زمانہ قبل از اسلام سے دور حاضر تک

مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ

زمانہ قبل از اسلام سے 2011ء تک

تاریخ افغانستان

جلدِ دوم

تالیف

مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ
استاذ تاریخ اسلام جامعۃ الرشید کراچی

المنہل پبلشرز
بلاک A-1 گلستان جوہر یونیورسٹی روڈ کراچی
0321-3135009|0321-2000870
www.almanhalpublisher.com
almanhalpublisher@gmail.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

تاریخ افغانستان
جلد دوم

تالیف
مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ
[illegible]

ادارۃ النور
دوکان نمبر 2-3 [illegible] کراچی
021-34914596, 0324-2855000
Idaratunnoor@gmall.com

پاکستان بھر میں ملنے کے پتے

لاہور	
مکتبہ رحمانیہ	0343-9697395 042-37224228
مکتبہ سید احمد شہید	042-37228272 042-37228196
اعجاز احمد	0332-4959155
المیزان	042-37122981
مکتبۃ العلم	042-37211788
الفلاح پبلشرز	0333-4101085
راولپنڈی	
اسلامی کتاب گھر	0514-830451
الخلیل پبلشنگ	0332-5459409
ملتان	
مکتبہ حقانیہ	0300-4541093
مکتبہ امدادیہ	0300-6380664
مکتبہ امداد العلوم	0302-9635918
فیصل آباد	
اسلامی کتاب گھر	0323-2000921
اسلام آباد	
مکتبہ فریدیہ	0343-5846073
حیدرآباد	
محمد احسن	0321-8728384
مکتبہ اصلاح و تبلیغ	0320-3015228
کوئٹہ	
کتب خانہ رشیدیہ	0333-7825484

جوز علاقہ سالارزی بونیر	
مکتبہ ہاشمیہ	0312-5588992 0341-9333804
کوہاٹ	
مکتبہ حسین بن علی	0334-8299029
پشاور	
دار الاخلاص	0300-5831992 091-2567539
بیت العلم	0300-9348654
مکتبہ عمر فاروق	0311-8845717 091-2580103
مکتبہ فاروق اعظم	0345-9597693
مکتبہ عثمانیہ	0300-5990822
چمن	
دار العلم	0315-4105987
مکتبہ عزیزیہ	0315-7788573
ڈیرہ اسماعیل خان	
مرکزی کتب خانہ	0346-7851984 0336-9755780
مکتبہ حقانیہ	0346-5435446
درہ پیزو	
مکتبہ علمیہ	0305-9571570
سرائے نورنگ	
مکتبہ ختم نبوت کتاب گھر	0302-5565112
بنوں	
مکتبۃ الاسلام	0334-5345720
مکتبہ عرفان	0333-9749663
مکتبہ شیخ الہند	0336-9243535

میران شاہ	
مکتبہ رحمانیہ	
مردان	
مکتبہ الابرار	0321-9872067
مکتبہ امام محمد	0311-9383776
کرک	
مکتبہ حقانیہ	0313-9836011
اکوڑہ	
مکتبہ سید احمد شہید	0332-9984701
سوات	
مکتبہ صدیقیہ	0334-9332627
مکتبہ عزیزیہ	0344-8178216
مانسہرہ	
ادارہ محمود دینی کتب خانہ	0311-8790712
ہنگو	
مکتبہ دیوبند	0332-4345384
سواڑی بازار	
مکتبہ حسن	0335-9520022
مکتبہ حبیبیہ	0333-9691389
مکتبہ صدیقیہ	0333-9705047
نوشہرہ	
القاسم اکیڈمی	0346-4010613
ادارۃ العلم	0321-9746859
دیر بالا	
ادارہ محمودیہ	0300-5571532
مکتبہ صدیقیہ	0331-8174101
صوابی	
اسلامی کتب خانہ	0303-8004066
مدنی کتب خانہ	0302-5687765
شبقدر	
مکتبہ بیت العلم	0345-0947410
مری	
مکتبہ محمدیہ	0321-7484917
مکتبہ عزیزیہ	0310-2197703
ٹانک	
مکتبہ حمادیہ	0304-0988857

فہرستِ جلدِ دوم

پچیسواں باب

چھبیسواں باب

اٹھانیسواں باب

چونتیسواں باب

اڑتیسواں باب

انتالیسواں باب

چالیسواں باب

بائیسواں باب

بچہ سقہ، نادر خان اور آخری بادشاہ ظاہر شاہ

بچہ سقہ اب افغانستان کا حکمران تھا۔ ایک دیہاتی، ناخواندہ اور امورِ مملکت سے قطعاً ناواقف شخص جو پہاڑوں کی بھول بھلیوں میں پولیس اور فوج کو چکمے دیتا رہا، صد سالہ بارک زئی بادشاہت کو قدموں تلے روند کر اب افغانستان کے سیاہ و سپید کا مالک بن گیا تھا۔ اسے تقدیر کے کرشمے کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

بچہ سقہ نے چند دن بعد اپنی کابینہ تشکیل دی جس میں کئی افراد اُسی جیسے دیہاتی اور اَن پڑھ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اس کے ساتھ ماضی کی مہمات اور معرکوں میں شریک رہے تھے اس لیے اس کے نزدیک حد درجہ قابلِ اعتماد تھے مگر ان میں سے بعض اس قابل بھی نہ تھے کہ خود دستخط کر سکیں۔

<u>روس سے سوویت روس تک</u>: امان اللہ خان کی اقتدار سے محرومی اور بچہ سقہ کی حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی افغانستان میں سوویت روس کی اس مداخلت کی راہ ہموار ہونے لگی جس کی انتہاء 1979ء میں سرخ فوج کے دریائے آمو عبور کرنے پر ہوئی۔ بچہ سقہ کی حکومت ایک کمزور حکومت تھی جو حادثات کی پیداوار تھی۔ یقیناً کسی خارجی سہارے کے بغیر وہ پنپ نہیں سکتی تھی۔

بچہ سقہ کے گروہ کے زیادہ تر افراد وہ تاجک اور ازبک تھے جن کے قبائل روس افغان سرحدوں کے ساتھ ساتھ آباد تھے۔ پھر بچہ سقہ نے سابقہ حکومت کی پالیسیوں کو ختم کرنے کے اعلان کے ساتھ اقتدار چھینا تھا اس لیے اس کے برسرِ اقتدار آتے ہی ماسکو میں کابل کی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے روسی حکام کا اعلیٰ سطحی اجلاس منعقد ہوا اور اس بات پر غور کیا گیا کہ آیا بچہ سقہ افغانستان میں سوویت روس کے نظریات کی کاشت کے لیے بہترین آلہ کار ثابت ہو سکتا ہے یا نہیں؟

اُدھر امان اللہ خان جو از خود تخت سے دستبردار ہوا تھا، ایک بار پھر قندھار میں حصولِ اقتدار کے لیے سرگرم ہو گیا۔ اس نے برطانیہ افغان جنگ کے ہیرو جنرل نادر خان کو قندھار بلا کر اسے اپنا ساتھ دینے پر آمادہ کر لیا اور بدلے میں اسے وزیر اعظم بنانے کا وعدہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی امان اللہ خان نے بیک

وقت دو بڑی طاقتوں سے روابط کا آغاز کیا۔ ایک طرف نا رخان کو برطانوی حکام سے بات چیت کے لیے ہندوستان بھیجا جو فروری 1929ء میں بمبئی پہنچا اور برطانوی اعلیٰ افسران سے گفت وشنید کی۔ دوسری طرف غلام نبی اور غلام صدیق ماسکو میں روسی قیادت سے مذاکرات کر رہے تھے۔ اسٹالن اور پرائم کوف جیسے اشتراکی قائدین سے بھی ان کی ملاقات ہوگئی تھی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ افغانستان میں حکومت بنانے یا اسے برقرار رکھنے کے لیے حزبِ اقتدار اور حزبِ مخالف دونوں روس کے محتاج تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ روس افغانستان پر بری طرح اثرانداز ہو چکا ہے۔

سرخ فوج امان اللہ خان کے ساتھ: روسی قیادت نے بچہ سقہ اور امان اللہ خان کا موازنہ کرنے کے بعد آخر کار امان اللہ خان ہی کو موزوں تصور کیا کیوں کہ اسے بنیادی طور پر برطانیہ مخالف اور روس نواز تصور کیا جاتا تھا۔ روسی حکام اس کے لیے بھی تیار ہو گئے کہ وہ کابل کو بچہ سقہ سے چھیننے اور امان اللہ خان کے حوالے کرنے کے لیے سرخ فوج دریائے آمو کے پار اُتاریں گے۔ روس کی حمایت پر بھروسہ کر کے امان اللہ خان نے 25 مارچ 1929ء کو قندھار سے کابل کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ اس کے ہمراہ ہزارہ قبائل کے افراد کی بہت بڑی تعداد تھی۔

ادھر امان اللہ خان کا نمائندہ غلام نبی ماسکو سے واپس آکر شمالی افغانستان میں آٹھ ہزار کا لشکر جمع کر چکا تھا۔ روسی جنرل پرائم کوف بھی سرخ فوج کے ساتھ اس کے ہمراہ تھا۔ 30 اپریل کو غلام نبی نے مزارِ شریف پر قبضہ کر لیا اور پھر کابل کی طرف بڑھا۔ درہ خلم پر بچہ سقہ کے گروہ سے زبردست مقابلہ ہوا جس میں بچہ سقہ کے تین ہزار حمایتی مارے گئے۔

افغان عوام پر اب یہ بات عیاں ہوگئی تھی کہ سوویت یونین امان اللہ خان کی پشت پر ہے۔ اس لیے بچہ سقہ نے عوامی جذبات کو اُبھار کر انہیں اپنی حکومت کے دفاع اور امان اللہ خان کے حامیوں سے مقابلے پر تیار کرنے کی کوشش کی۔ اس نے عوام کے نام ایک پیغام میں کہا:

> ''میرے پیارے بھائیو! میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے امان اللہ خان پر لعنت اور تکلیف نازل فرمائی۔ یہ دنیا و آخرت کے خسارے میں رہے گا۔ آپ اُٹھیے! شرابی اور بے دین غلام نبی کو ملک سے باہر نکال لیے۔''

امان اللہ خان کی مایوسی اور خود ساختہ جلاوطنی: ایسا لگتا تھا کہ امان اللہ خان جنگ جیتنے والا ہے مگر بچہ سقہ کی یہ بات درست ثابت ہوئی کہ وہ ''خسارے میں رہے گا۔'' امان اللہ خان کو کئی فتوحات کے بعد غیر متوقع طور پر غزنی میں شکست ہوئی۔ وہ اس شکست سے اتنا دلبرداشتہ ہوا کہ اس نے افغانستان ہمیشہ کے

لیے چھوڑ دیا اور براستہ قندھار 23 مئی کو ہندوستان چلا گیا۔ اس کا ترکِ وطن کا فیصلہ نہایت بچکانہ تھا کیونکہ ابھی شمال سے اس کی حامی فوج غلام نبی اور روسی جنرل کے ہمراہ کامیابی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ نیز اس کا معتمد جرنیل نادر خان بھی پشاور سے افغانستان میں داخل ہو چکا تھا اور اس کے پاس بھی خاصی فوج جمع ہو چکی تھی۔ بہر کیف امان اللہ خان کے ملک چھوڑتے ہی اس کی حمایت میں لڑنے والے لوگ منتشر ہو گئے۔ غلام نبی بھی مایوس ہو کر پہلے مزار شریف اور پھر وہاں سے سوویت یونین چلا گیا۔

افغان سیاست کا نیا کردار، جنرل نادر خان: اس موقع پر افغانستان کی تاریخ میں جنرل نادر خان سب سے اہم کردار کے طور پر اُبھر کر سامنے آیا۔ وہ امان اللہ خان کا نمائندہ بن کر ہندوستان گیا تھا اور برطانیہ کو اعتماد میں لے کر 8 مارچ کو افغانستان میں داخل ہوا تھا۔ بظاہر اس کا مقصد کابل کو امان اللہ خان کے لیے مسخر کرنا تھا مگر قرائن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خود کابل پر قبضے اور اپنی حکومت کے قیام کا ارادہ رکھتا تھا اس لیے افغانستان آ کر اس نے امان اللہ خان سے رابطہ کیا نہ بچہ سقہ سے۔ وہ تماشا دیکھتا رہا اور پھر جوں ہی امان اللہ خان غزنی میں شکست کھا کر ہندوستان فرار ہوا، جنرل نادر اپنی فوج کے ساتھ کابل کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے ساتھ موجودہ پاک افغان سرحدی قبائلیوں کی بہت بڑی تعداد تھی کیونکہ یہ لوگ اسے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے والے ایک بڑے مجاہد کے طور پر جانتے تھے۔

بچہ سقہ قتل، جنرل نادر تخت پر: جنرل نادر خان نے 13 جون 1929ء کو بچہ سقہ کی فوج کو شکست دے دی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے 15 اکتوبر کو کابل میں داخل ہو گیا۔ 16 اکتوبر کو وہ کابل کے تخت شاہی پر براجمان تھا جبکہ بچہ سقہ صرف نو ماہ حکومت کر کے کوہستان کی طرف فرار ہو چکا تھا۔ جنرل نادر نے بچہ سقہ کو معافی کا جھانسا دے کر کچھ دنوں بعد گرفتار کر لیا اور پھر سرکردہ ساتھیوں سمیت اسے کابل میں توپ سے اُڑا دیا۔ تخت نشینی کی توثیق کے لیے جنرل نادر خان نے ایک جرگہ طلب کیا جس میں 286 عمائد اور امراء نے اس کے حق میں فیصلہ دیا۔ اس کے بعد اس نے سابق حکمران اور اس کے وفاداروں کے خلاف کارروائیاں شروع کیں۔ امان اللہ خان کی وطن واپسی پر پابندی لگا دی، اس کی جائیدادیں ضبط کر لیں، اس کے کئی اہم وفاداروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ امان اللہ خان نے کچھ دن ہندوستان میں گزارنے کے بعد اٹلی میں سیاسی پناہ حاصل کی اور تادمِ مرگ وہیں زندگی گزاری۔

نادر خان کے عمائد حکومت: جنرل نادر خان اب شاہ نادر خان بن گیا تھا۔ اس نے 1919ء کی جنگ میں برطانیہ کے خلاف جو کارنامے انجام دیے تھے اس کی بنا پر وہ نہ صرف افغان عوام میں بلکہ ڈیورنڈ لائن کے پار سرحدی قبائل اور ہندوستانی مسلمانوں میں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ افغانوں کو

اس سے نیک توقعات تھیں اور نادر شاہ نے بڑی حد تک ان پر پورا اُترنے کی کوشش کی۔ اس کا دور حکومت عمومی زاویہ نگاہ سے پُرامن تھا۔ البتہ سابقہ حکمران کے ان حامیوں کو کچلنے میں اس نے سختی سے کام لیا جو موجودہ حکومت کے خلاف سرگرم تھے۔ ہاں! امان اللہ خان کے خاندان کے وہ لوگ جو اس کے حامی تھے، عزت واحترام کے حق دار رہے۔ مثلاً: شہزادہ اسداللہ خان کو جو امان اللہ خان کا سوتیلا بھائی تھا شاہی فوج کا کمانڈر مقرر کیا گیا تھا۔ حکومت کے دیگر اہم ارکان میں سردار شاہ محمود خان وزیر حرب، سردار احمد خان وزیر دربار، سردار فیض محمد خان وزیر خارجہ اور میر عطا محمد خان صدر مجلس اعیان شامل تھے۔ یہ مجلس اعیان گویا حکومت کی مجلس شوریٰ یا پارلیمنٹ تھی۔ ان سب عمائد سے بڑا رتبہ نادر شاہ کے بھائی سردار ہاشم خان کا تھا جو صدر اعظم کے منصب پر فائز تھا اور عملاً تمام اُمور اس کی گرفت میں تھے۔ اس کے اختیارات کسی طرح بھی یورپی ممالک کے صدور سے کم نہیں تھے۔

نادر شاہ نے حکومت میں ہمسایہ ممالک کے ان قابل اور وفادار افراد کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا جو افغانستان کو اپنا وطن بنا چکے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں اسلامیہ کالج لاہور کے گیارہ طالب علم جو سرحد پار کر کے افغانستان چلے گئے تھے ان میں سے ایک صاحب اللہ نواز خان تھے۔ نادر شاہ نے انہیں ''وزیر فوائد عامہ'' مقرر کیا تھا۔ انہوں نے بچہ سقہ کے خلاف نادر شاہ کو کامیابی دلانے میں بھی بھرپور کردار ادا کیا تھا۔ اس طرح ہندوستان کے ایک اور صاحب عبداللہ عرف شاہ جی افغان فوج میں نائب سالار تھے۔ نادر شاہ کا بھائی شاہ ولی خان بھی حکومت کے اہم ستونوں میں سے ایک تھا۔

نورالمشائخ کی واپسی: نادر شاہ نے ایک اچھا کام یہ کیا تھا کہ سابق حکمران کے دور میں جلاوطن کیے جانے والے مشہور صوفی بزرگ نورالمشائخ حضرت فضل عمر مجددی کو واپس کابل بلا لیا تھا۔ نورالمشائخ کے جلاوطنی کے کئی سال بمبئی میں گزرے تھے اور وہاں وہ ''ملائے شور'' کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ نادر شاہ نے انہیں عزت واحترام سے واپس بلوا کر ''وزیر عدلیہ'' کا عہدہ دے دیا۔ نادر شاہ کو ان سے ایک خاص عقیدت تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ 1919ء کے جہاد میں حضرت نورالمشائخ نے قبائل کو جہاد کے لیے آمادہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا اور لشکر کشی کے وقت وہ بذاتِ خود نادر شاہ کے ساتھ تھے۔

نادر شاہ کی پالیسیاں: نادر شاہ نے امان اللہ خان کی ان غیر شرعی ترقی پسندانہ پالیسیوں کو پروان نہیں چڑھنے دیا جن پر افغان علماء اور عوام کو سخت اعتراض تھا۔ تاہم کچھ اُمور ایسے تھے جو سابق حکمرانوں کے دور سے سرکاری نظام ومزاج کا حصہ بن چکے تھے اور انہیں دور کرنا نادر شاہ کے لیے جلد ممکن نہ تھا۔ نادر شاہ ذاتی طور پر ایک خوش اخلاق، اسلام پسند، محب وطن اور مخلص آدمی تھا۔ مگر اس کے پاس گہری منصوبہ

بندی اور اہداف کا تعین کرنے والے لوگوں کی کمی تھی۔ افغانستان کے شعبہ تعلیم میں ایک انقلابی تبدیلی کی ضرورت تھی مگر نادر شاہ اس سلسلے میں فکر مند ہونے کے باوجود کوئی خاص تبدیلی نہ لا سکا۔

ملک کی تعلیمی حالت: اس دور میں کابل کا مشہور دینی مدرسہ ''دار العلوم عربی'' تھا جہاں قدیم انداز میں درسِ نظامی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ جدید تعلیم کی کئی اعلیٰ درسگاہیں کام کر رہی تھیں جن میں مکتب صنائع نفیسہ، مکتبہ حبیبیہ، مکتب استقلال، مکتب زراعت، مکتب طبی، مکتب نجات، مکتب دوا سازی اور مکتب دار المعلمین قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں مکتب سے مراد کالج ہے نہ کہ ابتدائی تعلیم کی درسگاہ۔

بچوں کو قرآن مجید حفظ کرانے کے لیے دار الحفاظ قائم تھا۔ مکتب صنائع نفیسہ فنون لطیفہ یا فائن آرٹس کا مرکز تھا جہاں قالین بافی، نقاشی، مصوری اور نجاری کے فنون سکھائے جاتے تھے۔ یہ مکتب شاہ امان اللہ خان کا جاری کردہ تھا اور اس میں بعض جرمن استاذ بھی فنون سکھاتے تھے۔ ان میں سب سے قدیم کالج مکتب حبیبیہ کی بنیاد شاہ حبیب اللہ خان نے رکھی تھی۔ مکتب استقلال فرانسیسی زبان سکھانے کا کالج تھا جبکہ مکتب نجات میں جرمن زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ دونوں شاہ امان اللہ خان کی یادگار تھے۔ مکتب زراعت جو کابل اور پغمان کے درمیان واقع تھا، باغبان اور کاشتکاری کی تعلیم کا مرکز تھا۔ مکتب دار المعلمین میں اساتذہ کو تدریس کی تربیت دی جاتی تھی۔

مکتب طبی اور مکتب حربیہ: مکتب طبی شاہ نادر خان نے اپنے دور میں قائم کیا تھا۔ یہ میڈیکل کالج آگے چل کر موجودہ کابل میڈیکل یونیورسٹی بنا۔ اس کا معیار تعلیم بہترین مانا جاتا رہا ہے۔ مکتب دوا سازی (فارمیسی) مکتب طبی ہی کا پھیلاؤ تھا۔ ان کے علاوہ نادر شاہ نے یتیم خانہ نادری کے نام سے لاوارث بچوں کے لیے ایک عمدہ درسگاہ بنوائی تھی جس میں دار الاقامہ کی سہولت موجود تھی۔

نادر شاہ نے عسکری تعلیم میں ترقی کے لیے مکتب حربیہ (ملٹری کالج) کی بنیاد رکھی۔ اس نے سدوزئی حکمرانوں کے مرکز قلعہ بالا حصار کو اس کام کے لیے پسند کیا۔ قلعہ بالا حصار کابل کا قدیم ترین قلعہ ہے۔ چنگیز خان کے حملے کے وقت بھی یہ موجود تھا۔ 1879ء (1396ھ) میں برطانیہ نے کابل پر حملے کے دوران اسے توپوں کی مسلسل گولہ باری سے اتنا شکستہ کر دیا تھا کہ یہ پتھروں کا ڈھیر اور محض کھنڈر نظر آتا تھا۔ نادر شاہ خان نے اسے از سر نو آباد کرنے کے لیے یہاں ملٹری کالج بنانا چاہا۔ افغانستان کے قومی دن کے موقع پر نادر شاہ نے یہاں بدست خود کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ پھر عمائد سلطنت اور عوام نے کدالیں اور پھاوڑے لے کر اس کھنڈر کو ہموار زمین میں تبدیل کر دیا۔ تاہم یہاں تعمیراتی کام کی ابتداء نادر شاہ کی زندگی میں نہ ہو سکی۔

نقصان دہ پہلو: تعلیمی شعبے کے مذکورہ بالا پہلوؤں سے واضح ہو جاتا ہے کہ نادر شاہ اور اس کے وزراء

دمشیران کے ذہن میں تعلیم کو ترقی دینے کے جذبے کے باوجود کوئی مربوط، واضح اور دوررس نظام نہ تھا۔ جرمن، فرانسیسی اور انگریزی کالجوں کے قیام سے نو تعلیم یافتہ لوگوں کے تین گروہ بن گئے تھے۔ یہ افراد مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی، فرانس یا برطانیہ کا رُخ کر لیتے تھے اور پھر بڑی حد تک انہی کے رنگ میں رنگے جاتے تھے۔ سرکاری سطح پر کوئی ایک تعلیمی نظام نہ ہونا ملک کی بڑی بدقسمتی تھی۔

ذرائع ابلاغ: دنیا میں یہ زمانہ میڈیا وار کے آغاز کا تھا۔ اخبارات کا گھر گھر چرچا تھا اور ریڈیو عام ضرورت کی چیز بن چکا تھا۔ تاہم نادر شاہ کے دور میں افغانستان میں ذرائع ابلاغ ایک دو اخبارات تک محدود تھے۔ حبیب اللہ خان کے زمانے میں سراج الاخبار، امان اللہ خان کے دور میں ''امان افغان'' بچہ سقہ کے عہد میں ''حبیب الاخبار'' اور نادر شاہ کے ایام میں ''اصلاح'' مقبول ترین قومی جرائد رہے ہیں۔ بہر حال نادر شاہ نے پریس کو ترقی دینے کے لیے کئی اقدامات کیے اور جرمنی سے جدید ترین مشینیں منگوائیں جن کی بنا پر افغان پریس علاقائی ممالک میں سب سے بہتر شمار ہونے لگا۔ اتفاق اسلام، طلوع افغان، بیدار، مجلۂ کابل اور حی علی الفلاح جیسے معیاری رسائل وجرائد نادر شاہ کے دور میں جاری رہے۔

علی آباد کا دار الصحت: 1919ء کی جنگ میں برطانیہ کو شکست دینے کے صلہ میں امان اللہ خان نے نادر شاہ کو کابل اور لغمان کے درمیان ''علی آباد'' کی جاگیر بخشی تھی۔ نادر شاہ نے اپنے دورِ حکومت میں عوامی فلاح وبہبود کے لیے یہاں ایک سینی ٹوریم (دار الصحت) قائم کیا۔ دق وسل کے مریض اس صحت افزا مقام میں ٹھہر کر شفایاب ہوتے تھے۔

سرکاری لباس: حبیب اللہ خان کے زمانے سے افغان حکمران، عمائد، امراء اور سرکاری افسران مشرقی ومغربی تمدن کا امتزاج بن گئے تھے۔ سر کو چھوڑ کر پورے جسم پر یورپی لباس (کوٹ، پتلون) پہنا کرتے تھے جبکہ سر پر افغان ٹوپی یا دستار کا رواج باقی تھا۔ نادر شاہ کا لباس بھی اس قسم کا ہوتا تھا۔ حکام کی دیکھا دیکھی عوام بھی اس وضع قطع کو اپنانے لگے تھے۔ سرکاری ملازمین، فوج، پولیس، ڈرائیور اور چوکیدار وغیرہ اسی قسم کے لباس کے پابند تھے۔

ذرائع آمد ورفت: قلتِ وسائل کے باوجود نادر شاہ کے دور میں ذرائع آمد ورفت پر خاصی توجہ دی گئی۔ کابل سے مزار شریف تک نیا پختہ راستہ تیار کیا گیا۔ اس طرح پشاور سے کابل تک نئی سڑک تعمیر کی گئی۔ عموی طور پر یہ تمام راستے محفوظ تھے اور چوری ڈاکے کے واقعات بہت کم ہو گئے تھے۔ ایک جاپانی سیاح نے ان دنوں تنہا موٹر کار پر پورے افغانستان کا دورہ کیا اور امن وامان کی صورتِ حال کی بے حد تعریف کی۔

خارجہ پالیسی اور معاہدے: نادر شاہ کی خارجہ پالیسی غیر جانبداری، عدم جارحیت اور بقائے باہمی

کے اُصولوں پر استوار تھی۔ وہ سابقہ دو حکمرانوں کے دور میں برطانوی اور سوویت استعمار کی ستم خیزیاں دیکھ چکا اور ان کے عزائم سے خوب واقف تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ برسوں سے شورش زدہ اور جنگوں کا مارا ہوا افغانستان جب تک اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو جائے از خود کسی نئی جنگ کا خطرہ مول لینے کے قابل نہیں۔ چنانچہ اس نے برطانیہ اور روس دونوں سے سابقہ معاہدے برقرار رکھے۔ 24 جون 1931ء کو اس نے روس سے دس برس قبل امان اللہ خان کے ساتھ کیے گئے اس معاہدے کی تجدید کی جس کا مسودہ سوویت انقلاب کے بانی لینن نے تیار کیا تھا۔ یہ 1921ء کے معاہدے کی توثیق تھی۔ ذاتی خیالات کے لحاظ سے برطانیہ مخالف ہونے کے باوجود اس نے برطانیہ کو مطمئن رکھنے کی پوری کوشش کی اور تخت نشینی کے چند ماہ بعد ہی 6 مئی 1930ء کو برطانیہ سے اس معاہدے کی تجدید کی جو امیر عبدالرحمن خان کے دور میں 2 اکتوبر 1893ء کو عمل میں آیا تھا اور جس کے تحت افغانستان اور برطانیہ ہندوستان کی سرحدوں کو متعین کرنے کے لیے ڈیورنڈ لائن پر متفق ہوئے تھے۔

داخلہ پالیسی کے بعض پہلو اور ان کا نقصان: شاہ نادر خان شاہان افغانستان میں آخری قدامت پسند انسان تھا اور ماڈرن ازم کا مخالف تھا۔ اس نے جہاں امان اللہ خان کے جدت پسندانہ رجحانات کے برعکس افغانستان کو اپنے قدیم رنگ ڈھنگ پر برقرار رکھنے کی کوشش کی وہاں وہ سابق حکمران کے حامیوں کو دبانے میں بھی کامیاب رہا تھا۔

چونکہ اس نے ایک صدی سے افغانستان پر حکومت کرنے والے بارک زئی خاندان کی ہڈیوں پر اپنا راج محل تعمیر کیا تھا اس لیے لازمی طور پر اسے سب سے زیادہ خطرہ اسی خاندان اور اس کے حمایتیوں سے تھا۔ اس لیے اس نے انہیں اپنے اقتدار کے لیے شدید خطرہ تصور کرتے ہوئے انہیں دیوار سے لگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ تاہم یہی کوشش اس کے جلد خاتمے کا سبب بن گئی۔ اگر نادر خان کا دور طویل ہوتا تو وہ ایک کامیاب ترین حکمران ثابت ہوتا مگر اسے مدتِ اقتدار بھی کم ملی اور اچھے مشیر اور باصلاحیت رفقاء بھی کم میسر آئے تھے۔ اس کا زیادہ تر انحصار اپنے بھائیوں شاہ ولی اللہ، شاہ محمود اور سردار ہاشم پر تھا۔ یہ تینوں بھائی عسکری ذہنیت کے مالک تھے اور سخت گیر پالیسی رکھتے تھے۔ سارا نظم ونسق انہی کے ہاتھوں میں تھا۔ اس تنگ نظری کا اثر یہ ہوا کہ نادر خان کی حکومت کو زیادہ استحکام نصیب نہ ہوا۔

روس سے سرحدی تنازع: نادر خان کے دور میں روس اور افغانستان میں کچھ مدت کے لیے سرحدی کشیدگی کا ماحول بھی رہا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ شمالی علاقوں کا ایک قبائلی سردار ابراہیم بیگ بار بار سوویت علاقوں میں چھاپے مار رہا تھا۔ اس نے افغانستان کو اپنی جائے پناہ بنا رکھا تھا۔ جون 1930ء میں سوویت افواج

ابراہیم بیگ کے تعاقب میں دریائے آمو عبور کر کے افغانستان میں گھس گئیں۔ یوں دونوں ملکوں میں سرحدی کشیدگی پیدا ہوگئی۔ آخر روس کے کہنے پر افغانستان نے ابراہیم بیگ کو افغان علاقوں سے نکال کر روسی عملداری میں دھکیل دیا۔ روسیوں نے اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ اس طرح سرحدی کشیدگی ختم ہوگئی۔

شاہ نادر خان کا خاتمہ: نادر خان بنیادی طور پر ایک پختہ مسلمان تھا۔ ہندوستان کے اکابر دیوبند سے اسے نیاز مندانہ تعلق تھا۔ ظفر حسن ایبک نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ وہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ سے بیعت بھی تھا۔ مگر افسوس کہ اس باصلاحیت حکمران کا دورِ حکومت صرف چار سالہ رہا۔

اس کے آخری دور میں امان اللہ خان کے حامی جرخی قبیلے نے زبردست شورش برپا کردی۔ نادر خان کا حامی قبیلہ ''مصاحبان'' اس کے مقابلے پر اُتر آیا۔ دونوں قبائل کی باہمی لڑائی نے ملک میں خانہ جنگی کا ماحول پیدا کر دیا۔ نادر خان کے خلاف ان لوگوں کی نفرت میں اضافہ ہوگیا جو ماڈرن ازم کے حامی تھے۔ یہ مخالفین اس کے قتل کی سازشیں تیار کرنے لگے۔

6 نومبر 1933ء کو نادر خان ''دلکشا محل'' میں طلبہ میں تقسیم انعامات کی تقریب میں شریک ہوا۔ اسی محفل میں ایک طالب علم نے فائرنگ کر کے اسے قتل کر دیا۔ یوں افغانستان ایک باصلاحیت حکمران سے بہت جلد محروم ہوگیا۔ اس کے بعد نااہل، مغرب زدہ اور پھر اسلام دشمن حکمرانوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے افغانستان کے مستقبل کو گھپ اندھیروں کی نذر کر دیا۔

ظاہر شاہ، ظاہری شاہ: نادر خان کے قتل کے بعد اس کے نوجوان لڑکے ظاہر شاہ کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اسے حکومتی امور کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ تمام ملکی معاملات اس کے تینوں چچاؤں شاہ محمود، شاہ ولی اور سردار ہاشم کے ہاتھ میں تھے۔ ظاہر شاہ جو صرف ظاہری شاہ تھا، اس پر مطمئن تھا کہ اسے فیصلوں کے بوجھ سے آزاد رکھا جائے اور ملک کو اس کے چچا سنبھالے رہیں۔ ان تینوں کے بعد وہ اپنے چچازاد اور بہنوئی سردار داؤد خان پر سب سے زیادہ اعتماد کرتا تھا۔

ظاہر شاہ کو حکومتی اُمور سے زیادہ سیر و تفریح اور شکار سے دلچسپی تھی۔ اس کے دورِ حکومت کے ابتدائی برسوں میں عالمی سیاست کے حوالے سے افغانستان کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ روس کو افغانستان کے ذریعے اپنے جن مفادات کا حصول عزیز تھا وہ فی الحال پس منظر میں چلے گئے تھے کیوں کہ سوویت روس کا سربراہ اسٹالن مشرقی یورپ کی طرف متوجہ تھا۔ ادھر افغانستان کی خارجہ پالیسی بھی بظاہر غیر جانبدارانہ ہوگئی تھی۔

دوسری جنگ عظیم: ظاہر شاہ کی تخت نشینی کے چھٹے سال جنگ عظیم دوم کا آغاز ہوگیا۔ جرمنی کے حکمران ایڈولف ہٹلر نے عالمی طاقتوں کی استحصالی کارروائیوں اور ناانصافیوں سے تنگ آ کر جنگ کا الاؤ بھڑکا

دیا۔ برطانیہ، فرانس اور روس اس کے خلاف متحد ہو گئے اور یوں یہ جنگ مغرب سے مشرق تک پھیل گئی۔ پھر جب جاپان جرمنی کی حمایت میں میدان جنگ میں کودا تو صورت حال مزید ابتر ہو گئی۔

ستمبر 1939ء میں شروع ہونے والی مہیب جنگ ڈیڑھ دو کروڑ انسانوں کی ہلاکت اور درجنوں ممالک کی اقتصادی تباہی کے بعد 1945ء میں اس وقت ختم ہوئی جب امریکا نے جاپانی شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر تاریخ انسانی میں پہلی بار ایٹم بم برسائے اور جاپان کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔ ادھر روس میں طوفان کی طرح داخل ہونے والا ہٹلر بھی موسم کی قیامت خیزیوں کے سبب پسپائی پر مجبور ہو گیا اور خودکشی کر کے اپنے انجام کو پہنچا۔

برطانیہ کی ہندوستان سے واپسی: چھ برسوں کی اس جنگ نے پوری دنیا پر تباہ کن اثرات مرتب کیے۔ جنگ میں ملوث ممالک اور ان کے معاونین کا دیوالیہ نکل گیا تھا تاہم افغانستان کی غیر جانبدارانہ پالیسی نے اسے بڑے نقصانات سے محفوظ رکھا۔ پھر جنگ کے خاتمے پر افغانستان کو ایک غیر معمولی تحفظ اس وقت ملا جب برطانیہ نے ہندوستان سے بوریا بستر سمیٹنا شروع کیا۔ جنگ عظیم دوم کے صدمات نے اس سپر پاور کو اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ اپنی عملداری میں سورج نہ ڈوبنے پر فخر کرتا رہے۔ اگست 1947ء میں جب برطانیہ ہندوستان سے واپس ہوا تو اس کے ساتھ ہی اسے افغانستان کے سرحدی مقبوضات بھی چھوڑنے پڑے۔ اسی طرح افغانستان کی مشرقی سرحدوں کو برطانیہ کے خطرات سے ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی۔

صوبہ سرحد کا مستقبل: تاہم اس کے ساتھ ہی ایک اہم مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا اور وہ تھا سرحدی علاقوں کے مستقبل کا۔ درۂ خیبر سے لے کر دریائے سندھ تک کا یہ علاقہ جسے 13 نومبر 1893ء کو ڈیورنڈ لائن معاہدے کے ذریعے افغانستان سے الگ کیا گیا تھا نسلی، لسانی، تہذیبی، جغرافیائی اور تاریخی لحاظ سے مکمل طور پر افغانستان سے ہم آہنگ تھا۔ اس لیے افغانستان چاہتا تھا کہ برطانیہ کے چلے جانے کے بعد یہ علاقے اسے دوبارہ مل جائیں مگر برطانیہ کا کہنا تھا کہ ڈیورنڈ لائن معاہدے کے بعد افغانستان یہ حق کھو چکا ہے۔ امیر عبدالرحمن کے بعد 1905ء میں شاہ حبیب اللہ خان، 1919ء میں شاہ امان اللہ خان اور 1930ء میں شاہ نادر خان اس کی توثیق کر چکے ہیں۔ لہٰذا اس علاقے کے مستقبل کا فیصلہ افغانستان نہیں کر سکتا۔

تقسیم ہند سے قبل 1947ء میں برطانیہ نے ریفرنڈم کرایا۔ افغانستان کی خواہش تھی یہ ریفرنڈم اس طور پر ہو کہ سرحد کے باشندوں سے پوچھا جائے "آپ افغانستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا آزاد ریاست بننا پسند کریں گے؟"

مگر برطانیہ نے افغانستان کو نظر انداز کرتے ہوئے ریفرنڈم میں یہ سوال سامنے رکھا: "آپ متحدہ

ہندوستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا پاکستان میں؟''

سرحد کے غیور مسلمان مسلم لیگ کی تحریک سے متاثر تھے اور خان عبدالغفار خان کی مقبولیت کم ہو چکی تھی۔ چنانچہ سرحد کے پختونوں نے بھاری اکثریت کے ساتھ پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

پاک افغان تعلقات میں کشیدگی: 14 اگست 1947ء کو پاکستان بن گیا۔ افغانستان کی مشرقی سرحدوں کو تقریباً ایک صدی کے طویل عرصے بعد کسی مسلم حکومت کی رفاقت نصیب ہوئی مگر افغانستان کے حکمران ظاہر شاہ نے پختون علاقوں کی پاکستان میں شمولیت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور برطانیہ کی واپسی کے بعد ڈیورنڈ لائن کو ناقابل قبول سمجھتے ہوئے صوبہ سرحد پر افغان علاقہ ہونے کا دعویٰ جاری رکھا۔ اس طرح پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی افغانستان اور پاکستان کے تعلقات خراب ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان خراب تعلقات کی بنیاد برطانیہ ہی نے ڈالی تھی۔ جس طرح وہ جاتے جاتے مسئلہ کشمیر کھڑا کر کے پاکستان اور بھارت کو دہکتے انگاروں پر چھوڑ گیا تھا، اسی طرح اس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق پختون علاقوں کی سرحدوں کے معاملات کو اس طرح الجھا دیا تھا جو پاکستان اور افغانستان کے درمیان مستقل تناؤ کا باعث بن کر رہے۔

بدقسمتی سے حکومت پاکستان کی جانب سے خیر سگالی کے رسمی جذبات کے اظہار کے باوجود افغانستان کو اعتماد میں لینے کی کوئی ٹھوس کوشش نہ کی گئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ کئی عشروں تک افغانستان اور پاکستان میں بہتر تعلقات پیدا نہ ہو سکے بلکہ آئے دن کشیدگی میں اضافہ ہوتا رہا۔ 1950ء میں دونوں ممالک کی فوجوں کے درمیان سرحدی جھڑپیں ہوئیں جس کے بعد پاکستان نے افغانستان کی تجارتی راہداری بند کر دی۔ اس سے افغانستان کی معیشت و تجارت پر بہت برا اثر پڑا اور اسے اپنی اقتصادیات کو سہارا دینے کے لیے ایک بار پھر روس کی طرف دیکھنا پڑا۔

افغانستان اور روس کے نئے روابط: افغانستان جس پر روس کی توجہ اپنے داخلی مسائل کی وجہ سے کم ہو گئی تھی، اب دوبارہ روس کے لیے اہم ہو گیا۔ خاص طور پر اس لیے کہ اب روس کا حریف برطانیہ بھی یہاں سے جا چکا تھا۔ 1950ء میں سرحدی جھڑپوں کے بعد جب پاکستان نے افغانستان کے لیے سرحدیں بند کیں تو اسی سال افغانستان اور سوویت روس کے درمیان ایک تجارتی معاہدہ طے پا گیا۔ یہ معاہدہ افغانستان اور روس کے قرب کیلئے ایک سنگِ میل ثابت ہوا اور آنے والا ہر دن ان کے تعلقات کو گہرا کرتا گیا۔ اس طرح افغانستان کی غیر جانبدارانہ حیثیت ختم ہو گئی اور وہ مکمل طور پر روسی بلاک میں چلا گیا۔ ادھر پاکستان اپنے قیام کے بعد سے امریکا کی دلچسپی کا محور رہا تھا اور اسے امریکی بلاک میں شامل سمجھا جاتا تھا۔ روس اور امریکا کی رقابت کا اثر پاکستان اور افغانستان پر بھی پڑ رہا تھا اور ان دونوں میں

فاصلے بڑھتے جا رہے تھے۔

امداد و ترقی کی آڑ میں سازش: دسمبر 1955ء میں کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری خروشیف اور روسی وزیر اعظم بلگانن نے افغانستان کا دورہ کیا۔ اس دورے کا اصل مقصد افغانستان جیسے پس ماندہ ممالک میں کمیونزم کو فروغ دینا تھا۔ تاہم روس یہ مقصد افغانوں کو مراعات و امداد کے سنہرے جال میں پھانس کر حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اس دورے میں افغانستان کو 100 ملین ڈالر قرضہ دینے کا وعدہ کیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ افغانستان میں کئی اہم ترقیاتی منصوبے شروع کرنے کا اعلان کیا گیا جن میں پلوں اور شاہراہوں کی تعمیر کے علاوہ کوہِ ہندوکش سے گزرنے والی درہ سالانگ کی سرنگ اور بگرام ائیر پورٹ کا منصوبہ بھی شامل تھا۔ یہ ترقیاتی کام دراصل افغانستان کو فتح کرنے کے اس منصوبے کا حصہ تھے جو 50ء کی دہائی میں ہی روسی حکمرانوں کے ذہنوں میں پرورش پانے لگا تھا۔

روس جو پہلے زار شاہی کی صورت میں اسلامی دنیا پر خطرے کی تلوار بن کر لٹکتا رہا تھا 20ویں صدی میں کمیونزم کا علمبردار بن کر پہلے سے بڑھ کر سامراجیت پر آمادہ تھا۔ 1917ء میں برپا ہونے والا بالشویک انقلاب جو وسط ایشیا کی اسلامی تہذیب وثقافت کو پامال کر کے افغانستان کی سرحدوں پر رک گیا تھا اب ہر حد سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ افغانستان میں جاری یہ ترقیاتی منصوبے اسی انقلاب کے لیے راستہ ہموار کر رہے تھے۔ روس نے ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق پل اتنے مضبوط اور کشادہ تعمیر کیے جن سے بڑے بڑے ٹرک، ٹینک اور بھاری اسلحے سے لدی گاڑیاں بآسانی گزر سکتی تھیں۔ بگرام اور شین ڈنڈ کے علاقوں میں اتنے وسیع ائیر پورٹ تعمیر کیے گئے جن کو روسی فوجیں بڑی سہولت سے استعمال کر سکتی تھیں۔ کچھ عرصے بعد روس نے افغانستان سے ''دوستی'' کا رشتہ مضبوط کرنے کے لیے ایک اور قدم اُٹھایا۔ اس نے افغان فوج کے افسران کی بھاری تعداد کو اعلیٰ تربیت کے لیے اپنے ہاں مدعو کیا۔ اس سے قبل افغانستان کی افواج کو جرمن یا ترک افسران تربیت دیتے تھے۔ اب پہلی بار ایسا ہو رہا تھا کہ افغانستان کے بہادر سپاہی تربیت لینے ایک ایسے ملک جا رہے تھے جس کی اسلام دشمنی کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ افغان افسران کی تربیت کا یہ منصوبہ سوویت حکومت اور ظاہر شاہ کے دستِ راست سردار داؤد کی ذہنی ہم آہنگی کا نتیجہ تھا۔ جہاں تک ظاہر شاہ کا تعلق ہے وہ ایسے معاملات میں سرے سے دلچسپی ہی نہیں لیتا تھا اور صرف برائے نام بادشاہت اور راحت و آرام پر مطمئن تھا۔

سردار داؤد اور ظاہر شاہ: سردار داؤد خان شاہی افواج کا کمانڈر تھا، ظاہر شاہ کو اس کی قابلیت اور وفاداری

پر پورا بھروسہ تھا۔ افغانستان کی سیاست میں وہ اس وقت اُبھر کر سامنے آیا جب ظاہر شاہ نے ملکی انتظامات اپنے ہاتھ میں لینے کا ارادہ کیا۔ داؤد خان نے اس کا بھرپور ساتھ دیا اور ستمبر 1953ء میں ظاہر شاہ جو کہ گزشتہ بیس سال سے برائے نام حکمران تھا مطلق العنان حکمران بن گیا اور تمام اختیارات اس کے ہاتھ میں آ گئے۔ یہ سب سردار داؤد کا کمال تھا۔ مگر اس کے بعد ظاہر شاہ نے ان اختیارات کو صحیح طور پر استعمال نہ کیا۔ اس نے سردار داؤد کی احسان مندی کے اظہار کے طور پر اسے ملک کا بااختیار وزیر اعظم بنا دیا اور خود کنج عافیت ہی میں بیٹھنا پسند کیا۔ اس طرح سردار داؤد ملک کے سیاہ و سپید کا مالک بن گیا۔

سردار داؤد خان، ظاہر شاہ کا چچا زاد بھائی اور بہنوئی تھا۔ گول مٹول چہرے، گنجے سر، موٹے ہونٹوں اور بھاری جسم کے ساتھ وہ قدرے بدنما دکھائی دیتا تھا مگر اس کی دماغی صلاحیتیں حیرت انگیز تھیں۔ وہ جدید تعلیم یافتہ اور بنیادی طور پر روس نواز ذہن کا حامل تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے افغانستان کی غیر جانبدارانہ پالیسی کو باضابطہ طور پر تبدیل کر کے اسے روسی بلاک میں شامل کیا۔ اس کی وزارت عظمیٰ کے دوسرے سال (1954ء میں) افغانستان کے تعلیمی اداروں میں روسی اساتذہ کو تعینات کیا جانے لگا۔ عوام نے اس اقدام کو شک و شبہے کی نگاہ سے دیکھا کیونکہ اس سے پہلے روسیوں کو افغانستان میں ملازم رکھنے سے سخت احتراز کیا جاتا تھا۔ کچھ مدت بعد سردار داؤد نے اپنے فوجی افسران کو تربیت کے لیے روس بھیجنے کا منصوبہ بھی منظور کرا لیا۔ روسی اساتذہ کے افغانستان اور افغان افسران کے روس میں تربیت پانے کے نتائج آگے چل کر بڑے بھیانک انداز میں سامنے آئے۔ بہت سے افسران تربیت کے زمانے میں کمیونزم کے پرستار بن گئے اور ان کی وفاداریاں سوویت روس کے ساتھ وابستہ ہو گئیں۔ 1973ء اور 1978ء میں ایسے افسران کو استعمال کر کے ہی فوجی بغاوت برپا کی گئی جس کے بعد روس کے لیے افغانستان پر یلغار کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھل گیا۔

داؤد خان کی برطرفی: وزیر اعظم سردار داؤد خان نے اپنی وزارت عظمیٰ کے دس برسوں میں افغانستان کو روسی کالونی بنانے کے لیے سر توڑ کوشش کی مگر افغان عوام نے اس کی پالیسیوں پر منفی ردِ عمل کا اظہار کیا اور اس کے خلاف نفرت بڑھتی چلی گئی۔ خود حکمران ظاہر شاہ بھی دیکھ رہا تھا کہ پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ تب اس نے پہلی بار اپنے اختیارات کو قطعی طور پر استعمال کیا۔ اس نے مارچ 1963ء میں سردار داؤد کو وزارتِ عظمیٰ کے منصب سے برطرف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے کی ایک اور بڑی وجہ بھی تھی۔ شاہ کے مشیروں کا خیال تھا کہ داؤد خان اب اس حد تک اقتدار کو گرفت میں لے چکا ہے کہ کچھ عرصے بعد وہ بادشاہ کو بھی لائق اعتناء نہیں سمجھے گا۔ ظاہر شاہ خود بھی داؤد کی ترک تازیوں کو خدشے کی نگاہ سے دیکھ رہا

تھا۔ تاہم اس نے حتمی فیصلے سے پہلے ایک معتمد رشتہ دار کو فوج کے اعلیٰ افسران کے پاس بھیج کر یہ اطمینان کیا کہ فوج اب بھی اس کی وفادار ہے یا نہیں۔ وہاں سے مثبت جواب آنے کے بعد اس نے سردار داؤد کو بلوا کر اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔

سردار داؤد کے لیے یہ صورتِ حال انتہائی اعصاب شکن تھی کہ اسے یوں اچانک وزارتِ عظمیٰ سے ہٹایا جا رہا ہے۔ اس نے بھڑک کر کہا: ’’آپ حکومت نہیں چلا سکتے۔ اور نہ ہی مجھے ہٹا سکتے ہیں۔ کیونکہ فوج میری حامی ہے۔‘‘

یہ سن کر بادشاہ نے فون کا ریسیور اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا: ’’یہ لو فون! اور فوج کو بلوا کر مجھے گرفتار کر لو۔‘‘

داؤد نے لپک کر فون لیا اور جرنیلوں کے نمبر گھمانے شروع کیے مگر کسی ایک افسر نے بھی اس وقت اس کی حمایت کا اظہار نہ کیا تب اسے احساس ہوا کہ کمیونزم کے فروغ کے لیے اب تک کی گئی کوششیں پورے طور پر کامیاب نہیں ہوئیں۔ افغانستان پر اب تک قدامت پسندی غالب ہے۔ فوج میں اب تک دین و مذہب، وطن اور بادشاہت کے خلاف باغیانہ رجحانات زیادہ پنپ نہیں سکے۔ داؤد خان بازی ہارے ہوئے جواری کی طرح ایوانِ شاہی سے نکل گیا۔ ظاہر شاہ کمیونزم کے راستے میں رکاوٹ تو نہ بن سکا تھا مگر اس کی موجودگی میں کمیونزم کی اتنی حوصلہ افزائی بھی نہیں ہو سکتی تھی جو داؤد خان اور اس کے سوویت آقاؤں کو مطلوب تھی۔ اسی دن داؤد خان نے طے کر لیا کہ وہ اب طویل اور گہری منصوبہ بندی کے ساتھ کمیونزم کے فروغ کے لیے کام کرے گا اور نتائج کا صبر و تحمل سے منتظر رہے گا۔

نیا آئین اور جمہوری ادارے: سردار داؤد کی برطرفی سے عوام دم بخود رہ گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ظاہر شاہ میں حکومت چلانے کی اہلیت نہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اب ملک کیسے چلے گا اور کون چلائے گا؟ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ظاہر شاہ کو چند اہم اقدامات کرنا پڑے۔ عوام کو مطمئن کرنے کے لیے اس نے 1964ء میں ملک کو ایک نیا آئین دیا۔ اس نئے آئین کے تحت افغانستان میں پہلی بار دو ایوانوں کی پارلیمنٹ قائم کی گئی جنہیں ’’اولسی جرگہ‘‘ (ایوانِ عام) اور ’’مشرانو جرگہ‘‘ (ایوانِ بالا) کا نام دیا گیا۔ انتظامیہ اور عدلیہ کو شامل کر کے اب نظامِ مملکت تین ستونوں پر استوار ہو گیا۔

➊...... مقننہ ➋...... انتظامیہ ➌...... عدلیہ

اس دوران سردار داؤد جمہوری و سیاسی میدان میں اُتر کر ظاہر شاہ کے خلاف صف آرا ہو چکا تھا۔ وہ ظاہر شاہ کو قدامت پسند، فرسودہ روایات کا حامل اور تعمیر و ترقی کی راہ میں رکاوٹ باور کرا رہا تھا اور شاہی

خاندان سے اپنے تعلق کو عوامی حمایت کے لیے استعمال کر رہا تھا لیکن ادھر ظاہر شاہ نے آئندہ کسی بھی حکومت میں داؤد خان کی شمولیت کو ناممکن بنانے کے لیے آئین میں ایک شق یہ بھی شامل کر دی کہ شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی فرد سیاست میں حصہ نہیں لے سکتا۔ اس اقدام کے بعد ظاہر شاہ کا خیال تھا کہ اس نے پارلیمانی ذرائع استعمال کر کے داؤد خان کو دوبارہ برسر اقتدار آنے سے روک دیا ہے مگر داؤد خان ساز باز کا ماہر تھا۔ اس نے افغانستان کی ان تنظیموں سے روابط مضبوط کیے جو سوویت یونین کی پروردہ تھیں۔ اس کے بعد وہ خفیہ طور پر ظاہر شاہ کا تختہ اُلٹنے کی منصوبہ بندی میں مصروف ہو گیا۔

انہی دنوں افغانستان کی سیاست میں سرگرم کمیونسٹوں نے اُبھر کر سامنے آنا شروع کر دیا۔ انہوں نے ''پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی'' کے نام سے جنوری 1965ء میں ایک نئی سیاسی جماعت بنا ڈالی جس کا جنرل سیکرٹری نور محمد ترہ کئی تھا۔ ببرک کارمل بھی اس کا اہم رہنما تھا۔ ستمبر 1965ء کے انتخابات میں اس پارٹی کے بہت سے افراد نے کامیاب ہو کر اسمبلی میں اپوزیشن کا کردار سنبھالا اور ظاہر شاہ کے لیے دردِ سر بنے رہے۔ 1969ء میں ایک بار پھر انتخابات ہوئے۔ ظاہر شاہ کی خواہش کے مطابق اس بار بھی کمیونسٹ حکومت نہ بنا سکے مگر اپوزیشن کی صورت میں ان کی ریشہ دوانیاں جاری رہیں۔

''خلق'' اور ''پرچم'' پارٹی: افغانستان میں کمیونسٹوں کی نمائندہ جماعت پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی اپنے قیام کے دو سال بعد 1967ء میں کئی گروہوں میں بٹ گئی تھی۔ ان میں سے دو گروہوں کی اہمیت زیادہ تھی۔ ایک ''خلق پارٹی'' کے نام سے تھا جس کا سربراہ نور محمد ترہ کئی تھا۔ دوسرا گروہ ''پرچم پارٹی'' کہلاتا تھا۔ اس کا لیڈر ببرک کارمل تھا۔ خلق پارٹی میں پختونوں کی جبکہ پرچم پارٹی میں فارسیوں اور غیر پختونوں کی اکثریت تھی۔ ان دونوں پارٹیوں نے ''خلق'' اور ''پرچم'' کے نام سے اپنے اپنے اخبارات بھی جاری کیے۔ عوام میں کمیونزم کی کاشت کا کام ان اخبارات نے بھرپور انداز میں کیا۔

قومی اسمبلی کی حالت: ادھر ظاہر شاہ کی گرفت حکومت پر کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ 1969ء میں اس کی جانب سے کرائے گئے انتخابات کے ذریعے وجود میں آنے والی اسمبلیاں عوامی توقعات پر پوری نہ اُتر سکیں۔ 33 فیصد ممبران اسمبلی ناتجربہ کار اور ان پڑھ تھے جنہیں حالات حاضرہ سے آگاہی تھی نہ سیاسی معاملات کا کوئی تجربہ تھا۔ پھر ان اسمبلیوں کی کارروائی بھی اکثر کورم پورا نہ ہونے کی وجہ سے ملتوی کر دی جاتی تھی۔ یہ نام نہاد اسمبلیاں کمیونسٹوں کے عزائم کو تقویت فراہم کرنے میں مددگار ثابت ہو رہی تھیں کیونکہ جب بھی اجلاس ہوتا، کمیونسٹ ارکان دھواں دار تقاریر کر کے اجلاس پر چھا جاتے تھے۔ کمیونسٹ اس کے ساتھ ساتھ گلی کوچوں میں نوجوانوں کو منظم کر کے حکومت کے خلاف احتجاجی جلسے جلوس اور فسادات

کرانے میں بھی مصروف تھے۔ ظاہر شاہ کے پاس اس افراتفری اور ابتری پر قابو پانے کے لیے کوئی لائحہ عمل نہ تھا۔ اس نے حالات کے خطرناک رُخ کا بروقت ادراک نہ کیا اور کمیونسٹوں کی سرگرمیوں کو روکنے میں مستعدی نہ دکھائی۔ دن گزرتے گئے، اسمبلیاں اپنی مدت پوری کرنے کے قریب پہنچ گئیں۔

داؤد خان کی سازش: یہ 1973ء تھا۔ ظاہر شاہ نے اعلان کر دیا تھا کہ اس سال عام انتخابات کے ذریعے نئی حکومت تشکیل پا جائے گی۔ عوام کو مطمئن تصور کر کے وہ جولائی میں یورپ کے دورے پر نکل گیا۔ اس کی غیر موجودگی میں داؤد خان کو اپنے کھیل کا آخری مرحلہ پورا کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے سوویت یونین سے بڑی مقدار میں جدید اسلحہ حاصل کر لیا تھا اور اپنے حق میں اس کی بھرپور حمایت کو یقینی بنا لیا تھا۔ روس کی حمایت کا لازمی اثر یہ تھا کہ روس سے تربیت حاصل کر کے آنے والے فوجی افسران جن کی تعداد اب خاصی بڑھ گئی تھی، داؤد خان کا ساتھ دیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ داؤد خان نے خلق اور پرچم پارٹیوں کو بھی ساتھ دینے پر رضامند کر لیا تھا۔

ظاہر شاہ تخت سے محروم: 17 جولائی 1973ء کو ظاہر شاہ اٹلی کا دورہ کر رہا تھا کہ یکا یک اسے اطلاع ملی کہ داؤد خان مسند اقتدار پر قابض ہو گیا ہے۔ داؤد خان نے اس دن بری فوج کے کچھ یونٹوں کی مدد سے کابل کے اہم سیاسی مراکز پر قبضہ کر لیا تھا۔ کسی کشت و خون کے بغیر چند گھنٹوں کے اندر اندر افغانستان سے بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا اور کسی نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

مآخذ و مراجع

- تاریخ افغانستان من قبیل الفتح الاسلامی الی وقتنا المعاصر۔ فاروق حامد بدر
- افغانستان در مسیر تاریخ، میر غلام محمد غبار
- Encyclopedia of Islam.V.1
- تاریخ جہاد افغانستان، ڈاکٹر ایچ بی خان
- افغانستان، ایک قوم کا المیہ، احمد شجاع پاشا
- Encyclopaedia Britannica (Afghanistan)

تیئیسواں باب

کیمونزم کے سائے، جمہوریت اور انقلابِ ثور

ظاہر شاہ کی بادشاہت یوں چپ چاپ ختم ہوگئی جیسے مغرب میں سورج ڈوب گیا ہو۔ دراصل اس آخری بادشاہ کی انتظامی کمزوری، خام فکری اور عاقبت نا اندیشی نے عوام وخواص سب کو مایوس کر رکھا تھا اس لیے انقلابیوں کو بادشاہت کے خاتمے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ اب جمہوریت کا سورج تعمیر وترقی کی کرنیں لٹاتا ہوا طلوع ہوگا۔ شروع شروع میں واقعی ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔

17 جولائی 1973ء کو داؤد خان نے حکومت سنبھالتے ہی ریڈیو پر قوم کے نام اپنے پیغام میں کہا کہ ملک سے بادشاہت کا خاتمہ کر دیا گیا ہے اور اب ''ریپبلک جمہوری نظام'' صحیح معنوں میں نافذ کیا جا رہا ہے جو ''اسلامی روح'' کے عین مطابق ہوگا۔ اس نے عوام سے ''حقیقی جمہوریت، سماجی اصلاحات، انصاف ومساوات، خوشحال معیشت اور تعلیمی انقلاب'' جیسے خوش کن وعدے بھی کیے۔ مگر داؤد خان کے عزائم جو بھی تھے، ڈھکے چھپے نہ تھے۔ وہ کیمونزم کا پیروکار تھا اور افغانستان کو اس رنگ میں رنگنا چاہتا تھا۔ بادشاہت کا خاتمہ کرکے اس نے افغانستان کو سیاسی طور پر مستقل انتشار کی کھائی میں گرا دیا تھا۔

پاکستان مخالف بیانات: سردار داؤد خان کے اقتدار کا آغاز پاکستان دشمنی کے جذبات کے اظہار کے ساتھ ہوا۔ اس نے اپنی ابتدائی تقاریر میں کہا کہ پاکستان وہ واحد ملک ہے جس کے ساتھ افغانستان کا تنازعہ ہے۔ پھر ایک پریس کانفرنس میں اس نے ''آزاد پختونستان'' کے مسئلے کو ''ایک ناقابلِ تردید حقیقت'' کا عنوان دیا۔

17 اگست 1973ء کو افغانستان کے ڈپٹی وزیر خارجہ نے کابل میں پاکستانی سفیر سے ملاقات کرکے پاکستان کی سیاسی جماعت عوامی نیشنل پارٹی کے رہنماؤں خان عبدالغفار خان، خان عبدالولی خان اور دیگر سرخ پوش رہنماؤں کی گرفتاری پر تشویش کا اظہار کیا۔ یہ لیڈر پختونستان کا مسئلہ کھڑا کرکے حکومتِ پاکستان کے لیے مشکلات پیدا کر رہے تھے جبکہ نئی افغان حکومت اس قسم کے مسائل اُٹھانا چاہتی تھی۔ اس کے چند دن بعد 26 اگست 1973ء کو افغانستان کے یوم آزادی کی تقریب سے خطاب

کرتے ہوئے داؤد خان نے پختونستان کو اپنا "قومی مسئلہ" قرار دیا۔

علیحدگی پسندوں کی تربیت: داؤد خان نے صرف بیان بازی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سرحد اور بلوچستان کے علیحدگی پسند عناصر کو اپنی حمایت کا یقین دلاتے ہوئے ان صوبوں میں افراتفری اور بدامنی پھیلانے کی کوشش بھی کی۔ حکومتِ پاکستان کا یہ بھی کہنا تھا کہ داؤد خان ان دونوں صوبوں میں ایک عوامی جنگ شروع کرنے کے لیے پندرہ ہزار سے زائد پختونوں اور بلوچوں کو عسکری تربیت دے رہا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو کی جوابی چال: پاکستان مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے صدمے سے ابھی تک نہیں سنبھل سکا تھا، اس لیے افغانستان کی روس نواز حکومت کی یہ کارروائیاں اس کی سالمیت کے لیے ازحد خطرناک تھیں۔ وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو نے بڑی سنجیدگی سے اس کا نوٹس لیا اور داؤد خان کو لگام دینے کے لیے سیاسی دباؤ استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ افغانستان کی اسلام پسند جماعتوں کا تعاون حاصل کرنے کی بھی کوشش کی۔

افغانستان میں اس وقت علمائے کرام اور دین دار طبقے نے الحاد ولادینیت کی اشاعت کی ان کوششوں کو جو کہ سرکاری سرپرستی میں جاری وساری تھیں بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مملکت کے کمیونزم کی طرف مسلسل جھکاؤ سے اسلام کو بے حد خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔ اس لیے وہ حکومت کے خلاف مسلح جہاد کی تیاریاں کرنے لگے تھے۔ حکومت کی جانب سے ان میں سے بہت سے گرفتار اور بہت سے جلاوطن کر دیے گئے تھے۔ کئی اہم شخصیتیں حکومتی عتاب سے بچنے کے لیے سرحد پار آ گئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ افغانستان پر کمیونزم کے سرخ بادل منڈلاتے دیکھ کر بعض افغان رہنما 1973ء میں یعنی ظاہر شاہ کے آخری ایام ہی میں ہتھیار اُٹھا چکے تھے۔ جہاد فی سبیل اللہ کا اعلان کر کے وہ پہاڑوں اور وادیوں کو اپنا مسکن بنا چکے تھے اور ان کی جانب سے سرکاری اہداف پر وقفے وقفے سے حملے جاری تھے۔ مگر ان کارروائیوں کا کوئی خاص اثر نہیں پڑ رہا تھا۔ ان میں باقاعدگی اس وقت پیدا ہوئی جب 1974ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے سردار داؤد خان کی پاکستان دُشمنی پالیسی سے مجبور ہو کر اسے اسی کی زبان میں جواب دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ سرحد اور بلوچستان میں علیحدگی پسندوں کی سرپرستی کی افغان سازشوں کے جواب میں ان جماعتوں کی حمایت شروع کر دی گئی جو افغان حکومت کے خلاف ہتھیار اُٹھا چکی تھیں۔ ان میں گلبدین حکمت یار کی حزبِ اسلامی اور مزید چند تنظیمیں نمایاں تھیں۔ یہ جماعتیں افغانستان کو ایک اسلامی مملکت کے طور پر دیکھنا چاہتی تھیں۔

اسلام پسند تنظیموں کی کارروائیاں: ذوالفقار علی بھٹو کی پالیسی کامیاب رہی۔ جب بھی کابل سے

پاکستان کے خلاف بیان بازی شروع کی جاتی یا پختونستان کا مسئلہ اُٹھایا جاتا افغانستان میں اسلام پسند تنظیموں کی کارروائیاں شدت اختیار کر جاتیں اور یوں داؤد خان کو پریشان ہو کر خاموشی اختیار کرنا پڑتی۔ ان تنظیموں کے بہت سے رہنما ہجرت کر کے پشاور منتقل ہو گئے تھے اور حکومت پاکستان کی جانب سے ان کو پناہ مہیا کی گئی تھی۔ کابل یونیورسٹی کے اسلام پسند طلبہ و اساتذہ کی ایک بڑی تعداد بھی ان دنوں حکومتی پکڑ دھکڑ سے بچنے اور اندرونِ افغانستان تحریک کو منظم کرنے کی تیاریاں کرنے پشاور چلی آئی تھی۔ انہی تنظیموں کی جانب سے 21 جولائی 1975ء کو سردار داؤد خان کی حکومت کے خلاف انقلاب برپا کرنے کی ایک بڑی کوشش کی گئی جس کا آغاز پکتیا میں زبردست مسلح کارروائیوں سے ہوا۔ داؤد خان نے بھرپور عسکری طاقت استعمال کر کے اس کوشش کو ناکام بنا دیا مگر اس دوران اسے دانتوں پسینہ آ گیا۔

داؤد خان کی کایا پلٹ تبدیلی: داؤد خان کو یہ محسوس ہوا کہ پاکستان اور دیگر ہمسایوں سے مخاصمت مول لینا صریح حماقت ہے اور افغانستان کو مکمل طور پر سوویت رُوس سے وابستہ رکھنا اور دیگر ممالک سے تعلقات بگاڑنا کبھی سودمند ثابت نہیں ہو سکتا۔ داؤد خان یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ پاکستان کے خلاف اب تک کی گئی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی ہے کیوں کہ افغانستان اور قبائلی علاقوں میں اثر و رسوخ رکھنے والے علماء پاکستان کا احترام کرتے ہیں اور دونوں ملکوں میں برادرانہ جذبات کے فروغ کے خواہاں ہیں۔ یورپی اخبارات کی رپورٹیں اس کی گواہ تھیں کہ قبائلی اور سرحدی پٹھان پختونستان کے مسئلے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

ان حقائق کے پیشِ نظر داؤد خان نے آہستہ آہستہ پاکستان سے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ ایران سے بھی افغانستان کے تعلقات بہتر نہیں تھے۔ داؤد خان اس سے تعلقات قائم کرنے پر بھی غور کرنے لگا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ اب ''غیر متصادم بقائے باہمی'' کا تین فریقی سمجھوتہ کیا جائے جس میں افغانستان، پاکستان اور ایران شامل ہوں۔ اس تین فریقی معاہدے میں داؤد خان تین باتیں طے کرنا چاہتا تھا:

① ڈیورنڈ لائن کو تسلیم کر لیا جائے۔ (جسے اب تک داؤد خان اور اس سے پہلے ظاہر شاہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے)

② حکومت پاکستان عوامی نیشنل پارٹی کے رہنماؤں اور دیگر پختون علیحدگی پسند لیڈروں کو، جن کا افغانستان سے گہرا تعلق تھا، رہا کر دے۔

③...... ایران افغانستان کو مالی امداد فراہم کرے۔

شاہ فیصل مرحوم کا کردار: کہا جاتا ہے کہ داؤد خان کی سوچ میں اس مثبت تبدیلی کے پس پردہ سعودی

حکام کا جذبۂ اخوت بھی کارفرما تھا۔ پاکستان اور افغانستان کے تعلقات میں بڑھتی ہوئی کشیدگی اور دونوں ملکوں کی ایک دوسرے کی حدود میں مبینہ مداخلت سے سعودی حکمران شاہ فیصل مرحوم کو سخت تشویش لاحق تھی۔ چنانچہ انہوں نے دباؤ ڈال کر دونوں ملکوں کو تعلقات بہتر بنانے پر آمادہ کیا۔ اس مصالحت میں تیسرے پڑوسی ایران کو بھی شامل کرنا مفید سمجھا گیا۔ ایران میں ان دنوں رضا شاہ پہلوی کی حکومت تھی جس نے معاہدے کے مطابق بعد میں افغانستان کو خاصی مالی امداد مہیا بھی کی۔

ایران کی مداخلت: ایران کی جانب سے دی جانے والی امداد یقیناً پس ماندہ افغانستان کے لیے سودمند تھی مگر اس کے پسِ پردہ ایران کے اپنے خفیہ مفادات بھی تھے۔ ایک طرف تو باہمی تعلقات میں بہتری کے باعث ایران اور افغانستان میں پانی کی تقسیم کا تنازع حل ہو گیا تھا پھر ایک ایشیائی مشترکہ منڈی کے قیام، ایران و افغانستان کے درمیان ریلوے لائن بچھانے اور ایشیائی ممالک کو ملانے والی عظیم شاہراہ تعمیر کرنے کے منصوبوں پر بھی غور ہونے لگا مگر اس کے ساتھ ساتھ ایران کی خفیہ ایجنسی ''ساواک'' بھی افغانستان میں سرگرم عمل ہو گئی۔ ساواک کے ایجنٹ افغانستان کے تجارتی نظام اور مالیاتی شعبوں پر حاوی ہونے لگے اور یوں ایران کو ایک طویل مدت بعد افغانستان میں مداخلت کا راستہ مل گیا۔

افغانستان کو روسی بلاک سے نکالنے کی کوششیں: افغانستان، پاکستان اور ایران کی بھائی بندی میں امریکا کا بھی کردار تھا جو روس کے بڑھتے ہوئے قدموں سے خوفزدہ تھا۔ چنانچہ اس کی کوشش تھی کہ افغانستان کو روسی بلاک سے کسی نہ کسی طرح نکالا جائے۔ اس مقصد کے لیے امریکا نے شاہ ایران کی (جو امریکا کا بڑا مراعات یافتہ حکمران تھا) حوصلہ افزائی کی کہ وہ افغانستان سے تعلقات مزید بہتر بنائے اور اسے مالی امداد فراہم کرتا رہے۔

بہرحال! بیرونی دنیا کی جانب سے جاری ان کوششوں کا افغانستان پر خاصا اثر پڑا، داؤد خان نے 1976ء میں اپنی خارجہ پالیسی میں تبدیلی کا آغاز کیا۔ جون 1976ء میں اس نے وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کی اور دونوں رہنما ایک دوسرے کی جانب سے مطمئن ہو گئے۔ داؤد خان نے پاکستان مخالف بیانات دینا بند کر دیے اور ذوالفقار علی بھٹو نے افغانستان میں سرگرم اسلامی تنظیموں اور حریت پسند جماعتوں کی حرکات و سکنات پر پاکستان میں پابندیاں عائد کر دیں۔

داؤد خان کمیونسٹوں کا مخالف بن گیا: ادھر داؤد خان نے حکومت سے ان افراد کو چن چن کر الگ کرنا شروع کر دیا جو سوویت یونین کے منظور نظر تھے۔ داؤد خان نے دیکھ لیا تھا کہ یہ لوگ کارکردگی میں صفر ہیں اور ان کی وفاداریاں کسی بھی وقت تبدیل ہو سکتی ہیں۔ اس نے 1977ء میں نئی کابینہ تشکیل دی جس

میں اپنے دوستوں اور سابق شاہی خاندان کے افراد کو بطور خاص شامل کیا گیا۔ اس نے ایک نیا آئین بھی پیش کیا جس کے تحت ملک میں صرف ایک سیاسی پارٹی کام کر سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے خود ''قومی انقلابی پارٹی'' کے نام سے ایک سیاسی جماعت تشکیل دے ڈالی اور دیگر تمام سیاسی جماعتوں کو جن میں کمیونسٹ پارٹیاں ''خلق'' اور ''پرچم'' بھی شامل تھیں، کالعدم قرار دے دیا۔

ان اقدامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ داؤد خان نے اب سوویت روس اور کمیونزم کا اصل مکروہ چہرہ دیکھ لیا تھا اور کسی نہ کسی طرح اس چنگل سے خود کو اور ملک و قوم کو نکالنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ روس کی جگہ وہ باقی دنیا سے تعلقات بہتر بنانے اور فائدہ حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھا۔ اس نے روس پر انحصار ختم کر کے آب پاشی، ٹیکسٹائل ملز اور دیگر منصوبوں کے لیے چین سے امداد حاصل کرنا شروع کر دی۔ نیز امریکا سے بھی اسے امداد ملنے لگی جو روس کے پھندے سے اس کی آزادی کی کوشش کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔

سوویت یونین کا پیچ و تاب: سوویت یونین کا داؤد خان کی بدلتی ہوئی پالیسیوں پر چیں بہ جبیں ہونا لازمی امر تھا۔ افغانستان کے ایوانِ اقتدار سے کمیونسٹوں کا اخراج اور پاکستان و ایران سے دوستانہ مراسم کی ابتدا داؤد خان کے وہ ''سنگین جرائم'' تھے جنہیں ماسکو کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ 1977ء کے وسط میں داؤد خان کا تختہ اُلٹنے کی سازشیں شروع ہو گئیں۔ سوویت روس کی کمیونسٹ پارٹی نے اس مقصد کے لیے بھارت کی کمیونسٹ پارٹی کو بھی استعمال کیا۔ ان کی کوششوں کا پہلا ہدف یہ تھا کہ افغانستان کی دونوں کمیونسٹ پارٹیوں ''خلق'' اور ''پرچم'' کو متحد کر دیا جائے۔ یہ کوششیں کامیاب ہوئیں اور جولائی 1977ء میں ''خلق'' اور ''پرچم'' نے داؤد خان کو اقتدار سے مٹانے کی خاطر آپس میں اتحاد کر لیا۔

داؤد خان کے بیرونی دورے: اس دوران داؤد خان اپنی نئی پالیسیوں پر بدستور عمل پیرا رہا۔ جولائی 1977ء میں پاکستان میں فوجی انقلاب آیا۔ فوج نے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو حراست میں لے لیا اور جنرل ضیاء الحق چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔ تاہم افغانستان اور پاکستان کے تعلقات متاثر نہ ہوئے بلکہ ان میں مزید بہتری آئی۔ جنرل ضیاء الحق نے اقتدار سنبھالنے کے تیسرے ماہ کابل جا کر داؤد خان سے ملاقات کی جس کا مقصد دونوں ملکوں میں اعتماد کو برقرار رکھنا تھا۔ اس کے کچھ عرصے بعد 1978ء کے موسم بہار میں داؤد خان نے پاکستان، بھارت، لیبیا، مصر، ترکی، یوگوسلاویہ، سعودی عرب اور کویت کے دورے کیے۔ ساتھ ہی جلد امریکا جانے کا اعلان بھی کیا۔ دراصل وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے اسلامی ممالک اور امریکا سے تعلقات استوار نہ کیے تو اس کی کرسی ڈگمگاتی رہے گی اور سوویت یونین بڑی آسانی سے اسے اقتدار سے علیحدہ کرنے کے لیے کوئی بھی کارروائی کر گزرے گا۔

اپریل 1978ء میں سعودی عرب کے دورے میں داؤد خان نے صومالیہ اور ایتھوپیا کے تنازع کو جلد حل کرنے سے متعلق ایک مشترکہ اعلامیہ پر دستخط بھی کیے تھے۔ چونکہ ایتھوپیا روس کا حلیف اور یوگنڈا کے صومالوی مسلمانوں کے حقوق آزادی کا غاصب تھا، اس لیے داؤد خان کا یہ اقدام ایتھوپیائی حکومت کے ساتھ ساتھ روس کو بھی سخت ناگوار گزرا اور اس نے افغانستان میں اپنی پروردہ کیمونسٹ پارٹیوں اور فوج کے کیمونسٹ افسران کو داؤد خان کا تختہ اُلٹنے کے لیے ''گرین سگنل'' دے دیا۔

میر اکبر کا قتل، نئی سازش: داؤد خان سعودی عرب کے دورے سے واپس آیا ہی تھا کہ اس کے خلاف دھڑن تختہ ڈرامے کا آغاز ہوگیا۔ اس کی پہلی قسط 17 اپریل کو دیکھی گئی جب پرچم کیمونسٹ پارٹی کے اخبار ''پرچم'' کے ایڈیٹر میر اکبر کو کابل میں اچانک قتل کردیا گیا۔ کیمونسٹوں نے آن کی آن میں یہ بات دارالحکومت کے طول وعرض میں پھیلادی کہ اس نامور صحافی کو داؤد خان نے اپنے نئے سرپرست امریکا کی خوشنودی کی خاطر قتل کروایا ہے۔ ''میر اکبر'' کا افغانستان کی شہری آبادی خصوصاً کیمونسٹوں میں بڑا نام تھا۔ ہزاروں لوگ اس کے جنازے میں شریک ہوئے اور پھر اس اجتماع نے احتجاجی جلوس کی شکل اختیار کرلی۔ مظاہرین داؤد خان اور امریکا پر فردِ جرم عائد کررہے تھے۔ ان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ اسی حالت میں وہ امریکی سفارت خانے کے سامنے پہنچ گئے اور شدید نعرے بازی کی۔

کریک ڈاؤن: اس کے بعد آٹھ نو دن تک حالات معمول پر نہ آسکے۔ یہ دیکھ کر 26 اپریل کو داؤد خان نے کیمونسٹ رہنماؤں کے خلاف کریک ڈاؤن شروع کردیا کیونکہ وہی حکومت مخالف جذبات کو ہوا دے رہے تھے۔ ببرک کارمل اور نور محمد ترہ کئی کے ساتھ ایک اور بڑے کیمونسٹ لیڈر حفیظ اللہ امین کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ تاہم ایک سنگین کوتاہی یہ ہوئی کہ کیمونسٹ افسرانِ فوج کو گرفتار نہ کیا گیا۔ 27 اپریل کی صبح 10 بجے داؤد خان نے کابینہ کا اجلاس طلب کرلیا تاکہ حالات کے نئے رُخ پر مشورہ کیا جاسکے۔ اجلاس میں گرما گرم بحث جاری تھی۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ حکومت کے خلاف زیرِ زمین سازش کس حد تک آگے بڑھ چکی ہے۔

فوج حرکت میں آگئی: دراصل کیمونسٹ رہنماؤں نے گرفتاری سے پہلے فوج کے کیمونسٹ افسران سے رابطے کرکے انہیں اعتماد میں لے لیا تھا۔ چنانچہ اگلے دن ایوانِ صدر میں کابینہ کا اجلاس شروع ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے ہی کابل کے مشرق سے بکتر بند بریگیڈ کے ٹینکوں نے حرکت شروع کردی تھی جن کی کمان کیپٹن اسلم وطن یار کررہا تھا۔ ادھر کرنل عبدالقادر نے بگرام ایئرپورٹ کو سنبھال لیا تھا۔ اسلم وطن یار نے پہلے کابل کے ہوائی اڈے پر قبضہ کیا، گیارہ بجے اس نے وزارتِ دفاع کی عمارت کو تحویل میں لے لیا تھا۔ پھر 12 بجے وہ ٹینکوں کے ساتھ ایوانِ صدر پہنچا اور داؤد خان کو گرفتاری کا حکم دیا مگر

ایوانِ صدر کے محافظوں نے جوابی کارروائی شروع کردی اور یوں ایک خونریز جنگ کا آغاز ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی کابل میں بھگدڑ مچ گئی، بازار بند ہو گئے اور لوگ بھاگ بھاگ کر محفوظ مقامات میں پناہ لینے لگے۔ اس کے باوجود دو طرفہ فائرنگ کی زد میں آکر بہت سے شہری مارے گئے۔

داؤد خان کو قتل کر دیا گیا: کئی گھنٹوں تک یہ لڑائی جاری رہی۔ صدر داؤد کے 1800 محافظ ایوانِ صدر خالی کرنے اور ہتھیار ڈالنے پر تیار نہ ہوئے۔ جب ٹینک ناکام ہو گئے تو سہ پہر کے وقت فضائیہ کو طلب کر لیا گیا۔ چنانچہ مگ 21 طیاروں نے ایوانِ صدر پر اندھا دھند بمباری شروع کر دی جس سے کئی سو محافظ ہلاک ہو گئے اور ایوانِ صدر پر باغیوں نے قبضہ کر لیا۔ افغان فضائیہ نے جس سرعت اور مہارت سے ایوانِ صدر پر حملے کیے تھے اسے دیکھتے ہوئے کابل میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ ان طیاروں کو افغان نہیں بلکہ روسی پائلٹ اُڑا رہے ہیں۔ تاہم اس بات کی کسی ذریعے تصدیق نہ ہو سکی۔

شام کے وقت باغی گرفتار شدہ کمیونسٹ رہنماؤں کو رہا کرا چکے تھے اور کابل ریڈیو سے ''انقلاب'' کا اعلان ہو رہا تھا۔ داؤد خان کا انجام بہت بُرا ہوا۔ کمیونزم کو راہِ نجات سمجھنے اور کمیونسٹوں کو اقتدار میں شامل کرنے والا افغانستان کا یہ حکمران آخر کار کمیونسٹوں ہی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ محل میں موجود اس کے خاندان کے تمام افراد حتیٰ کہ عورتوں اور بچوں کو بھی بڑی بے رحمی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔

کمیونسٹوں نے اگلے دن افغانستان میں ''انقلابی کونسل'' قائم کرنے کا اعلان کیا اور دعویٰ کیا کہ اس کونسل کی طاقت کا منبع عوام ہیں اور یہ کونسل افغانستان کی آزادی اور اسلامی روایات کے تحفظ کی ضامن ہے۔

انقلابِ ثور: اس انقلاب کو ''انقلابِ ثور'' کا نام دیا گیا۔ دنیا ششدر ہو کر افغانستان میں اس کایا پلٹ کو دیکھ رہی تھی۔ کسی کو توقع نہ تھی کہ قدامت پسند مسلمانوں کا مرکز سمجھا جانے والا یہ ملک اس طرح کمیونزم کا داعی بن جائے گا۔ خود امریکا کو بھی اس کا صحیح اندازہ نہ تھا ورنہ وہ اس انقلاب کو روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا۔

30 اپریل 1978ء کو ''انقلابی کونسل'' کی جانب سے نور محمد ترہ کئی کو افغانستان کا وزیراعظم مقرر کر دیا گیا اور افغانستان کو ''ڈیموکریٹک ریپبلک آف افغانستان'' کا نام دیدیا گیا۔ انقلاب کا دوسرا بڑا لیڈر ببرک کارمل نائب وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہوا جبکہ حفیظ اللہ امین کو ڈپٹی وزیراعظم اور وزیرِ خارجہ کا منصب دیا گیا۔

ترہ کئی کون تھا؟ نور محمد ترہ کئی جو اب افغانستان کا پہلا کمیونسٹ حکمران تھا، غزنی کے ایک پختون چرواہے کے گھر پیدا ہوا تھا۔ وہ بڑے فخر سے بتاتا تھا کہ اس کا سن پیدائش 1917ء ہے جو کہ بالشویک انقلاب کی کامیابی کا سال ہے۔ وہ لڑکپن میں پھل درآمد و برآمد کرنے والی ایک کمپنی میں ملازم ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نائٹ کلاسز میں اسکول بھی پڑھتا رہا اور میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ اس کمپنی کے توسط سے اسے

بمبئی جانے کا موقع ملا جہاں اس کی ملاقات کمیونسٹوں سے ہوئی اور وہ باقاعدہ مارکسزم کا پیروکار بن گیا۔

وطن واپس آ کر کئی سال تک وہ مختلف سرکاری محکموں میں معمولی قسم کی ملازمتیں کرتا رہا۔ وہ مطالعے کا شوقین اور مغربی و روسی ادب کا رسیا تھا۔ 31 سال کی عمر میں اس نے ''بیدار نوجوان'' نامی ایک تحریک شروع کی اور ''انگارا'' کے نام سے اس کا جریدہ بھی شائع کرنے لگا۔ 1955ء میں اسے کابل کے امریکی سفارت خانے میں ملازمت مل گئی۔ ساتھ ساتھ انقلابی تصانیف کا سلسلہ بھی جاری رہا اور یوں وہ کمیونزم کے پیروکار جدید تعلیم یافتہ طبقے کے رہنماؤں میں شامل ہو گیا۔ آہستہ آہستہ کمیونسٹ منظم ہوتے گئے اور جب 1965ء میں کمیونسٹ پارٹی قائم ہوئی تو ترہ کئی اس کا پہلا جنرل سیکرٹری مقرر ہوا۔ کچھ عرصے بعد ببرک کارمل سے اختلاف کے باعث پارٹی تقسیم ہوئی تو ترہ کئی نے ''خلق'' اور کارمل نے ''پرچم'' کے نام سے الگ الگ پارٹیاں بنالیں۔ بعد میں داؤد خان کو ہٹانے کے لیے دونوں پارٹیاں پھر متحد ہو گئیں اور یوں نئی حکومت میں ان دونوں کا حصہ تھا۔

<u>ترہ کئی کی پالیسیاں:</u> کمیونسٹوں کا شروع سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ کسی بھی مقام پر گرفت مضبوط کرنے کے لیے سب سے پہلے عوام کو دھوکا دیتے ہیں، انہیں غربت اور افلاس کے خاتمے اور تعمیر و ترقی کے نئے دور کے آغاز کا مژدہ سناتے ہیں۔ نیز ابتدا میں انہیں مذہب کے حوالے سے بھی اعتماد میں لیتے ہیں اور خود کو مذہب دوست باور کراتے ہیں۔ مگر آہستہ آہستہ ملک میں لادینیت، الحاد اور اپنے مخصوص نظریات کو فروغ دے کر عوام کو دین و مذہب سے بہت دور لے جاتے ہیں۔ اس کے بعد بھی جو لوگ دین پر ثابت قدم رہیں، کمیونسٹ انہیں قطعاً برداشت نہیں کرتے بلکہ ان پر جگر دوز مظالم ڈھا کر انہیں نمونہ عبرت بنا دیتے ہیں۔

ترہ کئی نے بھی یہی کچھ کیا۔ ''انقلابِ ثور'' کے دو ہفتے بعد 7 مئی کو اس نے اعلان کیا: ''ملک کی اساس اسلام ہو گی۔'' مگر اس کے ساتھ ساتھ ''انقلابِ ثور'' کا بھیانک چہرہ افغان مسلمانوں کے سامنے آتا جا رہا تھا۔ ملک میں جگہ جگہ گرفتاریاں جاری تھیں۔ بڑے بڑے معزز لوگوں کو بے دریغ قتل کیا جا رہا تھا۔ داؤد خان کو اس کے خاندان سمیت مشین گنوں کی فائرنگ سے بھون ڈالا گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد اس کی کابینہ کے تمام اہم وزراء کو بھی پھانسی دے دی گئی تھی۔ یہ سب لوگ سابق شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مئی کے پہلے عشرے میں سابق حکومت کے سینکڑوں اعلیٰ عہدے داروں کو برطرف کر دیا گیا جن میں فوجی حکام، سویلین افسران اور سفارتی نمایندے بھی شامل تھے۔

ترہ کئی کی کوشش تھی کہ وہ کمیونزم کی کاشت مکمل ہونے تک نئی حکومت پر ''کمیونسٹ'' کی چھاپ نہ لگنے دے اور اسے غیر جانبدار باور کراتا رہے۔ مگر سوویت روس کے ساتھ اس کے تعلقات کوئی ڈھکے چھپے نہ

تھے۔ اس کی کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی کوئی راز نہ تھی۔ خلق اور پرچم کے نظریات عوام وخواص کے سامنے تھے۔ اس لیے افغان عوام اس جھانسے میں نہ آئے۔

سوویت یونین سے ناقابل شکست رشتہ: ترہ کئی کی پشت پر سوویت یونین کی حمایت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ "انقلاب ثور" کے فوراً بعد دنیا کے تمام ممالک میں سے سب سے پہلے روس نے نئی حکومت کو تسلیم کیا۔ پھر انقلاب کے صرف تین ہفتے بعد ہم وزیر خارجہ حفیظ اللہ امین کو ماسکو کے دورے پر دیکھتے ہیں جہاں وہ یہ اعلان کرتا ہے: افغانستان اپنے عظیم ہمسائے سوویت یونین کے ساتھ ناقابل شکست برادرانہ رشتے میں منسلک ہے۔

احمقانہ اصلاحات: اس کے ساتھ ساتھ کمیونسٹ حکومت نے ملک میں کئی "اصلاحات" متعارف کرائیں۔ مثلاً سولہ سال سے کم عمر لڑکیوں کی شادی ممنوع قرار دی گئی۔ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دینے کا اعلان کیا گیا۔ ملک کا سبز پرچم تبدیل کر کے سرخ پرچم متعارف کرایا گیا جو واضح طور پر کمیونزم کی علامت ہے۔ ان اصلاحات کو عوام نے سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ بعض اصلاحات بظاہر پرکشش تھیں۔ مثلاً: شادی کے موقع پر دلہن کے بدلے کسی قسم کی رقم لینے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ کسانوں کے وہ قرضے معاف کر دیے گئے جو انہوں نے زمین داروں سے لیے تھے۔ زمین سے محروم کسانوں کو کہا گیا کہ وہ بڑے زمین داروں کی زمین پر قبضہ کر لیں۔ انہیں مالکانہ حقوق جاری کر دیے گئے اور کاغذات بنا کر دے دیے گئے۔ مگر اکثر کسانوں نے ان کاغذات کو پھاڑ دیا کیوں کہ وہ جانتے تھے کسی کی زمین پر جبراً قبضہ کرنا خلاف شریعت ہے۔ جب کسانوں کو اس پر زیادہ مجبور کیا گیا تو وہ زراعت سے متنفر ہونے لگے۔ انہی اصلاحات کے مطابق ثقافتی اور نسلی اقلیتوں کے حقوق تسلیم کیے گئے۔ نسلی اقلیتوں کو عام شہریوں کے برابر حقوق مہیا کرنے کا اعلان کیا گیا۔ چونکہ یہ تمام تبدیلیاں کمیونسٹوں کی جانب سے سامنے لائی جارہی تھیں اس لیے عوام انہیں شک وشبہے کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے بیشتر احکام شریعت اسلامیہ کے خلاف تھے۔ بلکہ غور کرنے پر ان میں سے اکثر معقول احکام کے پس پردہ بھی کوئی نہ کوئی سازشی عنصر کارفرما دکھائی دیتا ہے جس سے کمیونزم کے لیے راستہ ہموار ہوتا ہے۔ جیسا کہ کسانوں کو زمین فراہم کرنے اور ان کے قرضے معاف کرنے کا مقصد یہ تھا کہ انہیں ممنونِ احسان کر کے کمیونزم کی "مساوات" کا قائل کیا جائے اور یوں رفتہ رفتہ انہیں کمیونسٹ بنا لیا جائے۔ اس قسم کی اکثر زرعی اصلاحات جو کسانوں کے لیے پرکشش اور زمین داروں پر ضرب کاری تھیں، انجام کار شدید نقصان دہ ثابت ہوئیں۔ زمین داروں کے جائز حقوق بھی سلب ہو گئے اور ملک میں زراعت سے دلچسپی کا رجحان ختم ہونے لگا۔ اکثر

زمین داروں نے یا تو اپنے کسانوں کی وہ مراعات ختم کر دیں جو کسی قانون کے تحت نہیں آتی تھیں۔ مثلاً: بیج، آلاتِ زراعت، پانی کی فراہمی وغیرہ۔ یا انہوں نے یہ شعبہ ہی ترک کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا ملک زراعت کے میدان میں عشروں پیچھے چلا گیا۔ اناج میں خودکفیل افغانستان غلے کی درآمد پر مجبور ہو گیا۔

یقین دہانیاں اور دھمکیاں: کمیونسٹوں کے خلاف عوامی نفرت بتدریج بڑھ رہی تھی اور ارزگان، نیمروز، ہلمند اور غور جیسے دور دراز کے دیہاتوں میں مزاحمت کی چنگاریاں سلگنے لگی تھیں۔ ترہ کئی نے قبائلی رہنماؤں کو مطمئن کرنے کے لیے ڈپلومیسی سے کام لیا۔ جون کے اواخر میں اس نے ملک بھر کے سرداروں اور عمائد کو جمع کر کے انہیں کہا کہ حکومت نیک عزائم کی تکمیل کے لیے ان کا تعاون چاہتی ہے۔ کسان، مزدور اور اہلِ علم سب کو انقلاب کا ساتھ دینا چاہیے۔ خارجہ پالیسی کے حوالے سے اس نے کہا کہ افغانستان بہرحال غیر جانبدار ہے۔ سوویت یونین سے امداد لینے کا یہ معنیٰ لینا غلط ہے کہ افغانستان سوویت بلاک کا حصہ بن جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اسلام پسند طبقات کو دھمکاتے ہوئے کہا:

''جو لوگ اس کے باوجود حکومت کی مخالفت کریں گے انہیں سنگین سزا دی جائے گی۔''

ببرک کارمل برطرف، نت نئی فریب کاریاں: اس کے ساتھ ساتھ ترہ کئی نے اپنی کرسی کو مضبوط بنانے کے لیے دیگر کمیونسٹ پارٹیوں کو کمزور کرنے کے اقدامات بھی شروع کر دیے۔ اس نے پرچم پارٹی کا وجود تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ببرک کارمل کو برطرف کر کے جلاوطن کر دیا مگر اس طرح اس کی پوزیشن مضبوط نہ ہوئی بلکہ اس کے مخالفین میں اضافہ ہوتا گیا۔ ترہ کئی جانتا تھا کہ ملک میں فوراً روسی طرز کا کمیونزم نافذ نہیں ہو سکتا اس لیے اس نے لینن کی بہت سی ''اصلاحات'' پر عملدرآمد کو ملتوی رکھا۔ اس نے ایک نئے قسم کا کمیونزم متعارف کرانے کی کوشش کی جو بظاہر ''اسلام دوست'' دکھائی دیتا۔ اس سلسلے میں اس نے کچھ ہلکے پھلکے اقدامات کیے جو بظاہر غیر مضر اور ہر طبقے کے لیے قابلِ قبول تھے۔

اس نے ''کامریڈ'' کے لفظ کو فروغ دے کر لوگوں کو کمیونسٹ ثقافت کے قریب لانا چاہا۔ (''کامریڈ'' کا لفظی معنیٰ دوست یا ساتھی ہیں مگر کمیونسٹ اس لفظ کو اپنے ہم فکر و ہم نظر افراد کے لیے استعمال کرتے ہیں تا کہ وہ محفلوں اور مجلسوں میں غیر کمیونسٹوں سے ممتاز رہیں) مگر عوام میں یہ تبدیلیاں پنپ نہ سکیں۔ بڑھتی ہوئی عوامی نامقبولیت کو دیکھتے ہوئے ترہ کئی نے بار بار یہ بیانات دیے کہ ہم مذہبی آزادی کے قائل ہیں۔ اس نے افغانستان کے سابق سبز پرچم کو بھی جزوی طور پر دوبارہ بحال کر دیا مگر اس کے ساتھ ساتھ عمومی طور پر سرخ پرچم ہی استعمال ہوتا رہا۔

حقیقت چھپ نہ سکی: ظاہر ہے مذہب پسند عوام کو اس طرح دھوکے میں رکھنا ناممکن تھا۔ افغان عوام

سوویت یونین سے ہجرت کر کے افغانستان آنے والے ہزاروں تاجکوں، ازبکوں، ترکمانوں اور کرغیزیوں کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ یہ لوگ سوویت یونین کے اسلام دشمن اقدامات اور لرزہ خیز مظالم سے تنگ آ کر ہجرت پر مجبور ہوئے تھے۔ ان علاقوں کے مہاجر علمائے دین افغان عوام کو آگاہ کر رہے تھے کہ اگر انہوں نے کمیونزم کا راستہ نہ روکا تو کل ان کا حشر وسط ایشیا کے بے کس مسلمانوں جیسا ہی ہوگا۔

ترہ کئی سراپا جنگ: آخر ترہ کئی انتہائی اقدامات پر اُتر آیا۔ بندگانِ خدا کا خون بہانا اس کے لیے ایسا ہی آسان اور خوش گوار تھا جیسا ہر ملحد کمیونسٹ کے لیے۔ حکومت سنبھالتے ہی اس نے سابق صدر داؤد خان کے ہزاروں حامیوں کو فوج کے ہاتھوں قتل کروایا تھا۔ اب وہ کھلم کھلا مذہبی طبقے کے خلاف سراپا جنگ بن گیا۔ سب سے پہلے اس نے ان علماء کی کردار کشی شروع کی جو حکومت کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ یہ کوشش بے سود رہی۔ اُلٹا عوام علمائے دین کی عزت و ناموس بچانے سڑکوں پر آ گئے اور حکومتی بدزبانی پر احتجاج شروع کر دیا۔ ترہ کئی نے احتجاجی جلوسوں پر گولیاں چلوا دیں اور درجنوں افراد شہید ہو گئے۔

"جہاد" کا نیا مفہوم: ترہ کئی نے افغان عوام کو علماء اور مذہبی طبقے کے خلاف استعمال کرنے کے لیے ایک اور چال چلی۔ اس نے ان کے مذہبی جذبات کو اپنے حق میں بھڑکانے کے لیے کابل میں نام نہاد مذہبی اسکالروں کی کونسل ترتیب دی اور اس کے ذریعے یہ اعلان کر دیا کہ حکومت کے مخالفین سے لڑائی "جہاد" ہے۔

اس نے مسلح افواج اور عوام کو یہ پیغام دیا کہ خدا کو راضی کرنے اور جنت میں بلند مقام پانے کیلئے حکومت کے مخالفین سے ٹکرا جائیں اور "غازی" یا "شہید" کہلائیں۔ مگر اس پروپیگنڈے کا اثر بالکل برعکس ہوا۔ علمائے کرام نے کمیونسٹ حکومت کے خلاف لڑنے کو زیادہ شدت کے ساتھ "جہاد" کہنا شروع کر دیا اور کچھ ہی دنوں میں ملک کے ہر گلی کوچے میں "جہاد" کا لفظ عام ہو گیا جسے لوگ کئی عشروں سے بھولے ہوئے تھے۔

شدید جھڑپیں: حکومت اور عوام میں ٹکراؤ روز بروز شدید ہوتا گیا۔ کنڑ اور پکتیا میں سب سے پہلے مسلح کارروائیاں شروع ہوئیں۔ حکومتی افواج ٹینکوں، بکتر بند گاڑیوں اور توپ خانے کے ساتھ ان علاقوں میں گھس گئیں۔ اب شدید جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ مجاہدین معمولی اور پرانے اسلحے سے چھاپہ مار حملے کر رہے تھے۔ وہ گھاٹیوں اور تنگ پہاڑی راستے پر فوج کے کانوائے روک لیتے اور انہیں سنگ باری یا دیسی بموں کا نشانہ بناتے۔ ایک لڑائی میں سو کے لگ بھگ افغان سپاہی اور ان کے ساتھ چار روسی مشیر مارے گئے جس سے معلوم ہوا کہ روس برابر افغان حکومت کی رہنمائی کر رہا ہے۔

حالات روز بروز خراب ہو رہے تھے۔ سرحد کے قریب افغان دیہاتوں سے لوگ پاکستان کا رُخ کرنے لگے۔ سال 1978ء کے اواخر تک تیس ہزار مہاجرین پاکستان پہنچ چکے تھے۔

انقلاب ایران: 1979ء اپنے دامن میں نئے ہنگامے لیے وارد ہوا، اس سال 16 جنوری کو شاہ ایران رضا شاہ پہلوی ملک سے فرار ہونے پر مجبور ہو گیا کیونکہ ایران میں آیت اللہ خمینی کا انقلاب کامیاب ہو گیا تھا۔ انقلابیوں نے ملک کا نظم و نسق سنبھال لیا تھا اور ''مرگ بر امریکا'' کے نعرے بلند کرتے ہوئے وہ سابقہ حکومت کی ہر علامت کو مٹا رہے تھے۔ رضا شاہ پہلوی امریکا کا چہیتا حکمران تھا مگر اس موقع پر امریکا اسے سہارا دینے نہ آیا حتیٰ کہ اسے سیاسی پناہ تک دینے کی زحمت گوارا نہ کی۔ مجبوراً رضا شاہ، مصر کے صدر انور سادات کے ہاں پناہ گزین ہوا اور مصر ہی میں جلاوطنی کی حالت میں فوت ہوا۔ اس کی معزولی کے ساتھ ہی ایران کے قدیم بادشاہی نظام کا خاتمہ ہو گیا۔

اب ایران ایک نئی حیثیت اختیار کر چکا تھا جس سے عرب دنیا سمیت کئی ملکوں کو خدشات لاحق تھے۔ رضا شاہ کی حکومت اگر امریکا نواز تھی تو اب انقلابی رہنما آیت اللہ خمینی کی حکومت کا روس نواز بن جانا کوئی بعید نہ تھا۔ پھر یہ حکومت کٹر شیعہ تھی جس کے انقلابی افکار سے ہمسایہ سنی مسلم ممالک کو بھی خطرہ تھا۔

روس رضا شاہ جیسے امریکی مہرے کے گر جانے پر خوش تھا۔ اب اس کے لیے سرخ انقلاب کا دائرہ افغانستان اور عرب دنیا تک پھیلا دینا آسان ہو گیا تھا۔ اس مقصد کے لیے ایران کو اپنا حلیف بنا لینا زیادہ مشکل نہ تھا۔ تاہم نیا ایران بزعمِ خود انقلابِ اسلامی کا دعوے دار اور بزورِ طاقت اپنے ہمسایوں پر اپنے افکار مسلط کرنے کا خواہاں تھا۔ چنانچہ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اس نے اپنے پڑوسی عراق سے ''جزیرۃ شط العرب'' کے قضیے کو بنیاد بنا کر تعلقات کشیدہ تر کر لیے جو جلد ہی باقاعدہ جنگ میں تبدیل ہو گئے۔ یہ جنگ آٹھ برس تک جاری رہی اور اس سے عالم اسلام کے بے پناہ قیمتی وسائل خاک میں مل گئے۔

گرم پانی تک رسائی کا روسی منصوبہ: دریں حالات روس کو سازگار فضا مہیا تھی کہ اب وہ افغانستان سے پاکستان اور پھر بحیرہ عرب کے گرم پانی تک راستہ بنا لے۔ یہ منصوبہ مدتوں سے ماسکو میں زیرِ غور تھا مگر اب اس پر عمل کا بہترین موقع سامنے آ چکا تھا۔ ایران میں امریکی اثر و رسوخ کو سخت دھچکا لگا تھا۔ افغانستان میں کمیونسٹوں کا قابل اعتماد ایجنٹ ترہ کئی برسرِ اقتدار تھا جو کمیونزم کی خاطر کچھ بھی کرنے کو تیار تھا اور جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے روس اسے کوئی ناقابل تسخیر رکاوٹ تصور نہیں کرتا تھا۔ پھر پاکستان میں روس نواز لابی پوری طرح سرگرم تھی اور فوجی حکومت جو عوام میں نامقبول تھی روس سے ٹکر لینے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔

گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ افغانستان میں روسی اثر و رسوخ تیزی سے بڑھتا گیا۔ اس سال فوج میں سوویت مشیروں کی تعداد پانچ ہزار سے زائد ہو گئی۔ یہ مشیر درحقیقت افغان فوج کے آقا تھے۔ ان کی موجودگی سے فوج کی پیشہ ورانہ حیثیت شدید متاثر ہو رہی تھی۔ ادھر کمیونزم کے فروغ کے لیے بھرپور انداز میں کوششیں

جاری تھیں۔ کمیونسٹ پارٹی گاؤں گاؤں جا کر لوگوں کو ہم خیال بنانے کے جتن کر رہی تھی۔ ان کے کارکن اور عہدے دار اپنے جلسوں میں شعائرِ اسلام کا کھلے عام مذاق اڑاتے تھے، نماز روزے کو جنگل پن اور دقیا نوسیت قرار دیتے تھے۔ وہ لوگوں کو ترغیب دیتے تھے کہ مذہبی کتب کی جگہ لینن اور مارکس کا لٹریچر پڑھیں، لڑکے اور لڑکیاں مل کر تعلیم حاصل کریں، قرآن وسنت کے مطابق عبادت کے مروجہ طریقے ترک کر کے اب سکونِ قلب اور نجات پانے کے وہ طریقے اختیار کریں جو کمیونسٹ رہنماؤں نے تجویز کیے ہیں۔

مجاہدین کی تنظیمیں میدان میں: ان ملحدانہ نظریات کے خلاف علمائے افغانستان کا احتجاج بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ مختلف علاقوں کے غیور مسلمان علمائے کرام اور مجاہد رہنماؤں کی قیادت اپنے طور پر جہاد کا اعلان کر چکے تھے۔ لغمان کے نورستانی تو 1978ء کے موسم خزاں ہی میں اپنے علاقے کی فوجی چوکیوں پر حملے کرنے لگے تھے پھر 1979ء کے آغاز میں کنڑ میں مجاہدین کا ایک بڑا حملہ ہوا، پانچ ہزار مجاہدین نے ''چغہ سرائے'' میں سرکاری فوج کا ناطقہ بند کر دیا۔ اگرچہ جہاد کے اس ابتدائی دور کی کارروائیاں پختون صوبوں تک محدود نظر آتی ہیں مگر ان مجاہدین میں وسط ایشیاء سے ہجرت کر کے آنے والی ازبک، تاجک اور ترکمان مسلمان بھی پیش پیش تھے۔ یہ لوگ کمیونزم کی اذیت ناک اندھیر نگری کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ اس لیے سوویت یونین سے نفرت ان کے رگ وپے میں سرایت کر چکی تھی۔

1979ء کے آغاز میں ہم جن جماعتوں کو جہادی کارروائیوں میں مصروف دیکھتے ہیں، ان میں انجینئر گلبدین حکمت یار کی حزب اسلامی، پروفیسر برہان الدین ربانی کی جمعیت اسلامی، مولانا محمد نبی محمدی کی حرکت انقلاب اسلامی اور مولانا محمد یونس خالص کی حزب اسلامی (خالص گروپ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نیز پروفیسر صبغت اللہ مجددی بھی ''جبہ نجات ملی افغانستان'' کے نام سے جماعت بنا کر متحرک تھے۔ کچھ دنوں بعد کابل کے جنوب میں ''صوبہ وردگ'' کے پیر سید علی گیلانی کے ''قومی اسلامی محاذ'' نے بھی جہاد کا اعلان کر دیا اور یوں کمیونسٹ حکومت کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا۔

امریکی سفیر کا اغواء: پہاڑوں، دیہاتوں اور جنگلات میں مجاہدین کے حملوں کے آغاز کے بعد فروری میں کابل شہر میں ایک حیرت انگیز کارروائی ہوئی جس سے دنیا بھونچکا کر رہ گئی اور یہ تاثر عام ہو گیا کہ مجاہدین شہروں میں بھی بھرپور وار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ہوا یہ کہ مجاہدین کے کسی گروپ نے امریکی سفیر ایڈلف ڈولیس کو اغواء کر لیا۔ حکومتی اہلکاروں نے اس ہوٹل کا محاصرہ تو کر لیا جس میں سفیر کو یرغمال بنا کر رکھا گیا تھا مگر وہ اسے آزاد نہ کرا سکے۔ دوطرفہ فائرنگ ہوتی رہی اور اس دوران امریکی سفیر کسی گولی کا نشانہ بن کر ہلاک ہو گیا۔ مشہور یہی تھا کہ سرکاری

اہلکاروں کی گولیوں نے اس کا کام تمام کیا ہے۔ امریکی حکومت نے بھی افغان حکومت کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا اور احتجاجاً افغانستان کی امداد بند کردی۔

ہرات، خونِ شہیداں سے لالہ زار: اس دوران افغان عوام پر حکومت کی جانب سے بدترین مظالم کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ مجاہدین کی کارروائیوں کو روکنے میں ناکامی کا غصہ نہتے شہریوں پر نکالا جارہا تھا۔

اپریل 1979ء میں حکومت نے "انقلاب ثور" کی پہلی سالگرہ منائی اس موقع پر جہاں سرکاری تقریبات دھوم دھام سے منائی جارہی تھیں وہاں ہرات میں عوام ایک احتجاجی مظاہرہ کر رہے تھے۔ ترہ کئی حکومت نے اس احتجاج کو سختی سے کچلنے کے لیے فوج کو ایکشن لینے کا حکم دیا۔ ہرات میں سترھویں ڈویژن کے سپاہی تعینات تھے۔ اس فوج کے افسران میں سے سینئر کیپٹن اسماعیل خان تورون اور کیپٹن علاؤالدین نے ان ظالمانہ احکام کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ چنانچہ ڈویژن کے تقریباً تمام سپاہی جن کی تعداد دس ہزار تھی، مظاہرین سے جاملے۔ انہوں نے سرکاری اسلحہ خانہ لوٹ لیا اور ہتھیار مظاہرین میں تقسیم کردیے۔ پرجوش مظاہرین مسلح ہو کر ہرات میں رہائش پذیر سوویت شہریوں کی آبادی پر ٹوٹ پڑے اور ان کے چھ سو افراد کو موقع پر قتل کردیا۔

اس خبر سے حکومتی ایوانوں میں سناٹا چھا گیا۔ ترہ کئی اور امین کے نزدیک روسیوں کا قتل ناقابل معافی جرم تھا اور اب ہرات کے تمام شہریوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا تھا۔ چنانچہ کابل اور قندھار سے کئی ڈویژن فوج ہرات پہنچ گئی۔ ادھر فضائیہ بھی حرکت میں آ گئی۔ بکتر بند گاڑیوں اور توپ خانے کے ساتھ لیس فوج شہر پر حملہ آور ہوئی۔ فضائیہ نے اندھادھند بمباری کی، پہلے ہرات میں موجود فوج کے ہیڈکوارٹر کو نشانہ بنایا گیا۔ اسے تہس نہس کرنے کے بعد عام شہری آبادی پر بمباری شروع کردی گئی۔ اس قتل عام میں ہرات کے اسلام پسند فوجیوں کے علاوہ پانچ ہزار سے زائد عام شہری شہید ہوئے، گویا سرخ انقلاب کے داعیوں نے اپنی پہلی انقلابی سالگرہ ارضِ وطن کو اہلِ وطن کے خون سے سرخ کر کے منائی۔

مگر اس قسم کی ستم رانیوں سے افغان مجاہدین کے حوصلے سرد نہ پڑے، بلکہ ان کے ولولوں میں اور اضافہ ہوگیا۔ برہان الدین ربانی، گلبدین حکمت یار، مولوی نبی محمدی اور مولوی محمد یونس خالص کے ساتھ اب ایک اور نام کا اضافہ ہوگیا۔ ہرات کے کیپٹن اسماعیل خان تورون نے اب باقاعدہ مجاہد رہنما کا روپ دھار لیا اور حکومت کے لیے مزید پریشانیاں پیدا کردیں۔ غیور افغان عوام خون معاف کرنے کے قائل نہیں اس لیے ایسا ہر سانحہ ان کے خون کو اور گرم کردیتا تھا۔

کنڑ میں قتل عام: ہرات کے ہولناک واقعے سے چند دن پہلے 20 اپریل 1979ء کو کنڑ میں بھی نہایت

لرزہ خیز واقعہ پیش آچکا تھا۔ صوبے کے قصبے ''کیرالا'' میں دوسو پولیس اہلکار اور 20 روسی مشیر پہنچے اور پوری بستی کی آبادی کو ایک میدان میں جمع کرلیا۔ انہوں نے الزام لگایا کہ بستی کے مکین مجاہدین سے ملے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد لوگوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے ان پر مشین گن سے گولیاں برسانی شروع کی گئیں جس سے کم از کم بارہ سو افراد شہید ہو گئے۔ پھر ان نعشوں کو بلڈوزر کے ذریعے ایک گڑھے میں دفن کردیا گیا۔ آخری سانسوں تک یہ شہداء ''اللہ اکبر'' کے نعرے بلند کررہے تھے۔ ان کا حوصلہ اور ولولہ ایمانی قابلِ دید تھا۔

مجاہد رہنماؤں کے خلاف کارروائیاں: ملک بھر میں مجاہد رہنماؤں کے گرد گھیرا تنگ کیا جارہا تھا۔ مشہور افغان بزرگ ملا محمد ابراہیم مجددی جو ''ملاشور'' کے نام سے معروف تھے اپنے خاندان کے ایک سو مردوزن اور بچوں سمیت گرفتار کرلیے گئے۔ ملا صاحب پر شرمناک مظالم ڈھائے گئے۔ ان کے خاندان کے دوسرے اہم رہنما پروفیسر صبغت اللہ مجددی پر (جو پشاور میں تھے) قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ ان کی رہائش گاہ پر بم پھینکا گیا مگر پروفیسر صاحب خوش قسمتی سے محفوظ رہے۔

حفیظ اللہ امین اقتدار کے لیے سرگرم: ان دنوں افغانستان کا ڈپٹی وزیر اعظم اور وزیر خارجہ حفیظ اللہ امین بڑی پرکاری سے حصولِ اقتدار کے لیے سرگرم تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ترہ کئی نے طاقت کا توازن اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ ملک کا صدر بھی وہی ہے اور وزیر اعظم بھی۔ پھر اس نے افغان کابینہ کے اہم ترین افراد کو بیرون ملک سفیر بنا کر انہیں ناکارہ پرزہ بنادیا ہے۔ مثلاً: نائب وزیر اعظم ببرک کارمل چیکو سلواکیہ میں اور ڈاکٹر نجیب اللہ ایران میں بحیثیت سفیر تعینات کر کے عملاً معطل کردیے گئے تھے۔ ایسے میں ضروری تھا کہ ترہ کئی کے استبدادی حربوں کو ناکام بنادیا جاتا۔

چنانچہ امین نے حد درجہ ہوشیاری سے اس مقصد کے لیے دوڑ دھوپ شروع کردی۔ اس نے اہلِ ہرات کے قتلِ عام کو اپنی ترقی کا زینہ بنایا اور جلد ہی اسے ڈپٹی وزیر اعظم سے وزیر اعظم بنادیا گیا۔ گویا اب ترہ کئی صرف صدر تھا۔ تاہم اصل حکمران وہی تھا۔ امین اس کا دست راست تھا۔ گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ امین کے اختیارات بڑھتے گئے۔ 27 جولائی 1979ء کو اسے کمیونسٹ پارٹی کا سیکرٹری بنادیا گیا پھر اس نے وزیر دفاع کا عہدہ بھی حاصل کرلیا۔

امین کا ماضی: امین کا ماضی یہ تھا کہ وہ 1929ء میں کابل کے نواحی صوبے پغمان میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے کابل یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی اور درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ 1957ء میں حکومت نے اسے انتظامی اُمور کی اعلیٰ تعلیم MBA کے لیے امریکا بھیج دیا۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ امریکا میں مقیم افغان طلبہ کی ایک تنظیم کا صدر چن لیا گیا۔ 1965ء میں جب افغانستان میں عام انتخابات

ہونے لگے تو امین وطن واپس آ گیا۔ اس نے انتخابات میں حصہ لیا مگر ناکام رہا۔ کچھ عرصے بعد وہ کمیونسٹوں کی نمائندہ سیاسی جماعت وہ پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی میں شامل ہو گیا۔ جلد ہی اس نے افغان سیاست میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔

امین کمیونسٹوں میں مقبول ہونے کے علاوہ وہ امریکا کے نزدیک بھی پسندیدہ مہرہ تھا۔ اسی وجہ سے ترہ کئی بھی اسے خاص اہمیت دیتا تھا۔ 1978ء کے "انقلاب ثور" میں اس کا کردار سب سے نمایاں تھا کیونکہ اسی نے کمیونسٹ فوجی افسران سے رابطہ کر کے انہیں داؤد خان کے خلاف کارروائی کے لیے تیار کیا تھا۔

ترہ کئی اور امین کا اختلاف: حفیظ اللہ امین افغانستان کا وزیر اعظم بن چکا تھا اور اب اسے اقتدار کے بلند ترین منصب تک پہنچنے میں کوئی خاص دشواری درپیش نہ تھی۔ امین کا کمال یہ تھا کہ اس نے صدر ترہ کئی کو اپنے عزائم کی ذرا بھی بھنک نہیں پڑنے دی اور اسے پوری طرح اعتماد میں لیے رکھا۔ چنانچہ ترہ کئی نے اکثر امور اس کے سپرد کر دیے۔ ترہ کئی کی اس سادہ لوحی سے امین نے خوب فائدہ اُٹھا دیا۔ اس نے ترہ کئی کو "بابائے قوم" کا خطاب دے ڈالا۔ کابل میں جگہ جگہ اس کی تصویریں آویزاں کرا دیں۔ اس طرح گویا خود کو اس کا سب سے معتمد وجاں نثار ثابت کر دیا۔ افغانستان میں کمیونسٹ اصلاحات اور دیگر تمام نت نئی تبدیلیوں کے منصوبے اب وہی مرتب کر رہا تھا...... تاہم اس کا کوئی منصوبہ عوامی اشتعال کو ختم نہ کر سکا۔

امین کی یہ ترک تازیاں روس کی نظر سے پوشیدہ نہ تھیں۔ روسی حکام بہر کیف ترہ کئی پر زیادہ اعتماد کرتے تھے اور امین کو امریکا کا منظور نظر ہونے کی بنا پر شک وشبے کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ امین اتنا با اختیار ہونے کے باوجود عوامی مزاحمت پر قابو پانے اور کمیونزم کو مقبول بنانے میں ناکام ہے۔ چنانچہ ستمبر 1979ء میں ترہ کئی ماسکو گیا تو روسی صدر برژنیف نے اس سے تنہائی میں ملاقات کے دوران امین کے منصوبوں کی ناکامی پر تنقید کی اور اسے برطرف کرنے کا مطالبہ کیا۔

11 ستمبر 1979ء کو ترہ کئی کابل واپس آیا۔ ہوائی اڈے پر کمیونسٹوں نے اس کا زبردست استقبال کیا۔ اگلے دن وزراء کے اجلاس میں ترہ کئی امین پر برہم ہوا اور اسے برطرف کر دینے کا عندیہ دیا۔ ترہ کئی کو معلوم نہیں تھا کہ اس وقت تک امین نہ صرف فوج اور پولیس کو اپنی مٹھی میں لے چکا تھا بلکہ مجلس وزراء کی اکثریت اس کی حامی تھی۔

امین نے 14 ستمبر 1979ء کو مجلس وزراء کا اجلاس بلا لیا اور فوری طور پر اپنے مخالف چند وزراء کو معزول کرنے کے احکام جاری کر دیے۔ یہ احکام جب ایوان صدر پہنچے اور صدر ترہ کئی کو ان پر دستخط کرنے کا کہا گیا تو ترہ کئی کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ امین کتنی طاقت کا حامل ہے۔

اس نے صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے امین کو فون کیا۔ طے یہ ہوا کہ دونوں روسی سفیر کی موجودگی میں ایوانِ صدر میں بیٹھ کر بات چیت سے باہمی تنازعات کا کوئی حل نکال لیں گے۔ ترہ کئی نے امین کو فون پر ہی کہا کہ روسی سفیر اسی وقت آرہا ہے۔ تم بھی فوراً آجاؤ۔ یہ واقعہ 15 ستمبر 1979ء کا ہے۔

ترہ کئی کا قتل: ان دونوں کمیونسٹ لیڈروں کی یہ آخری بات چیت تھی جو فون پر ہی ہوئی۔ امین مزید کہنے سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے روسی سفیر کے آنے سے پہلے پہلے آناً فاناً صدارتی محل کا محاصرہ کرادیا۔ کچھ دیر بعد وہ خود وہاں پہنچا اور کارروائی کا اشارہ دیا۔ صدارتی محل گولیوں کی تڑاتڑ سے گونج اُٹھا۔ چند ہی لمحوں میں ترہ کئی اپنے تین قابلِ اعتماد وزراء، خفیہ پولیس کے سربراہ اور محافظوں سمیت موت کے گھاٹ اُتر گیا۔

بعض ذرائع کا کہنا تھا کہ ترہ کئی کو اس موقع پر قتل نہیں کیا گیا تھا بلکہ زخمی حالت میں اغوا کر کے ایک کوٹھڑی میں بند کردیا گیا تھا۔ تین ہفتے بعد 8 اکتوبر 1979ء کو اسے وہیں گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔

بہرصورت افغانستان میں کمیونزم کی زہریلی فصل بونے والا دشمنِ اسلام صرف ایک سال، چار ماہ اور پندرہ دن حکومت کر کے نہایت ذلت ورسوائی کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچا۔ اس کے ساتھ ہی حفیظ اللہ امین نے افغانستان کے دوسرے صدر کے طور پر اقتدار سنبھال لیا۔ ترہ کئی کی موت کی خبر کو خفیہ رکھا گیا۔ 16 ستمبر کو انقلابی کونسل نے اعلان کیا کہ ترہ کئی کو علالت کی وجہ سے پارٹی کی ذمہ داریوں سے سبک دوش کردیا گیا ہے۔ مگر آہستہ آہستہ اس کے قتل کی بات مشہور ہوگئی جس سے ملک میں مزید انارکی پھیلنے لگی۔

حفیظ اللہ امین کا دورِ حکومت: افغانستان کا اقتدار اب حفیظ اللہ امین کے پاس تھا۔ ترہ کئی کی طرح وہ روس کا خصوصی مہرہ نہ تھا اس لیے ماسکو نے اس کی حکومت کو خوش آمدید نہ کہا۔ روس کے اس رویے کے ردِعمل میں امین امریکا سے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ امریکا نے خیرسگالی کے پہلے قدم کے طور پر افغانستان کی امداد بڑھادی اور اپنا ایک مسافر بردار طیارہ افغان ائیر لائنز کو بطور تحفہ دے دیا۔

ادھر ظلم وستم کا خونیں عفریت افغانستان میں ایک بار پھر خون آشامی کا ذوق پورا کرنے لگا تھا۔ امین نے بھی ترہ کئی کی طرح اقتدار سنبھالتے ہی سابق حکومت کے وفاداروں اور اپنے مخالفین کو بے دریغ قتل کرنا شروع کردیا۔ مگر جلد ہی امین کو اندازہ ہوگیا کہ ایک طرف سوویت کے نزدیک ناپسندیدہ رہ کر اور دوسری جانب عوام کی نظروں میں قابلِ نفرت بن کر وہ زیادہ دن اقتدار کے مزے نہیں لوٹ سکتا۔ چوں کہ وہ ایک منصوبہ ساز آدمی تھا اس لیے اس نے ایک طرف تو ماسکو کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ وہ افغانستان میں سوویت اصلاحات رائج کرنے، عوامی شورش پر قابو پانے اور دیگر ترقیاتی کاموں کو سرانجام دینے کی سب سے بہتر اہلیت رکھتا ہے۔ دوسری طرف عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے اس نے ادیبوں،

صحافیوں، فنکاروں اور دیگر شعبوں کے افراد کے گروپ بنائے اور انہیں حکومتی سرپرستی کا یقین دلایا۔

یہی نہیں بلکہ مذہبی طبقے کو متاثر کرنے کے لیے اس نے کچھ زرخرید علماء کو جمع کر کے ایک ''جمعیت علماء'' قائم کی اور اس کے ارکان علماء کو ''اولوالامر'' کا لقب دیا۔ عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ حکم خداوندی کے مطابق ''اولوالامر'' کی اطاعت کریں۔ تاہم امین کے یہ منصوبے بھی افغان عوام کو متاثر نہ کر سکے اور اسے مذہبی طبقے سے حسبِ خواہش ایک ''اچھا مسلمان'' ہونے کی سند نہ مل سکی۔

ماسکو افغانستان پر چڑھائی کے لیے تیار: ادھر سوویت یونین امین کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اس کے متبادل پر غور کر رہا تھا۔ روسی حکام دیکھ رہے تھے کہ افغانستان میں حالات قابو سے باہر ہوئے جا رہے ہیں۔ داؤد خان، ترہ کئی اور اب امین بھی کیمونزم کے مخالفین کو کچلنے میں ناکام رہے ہیں۔ ان کے نزدیک اب افغانستان کے اسلام پسند مسلمانوں کی مزاحمت کے خاتمے کے لیے براہِ راست کارروائی ناگزیر ہوگئی تھی۔ چنانچہ اس کے لیے وسیع پیمانے پر کام شروع کر دیا گیا۔ روسی سپاہیوں کا جمِ غفیر وسط ایشیا میں جمع ہونے لگا۔ وہاں ٹینکوں، توپوں اور طیاروں کا ایک میلہ لگ گیا۔

روس نے اس سے پہلے کسی مخالف ملک میں افواج اُتارنے کی مشقیں بھی کر لی تھیں۔ افغانستان پر باقاعدہ حملے سے کئی ماہ قبل دس ہزار روسی فوجی اینٹونوف 22 طیاروں کے ذریعے جنوبی یمن اور ایتھوپیا میں اُتار گئے تھے۔ یہ ساری کارروائیاں اور مشقیں نہایت خفیہ رکھی جا رہی تھیں حتیٰ کہ امریکا کی فعال ایجنسیوں کو بھی صورتِ حال کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ روسی حکام ایک طرف امین کو دوستی کے پیغامات بھیج رہے تھے اور دوسری طرف دریائے آمو کے قریب چالیسویں بریگیڈ کے سپاہی حملے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

مآخذ و مراجع

- تاریخ افغانستان من قبیل الفتح الاسلامی الی وقتنا المعاصر۔ فاروق حامد بدر
- تاریخ جہاد افغانستان، ڈاکٹر ایچ بی خان
- افغانستان، ایک قوم کا المیہ، احمد شجاع پاشا
- اردو ڈائجسٹ، جہاد افغانستان نمبر اپریل 1989ء
- Encyclopaedia Britannica (Afghanistan)

چوبیسواں باب

سوویت افواج کی افغانستان پر یلغار

سوویت سپاہ کا افغانستان میں عمل دخل: روسی سپاہی دسمبر 1979ء سے پہلے بھی افغانستان میں موجود تھے۔ ترہ کئی اور امین حسبِ ضرورت ان کے چھوٹے چھوٹے دستے طلب کرتے رہتے تھے۔ ان کے علاوہ جدید ترین روسی اسلحے کے استعمال کے لیے سوویت فوجی ہی کام آتے تھے۔ جون 1979ء تک افغانستان میں سوویت مشیروں کی تعداد 8 ہزار تک پہنچ گئی تھی جن میں نصف سویلین اور نصف فوجی آفیسر تھے۔ اس کے علاوہ دسمبر 1979ء میں عمومی یلغار سے پہلے روس 25 ہزار کے لگ بھگ فوج افغانستان بھیج چکا تھا۔

امین کو معلوم تھا کہ وہ ماسکو کی نظر میں ناپسندیدہ ہے اس لیے وہ اسے خوش کرنے کے لیے مجاہدین کے خلاف بھرپور کارروائیوں کی کوشش کر رہا تھا۔ اکتوبر 1979ء میں اس نے پکتیا میں مجاہدین کے خلاف ایک بڑا آپریشن شروع کرایا۔ جس کی وجہ سے 40 ہزار افغان سرحد پار کر کے پاکستانی قبائلی علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ سرکاری فوجیں یہ اطمینان کر کے واپس چلی گئیں کہ مجاہدین فرار ہو گئے ہیں مگر مجاہدین اپنے اہل وعیال کو پاکستانی کیمپوں میں ٹھہرانے کے بعد دوبارہ پکتیا میں داخل ہو گئے اور پہلے سے بڑھ چڑھ کر کارروائیاں شروع کر دیں۔

امین...... طاغوت سے مدد کا منتظر: اتنی زبردست افواج اور جدید ترین اسلحے کے باوجود حالات کی باگ ڈور امین کے ہاتھوں سے نکل رہی تھی۔ ترہ کئی کے دور کی طرح امین کے ایامِ اقتدار میں بھی افغانستان کے بڑے شہروں میں رات کو مستقل کرفیو نافذ رہتا تھا۔ امین اتنا خوفزدہ تھا کہ دارالحکومت میں ہر وقت بھاری تعداد میں افواج جمع رکھنا ضروری خیال کرتا تھا۔ امین اب لے دے کے روسی طاغوت سے مدد کا منتظر تھا۔ چنانچہ اس نے ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے واضح طور پر کہا تھا: ''اگر ہم پر حملہ ہوا تو ہم مدد کے لیے روس ہی کو پکاریں گے۔''

مگر سوویت روس کو امین کی پکار کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد یلغار کا حتمی

فیصلہ کرلیا تھا۔

4 لاکھ مہاجرین: ادھر پاکستان افغانستان کے حالات سے شدید متاثر ہو رہا تھا۔ دسمبر کے اواخر تک پاکستان میں پناہ لینے والے افغان مہاجرین کی تعداد 4 لاکھ سے زائد ہو چکی تھی۔ یہ صورتِ حال خود امین کے منہ پر ایک طمانچہ اور اس کی نااہلیت کا واضح ثبوت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ امین نے ہجرت کرنے والے تمام افراد کو واپسی کی دعوت دی اور ان کے لیے معافی کا اعلان کیا۔ ساتھ ہی حزبِ اسلامی کے سربراہ مولوی محمد یونس خالص پر زور دیا کہ وہ مہاجرین کو واپسی پر آمادہ کریں مگر جب تک امین اپنی روش تبدیل نہ کرتا، ستم زدہ مہاجرین واپس کیسے آسکتے تھے۔ چنانچہ مولوی یونس خالص نے امین کی اپیل مسترد کر دی۔

حکمرانِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے افغانستان پر روسی حملے کا شدید خطرہ محسوس کرتے ہوئے دسمبر کے اواخر میں وزیرِ خارجہ آغا شاہی کو کابل بھیجنے کی کوشش کی مگر وہ برف باری کی وجہ سے نہ جا سکے۔

بہت بڑا کھیل: دسمبر کے آخری عشرے میں روس نے افغانستان میں سرخ افواج اُتارنے کی منصوبہ بندی پر عمل کر ڈالا۔ اس کے لیے بہت بڑا کھیل کھیلا گیا۔ روس نے دنیا پر یہ ظاہر کیا کہ وہ مال بردار جہازوں میں بڑے پیمانے پر افغانستان کے لیے امدادی ساز و سامان روانہ کر رہا ہے۔ مگر حقیقت کچھ اور تھی۔ طے شدہ پلان کے مطابق 23 دسمبر 1979ء کو روس نے کچھ نئے ٹینک اور جدید اسلحے کے کچھ ذخائر کابل پہنچا دیے۔ پھر افغان حکام کو ایک تقریب میں مدعو کیا جہاں ان کی روسی شراب سے تواضع کی گئی۔ انہیں یہی تاثر دیا گیا کہ روس فوجی امداد میں اضافہ کر رہا ہے۔

ایک لاکھ سوویت فوجی افغانستان میں: 23 اور 26 دسمبر کے درمیان روس کے اینٹونوف اور الیوشن طیارے بگرام ائیر پورٹ پر روسی سپاہ کو اُتارتے رہے۔ امین کابل انتظامیہ اور افغان فوج یہ سب کچھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے مگر انہیں لب کشائی کی جرأت نہ تھی۔ روسی طیاروں نے ان دو تین ایام میں بگرام ائیر پورٹ تک 350 پروازیں کیں اور ہزاروں سپاہی یہاں اُتار دیے۔ یہ ائیر پورٹ برسوں پہلے روس نے ایسے ہی کسی موقع پر اپنا اڈا بنانے کے ارادے سے تعمیر کیا تھا۔

26 دسمبر کی شام تک ایک لاکھ سوویت سپاہی افغانستان میں داخل ہو چکے تھے۔ تب امین نے ایک انجانا خطرہ محسوس کرتے ہوئے 26 دسمبر کی شام کو افغانستان کی چوتھی آرمرڈ بریگیڈ کے افسران کا اجلاس طلب کیا اور ان کی رائے معلوم کی۔ بحث کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ کوئی ایسا قدم نہ اُٹھایا جائے جس سے روس کے ساتھ تعلقات متاثر ہوں اور انقلاب ''ثور'' کے مقاصد کو ٹھیس پہنچے۔

کاش! یہ بے حمیت حکمران اور افسرانِ عساکر کمیونزم کی عینک اُتار کر حالات کا جائزہ لیتے تو انہیں

سوویت یونین کا ہر ہر اقدام افغانستان کی سالمیت اور آزادی کے خلاف ایک زہر آلود خنجر دکھائی دیتا مگر کیمونزم کے پرستار روسی آقاؤں سے یہ گمان کیسے کر سکتے تھے؟ وہ خوش فہمی کی دنیا میں مست تھے۔

روس کا امین کے خلاف آپریشن: اُدھر ہزاروں روسی مشیر جو افغان فوج کے غیر علانیہ آقا تھے، حرکت میں آگئے۔ انہوں نے امین کے حامی افسران کو کمروں میں بند کر کے تالے لگا دیے اور بہت سے سرکردہ عہدے داروں کو بیڑیاں لگا کر انہیں نقل وحرکت کے قابل نہ رہنے دیا۔

حفیظ اللہ امین کچھ دنوں پہلے ہی سوویت مشیروں کی تجویز پر کابل کے محفوظ ایوانِ صدر کو چھوڑ کر ایوان دارالامان منتقل ہو گیا تھا۔ یہاں روسی اس پر آسانی سے ہاتھ ڈال سکتے تھے کیونکہ یہ شاندار محل شہری آبادی سے دور تھا۔ 27 دسمبر کی دوپہر تک امین یہاں دادِ عیش دے رہا تھا۔ اسے کچھ خطرات محسوس ہو رہے تھے مگر سہ پہر کو روسی وزیر مواصلات نے بڑے خوشگوار موڈ میں اس سے ملاقات کی اور کہا:

''اگر ہر چیز معمول کے مطابق ہے تو پھر سب ٹھیک ہے۔''

اس دوستانہ رویے سے وہ امین کو حتی الامکان بے فکر رکھنا چاہتا تھا۔ اسی شب K.G.B کے خاص کمانڈوز دستے دارالامان کی طرف بڑھے اور اسے نرغے میں لے لیا۔ وہ امین کو زندہ گرفتار کرنا چاہتے تھے مگر محل کے محافظ سپاہیوں نے مقابلہ شروع کر دیا۔ بہرکیف وہ مشاق روسی کمانڈوز کو روک نہ سکے اور مارے گئے۔ امین بھی اس معرکے میں گولی کا نشانہ بن کر موت کے گھاٹ اُتر گیا۔ اس کے خاندان کے بہت سے افراد بھی قتل کر دیے گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امین کو معرکے کے بعد گرفتار کر کے قتل کیا گیا۔

امین کا سیاہ کردار اور انجام بد: حفیظ اللہ امین 16 ستمبر 1979ء سے 27 دسمبر 1979ء تک صرف 102 دن حکومت کر کے اپنے انجام کو پہنچا۔ مختصری مدت میں اس نے افغان عوام وخواص پر جو مظالم ڈھائے تھے ان کی فہرست بڑی طویل ہے۔ وہ اپنے ہر مخالف کو بے دریغ قتل کرا دیا کرتا تھا چاہے وہ کتنی ہی بڑی حیثیت کا حامل کیوں نہ ہو۔ اس نے اپنے پیشرو ترہ کئی کے حامی سیاست دانوں اور افسران کو مروا ڈالا، افغانستان کی بڑی بڑی شخصیات کو جیلوں میں ٹھونس دیا، اس کے حکم پر قتل اور گرفتار کیے جانے والوں میں سیاست دان، علمائے کرام، دانشور، بیوروکریٹ، سول، فوجی، ملازمین اور عوام سب ہی شامل تھے۔ اقتدار سنبھالتے وقت اس کا دعویٰ تھا کہ وہ جیلیں خالی کر دے گا مگر چند ماہ میں اس نے جیلوں میں دوگنا قیدی بھر دیے تھے۔

روسی یلغار کے پسِ پردہ مقاصد: روس کا مقصد صرف افغانستان کی حکومت تبدیل کرنا نہیں تھا۔ یہ کام تو وہ اپنے افغان ایجنٹوں اور خفیہ ایجنسیوں سے بھی لے سکتا تھا۔ روس اپنے ان استعماری عزائم کے

تحت افغانستان میں داخل ہوا تھا جو مدتوں سے اس کے سامنے تھے۔ جن کے تحت وہ وسط ایشیا پر قابض ہوا تھا۔ وہ افغانستان کے جذبۂ جہاد کو کچل کر یہاں کمیونزم کا بت کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ یہاں کے انمول معدنی وسائل کو اپنے قبضے میں لینے کا خواہش مند تھا۔ اس سے بڑھ کر وہ اس دروازے کو استعمال کر کے پاکستان کو گرفت میں لے سکتا تھا اور پھر بحرِ ہند کے راستے عرب ممالک تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ الغرض سوویت روس افغانستان کے ذریعے پورے عالمِ اسلام کو مغلوب کرنے اور دنیا کی سب سے بڑی طاقت بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر اسے معلوم نہ تھا، اس نے ایسی دھرتی پر قدم رکھ دیا ہے جہاں کے غیور مسلمان ہر دور میں سر دھڑ کی بازی لگا کر اپنے ایمان، آزادی اور عزت کی حفاظت کرتے آئے ہیں۔

چار بڑے اہداف: روس کے افغانستان پر حملے کے پسِ پردہ مقاصد کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں اور اس پر بڑی بحث ہو چکی ہے تاہم چند باتیں بہت واضح ہیں:

1. کمیونزم کا غلبہ...... روس کمیونزم کا داعی تھا اور دنیا بھر میں اس لادینی ولحدانہ نظام کو غالب دیکھنا چاہتا تھا۔

2. یہودی عزائم کی تکمیل...... کمیونزم کے بانی مارکس اور لینن یہودی تھے۔ روس میں بالشویک انقلاب برپا کر کے زار شاہی کو ختم کرنے اور اسے کمیونزم کا مرکز بنانے میں یہودی لابی پیش پیش تھی۔ ابلیس کے یہ نمایندے تسخیرِ عالم کے ناپاک منصوبے کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کمیونزم کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے۔ وسطِ ایشیا میں قصرِ اسلام کی اینٹ سے اینٹ بجادینے کے بعد افغانستان ان کی راہ میں حائل تھا۔ اسے مسخر کیے بغیر تسخیرِ عالم کا قدیم یہودی منصوبہ ادھورا رہ جاتا۔

3. گرم پانیوں تک رسائی...... روس عرصہ دراز سے گرم پانیوں تک رسائی کا خواہش مند تھا۔ اس کے لاکھوں مربع میل پر پھیلے ہوئے رقبے میں کوئی ایسا سمندر نہ تھا جو سال بھر کھلا رہتا ہو۔ یہ سمندر موسمِ سرما میں منجمد ہو جاتے تھے جس کی وجہ سے روس کے لیے بحری راستوں کے ذریعے تجارتی وعسکری مقاصد حاصل کرنا ناممکن تھا۔ روس کے زار پیٹر اول نے اپنے وصیت نامے میں تاکید کی تھی کہ ہمارے ملک کے لیے جنوب کی طرف بڑھ کر گرم سمندروں تک پہنچنا اور وہاں بحری معسکر قائم کرنا بہت ضروری ہے۔ یہ وصیت نامہ روسی حکمرانوں کی نظر میں ہمیشہ خاصی اہمیت کا حامل رہا اور اس کے مطابق جنوب کی فتوحات ان کی ترجیح میں شامل رہیں۔ افغانستان پر قابض ہوئے بغیر روس کا آگے بڑھنا محال تھا اس لیے یہ خطہ اس کی استعماری سرگرمیوں کا ایک عرصے سے نشانہ اور اس کے فتوحات کے منصوبے میں شامل تھا۔

❹ معدنی دولت پر قبضہ......روس افغانستان کی معدنی دولت اور قدرتی وسائل کو کسی روک ٹوک کے بغیر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد وہ خلیج کے مسلم ممالک کا تیل بھی اپنے قبضے میں لینے کے لیے بے تاب تھا۔ ماہرین ارضیات کے مطابق افغانستان میں تیل، گیس، فولاد، جست اور قیمتی پتھروں کے بے پناہ ذخائر مدفون ہیں۔ قدرتی گیس کے بعض ذخائر دریافت بھی کر لیے گئے تھے، یہ گیس سوویت یونین کو برآمد کی جارہی تھی اور اس کی قیمت عالمی منڈی کے نرخ سے کہیں کم تھی۔ گویا کم خرچ بالانشین والا معاملہ تھا۔ مگر اب روس یہ دولت براہِ راست اپنے قبضے میں لینا اور پھر خلیج کی اسلامی ریاستوں متحدہ عرب امارات وغیرہ کا تیل چھیننا چاہتا تھا۔

مولانا جلال الدین حقانی کی گواہی: اس سلسلے میں روس کی نظر صرف افغانستان پر نہیں تھی بلکہ وہ پاکستان پر قبضہ کیے بغیر اپنی مہم کو بالکل ادھورا سمجھتا تھا۔ عظیم مجاہد کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی نے ماہنامہ ''الحق'' کے جون 1988ء کے شمارے میں شائع ہونے والے اپنے انٹرویو میں دوٹوک الفاظ میں کہا تھا کہ اس خطے کے لیے روس کی حکمت عملی کا پہلا مرحلہ یہی تھا کہ افغانستان پر مکمل تسلط کے بعد پاکستان کے صوبہ سرحد اور بلوچستان پر قبضہ کیا جائے۔ روس اس راستے سے گرم پانیوں اور خلیج کے تیل کے چشموں تک رسائی کا عزم کیے ہوئے تھا۔

فوری سبب: یہ تو مستقل اسباب تھے جن کی بنا پر روس کو بہر حال افغانستان میں ایک نہ ایک دن قدم رکھنا تھا۔ داؤد خان اور ترہ کئی جیسے کمیونسٹ ایجنٹ شعوری یا لاشعوری طور پر روس کے اس انتہائی مقصد کے لیے زمین ہموار کرتے رہے تھے۔ مگر جب روس نے یہ دیکھا کہ اس کے ایجنٹ حالات پر قابو پانے اور اہداف کے حصول میں ناکام ہیں اور افغان علماء اور مجاہدین میدانِ جہاد میں اُتر کر کمیونسٹ نظام کے لیے خطرہ بن گئے ہیں تو اسے بازی پلٹتی محسوس ہوئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اگر بلا تاخیر پوری طاقت سے مجاہدین کو نہ کچلا گیا تو افغانستان کمیونزم کا مورچہ بننے کی بجائے اس کے خلاف اسلام کا قلعہ بن جائے گا۔ چنانچہ وہ افغانستان پر ٹوٹ پڑا۔ اور اس سلسلے میں کسی کی ملامت اور ناراضی کو خاطر میں نہ لایا۔

دنیا بے خبر تھی: 27 دسمبر 1979ء کو سرخ فوج کے افغانستان میں داخل ہونے کے بعد افغانستان دنیا کی نگاہوں کا محور بن گیا۔ چند دن پہلے تک کسی کو اندازہ نہ تھا کہ سوویت روس اس طرح افغانستان میں کھلی مداخلت کی جرأت کرے گا۔ امریکی سی آئی اے تک حقائق سے لاعلم تھی۔ امریکی ذرائع ابلاغ نے بھی باقی دنیا کی طرح یہ خبر 28 دسمبر کی صبح نشر کی۔ اور تو اور خود پاکستان تک کو بھنک نہ پڑسکی۔ جنرل ضیاء الحق کو امین سے روس کی ناراضی اور اس کے امریکا کی طرف جھکاؤ کا اچھی طرح علم تھا، وہ روس کے

افغانستان میں بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ سے بھی فکر مند تھے اور امین کو سہارا دینا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے 23 دسمبر کو وزیر خارجہ پاکستان آغا شاہی کو کابل بھیجنے کا فیصلہ بھی کیا تھا مگر برف باری کے سبب یہ سفر ملتوی ہو کر 28 دسمبر کو طے کیا گیا تھا۔ اس دن دوبارہ آغا شاہی آمادۂ سفر تھے مگر علی الصبح سوویت یلغار کی اطلاع ملی۔ اگر پاکستانی ایجنسیوں کو اس کی ذرا بھی پیشگی خبر ہوتی تو آغا شاہی کا دورہ 28 دسمبر کو طے نہ کیا جاتا۔

روس کا نیا مہرہ: چند دن تک دنیا بھر میں چہ می گوئیاں ہوتی رہیں کہ اب افغانستان کا نیا نظام حکومت اور سیاسی سیٹ اَپ کیا ہوگا؟ مگر سوویت یونین پہلے ہی اس مقصد کے لیے ایک مہرہ تیار کر چکا تھا۔ یہ ببرک کارمل تھا۔

کمیونسٹ پرچم پارٹی کا سربراہ ببرک کارمل 1929ء میں درّانی قبیلے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا خاندان افغانستان میں نہایت معزز شمار ہوتا تھا۔ اس کا باپ محمد حسین خان ہرات اور پکتیا کا گورنر رہا تھا۔ وہ جدید تعلیم کا دلدادہ تھا مگر عام افغانوں کی طرح کمیونزم سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ ایک حد تک وہ روایتی مسلمان تھا۔ پختون ہونے کے باوجود اس خاندان میں پشتو کی بجائے دری زبان بولی جاتی تھی۔

کارمل نے کابل کے امانیہ ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی جو شاہ امان اللہ خان نے ملک میں جدید تعلیم عام کرنے کے لیے کھولا تھا۔ اس نے 1948ء میں ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کی۔ 1960ء میں اس نے قانون وسیاسیات میں یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی۔ اس دوران افغانستان کے سیاسی معاملات کے علاوہ نظامِ تعلیم میں بھی کمیونسٹ اثرات غالب آتے جارہے تھے۔ یہ داؤد خان کی ''جدید اصلاحات'' کا کرشمہ تھا۔ کارمل اس ماحول سے متاثر ہوا اور ''مارکسی نظریات'' کا پیروکار بن گیا۔ اس کی ذہن سازی میں کمیونسٹ دانشور اور صحافی میر اکبر کا بڑا ہاتھ تھا۔

1965ء میں افغانستان میں سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کی اجازت ملی تو ترہ کئی کے ساتھ مل کر کمیونسٹ پارٹی، پی ڈی اے (پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان) بنانے میں اس کا کردار نمایاں تھا۔ یہ پارٹی کے چند بنیادی ارکان میں شامل تھا۔ بعد میں اختلاف کے باعث ترہ کئی نے ''خلق پارٹی'' اور کارمل نے ''پرچم پارٹی'' کے نام سے الگ الگ دھڑے بنالیے۔ تاہم اپریل 1973ء کے انقلاب ثور میں یہ دونوں دھڑے یکساں طور پر شریک تھے۔ حکومت سازی میں بھی ببرک کارمل کا نمایاں مقام تھا۔ یعنی ترہ کئی کے بعد اس کو نائب وزیر اعظم بنایا گیا تھا۔ مگر کچھ دنوں بعد ترہ کئی نے اسے معطل کر کے سفیر کی حیثیت سے چیکوسلواکیہ بھیج دیا تھا۔ کارمل تب سے وہاں ''پراگ'' میں کرب وانتظار کی زندگی گزار رہا تھا۔

ببرک کارمل، روس کی کٹھ پتلی: سوویت روس نے افغانستان پر باقاعدہ حملہ کرنے سے پہلے جب

اپنے مہروں پر نظر دوڑائی تو کارمل سب سے موزوں نظر آیا۔ چنانچہ اسے اپنے عزائم سے آگاہ کر دیا گیا۔ کارمل نے اقتدار کی پُرکشش قیمت پر اپنی وفاداریاں سوویت یونین کے نام کر دیں۔ ماسکو ہی میں کارمل کی وہ تقریر ریکارڈ کی گئی جو 27 دسمبر کی شب روسی افواج کے ہاتھوں امین کے قتل کے بعد کابل ریڈیو سے افغان عوام کو سنائی گئی تھی۔ حالانکہ کارمل ابھی افغانستان پہنچا بھی نہیں تھا۔ اس تقریر میں کارمل نے جو کچھ کہا تھا، اس کا لب لباب یہ ہے:

"میرے بہادر و دلیر ہم وطن خواتین و حضرات! میں آپ سے اظہارِ عقیدت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ نے حفیظ اللہ امین کے دور میں ہونے والے ظلم و ستم، جبری ہجرت، انسانیت سوز مظالم اور ہزاروں افراد کے بے رحمانہ قتل عام کا مشاہدہ کیا۔ اس کی براہِ راست نگرانی میں خوں آشام درندوں نے عوام کو قصائیوں کی طرح کاٹا کیونکہ حفیظ اللہ امین امریکی جاسوس ادارے سی آئی اے کا ایجنٹ تھا۔ یہ امریکی سامراجی نظام عوام کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے جو کہ اس کی ابلیسی حرکتوں اور فرعونی کارستانیوں سے تنگ آ گئے تھے۔"

<u>کیا امین سی آئی اے کا ایجنٹ تھا؟</u> ببرک کارمل کی یہ تقریر جھوٹ اور فریب کی بدترین کی مثال تھی۔ دنیا جانتی ہے کہ امین کو قتل کرنے میں افغان عوام کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ لوگ اس سے متنفر ضرور تھے مگر اسے قتل کرنے کے لیے خود روس نے کے جی بی کے کمانڈوز بھیجے تھے جن کی قیادت جنرل وکٹر پاپوٹن (Papotin) کر رہا تھا۔ یہ جنرل اس لڑائی میں خود بھی شدید زخمی ہوا تھا اور کچھ دنوں بعد مر گیا تھا۔ بہرکیف سوویت یونین اور اس کے ایجنٹوں نے دنیا کو یہی دکھانے کی کوشش کی کہ امین کا قتل مقامی عوام کے ردِعمل کا نتیجہ ہے۔ روس کی خبر رساں ایجنسیوں نے نہ صرف یہ بے بنیاد خبر مشہور کی کہ امین سی آئی اے کا ایجنٹ تھا بلکہ یہاں تک دعویٰ کیا کہ وہ امریکا کے ایما پر افغانستان کی اسلامی جماعتوں کے ساتھ مل کر 1978 کے انقلاب ثور کے تمام اثرات کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حالانکہ اسی حفیظ اللہ امین کو ستمبر 1979ء میں برسرِ اقتدار آنے پر روسی صدر برزنیف نے مبارک باد دی تھی۔

روس افغانستان میں ایک لاکھ سپاہی داخل کر دینے کے بعد یہ ڈھنڈورا بھی پیٹ رہا تھا کہ اس نے حفیظ اللہ امین کی درخواست پر عسکری مداخلت کی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ سی آئی اے کا ایجنٹ ہوتا تو وہ روس سے مداخلت کی درخواست کیسے کر سکتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ سی آئی اے کا ایجنٹ تھا نہ اسلام پسند جماعتوں سے اس کا کوئی تعلق تھا۔ وہ بھی ایک پکا کمیونسٹ تھا مگر تره کئی سے ذرا کم درجے کا۔ یہ بھی روسی پروپیگنڈا تھا کہ امین نے روس سے مداخلت کی اپیل کی تھی۔ حقیقت اس کے بالکل

برعکس تھی۔ امین کمیونسٹ ہونے کے باوجود سوویت یونین کے بڑھتے ہوئے دباؤ سے خوفزدہ تھا۔ وہ روسی فوج کو مداخلت کی دعوت نہیں دے سکتا تھا؟ بالفرض اگر روسی فوج اس کی اپیل پر دوستانہ مدد کے لیے آئی تھی تو اس نے آتے ہی سب سے پہلے امین کو کیوں قتل کیا؟

اصل میں روس اس سے خوفزدہ تھا کہ امین اس کے جرائم کے خلاف سب سے بڑا چشم دید گواہ نہ بن جائے اور کل کلاں دنیا کو یہ نہ بتادے کہ روس نے اس کو دھوکے میں رکھتے ہوئے افغانستان میں اتنی بڑی مداخلت کرڈالی ہے۔ چنانچہ روس نے اس عینی گواہ کو سب سے پہلے ختم کیا۔ پھر دنیا کو بتایا کہ ہمیں امین نے بلایا تھا اور افغان عوام نے اسے بے پناہ مظالم ڈھانے اور امریکا کی دلالی کرنے کے باعث قتل کردیا ہے۔

ببرک کارمل ایوانِ صدر میں: امین کے قتل کے چار دن بعد روس نے اپنا نیا مہرہ افغانستان میں اُتار دیا۔ کارمل سوویت یونین کی موٹر رائفل ڈویژن نمبر 360 کے حفاظتی حصار میں ایک ٹینک پر سوار کابل کے ایوانِ صدر پہنچا۔ یہ یکم جنوری 1980ء کی بات ہے۔ راتوں رات سوویت یونین کے آزمودہ وفاداروں پر مشتمل ایک کابینہ تشکیل دے دی گئی جس میں جنرل عبدالقادر، میجر اسلم وطن یار، اسداللہ سروری، فیض محمد، میجر شیر جان مزدوریار، محمد رفیع، سلطان علی کشتمند اور محمد گلاب زئی جیسے کمیونسٹ شامل تھے۔ روس نے کابینہ میں پرچمی اور خلقی دونوں عناصر شامل کروائے تھے تاکہ توازن برقرار رہے۔

اسداللہ سروری اور سلطان علی کشتمند دونوں نائب وزیر اعظم قرار دیے گئے۔ انا بیتا رطب زاد (خاتون) کو وزیر تعلیم، محمد رفیع کو وزیرِ دفاع، محمد گلاب زئی کو وزیر داخلہ، دوست محمد کو وزیر خارجہ، مزدوریار کو وزیر ٹرانسپورٹ اور فیض محمد کو وزیر قبائلی اُمور بنادیا گیا۔ کارمل خود ملک کا وزیر اعظم، انقلابی کونسل کا صدر اور مسلح افواج کا کمانڈر انچیف مقرر ہوا۔ گویا تمام کلیدی عہدے اسی کے پاس تھے۔ ایک نیا محکمہ افغانستان کی پہلی خفیہ ایجنسی کے طور پر قائم کیا گیا۔ جسے ''خدمت دولتی'' یا ''خاد'' کہا جاتا تھا۔ پرچمی کمیونسٹ ڈاکٹر نجیب اللہ کو اس کا سربراہ بنایا گیا۔

کارمل کے اقدامات: کابل پہنچنے کے دو دن بعد 3 جنوری 1980ء کو کارمل نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اپنے نئے پروگرام کا اعلان کیا اور عوام کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ نئی حکومت مسائل پر بہت جلد قابو پالے گی۔ ہر کمیونسٹ حکمران کی طرح اس نے زرخرید مذہبی رہنماؤں کو استعمال کرتے ہوئے مذہبی طبقے کی تشویش دور کرنے کی کوشش بھی کی۔ پھر اس نے سابقہ حکومت کے مظالم کا سدباب کرنے کا اعلان کرتے ہوئے جیلوں سے آٹھ ہزار کے لگ بھگ قیدی رہا کردیے۔ مگر یہ ایک دھوکا تھا۔ رہا ہونے والے اکثر قیدی وہی کمیونسٹ تھے جو کارمل کے حامی تھے اور امین سے سیاسی

رقابت کی پاداش میں سزا بھگت رہے تھے۔ عام قیدیوں کو ''رحم دلی کے اس دریا'' سے ایک گھونٹ بھی نہ ملا۔ کارمل اپنا سیاسی قد بڑھانے کے لیے امین پر تنقید کرتا رہا۔ اس نے یہ بھی الزام عائد کیا کہ امین افغانستان کے پختون صوبے پاکستان کے حوالے کرنا چاہتا تھا اور اس وطن فروشی کی جگہ اب قوم کو ''محب وطن قیادت'' نصیب ہوئی ہے۔ مگر عوام پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ایک کمیونسٹ کی کارکردگی روس کو خوش نہ کر سکی تو وہ دوسرے کمیونسٹ کو آگے لایا گیا ہے۔ ان کے نزدیک کارمل کی لچھے دار تقاریر بے معنی تھیں، اس کے چمکدار پروگرام اور منصوبے خرافات کا انبار تھے۔ وہ اسے روس کی کٹھ پتلی تصور کرتے تھے اور یہ سو فیصد درست تھا۔ کارمل بذاتِ خود ہر وقت روسیوں کے رحم وکرم پر تھا۔ اس کے ڈرائیور، محافظ، باورچی، معالج سب روسی تھے۔ وہ روس کے اشارہ پر ناچنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

<u>کارمل کے منصوبے:</u> کارمل نے افغان عوام کو اپنا حامی بنانے کے لیے جو کھوکھلے اور لاحاصل منصوبے پیش کیے تھے ان کی ایک جھلک یہ ہے:

① ایک نیا نعرہ ملک بھر میں متعارف کرایا گیا: ''آگے بڑھیے اور قیامِ امن میں ساتھ دیجیے۔''
② کہا گیا کہ قید وبند اور پھانسی کی سزائیں ختم کر دی جائیں گی۔
③ تمام غیر انسانی غیر جمہوری قواعد وضوابط منسوخ کر دیے جائیں گے۔
④ اسلام کے مقدس احکام، آئین، اُصولوں، قانون وانصاف، مذہبی اعتقادات اور آزادیِ خیال ونظریے کا احترام کیا جائے گا۔
⑤ بے جا ٹیکس ختم کیے جائیں گے۔
⑥ محب وطن جماعتوں، عوامی وسماجی تنظیموں، آزادی صحافت اور آزاد مواصلات کی حوصلہ افزائی کی جائیگی۔

لیکن یہ سب کچھ دکھاوا تھا۔ افغانستان میں اصل آقا اب سوویت مشیر تھے جو اعلیٰ عہدوں، وزارتوں اور عسکری مناصب سے لے کر زراعت اور تعلیم تک ہر شعبے میں پوری طرح مداخلت کر رہے تھے۔

<u>کمیونزم کا بھرپور پرچار:</u> کارمل کی نام نہاد اصلاحات کے پردے میں کمیونزم کا پرچار پوری تیزی سے کیا جا رہا تھا۔ تجارتی تنظیموں تک کو سوویت نظام کے مطابق کام کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ہر ماہ سینکڑوں افغان بچوں کو روسی نظریات کا خوگر بنانے کے لیے ماسکو بھیجا جانے لگا۔ ''ڈیموکریٹک'' کے نام سے افغان نوجوانوں اور ''پونیئرز'' کے نام سے افغان نوجوان لڑکیوں کی تنظیمیں قائم کی گئیں جو نئی نسل کو روس نواز بنانے کے لیے سرگرم تھیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں نیا نصاب متعارف کرایا گیا جس میں کمیونزم کو

جذب کر دیا گیا۔ تعلیمی اداروں میں انگریزی کی بجائے روسی زبان کو لازمی مضمون کی حیثیت دے دی گئی۔ تمام اساتذہ کو تنبیہ کر دی گئی کہ وہ کیمونسٹ پارٹی ''پرچم'' میں شامل ہو جائیں ورنہ انہیں برخاست کر دیا جائے گا۔ ملک کے سب سے بڑے تعلیمی مرکز کابل یونیورسٹی میں سوویت یونین کے کیمونسٹ اور ملحد اساتذہ کو تعینات کر دیا گیا۔ تمام نیوز ایجنسیوں اور اخبارات بلکہ رسالوں اور ڈائجسٹوں تک کو پابند کر دیا گیا کہ وہ سوویت یونین سے مواد لیا کریں۔ کابل ریڈیو کو نشریاتی مواد حاصل کرنے کے لیے روس کا محتاج بنا دیا گیا۔ اس کی اکثر نشریات اب سوویت یونین کے ٹرانسمیٹر سے حاصل کی جانے لگیں۔

کیمونسٹوں کا تناسب: بڑے نسلی ولسانی گروہوں خصوصاً پختونوں، تاجکوں، اُزبکوں اور فارسی بانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کی خاصی تعداد کیمونسٹوں پر مشتمل تھی، مگر چونکہ افغانستان میں اکثریت ناخواندہ ہے اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب بہت کم ہے اس لیے مجموعی طور پر ملک بھر میں کیمونسٹ 5 فیصد سے بھی کم تھے۔ ان کا زیادہ زور کابل میں نظر آتا تھا جو ملک کا سیاسی وتجارتی مرکز تھا۔ جبکہ باقی شہروں اور دیہاتوں میں ان کی تعداد برائے نام تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کیمونسٹ کبھی انتخابات میں فتح یاب ہو کر حکومت نہیں بنا سکے بلکہ جبر وتشدد اور خونیں انقلابات کے ذریعے برسر اقتدار آئے۔ عوامی حمایت سے اس محرومی کے سبب ان کی اسلام دشمن پالیسیاں عوام کو مزید متنفر کرتی رہیں۔ یہ ایک المیہ ہی تھا کہ چند فیصد کیمونسٹ عملاً پورے ملک پر چھائے ہوئے تھے۔ سیاست، تعلیم، فوج غرض ہر جگہ ان کی اجارہ داری تھی اور ایک کروڑ تیس لاکھ افراد ان کی ستم رانیوں کے لیے تختۂ مشق بنے ہوئے تھے۔

پرچم اور خلق کے اختلافات: کارمل اور اس کے آقاؤں کے الحادی اقدامات سے ملک میں عوامی نفرت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ اشتعال سے لبریز غیور افغان مسلمان صرف یہ چاہتے تھے کہ غاصب روسی افواج ملک سے نکل جائیں اور ملک کی سیاست کا فیصلہ علماء، قبائلی عمائد اور مقامی مخلص رہنماؤں کی مرضی سے ہو۔ روسی فوجوں کے کندھوں پر بیٹھ کر کارمل کا ان کے ملک کی مسند اقتدار تک پہنچ جانا، ان کے لیے ایک تحقیر آمیز طمانچے سے کم نہیں تھا۔ ہر افغان مسلمان اس صورتِ حال پر رنجیدہ تھا۔ اور تو اور خود افغان کیمونسٹوں میں بھی ایک بڑی تعداد روس کی مداخلت پر چیں بہ جبیں تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ کارمل کے اقتدار سنبھالتے ہی سول انتظامیہ اور سرکاری اداروں سے تعلق رکھنے والے ہزاروں لوگ ملازمتیں چھوڑ گئے۔ کئی ملکوں میں افغان سفیروں نے استعفیٰ دے دیا۔ افغانستان کی بعض کھلاڑی ٹیمیں غیر ملکی دوروں پر تھیں انہوں نے وطن واپس جانے سے انکار کر دیا۔

ناراض کیمونسٹوں میں زیادہ تر ''خلق'' کے لوگ تھے۔ کیونکہ روسی مداخلت نے ان کا اقتدار ختم کر دیا

تھا مگر ناراض پرچمیوں کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ فروری 1980ء تک تین ہزار سے زائد خلقی اور پرچمی افراد سرکاری ملازمتوں سے استعفے دے چکے تھے۔ کارمل کے دورِ حکومت کے آغاز میں خلق اور پرچم دھڑوں میں باقاعدہ خانہ جنگی کی صورتِ حال پیدا ہوگی۔ خلقیوں نے ترہ کئی اور امین کے دور میں پرچموں کو رومال تھا۔ اب پرچمی جیل سے رہا ہوتے ہی معتوب خلقیوں کے گرد گھیرا تنگ کرنے لگے۔

روسی افواج اور کیمیائی ہتھیار: کارمل کی حکومت برائے نام ہی تھی۔ اس لیے روس کو اسے بچانے اور فعال رکھنے کے لیے زبردست تحفظ فراہم کرنا پڑا۔ سرخ افواج اب بگرام ایئربیس، کابل کی چھاؤنیوں اور شاہراہ سالانگ پر بکثرت نظر آتی تھیں۔ عسکری لحاظ سے شاہراہ سالانگ نہایت اہمیت کی حامل تھی۔ سوویت یونین سے کابل تک افواج کے آنے جانے کا واحد زمینی راستہ یہی تھا۔ بہت جلد روسی کنڑ اور جلال آباد بھی پہنچ گئے۔ جلال آباد میں ایک مکمل رائفل ڈویژن تعینات کردیا گیا۔ سرخ افواج نے آتے ہی امن وامان قائم کرنے کے نام پر ظلم وستم کے نئے ریکارڈ قائم کرنے شروع کردیے تھے۔ صدیوں سے ماسکو افغان مسلمانوں کو اپنا سخت ترین حریف تصور کرتا آیا تھا۔ اب یہ آزاد منش غیور مسلمان اپنے نام نہاد حکمرانوں کے سیاہ کرتوتوں کی پاداش میں ماسکو کی درانتی تلے آچکے تھے۔

ابھی سرخ افواج کو آئے تین ہفتے بھی نہیں ہوئے تھے کہ کئی مقامات پر افغانوں کی مسخ شدہ لاشیں برآمد ہوئیں۔ اندازہ لگایا گیا کہ انہیں کیمیائی ہتھیاروں سے قتل کیا گیا ہے۔ نیز مجاہدین کے مقابلے میں ہلاک ہونے والے روسیوں کے سامان سے گیس ماسک ملنا بھی اس گھناؤنے جرم کا راز فاش کرتا تھا۔ مغربی میڈیا میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ روس نے کیمیائی ہتھیاروں سے لڑنے والے کئی یونٹ افغانستان بھیجے ہیں۔

قراردادِ مذمت اور برزنیف کا موقف: روس کے سب سے بڑے مخالف امریکا کو افغانستان میں اس مداخلت پر نہایت تشویش تھی کیونکہ وہ خود اس خطے پر اپنے اثرات بڑھانے اور روسی اثر ورسوخ کو ختم کرنے کے لیے بے چین تھا۔ چنانچہ 14 جنوری 1980ء کو سلامتی کونسل کا اجلاس ہوا۔ 104 ممالک نے سوویت یلغار کے خلاف ووٹ دیا جبکہ اس کے حق میں صرف 18 ووٹ آئے۔ عالمی رائے عامہ کے اس دباؤ کے جواب میں روسی صدر برزنیف نے کہا کہ ان کی فوج افغان حکومت کی طلب پر وہاں قیام امن کے لیے گئی ہے۔ دونوں ملکوں کے مابین معاہدے کی شق 4 کے تحت یہ عمل بالکل جائز ہے۔ برزنیف نے یہ بھی کہا کہ اگر مداخلت نہ کی جاتی تو روس کے جنوب میں سنگین حالات پیدا ہوجاتے جنے ہم کسی طرح برداشت نہیں کرسکتے تھے۔

روس کو کیا خطرہ لاحق تھا؟ یہ "سنگین حالات" کیا تھے؟ برزنیف نے اس کی وضاحت نہیں کی۔ مگر

حقیقت یہ ہے کہ یکے بعد دیگرے کمیونسٹ حکومتوں کی ناکامی اور ان کے خلاف مجاہدین کی کامیاب کارروائیوں کو دیکھتے ہوئے روس کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں افغانستان میں اس کی منصوبہ بندی کے بالکل برعکس کمیونسٹوں کی جگہ ایک اسلام پسند حکومت قائم نہ ہو جائے جو اشتراکیت کی خاطر اس کی 60 سالہ کوششوں پر پانی پھیر دے۔

اس دور کے حالات کے گہرے جائزے، افغانستان کی صورتِ حال کے مطالعے اور پھر برزنیف کے اس بیان پر غور کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ روس کے افغانستان پر یکدم اتنے بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ ٹوٹ پڑنے کی سب سے بڑی اور فوری وجہ یہی تھی۔ اگرچہ دیگر اسباب اور وجوہ جو مستقل حیثیت رکھتے تھے، اپنی جگہ اہم تھے۔ مثلاً: گرم پانی تک رسائی، امریکا کے بڑھتے ہوئے دائرۂ کار کی روک تھام، کمیونزم کو دیگر ملکوں تک پھیلانے کی خواہش وغیرہ۔

دنیا روسی یلغار کی جو وجوہ بھی بیان کرے، اسے افغان حکومتوں اور ماسکو کی کشاکشی قرار دے یا امریکا اور روس کی جنگ...... خود افغان مسلمانوں پر یہ واضح تھا کہ یہ ہولناک یورش اصل میں اسلام کے خلاف ہے، یہاں اسلامی حکومت بننے کے امکانات کو روکنے کے لیے ہے۔ وہ جانتے تھے کہ روس نے وسط ایشیا میں اللہ اور رسول کا نام لینے پر پابندی لگادی ہے۔ مساجد کو مقفل اور مدارس کو ویران کر دیا ہے۔ اب وہ یہی قیامت افغانستان میں بھی ڈھانا چاہ رہے ہیں۔ چنانچہ افغانوں کی فطری و مذہبی غیرت کو جوش آیا اور وہ نہایت تیزی سے اپنے اپنے علاقائی مجاہد رہنماؤں کی قیادت میں جمع ہونے لگے۔ یہاں سے جہادِ افغانستان کی وہ درخشاں تاریخ شروع ہوتی ہے جسے لکھتے ہوئے اسلامی مؤرخ کے قلم کا ہر لفظ احترام و عقیدت کے جذبات سے سرشار ہو جاتا ہے۔

جنرل ضیاء الحق کی دور اندیشی: جیسا کہ یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ روس کا منصوبہ افغانستان کی فتح کے بعد بحیرہ عرب کے گرم پانیوں تک رسائی حاصل کرنا تھا۔ دوسرے لفظوں میں پاکستان کے ساحلی علاقے اس کے اہم اور قدیم ترین اہداف میں شامل تھے۔ اس لیے روسی یلغار سے پاکستان کو تشویش لاحق ہونا ایک لازمی امر تھا۔ پاکستان کے فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق اگرچہ جمہوری نظام میں رخنے ڈالنے اور 1973ء کے آئین میں چند ترامیم کرانے کے باعث ملک کی سیاسی پارٹیوں کے نزدیک قابلِ ملامت رہے ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ انہوں نے سوویت یلغار کا مقابلہ جس پامردی سے کیا وہ تاریخ کا روشن باب ہے۔

ان کی عسکری دور اندیشی نے روس کے حملے کے مضمرات اور اس کے "آیندہ اہداف" کو بھانپ لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے فوراً یہ اعلان کیا کہ افغانستان پر حملہ دراصل پاکستان کی سلامتی پر ضرب ہے۔ افغان

مجاہدین پاکستان کے تحفظ کی جنگ لڑ رہے ہیں لہٰذا ہر ملک اور عوام کو ان کی غیر مشروط طور پر مدد کرنا چاہیے۔

پاکستان نے سرحدیں کھول دیں: انہوں نے پاکستان کی سرحدیں افغان مجاہدین اور مہاجرین کے لیے مکمل طور پر کھول دیں۔ صوبہ سرحد میں مہاجرین کی خیمہ بستیوں میں روزانہ ہزاروں لٹے پٹے افغان آ کر پناہ لیتے اور حکومت پاکستان ان کی ہر ممکن مدد کرتی۔ ان مہاجرین کو اجازت تھی کہ وہ ملک کے کسی بھی علاقے میں جا کر تلاشِ روزگار کر سکتے ہیں۔ مجاہد رہنما پورے تحفظ کے ساتھ پاکستان میں داخل ہوتے۔ ان کی اہم اور بڑی مشاورتی مجالس پشاور میں منعقد ہوا کرتی تھیں جہاں مجاہد تنظیموں کے دفاتر بکثرت تھے۔

جنرل ضیاء الحق نے وزارتِ خارجہ کو تاکید کر دی تھی کہ وہ دنیا کے ہر فورم اور ہر سطح پر سب سے پہلے مسئلہ افغانستان کی آواز اُٹھائے اور اس سلسلے میں کسی مصلحت کو خاطر میں نہ لائے۔ حکومت پاکستان کی اس جدوجہد نے بہت جلد عرب ممالک کو اس خطرے کا احساس دلا دیا جو سوویت درانتی کی شکل میں عالمِ اسلام کے تشخص کو پارہ پارہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ چنانچہ عرب شیوخ نے افغان مہاجروں اور مجاہدوں سے مالی تعاون کے لیے دل کھول کر امداد فراہم کرنا شروع کر دی۔

امریکا حقائق سے لاعلم رہا: بلاشبہ امریکا نے اس جنگ میں بطورِ خاص دلچسپی لی اور روس مخالف مغربی ممالک بھی اس میں اپنا حصہ ڈالتے رہے۔ ان کی یہ ہمدردیاں محض اپنے مفادات کے تحفظ اور روس سے دیرینہ عداوت نکالنے کے لیے تھیں۔ امریکا نے افغان جنگ کے لیے اسلحہ بھی فراہم کیا کیونکہ روس کو اس خطے میں روکنا اس کی اہم ترین ترجیح تھی۔ مگر اس سے مجاہدین کے جہاد کی حیثیت تبدیل نہیں ہو سکتی۔ یہ جنگ کفر و اسلام کے عالمی معرکے کی حیثیت سے شروع ہوئی تھی اور اسی حیثیت سے اس کا اختتام ہوا۔

ہم جنگ کے آغاز میں دیکھتے ہیں کہ دنیا کو افغانوں کے احوال کا کچھ پتا نہ تھا۔ داؤد خان اور ترہ کئی کے دور میں یہ مجاہد پرانی رائفلوں حتیٰ کہ توڑے دار بندوقوں، تلواروں اور خنجروں سے لڑ رہے تھے۔ تقریباً چار برس تک کسی بیرونی اعانت کے بغیر یہ سلسلہ جاری رہا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے افغان جہادی رہنماؤں سے رابطے ضرور تھے مگر امریکا کا اس سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امریکا کی بدنام زمانہ سی آئی اے تک کو سوویت عزائم کا اندازہ نہ ہو سکا۔

مونگ پھلی کے دانے: جب 27 دسمبر 1979ء کو سوویت یونین کی افواج افغانستان میں گھس گئیں تب امریکا کو اپنی غفلت پر ندامت ہوئی مگر صدرِ امریکا جمی کارٹر سمیت ان کی کابینہ کے کسی فرد کو توقع نہ تھی کہ افغانستان کی مزاحمت چند ہفتوں سے زیادہ برقرار رہ سکے گی۔ دو سال تک افغان مجاہدین صرف اپنے بل بوتے پر اس سخت ترین جہاد میں مصروف رہے۔ یہ ابتدائی دو سال اس لحاظ سے نہایت

ہولناک تھے کہ روس نہایت آزادی سے عوام کا قتل عام کرتا چلا جارہا تھا اور کسی مبالغے کے بغیر خون کے دریا بہا رہا تھا۔ روسی طیارے روزانہ جگہ جگہ بمباری کر رہے تھے مگر دنیا خاموش تماشائی بنی دیکھ رہی تھی۔ مجاہدین کے پاس جدید اسلحہ تھا نہ ذرائع مواصلات، علاج معالجے کا انتظام تھا نہ کوئی پناہ گاہ۔ جنرل ضیاء الحق برابر کوشش کر رہے تھے کہ امریکا اور مغربی ممالک روس پر دباؤ ڈالیں اور مجاہدین کو جدید اسلحہ فراہم کیا جائے جو روسی اسلحے کی ٹکر کا ہو۔ مگر سب کو یقین تھا کہ آج نہیں تو کل مجاہدین سرنگوں ہو جائیں گے، لہٰذا کسی مغربی ملک نے اس خسارے کے کاروبار میں سرمایہ کاری کی ضرورت نہ سمجھی۔

بہت کہنے سننے کے بعد امریکی صدر جمی کارٹر نے جنرل ضیاء الحق کو افغانستان کے لیے معمولی سی امداد پیش کی جسے جنرل ضیاء الحق نے ''مونگ پھلی کے دانے'' کہہ کر مسترد کر دیا۔ مونگ پھلی کے دانے'' کہنے میں یہ دلچسپ نکتہ مضمر تھا کہ صدر جمی کارٹر ذاتی کاروبار کے اعتبار سے مونگ پھلی کی کاشت کاری کے لیے مشہور تھے۔

جنرل ضیاء الحق کی پالیسی: روس افغان جہاد سے متعلق صدر ضیاء الحق کی پالیسی نہایت برمحل اور کامیاب تھی۔ اگر وہ اس جنگ میں براہِ راست شامل ہو جاتے تو غالباً بازی ہار جاتے کیونکہ بھارت اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر پاکستان پر پشت سے حملہ کر دیتا۔ مگر افغانستان کو اس کے حال پر چھوڑ دینا بھی نادانی تھی جس کا خمیازہ پاکستان ہی کو بھگتنا پڑتا۔ لہٰذا جنرل ضیاء الحق نے ایک محتاط اور مؤثر راستہ اپنایا۔

انہوں نے نہ صرف پورے عالمِ اسلام بلکہ مغربی دنیا کو بھی افغانستان کی شدت اور روس کی زیادتیوں کا احساس دلایا اور یوں روس کو سفارتی طور پر تنہا کر دیا۔ افغان مہاجرین اور مجاہدین کے لیے عالمی امداد کی فراہمی میں ان کا کردار سب سے نمایاں رہا۔ پھر ایک طرف انہوں نے مہاجرین کے لیے پاکستان کو دوسرا گھر بنا دیا اور دوسری طرف اس جہاد میں شرکت کے لیے دنیا بھر سے آنے والے مجاہدین کے لیے بھی پاکستان کے دروازے کھول دیے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود انہوں نے روس سے تعلقات اتنے کشیدہ نہیں ہونے دیے کہ نوبت جنگ تک پہنچ جاتی۔ روس کی شکایات اور احتجاج کا نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ جواب دیا گیا۔ جس میں معذرت تھی نہ اشتعال انگیزی بلکہ ایک باوقار اور دوٹوک انداز تھا۔ جنرل صاحب کی پوری ٹیم اسی انداز سے کام کر رہی تھی۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ روسی سفیر صوبہ سرحد آیا اور وہاں کے گورنر جنرل فضل حق سے مہاجرین افغانستان کو پناہ دینے پر ناراضی کا اظہار کیا اور مطالبہ کیا کہ ان مہاجرین کو روکا جائے۔ جنرل فضل حق نے برملا جواب دیا: ''یہ کام ہمارے بس سے باہر ہے۔ بارڈر اتنا

طویل ہے کہ ہم اپنی ساری نفری لگا کر بھی مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کر سکتے۔ پھر ہمیں اپنے عوام کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ ان کی غیرت اپنے بھائیوں کا راستہ بند کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔‘‘

روسی سفیر نے دوبارہ اپنے موقف پر اصرار کیا تو جنرل فضل حق نے کہا: ’’آپ سپر پاور ہیں، آپ افغانستان کی جانب سے بارڈر بند کر دیں تاکہ مہاجرین ہمارے پاس آہی نہ سکیں۔ روسی سفیر نے اسے ناممکن قرار دیا تو جنرل فضل حق نے کہا: ’’جب آپ سپر پاور ہو کر ایسا نہیں کر سکتے تو ہم اس قابل کہاں کہ مہاجرین کو روک سکیں۔‘‘ اس پر روسی سفیر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

جہادِ افغانستان عظیم ترین جہاد تھا: یہ کہنا حقائق کو مسخ کرنے کے مترادف ہوگا کہ افغان جنگ امریکا اور روس یا اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام کی جنگ تھی۔ تاریخی حقائق بتاتے ہیں کہ بنیادی طور پر یہ جنگ مسلمانوں کی نسل کشی، اسلامی عقائد و نظریات کی پامالی اور اسلامی تہذیب و تمدن کی تباہی کے اس سلسلے کی کڑی تھی جو سترہویں صدی عیسوی سے جاری تھا۔ روس وسط ایشیا کے مسلمانوں کو زندہ درگور کرنے کے بعد افغانستان کو بھی اسی انجام سے دوچار کرنا چاہتا تھا۔ اب اگر یہاں مجاہدین اس کی راہ میں مزاحمت کی مضبوط دیواریں کھڑی نہ کر دیتے تو روس پاکستان کے بعد بحیرۂ عرب کے راستے خلیجی ریاستوں سے لے کر مشرقِ وسطیٰ تک کے اسلامی ممالک پر قبضہ کرتا چلا جاتا۔ پاکستان سے مصر تک کوئی ملک ایسا نہ تھا جہاں پہلے سے کمیونسٹ پارٹیاں موجود نہ ہوں اور وہاں وسطِ ایشیا اور افغانستان کی طرح کمیونزم کی کاشت زور و شور سے نہ ہو رہی ہو اور روسی افواج کے لیے زمین ہموار نہ کی جا رہی ہو۔

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو افغان جنگ کو تاریخ اسلام کا عظیم ترین جہاد کہنا چاہیے۔ یہ وہ جہاد تھا جس میں بے سروسامان پس ماندہ اور فاقہ کش مسلمان دنیا کی سب سے بڑی طاقت سے ٹکرا گئے۔ جس میں مشرق و مغرب کے اہلِ ایمان یکجا ہو کر کفر کے راستے میں ڈٹ گئے۔ جس میں اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے وہ نظارے دکھائی دیے کہ بدر و احزاب کی یادیں تازہ ہونے لگیں۔

جہاد کے چار مراحل: کمیونزم کے خلاف افغان مسلمانوں کے جہاد کو ہم چار مراحل یا چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا دور...... ظاہر شاہ کے آخری ایام اور داؤد خان کے ایامِ اقتدار پر مشتمل ہے۔ جس میں علمائے کرام نے جہاد کا تقاضا محسوس کر کے تیاری شروع کر دی تھی۔

دوسرا دور...... اپریل 1978ء کے انقلابِ ثور سے لے کر حفیظ اللہ امین کے قتل تک دی جانے والی قربانیوں اور جدوجہد پر مشتمل ہے۔

تیسرا دور...... 27دسمبر 1979ء کو امین کے قتل اور روسیوں کی سرخ یلغار سے شروع ہوتا ہے اور 15فروری 1989ء کو روسیوں کے رسوا کن انخلا پر ختم ہوتا ہے۔

چوتھا دور...... روسیوں کی واپسی کے بعد نجیب انتظامیہ کے ساتھ معرکوں پر مشتمل ہے جو 1992ء میں مجاہد تنظیموں کے کابل پر قبضے کے ساتھ اختتام پذیر ہوتا ہے۔

پہلا دور: ہم دیکھتے ہیں کہ انقلاب ثور سے پہلے بھی افغانستان میں اسلامیت اور کمیونزم کے درمیان کشاکشی جاری تھی۔ داؤد خان کا جبر و تشدد اس اسلامیت کے خلاف تھا۔ اس دور میں بھی کمیونسٹ پارٹی کے ناپاک عزائم کے خلاف کچھ مذہبی جماعتیں سرگرم ہو چکی تھیں۔ کئی علمائے کرام اس سلسلے میں قید و بند کی مشقتیں برداشت کر رہے تھے اور کچھ پہاڑوں کو اپنا مسکن بنا کر جہاد کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

دوسرا دور: انقلابِ ثور کے بعد جب کمیونزم باقاعدہ حکومت کی شکل میں عوام پر مسلط ہو گیا تو اس کے ردِعمل میں 2جون 1978ء کو مذہبی اور حریت پسند جماعتوں نے جہاد کا باقاعدہ نعرہ بلند کیا۔ ترہ کئی اور امین نے اس آواز کو دبانے کے لیے جبر و تشدد کا ہر حربہ آزما کر دیکھ لیا مگر وہ ناکام رہے۔

اس ظلم و ستم کی انتہا یہ تھی کہ لوگوں کو اجتماعی طور پر بھیڑ بکریوں کی طرح قتل کر دیا جاتا تھا۔ ایک بار دیہی علاقوں سے سینکڑوں افراد کو مجاہدین سے تعلق کے الزام میں گرفتار کر کے کابل کی طرف روانہ کیا گیا۔ مگر انہیں کسی عدالت میں پیش کیا گیا نہ کوئی جیل خانہ انہیں جگہ دے سکا۔ کابل پہنچانے سے پہلے ہی ان سے ڈیڑھ سو افراد کو چلتے ٹرکوں سے نیچے گرا دیا گیا۔ پھر پیٹرول چھڑک کر زندہ جلا دیا گیا۔ باقی لوگوں کے لیے بلڈوزر کے ذریعے ایک کھائی کھودی گئی پھر انہیں کھائی میں پھینک دیا گیا اور بلڈوزر چلا کر زندہ دفن کر دیا گیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ بعد میں اس لرزہ خیز واقعے کا الزام مجاہدین پر عائد کر دیا گیا۔

روس کے پٹھو، ظالم و جابر افغان حکام ہر کارروائی میں روسی درندوں کے ساتھ تھے، ان بدبختوں نے جیلوں کو بے گناہ لوگوں سے بھر دیا۔ ترہ کئی اور امین کے دور میں تیس ہزار افراد کو قید کیا گیا۔ قیدیوں کو کوڑے لگانا، ناخن اُتارنا، نیند سے باز رکھنا اور جسم کو جلانا، کمیونسٹ حکام کے نزدیک ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔ ان قیدیوں کو ایک تسلسل سے قتل بھی کیا جاتا رہا۔ ان گنت علماء، دانشور، اساتذہ، پروفیسر، ڈاکٹر، صنعت کار، تاجر، مزدور اور کسان اس ذوقِ خون آشامی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ کمیونزم کے حامی نہیں تھے یا ان کا حکومت مخالف افراد سے قریبی یا دور کا کوئی تعلق تھا۔ سرکاری اداروں اور تعلیم گاہوں سے اسلامی آثار کو کھرچ کھرچ کر مٹانے کی کوشش کی گئی۔ کابل یونیورسٹی کی مشہور مسجد کو منہدم کر کے اس کی جگہ ہاسٹل اور ڈانس کلب تعمیر کر دیا گیا۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں جہادِ افغانستان اپنے پہلے مرحلے میں گزر رہا تھا۔ افغان مسلمان ہر قسم کے مصائب برداشت کرتے رہے مگر انہوں نے اپنے ایمان اور عزت و آبرو کا سودا نہ کیا۔

تیسرا دور: پھر دسمبر 1979ء میں روسی یلغار کے بعد جہاد کا تیسرا، سب سے جاں گسل اور طویل ترین مرحلہ شروع ہوا۔ اب افغان مسلمانوں کا مقابلہ صرف ملت فروش کمیونسٹ پارٹی اور کمیونسٹ افغان سپاہیوں سے نہیں تھا بلکہ ان کے سامنے روس کی ٹڈی دل فوج تھی جسے دنیا کی سب سے بڑی فوج کہا جاتا تھا۔ اس لشکر کے پاس جدید ترین وسائل اور بہترین اسلحہ تھا۔ کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ روسی افواج کسی علاقے پر حملہ کریں اور ناکام واپس آجائیں۔ تقریباً تین صدیوں کی تاریخ یہ بتاتی تھی کہ مشرق، مغرب اور جنوب میں روس نے جس ملک کے خلاف جارحیت کی، اسے سرنگوں ہونا پڑا۔

سوویت افواج کے مظالم: روسی افواج کا طریقہ کار یہ تھا کہ کسی بھی علاقے پر حملہ کرنے کے بعد وہ سب سے پہلے ظلم و دہشت کی ایسی لرزہ خیز مثالیں پیش کرتیں کہ لوگوں کے ہوش اُڑ جاتے اور دنیا تھر تھر کانپنے لگتی۔ درندہ صفت روسیوں کا اتنا رعب طاری ہو جاتا کہ کسی کو ان کے مقابلے پر آنے کی جرأت نہ ہوتی۔

روسی افواج نے افغانستان میں داخل ہو کر جو جگر سوز مظالم ڈھائے ان کا ریکارڈ کئی جلدوں کا تقاضا کرتا ہے۔ بگرام ایئر پورٹ پر اُترنے کے چند دنوں بعد تک ہی روسی فوج شہروں سے، دیہاتوں تک ہر جگہ پھیل گئی۔ ان کے ساتھ افغان فوجی محض خادم ہوتے تھے۔ قوت روسیوں کے پاس تھی۔ ان کے نزدیک خونِ مسلم اتنا سستا تھا کہ محض مذاق میں، اپنا دل بہلانے کے لیے خون کی ندیاں بہا دیتے۔

کنڑ کے علاقے چغہ سرائے میں روسیوں نے عوام کو ایک جلسے میں مدعو کیا اور کہا گیا کہ ایک ''اہم اعلان'' کیا جائے گا۔ جب گاؤں کی آبادی وہاں جمع ہو گئی تو ان پر کئی اطراف سے مشین گنوں کے دہانے کھول دیے گئے۔ گولیوں کی بارش اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ سب کے ختم ہو جانے کا یقین نہ ہو گیا۔ اس طرح ''ڈاگر'' نامی دیہات کے باشندوں کو اجتماعی طور پر اس طرح قتل کیا گیا کہ ان کے جسم کے اعضا کے ٹکڑوں، لوتھڑوں اور بوٹیوں کے ڈھیر نظر آتے تھے۔

فروری 1980ء میں صوبہ لغمان کے گاؤں علی شنگ میں جلسے کا اعلان کر کے دیہاتیوں کو جمع کیا گیا۔ یہ 650 افراد تھے۔ انہیں رسیوں سے جکڑ کر تین بڑے گڑھوں میں زندہ دفن کر دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد مجاہدین نے وہاں آکر کھدائی کی تو یہ دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے کہ شہداء میں ایک عورت بھی تھی جس کی گردن میں قرآن مجید حمائل تھا اور اس کا دودھ پیتا بچہ اس کے سینے سے چمٹا ہوا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ روسی بھیڑیے عورتوں اور بچوں کو بھی کسی رعایت کا حق دار نہیں سمجھتے تھے۔ بلاشبہ وہ نسلِ افغان کو ختم کر دینے پر

تلے ہوئے تھے کیونکہ اسی قوم سے غزنوی اور غوری جیسے مجاہد پیدا ہو کر دنیائے کفر کے سینے پر مونگ دلتے رہتے تھے۔ اب درندہ صفت روسی افغان مسلمانوں کے خون سے اپنی صدیوں کی پیاس بجھا رہے تھے۔

جبر وقہر کے ہولناک مناظر: سوویت سپاہی اپنی دہشت کا سکہ بٹھانے اور عوام کو خوف و ہراس کی تصویر بنا کر ان کی قوتِ مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے بالکل وہی انداز اپنا رہے تھے جو صدیوں پہلے اس خطے میں چنگیز خان نے اپنایا تھا۔ اُس وقت بھی کھوپڑیوں کے مینار قائم کیے جاتے تھے اور مقبوضہ علاقوں میں لاشوں کے ٹیلے بھی دور سے نظر آتے تھے۔

روس نے بھی اسی قسم کی دہشت گردی کو اپنایا اور انسانی حقوق کی پامالی کا بدترین ثبوت فراہم کیا۔ روسی یلغار کے پہلے سال کے اختتام پر جب مقتول افغانوں کا تخمینہ لگایا گیا تو وہ 5 لاکھ سے متجاوز تھے۔ اس نسل کشی کے علاوہ انسانی تمدن و معاشرت سے تعلق رکھنے والی ہر شے کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی، آبادیوں کو بلڈوز کر دیا گیا، کنویں خراب کر دیے گئے، مساجد کو شہید کر دیا گیا، ہسپتالوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، دینی مدارس ویران کر دیے گئے، دیہاتوں میں اسکولوں اور ان میں پڑھنے والے بچوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔

مظاہرین پر فائرنگ: سوویت درندوں کا جبر وتشدد دیہاتوں تک محدود نہیں تھا۔ کابل جیسے شہر کے متمدن اور پڑھے لکھے لوگ بھی اس کی زد میں تھے۔ جس طرح وہ دیہاتوں میں مجمع عام پر کسی روک ٹوک اور جھجک کے بغیر فائر کھول دیتے اسی طرح کابل، قندھار، ہرات اور غزنی کے شہری بھی ان کا نشانہ ستم تھے۔ انہیں بین الاقوامی ملامت کا کوئی خوف تھا نہ کہیں جواب دہی کا کوئی ڈر۔ روسیوں کی آمد کے ایک ماہ بعد فروری 1980ء میں کابل کے شہریوں نے سوویت مظالم کے خلاف احتجاجاً ہڑتال کی اور جلوس نکالا۔ روسی فوج حرکت میں آگئی اور اس نے کابل پولیس کے ساتھ مل کر عوام پر فائر کھول دیا جس سے سینکڑوں افراد جاں بحق اور زخمی ہو گئے۔

ہمارے برقعے تم پہن لو: یہ تو دارالحکومت کے عام شہریوں پر ''کمیونزم'' کی مساوات اور ''انسانی حقوق'' کی کرم فرمائیاں تھیں۔ ان ظالموں نے اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ وطالبات کو بھی نہ بخشا جو خاصے معتدل اور آزاد خیال شمار ہوتے تھے اور ان کا مجاہدین سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اپریل 1980ء میں کابل کے ہائی اسکولوں، کالجوں اور کابل یونیورسٹی کے ہزاروں طلبہ وطالبات نے کلاسوں کا بائیکاٹ کر کے احتجاجی مظاہرہ کیا۔ طالبات نعرے لگا رہی تھیں: ''روس کے غلامو! ہمارے برقعے تم پہن لو، اب ہم بندوقیں اُٹھائیں گی۔''

لڑکیوں نے روسی صدر برزنیف کے خلاف فلک شگاف نعرے لگائے۔ کابل ''برزنیف کی موت ......غداروں کی موت'' کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ سینکڑوں طالبات وزیرِ تعلیم ''اناہیتا رطب زاد'' کے گھر کے سامنے جمع ہوگئیں جو ایک بدکردار اور حیاباختہ عورت تھی۔ یہاں طالبات نے نعرے لگائے: ''فاحشہ عورتیں افغانستان کے تعلیمی ادارے چلانے کی حق دار نہیں ہیں۔''

''خون سے لکھی آزادی'': طلبہ وطالبات کے اس مجمع کو جو مکمل طور پر پُرامن مظاہرہ کر رہا تھا، سبوتاژ کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ اگر ایسا کرنا ناگزیر تھا تب بھی آنسو گیس، لاٹھی چارج یا کوئی اور متبادل طریقہ استعمال کیا جاسکتا تھا۔ مگر روسی درندے جو افغان طلبہ وطالبات کو سیکولر تصور کیے ہوئے تھے، ان کی جانب سے ملی وقومی غیرت کے اس مظاہرے پر غضب ناک ہوگئے۔ انہوں نے کمیونسٹ پولیس اہلکاروں کو ساتھ لے کر اس مجمع پر اندھادھند فائرنگ کی جس سے درجنوں طلبہ وطالبات شہید اور سینکڑوں زخمی ہوگئے۔ ایک لڑکی نے اپنی زخمی سہیلی کے بہتے خون میں اُنگلی ڈبوڈبو کر اپنے برقعے پر ''آزادی'' کا لفظ تحریر کر دیا۔

اسلام کا پرچم! کابل کے ''سوریہ ہائی اسکول'' اور ''رابعہ ہائی اسکول'' کی بچیوں نے ایک مظاہرے میں بے مثال جرأت وشجاعت کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے ایک سبز کپڑا بانس پر باندھ کر اسلامی پرچم بنالیا اور کابل کی سڑکوں پر نکل آئیں۔ وہ ''اسلام زندہ باد، روسی ایجنٹ مردہ باد، برزنیف مردہ باد، کارمل مردہ باد'' کے نعرے لگا رہی تھیں۔

روسی فوجیوں نے ان پر فائرنگ شروع کردی مگران کے قدم نہ اکھڑے۔ ایک روسی سپاہی نے پرچم اُٹھانے والی لڑکی کو نشانہ بنایا۔ اس کا دایاں ہاتھ چھلنی ہوگیا۔ اس نے پرچم بائیں ہاتھ میں تھام لیا۔ روسی نے اسے بھی گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ مگر بچی نے پرچم کو گرنے سے پہلے ساتھ کھڑی دوسری بچی کے حوالے کر دیا اور چلا کر کہا: ''یہ اسلام کا پرچم اب تمہارے حوالے ہے، اسے گرنے مت دینا۔''

ایک اور مظاہرے میں بچیوں کو کسی افغان عہدے دار کی جیپ نظر آگئی۔ سب نے اسے گھیر لیا اور اسے تابڑ توڑ جوتے رسید کیے جس سے گاڑی کے شیشے ٹوٹ گئے۔ اس کے بعد سرکاری اہلکاروں نے اندھادھند فائرنگ کی جس سے کئی بچیاں شہید اور کئی زخمی ہوگئیں۔

میں مسلمان ہوں: ایک دن کابل یونیورسٹی کی فیکلٹی آف فارمیسی کے سامنے طالبات نے مظاہرہ کیا۔ سرکاری کارندوں اور روسیوں کی فائرنگ سے ایک طالبہ کی ٹانگ زخمی ہوگئی اور وہ گر پڑی۔ کچھ دیر بعد وہاں سے ایک سرکاری گاڑی کا گزر ہوا۔ گاڑی میں سوار کمیونسٹوں نے اسے ساتھ بٹھا کر ہسپتال لے چلنے کی پیش کش کی مگر اس غیرت مند لڑکی کا جواب تھا: ''میں مسلمان ہوں۔ چاہے یہاں ایڑیاں رگڑ رگڑ

کر مر جاؤں مگر کسی کافر کی گاڑی میں نہیں بیٹھوں گی نہ ان سے علاج کراؤں گی۔"

کابل میں کوئی محفوظ نہ تھا: ظلم وتشدد کی اس آندھی سے کابل کے تمام اسلام پسند شہری شدید متاثر ہوئے۔ سرکاری ادارے تو ایسے لوگوں سے پہلے ہی خالی کردیے گئے تھے۔ کابل یونیورسٹی بھی محفوظ نہیں رہی۔ اسلام کے شیدائیوں کو چن چن کر نکالا اور غائب کردیا گیا۔ یونیورسٹی کی شریعت فیکلٹی میں 67 طلبہ تھے۔ ان میں سے صرف چھ زندہ بچ گئے باقی سب لاپتہ ہوگئے۔ غالب گمان یہی تھا کہ دیگر ہزاروں افراد کی طرح انہیں بھی کسی نامعلوم مقام پر لے جاکر قتل کردیا گیا ہے۔ روسیوں کی آمد کے بعد بدنام زمانہ پل چرخی جیل میں ایک لاکھ سے زائد افراد کو مختلف اوقات میں لایا گیا اور تڑپا تڑپا کر نہایت بے رحمانہ انداز ے سے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ ان میں بارہ تیرہ سال کے بچوں سے لے کر 70، 80 سال کے بزرگ بھی شامل تھے۔ ان کی اکثریت علمائے کرام، ائمہ مساجد، قراء، حفاظ، مؤذنین، طلبۂ مدارس دینیہ اور دین دار لوگوں پر مشتمل تھی۔

کابل کے مشہور دینی ادارے "جامعہ ابوحنیفہ" کے پانچ سو طلبہ کو گرفتار کرکے غائب کردیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے صرف چھ سات طلبہ زندہ بچ کر نکل سکے، باقی سب شہید کرادیے گئے۔ غرضیکہ اس دور میں کابل کا کوئی مسلمان محفوظ نہ تھا۔

افغان جنگ کا سوویت اسلحہ: سوویت یونین اس جنگ میں دنیا کا جدید ترین اسلحہ استعمال کررہا تھا۔ اصل میں اس کی پالیسی یہ تھی کہ افواج کا جانی نقصان کم سے کم ہو اور دو بدو مقابلے کی نوبت حتی الامکان نہ آئے۔ چنانچہ روسی فوج ہر قسم کا بھاری اسلحہ آزادانہ طور پر استعمال کررہی تھی۔ عام طور پر روسی فوج کے کانوائے جس قسم کے اسلحے سے لیس ہو کر چلتے تھے، اس کی ایک جھلک درج ذیل ہے:

- ٹینک: 62-152
- 40 کلومیٹر تک مار کرنے والی 155 ملی میٹر کی توپیں
- ملٹی بیرل رائٹ جن سے 13 تا 41 راکٹ بیک وقت فائر کیے جاسکتے تھے
- بھاری مشین گنیں
- راکٹ لانچر
- درجنوں اقسام کی بارودی سرنگیں
- مارٹر توپیں
- ریکائل لیس توپیں

- مگ طیارے 19 تا 27
- دیو پیکر مال بردار طیارے "انتونوف" 12\12
- بمبار طیارے U5،18 تا 25
- گن شپ ہیلی کاپٹر M1-18، تاM1-24

یہ وہ ہتھیار اور وسائل تھے جو دنیا کی کسی جدید ترین فوج کو کسی بھی قسم کی جنگ میں درکار ہو سکتے تھے۔

گن شپ ہیلی کاپٹر: ان تمام ہتھیاروں میں گن شپ ہیلی کاپٹر سب سے زیادہ تباہ کار تھے۔ وہ ہر جگہ ہر زاویے سے حملہ کر سکتے تھے۔ پہاڑوں کے درمیان کسی جگہ گھس سکتے تھے۔ کھائیوں میں اُتر سکتے تھے۔ آبادیوں پر معلق رہ کر بمباری کر سکتے تھے۔ ان سے جھانکتی مشین گنیں بارش کے قطروں کی طرح بے حساب گولیاں برساتی تھیں اور ان کی بمباری سے آن کی آن میں آبادیاں تو دہ خاک بن جاتی تھیں۔ افغانستان میں ہر طرف گن شپ ہیلی کاپٹروں کی دہشت ناک کہانیاں گردش کرتی رہتی تھیں۔

نیپام بم، کھلونا بم: گن شپ ہیلی کاپٹر شہری اور دیہی آبادیوں پر نت نئے انداز سے حملہ آور ہوتے تھے۔ بسا اوقات وہ نیپام بم جیسا مہلک ہتھیار بھی استعمال کرتے تھے، جو آناً فاناً آبادیوں کو جھلسا کر رکھ دیتا تھا۔ کبھی وہ بستیوں پر چھوٹے چھوٹے ڈبے پھینکتے، ہر ڈبے میں ایسا خطرناک کیمیائی مادہ ہوتا تھا جو دو سو لیٹر آتش گیر مواد سے زیادہ تباہی پھیلا سکتا تھا۔ صرف ایک ڈبے سے نکلنے والے مواد کے زمین پر پھیل جانے سے دو سو فٹ کے اندر اندر آکسیجن ختم ہو جاتی اور لوگ گلا گھونٹ کر ہلاک کیے جانے والوں کی طرح تڑپ تڑپ کر مر جاتے۔ جب ایسے سینکڑوں ڈبے پھینکے جاتے تو گاؤں کے گاؤں اور قصبوں کے قصبے قبرستان بن جاتے۔

گن شپ ہیلی کاپٹروں سے کھلونا بم (بوبی ٹریپس) بھی پھینکے جاتے۔ ٹافیوں، چاکلیٹوں، کھلونا گاڑیوں اور خوبصورت جانوروں کی شکل میں تیار کیے گئے یہ بم بے حد تباہ کن تھے۔ یہ معصوم افغان بچوں کے قتل عام کا ایک شیطانی حربہ تھا۔ ہزاروں بھولے بھالے بچے ان بموں کو کھلونا سمجھ کر اُٹھاتے اور پھر ایک دھماکے سے ان کے چہرے جھلس جاتے، یا جسم کے پرخچے اُڑ جاتے۔ لاکھوں بچے ان بموں کی وجہ سے عمر بھر کے لیے معذور ہو گئے۔ اس کے علاوہ مدرسوں میں پڑھنے، پارکوں میں کھیلنے اور وادیوں میں بکریاں چرانے والے بچوں پر پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے خصوصی بم پھینکے جاتے جن سے ان گنت بچے شہید اور اپاہج ہوئے۔

زہریلی گیسیں: روسی فوج بے دریغ کیمیائی ہتھیار استعمال کر رہی تھی۔ زہریلی گیس خوسیجین اوکسائم ان کا خاص ہتھیار تھی۔ روسی فوج میں کیمیائی ہتھیار استعمال کرنے والے چند یونٹ بطور خاص شامل کیے گئے تھے

جو گیس ماسک پہن کر حملہ آور ہوتے تھے۔ اس گیس سے متاثر ہونے والے یا تو مرجاتے یا فالج زدہ ہوجاتے...... معمولی متاثر ہونے والوں کے جسم پر سرخ داغ پڑ جاتے، جلد اور ناک سے خون جاری ہوجاتا۔

افغان حکومت کی نگاہ میں افغان خواتین کا مقام: روسی درندوں کی ستم رانیوں کا سب سے روح فرسا پہلو یہ ہے کہ وہ پردہ نشین افغان خواتین کی کھلے عام عصمت دری کرتے اور انہیں بڑی بے رحمی سے موت کے گھاٹ اُتار دیتے تھے۔ اَن گنت افغان خواتین ان بدبختوں کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ ایسے واقعات اتنی کثرت سے پیش آئے کہ ان کا صحیح اندازہ لگانا محال ہے۔ روسیوں کی اس بدلگامی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ خود کٹھ پتلی افغان حکومت کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ ایک موقع پر بعض روسی عہدے داروں نے اپنا شک دور کرنے کے لیے افغان وزارتِ داخلہ سے اس بارے میں دریافت کیا تو وہاں سے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے افغان عورتوں کی عصمت دری کی نہ صرف اجازت دی گئی بلکہ یہ شرم ناک جواب دیا گیا...... ''تمام افغان عورتیں روسیوں کی تسکین کے لیے ہیں۔''

اس کے بعد روسیوں کو اپنی شیطانی خواہشات پوری کرنے میں برائے نام جھجک بھی نہ رہی۔

ناموس کی خاطر! جب افغان عوام نے کٹھ پتلی حکومت کا یہ رویہ دیکھا تو انہوں نے از خود عورتوں کو روسیوں کے شر سے بچانے کے لیے عجیب و غریب اقدامات شروع کردیے جو مجبوری و مقہوری کے ساتھ ساتھ غیرت وحمیت کی اعلیٰ مثال بھی تھے۔ روسیوں کا جس آبادی سے گزر ہوتا وہاں کے باشندے فوراً اپنی خواتین کو گھروں کے تہ خانوں، کوٹھڑیوں اور گوداموں میں چھپادیتے۔ کوئی اور گوشہ نہ ملتا تو خواتین غسل خانوں میں مقفل ہوجاتیں۔

بعض اوقات عورتیں خود اپنی عصمت کو بچانے کے لیے انتہائی اقدامات پر مجبور ہوجاتیں۔ کنڑ کے ایک دیہات میں ایک روسی کسی گھر میں گھس گیا۔ اس نے خاتونِ خانہ کی عصمت پر ہاتھ ڈالنا چاہا، غیرت مند عورت نے کلہاڑی کا وار کرکے روسی کو قتل کردیا۔ ایک اور بستی میں ایک روسی سپاہی جبراً کسی عمر رسیدہ عورت کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا اور اس عورت کی نوجوان لڑکی کو بہکا کر اپنے دام میں لا رہا تھا۔ بوڑھی عورت کو پتا چلا تو اس نے پورے گھر پر مٹی کا تیل چھڑک کر اسے آگ لگادی۔ اس کی بیٹی اور روسی جھلس کر مرگئے۔ وہ خود بھی زندہ نہ بچ سکی مگر جیتے جی اپنی اولاد کو روسیوں کی ہوس کا نشانہ نہ بننے دیا۔

عصمتِ بناتِ اسلام تار تار: افغانستان کے ایک گاؤں میں چھ روسی ہیلی کاپٹر اُترے، انہوں نے گاؤں والوں کو جمع کرکے مطالبہ کیا کہ مجاہدین کو ان کے حوالے کردیا جائے۔ حالانکہ اس گاؤں میں کوئی مجاہد تو کجا کوئی جوان مرد بھی نہیں تھا۔ وہاں صرف عورتیں، بچے اور بوڑھے تھے۔ روسیوں نے طیش میں آکر گاؤں کی

تمام عورتوں کو بے پردہ کر دیا اور پھر ان میں سے چھ خوبصورت لڑکیوں کو چھانٹ کر ساتھ لے گئے۔ خاصی دیر بعد وہی ہیلی کاپٹر فضا میں دوبارہ نمودار ہوئے۔ ان سے یکے بعد دیگرے ان چھ لڑکیوں کی برہنہ لاشیں زمین پر پھینک دی گئیں۔ اس قسم کے لرزہ خیز واقعات افغانستان کے مختلف حصوں میں پیش آتے رہے۔ بعض اوقات وہ ہیلی کاپٹروں سے لڑکیوں کی لاشوں کی بجائے ان کی شلواریں پھینک جایا کرتے تھے۔ ان لاپتہ لڑکیوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی جن کے والدین عمر بھر ان کی یاد میں روتے روتے گزر گئے۔

یہ لٹی لٹی مساجد، یہ اُداس سجدہ گاہیں: مسلمانوں کے جذبات مجروح کرنے اور اسلام سے اپنی دشمنی نکالنے کے لیے روسی اور کمیونسٹ سپاہی اسلامی شعائر کی توہین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ وہ قرآن مجید کے نسخوں کو کوڑے میں پھینک دیتے، اس کے مقدس اوراق کو بوٹوں سے پامال کرتے، مساجد اور دینی مدرسوں کو بلڈوزر چلا کر زمین کے برابر کر دیتے، بستیوں پر بمباری کر کے ایک ہی وقت میں سینکڑوں افراد کو موت کی نیند سلا دیتے، خدا اور رسول کی شان میں علانیہ گستاخیاں کرتے پھرتے۔

افغانستان میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ ہزاروں اجڑی ہوئی مساجد نوحہ کناں تھیں۔ تباہ حال مدارس سسکیاں لے رہے تھے۔ عورتیں بے آبرو ہو رہی تھیں، بچے ذبح ہو رہے تھے، بوڑھوں کے لہو آمیز آنسوان کی ڈاڑھیوں کو تر کر چکے تھے۔ ماؤں بہنوں کی گھٹی گھٹی چیخوں سے اسلام کا یہ قلعہ ماتم کدہ بن چکا تھا۔ یہ تھا وہ ''امن وامان'' جس کے قیام کے لیے روس افغانستان میں داخل ہوا تھا...... جس کے گن دہریے آج بھی گایا کرتے ہیں۔

روس کی غلط فہمی: روسیوں کا خیال تھا کہ وہ جبر وقہر کے یہ مناظر دکھا کر افغان مسلمانوں کو دبالیں گے اور ان کی مزاحمت دم توڑ دے گی مگر یہ ان کا خیالِ خام تھا۔ افغان مسلمان اسلام کی جرأت و بسالت کا وہ اعلیٰ نمونہ ہیں کہ کفار کا کوئی لشکر ان کے حوصلوں کو شکستہ نہ کر سکا، وہ وقتی طور پر مغلوب ضرور ہوئے مگر انہوں نے کبھی ہار نہیں مانی۔ میدانِ جنگ سے پیٹھ پھیر کر بھاگنا ان کی روایت نہیں۔ اگر وہ ختم ہوئے ہیں تو لڑتے لڑتے اور ہارے ہیں تو سینے پر زخم کھاتے کھاتے...... ہر زخم ان کے جوشِ انتقال کو بڑھاتا ہے اور ہر وقتی شکست ان کی شجاعت وحمیت پر چوٹ لگاتی ہے۔ اسی قوم کا ایک فرد شہاب الدین غوری تھا جو پرتھوی راج سے شکست کھانے کے بعد غور واپس آ کر پورے سال بستر پر نہیں لیٹا۔ جنگ کی تیاری کرتا رہا اور اگلے سال ہندوستان میں گھس کر اس نے پرتھوی راج کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ افغانوں کی نفسیات انہیں کسی جابر کے آگے جھکنے نہیں دیتی۔ ان کے ہاں قتل کبھی معاف نہیں کیا جاتا۔ وہ نسل در نسل خون یاد رکھتے ہیں اور موقع ملتے ہی ظالم سے بدلہ لینے میں دیر نہیں کرتے۔ انہیں ظلم وستم کا

تختۂ مشق بنا کر مرعوب کر دینا ناممکن ہے۔ انہیں چنگیز خان کے قہرناکیاں بھی ہیبت زدہ نہ کر سکیں جس نے ایک ہفتے میں ہرات کے 16 لاکھ مسلمانوں کو شہید کیا تھا مگر وہ پھر بھی چنگیزی افواج سے نبرد آزما رہے۔ کبھی ہرات کے شمس الدین کی قیادت میں اور کبھی خوارزم کے سلطان جلال الدین کے پرچم تلے۔

مآخذ و مراجع

- ...... تاریخ جہاد افغانستان، ڈاکٹر ایچ بی خان
- ...... افغانستان-ایک قوم کا المیہ، احمد شجاع پاشا
- ...... اردو ڈائجسٹ، جہاد افغانستان نمبر اپریل 1989ء، فروری 1990ء،
- ...... المسلمون فی افغانستان، ڈاکٹر محمد عبدالقادر احمد
- ...... تاریخ افغانستان من قبیل الفتح الاسلامی الی وقتنا المعاصر۔ فاروق حامد بدر
- ...... Encyclopaedia Britannica (Afghanistan)

پچیسواں باب

جہاد افغانستان کی نامور شخصیات اور تنظیمیں

مجاہد رہنماؤں کے چار حلقے: اس سے پہلے کہ ہم جہادِ افغانستان کی زریں تاریخ صفحہ بصفحہ اُلٹنا شروع کردیں، مناسب ہوگا کہ پہلے افغانستان کے مختلف علاقوں میں برسرِ پیکار ان مجاہد رہنماؤں اور انکی جماعتوں پر ایک نظر ڈال لیں جن کا ذکر آئندہ بار بار آتا رہے گا، جہادِ افغانستان میں اہم کردار ادا کرنیوالی شخصیات کو ہم چار 4 حلقوں میں تقسیم کرسکتے ہیں:

1. علمائے کرام...... ان میں مولانا محمد یونس خالص، مولانا جلال الدین حقانی، مولانا ارسلان خان رحمانی، مولانا نظام الدین حقانی اور مولانا نصر اللہ منصور قابلِ ذکر ہیں۔
2. صوفیائے کرام...... ان میں سلسلہ نقشبندیہ کے مولوی محمد نبی محمدی، پروفیسر صبغت اللہ مجددی اور سلسلہ قادریہ کے پیر سید احمد گیلانی نمایاں تھے۔
3. جدید تعلیم یافتہ حضرات...... ان میں گلبدین حکمت یار، برہان الدین ربانی، احمد شاہ مسعود اور عبدالرب رسول سیاف پیش پیش رہے۔
4. افغان فوج سے الگ ہونے والے...... ان میں ہرات کے کمانڈر اسماعیل خان تورون، خوست کے کرنل افضل خان، پکتیا کے کرنل احمد سعید اور کمانڈر ضابط اکبر شاہ مشہور ہیں۔

ہوئے احرارِ ملت جادہ پیما کس تجمل سے

مولانا محمد یونس خالص: مولانا محمد یونس خالص کو افغانستان کے جلیل القدر علماء میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ 1920ء میں صوبہ ننگرہار میں پیدا ہوئے۔ نہایت بے لوث، جرأت مند اور صاف گو شخصیت کے مالک اور عابد و زاہد انسان تھے۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ درس و تدریس اور علمی مشاغل میں گزرا۔ وہ ایک ادیب اور صحافی بھی تھے۔ کابل میں ایک اخبار کے ایڈیٹر بھی رہے۔ وہ نقشبندی سلسلے کی روایات کے امین بھی تھے۔ تقویٰ اور خدا خوفی میں قرونِ اولیٰ کی تصویر تھے۔ مزاج پر علمی رنگ غالب تھا۔ اس کے

ساتھ ساتھ وہ ایک نہایت متحرک اور فعال لیڈر رہے تھے۔ ہر دور میں حکمرانوں کے خلاف کلمۂ حق بلند کرتے رہے۔ ظاہر شاہ اور داؤد خان کے زمانے میں متحرک ہونے والے عام مجاہدین اور تمام گروپ انہیں اپنا بڑا تصور کرتے تھے اور ان کے مشوروں سے استفادہ کرتے تھے۔ انہیں ملک میں استادالاساتذہ کی حیثیت حاصل تھی۔ مولانا محمد یونس خالص نرم مزاجی، اعتدال پسندی اور مل جل کر کام کرنے کی زبردست صلاحیت کے حامل ہونے کے باوجود احکام شریعت میں کسی قسم کی لچک روا نہیں رکھتے تھے۔ امانت و دیانت اور ہم آہنگی کا یہ عالم تھا کہ عبدالرب رسول سیاف سے اختلافات کے باوجود ایک عرصے تک ان کی جماعت "اتحاد اسلامی" کے "خازنِ بیت المال" رہے۔

ترہ کئی کے دور میں وہ بزرگ مجاہد رہنما اور سرپرست کے طور پر برہان الدین ربانی، عبدالرب رسول سیاف اور گلبدین حکمت یار وغیرہ کے ساتھ "حزبِ اسلامی" میں شامل رہے۔ یہ تنظیم جلد ہی "حرکت انقلاب اسلامی" میں بدل گئی مگر بعد میں مجاہد رہنماؤں کے اختلاف اور ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث جلد ہی سبوتاژ ہوگئی۔ یہ 1979ء کی بات ہے تب مولانا خالص نے پرانی حزب اسلامی کا ازسرنو احیاء کر دیا اور ان پر اعتماد کرنے والے 30 ہزار کے لگ بھگ مسلح مجاہدین اس گروپ میں شامل ہوگئے۔ یہ گروپ حزب اسلامی خالص گروپ کے نام سے مشہور ہوا۔

مولانا خالص نامور عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ مردِ میدان بھی ثابت ہوئے۔ وہ تنظیمی سازشوں اور جوڑ توڑ کی سیاست سے الگ تھلگ ہو کر میدانِ جہاد میں اُترے تھے اور عمر رسیدہ ہونے کے باوجود مدت دراز تک محاذوں پر دادِ شجاعت دیتے رہے۔ وہ بذاتِ خود عام مجاہدین کے ساتھ سخت ترین معرکوں میں لڑا کرتے تھے۔

ننگر ہار، ارزگان، پکتیا، پکتیکا، قندھار، زابل، غزنی اور جنوب مشرقی صوبوں پر خالص گروپ کی بھرپور گرفت تھی۔ اس تنظیم میں بڑے بڑے جنگجو کمانڈر شامل تھے۔ بعد میں ظہور پذیر ہونے والے طالبان کے امیر ملا محمد عمر مجاہد بھی اس دور میں اسی جماعت میں شامل تھے۔

مولانا خالص میڈیا پر زیادہ نظر نہیں آتے تھے کیونکہ ان کا زیادہ وقت جنگ کے میدانوں میں گزرتا تھا۔ میڈیا پر خود کو نمایاں کرنے اور اقتدار کے لیے تگ و دو کرنے کی بجائے ان کی نظر ہمیشہ اُمت کے مفادِ عامہ پر رہتی تھی۔

مولانا جلال الدین حقانی: مولانا جلال الدین حقانی کا تعلق پکتیا کی تحصیل "وزی" کے گاؤں "کنڈاؤ" سے تھا۔ وہ 1940ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا قبیلہ "زوران" دلیری اور معرکہ دانی میں مشہور تھا۔ انہوں

نے افغانستان کے مختلف دینی مدارس میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ آخر پاکستان میں اکوڑہ خٹک کی مشہور دینی درسگاہ جامعہ حقانیہ سے فارغ التحصیل ہوئے اور یہیں ایک سال تدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔

مولانا حقانی کو افغانستان میں جہاد کا بانی قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ اُس دور میں کمر باندھ کر میدانِ جہاد میں اُتر گئے تھے جب لوگ جہاد کے مفہوم تک کو بھول چکے تھے۔ یہ ظاہر شاہ کے اقتدار کے آخری چند برس تھے۔ جن میں کمیونسٹ افغانستان کی سیاست پر چھانے لگے تھے۔ علمائے دین کمیونسٹوں سے شدید خطرہ محسوس کر رہے تھے جبکہ کمیونسٹ اسی شدت سے دینی رہنماؤں کو راستے سے ہٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ کمیونزم کے اس سیلاب کا مقابلہ کرنے کے لیے سر پر کفن باندھ کر میدان میں اُترنے والوں میں مولانا جلال الدین حقانی سب سے پیش پیش تھے۔

جب دو کمیونسٹ پارٹیوں پرچم اور خلق کے تعاون اور فوج کی ملی بھگت سے سردار داؤد خان برسرِ اقتدار آیا تو مولانا جلال الدین حقانی اسی وقت سمجھ گئے تھے کہ اب افغانستان کا اسلامی تشخص ختم ہوا چاہتا ہے اور اسے بچانے کے لیے جہاد کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا۔ چنانچہ مولانا حقانی وہ پہلے فرد تھے جنہوں نے سردار داؤد کے حکومت سنبھالتے ہی مسلح جہاد کا اعلان کر دیا۔ سرکاری فوج نے ان کے گھر کو نرغے میں لے کر نذرِ آتش کر دیا جبکہ مولانا خود بھیس بدل کر نکل جانے میں کامیاب ہو گئے اور کچھ مدت پاکستان میں رہے۔ آخر کار اہل وعیال کو پاکستان چھوڑ کر دوبارہ افغانستان پہنچے اور داؤد کی حکومت کے خلاف گوریلا لڑائی شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے پاکستان کے آزاد قبائلی علاقوں سے ریوالور، بندوقیں اور دیسی دستی بم خرید کر سرکاری مراکز، فوجی اڈوں اور پولیس چوکیوں پر حملے شروع کر دیے۔ ایک سال کے اندر اندر وہ ایک کمیونسٹ مخالف قوت کے طور پر مشہور ہو گئے۔

27 اپریل 1978ء کو ترہ کئی نے "انقلابِ ثور" کے نام سے باقاعدہ طور پر "کمیونسٹ انقلاب" برپا کیا تو علمائے کرام اور مفتیانِ عظام نے اس کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا۔ سب سے مشہور فتویٰ "دار تخیل" کے بزرگ عالم حضرت مولانا عبدالغنی صاحب کا تھا۔ انہوں نے انقلابِ ثور کے صرف دس دن بعد جہاد کا فتویٰ دے دیا تھا۔

اس فتوے کے بعد مولانا حقانی کے ساتھیوں کی تعداد بڑھتی گئی اور جلد ہی وہ پکتیا اور پکتیکا میں سب سے مضبوط جہادی کمانڈر کے طور پر مشہور ہو گئے۔ کئی ضلعی اور تحصیل ہیڈ کوارٹر بھی ان کے قبضے میں آ گئے۔

اس دوران مولانا محمد یونس خالص، پروفیسر عبدالرب رسول سیاف، پروفیسر برہان الدین ربانی، گلبدین حکمت یار اور دیگر مجاہد رہنماؤں نے مل کر حزبِ اسلامی کے نام سے ایک جہادی تحریک کی بنیاد

رکھی۔اس کی تشکیل میں مولانا حقانی کا کردار نہایت اہم تھا۔بعد کے دور کی تمام بڑی مجاہد تنظیموں کے سربراہ ابتداء میں اسی حزبِ اسلامی میں شامل تھے۔پھر کچھ مزید تنظیموں کی شمولیت کے بعد اس کا نام ''حرکتِ انقلاب اسلامی'' رکھ دیا گیا مگر تھوڑی مدت بعد یہ اتحاد بھی تنازعات کا شکار ہو کر بکھر گیا۔اس موقع پر مولانا محمد یونس خالص نے ''حزبِ اسلامی'' کا نام دوبارہ بحال کر کے کام شروع کر دیا اور جلال الدین حقانی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔یہ 1979ء کا واقعہ ہے۔جب 27 دسمبر 1979ء کو روس نے افغانستان میں مداخلت کی تو مولانا حقانی سرخ افواج کے مقابلے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔وہ ہزاروں نوجوانوں کو گوریلا تربیت دے چکے تھے۔چنانچہ انہوں نے روسی افواج کے خلاف زبردست کارروائیاں کیں جس کی بنا پر وہ پورے ملک میں ''امام شامل ثانی'' کے لقب سے پہچانے جانے لگے۔

روس افغان جنگ کے نو برسوں میں سب سے بڑے اور سخت ترین معرکے انہی کے علاقوں میں برپا ہوئے اور ایسے ہر موقع پر اس مردِ درویش نے اپنی قوتِ ایمانی اور جذبۂ جہاد کے ساتھ روس کی ٹڈی دل افواج کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا۔ان معرکوں کی تفصیل ان شاء اللہ آگے اپنے موقع پر آئے گی۔

مولانا جلال الدین وہ پہلے کمانڈر تھے جنہوں نے افغانستان میں زمین دوز معسکر بنائے جن میں ''ژاور'' کا معسکر مجاہدین کا سب سے بڑا معسکر شمار کیا جاتا تھا۔مولانا نے روسی بمباری سے بچنے کے لیے بڑے بڑے غار بھی کھدوائے تھے اور اس طرح سرخ افواج سے سالہا سال طویل جنگ کی پیش بندی کی تھی۔افغانستان کے تباہ شدہ مدارس کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کرنے کے لیے انہوں نے وزیرستان کے سرحدی علاقے میران شاہ میں منبع العلوم کے نام سے ایک بڑا دینی مدرسہ قائم کیا جس میں وزیرستان کے علاوہ افغانستان کے تباہ شدہ 80 سے زائد مدارس کے طلبہ تعلیم حاصل کرتے رہے۔

پروفیسر غلام محمد نیازی: ظاہر شاہ کے آخری دور میں کمیونزم کا مقابلہ کرنے کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں سے تعلق رکھنے والے باشعور مسلمان بھی متحرک ہو چکے تھے۔ان میں کابل یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے معروف استاذ پروفیسر غلام محمد نیازی سرفہرست تھے۔یونیورسٹی میں عملاً کمیونزم کا راج تھا۔یونیورسٹی کی مسجد کو ڈانس کلب میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ان حالات میں پروفیسر نیازی نے ''اسلامی جماعت'' کے نام سے ایک تحریک چلائی اور ان کے شاگردوں (کابل یونیورسٹی کے طلبہ) نے ''نوجوانانِ اسلام'' کے نام سے ایک تنظیم بنائی۔عبدالرحیم نیازی اس کے روحِ رواں تھے جبکہ یونیورسٹی کے دو نامور اساتذہ پروفیسر برہان الدین ربانی اور پروفیسر عبدالرب رسول سیاف ان طلبہ کی سرپرستی کر رہے تھے۔

داؤد کے دورِ حکومت میں جب اسلام پسند لیڈروں کے خلاف کریک ڈاؤن شروع ہوا تو پروفیسر غلام

محمد نیازی اور پروفیسر عبدالرب رسول سیاف کو گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں پروفیسر نیازی کو حالت قید و بند میں پھانسی دے دی گئی جبکہ سیاف ایک عرصے بعد رہا ہو گئے۔ اس دوران پروفیسر برہان الدین ربانی اور ''نوجوانانِ اسلام'' کے ایک فعال نوجوان لیڈر گلبدین حکمت یار چند ساتھیوں سمیت ہجرت کر کے پشاور آ گئے تھے۔ انہوں نے پشاور میں دیگر مجاہد رہنماؤں کے ساتھ مل کر افغانستان میں عسکری کارروائیوں کا فیصلہ کیا۔ چونکہ حکومتِ پاکستان داؤد خان کی پاکستان مخالف پالیسی سے تنگ تھی اس لیے اس دور کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے ان مجاہد رہنماؤں کی سرپرستی شروع کر دی۔

گلبدین حکمت یار نے ''نوجوانانِ اسلام'' کو ''جمعیت اسلامی'' کے نام سے موسوم کر کے افغانستان میں کام شروع کر دیا۔ بعد میں اس نے حزبِ اسلامی (حکمت یار گروپ) کا نام اختیار کیا جبکہ حزب اسلامی (یونس خالص گروپ) الگ سے کام کر رہا تھا۔ اس دوران ''جمعیت اسلامی'' کے نام سے برہان الدین ربانی نے الگ جماعت بنا لی۔

گلبدین حکمت یار: جہادِ افغانستان کے حوالے سے دنیا بھر میں سب سے زیادہ شہرت پانے والے دو تین ناموں میں سے ایک نام انجینئر گلبدین حکمت یار کا ہے۔ وہ 1949ء میں پختون قبیلے ''خروٹی'' میں پیدا ہوئے۔ کابل یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی۔ شروع سے اسلام پسند اور انقلابی خیالات کے حامل تھے۔ وہ افغان اسلام پسند نوجوانوں کی تنظیم ''نوجوانانِ اسلام'' کے صفِ اول کے رہنما تھے۔ 1972ء میں اپنی انقلابی سرگرمیوں کے باعث جیل کاٹی۔ 1973ء میں داؤد خان کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد حکومتی پکڑ دھکڑ کے باعث روپوش ہو گئے اور موسیٰ خیل میں امام مسجد بن کر وقت گزارتے رہے۔ 1974ء میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور کچھ مدت بعد پشاور میں ''حزبِ اسلامی'' کی بنیاد رکھی۔

جلد ہی اس تنظیم نے ''حکومت پاکستان'' کے تعاون سے افغانستان میں کمیونسٹ حکومت کے خلاف محتاط اور محدود انداز میں کام شروع کر دیا۔ اس بنا پر حکمت یار کو ان لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے جو انقلاب ثور سے بہت پہلے کمیونسٹ افغان حکومتوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اس وقت انہیں وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کی سرپرستی حاصل تھی۔ حزبِ اسلامی کا اندازِ کار عسکری کے ساتھ ساتھ سیاسی بھی رہا ہے۔ وہ جمہوریت اور انتخابات پر یقین رکھتی ہے۔ ننگرہار، کنڑ، بغلان اور قندوز اس کے خاص حلقے رہے ہیں۔ اس کے قائد حکمت یار بذاتِ خود میدانِ جنگ کے آدمی نہیں تاہم وہ ایک بہترین سیاست دان ہیں جنہیں درجنوں سرفروش کمانڈروں کا اعتماد حاصل رہا ہے۔ جہادِ افغانستان کے دور میں وہ خود عموماً پاکستان میں مقیم رہتے ہوئے افغانستان میں اپنے کمانڈروں سے رابطے رکھتے تھے

اور میڈیا پر افغان عوام کے موقف کی بھرپور وکالت کرتے تھے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کی ایک بڑی تعداد اس تنظیم میں شامل رہی ہے۔

حزب اسلامی جدید تعلیم یافتہ اسلام پسند افراد کی جماعت ہے جو نظریاتی لحاظ سے سید جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہٗ اور جماعتِ اسلامی کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی کی خوشہ چیں ہے اور علمائے کرام وفقہاء کی تقلید سے کسی حد تک آزاد رہنا پسند کرتی ہے۔ جماعت اسلامی اور حزب اسلامی کے تعلقات نہایت گہرے رہے ہیں اور جماعت اسلامی کے نزدیک مجاہدین میں سب سے قابل اعتماد لیڈر گلبدین حکمت یار ہی رہے ہیں۔ حکمت یار جماعت اسلامی کے بعد عالمِ عرب کی عظیم تحریک ''الاخوان المسلمون'' کے افکار سے بڑی حد تک اتفاق کرتے تھے اور ایرانی انقلاب سے بھی متاثر تھے۔ ایرانی انقلاب کے بانیوں سے ان کے قریبی گہرے روابط رہے ہیں۔ حکمت یار کو ذاتی طور پر فقہ حنفی کا پابند کہا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ حزبِ اسلامی کا ایک گروہ حکمت یار سے الگ ہو کر مولوی محمد یونس خالص کی قیادت میں مصروفِ جہاد رہا۔ یہ وہ لوگ تھے جو نظریاتی طور پر حزبِ اسلامی سے پوری طرح اتفاق نہیں کرتے تھے اور علماء وفقہاء کی آراء پر پورا اعتماد کرتے تھے۔ اس گروپ کا ذکر مولانا یونس خالص کے تعارف کے ضمن میں پیچھے آچکا ہے۔

مولانا محمد نبی محمدی: حرکت انقلاب اسلامی کے سربراہ مولانا محمد نبی محمدی ایک مشہور صوفی بزرگ، جید عالم دین اور بے باک اسلامی رہنما تھے۔ ان کی ولادت 1921ء میں ہوئی۔ ابتدائی اور اعلیٰ دینی تعلیم اپنے والد اور افغانستان کے نامور علمائے کرام سے حاصل کی۔ پھر درس وتدریس اور سلسلہ قادریہ کے جادۂ سلوک واحسان سے وابستہ رہے۔

افغان جہاد کے دور میں وہ عمر رسیدہ ہو چکے تھے مگر اس کے باوجود مجاہدین کو منظم کرنے میں پیش پیش رہے۔ جہاد افغانستان کے حوالے سے اگرچہ میڈیا پر دیگر جماعتیں زیادہ اثر انداز تھیں مگر مشرقی صوبے کے میدانوں میں کارکردگی کے لحاظ سے حرکت انقلابِ اسلامی سب سے آگے شمار ہوتی تھی۔

جہاد کا اصل مرکز افغانستان کے دیہات تھے اور ایسے علاقوں میں مولانا کی شخصیت نہایت قابلِ احترام اور ان کی جماعت بے حد مقبول تھی۔ مولانا محمدی کے عقیدت مند احکام شریعت کی پابندی میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کٹر مذہبی لوگوں کی جماعت تھی جس کی قیادت روایتی پختہ فکر علماء اور صوفیاء کے ہاتھ میں تھی۔ کابل، قندھار، غزنی، لوگر، قندوز اور بغلان اس تحریک کے اہم مراکز تھے۔

پروفیسر برہان الدین ربانی: پروفیسر برہان الدین ربانی 1935ء میں شمال مشرقی افغانستان کے صوبے

بدخشاں میں پیدا ہوئے۔ان کا تعلق تاجک قوم سے ہے۔کابل یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد وہ مصر چلے گئے اور جامعۃ الازہر سے ماسٹر ڈگری حاصل کی۔وطن واپس آکر کابل یونیورسٹی کی "کلیۃ الشریعۃ فیکلٹی" میں تدریس کرنے لگے اور پروفیسر کہلائے۔وہ کابل یونیورسٹی سے اسلامی تحریک چلانے والے پہلے رہنما پروفیسر غلام محمد نیازی کے سب سے معتمد رفیق تھے۔حکمت یار سے بھی ان کی رفاقت اسی دور سے رہی۔

حکمت یار سے ان کا پہلا اختلاف داؤد خان کی حکومت کے خلاف کام کے طریقہ کار کے حوالے سے تھا۔پروفیسر ربانی پُرامن سیاسی حل کے خواہاں تھے جبکہ حکمت یار مسلح تحریک کے قائل تھے۔پروفیسر غلام محمد نیازی نے جیل جانے سے پہلے ربانی کو اپنا نائب بنا دیا تھا اس لیے ربانی خود کو انقلابی تحریکوں کا جائز سربراہ تصور کرتے تھے۔حکمت یار سے ان کے اختلاف کی یہ دوسری بڑی بنیاد تھی۔

1974ء میں پروفیسر ربانی سعودی عرب گئے اور شاہ فیصل سے مل کر انہیں کمیونسٹ انقلاب کے خطرات سے آگاہ کیا۔واپس آکر کچھ مدت بعد انہوں نے جمعیت اسلامی کی بنیاد رکھی۔ربانی اس کے سربراہ تھے جبکہ احمد شاہ مسعود اس کے سرکردہ کمانڈر اور مرکزی قوت تصور کیے جاتے تھے۔

دیگر تنظیموں میں عسکری اور سیاسی اُمور کی باگ ڈور بالائی سطح پر ایک فرد یا مرکزی شوریٰ کے اختیار میں ہوتی تھی مگر "جمعیت اسلامی" کا کمزور پہلو یہ تھا کہ اس میں سیاسی امور پروفیسر برہان الدین ربانی کے پاس تھے جبکہ عسکری اُمور میں عسکری شعبہ خود مختار تھا اور سیاسی قیادت کی منشاء سے ہٹ کر فیصلے کر سکتا تھا۔یہ کیفیت احمد شاہ مسعود کی کمان میں ہزاروں ازبک، تاجک اور ترکمان مجاہدین کی جمعیت اسلامی میں شمولیت کے بعد پیدا ہوئی اور اس سے آگے چل کر نا قابلِ تلافی نقصانات سامنے آئے۔پروفیسر ربانی کے عرب ممالک سے گہرے تعلقات رہے ہیں اور انہیں وہاں سے خطیر امداد ملتی رہی ہے۔

<u>احمد شاہ مسعود:</u> احمد شاہ مسعود افغان جنگ کے سب سے شہرت یافتہ کمانڈر تھے۔وہ 1952ء میں پنج شیر کے علاقے بازارک کے گاؤں جنگلاک میں پیدا ہوئے تھے۔ان کا تعلق تاجک نسل سے تھا۔ان کے آباؤ اجداد افغان حکمرانوں کے بہترین سالاروں میں شمار ہوتے تھے، گویا احمد شاہ مسعود کو فنون سپہ گری ورثے میں ملے تھے۔انہوں نے مختلف فوجی چھاؤنیوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

1974ء میں وہ انسٹی ٹیوٹ آف پولی ٹیکنیک میں زیرِ تعلیم تھے کہ داؤد خان برسرِ اقتدار آگیا۔احمد شاہ مسعود کابل یونیورسٹی کی طلبہ تنظیم نوجوانانِ اسلام کے ابتدائی سینئر ارکان میں شامل ہونے کی وجہ سے زیرِ عتاب آگئے چنانچہ وہ اپنے آبائی علاقے پنج شیر چلے گئے اور یہاں سے کمیونسٹوں کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔

ان کے استاذ پروفیسر برہان الدین نے ''جمیعت اسلامی'' قائم کی تو مسعود اس سے وابستہ ہو گئے تاہم ان کا زیادہ وقت پنج شیر میں عسکری مہمات میں گزرتا تھا جبکہ برہان الدین ربانی سیاسی اُمور اور میڈیا وار میں نمایاں تھے۔ جمیعت اسلامی کی اصل قوت احمد شاہ مسعود ہی کو سمجھا جاتا تھا۔ احمد شاہ مسعود کو تاریخ کے مطالعے سے گہری دلچسپی تھی۔ اس مطالعے نے جنگی چالوں اور عسکری حربوں سے متعلق ان کے تجربے کو انتہا تک پہنچا دیا تھا۔

فرانسیسی زبان سے واقفیت کے باعث اس جنگجو کمانڈر نے زمینی جنگ کے ساتھ ساتھ ''میڈیا وار'' میں نہایت شاندار نتائج حاصل کیے۔ مغربی ذرائع ابلاغ خصوصاً فرانسیسی میڈیا نے ہمیشہ احمد شاہ مسعود کو غیر معمولی انداز میں نمایاں کیا۔ اس لحاظ سے جلد ہی وہ عالمگیر شہرت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ''شیرِ پنج شیر'' کا لقب پایا۔ کمیونسٹوں اور روسیوں سے برسرِ پیکار رہنے کے باوجود احمد شاہ مسعود مغربی نظامِ زندگی اور فلسفۂ وطنیت سے بے حد متاثر تھے اس لیے یہ جنگ ان کے نزدیک جہاد سے زیادہ دفاعِ وطن کی لڑائی تھی۔

ان کے بعد کے طرزِ عمل سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ دیگر مجاہد رہنماؤں کے برخلاف شاید وہ افغانستان میں کسی کٹر اسلامی حکومت کے قیام کی خواہش نہیں رکھتے تھے۔ خود کو ملک کی غالب ترمؤثر قوت کے طور پر منوانے کا جذبہ ہمیشہ ان کے دل میں جاگزین رہا۔ احمد شاہ مسعود کی ہوشیاری کا یہ عالم تھا کہ مغربی میڈیا کے علاوہ روسی نمایندوں حتیٰ کہ کے جی بی کے اہلکاروں سے بھی ان کے گہرے روابط رہے اور وہ حسبِ موقع سب سے اپنا سیاسی و عسکری مفاد حاصل کرتے رہے۔ احمد شاہ مسعود جہاد افغانستان کی کامیابی کے کئی سال بعد ظہور پذیر ہونے والے طالبان کے آخری ایام میں 10 ستمبر 2001ء کو ایک قاتلانہ حملے میں جاں بحق ہو گئے۔

<u>پروفیسر عبدالرب رسول سیاف:</u> پروفیسر عبدالرب رسول سیاف 1945ء میں کابل کے قریب ''پغمان'' میں پیدا ہوئے۔ کابل یونیورسٹی میں کچھ مدت زیر تعلیم رہنے کے بعد جامعۃ الازہر (قاہرہ) سے ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ 1973ء میں اپنی اسلامی سرگرمیوں کے باعث گرفتار ہوئے اور طویل مدت تک شدید مصائب برداشت کیے۔ انہیں پھانسی دینے کا فیصلہ ہو سکتا تھا مگر حفیظ اللہ امین (جو بعد میں افغانستان کا صدر بنا) ان کا خالہ زاد بھائی تھا۔ اس کی سفارش سے وہ سزائے موت سے بچ گئے۔ رہائی پانے کے بعد ہجرت کر کے پشاور پہنچے۔ تنظیموں کے جوڑ توڑ کے چند مراحل کے بعد ''اتحاد اسلامی'' کے نام سے ایک جماعت بنائی۔ سیاف عربی کے بہترین مقرر تھے اس لیے عرب دنیا میں انہیں بے حد

مقبولیت حاصل ہوئی۔ خلیجی ممالک اور سعودی عرب ان سے بطورِ خاص مالی تعاون کرتے رہے۔

پیر احمد گیلانی: پیر احمد گیلانی کے والد بغداد سے ہجرت کر کے کابل آ بسے تھے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ سے خاندانی نسبت کی بنا پر یہ گھرانہ افغان عوام میں نہایت معزز شمار ہونے لگا۔ شاہ امان اللہ خان پیر احمد گیلانی کے والد کو اپنے قریب رکھتا تھا۔ پیر احمد گیلانی کی جماعت محاذِ ملی (پیمان اتحاد اسلامی) کے نام سے فعال رہی۔ جنرل عبدالرحمن اس کے منتظم اور کمانڈر سلیمان گیلانی عمومی کمانڈر کی حیثیت رکھتے تھے۔

پروفیسر صبغت اللہ مجددی اور خدام الفرقان: پروفیسر صبغت اللہ مجددی کا تعلق بھی افغانستان کے ایک روحانی خانوادے سے تھا۔ ان کے والد شیخ اسماعیل مجددی نے کمیونزم کے خلاف ابتداء ہی میں آواز بلند کرنا شروع کر دی تھی۔ یہ ظاہر شاہ کا دور تھا اور وزیر اعظم داؤد خان ثقافتی انقلاب کے نام پر الحاد اور لادینیت کو سرکاری سطح پر پھیلانے کی مہم شروع کر چکا تھا۔ مولانا شیخ اسماعیل مجددی نے اس طوفان کے خلاف مزاحمت کے لیے 1966ء میں غزنی کے نور المدارس میں ایک تنظیم ''خدام الفرقان'' کی بنیاد رکھی۔ اس تنظیم نے جلسے جلوسوں اور احتجاجی مظاہروں کے ذریعے ظاہر شاہ کو مسلمانانِ افغانستان کے جذبات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی اور ایک رسالہ ''ندائے حق'' بھی جاری کیا مگر ظاہر شاہ اور داؤد خان کے ہاں علماء کی آواز کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

ظاہر شاہ کے بعد داؤد خان کے دور میں ''خدام الفرقان'' کو کچلنے کی بڑی کوششیں کی گئیں۔ اس کے رہنماؤں اور کارکنوں کو گرفتار کیا جانے لگا۔ ترہ کئی کے دور میں انقلابِ ثور کے آغاز کے ساتھ ہی خدام الفرقان کے قائدین نے جن میں پروفیسر صبغت اللہ مجددی اور کمانڈر مولانا ارسلان خان رحمانی پیش پیش تھے، ملک بھر کے مفتیانِ کرام سے رابطہ کیا اور ان سے جہاد کے بارے میں فتویٰ طلب کیا۔ سب نے متفقہ طور پر جہاد کی فرضیت کا فتویٰ دیا۔ تب خدام الفرقان کے قائدین میدان میں کود گئے۔ انہوں نے خفیہ طور پر مختلف علاقوں کے دورے کیے۔ وہ رات کی تاریکی میں لوگوں سے مل کر انہیں دعوتِ جہاد دیتے اور کمیونسٹ حکومت کے خلاف ''شب نامے'' تقسیم کرتے جن میں بتایا جاتا کہ یہ حکومت کافر ہے، دشمنِ دین و ایمان ہے، علماء اس کے خلاف جہاد کا فتویٰ دے چکے ہیں لہٰذا عوام ندائے جہاد پر لبیک کہنے میں دیر نہ کریں۔ دوسرے مرحلے میں انہوں نے سرکاری عمال کے خلاف گوریلا جنگ شروع کی۔ سب سے پہلے ان تعلیمی اداروں کو تباہ کرنا شروع کیا جہاں طلبہ کو کمیونزم کی تعلیم دے کر دین سے باغی بنا دیا جا رہا تھا۔ اس دوران کمیونسٹوں نے مولانا اسماعیل مجددی کو گرفتار کر لیا اور کسی نامعلوم مقام پر لے جا کر شہید کر دیا۔ ان کی شہادت کے بعد خدام الفرقان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی اور نئی جہادی و انقلابی

جماعتیں ظہور پذیر ہوئیں۔ اس دوران پروفیسر صبغت اللہ مجددی نے الگ تنظیم بنالی جو کہ نجات ملی (جبہ آزادی) کے نام سے کام کرتی رہی۔ اگرچہ یہ جماعت عسکری لحاظ سے کمزور تھی تاہم مجددی صاحب کو ایک روحانی شخصیت ہونے کے ناتے افغان عوام میں بہت احترام حاصل تھا اس لیے جہادی قائدین بھی انہیں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

عرب ممالک میں مجددی صاحب کی شخصیت خاصی معروف تھی اس لیے جہاد کے آخری دور میں وہ سیاسی طور پر زیادہ اہمیت اختیار کر گئے اور نئی عبوری افغان حکومت کے پہلے سربراہ مقرر ہوئے۔

مولانا نصر اللہ منصور: مولانا نصر اللہ منصور جہادِ افغانستان کے اولین قائدین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ ایک درویش صفت عالم دین اور ماہر گوریلا کمانڈر کے طور پر مشہور تھے۔ انہوں نے ذاتی سیاسی فوائد حاصل کرنے سے گریز کیا اور ہمیشہ اعلیٰ مناصب کے لیے دوسروں کو ترجیح دی۔ یہی وجہ ہے کہ صفِ اول کے کمانڈر اور مذہبی رہنما ہونے کے باوجود وہ جہاد کے حوالے سے میڈیا پر اتنے معروف نہیں تھے جیسا کہ ان کی حیثیت کا تقاضا تھا۔ ان کا اصل نام فضل الرحمن تھا مگر انہیں نصر اللہ منصور کے نام سے شہرت ملی۔ وہ 1940ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق قبیلہ "سہاک" سے تھا۔ صوبہ پکتیا کا علاقہ "زرمت" ان کا مسکن تھا۔ انہوں نے غزنی کی مشہور دینی درسگاہ "جامعہ فاروقیہ" سے علوم دینیہ کی تکمیل کی۔

1966ء میں ظاہر شاہ کے دور کی جدت پسندی کا مقابلہ کرنے کے لیے اکابر علماء کے تعاون سے "خدام الفرقان" نامی تنظیم قائم کی گئی۔ مولانا اسماعیل مجددی اس تنظیم کے پہلے سربراہ تھے۔ مولانا نصر اللہ منصور اس تنظیم کے بانی ارکان میں شامل تھے۔ وہ 1973ء میں اس کے مرکزی نائب امیر مقرر کردیے گئے۔ یہ ظاہر شاہ کا دور تھا جس میں انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

ترہ کئی کے دور میں وہ "حرکت انقلاب اسلامی" میں شامل ہوئے اور مولانا محمد نبی محمدی کے دست راست بنے۔ "حرکت انقلاب اسلامی" کئی بڑے جہادی لیڈروں کے مشترکہ پلیٹ فارم کے طور پر کچھ عرصے تک فعال رہی مگر جلد ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی۔ الگ ہونے والے لیڈروں نے اپنی اپنی جماعتیں قائم کرلیں۔ علمائے کرام نے ان جہادی لیڈروں کو ایک اتحاد بنانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تو "حرکت انقلاب اسلامی" کے دو مرکزی رہنماؤں مولانا محمد نبی محمدی اور مولانا نصر اللہ منصور کے درمیان اس اتحاد میں شرکت کے حوالے سے اختلاف ہوگیا۔ حرکت انقلاب اسلامی کی شوریٰ کے فیصلے کے مطابق مولانا نصر اللہ منصور اتحاد میں شمولیت کے حامی تھے جبکہ مولانا محمد نبی محمدی اس سے گریزاں تھے۔ اس صورت حال میں ارکانِ شوریٰ نے مولانا نصر اللہ منصور کو نیا امیر چن کر مجاہدین کے اتحاد میں شمولیت اختیار

کرلی۔ یوں حرکت انقلاب اسلامی (نصر اللہ منصور گروپ) وجود میں آیا۔ جبکہ مولانا محمد نبی محمدی حرکت انقلاب اسلامی (محمدی گروپ) کے نام سے علیحدہ کام کرتے رہے۔ مولانا نصر اللہ منصور کچھ عرصے تک اتحادی تنظیموں کے ساتھ سرگرمی سے جہاد میں مصروف رہے مگر پھر بیرونی امداد کے حوالے سے بعض تحفظات نے انہیں علیحدگی پر مجبور کردیا۔ اِدھر مولانا محمد نبی محمدی اتحاد میں شامل ہوگئے۔

مولانا نصر اللہ منصور آخر تک اپنے گروپ کے ساتھ علیحدہ طور پر مصروفِ جہاد رہے۔ صوبہ پکتیا اور گردونواح کے علاقوں میں ان کی گرفت نہایت مضبوط تھی۔ جہاد کے آخری مراحل میں وہ ایک غیر ملکی سازش کے تحت ایک اچانک حملے میں شہید کردیے گئے۔

چند اور اہم کمانڈر

مولانا ارسلان خان رحمانی: مولانا ارسلان رحمانی کا تعلق صوبہ پکتیکا کے علاقے ارگون (ارغون) سے تھا۔ ارگون کا نواحی گاؤں "خالق داد بابا کلے" ان کی جائے پیدائش تھا۔ انہوں نے 17 سال دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے اور پھر 15 سال تدریسی خدمات انجام دینے میں گزارے۔ وہ تفسیر، حدیث اور دیگر علوم وفنون کے استاذ الاساتذہ شمار ہوتے تھے۔ داؤد خان اور ترہ کئی کے دور میں انہوں نے مولانا شیخ اسماعیل مجددی کی جماعت خدام القرآن میں شمولیت اختیار کی۔ وہ اس تحریک کے نہایت سرگرم عہدے دار تھے۔

خدام الفرقان ختم ہوئی تو وہ حرکت انقلاب اسلامی میں شامل ہوگئے۔ پھر پارٹیوں کے جوڑ توڑ اور نئی تنظیموں کی تشکیل کے بعد پروفیسر عبد الرب رسول سیاف کی جماعت "اتحاد اسلامی" میں آگئے۔

مولانا ارسلان رحمانی کی کارروائیوں کا خاص مرکز ارغون تھا۔ وہ تین بار گرفتار بھی ہوئے مگر ہر بار فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ صوبہ پکتیکا میں روسی فوج ان کے نام سے کانپتی تھی اور انہیں آدم خور کہہ کر یاد کرتی تھی۔

کمانڈر رسید الرحمن: کمانڈر رسید الرحمن 1949ء میں پیدا ہوئے۔ یہ گلبدین حکمت یار کے ہم قبیلہ تھے اور بعد میں انہی کی جماعت حزبِ اسلامی کے نامور کمانڈر بنے۔ کابل یونیورسٹی سے ایم اے اکنامکس کرنے کے دوران یہ "نوجوانانِ اسلام" میں شامل ہوگئے تھے۔ ترہ کئی حکومت کے دور میں انہیں گرفتار کرلیا گیا اور کمیونسٹ عدالت نے سزائے موت سنادی۔ انہیں پھانسی گھاٹ کی طرف لے جایا جارہا تھا کہ انہوں نے راستے میں سرکاری محافظوں کو اسلام اور ملک وملت کے ناموس کی دہائی دی۔ اس

پُراثر گفتگو سے متاثر ہو کر سرکاری اہلکاروں نے انہیں فرار ہونے کا موقع دے دیا۔ یہ طویل سفر کرتے ہوئے پاراچنار کے راستے پاکستان پہنچے اور حزبِ اسلامی میں شامل ہو گئے۔ جلد ہی ان کی صلاحیتوں کے پیشِ نظر انہیں لوگر، کنڑ، غزنی اور وردگ میں اہم ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ وہ متعدد بار دشمن کے محاصرے میں آئے، ساتھیوں کو ان کی شہادت کا یقین ہو جاتا مگر وہ اتنے میں گھیرا توڑ کر ان کے پاس پہنچ جاتے۔ ایک بار محاصرے سے نکل کر کسی مسجد میں پہنچے تو وہ وہاں ان کے لیے دُعائے مغفرت کی جا رہی تھی۔ سید الرحمن کی ڈاڑھی جوانی میں ہی سفید ہو گئی تھی۔ کہتے تھے: ''اتنے ساتھیوں اور مجاہدوں کو اپنے ہاتھوں سے دفن کیا ہے۔ اس کے بعد بال کالے کیسے رہ سکتے ہیں۔''

مولوی جان محمد: افغانستان کے جنوب مشرقی اور مغربی اضلاع ہی نہیں شمال میں بھی بڑے بڑے مجاہد کمانڈر کمیونسٹ اور سوویت افواج سے نبرد آزما رہے۔ ان میں ایک اہم نام مولوی جان محمد کا ہے۔ افغانستان کا انتہائی شمالی صوبہ بدخشاں جو کہ دنیا کی چھت ''پامیر'' کے ساتھ جا لگتا ہے ان کا مرکز تھا۔ تحصیل فیض آباد کے علاقے ''دیفتل'' میں گاؤں ''فضل خواہ'' ان کا مسکن تھا۔ وہ نسلاً تاجک تھے۔ تخار اور بغلان کے قدیم طرز پر کام کرنے والے دینی مدارس سے دینی تعلیم حاصل کی۔ کابل کے مدرسہ قلعہ جواد اور بدخشاں کے ''مدرسہ خرقہ مبارک'' میں تدریسی فرائض بھی انجام دیے۔ سرخ انقلاب کے بعد جولائی 1978ء میں جہاد کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ان کی وابستگی حزبِ اسلامی (یونس خالص گروپ) سے رہی۔ 1980ء میں انہوں نے کوہ غازیان (سابقہ نام کوہ ڈزدان) پر ایک بڑا خونریز معرکہ لڑ کر دشمن کے مضبوط مرکز ''عقاب شین چھاؤنی'' پر قبضہ کر لیا۔ شاہراہ بدخشاں پر حریف افواج کے کانوائے اکثر ان کے تند و تیز حملوں کی زد میں رہے۔ ان کے زیرِ قیادت مجاہدین روس کی مقبوضہ مسلم ریاستوں میں گھس کر بھی سوویت یونین کے خلاف کارروائیاں کرتے رہے۔

کمانڈر عبدالبصیر: کمانڈر عبدالبصیر خان کا تعلق بدخشاں سے تھا۔ ان کی ولادت 1951ء میں ہوئی۔ حصولِ تعلیم کے بعد 1971ء میں عصری تعلیمی اداروں میں تدریس شروع کر دی۔ سرخ انقلاب کے خلاف اساتذہ و طلبہ کو متحد کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اپریل 1979ء میں انہوں نے فیض آباد کے تحصیل ہیڈ کوارٹر پر قبضہ کر کے کمیونسٹوں کو ہراساں کیا۔ اسی سال پشاور آ کر برہان الدین ربانی سے ملے اور جمعیت اسلامی کے نامزد کمانڈر بن کر دوبارہ شمالی افغانستان میں مصروف پیکار رہے۔

مولوی دولت اللہ: بدخشاں کی سب ڈویژن دوراز کا گاؤں جوئی دریائے آمو کے بالکل کنارے پر واقع ہے۔ مولوی دولت اللہ اس گاؤں کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے ترہ کئی دور میں ہی برلب دریا

"معسکر دلاور شہید" کے نام سے ایک مرکز بنالیا تھا جس سے وہ دریائے آمو میں چلنے والی روسی کشتیوں پر حملے کرتے رہے۔ اسلحے سے لدی روسی کشتیاں ڈبونا ان کا خاص مشغلہ تھا۔ وہ روس کے اندر بھی کارروائیاں کرتے رہے۔ ایک بار دشت رچ کے روسی ائیرپورٹ کو بھی حملے کا نشانہ بنایا۔ وہ مقبوضہ مسلم ریاستوں کے مسلمانوں کو اسلامی کتب اور اسلحہ فراہم کرنے کا کٹھن کام بھی انجام دیتے رہے۔

مولانا نظام الدین حقانی: مولانا نظام الدین حقانی 1934ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی اور وسطی تعلیم افغانستان کے دینی مدارس میں حاصل کی اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (پاکستان) آگئے۔ علوم دینیہ کی تحصیل کے بعد 17 سال تک درس و تدریس سے منسلک رہے۔ یہ ان کی یکسوئی کا دور تھا جس میں وہ ہمہ تن فروغ علم کے لیے وقف تھے۔ ظاہر شاہ کے دور میں وہ پہلی بار اس وقت منظر عام پر آئے جب کمیونسٹوں نے ایک جلسے میں لینن پر دُرود پڑھا۔ اس ناپاک جسارت کے خلاف علمائے کرام نے احتجاجی تحریک شروع کردی۔

مولانا نظام الدین اس تحریک کے روح رواں تھے۔ ان کی سرتوڑ کوششوں سے پکتیا میں چھ ماہ تک ان مظاہروں کا سلسلہ جاری رہا۔ کمیونسٹوں کے مظالم سے مجبور ہوکر 1974ء میں انہوں نے پاکستان ہجرت کی اور اہل و عیال کو محفوظ مقام پر پہنچا کر جہاد میں شریک ہوگئے۔ وہ مولانا جلال الدین حقانی کے دست راست بن گئے اور آخر تک ان کے نائب کی حیثیت سے مصروفِ کار رہے۔

ترہ کئی کے دور میں انہوں نے مزاری کس (پکتیا) کا مشہور معرکہ لڑا۔ اس دور میں ان کے بھائی عبدالسلام کو جیل میں تشدد کے ذریعے شہید کردیا گیا۔ ان کے دوسرے بھائی مولانا فتح اللہ حقانی جو نامور گوریلا کمانڈر تھے، 1985ء کے ایک بڑے معرکے میں شہید ہوئے۔ افغان جہاد میں ان کے خاندان کے کم و بیش 12 افراد نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔

نوٹ: یہ افغان جہاد کی اہم شخصیات کی صرف ایک جھلک دکھائی گئی ہے۔ ان کے علاوہ درجنوں رہنماؤں اور بیسیوں نامور کمانڈروں کی ایک فہرست ہے جن کا ذکر طوالت کے خدشے سے ترک کیا جارہا ہے۔

جہادِ افغانستان اور شیعہ تنظیمیں: افغانستان میں شیعہ آبادی کا تناسب تقریباً 10 فیصد ہے جن میں امامیہ اور اسماعیلی فرقے شامل ہیں۔ 1978ء کے انقلابِ ثور کے بعد ان میں سے لاکھوں افراد نے ایران میں پناہ لی۔ یوں ایران بھی افغانستان پر روسی حملے سے متاثر ہوا۔ مستقبل میں افغانستان کے اندر شیعہ مفادات کے تحفظ کے لیے شیعہ رہنماؤں نے بھی ایران میں تنظیم سازی شروع کردی اور کئی چھوٹے چھوٹے شیعہ عسکری گروپ وجود میں آگئے جن کا اتحاد "حزبِ وحدت" کے نام سے قائم ہوا۔

شیعہ مسلح گروپوں نے افغان جہاد میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کیا۔ تاہم ایران کی بھرپور سرپرستی نے انہیں سیاسی طور پر اہمیت دلوادی۔ چونکہ ایران روس کا اتحادی تھا اس لیے وہ قصداً روس کے خلاف ان تنظیموں کو میدانِ جنگ میں فعال کرنے سے کتراتا رہا۔ اس کے برخلاف شیعہ تنظیمیں، سنی تنظیموں کے لیے مشکلات ضرور پیدا کرتی رہیں۔ روسی افواج کی واپسی کے بعد ایران نے شیعہ تنظیموں کو میدان میں لاکھڑا کیا۔ اس مقصد کے لیے وہ انہیں بے پناہ عسکری وسائل مہیا کر چکا تھا۔ اس طرح نئی حکومت کی تشکیل میں شیعہ تنظیموں کو جہاد میں اپنے کردار کی نسبت زیادہ حصہ دلوانے کی کوشش کی گئی۔ ان امور کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ جہادِ افغانستان کے اصل دور میں جو 1979ء سے 1988 تک محیط تھا، ایران نواز شیعہ تنظیموں کا کوئی کردار نظر نہیں آتا۔ اہم کردار انہی قائدین، کمانڈروں اور جماعتوں کا تھا جن کا ہم تعارف کرا چکے ہیں۔

مآخذ و مراجع

- ...... افغانستان کی کہانی حقائق کی زبانی۔ ڈاکٹر مظفر احمد
- ...... افغانستان ایک قوم کا المیہ۔ احمد شجاع پاشا
- ...... اردو ڈائجسٹ، جہادِ افغانستان نمبر اپریل 1989ء، فروری 1990ء
- ...... تاریخ جہاد افغانستان۔ ڈاکٹر ایچ بی خان

چھبیسواں باب

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے

1980ء افغان مجاہدین کا جوشِ انتقام: تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ مجاہدین افغانستان مولوی محمد یونس خالص، مولوی محمد نبی، گلبدین حکمت یار، احمد شاہ مسعود، عبدالرب رسول سیاف جیسے معرکہ آزما رہنماؤں کی قیادت میں جمع ہو رہے تھے۔ ان مجاہد رہنماؤں نے داؤد اور ترہ کئی کے زمانے میں جہاد کے لیے زمین ہموار کرلی تھی۔ وہ تقریباً تین سال سے نوجوانوں کو گوریلا تربیت دے رہے تھے۔ افغان باشندے پیدائشی طور پر جفاکش اور سخت جان ہوتے ہیں اور ان کا ہر فرد ایک حد تک اسلحہ چلانا ضرور جانتا ہے۔ اس لیے انہیں گوریلا تربیت حاصل کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔ روسی یلغار کے وقت مجاہد رہنماؤں کی تربیت لینے والے نوجوانوں کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ ہو چکی تھی اور وہ پورے افغانستان، خصوصاً اس کے مشرقی، وسطی اور جنوبی صوبوں میں پھیلے ہوئے تھے۔

رہنما متحد ہو گئے: افغان جہاد کے ابتدائی ایام میں ان تنظیموں اور قائدین کے درمیان کوئی مؤثر رابطہ نہیں تھا۔ یہ سب بکھری ہوئی شکل میں اپنے اپنے زیرِ اثر علاقوں میں سرخ افواج سے برسرِ پیکار تھے۔ مجاہدین کے پاس افرادی قوت کی کمی نہیں تھی البتہ نظم وضبط کا فقدان تھا اور وہ ان جدید عسکری وسائل سے محروم تھے جن سے کمیونسٹ اور سوویت افواج لیس تھیں۔ روسی افواج کی مداخلت سے قبل مجاہدین کی مختلف تنظیموں کے درمیان علاقائی اور نسلی چپقلش بھی موجود تھی، اس کے علاوہ ان کے کمانڈر عموماً ایک دوسرے پر اعتماد کرنے میں تامل کر رہے تھے۔ بڑے رہنماؤں کے اپنے اپنے تحفظات اور خدشات تھے، اسی لیے جس تیزی سے ان کی تنظیمیں وجود میں آتی تھیں، کچھ مدت بعد اسی طرح تحلیل ہو جاتی تھیں، اس صورتِ حال کی کئی مثالیں مجاہد رہنماؤں کے تعارف کے تحت آچکی ہیں۔

دریں حالات مجاہدین کو منظم کرنے کی سخت ضرورت تھی ورنہ ان کی جدوجہد کارگر ہونے کے امکانات زیادہ نہیں تھے۔ مجاہد رہنماؤں نے جلد ہی باہمی اعتماد کے قیام کی ضرورت محسوس کرلی۔ سرخ افواج کی

مداخلت کے صرف ایک ماہ بعد 28 جنوری 1980ء کو چھ جہادی تنظیموں کا اتحاد وجود میں آ گیا۔ پروفیسر برہان الدین ربانی اتحاد کی سپریم کونسل کے صدر چن لیے گئے۔ اس اتحاد کی تشکیل میں امریکہ اور حکومت پاکستان کا خاص کردار تھا جبکہ مالی تعاون میں سعودی عرب نے گہری دلچسپی لی۔ خادم الحرمین شریفین شاہ خالد مرحوم نے مجاہد رہنماؤں کے اتحاد کا خیر مقدم کرتے ہوئے 24 ملین ڈالر کی خطیر رقم بطور عطیہ فراہم کی۔

زبردست کارروائیاں: اس کے بعد افغانستان میں روسی افواج کے خلاف زبردست کارروائیوں کا آغاز ہو گیا۔ 13 فروری 1980ء کو مجاہدین نے جلال آباد ائر پورٹ تباہ کر دیا۔ 10 مارچ کو مجاہدین نے خونریز لڑائی کے بعد کابل طورخم شاہراہ پر قبضہ کر لیا۔ اس جنگ میں سینکڑوں روسی سپاہی مارے گئے۔ 11 اپریل کو مجاہدین نے ننگرھار میں ایک سو کے لگ بھگ روسیوں کو ہلاک کر دیا۔ تاہم روس کی جوابی فضائی کارروائیوں میں درجنوں مجاہدین بھی شہید ہو گئے۔ کابل کے گرد و پیش میں بھی مجاہدین کی گوریلا کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ 24 مئی کو انہوں نے نواحِ کابل میں اسلحے اور گولہ بارود کا ایک بڑا ذخیرہ نذر آتش کر دیا۔ اُدھر قندھار میں زوردار معرکہ ہوا اور تین سو روسی داخلِ جہنم ہو گئے۔ 9 رجون کو ہرات میں زبردست لڑائی کے دوران 874 روسی مارے گئے۔ اس دن مجاہدین کی ایک بڑی تعداد گوریلا کارروائیوں کے لیے کابل میں گھس گئی اور روسی افسران کو پہلی بار احساس ہوا کہ کابل پر ان کی گرفت کمزور ہے۔

ان مجاہدین کے داخلے کے اگلے دن 10 ہزار تازہ دم سوویت سپاہیوں نے آ کر کابل میں مورچے بنا لیے تاہم مجاہدین کا خوف کابل پر مسلط رہا۔ موسم گرما میں پغمان اور ہرات بھی شدید معرکوں کا مرکز بن گئے۔ ہرات کی کارمل انتظامیہ دو ماہ بعد سرنگوں ہو گئی جبکہ پغمان پر بھی مجاہدین قابض ہو گئے۔ کٹھ پتلی حکمران ببرک کارمل اس صورتِ حال سے اتنا حواس باختہ تھا کہ 18 جون کو اس نے خودکشی کی کوشش کر ڈالی۔ اسے بچانے کی کوشش میں اس کا ایک محافظ ہلاک اور دو زخمی ہو گئے۔

مزید روسی افواج کی طلب: خود سوویت انتظامیہ مجاہدین کی خلافِ توقع شدید مزاحمت پر حیران تھی۔ جولائی میں اس نے 65 ہزار سپاہیوں پر مشتمل مزید 5 ڈویژن فوج افغانستان بلائی تاکہ مجاہدین کا زور توڑا جا سکے۔ اگست کے اواخر تک مزید 16 ہزار سپاہی منگوائے گئے۔ اس طرح افغانستان میں سوویت فوج کی تعداد دو لاکھ کے قریب ہو گئی جبکہ ببرک کارمل دنیا کو دھوکے میں رکھنے کے لیے یہ بیان دے رہا تھا کہ افغانستان میں روسی سپاہیوں کی تعداد صرف 10 ہزار ہے۔

ببرک کارمل اپنی حیثیت سے خوب واقف تھا اس لیے وہ موسمِ گرما میں ہونے والی اسلامی وزرائے خارجہ کانفرنس میں بھی شریک نہ ہوا۔ اس کی اپنی افواج اس کا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھیں۔ روسی افواج کی تم

ریزیاں بہت سے افغان سپاہیوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھیں۔ ایک دن روسیوں نے چھ افغان طلبہ کو گرفتار کر کے ان سے نازیبا سلوک کیا تو ایک افغان رائفل بردار سپاہی سے رہا نہ گیا۔ اس نے فائرنگ کر کے چار روسیوں کو وہیں موت کے گھاٹ اُتار دیا اور پھر خود روسیوں کے انتقام سے بچنے کے لیے خودکشی کر لی۔

9 مارچ 80ء کو ذرائع ابلاغ نے یہ دھماکا خیز خبر نشر کی کہ اب تک 60 ہزار افغان فوجی مجاہدین میں شامل ہو چکے ہیں۔ ماہ ستمبر میں روس کے وادی پنج شیر پر حملے کے دوران ایک ہزار افغان فوجی مجاہدین سے جا ملے۔ 6/ اکتوبر کو روسی افواج نے سو سے زائد افغان فوجیوں کو فرار کی کوشش پر گولی مار کر ہلاک کر دیا، افغان فوجیوں کی تعطیلات منسوخ کر دیں اور ان کی خط و کتابت پر پابندی عائد کر دی۔ افغان سرکاری افواج کی تعداد گھٹتے گھٹتے 7 ماہ کے دوران صرف 50 ہزار رہ گئی۔

روس وسط ایشیا کے ہزاروں مسلم فوجیوں کو بھی امریکا اور چین سے جنگ کا دھوکا دے کر افغانستان میں لے آیا تھا۔ ایسے بہت سے سپاہی حقیقت کھلتے ہی مجاہدین سے جا ملتے تھے۔ آخر کار نومبر 80ء میں روس نے تمام مسلم سپاہیوں کو وسط ایشیا واپس بھیج دیا۔

<u>افغان مہاجرین کی اعانت</u>: روس کے خلاف مزاحمت کے اس ابتدائی دور میں مجاہدین کو جدید اسلحے اور خوراک ورسد کے لیے اخراجات کی شدید ضرورت تھی۔ علاوہ ازیں لاکھوں کی تعداد میں افغان مہاجرین پاکستان اور ایران کا رخ کر رہے تھے۔ پاکستانی کیمپوں میں 10 لاکھ سے زائد مہاجرین جمع ہو چکے تھے۔ ان کی ضروریات کی کفالت کے لیے بہت بڑے پیمانے پر تعاون درکار تھا۔ صدر ضیاء الحق نے اس موقع پر افغان مہاجرین کے لیے امدادی فنڈ قائم کیا جس کے بہترین نتائج برآمد ہوئے۔ 11/ مارچ 1980ء کو جب اس کی ابتدا ہوئی تو اس میں 20 لاکھ روپے جمع تھے۔ نومبر میں یہ رقم 26 کروڑ سے تجاوز کر گئی۔ مظلوم افغانوں کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھنے والے ملکوں، اداروں اور افراد نے دل کھول کر تعاون کیا۔ عرب اس سلسلے میں سب سے آگے تھے۔ ایک سعودی تاجر سید حسن عباس نے آٹے کی 20 لاکھ بوریاں فراہم کیں۔

<u>روس کی پاکستان کو دھمکی</u>: پاکستان کی اس پالیسی سے روس بے حد برہم تھا۔ اکتوبر 1980ء کے آغاز میں روسی وزیر خارجہ نے اپنے پاکستانی ہم منصب آغا شاہی سے ملاقات کی۔ بعد میں صدر ضیاء الحق نے ایک بیان میں انکشاف کیا کہ روس ہمیں "ٹھیک" کر دینے کی دھمکی دے رہا ہے۔

روس پاکستان کو عملاً بھی متنبہ کر رہا تھا۔ ایک سال کے دوران روس اور افغان طیارے بیسیوں بار پاک افغان سرحد کی خلاف ورزی کر چکے تھے۔ روس نے بارڈر پر اندھا دھند بارودی سرنگیں بچھانے کا

کام بھی شروع کر دیا تھا تا کہ مہاجرین کے قافلے سلامتی سے پاکستان نہ پہنچ سکیں۔

صدر ضیاء الحق ایک طرف افغان مسئلے سے نبرد آزما تھے، دوسری طرف تقریباً تمام سیاسی پارٹیاں ان کی مخالف تھیں۔ سابق حکمران پارٹی پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو کی اہلیہ بیگم نصرت بھٹو برملا کہہ رہی تھیں کہ ہم افغان باغیوں کو پاکستان میں پناہ لینے کی اجازت نہیں دیں گے۔ 22 اپریل 80ء کو صدر ضیاء الحق کی افغان پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے ببرک کارمل کی حکومت کو قابل قبول قرار دیا۔

<u>جنرل اسمبلی میں صدر ضیاء الحق کی تقریر:</u> تاہم صدر ضیاء الحق اپنی دھن کے پکے تھے۔ انہوں نے یکم اکتوبر 80ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں افغان بحران کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا وہ ان کے عزم مصمم کا پتا دے رہے تھے۔ انہوں نے کہا: ''افغانستان میں مزاحمت کی تحریک ایک غیور قوم کے جذبہ حب الوطنی کا اظہار ہے...... جس نے کبھی بیرونی تسلط برداشت نہیں کیا۔'' انہوں نے اس تقریر میں سوویت افواج کی غیر مشروط واپسی اور افغانستان کی آزادانہ خود مختار حیثیت کی بحالی کا مطالبہ کیا۔

<u>ماسکو اولمپکس کا بائیکاٹ:</u> افغانستان پر روسی حملے کو دنیا بھر میں تشویش کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا۔ اس حقیقت کا اس وقت کھل کر اظہار ہوا جب 27 ممالک نے ماسکو میں منعقد ہونے والے اولمپکس گیمز 1980ء میں شرکت سے انکار کر دیا۔ ان میں سعودی عرب، مراکش، اُردن، بحرین، سوڈان، ملائشیا جیسے اسلامی ملکوں کے علاوہ برطانیہ، آسٹریلیا، جاپان، چین، ہالینڈ، ناروے، نیوزی لینڈ اور چلی بھی شامل تھے۔ اگست کے آغاز میں جب ماسکو اولمپکس گیمز اختتام پذیر ہوئے تب تک ان کا بائیکاٹ کرنے والے ملکوں کی تعداد 60 تک پہنچ گئی تھی۔ بائیکاٹ کی اس مہم کو کامیاب بنانے کے لیے امریکی میڈیا نمایاں کردار ادا کر رہا تھا۔

<u>عالمی سطح پر افغان مسلمانوں سے تعاون کا جذبہ:</u> سعودی عرب نے افغان مہاجرین کی امداد کے لیے ریاض میں ایک خصوصی فنڈ قائم کر دیا تھا۔ مئی 1980ء تک اس فنڈ میں تقریباً ساڑھے 4 کروڑ ریال جمع ہو چکے تھے۔ بیرون ممالک میں مقیم افغان بھی روس کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تہران میں افغان طلبہ نے افغان سفارت خانے پر قبضہ کر کے اپنے ملک کی آزادی کے لیے لڑنے کا عزم ظاہر کیا۔ سابق افغان حکمران ظاہر شاہ نے جو کہ 1973ء سے اٹلی کے دارالحکومت ''روم'' میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے، فرانس کے ایک خبری ادارے کو انٹرویو دیتے ہوئے مغربی طاقتوں سے یہ اپیل کی کہ وہ روس کو افغانستان سے باہر نکالنے کی کوشش کریں۔ ایک اور بیان میں ظاہر شاہ نے کہا کہ افغان عوام صرف زندہ رہنے کا حق مانگ رہے ہیں، عالمی ضمیر ان کی بے کسی پر توجہ دے۔

بھارتی مسلمان افغانستان میں روسی دہشت گردی کے خلاف پُرزور احتجاجی مظاہرے کر رہے تھے۔ خود بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے افغان بحران کو سنگین قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس سے دو بڑی طاقتوں میں جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ بھارت کے معروف عالم دین حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے شاہ فیصل ایوارڈ میں ملنے والی رقم افغان مہاجرین کی امداد کے لیے جمع کرادی تھی۔

جنوری 1981ء میں مکہ مکرمہ میں 37 مسلم ممالک کے سربراہ اور نمایندوں کا عظیم الشان اجتماع ہوا۔ طائف سے مکہ مکرمہ تک کاروں کی قطاریں نظر آرہی تھیں۔ اس اجتماع میں شاہ خالد نے اپنی یادگار تقریر کے دوران اسلامی ممالک سے اپیل کی کہ وہ القدس اور افغانستان کو آزاد کرانے کے لیے متحد ہو جائیں۔

1980ء کے اواخر اور 1981ء کے اوائل میں شدید موسم سرما کے باوجود روس کے خلاف معرکے جاری رہے۔ 29 اکتوبر کو قندوز میں مجاہدین نے ایک لڑائی میں کیوبا کے دو جرنیلوں سمیت 117 روسی ہلاک کر دیے۔ دو دن بعد جلال آباد ائیر پورٹ پر حملے میں مجاہدین نے تین ٹینک اور دو ہیلی کاپٹر تباہ کر دیے۔

افغان تہذیب وتمدن کی تباہی: روس افغانستان کی تہذیب وثقافت اور قدیم اسلامی آثار کو تباہ کر رہا تھا۔ کیا یہ بات صدمہ انگیز نہیں تھی کہ روسیوں نے کابل میں اُترنے کے صرف 10 دن بعد 7 جنوری 1980ء کو غزنی میں اسلام کے بطل جلیل فاتح ہند سلطان محمود غزنوی کا مقبرہ منہدم کر دیا تھا۔ پھر ایک سال کے اندر اندر افغانستان کا نظامِ تعلیم تبدیل کر دیا گیا۔ دینیات اور تاریخ اسلام کے مضامین خارج کر کے لینن اور مارکس کی سوانح حیات اور کمیونسٹ تحریک کا تعارف نصاب میں شامل کر دیا گیا۔ ذہین وقابل افغان طلبہ کو پُرکشش ترغیبات دے کر ماسکو بھیجا جا رہا تھا، جو آمادہ نہ ہوتے انہیں جبراً بھیجا جاتا، جہاں برین واشنگ (ذہنی غسل) کے ذریعے انہیں کمیونزم کا داعی بنا دیا جاتا تھا۔

پاکستان میں پناہ لینے والے افغان وزارتِ تعلیم کے ایک اعلیٰ افسر شہباز وزیر زئی کے بیان کے مطابق افغانستان کے طلبہ واساتذہ کی اکثریت مجاہدین سے مل گئی تھی اور روسی فوجی کمیونزم مخالف طلبہ، اساتذہ اور محکمہ تعلیم کے اسلام پسند افسران کو چن چن کر شہید کر رہے تھے۔

''واخان'' کا روس سے الحاق: پاکستان اور روس کو جدا کرنے والی پٹی ''واخان'' جغرافیائی لحاظ سے بے پناہ اہمیت کی حامل تھی۔ یہ بیک وقت پاکستان، چین، وسط ایشیا کی سوویت ریاستوں اور افغانستان کا سنگم تھی۔ برطانیہ نے سرحدیں تشکیل دیتے وقت یہ حصہ اس پیش بندی کے طور پر افغانستان میں شامل کرایا تھا تاکہ اس کی ہندوستانی سرحدیں روس سے براہِ راست نہ ملنے پائیں اور وہ روسی جارحیت سے محفوظ رہے۔ تقسیم ہند کے بعد یہی پٹی پاکستان کو روسی حملے سے محفوظ رکھنے اور چین سے پاکستان کے

فاصلوں کے سمٹنے کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اب چونکہ روس کے لیے پاکستان کی افغان نوازی نا قابل برداشت تھی اس لیے اپنی سرحدیں پاکستان سے متصل کر کے پاکستان کو دھمکانے کے لیے اس نے ''واخان'' کو روسی ریاستوں میں شامل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس مقصد کے لیے سجائے جانے والے اسٹیج ڈرامے میں شرکت کے لیے کٹھ پتلی صدر افغانستان ببرک کارمل اکتوبر کے وسط میں ماسکو گیا۔ وہاں اس نے روسی حکام کے حسب منشا ''واخان'' کی پٹی بطور تحفہ روس کے حوالے کر دینے کا اعلان کیا۔

5 نومبر 1980ء کو ''واخان'' باضابطہ طور پر سوویت روس کا حصہ بن گیا اور پاک سوویت سرحدیں باہم مل گئیں۔ اب روس جب چاہے افغانستان سے گزرے بغیر پاکستان پر حملہ کر سکتا تھا۔ یہ صدر ضیاء الحق کو دی گئی کھلی دھمکی ''ہم تمہیں ٹھیک کر دیں گے'' پر عمل کی پہلی جھلک تھی۔ اس نئی صورتِ حال سے پاکستان سمیت ہمسایہ علاقوں میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔

برزنیف کا دورۂ بھارت: اس کے ساتھ ساتھ روس نے اپنے دوست بھارت کے ساتھ تعلقات مزید مضبوط کر کے اسے اپنے موقف کی حمایت پر آمادہ کرنے اور اس کے ذریعے پاکستان پر دباؤ بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے روسی صدر برزنیف نے بذاتِ خود دسمبر 1980ء میں وہاں کا دورہ کیا۔ اس نے بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کو اس حد تک قائل کرلیا کہ 9 دسمبر کو مسز اندرا گاندھی کا یہ مضحکہ خیز بیان اخبارات کی شہ سرخی بنا: ''افغان مسئلے پر عالمی برادری کے شور و غوغا نے روس کو افغانستان پر قبضہ برقرار رکھنے پر مجبور کیا ہے۔''

سوویت اور امریکی بلاک: افغانستان پر روسی حملے کے زمانے میں دنیا واضح طور پر سوویت اور امریکی بلاکوں میں تقسیم تھی۔ یہ دونوں بڑی طاقتیں پوری دنیا پر قبضہ جمانے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ روس کمیونزم کا داعی تھا اور اس لادینی نظام کے فروغ کے لیے ہر سطح پر جدوجہد کر رہا تھا۔ وسط ایشیا میں اسے زبردست کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں اور وسط ایشیا کے بعد اب وہ افغانستان پر بھی قابض ہونے پر تلا ہوا تھا۔ امریکا سرمایہ دارانہ نظام کی بالادستی کا خواہاں تھا اور ساری دنیا میں اس کی سیاسی، عسکری اور اقتصادی قوت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

دنیا کے ہر خطے میں کچھ ممالک امریکی بلاک میں شامل تھے اور کچھ روسی بلاک میں۔ برصغیر میں پاکستان، امریکی بلاک کا ممبر تھا اور بھارت روسی بلاک کا۔ خلیج میں ایران روس نواز تھا اور عراق امریکا نواز۔ مشرقِ وسطیٰ میں سعودی عرب، اُردن اور بحرین امریکا نواز تھے جبکہ شام روس نواز۔

امریکا کے خدشات: سیاسی اثر و رسوخ اور کامیاب ڈپلومیسی کے لحاظ سے ہمیں اس دور میں امریکا

روس سے کچھ آگے نظر آتا ہے مگر اس کے باوجود روس کی بے پناہ عسکری طاقت سے خود امریکا خوف محسوس کرتا تھا۔ اس لیے افغانستان میں روسی افواج کی مداخلت سے امریکا کو واضح طور پر خطرات لاحق تھے۔ وہ ایشیائی ممالک جو امریکا نواز تھے اور مستقبل میں امریکن کالونیاں بن سکتے تھے، اگر سوویت روس کے زیرِ اثر آ کر امریکی بلاک سے نکل جاتے تو نہ صرف امریکا ان تمام مراعات اور فوائد سے محروم ہو جاتا جو اسے ایشیائی علاقوں میں دستیاب تھے بلکہ عالمی تناظر میں وہ چین اور برطانیہ کی طرح ایک دوسرے درجے کی بڑی طاقت بن کر رہ جاتا اور سپر پاور کا مرتبہ صرف روس کے لیے مخصوص ہو جاتا۔ یہ صورتِ حال امریکا کے لیے قطعاً قابلِ برداشت نہ تھی۔

جنگ ویت نام کا بدلہ لینے کا موقع: اس سے قبل روس اور امریکا میں سرد جنگ ایک عرصے سے جاری تھی اور دونوں طاقتیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے عجیب و غریب حربے آزماتی رہی تھیں۔ امریکا کو "ویت نام" کی جنگ میں ناکامی کا زخم خوب یاد تھا۔ امریکا نے اس جنگ میں پانچ لاکھ فوجی استعمال کیے تھے جن پر یومیہ چالیس ملین ڈالر خرچ ہوتے تھے۔ اتنی مہنگی جنگ کو روس کی مداخلت نے ناکام بنایا تھا جس نے ویت نامیوں کو کھلے عام اسلحہ فراہم کیا تھا اور ان کی امریکا کے خلاف لڑائی کو جائز قرار دیتے ہوئے ہر سطح پر ان کی حمایت کی تھی۔ اب امریکا یہی سلوک روس کے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ امریکی کانگریس کے ارکان اس پر متفق تھے کہ مجاہدین افغانستان کی جدوجہد آزادی کی حمایت کر کے روس کے عزائم کو ناکام بنانا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے امریکا نے شروع ہی سے روس کی فوجی مداخلت پر شدید تنقید کی تھی اور اپنے زیرِ اثر ممالک کو بھی روس کے خلاف احتجاجی صف میں کھڑا کر دیا تھا۔ اس نے مہاجرین کے لیے بھی کچھ نہ کچھ امداد فراہم کی تھی۔ وہ سفارتی محاذ پر بھی روس کے خلاف ہر مہرہ استعمال کر رہا تھا۔ امریکا کی پالیسیوں کے مطابق مغربی میڈیا چیخ چیخ کر دنیا کو افغانستان میں روسی مظالم کی جھلکیاں دکھا رہا تھا۔

امریکا کے دو تحفظات: مگر اس کے باوجود امریکا کے گھاگ سیاست دان اب تک میدانِ جنگ میں مجاہدین سے تعاون کا حوصلہ نہیں کر سکے تھے جس کی دو وجوہ تھیں۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ امریکا کو اُمید نہیں تھی کہ مجاہدین روس کو پسپا کر سکیں گے۔ غالب اندازہ یہی تھا کہ چند ماہ کے اندر اندر روس بہر صورت افغانوں کی جدوجہد آزادی کو کچلنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ امریکا کمیونزم مخالف تحریک سے اظہارِ ہمدردی کر کے اپنا اخلاقی مقام بلند کرنا اور روس کا اصل چہرہ دنیا کو دکھانا ضرور چاہتا تھا مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا کہ ایسی جنگ میں کود پڑے جس کی ناکامی طے ہے اور جس میں فتح پانے کے بعد روس امریکا سے شدید انتقام کے درپے ہو سکتا تھا۔

دوسری وجہ افغانوں کی ''اسلام دوستی'' تھی جو اس جنگ کی نظریاتی بنیاد تھی۔ امریکا خواہ مخواہ ایسے ''اسلام دوستوں'' کی مدد کیوں کرتا جو کامیاب ہو جاتے تو افغانستان کو ''اسلامی'' بنا دیتے اور ناکام ہوتے تو امریکا کو ان سے تعاون کا خمیازہ روس سے کھلی جنگ کی صورت میں بھگتنا پڑتا۔

یہی وجہ تھی کہ امریکی صدر جمی کارٹر کے فوجی سلامتی کے مشیر زبگینو برزنسکی نے جب پاکستان کا دورہ کیا تو صدر ضیاء الحق کو بڑی محدود امداد کی پیش کی تھی اور صدر ضیاء نے اسے ''مونگ پھلی کے دانے'' قرار دے کر مسترد کر دیا۔

1981ء جہاد کا دوسرا سال: 1981ء میں روس کے خلاف افغان مجاہدین کی تحریک جہاد اپنے دوسرے برس میں داخل ہو گئی تھی۔ ان کی کارروائیوں میں روز بروز شدت آتی جا رہی تھی۔ انہوں نے ''واخان'' کے علاقے میں 900 روسی چھاپہ ماروں کو ہلاک کر دیا تھا۔ شمالی علاقوں کے صحرائی میدانوں میں مجاہدین قدیم جنگوں کی طرح باقاعدہ گھڑ سوار دستوں کی شکل میں روسی افواج پر حملہ آور ہوتے تھے۔

ایک روسی فوجی اپنی ڈائری میں لکھتا ہے:

> ''مجاہدین کے گھڑ سوار دستے ہمیں بالکل بے بس اور مایوس کر دیتے ہیں۔ وہ ہمارے ٹینکوں اور توپوں پر حملہ آور ہو کر ہماری پیش قدمی روک دیتے ہیں۔''

18 جنوری 1981ء کو روس نے 126 ٹینکوں اور ہزاروں سپاہیوں کے ساتھ وادی پنج شیر پر حملہ کیا۔ احمد شاہ مسعود نے کئی دن کی خونریز لڑائی کے بعد یہ خوفناک حملہ پسپا کر دیا۔ مجاہدین نے بعض علاقوں میں شرعی عدالتیں بھی قائم کر لی تھیں۔ 10 فروری 1981ء کو ایسی ایک عدالت میں چند افغان کمیونسٹ افسران کو پیش کیا گیا جنہوں نے خواتین کی آبروریزی کی تھی۔ جرم ثابت ہونے پر انہیں مجمع عام میں سنگسار کر دیا گیا۔

افغان فوج کی حالتِ زار: افغان سرکاری فوج کا مورال بے حد گر گیا تھا، تقریباً 70 فیصد سپاہی فوج سے نکل کر مجاہدین کے ساتھ مل گئے تھے یا سرحد عبور کر کے پاکستان آ گئے تھے۔ سرکاری فوج میں 25 ہزار کے لگ بھگ وہی افراد رہ گئے تھے جو پکے کمیونسٹ تھے یا کسی وجہ سے مجبور تھے۔ فرار ہونے والے سپاہی عموماً اپنی رائفلیں اور کبھی کبھار ٹینک اور توپیں بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ جبراً نئے بھرتی ہونے والے سپاہیوں کے لیے عمر کی حد 21 سال کی بجائے 20 کر دی گئی تھی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ان سپاہیوں کی تربیت کا کوئی معقول نظام نہیں تھا۔ یہ اناڑی سپاہی جب کسی معرکے میں مجاہدین کے دوبدو آ جاتے تو بلا تامل ہتھیار پھینک دیتے۔ ایک جائزے کے مطابق روس کی مداخلت کے بعد افغان سرکاری افواج میں

جبراً بھرتی کیے جانے والے سپاہیوں کی اکثریت پہلے معرکے میں ہی مجاہدین سے جا ملتی تھی۔

افغان حریت پسندوں کو امداد دینے کا فیصلہ کب ہوا؟ مگر دو سال کی متواتر جنگ کے ان گنت مناظر نے جب نہ صرف امریکا بلکہ ساری دنیا پر یہ واضح کر دیا کہ مجاہدینِ افغانستان ناقابلِ شکست ہیں، تب امریکا نے مجاہدین کے بارے میں اپنے خیالات تبدیل کیے۔

اب امریکا میں نئی قیادت آ چکی تھی۔ 20 جنوری 1981ء کو صدر ریگن نے نئے امریکی صدر کا عہدہ سنبھال لیا تھا۔ گزشتہ صدر کی بہ نسبت وہ مجاہدین کے حق میں خاصے پُرجوش نظر آئے کیونکہ اب امریکی سیاست دانوں کو افغان مجاہدین کی امداد کے ذریعے روس سے بدلہ لینے میں کامیابی کی خاصی اُمید ہو چکی تھی۔ صدر ریگن نے بذاتِ خود پاکستان کا دورہ کیا اور افغان مہاجر خیمہ بستی میں جا کر مظلوم افغانوں کی حوصلہ افزائی کی۔

مجاہدین کے اختلافات سے فائدہ اُٹھایا گیا: مجاہد تنظیموں کو اب خاطر خواہ امداد ملنے لگی۔ مگر اس دوران ان تنظیموں کا وہ چھ جماعتی اتحاد جو سوویت حملہ کے فوراً بعد وجود میں آیا تھا، عملاً ختم ہو چکا تھا۔ امریکا نے بھی اسے صحیح معنوں میں فعال کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ مستقبل کے افغانستان کو ''اسلامی مملکت'' نہ بننے دینے کے لیے مجاہدین کا افتراق ضروری تھا۔ اگر وہ متحد ہوتے تو امریکا کو ان سے سودے بازی میں مشکلات پیش آتیں۔ اب امریکا ضرورت پڑنے پر بہت کچھ کر سکتا تھا۔ اگر مجاہد تنظیمیں ایک امیر کے تحت متحد ہوتیں تو ضابطے کے لحاظ سے بیرونی امداد اور فنڈز بھی ایک جگہ جمع ہوتے اور ضرورت کے مطابق مختلف تنظیموں کو ملتے رہتے۔ اب ہر لیڈر اپنے طور پر امداد لے رہا تھا اور اس لحاظ سے امریکا اور دوسری روس مخالف طاقتوں سے تعلقات بہتر رکھنے پر مجبور بھی تھا۔ اس صورتِ حال نے مستقبل میں مجاہدین کی قربانیوں کے بارآور ہونے میں شدید رکاوٹ ڈالی۔

میڈیا کا انداز بدل گیا: مجاہدین کو اسلحے اور مالی امداد کی ترسیل تو شروع ہو گئی مگر حیرت انگیز طور پر مغربی میڈیا کا رویہ بدل گیا۔ پہلے مجاہدین کی ہر کارروائی بڑی بڑی سرخیوں میں آتی تھی مگر اب ان خبروں کو کبھی نظر انداز کر دیا جاتا اور کبھی کونوں کھدروں میں جگہ دی جاتی۔ اس پالیسی کا اثر ایشیائی میڈیا پر بھی ہوا۔ یہاں بھی رفتہ رفتہ مجاہدین کی خبروں کی وہ حیثیت نہ رہی جو شروع کے دنوں میں تھی۔ حالانکہ پہلے کی بہ نسبت اب محاذ زیادہ گرم تھے اور کارروائیاں زیادہ تیز تر ہو رہی تھیں۔ مگر یوں لگتا تھا جیسے افغانستان کی جدوجہد آزادی کی خبروں کو نمایاں جگہ دینا اخبارات کی پالیسی نہیں رہی یا اسے تضیع اوقات سمجھا جانے لگا ہے۔

مغربی میڈیا نے ان دنوں ایک اور کام کیا۔ اس نے مجاہد لیڈروں کے مغرب سے تعلقات کی گرم جوشی

اور سرد مہری کا جائزہ لے کر انہیں دو حصوں میں بانٹ دیا۔ اعتدال پسند اور بنیاد پرست۔ اعتدال پسند وہ تھے جو مغرب اور امریکا کے لیے قابل قبول تھے۔ بنیاد پرست وہ تھے جن سے مستقبل میں اسلامی حکومت کے قیام کا خطرہ لاحق تھا۔ صبغت اللہ مجددی، پیر احمد گیلانی اور احمد شاہ مسعود کو پہلے گروہ میں جبکہ مولوی محمد یونس خالص، حکمت یار اور مولانا محمد نبی محمدی جیسے رہنماؤں کو دوسرے گروہ میں شامل کر لیا گیا۔

پاکستانی طیارے کا اغوا: 2 مارچ 1981ء کو پی آئی اے کے طیارے کے اغوا کے ذریعے پاکستان کو ایک بار پھر شدید دباؤ میں ڈال دیا گیا۔ ہائی جیکرز طیارے کو اغوا کر کے کابل لے گئے۔ انہوں نے اپنا تعلق ''الذوالفقار'' نامی تنظیم سے ظاہر کیا اور یرغمال بنائے جانے والے مسافروں کے بدلے 92 افراد کی رہائی کا مطالبہ کیا جو مختلف مقدمات کے تحت پاکستانی جیلوں میں قید تھے۔ کچھ دنوں بعد ہائی جیکرز طیارے کو دمشق لے گئے۔ حکومت پاکستان کے نمائندوں اور ہائی جیکرز کے درمیان مذاکرات کے کئی ادوار کے بعد آخر کار 55 افراد کو جیلوں سے رہا کر کے دمشق پہنچانے کا معاہدہ ہو گیا۔ 15 مارچ کو ان 55 افراد کے بدلے جہاز کے مسافروں کو آزادی مل گئی۔

ہائی جیکنگ کی اس سازش کے پیچھے روس اور کارمل انتظامیہ کی سرپرستی کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ کابل ایئر پورٹ پر کارمل انتظامیہ ہائی جیکروں کو مکمل تحفظ فراہم کر رہی تھی اور ہائی جیکرز حکومت پاکستان سے یہ مطالبہ بھی کرتے رہے تھے کہ کارمل انتظامیہ کو افغانستان کی جائز حکومت تسلیم کر لیا جائے۔

BMD بکتر بند گاڑی: مجاہدین کو ممکنہ امریکی امداد فراہم ہونے کے خطرے کے پیش نظر روس نے ان دنوں ایک نئی بکتر بند گاڑی تیار کر کے افغانستان میں مصروف پیکار اپنی افواج کے حوالے کی۔ اسے B.M.D کہا جاتا ہے، اس پر 72 ملی میٹر کی توپ تین مشین گنیں اور ٹینک شکن میزائل نصب تھے۔ یہ بکتر بند گاڑی سب سے پہلے لوگر کے علاقے میں استعمال کی گئی جو کہ مجاہدین کے لیے محفوظ کیمپ کی حیثیت رکھتا تھا، یہاں مولوی محمد نبی محمدی اور ان کے رفقاء کا ٹھکانہ تھا۔ کابل سے جنوب کی جانب جانے والا ہر کانوائے ان کی زد میں رہتا تھا۔

آخر کار B.M.D بکتر بند گاڑیوں کی مدد سے لوگر پر حملہ کیا گیا۔ کئی دنوں تک خون ریز جھڑپیں ہوتی رہیں۔ مگر مجاہدین کو یہاں سے بے دخل نہ کیا جا سکا۔

صوبہ فراہ میں بھی مولوی محمد نبی محمدی کے رضا کار بکثرت تھے۔ یہاں پانچ ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج بھیجی گئی جسے فضائیہ کی مدد بھی حاصل تھی۔ مولوی محمد نبی محمدی کے نائب مولوی محمد شاہ نے پندرہ سو مجاہدین

کے ساتھ دشمنوں کا دلیری سے مقابلہ کیا، دس دن تک جنگ جاری رہی، مجاہدین جزوی نقصان اٹھا کر منتشر ضرور ہو گئے مگر حریف افواج کی واپسی کے کچھ دنوں بعد وہ دوبارہ فعال ہو گئے۔

وادی پنج شیر پر حملے: روسیوں نے وادی پنج شیر پر وقفوں وقفوں سے کئی بڑے حملے کیے، احمد شاہ مسعود نے کابل کو شمال سے ملانے والی شاہراہ سالانگ کو غیر محفوظ بنا دیا تھا اس لیے روسی پنج شیر کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ پہلے حملے میں ہیلی کاپٹرز کے ذریعے چھاتہ بردار سپاہی بھی اتارے گئے مگر احمد شاہ مسعود نے دس ہیلی کاپٹرز تباہ کر کے حملہ آوروں کو پسپا کر دیا۔ دوسرا حملہ بھی ناکام رہا، اس کے بعد احمد شاہ مسعود نے خود آگے بڑھ کر بگرام ایئر پورٹ پر کھڑے روس کے بائیس عدد انیٹونوف ٹرانسپورٹ طیارے تباہ کر دیے، یہ روس کے لیے ایک بڑا دھچکا تھا۔

غزنی اور کابل میں کارروائیاں: غزنی میں قاری تاج محمد ایک آزاد کمانڈر کی حیثیت سے مصروف جہاد تھے۔ ان کے دو ہزار مجاہدین کابل انتظامیہ کی چودھویں ڈویژن کے ساتھ برسرپیکار رہے، بعد میں سوویت افواج کا ایک بریگیڈ بھی ان کے خلاف مقابلے میں شامل ہو گیا۔ جس کے بعد غزنی میں مزاحمت کا زور کم پڑ گیا۔

کابل کے قریب مولوی یونس خالص کی تنظیم کے کمانڈر عبدالحق نے زبردست کارروائیاں شروع کر دی تھیں۔ وہ بڑے بڑے کمیونسٹ رہنماؤں کو موت کے گھاٹ اتار رہا تھا۔ خاد کا نائب سربراہ بھی اس کی منصوبہ بندی کے مطابق قتل ہو گیا جس سے کابل انتظامیہ میں کھل بلی مچ گئی۔ عبدالحق کے ساتھی کابل انتظامیہ کو ہراساں کرنے کے لیے کابل کے بجلی گھروں پر حملہ کر کے انہیں ناکارہ بناتے رہے تھے۔ کابل کے قریب کوہ حافی مولوی شفیع اللہ کا مرکز تھا، اس کے ساتھ وہ کابل جلال آباد شاہراہ اور کابل کی سرکاری تنصیبات کو نشانہ بناتے رہتے تھے۔

''مارسول'' گھاٹی کی لڑائی: شمالی علاقوں میں ''بلخ'' کے کمانڈر ذبیح اللہ کو خطرناک تصور کیا جاتا تھا، ''مارسول'' کی گھاٹی سے مزار شریف پر اس کے متواتر حملوں نے سوویت افواج کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ کمانڈر ذبیح اللہ کی سرکوبی کے لیے روس نے زبردست تیاریوں کے ساتھ ''مارسول'' گھاٹی پر فضائی حملے شروع کیے، ایک ہفتے تک پہاڑوں پر لگاتار بمباری ہوتی رہی، جب روسیوں کو یقین ہو گیا کہ یہاں سے مجاہدین کا نام ونشان تک مٹ چکا ہوگا، تب وہ وادی میں داخل ہوئے۔ مگر مجاہدین ان کے استقبال کے لیے تیار تھے، گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی، حملہ آوروں کو لینے کے دینے پڑ گئے، وہ مارسول کی گھاٹی میں داخل نہ ہو سکے بلکہ ان کو اپنی جان پر بن گئی، آخر کار فضائیہ نے مداخلت کر کے روسی سپاہیوں کو باہر نکالا۔

شیر کا بچہ اور شکار: 1981ء کے دوران مجاہدین کو امریکی اسلحہ ملنے لگا، اس اسلحے کی ترسیل کا راستہ پاکستان تھا۔ سب سے پہلے بارودی سرنگیں فراہم کی گئیں۔ پھر آہستہ آہستہ دیگر انواع واقسام کا اسلحہ بھی بھیجا جانے لگا۔ یہ اسلحہ صرف امریکی ساختہ نہیں تھا۔ اس میں مختلف ذرائع سے حاصل کردہ روسی ساختہ ہتھیار بھی شامل تھے۔ یہ ان ہتھیاروں کے علاوہ تھے جو مجاہدین کیمونسٹوں اور روسیوں سے مال غنیمت کے طور پر حاصل کرتے تھے۔ مصر کے صدر انور سادات نے ایک موقع پر انکشاف کیا کہ انہوں نے امریکی ایماء پر اپنے اسلحہ خانوں سے روسی ساختہ اسلحے کی بڑی کھیپ مجاہدین کے لیے روانہ کی تھی۔ مجاہدین اس اسلحے کی تربیت کہاں حاصل کرتے تھے؟ پاکستانی حکومت سے یہ سوال کئی بار کیا گیا۔ گورنر سرحد فضل حق نے اس کا گول مول جواب کچھ یوں دیا: ''مچھلی کے بچے کو تیرنا اور شیر کے بچے کو شکار کرنا کون سکھاتا ہے'' مطلب یہ تھا کہ اسلحہ چلانا افغانوں کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ انہیں تربیت کی ضرورت نہیں۔ تاہم روس ہمیشہ یہ شک ظاہر کرتا رہا ہے کہ پاکستانی ایجنسیاں سرحدی علاقوں میں تربیتی کیمپ قائم کر کے مجاہدین کو جدید اسلحے کا ماہر بنا رہی ہیں۔ زمینی حقائق کے مطابق روس کا یہ شک درست تھا۔ پاکستان میں آئی ایس آئی کے تحت چلنے والے درجنوں ٹریننگ کیمپوں میں ہزاروں مجاہدین کو تربیت دی جارہی تھی تاہم یہ نظام اتنا خفیہ رکھا گیا تھا کہ روس کبھی اپنے الزامات ثابت نہیں کر پایا۔ میڈیا کے ذریعے پھیلنے والا عام تاثر یہ تھا کہ مجاہدین کو ملنے والا بیرونی اسلحہ امریکا اپنے خرچے پر فراہم کر رہا ہے۔ مگر مجاہدین کے ذرائع کے مطابق اسلحے کے تمام مصارف عرب شیوخ برداشت کر رہے تھے۔ امریکا اسلحے کی ہر کھیپ کا معاوضہ ان سے وصول کرتا تھا۔

مجاہدین بارودی سرنگیں استعمال کرنے لگے: اپریل 1981ء میں امریکی اسلحے کی پہلی کھیپ بارودی سرنگوں کی شکل میں مجاہدین کو پہنچی۔ مجاہدین نے فوراً اس کا بھرپور استعمال شروع کر دیا۔ اب وہ روسی فوجی قافلوں کو زبردست نقصان پہنچانے اور ان کے راستے میں آنے والے پل اڑا کر ان کی نقل و حرکت دشوار تر بنانے لگے۔

مئی میں موسم گرما کی آمد کے ساتھ ہی مجاہدین نے زوردار حملے شروع کر دیے۔ انہوں نے 7 مئی کو جلال آباد ائیر پورٹ پر ایک حملے میں 9 روسی طیارے اور پانچ ٹینک تباہ کر دیے۔ اس معرکے میں بیسیوں روسی اور کیمونسٹ سپاہی ہلاک ہوئے۔ انہی دنوں قندھار میں خون ریز معرکہ ہوا جو کئی دن جاری رہا۔ اس میں مجاہدین نے 700 کے لگ بھگ روسی اور کارمل سپاہی ہلاک وزخمی کیے جبکہ روسیوں کی فضائی بمباری سے سینکڑوں شہری جاں بحق ہو گئے۔ مجاہدین کی گرفت بعض علاقوں میں اتنی مضبوط تھی کہ

وہ عارضی طور پر شہروں اور قصبوں پر قبضہ بھی کر لیتے تھے۔

وزیر اعظم کشتمند: اُدھر کارمل حکومت کی ناکامی ساری دنیا پر واضح ہو چکی تھی، اس لیے روسی حکام ببرک کارمل کے متبادل پر غور کرنے لگے تھے۔ جبکہ کارمل انہیں کسی بھی قیمت پر اپنی وفاداریوں کا یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر ابتدائی مرحلے کے طور پر ببرک کارمل کے ''نام نہاد اختیارات'' مزید کم کر دیے گئے اور پارلیمانی امور کی زمام کو تھامنے کیلئے ایک نیا مہرہ سامنے لایا گیا یہ ''سلطان علی کشتمند'' تھا۔ 11 رجون 1981ء کو اسے افغانستان کا نیا وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا۔ بہر کیف کارمل یا سلطان علی دونوں کٹھ پتلی تھے، اصل فریق روسی اور مجاہدین تھے۔ جن میں کانٹے کا مقابلہ ہو رہا تھا۔

روس کا ایٹمی دھماکا: افغانستان کی صورتحال نے عالمی سطح پر روس کا دبدبہ خاک میں ملا دیا تھا۔ ماسکو میں اعلیٰ سطحی اجلاسوں میں غور کیا جا رہا تھا کہ کس طرح اپنی قوت و دہشت کا سکہ دوبارہ جمایا جائے اس کے علاوہ، امریکا کا مجاہدین سے تعاون بھی کھل کر سامنے آ چکا تھا جو کہ روس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ مجاہدین کو امریکی بارودی سرنگیں ملنے کے کچھ ہی دنوں بعد روس نے 23 راپریل 1981ء کو زیر زمین ایٹمی دھماکا کر کے گویا دبے لفظوں میں امریکا اور افغان جنگ میں اس کے حامیوں کو ایک تنبیہ کی تھی۔

نائٹروجن بم کا استعمال: اس کے ساتھ ہی روس نے مجاہدین کے خلاف نائٹروجن بم استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، 27 رمئی کو مجاہدین کے ٹھکانوں پر ہلکے قسم کے نائٹروجن بم برسائے گئے جن سے وہاں موجود 18 مجاہدین کی لاشیں ناقابل شناخت حد تک مسخ ہو گئیں...... اس تجربے کے بعد 11 راگست 1981ء کو روس نے دنیا میں پہلی بار ''نیوٹرون بم'' کا تجربہ کر ڈالا اور یوں امریکا پر سبقت حاصل کر لی۔ روس کی اس کارروائی کو دنیا بھر میں سخت تشویش کی نظر سے دیکھا گیا۔ امریکی صدر رونالڈ ریگن نے خاص طور پر اس صورتحال سے دونوں بڑی طاقتوں میں ایٹمی جنگ چھڑ جانے کا خطرہ محسوس کیا۔ روس کا پلہ بہر حال بھاری تھا۔ علاوہ ازیں خبر رساں ذرائع بتاتے تھے کہ سوویت یونین میں ذخیرہ کردہ کیمیائی ہتھیاروں کی مقدار 73 لاکھ ٹن کے لگ بھگ ہے، یہ مقدار امریکن ذخائر سے 8 گنا زائد تھی۔

بھارت کو اسلحے کی ترسیل: روس نے اپنے بلاک کو مضبوط کرنے کے لیے اگست کے اواخر میں بھارت کو جدید ترین مگ 25 طیارے بھی فراہم کر دیے تھے جو کہ 60 ہزار فٹ کی بلندی پر 8 سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کر سکتے تھے۔ یہ خبر بھی ذرائع ابلاغ کا موضوع بنی ہوئی تھی کہ روس نے امریکا کے ایٹمی ہتھیاروں کو ناکارہ بنانے کی صلاحیت حاصل کر لی ہے۔ ان حالات میں نومنتخب امریکی صدر ریگن نے ایک طرف تو روس کو ایٹمی میزائلوں پر مکمل پابندی کا منصوبہ پیش کیا۔ دوسری طرف پاکستان کو روس اور

بھارت کے دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لیے ایف 16 طیارے فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ ایٹمی میزائلوں پر پابندی کا منصوبہ روس نے مسترد کر دیا جبکہ پاکستان کو ایف 16 طیارے کی فراہمی میں خود امریکا تحفظات کا شکار ہو گیا حالانکہ پاکستان کو ان کی شدید ضرورت تھی۔ تقریباً ہر ہفتے روسی اور افغان جنگی طیارے پاکستانی سرحدوں میں بھی گھس کر کارروائیاں کر رہے تھے اور پاکستان ان کی روک تھام سے عاجز تھا۔

پاکستان کی مشکلات: ستمبر 1981ء تک افغانستان سے 62 بار پاکستان کی سرحدی حدود اور 35 بار فضائی حدود کی خلاف ورزی کی جا چکی تھی۔ یہ شرح روز بروز بڑھتی گئی۔ صرف ماہ نومبر میں افغان سرکاری افواج نے 23 بار پاکستانی حدود کی خلاف ورزی کی۔ پاکستان کے پُرزور احتجاج پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اس ماہ جنرل اسمبلی کا اجلاس ہوا جس میں پاکستان نے افغانستان سے سوویت افواج کے انخلا کی قرارداد پیش کی جسے بھاری اکثریت کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ افغان جنگ پاکستان کے لیے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ تھی۔ بعض حلقوں اور ملک کی طرف سے پھیلایا جانے والا یہ تاثر سراسر غلط تھا کہ پاکستان امدادی فنڈز کو اپنی معیشت کے استحکام کے لیے بڑی کامیابی سے استعمال کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ سے پاکستان کو معاشی استحکام تو کیا حاصل ہوتا! اس کی اقتصادی بربادی میں رہی سہی کسر بھی نکلتی جا رہی تھی۔

افغانوں کے لیے امدادی فنڈز میں بعض افسران ذاتی مفادات کے لیے خرد برد کرتے ہوں گے مگر یہ رقم پاکستانی معیشت کی ترقی کے لیے ہرگز استعمال نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ بیرونی امداد کے تمام ذخائر مل کر بھی مہاجرین کی ضروریات کے لیے کافی نہیں تھے۔ حکومت پاکستان بہر صورت اس مد میں اپنے خزانے سے خطیر اخراجات خرچ کرنے پر مجبور تھی جو کہ کل بیرونی امداد کے برابر تھے۔ پاکستان جیسے غریب ملک کے لیے یہ بہت بڑا امتحان تھا...... بلاشبہ ایک عظیم قربانی تھی جس کے پیچھے اسلامی اخوت کا عالمگیر جذبہ کارفرما تھا۔

یہ بات بھی واضح تھی کہ افغانستان کا جہاد پاکستان کی بقا کے لیے ناگزیر تھا اور مہاجرین کی کفالت سے بے فکر ہوئے بغیر مجاہدین میدانوں میں قدم نہیں جما سکتے تھے۔ سو پاکستان بڑی ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ یہ ذمہ داری نبھاتا رہا۔ دسمبر 1981ء تک پاکستان میں افغان مہاجرین کی تعداد 20 لاکھ سے بڑھ چکی تھی۔ یہ بے سروسامان لوگ اپنے پیچھے 10 لاکھ عزیزوں، رشتہ داروں اور ہم وطنوں کی لاشیں چھوڑ کر آئے تھے۔

1982ء ظاہر شاہ، ولی خان اور باچا خان: 1982ء کے دوران افغان مجاہدین کی مسلسل کامیابیوں سے دنیا کو روس کی جلد یا بدیر واپسی کا یقین ہونے لگا تھا۔ چنانچہ مختلف اہم شخصیات نے

مستقبل کے افغانستان میں اپنا کردار محفوظ رکھنے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ افغانستان کے سابق حکمران ظاہر شاہ نے اعلان کیا کہ وہ افغانستان واپس آ کر مجاہدین کے شانہ بشانہ روس سے لڑنے کے لیے تیار ہیں۔ مگر مجاہدین نے اس بیان کو بدنیتی پر محمول کیا۔ مجاہد رہنما عبدالرب رسول سیاف نے متنبہ کیا کہ اگر ظاہر شاہ افغانستان واپس آئے تو انہیں قتل کیا جا سکتا ہے۔

ادھر پاکستان کے سیاسی رہنما خان عبدالولی خان 18 راپریل 1982ء کو کابل میں ببرک کارمل سے ملے اور پاک افغان تنازعات کو حل کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ جبکہ ان کے والد سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان نے 19 راگست کو اپنے بیان میں اپیل کی کہ مجاہد رہنما ان کے ساتھ مل کر بات چیت کریں تا کہ افغانستان میں جاری جنگ کا پُرامن حل نکالا جا سکے۔

ظالم برزنیف چل بسا: امریکی صدر رونالڈ ریگن کی پوری کوشش تھی کہ کسی طرح روس سے ایٹمی جنگ کا خطرہ اور افغانستان کا قضیہ ختم ہو جائے۔ انہوں نے مئی 1982ء میں روسی صدر برزنیف کو اس شرط پر باہمی مفاہمت کی پیش کش کی کہ روسی افواج افغانستان سے واپس چلی جائیں تاہم روس کا رویہ منفی رہا۔ اس سال کے آخر میں روس پر 18 سال تک حکومت کرنے والا حکمران لیونڈز برزنیف 10 نومبر 1982ء کو 75 سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ برزنیف ایک انتہا پسند انسان تھا، اس نے افغانستان میں لاکھوں مسلمانوں کا خون بہایا جس کے دھبے ہمیشہ اس کے دامن پر رہیں گے۔ برزنیف کے بعد سوویت خفیہ ایجنسی کے جی بی کے سابق سربراہ آندرے پوف کو پہلے پارٹی کا سیکرٹری جنرل اور پھر روس کی سپریم پریزیڈنٹ کا رکن مقرر کر دیا گیا۔ 1982ء کے اواخر اور 1983ء کے اوائل میں آندرے پوف کی حیثیت صدر کی نہیں تھی لیکن عملاً برزنیف کی جگہ وہی روس کا سربراہ تھا۔

آندرے پوف کے مظالم: آندرے پوف نے برزنیف کی پالیسی کو جاری رکھا۔ اس نے 24 اپریل 1983ء کو ایک بیان میں واضح کر دیا کہ روس افغانستان سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ اس نے تخفیفِ اسلحہ سے متعلق صدر ریگن کی تجویز کو بھی مسترد کر دیا۔ اس کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد روسی افواج نے نئی شدت سے افغانوں پر ظلم و ستم ڈھانا شروع کر دیا۔ روسی طیاروں نے ایک بار پھر دیہاتوں پر اندھا دھند بمباری کا خونی سلسلہ شروع کر دیا جس سے ہزاروں عورتیں، بچے اور بوڑھے شہید ہو گئے۔ بستیوں کی بستیاں ملیامیٹ ہو گئیں۔

یہ مظالم زیادہ تر پاکستانی سرحد کے قریب واقع افغان صوبوں میں ڈھائے جا رہے تھے۔ غالباً روس کی کوشش یہ تھی کہ ان دیہاتوں کو جو ممکنہ طور پر سرحدی پٹی پر مجاہدین کی پناہ گاہیں بن سکتے تھے، بالکل ختم کر دیا

جائے تاکہ مجاہدین کے رہنے، چھپنے اور عام آبادی میں گھل مل کر محفوظ ہوجانے کا سلسلہ ختم ہوجائے۔

روسی گن شپ ہیلی کاپٹروں نے دیہی علاقوں پر خوفناک پروازیں بڑھادی تھیں۔ وہ آناً فاناً نمودار ہوتے اور آبادیوں کو آگ کے شعلوں میں تبدیل کردیتے۔ صوبہ لوگر خاص طور پر ان سے شدید متاثر تھا۔ گن شپ ہیلی کاپٹر پہاڑی گھاٹیوں اور گہری کھائیوں سے یکدم نمودار ہوتے، مقامی لوگوں کو ان کی گھن گرج اس وقت سنائی دیتی جب وہ خاصے قریب آجاتے تھے۔ لوگوں کو پناہ گاہوں میں چھپنے کے لیے بمشکل دو اڑھائی منٹ مل پاتے تھے، اس دوران جو کسی غار یا سرنگ میں کود جاتا وہ بچ جاتا، باقی سب لقمہ اجل بن جاتے۔

<u>کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال</u>: یہ گن شپ ہیلی کاپٹر اب کیمیائی ہتھیار بھی استعمال کررہے تھے۔ 20 دسمبر 1982ء کو (آندرے یوف کے برسراقتدار آنے کے ایک ماہ بعد) ایک علاقے میں ان کی کیمیائی بمباری سے 84 افراد شہید ہوگئے، ان میں عورتوں اور بچوں کی اکثریت تھی۔ ایک روسی سپاہی کاسلوف نے جو فرار ہوکر مجاہدین سے جاملا تھا، سرخ افواج کے کیمیائی ہتھیار استعمال کرنے کی تصدیق کی تھی۔ اس نے بتایا کہ غوربند میں ایک کارروائی کے دوران میں نے فوج کو کیمیائی ہتھیار استعمال کرتے دیکھا، کیمیائی بموں کے گرنے سے زمین سرخ ہوجاتی تھی۔

<u>1983ء مجاہدین کی کارروائیاں</u>: سوویت مظالم بڑھتے گئے مگر مجاہدین کی ہمت وحوصلے کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچی۔ روسی بہیمیت کا ہر مظاہرہ ان کے جذبۂ جہاد کو بلند تر کردیتا تھا۔ 1982ء اور 1983ء کے درمیان انہوں نے لگاتار کارروائیاں جاری رکھیں۔ ''نورستان'' سے روسی افواج کا صفایا کرکے وہاں شرعی احکام کے نفاذ کا اعلان کردیا گیا۔ مولوی افضل کو اس شرعی ریاست کے وزیر اعظم کا عہدہ دے دیا گیا۔ جنوری 1983ء میں مجاہدین کے ایک ترجمان کمانڈر فاروق نے ذرائع ابلاغ سے گفتگو کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ افغانستان کے 95 فیصد رقبے پر مجاہدین کا تسلط ہے۔ 23 فروری 1983ء کو کابل میں سرخ افواج کی 65 ویں سالگرہ منائی جارہی تھی۔ مجاہدین نے اس سے دو دن پہلے ہی کابل کی سرکاری عمارتوں اور سوویت دفاتر پر اتنے راکٹ برسائے کہ تقریب سالگرہ کے انتظامات درہم برہم ہوگئے۔ کئی اہم تنصیبات تباہ ہوگئیں۔ ایندھن کے ذخائر ضائع ہوگئے۔ روسی اور کارمل سپاہیوں کی خاصی تعداد ہلاک وزخمی ہوگئی۔ مئی میں ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ کارمل فوج کا ایک یونٹ 97 ٹینکوں سمیت مجاہدین سے آملا۔ اگرچہ مجاہدین ٹینکوں سے کوئی فوری فائدہ حاصل نہیں کرسکتے تھے مگر یہ واقعہ کارمل سپاہ کا مورال گرانے کے لیے کافی تھا۔

اس موسم گرما میں مجاہدین کو امریکا سے بھاری ہتھیار بھی ملنے لگے۔ ان ہتھیاروں میں طیارہ شکن توپیں

بھی تھیں۔ اس سے پہلے وہ روسی طیاروں کے مقابلے میں صرف امریکی 12-7MM کی مشین گنیں ہی استعمال کر رہے تھے جو قطعاً ناکافی تھیں۔ طیارہ شکن توپوں کے آنے سے مجاہدین روسی طیاروں کا بہتر انداز میں مقابلہ کرنے کے قابل ہو گئے۔ انہیں ان جدید ہتھیاروں کی تربیت حاصل کرنے میں ذرا وقت تو لگا مگر جب وہ انہیں چلانا سیکھ گئے تو دنیا کو حیرت انگیز نتائج حاصل کر کے دکھائے۔

جنرل اسمبلی میں روسی انخلا کی قرارداد: ادھر 17 جون 1983ء کو آندرے پوف باقاعدہ طور پر سوویت یونین کا صدر منتخب ہو گیا۔ اس پر افواج کی واپسی کے لیے عالمی دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ خود اس کے حلیف بھارت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی روسی افواج کو واپسی کا مشورہ دے رہی تھیں۔ جولائی 1983ء میں چین نے افغان قضیے کے حل کے لیے ثالثی کی پیش کش کر دی۔ عالم اسلام کے مختلف ممالک زور دیتے رہے کہ افغان مسئلے کو اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے ذریعے حل کیا جائے۔ آخر ستمبر 1983ء میں مسئلہ افغانستان کو جنرل اسمبلی کے ایجنڈے میں شامل کر لیا گیا۔ دو ماہ بعد 25 نومبر کو جنرل اسمبلی میں روسی افواج کے انخلا کی قرارداد بھاری اکثریت سے منظور کر لی گئی۔

روس کی ہٹ دھرمی: مگر روس اب تک اپنی ضد پر ڈٹا ہوا تھا۔ اگرچہ افغانستان میں اس کے یومیہ آٹھ کروڑ ڈالر خرچ ہو رہے تھے جو ایک خطیر رقم تھی مگر ہمیشہ فتح یاب ہونے والا سرخ ریچھ اتنی جلدی ہار ماننے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس نے عسکری اخراجات پورے کرنے کے لیے انتہائی اقدامات سے بھی گریز نہیں کیا۔ مارچ 1982ء کے دوران روس نے اپنے محفوظ سونے کے ذخائر سے 60 ٹن سونا فروخت کر دیا تھا جس سے عالمی منڈی میں سونے کے بھاؤ گر گئے۔ اس قدر زبردست اقتصادی نقصان برداشت کرتے ہوئے روس افغانستان کو بھنبھوڑتا رہا اور افغانوں کو زیر کرنے کے لیے نت نئے منصوبے بناتے ہوئے بے تحاشا دولت لٹاتا رہا۔ 1983ء کے اواخر میں اس نے دریائے آمو پر ایک بڑا پل تعمیر کرا کے افغانستان میں افواج اور اسلحے کی ترسیل آسان بنا دی۔

روس کے ترقیاتی کاموں کی حقیقت: روسی افواج کی مداخلت کے بعد افغانستان کی معاشی و اقتصادی حالت تباہ ہوتی جا رہی تھی۔ صنعت کار اور مزدور ملک چھوڑ کر ہجرت کر رہے تھے۔ افغانستان کی یہ تباہ حالی خود روس کے لیے انتظامی مشکلات پیدا کر رہی تھی۔ خصوصاً ذرائع توانائی اور مواصلات کی کمزوری اس کی عسکری مہمات کے لیے نقصان دہ تھی۔ چنانچہ اس نے کئی اہم اقدامات کیے اور کئی تعمیراتی کاموں کا آغاز کیا۔ ہوائی اڈوں کی توسیع کی۔ کابل اور جلال آباد جیسے بڑے شہروں کی اندرونی سڑکوں اور بعض بڑے شہروں کو ملانے والی شاہراہوں کو از سرِ نو تعمیر کیا۔ نئے بجلی گھر اور ہسپتال قائم کیے۔

ٹرکوں، فوجی گاڑیوں اور ٹرانسپورٹ وغیرہ کی سہولت کے لیے ان گنت ورکشاپ کھلوائے۔

کئی اشتراکی ملکوں نے روس کے ساتھ افغانستان کے ان تعمیری وترقیاتی کاموں میں دلچسپی لی۔ چیکو سلواکیہ نے آب پاشی کے نظام کی تجدید کے لیے قرضے دیے۔ مشرقی جرمنی نے بجلی کی پیداوار بڑھانے کے لیے پلانٹ مہیا کیے۔ بلغاریہ نے آٹھ ٹیلی فون ایکسچینج فراہم کیے۔ روس کے ان اقدامات کا فائدہ صرف بڑے شہروں کو تھا جہاں اس کے کارندے اور سرکاری اہلکار آباد تھے۔ افغان عوام ان سہولتوں سے برائے نام استفادہ کر رہے تھے۔

<u>ہیروئن کی تجارت</u>: افغانوں کے اصل مسائل جوں کے توں تھے بلکہ ان میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بے روزگاری، خانہ بربادی، غربت، بھوک وافلاس اب عجیب عجیب شکلیں اختیار کر کے اجتماعی مسائل کو جنم دے رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ دنیا میں ''ہیروئن'' جیسے خطرناک نشے کا چرچا ہوا۔ افغان مہاجرین کے جرائم پیشہ افراد کے علاوہ وہ لوگ بھی جو غربت وافلاس سے تنگ آچکے تھے ہیروئن فروشی کا دھندا کرنے لگے تھے۔ اس صورتِ حال سے مہاجرین کو پناہ دینے والا پاکستان شدید متاثر ہوا۔ چند سالوں میں یہ خطرناک نشہ ملک کے کونے کونے میں پھیل گیا۔ پھر یہ سلسلہ یہیں نہیں رکا۔ دنیا بھر میں اس کی منڈیاں کھل گئیں۔ ہیروئن کے تاجروں کے وارے نیارے ہوگئے۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے کروڑ پتی بن گئے۔ بڑے بڑے جرائم پیشہ افراد، انڈر ورلڈ کے ڈان اور بدعنوان حکومتی عہدے دار اس قبیح کاروبار میں شامل ہوتے گئے۔ پاکستان جہاں اکا دکا شرابی اور افیونی نظر آتے تھے، ہیرونچیوں کا گڑھ بن گیا۔ مغربی صحافت نے اس معاملے کو اتنا اُچھالا کہ بیرونِ ملک سفر کرنے والے ہر پاکستانی کو ہیروئن کا تاجر تصور کر کے شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔

<u>کلاشن کوف کلچر</u>: لٹے پٹے افغانوں کے پاس ہیروئن کے بعد دوسری شے جسے فروخت کر کے وہ اپنا پیٹ پال سکتے تھے، اسلحہ تھا۔ یہ اسلحہ زیادہ تر روسی ساخت کا ہوتا تھا جسے مجاہدین معرکوں میں دشمن سے چھینتے تھے۔ ضرورت سے زائد اسلحہ فروخت ہونے پاک افغان سرحد کے بازاروں میں آجاتا تھا۔ اس صورتِ حال سے جرائم پیشہ افراد کی بن آئی۔ پاکستان میں پہلی بار ''کلاشن کوف کلچر'' متعارف ہوا۔ سیاسی، گروہی، لسانی اور فرقہ واریت کی لڑائیوں میں ایک دوسرے کی جان لینا معمول بن گیا۔

<u>روس کی نئی حکمتِ عملی</u>: 1983ء میں مجاہدین کے اتحاد اور تنظیم میں غیر معمولی بہتری نظر آئی۔ ان کے ذاتی اختلافات اور رقابتیں پس منظر میں چلی گئیں اور وہ اکثر محاذوں پر مشترکہ انداز میں حریف کا مقابلہ کرتے دکھائی دیے۔ سات جماعتی اتحاد ایک بار پھر فعال ہوگیا۔ اشتراکِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجاہدین نے کئی علاقوں

میں روس اور افغان افواج کو محاصرے میں لے لیا۔ ارغون اور خوست کا محاصرہ خاص طور پر قابل ذکر ہے جہاں طویل عرصے تک جنگ جاری رہی۔ روسیوں کے لیے شاہراہوں کی حفاظت اور ان پر سفر کرنا بڑا مشکل تھا۔ وہ مجاہدین کے تند و تیز حملوں کا شکار ہوتے رہتے تھے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے انہوں نے شاہراہوں کی مستقل حفاظت کے انتظامات کیے۔ دوراہوں، چوراہوں اور اہم مقامات پر مضبوط فوجی بنکر اور مورچے بنا کر وہاں بھاری تعداد میں سپاہی تعینات کر دیے گئے۔ کابل انتظامیہ کو 15 سو ٹرک فراہم کیے گئے تاکہ تباہ شدہ گاڑیوں کا متبادل موجود رہے۔ ہر قافلے کے ساتھ گن شپ ہیلی کاپٹروں کی پرواز لازمی قرار دی گئی...... مگر ان تمام حفاظتی اقدامات کے باوجود مجاہدین روسی قافلوں پر حملے کرتے رہے۔

فضائی بمباری کی کثرت: روس نے میدانی فوج کی بجائے اب فضائی طاقت کو زیادہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ پہلے فضائیہ صرف دیہاتوں پر بمباری کرتی تھی، اب مجاہدین کے مورچوں کو تلاش کر کے انہیں اندھادھند بمباری کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ کابل کے شمال کی ایک شاہراہ مجاہدین کے قبضے میں تھی۔ روسیوں نے وہاں ان گنت طیاروں کے ساتھ حملہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ طیاروں کی کثرت کے باعث آسمان چھپ گیا تھا۔ اس علاقے کے چپے چپے پر اتنی بمباری کی گئی کہ مجاہدین کے مورچے، کھیت، دیہات، سڑکیں، پل...... سب بے نام ونشان ہو گئے۔ شکردرہ اور استالیف کو اس طرح تباہ کیا گیا کہ ایک ذی روح بھی بچنے نہ پایا...... سب کچھ آنافانا ملبے کا ڈھیر بن گیا۔

شرمناک مظالم: افغانوں پر روس کے ہولناک مظالم کی داستانیں اب باقاعدہ رپورٹوں کی شکل میں میڈیا پر آتی جا رہی تھیں۔ پیرس اور اوسلو میں ان لرزہ خیز واقعات پر باقاعدہ کام ہوا جو انسانی حقوق کی شرمناک خلاف ورزیوں پر مبنی تھے۔ 13 مارچ 1983ء سے 16 مارچ تک ایک غیر جانبدار عدالت میں افغانستان سے جان بچا کر نکلنے والے مختلف لوگوں نے چشم دید شہادتیں پیش کیں۔ کابل پولیس کے ایک اعلیٰ افسر محمد ایوب نے عدالت میں بتایا کہ ہماری وزارت داخلہ مکمل طور پر روسیوں کے قبضے میں ہے۔ ہر کام ان کی منشا کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ صرف وزارتِ داخلہ کابل 12 ہزار سے زائد افراد کو بدترین تشدد کے ذریعے ہلاک کر چکی ہے۔ تشدد کے طریقوں میں بجلی کے جھٹکے دینا، کئی کئی راتوں تک جگائے رکھنا، قیدیوں پر کتے چھوڑ دینا، والدین کی آنکھوں کے سامنے ان کے بچوں کو تختۂ مشق بنانا اور عورتوں کی عصمت دری کرنا معمول باتیں ہیں۔ اس نے بتایا کہ سوویت سپاہی ''انسانی شکار'' کے پروگرام بنا کر آبادیوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ پہلے بمباری کی جاتی ہے، جب دیہاتی مکانات سے نکل کر بھاگتے ہیں تو باقاعدہ شکار شروع ہوتا ہے۔ شکاری گن شپ ہیلی کاپٹروں میں ہوتے ہیں اور نیچی

پرواز کے ذریعے بھاگتے ہوئے خوفزدہ انسانوں کو گولیوں کا نشانہ بناتے چلے جاتے ہیں۔

مختلف افغان باشندوں نے بتایا کہ انہیں معمولی شک وشبے کی بنیاد پر دو دو ہفتے مسلسل کھڑا رکھا گیا، بجلی کے شاک دیے گئے۔ زہریلی ادویات کھلائی گئیں۔ ایک شخص نے بتایا کہ روسیوں نے ایک آٹھ سالہ بچے سے مجاہدین کا اتا پتا معلوم کرنے کی کوشش کی، جب اس نے زبان نہ کھولی تو اس پر پیٹرول چھڑک کر زندہ جلا دیا گیا۔ بعض دیگر اداروں کی رپورٹوں کے مطابق مارچ 1983ء تک سوویت افواج افغانستان میں دس لاکھ افراد کو شہید کر چکی تھیں۔ ایک لاکھ سے زائد افراد وہاں سیاسی قیدیوں کی حیثیت سے زندانوں میں گل سڑ رہے تھے۔ روسی 72 ہزار افغان بچوں کو ذہنی غسل دے کر کمیونسٹ بنانے کے لیے ماسکو لے جا چکے تھے۔ جبکہ 27 لاکھ افغان پاکستان میں پناہ گزینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی کفالت پر دس لاکھ ڈالر یومیہ خرچ ہو رہے تھے جن کا نصف حصہ پاکستان ادا کر رہا تھا۔

روس پاکستان کو اس ''مسلم دوستی'' کی سزا دینے کے لیے نت نئی سازشوں میں مصروف تھا۔ وہ دو سو پاکستانی نوجوانوں کو ماسکو میں دہشت گردی کی تربیت دے رہا تھا تاکہ ان کے ذریعے پاکستان کے امن وامان کو تہ وبالا کیا جاسکے۔

احمد شاہ مسعود اور روس کی جنگ بندی: یہ پورا سال حملہ آوروں کے لیے اس لحاظ سے اطمینان بخش تھا کہ مجاہدین کے اہم کمانڈر احمد شاہ مسعود اور سوویت یونین کے درمیان ایک سال کے لیے جنگ بندی کا معاہدہ طے پا گیا تھا۔ دیگر مجاہد تنظیمیں احمد شاہ مسعود کے اس فیصلے کو غداری سے تعبیر کرتی تھیں مگر احمد شاہ مسعود کے حامیوں کے نزدیک یہ فیصلہ درست تھا۔ ان کے بقول وادی پنج شیر چار سالہ جنگ میں روس کے مسلسل حملوں کے باعث بنیادی ضروریات سے بھی محروم ہو چکی تھی۔ کھیت تباہ ہو گئے تھے اور مجاہدین کے لیے باہر سے غلہ منگوانا پڑ رہا تھا۔ دشمن سے وقتی صلح کر کے احمد شاہ مسعود مقامی نظم ونسق کو بہتر بنانا، بنیادی ضروریات کا انتظام کرنا اور مجاہدین کو از سر نو تربیت دینا چاہتا تھا۔

بہر کیف اس معاہدے کا سب سے بڑا فائدہ روس کو ہوا۔ کیونکہ دریائے آمو سے کابل تک پہنچنے والی شاہراہ احمد شاہ مسعود کے علاقے سے گزرتی تھی۔ یہاں مجاہدین کی کارروائیاں بند ہو جانے سے روس کا کابل سے براہِ راست زمینی رابطہ بحال ہو گیا۔

1984ء کے اہم واقعات: اس کامیابی کو سوویت یونین نے اگلے برس مزید فتوحات کا ذریعہ بنایا۔ 1984ء کے آغاز ہی میں ارغون میں محصور سوویت اور افغان سپاہیوں نے زبردست جنگ کے بعد مجاہدین کا محاصرہ توڑ دیا۔ اس معرکے میں چھ سو مجاہدین شہید ہوئے تھے۔ (یہ تعداد روسی ذرائع کے

مطابق ہے) مجاہدین کے نقصانات کا بڑا سبب وہ بارودی سرنگیں تھیں جو ارغون کے ارد گرد چپے چپے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کامیابیوں سے ببرک کارمل کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اب وہ اپنی تقاریر میں نہایت غرور و تکبر کے ساتھ اپنی فتوحات کا تذکرہ کیا کرتا تھا۔ اپنی افواج کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اس نے ان کی تنخواہیں دوگنا کر دیں اور مجاہدین کو بڑی بڑی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ وہ پاکستان پر بھی رعب جھاڑنے کی کوشش کرتا رہا۔ جون 1984ء میں ایک دھمکی آمیز بیان کے دوران اس نے کہا: ''ہمارے پاس اتنا اسلحہ ہے کہ ہم پہاڑوں کو پگھلا سکتے ہیں۔'' افغان طیارے کھلم کھلا پاکستانی حدود کی خلاف ورزی کر کے بمباری کرنے لگے تھے۔

افغان طیاروں کے پاکستان پر حملے: 14 اگست 1984ء کو جبکہ پاکستان میں جشن آزادی منایا جا رہا تھا افغان طیاروں نے چوبیس گھنٹے کے اندر دوبار سرحدی حدود کی خلاف ورزی کر کے آبادی پر بمباری کی جس سے یومِ آزادی منانے والے 13 پاکستانی شہری جاں بحق ہو گئے۔

مجموعی طور پر 1980ء سے 1984ء کے آغاز تک صرف چار سال کے دوران افغان طیارے 411 بار پاکستان کی حدود کی خلاف ورزی کر چکے تھے مگر پاکستان ہمسائیگی کا لحاظ کر کے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتا رہا۔ اس سلسلے کا سب سے روح فرسا واقعہ 29 ستمبر 1984ء کو پیش آیا جب افغان طیاروں نے کرم ایجنسی کے پُر رونق بازار پر اندھا دھند بمباری کر کے تقریباً 200 افراد کو شہید اور کروڑوں روپے کی مالیت کا تجارتی سامان تباہ کر دیا۔ اس خوفناک بمباری کے نتیجے میں سینکڑوں دکانیں ملبے کا ڈھیر بن گئیں اور کئی عمارتیں زمین بوس ہو گئیں۔

آندرے پوف کی موت، چرننکو کا اقتدار: اس سال سویت یونین کی قیادت ایک بار پھر تبدیل ہوئی۔ برزنیف کے جانشین آندرے پوف کو زیادہ مہلت اقتدار نہ مل سکی اور وہ 11 فروری 1984ء کو فوت ہو گیا۔ اس کی عمر 69 برس تھی۔ 12 اپریل کو ''چرننکو'' نے سوویت یونین کے نئے صدر کی حیثیت سے اقتدار سنبھال لیا۔

پنج شیر پر ساتواں حملہ: ادھر احمد شاہ مسعود نے یک سالہ جنگ بندی کی مدت ختم ہوتے ہی شاہراہ سالانگ پر ایک بار حملے شروع کر دیے تھے۔ احمد شاہ مسعود نے روس کی پیش کش کے باوجود تا کہ بندی میں توسیع سے انکار کر دیا تھا۔ آخر روس نے پندرہ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک بڑی فوج پنج شیر پر حملے کے لیے روانہ کر دی۔ یہ وادی پنج شیر پر ''ساتواں بڑا حملہ'' تھا۔

روس کے T-U16 طیارے وادی پنج شیر پر کارپٹ بمباری کے لیے نہایت بلندی پر محوِ پرواز

تھے۔ ہیلی کاپٹروں پر چھاتہ بردار فوج بھی تیار تھی۔ فضا سے اندھا دھند بمباری شروع ہوئی تو مجاہدین کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ سوویت توپ خانہ اور بکتر بند گاڑیاں آگے بڑھتی رہیں۔ پنج شیر کی گھاٹیوں میں کئی مقامات پر جھڑپیں ہوئیں جن میں فریقین کا خاصا جانی و مالی نقصان ہوا۔ آخر کار احمد شاہ مسعود نے جنگی حکمت عملی کے تحت پہاڑ کی چوٹیوں اور بغلی وادیوں میں پناہ لے لی۔ سوویت چھاتہ بردار دستے 'علی تنگ' اور 'اندراب' میں لڑتے رہے۔ چند دنوں کے اس معرکے کے بعد کابل ریڈیو نے احمد شاہ مسعود کی مکمل شکست اور پنج شیر پر سرکاری کا اعلان کر دیا۔ جلد ہی ببرک کارمل نے خود پنج شیر کا دورہ کر کے دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہاں سے احمد شاہ مسعود کا قبضہ ختم ہو چکا ہے۔ تاہم احمد شاہ مسعود اور اس کے جانباز جو پنج شیر کی آبادی سے ہٹ کر پہاڑوں اور وادیوں میں موجود تھے اور اس کے بعد بھی متحرک اور فعال رہے۔

روس کی مزید کارروائیاں: چونکہ پنج شیر کی اس جنگ میں سوویت چھاتہ برداروں کا خاص کردار تھا اس لیے اس معرکے کے بعد افغانستان میں چھاتہ بردار افواج کی طلب میں اضافہ ہو گیا۔ ان کی بڑی تعداد افغانستان پہنچنے لگی، روس نے ایک نئی اسپیشل فوج ''سوویت ایر اسالٹ بریگیڈ'' بھی تشکیل دے ڈالی۔ خوفناک حد تک بے رحم ''اسپیٹز ناز'' دستے بھی تیار کیے جو مجاہدین کے بھیس میں دیہاتوں پر حملے کرتے تھے اور ان مظالم کی ذمہ داری مجاہدین پر ڈال دیتے تھے۔

احمد شاہ مسعود کی کارروائیوں کا جواب دینے کے لیے روس نے ایک بار پھر بڑے فضائی حملے کے لیے ماہ ستمبر میں عیدالاضحیٰ کے دن پنج شیر پر ''آٹھواں حملہ'' کیا۔ TU-16 طیاروں کی ہولناک بمباری سے تین سو افراد شہید ہو گئے۔ روس کا کہنا تھا کہ یہ سب مجاہدین تھے مگر مقامی لوگوں کے مطابق ان میں اکثریت عام لوگوں کی تھی۔

نومبر میں اسی طرح کے حملے اور بمباری میں لوگر کے چار سو شہری جاں بحق ہوئے۔ دورانِ سال روس کے بارہ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک لشکر نے افغان فوج کے ساتھ پارہ چنار اور کابل کے درمیان واقع علی خیل (جاجی) کی چھاؤنی کا محاصرہ کرنے والے مجاہدین پر حملہ کیا۔ اس جنگ کے نتیجے میں مجاہدین محاصرہ اُٹھانے پر مجبور ہو گئے۔ روسیوں نے اسے اپنی ایک بڑی کامیابی تصور کیا۔

مجاہدین میدان میں ڈٹے ہوئے تھے: روس کی ان تمام فتوحات کے باوجود مجاہدین کا حوصلہ روزِ اوّل کی طرح بلند تھا۔ وہ سر ہتھیلی پر رکھ کر ہر میدان میں سرخ افواج کو للکار رہے تھے۔ ایک وادی میں شکست کھا کر پسپا ہونے والے مجاہدین اگلے دن کسی دوسرے علاقے میں درجنوں روسیوں کا صفایا کر چکے ہوتے تھے۔

روس افغانستان کی دلدل میں دھنس چکا تھا۔ اس جنگ میں اس کے آٹھ کروڑ ڈالر یومیہ خرچ ہو رہے تھے۔ اس کی معیشت زوال کی جانب جا رہی تھی۔ 1984ء کے دوران ستر ہزار سے زائد امدادی سپاہی افغانستان بھیجے گئے تھے۔ جدید ترین طیاروں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ کر دیا گیا تھا مگر چند وقتی کامیابیوں کے سوا روس کو کچھ ہاتھ نہ آیا۔ 28 دسمبر 1984ء کی ایک اخباری رپورٹ کے مطابق پانچ سال میں 10 ہزار سے زائد روسی اور افغان فوجی مجاہدین کے ہاتھوں ہلاک ہو چکے تھے۔ ایک اور رپورٹ میں انکشاف کیا گیا تھا کہ روس اور کابل انتظامیہ کو مجاہدین کے ہاتھوں 34 ارب روپے سے زائد کا مالی نقصان ہو چکا ہے۔

عالمی سطح پر یہ خبریں روس کو بدنام کرنے کے لیے کافی تھیں کہ اس کی کارروائیوں کے نتیجے میں افغانستان کے 10 لاکھ شہری جاں بحق ہو چکے ہیں جبکہ 25 لاکھ افغان معاشی بدحالی کی انتہاء کو پہنچ کر فاقہ کشی پر مجبور ہیں۔

16 نومبر 1984ء کو جنرل اسمبلی کے اجلاس میں ایک بار پھر روسی افواج کے افغانستان سے فوری انخلاء کی قرارداد بھاری اکثریت سے منظور کر لی گئی۔ اس کے ساتھ امریکا نے مجاہدین کے لیے امداد دوگنی کرنے کا اعلان کر دیا اور مہاجرین کی امداد کے لیے دس لاکھ ڈالر کی منظوری دے دی۔

قبائلی ملیشیا: روس اور کارمل حکومت کے لیے حالات دشوار ہوتے جا رہے تھے۔ مجاہدین کا زور توڑنے کے لیے کارمل انتظامیہ نے قبائلیوں کی وفاداریاں خریدنے پر توجہ دیں۔ قبائلیوں میں بکنے والوں کی کمی نہ تھی۔ کارمل نے ایسے سرداروں اور ان کی نجی سپاہ پر مشتمل ایک نئی ملیشیا بنانے کی سرتوڑ کوشش شروع کر دی۔ بعض سردارانِ قبائل کبھی کابل انتظامیہ کے ساتھ مل جاتے اور کبھی مجاہدین کی صف میں کھڑے نظر آتے۔ ان دنوں کابل کے ایوانوں میں ان کی آمد و رفت کچھ زیادہ ہو گئی تھی۔ آخر کار ایک ملیشیا تیار کر لی گئی۔ عصمت اللہ مسلم نامی ایک سردار کو اس ملیشیا کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا۔ وہ مجاہدین سپلائی لائن پر حملے کر کے ان کا اسلحہ لوٹنے لگا۔ سروبی کے سردار حسن خان کروخیل نے بھی حکومت سے معاہدہ کر لیا۔ اسے سروبی کے بجلی گھر اور بجلی کے کھمبوں کی حفاظت کا ذمہ دار بنا دیا گیا۔ کیونکہ مجاہدین کچھ مدت پہلے پل چرخی کا بجلی گھر تباہ کر چکے تھے۔ اگر سروبی کا بجلی گھر بھی ناکارہ ہو جاتا تو کابل بالکل تاریک ہو جاتا۔ ان سرداروں کے علاوہ جمعہ خان نامی ایک اکھڑ اور بد دماغ کمانڈر بھی 500 جنگجوؤں سمیت کارمل کی چھتری تلے آ گیا تھا۔

مجاہدین کی دھمکی: ایسے ملت فروش سرداروں کے بارے میں مجاہدین کا طرزِ عمل بڑا صاف اور دوٹوک تھا۔ وہ غداروں کو کھلی تنبیہ کر دیتے کہ ان حرکتوں سے باز آ جائیں بصورتِ دیگر انہیں نشانِ عبرت بنا دیا

جائے گا۔ سروبی کے حسن خان کو مولانا یونس خالص کا ایک ہی دھمکی آمیز پیغام کافی ہو گیا: ”باز آجاؤ ورنہ لڑائی کے لیے تیار رہو۔ ہم تمہیں برباد کر دیں گے۔“ حسن خان ایسا گھبرایا کہ سروبی چھوڑ کر سیدھا پاکستان پہنچ گیا۔ البتہ جمعہ خان پر تنبیہات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر ایک کارروائی میں اسے قتل کر دیا گیا۔

مآخذ و مراجع

- ...... تاریخ افغانستان من قبیل الفتح الاسلامی الی وقتنا المعاصر۔ فاروق حامد بدر
- ...... تاریخ جہادِ افغانستان۔ ڈاکٹر ایچ بی خان
- ...... اردو ڈائجسٹ، جہادِ افغانستان نمبر اپریل 1989ء، فروری 1990ء
- ...... افغانستان۔ ایک قوم کا المیہ۔ احمد شجاع پاشا
- ...... المسلمون فی افغانستان، ڈاکٹر محمد عبدالقادر احمد
- ...... جہاد افغانستان اور فتح مبین۔ مولانا مشتاق احمد عباسی
- ...... Encyclopaedia Britannica (Afghanistan)

ستائیسواں باب

فیصلہ کن جنگوں کا دور

1985ء کے حالات (جوڑ توڑ): 1985ء کا آغاز عالمی سطح پر مفاہمتی عمل ہموار کرتا نظر آرہا تھا۔ 10 جنوری کو روس اور امریکا نے جوہری اسلحے کی تخفیف کے بارے میں مذاکرات شروع کرنے پر اتفاق کرلیا۔ روس اور امریکا میں جنیوا مذاکرات شروع ہوئے۔ اگرچہ افغانستان سے سوویت افواج کی واپسی کا سلسلہ طے نہ ہوسکا مگر جنیوا مذاکرات جاری رکھنے پر دونوں عالمی طاقتیں متفق تھیں۔

ادھر کارمل نے بھی لویہ جرگہ طلب کر کے افغان عمائد کا اعتماد حاصل کرنے کی ازسرنو کوشش کی۔ جرگے میں 1776 نمائندے شریک ہوئے۔ مگر یہ محض کٹھ پتلی تماشا تھا۔ ادھر جرگے کا اجلاس ہو رہا تھا، اُدھر چری کڑ کے پہاڑوں پر مجاہدین کی راکٹ باری سے ایک تہلکہ مچا ہوا تھا۔ بہر حال پختون قبائل اور کارمل انتظامیہ کے درمیان مفاہمت کے عمل کو آگے بڑھانے کے لیے خاد کے سربراہ ڈاکٹر نجیب اللہ کو ذمہ دار بنادیا گیا، کیونکہ وہ خود بھی پختون تھا اور قبائل کے عمائد سے اس کے قریبی روابط تھے۔

مجاہدین کی کارروائیاں: ان دنوں پکتیا سے لے کر پاراچنار تک کی پٹی مجاہدین کی کارروائیوں کا خاص مرکز تھی۔ یہ پٹی کابل سے پچاس میل کے فاصلے پر آکر ختم ہوتی تھی اس لیے کابل ہمہ وقتی خطرے کی زد میں تھا۔ کابل میں ساٹھ ہزار سوویت وافغان سپاہی ہر وقت پہرا دیتے رہتے تھے۔ اس طرح مجاہدین کا شہر میں داخلہ تو مشکل ہوگیا تھا مگر مجاہدین اکثر راکٹ حملوں اور بم دھماکوں کے ذریعے کارمل انتظامیہ اور سوویت اہلکاروں کو سراسیمہ کرتے رہتے تھے۔ اس سال بھی احمد شاہ مسعود نے سالانگ کابل شاہراہ پر سوویت افواج کے لیے مشکلات پیدا کیے رکھیں۔ آخر سوویت افواج نے پنج شیر پر نواں حملہ کیا۔ اس حملے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ احمد شاہ مسعود نے "پیش گر" پر جارحانہ حملہ کر کے وہاں قبضہ کرلیا تھا۔ مجاہدین نے پیش گر سے 5 کرنل، سو سے زائد افسران اور 350 سپاہی گرفتار کر لیے تھے۔

اس کے ردعمل میں فوری طور پر دشمن کی فضائیہ نمودار ہوئی اور اندھا دھند بمباری شروع کردی۔ اس

ہولناک بمباری سے مجاہدین کا اتنا نقصان نہ ہوا مگر 130 افغان و سوویت قیدی ہلاک ہو گئے۔ روس اور افغان میڈیا نے اُلٹا مجاہدین پر الزام لگایا کہ انہوں نے قیدیوں کو ہلاک کر کے بدترین ظلم کیا ہے۔ کچھ دنوں بعد سوویت یونین نے بڑا حملہ کر کے پیش گرو واپس لے لیا مگر وہ اپنے بقیہ قیدی آزاد نہ کرا سکا۔

ہرات کا محاذ: ہرات میں اسماعیل خان کے مجاہدین سرگرم عمل تھے۔ انہوں نے زمین دوز سرنگ کے ذریعے روسیوں کی ایک ناقابلِ تسخیر چوکی تک رسائی حاصل کی اور وہاں قبضہ کر کے دنیا کو حیرت زدہ کر دیا۔ وہ ائیرپورٹ پر بھی راکٹوں سے حملے کرتے رہتے تھے۔ ایک دن شین ڈنڈ ہولناک دھماکوں سے گونج اُٹھا۔ پتا چلا کہ 20 طیارے تباہ ہو گئے ہیں۔ سوویت یونین اور کارمل انتظامیہ کی فضائیہ کو اتنا بڑا دھچکا پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا۔

محاصرانہ جنگیں: 1984ء کے بعد 1985ء میں بھی مجاہدین نے خوست، تانی، جاجی اور بری کوٹ کا محاصرہ جاری رکھا۔ روس کو ان علاقوں میں خوراک و رسد اور اسلحے کی ترسیل میں بے حد دشواری پیش آ رہی تھی۔ اس نے مجاہدین پر کئی بڑے حملے کیے مگر جزوی کامیابی کے سوا کچھ نہ ملا اور مکمل طور پر مجاہدین کو منتشر نہ کیا جا سکا۔ چونکہ یہ عسکری مراکز بارودی سرنگوں کے جال سے گھرے ہوئے تھے اس لیے مجاہدین آسانی سے ان پر قبضہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک رپورٹ کے مطابق روس 1985ء کے دوران تک افغانستان میں 20 لاکھ بارودی سرنگیں بچھا چکا تھا۔ یوں افغانستان کے چپے چپے پر موت کا یہ جال بچھا ہوا تھا۔ محاصرانہ جنگیں جاری رہیں۔ آخر کار ایک مقام پر روس کو کامیابی ہوئی۔ 6 جون 1985ء کو سرخ افواج نے بری کوٹ کا محاصرہ توڑ ڈالا اور مجاہدین نقصان اُٹھا کر پہاڑوں میں غائب ہو گئے۔ اس کارروائی کے دوران سوویت افواج نے چار دیہات صفحہ ہستی سے مٹا دیے اور کم از کم دو ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

مجاہدین کا سات گروہی اتحاد بہرحال فعال تھا۔ پشاور میں اس کا صدر دفتر آباد رہتا تھا۔ اس سال اقوامِ متحدہ کی تقریبِ سالگرہ میں شرکت کے لیے اس سات گروہی اتحاد نے اپنا وفد بھی بھیجا تھا۔

1985ء کے اواخر میں ببرک کارمل ایک ہارے ہوئے لاچار و بے بس انسان کی مانند نظر آتا ہے۔ وہ بیمار بھی تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح تقاریب میں بکثرت شرکت نہیں کرتا تھا۔ جب اس نے ماسکو کا دورہ کیا تو وہاں اس کو وہ اہمیت نہ ملی جو کبھی ملا کرتی تھی۔ دراصل ماسکو اب اسے پٹا ہوا مہرہ سمجھ کر ہٹانا چاہتا تھا۔ سوویت یونین کو اب کارمل کے متبادل کی تلاش تھی۔ عالمی مبصرین ''سلطان علی کشتمند'' اس کے لیے موزوں ترین شخص قرار دے رہے تھے۔

روسی مظالم: 1985ء میں بھی روسی مظالم جاری رہے۔ سوویت افواج نے 15 مئی کو افغانستان کے دیہاتوں میں ایک ہزار افراد شہید کر دیے۔ انہی دنوں قندھار میں بمباری سے 70 افراد کو شہید کیا گیا۔ دورانِ سال مجموعی طور پر کم از کم 35 ہزار افراد کی شہادتیں منظر عام پر آئیں۔

سوویت یونین کا نیا سربراہ گورباچوف: سوویت یونین کے سربراہ اور کمیونسٹ پارٹی کے صدر ''چرننکو'' کو اقتدار کے زیادہ دن نصیب نہ ہوئے۔ آندرے پوف کی طرح اس کا دورِ حکومت بھی مختصر ثابت ہوا۔ بعدازاں میخائل گورباچوف نے کمیونسٹ پارٹی کی صدارت اور روس کے نئے حکمران کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ گورباچوف نے اپنے پیشرو حکمرانوں سے خاصا مختلف انداز اختیار کیا۔ سوویت روس کی روبہ زوال معیشت بتا رہی تھی کہ کمیونزم اپنی موت آپ مرنے والا ہے۔ گورباچوف نے پالیسیوں میں تدریجی طور پر تبدیلیاں کر کے آنے والے خطرات سے بچنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس نے پہلی بار سوویت عوام کو تحریر و تقریر کی محدود آزادی دی تو صحافی حکومت سے افغان جنگ کے بارے میں سوالات کرنے لگے۔ جب حکومت انہیں مطمئن نہ کر سکی تو روس میں یہ تاثر دن بدن بڑھنے لگا کہ افغان جنگ ایک احمقانہ مہم کے سوا کچھ نہیں۔ گورباچوف بنیادی طور پر پکا کمیونسٹ تھا مگر وہ نئے حالات کے تحت کمیونزم میں کچھ اہم تبدیلیاں کرنے کا خواہاں تھا۔ اس کے عزائم ماضی کے حکمرانوں کی طرح توسیع پسندانہ نہیں تھے۔ شاید اس لیے کہ سرخ ریچھ سات سال سے افغانستان میں لڑتے لڑتے لہولہان ہو چکا تھا۔ وہ پہلے اپنے زخموں کے بھرنے کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ فی الحال افغانستان سے واپسی کا کوئی باعزت راستہ نکالا جائے۔ چنانچہ 25 مئی 1985ء کو ایک بیان میں گورباچوف نے کہا: ''ہم بیرونی مداخلت سے آزاد افغان دوستی کے خواہش مند ہیں۔ ہم افغان مسئلہ کے سیاسی حل کی حمایت کرتے ہیں۔''

ایک بار پھر جنیوا مذاکرات: گورباچوف کے بیانات سے یہ واضح تاثر مل رہا تھا کہ سوویت یونین افغانستان سے واپسی اختیار کرنا چاہتا ہے اور غالباً اس کے لیے وہ خاصی سخت شرائط بھی قبول کر لے گا۔ روس کے اس رویے کے پیشِ نظر 17 دسمبر 1985ء کو افغان مسئلے پر جنیوا میں بالواسطہ مذاکرات کے چھٹے دور کا آغاز ہوا۔ مذاکرات سے قبل امریکا افغان مسئلے کے حل کے لیے ضامن بننے کے لیے تیار ہو گیا۔ طے ہوا کہ معاہدہ حکومت پاکستان اور حکومت افغانستان کے درمیان ہوگا تاہم افغان انتظامیہ کے وفد کے سخت رویے کے باعث مذاکرات نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے۔

پاکستان میں جمہوری حکومت: 1985ء کے دوران پاکستان میں ایک بڑی سیاسی تبدیلی آئی۔ صدر ضیاء الحق نے عام انتخابات منعقد کرائے جن کے نتیجے میں محمد خان جونیجو نے نئے وزیراعظم کی حیثیت

سے عہدہ سنبھالا۔ انتقال اقتدار کے ان ایام میں افغانستان کی جانب سے پاکستان پر مسلسل فضائی حملے ہوتے رہے۔ صرف مئی کے پہلے عشرے میں افغان طیاروں نے 60 بار پاکستانی علاقوں پر حملے کیے۔ 29 جون کو وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے خبردار کیا کہ آئندہ اگر کوئی افغان طیارہ پاکستانی حدود میں داخل ہوا تو جوابی کارروائی کی جائے گی۔

روسی طیاروں کا شکار: ستمبر کے مہینے میں مشرقی افغانستان زبردست جنگوں کا مرکز بنا رہا۔ خوست میں تین ہزار کارمل اور 500 روسی افسران محصور تھے اور گردونواح میں شدید لڑائی جاری تھی۔ مجاہدین کو امریکا کی طرف سے ملنے والے اسٹینگر میزائلوں نے روسی طیاروں کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ مجاہدین دھڑا دھڑ طیارے اور ہیلی کاپٹر گرا رہے تھے۔

6 ستمبر کو پکتیا میں سات روسی ہیلی کاپٹر اور طیارے مار گرائے گئے۔ اگلے دن، ایک مسافر بردار افغان طیارہ مجاہدین کے میزائلوں کا نشانہ بنا جو روس اور افغان افسران اور سپاہیوں کو لے جا رہا تھا۔ 52 افراد اس کارروائی میں ہلاک ہوئے۔ اس سے اگلے روز 9 ستمبر کو مجاہدین نے پاکستانی سرحد کے قریب دو روسی مگ طیارے تباہ کر دیے۔

ژاور کا معرکہ: اس دوران ہزاروں روسی اور افغان سپاہی مشرقی افغانستان میں ژاور پر حملہ آور ہو چکے تھے۔ یہ مجاہدین کا سب سے بڑا عسکری مرکز تھا جس میں سرنگوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ان میں بجلی اور جنریٹروں تک کا انتظام تھا۔ پورے افغانستان میں مجاہدین کو فراہم کیے جانے والے اسلحے کے ذخائر یہاں موجود تھے۔ روسیوں اور کارمل کے سپاہیوں نے ژاور کے عسکری مرکز پر قبضے کی سرتوڑ کوشش کر ڈالی مگر مجاہدین کی جرأت ایمانی، پامردی اور اولوالعزمی کے سامنے ان کی پیش نہ گئی اور آخر وہ لاشوں کے ڈھیر چھوڑ کر پسپا ہو گئے۔ اس جنگ کے بارے میں 11 ستمبر 1985ء کو مولانا جلال الدین حقانی کا یہ بیان ذرائع ابلاغ پر نشر ہوا کہ گزشتہ ہفتے افغانستان کی تاریخ کی سب سے ہولناک جنگ لڑی گئی۔

سال 1985ء کے اختتام پر سامنے آنے والے اعداد وشمار کے مطابق اس ایک سال میں 7920 روسی وافغان فوجی ہلاک ہوئے۔ 5829 عام شہری جاں بحق ہوئے۔ مجاہدین کا جانی نقصان 2152 افراد تک رہا۔ روسی وافغان فضائیہ کے 42 طیارے، 64 ہیلی کاپٹر، 837 ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں تباہ ہوئیں۔

کارمل رخصت: 1986ء شروع ہوا تو افغانستان میں ببرک کارمل کے دن پورے ہو چکے تھے۔ اب وہ اہم سرکاری تقاریب سے بھی اکثر غیر حاضر رہتا تھا۔ اپریل 1986ء میں بلائے گئے بڑے جرگے میں بھی کارمل موجود نہ تھا۔ صرف اس کا تحریری پیغام پڑھ کر سنا دیا گیا۔ البتہ کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی

کمیٹی کے سیکرٹری ڈاکٹر نجیب اللہ نے خاصی طویل اور پر جوش تقریر کی۔ آخر 4 مئی کو کابل ریڈیو سے اعلان ہوا کہ ببرک کارمل نے خرابی صحت کی بنا پر اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا ہے جو قبول کر لیا گیا ہے اور اس کی جگہ ڈاکٹر نجیب اللہ کو پارٹی کا جنرل سیکرٹری چن لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر نجیب اللہ کون تھا؟ 28 سالہ ڈاکٹر نجیب اللہ اپنے بھاری ڈیل ڈول کی وجہ سے ''بیل'' کے لقب سے مشہور تھا۔ وہ بڑا عیار، چوکس اور چرب زبان انسان تھا۔ فن تقریر کا خوب ماہر تھا۔ سیاسی جوڑ توڑ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اس کے ساتھ وہ حد درجہ بے رحم اور سفاک بھی تھا۔ وہ ایک پٹھان بینکار کا بیٹا تھا۔ 1947ء میں پکتیا میں پیدا ہوا تھا۔ 1964ء میں وہ ڈاکٹر بننے کے لیے کابل یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ اسی زمانے میں وہ جمہوری پارٹی کا رکن بن گیا اور پوری مستعدی سے ببرک کارمل کے زیرِ سایہ پرچم پارٹی کے لیے کام کرتا رہا۔ ڈاکٹر بننے کے بعد بھی وہ علاج معالجے کی بجائے سیاسی مشاغل میں مصروف رہا۔ تقریر کی صلاحیت نے اسے ترقی حاصل کرنے میں خاص مدد دی۔ خلق پارٹی کے اقتدار کے دور میں وہ ایران میں افغانستان کا سفیر مقرر ہوا۔ بعد میں مشرقی یورپ چلا گیا۔

سوویت یلغار کے ساتھ خلق کا اقتدار ختم ہوا اور ''پرچمی'' اپنے رہنما ببرک کارمل کی قیادت میں بر سر اقتدار آئے تو نجیب اللہ واپس آ گیا۔ 1980ء میں وہ افغان خفیہ ایجنسی ''خاد'' کا سربراہ بن گیا جو کہ مجاہدین اور ان کے حامیوں کے خلاف لرزہ خیز کارروائیاں کرتی رہی۔ چار سال بعد وہ نومبر 1985ء میں پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا سیکرٹری مقرر ہوا اور ببرک کارمل کے استعفے کے بعد 1986ء میں اس نے نئے افغان حکمران کی حیثیت سے چارج سنبھالا۔

نجیب اللہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سوویت خفیہ ایجنسی کے جی بی کا ایجنٹ تھا۔ اسی بنا پر سوویت حکام اس پر بھر پور اعتماد کرتے تھے۔ جب انہوں نے کارمل کو از کار رفتہ محسوس کر لیا تو ان کی نظر میں نجیب ہی اس عہدے کے لیے موزوں تر محسوس ہوا۔ نجیب اللہ نے بر سر اقتدار آتے ہی حکومتی مشینری کو فعال کرنے کی کوشش کی۔ وہ مکر و فریب اور جبر و تشدد کے ذریعے ان مشکلات پر قابو پانا چاہتا تھا جو ببرک کارمل کے زوال کا باعث بنی تھیں۔

نجیب اللہ کا دورِ حکومت: اس نے فوری طور پر ملک بھر کا دورہ کیا اور قبائلی عمائد سمیت مختلف طبقات کے لوگوں کو اعتماد میں لینے کی کوشش کا آغاز کیا۔ وہ ملک کو کوئی نیا سیاسی لائحہ عمل تو نہ دے سکا کیونکہ اس کی حیثیت کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی۔ تاہم اس نے کارمل کی پالیسیوں کو مربوط کر کے انتظامی بگاڑ دور کرنے پر توجہ دی۔ ہر مکار حکمران کی طرح اس نے بھی مذہب پسندی کا دعویٰ کیا، خود کو سچا اور پکا مسلمان کہا۔

اسلام دوستی کے نعرے لگائے۔ مساجد میں نماز جمعہ کے اجتماعات میں شرکت کی۔ مگر یہ سب ایک ڈھونگ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اصل میں تو وہ بھی کارمل کی طرح الحاد، ظلم اور سفاکی کی راہ پر گامزن تھا۔ خاد کی سربراہی کے تجربات اس کے کام آرہے تھے۔ اس نے اپنے مخالفین اور دشمنوں کو خفیہ کارروائیوں کے ذریعے ہلاک کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اپنی پارٹی کے کارکنوں کو بھی فوجی بھرتی میں سستی برتنے پر سخت سرزنش کی اور جبری بھرتی پر زور و شور سے عملدرآمد کرایا۔

ژاور کی دوسری جنگ: آغاز 1986ء میں ژاور کا محاذ ذرائع ابلاغ کا اہم موضوع رہا۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ مجاہدین کا سب سے بڑا مرکز تھا اور یہاں مولانا جلال الدین حقانی پورے افغانستان کے مجاہدین کو اسلحہ کی ترسیل کا نظام سنبھالے ہوئے تھے۔ یہاں مجاہدین کو تربیت بھی دی جاتی تھی۔ فضائی حملوں کے دفاع کے لیے یہاں زبردست انتظامات تھے۔ ستمبر 1985ء کے حملے کی ناکامی کے بعد سوویت اور افغان افواج نے بھرپور تیاریوں کے ساتھ آغاز گرما 1986ء میں یہاں دوبارہ حملہ کیا۔ بارہ ہزار سپاہی جو ہر قسم کے ہلکے اور بھاری اسلحے سے لیس تھے، کئی خطوط سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہ حملہ عین ان دنوں میں ہو رہا تھا جب جنیوا میں افغان مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک بار پھر مذاکرات کا دور چل رہا تھا۔ سوویت افواج ژاور پر کامیاب فضائی حملے کے لیے خوست کو مرکز بنانا چاہتی تھی۔ مجاہدین نے اس سے پہلے ہی خوست ایئرپورٹ کو ناکارہ بنانے کے لیے وہاں گولہ باری شروع کر دی تھی۔

ادھر دیگر تنظیموں کے مجاہدین بھی کشاں کشاں ژاور کی طرف لپک رہے تھے۔ مولانا جلال الدین حقانی کی قیادت میں وہ قدم قدم پر حملہ آوروں کی لاشیں گرا رہے تھے۔ یوں روسی بڑی فوج کا آگے بڑھنا مشکل ہو گیا۔ تب دشمن نے چھاتہ بردار سپاہی اُتارنے کا فیصلہ کیا۔ مجاہدین فضائی حملوں اور چھاتہ برداروں کی یلغار کو نہ روک سکے مگر انہوں نے بری افواج کی رفتار توڑ دی تھی۔ ژاور کے گرد و نواح میں پہنچتے پہنچتے سوویت اور افغان فوج کے دو ہفتے صرف ہو گئے۔ اس دوران مجاہدین ایک بٹالین کا مکمل صفایا کر چکے تھے۔ اس کے 500 میں سے بمشکل 70 افراد زندہ واپس جا سکے۔ تاہم جنگ پوری شدت سے جاری رہی۔ کئی دنوں تک اندازہ لگانا مشکل تھا کہ کون فتح یاب ہوگا؟۔ آخر کار چھاتہ بردار سپاہ کی مدد سے 24 اپریل کو روسی سپاہی ژاور میں داخل ہو گئے۔

ژاور پر روس کا قبضہ: یہاں دست بدست جنگ کا آغاز ہوا۔ فریقین کے بے شمار افراد معرکے کی نذر ہوئے۔ ممکن تھا کہ مجاہدین دشمن کو پسپا کر دیتے مگر اس دوران ان کے کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی فضائی بمباری کا نشانہ بن کر شدید زخمی ہو گئے۔ تب مجاہدین نے خفیہ راستوں سے یہ علاقہ خالی کر دینا

ضروری سمجھا۔ مولانا جلال الدین حقانی کو پاکستان پہنچا دیا گیا۔ اکثر مجاہدین بھی بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ جبکہ اڑھائی سو مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا۔ ژاور 24 اپریل کو روس کے قبضے میں آ گیا۔ یہاں سے اسلحے کے بے پناہ ذخائر برآمد ہوئے۔ افغان حکام اور روس نے اسے اپنی تاریخی فتح قرار دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ژاور میں مجاہدین روس کی فضائیہ اور چھاتہ بردار فوج کو اس لیے ناکام نہ بنا سکے کہ ان کے پاس موجود طیارہ شکن ہتھیار کثرتِ استعمال کی وجہ سے صحیح طور پر کام کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ غالباً مجاہدین کو ابھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ جدید اسلحہ بھی متواتر استعمال سے ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اگر انہیں معلوم ہوتا تو وہ طیارہ شکن توپوں کو وقفے وقفے سے ٹھنڈا ہونے کا موقع دیتے رہتے۔

بہرکیف روس کو اس مہم کی خوشیاں منانے کے زیادہ دن نہ ملے۔ مجاہدین نے بہت جلد خود کو منظم کر لیا اور مشرقی افغانستان میں ان کی کارروائیاں پوری شدت سے دوبارہ شروع ہو گئیں۔

کابل میں روسی اڈے کی تباہی: 27 اگست 1986ء کو کابل کے گرد و نواح سے کمانڈر عبدالحق نے شہر پر اچانک حملہ کیا اور 107 ایم ایم، بی ایم 12 قسم کے میزائل برسائے۔ ان کا ہدف کابل میں واقع سوویت یونین کا ایک فوجی اڈہ تھا۔ میزائل گرنے سے وہاں اسلحے کے ذخیرے کو آگ لگ گئی۔ ہولناک دھماکوں کے ساتھ وہاں ذخیرہ شدہ میزائل پھٹنے لگے۔ پورا کابل لرزنے لگا۔ ان دھماکوں میں ایک ہزار کے قریب روسی اور افغان اہلکار ہلاک ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ روسی خفیہ ایجنسیوں نے اسی حملے کا بدلہ لینے کے لیے اوجڑی کیمپ راولپنڈی کو تباہ کیا تھا۔

ببرک کارمل کا عبرت ناک انجام: نجیب کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد سابق حکمران ببرک کارمل داؤد، ترہ کئی اور امین کی طرح اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ اس کے بارے میں طرح طرح کی متضاد آراء پھیلی ہوئی تھیں، مگر معتبر ذرائع کے مطابق مئی 1986ء میں ببرک کارمل کے مستعفی ہوتے ہی اسے زیرِ حراست لے کر کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔ اس دن کے بعد اس کی کوئی خبر ملنا ناممکن ہو گیا تھا۔ ایک بات تو واضح تھی کہ کارمل کے استعفیٰ کے بعد صدارتی محل فائرنگ سے گونج اٹھا تھا اور اسی دن کابل میں روسی افواج نے کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ صدارتی محل میں کیا ہوا تھا؟ صرف اتنا پتا چل سکا کہ کارمل کے سوتیلے بھائی کو گولی ماردی گئی ہے اور وہ خود لاپتا ہے۔

کارمل سے یہ سلوک پرچم پارٹی کے ارکان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا چنانچہ وہ نجیب اور اس کی انتظامیہ کے خلاف کارروائیاں کرنے لگے۔ نجیب اللہ اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد جون کے آغاز میں کارمل کے حامیوں کی فائرنگ کا نشانہ بنا۔ زخمی ہونے کے باوجود اس کی جان بچ گئی۔ 25 نومبر کو ایک بار پھر اس

پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ یہ بھی کارمل نواز گروپ کی کارروائی تھی۔ نجیب اللہ اس بار بھی زخمی ہوا مگر جان بچ گئی۔ نجیب پہلے ہی کارمل کے حامیوں کے خلاف کارروائیاں کر رہا تھا۔ اب ان کارروائیوں میں شدت آ گئی چنانچہ کارمل کے باپ جنرل حسین کو بھی گرفتار کر کے کسی نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ کارمل کے حامیوں کو چن چن کر نشانہ بنایا گیا۔ دسمبر کے آغاز میں خبر پھیل گئی کہ کارمل کو خفیہ حراست میں قتل کر دیا گیا ہے۔ کچھ مدت گزر جانے پر یہ خبر غلط ثابت ہوئی۔ ببرک کارمل ماسکو چلا گیا تھا، وہاں اس نے نجیب کے خلاف پرچم پارٹی کی سرگرمیوں کی سرپرستی جاری رکھی۔ 3 دسمبر 1996ء کو ماسکو ہی میں اس کا انتقال ہوا۔

جہادِ افغانستان کا نیا دور: نجیب کی حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی جہادِ افغانستان اپنے تیز ترین اور فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گیا۔ مجاہدین کی صفوں میں ایک نیا نظم وضبط دیکھنے میں آیا۔ ان کی کارروائیاں اب ایک حیران کن ولولے کا مظہر ہوتیں۔ عوام جوق در جوق مجاہدین کے ساتھ شامل ہو رہے تھے۔ اب وہ لوگ بھی مجاہدین کی حمایت کرنے لگے جنہیں روس کے بارے میں کچھ خوش فہمیاں باقی تھیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ روس نے کارمل کو بھی نہیں بخشا اور نجیب جیسے خونی بھیڑیے کو افغانستان پر مسلط کر دیا ہے تو وہ مکمل طور پر مایوس ہو گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ روسی حکام کے ہاں افغانستان کی فلاح اور تعمیر وترقی کا تصور کوئی مطلب نہیں رکھتا۔ وہ اس ملک کو ایک مقتل بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔

نجیب ایک خونی درندہ: اب تک مسلط ہونے والے کمیونسٹ حکمرانوں میں نجیب کی شخصیت سب سے گھناؤنی اور مکروہ تھی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ افغانستان کی بدنام زمانہ خفیہ ایجنسی ''خاد'' کا پہلا سربراہ تھا۔ یہ ایجنسی روس کی ''کے جی بی'' اور بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کے اشتراکِ عمل سے وجود میں آئی تھی۔ انہوں نے نجیب کو اس عہدے پر فائز کرنے سے پہلے اسے بار بار آزمایا۔ ہر آزمائش میں نجیب نے اہل وطن کے خون میں ہاتھ رنگ کر اپنی ''وفاداری'' کا ثبوت فراہم کیا۔ اس کے بعد نجیب ''خاد'' کا سربراہ بن کر افغان عوام پر ایک خون آشام بلا کی طرح مسلط ہو گیا۔

خاد کی ہوش ربا کارروائیاں: ''خاد'' نے افغانوں پر جو ہوشربا مظالم ڈھائے ان کی تفصیل کئی سو صفحات کا تقاضا کرتی ہے۔ سر دست چند جھلکیاں پیش خدمت ہیں:

- ننگرہار کے گاؤں ہشار شاقی کے ایک اسکول ٹیچر کو اغوا کر کے زبردست تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور پھر زخمی حالت میں ایک چھوٹے سے کمرے میں بند کر دیا گیا جو زہریلی مکھیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان مکھیوں کے کاٹنے سے وہ سماعت وبصارت سے محروم ہو گیا۔ پانچ سال تک مسلسل تشدد کے بعد اسے رہا کیا گیا۔ یہ سزا صرف اس لیے دی گئی کہ اس نے اسکول میں کمیونسٹ پارٹی کے کسی

عہدیدار کے بیٹے سے سبق کے بارے میں کوئی سوال پوچھ لیا تھا۔

- کابل یونیورسٹی کے طالب علم محمد آغا کو 1981ء میں گیارہ طلبہ سمیت اغوا کر کے زہریلے دھوئیں سے بھرے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ انہیں بجلی کے جھٹکے دیے گئے۔ برقی ڈنڈوں سے پیٹا گیا۔ چار طلبہ کو زندہ دفن کر دیا گیا۔ باقی تشدد کی تاب نہ لا کر شہید ہو گئے۔ محمد آغا کے مطابق اسے برف میں کئی کئی گھنٹے دبا کر رکھا جاتا اور روزانہ پانچ بار بجلی کے ڈنڈوں سے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ وہ 1987ء میں رہا ہوا۔
- سابق فوجی اسرار الدین کا بیان ہے کہ اسے مجاہدین سے تعلق کے شبہے میں گرفتار کر کے اٹھارہ ماہ تک بدترین ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا۔ اس دوران اسے کئی کئی راتیں مسلسل جگایا گیا۔ بال اُکھاڑے گئے۔ جسم پر اُبلتا ہوا پانی پھینکا گیا۔ چھت سے اُلٹا لٹکا کر گلے میں طوق ڈال دیا گیا۔ ننگا کر کے رات بھر برف باری میں کھڑا رکھا گیا۔
- لوگر کے ایک دوا فروش محمد صدیق کو 1982ء میں گرفتار کیا گیا۔ اسے ایک ایسے کمرے میں قید کر دیا گیا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ ''خاد'' کے ایجنٹ زنبور سے اس کے جسم سے بال نوچتے رہتے۔ برقی ڈنڈوں سے پٹائی اور بجلی کے جھٹکے روز کا معمول تھا۔

سید کی دلخراش داستان: ننگرہار کے ضلع روزات کے ایک اسکول ٹیچر ''سید'' کو 1985ء میں گرفتار کر کے ایک پنجرے میں بند کر دیا گیا۔ اسے برہنہ کر کے اس پر کھولتا ہوا تیل چھڑکا گیا جس سے پورے جسم پر آبلے پڑ گئے۔ اگلے دن ان زخموں پر دوبارہ اُبلتا ہوا تیل ڈالا گیا۔ اس پر اتنا تشدد کیا جاتا کہ وہ بے ہوش ہو جاتا۔ اسے مسلسل بھوکا پیاسا رکھا جاتا اور پانی طلب کرنے پر نمک ملا کڑوا پانی دیا جاتا۔ پھر اس سے ایک کاغذ پر زبردستی دستخط لیے گئے جس پر نا کردہ جرائم کی ایک فہرست درج تھی۔ تین سال کی تشدد آمیز قید کاٹنے کے بعد اسے رہائی ملی۔

اعتبار گل کی کہانی: جلال آباد کا دکاندار اعتبار گل بتاتا ہے: ''خاد کے ایجنٹوں نے میری دکان پر چھاپا مارا۔ کوئی قابل اعتراض چیز نہ ملی مگر وہ مجھے گرفتار کر کے لے گئے۔ دس گھنٹے تک برف کے فرش پر لٹایا گیا۔ جس سے پورا جسم مفلوج ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد بجلی کے شاک دیے گئے۔ ہر شاک پر میں کئی فٹ اوپر اُچھل کر دھڑام سے نیچے گرتا۔ یہ پوری رات بجلی کے جھٹکے سہتے اور برقی لاٹھیوں سے مار کھاتے گزری۔ روز ایک گاڑی آتی اور کئی قیدیوں کو لے جاتی جب وہ آتی تو سب کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور جب جاتی تو باقی رہ جانے والے قیدی سسکیاں لے کر رونے لگتے۔ معلوم ہوا کہ روزانہ کچھ قیدیوں

کو کسی ویرانے میں زندہ دفن کر دیا جاتا ہے۔

بجلی کے جھٹکے اور: فصیح اللہ کابل ایئرپورٹ پر کام کرتا تھا، اسے بھی شک کی بنیاد پر گرفتار کر کے خاد کے عقوبت خانے میں پہنچا دیا۔ وہ بتاتا ہے: ''تفتیشی آفیسر جب اپنے سوالات کے جوابات پانے میں ناکام رہا تو ایک تیز دھار چاقو سے میرے دائیں اور بائیں ہاتھ کا ایک ایک ناخن اکھاڑ دیا۔ وہ روزانہ دو دو ناخن نکالتے گئے۔ ناخنوں کے بعد سر کے بالوں کی باری آتی۔ وہ پلاس سے بال اکھاڑتے گئے حتیٰ کہ ایک بال بھی باقی نہ رہا۔ پھر دانت اکھاڑنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ تین ماہ تک خاد کے تارچر سیل میں عذاب جھیلنے کے بعد مجھے وزارتِ داخلہ کے دفتر لے جایا گیا اور ایک خوبصورت قالین پر کھڑا کر دیا گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ قالین کے نیچے برقی تار بچھے ہیں۔ انہوں نے ایک بٹن دبایا اور بجلی کے جھٹکے نے مجھے چھت پر دے مارا۔ میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو خود کو ایک بستر پر پایا۔ اس بستر میں بھی برقی تار لگے تھے۔ خاد کے ایجنٹ بار بار بجلی آن کر کے مجھے ہولناک جھٹکے دیتے اور میں ہر بار اُچھل کر فرش پر جا گرتا۔

اس کے بعد مجھے وزیر داخلہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے میرے کپڑے اُتروا دیے اور مجھے ایک دروازے کے درمیان اس طرح کھڑا کر دیا کہ میرے اعضائے مخصوصہ دروازے کے دونوں پٹوں کے درمیان آ گئے۔ اب اس نے دروازہ اس زور سے بند کیا کہ میرے اعضائے مخصوص پس کر رہ گئے۔ میں چیختا چلاتا رہا اور وہ لوگ قہقہے لگاتے رہے۔ تین گھنٹے تک میں اسی حالت میں رہا۔ جب دروازہ کھولا گیا تو ہمیشہ کے لیے قوتِ مردمی سے محروم ہو چکا تھا۔ پندرہ دن کے شدید ترین تشدد اور ایک ماہ کی قید تنہائی کے بعد مجھے چھ سال تک عام جیل میں رکھا گیا۔

حراست میں لیے گئے ہر شخص سے لازمی طور پر یہ سوالات کیے جاتے تھے کہ اس کے مجاہدین کے ساتھ کیا روابط ہیں؟ اس کے دوستوں میں کون مجاہد ہے؟ حکومتِ پاکستان سے اس کا کیا تعلق ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

نجیب کے خلاف افغانوں میں جوش و جذبہ: ان مثالوں سے اس جبر و تشدد کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے جس نے ''خاد'' اور اس کے سربراہ ''نجیب'' کو افغانوں کی نظروں میں بے رحمی اور درندگی کی سب سے قابلِ نفرت علامت بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نجیب کے اقتدار نے افغانوں کے جوشِ مزاحمت کو اور بڑھا دیا...... مجاہدین کی صفوں میں وہ لوگ بھی شامل ہو گئے جو ذاتی انتقام اور نفرت و عداوت کی بنا پر نجیب سے لڑنا چاہتے تھے۔ دریائے آمو سے لے کر سرحد پاکستان تک جھڑپوں میں شدت آ گئی۔ معرکوں کی تعداد جو اوسطاً سالانہ 350 تک تھی اب 500 تک پہنچ گئی۔

مجاہدین کے ہتھیار: پاکستان کے راستے مجاہدین کو اسلحے کی ترسیل کامیابی سے جاری تھی۔ صدر ریگن

نے مجاہدین کو اسٹینگر میزائل فراہم کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا، اب اس کے نتائج سامنے آرہے تھے۔ مجاہدین نے بہت جلد اسٹینگر میزائلوں کا استعمال سیکھ لیا تھا۔ اس طیارہ شکن ہتھیار کی خوبی یہ تھی کہ اسے ایک آدمی کاندھے پر رکھ کر فائر کرسکتا تھا۔ اس کے حساس کیمرے اور انفرا ریڈ سینسر نے ہدف متعین کرنا آسان تر کر دیا تھا۔ مجاہدین نے اس ہتھیار کے ذریعے 60 تا 70 فیصد درست نشانے لگائے اور ان گنت طیارے اور ہیلی کاپٹر گرائے۔ صحیح نشانوں کی یہ شرح خود اسٹینگر میزائل بنانے والی کمپنی کے ہدف سے کہیں بڑھ کر تھی۔ مجاہدین کا دوسرا اہم ہتھیار 12 ایم بی توپ تھی جو 8 سے 9 کلومیٹر تک مار کرتی تھی۔ یہ توپیں مجاہدین کو پہلی بار 1984ء میں ملی تھیں۔

7 آر پی جی راکٹ لانچر مجاہدین کا سب سے مقبول ہتھیار تھا۔ جو ٹینکوں، بکتر بند گاڑیوں، ٹرکوں، مورچوں، عمارتوں اور پیدل سپاہیوں سمیت ہر ہدف کو کامیابی سے تباہ کرتا تھا۔ اس کے علاوہ مجاہدین گروپوں کی شکل میں مندرجہ ذیل اقسام کا اسلحہ استعمال کر رہے تھے:

- مارٹر توپ۔ 60MM, 82MM, 107MM
- ریکائل لیس توپ 72MM, 82MM, 122RR
- اینٹی پرسنل اور اینٹی وہیکل بارودی سرنگیں۔
- سام میزائل۔
- بلو پائپ میزائل
- بھاری اسٹین گن 12MM
- زیکو یک...... 14.5MM،Z.KI

انفرادی ہتھیاروں میں کلاشنکوف اور گرینوف سب اسٹین گن کا استعمال عام تھا۔

نجیب کی یک طرفہ جنگ بندی: مجاہدین کی بڑھتی ہوئی کارروائیوں اور اپنی مسلسل ہزیمتوں سے خوفزدہ ہو کر 1987ء کے آغاز میں نجیب نے مجاہدین کو یک طرفہ جنگ بندی کی پیش کش کی اور توقع ظاہر کی کہ مجاہدین بھی مثبت ردِ عمل کا مظاہرہ کریں گے مگر مجاہد رہنماؤں نے اسے ایک دھوکا قرار دیتے ہوئے قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ اس کے باوجود 16 جنوری 1987ء کو نجیب کی طرف سے چھ ماہ کے لیے غیر مشروط طور پر یک طرفہ جنگ بندی کا اعلان کر دیا گیا۔ اس اقدام کو ''آشتی ملی'' (قومی مصالحت) کا نام دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی نجیب نے کمیونسٹ حکومت کے سابقہ رویے کے برعکس مجاہدین کو ''اشرار'' کے بجائے ''روٹھے ہوئے بھائی'' کہہ کر مخاطب کرنا شروع کر دیا۔

مجاہدین کا ردِ عمل: مجاہد رہنما جانتے تھے کہ نجیب افغانستان میں کمیونزم اور اس کے حامیوں کی ناکامی کا یقین کرنے کے بعد اپنا اقتدار بچانے کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ اس لیے وہ اس فریب سے قطعاً متاثر نہ ہوئے۔ 16 جنوری 1987ء کو جنگ بندی کے اعلان کے چند گھنٹوں بعد ہی مجاہدین کی طرف سے زبردست کارروائیوں کا آغاز ہو گیا۔ ڈاکٹر نجیب نے بار بار اعلان کیا کہ مجاہدین نے جنگ بند نہ کی تو پہلے سے بڑھ کر خونریزی ہوگی مگر اس کی گیدڑ بھبکیوں کا کوئی اثر ہونا تھا نہ ہوا۔

گھمسان کی لڑائیاں: حقیقت یہ ہے کہ نجیب اور روسی افسران اس نام نہاد جنگ بندی سے صرف سنبھلنے کا وقت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کے عزائم کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ "قومی مصالحت" کے اعلان کے صرف 21 روز بعد کابل سے افغان روسی افواج کا ایک بہت بڑا کانوائے قندھار روانہ ہوا جس نے قندھار اور جنوبی علاقوں کی لڑائیوں میں بھرپور شرکت کی۔ جنوری 1987ء کے اواخر اور فروری کے اوائل میں قندھار خونریز جھڑپوں کا مرکز رہا۔ 31 جنوری کو مجاہدین نے ایک بڑے حملے میں قندھار کے اسلحہ ڈپو کو تباہ کر دیا جس میں 11 روسی ہلاک ہو گئے۔ اس دوران کابل سے چلنے والا کانوائے بھی آن پہنچا تھا اور مجاہدین پورے ولولے سے اس کا مقابلہ کر رہے تھے۔ 11 فروری کو آنے والی خبروں کے مطابق گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔ 50 روسی فوجی ہلاک اور 15 مجاہدین شہید ہو چکے تھے۔ روسیوں کا یہ حملہ بھی ناکام ہوا اور میدان مجاہدین کے ہاتھ رہا۔ فروری کے اواخر میں آنے والی ایک رپورٹ کے مطابق نام نہاد جنگ بندی کے اعلان کے بعد صرف 40 دن میں 1400 روسی اور افغان سپاہی ہلاک ہو چکے تھے۔ مطلب یہ کہ نجیب کا جنگ بندی کا ڈرامہ مکمل طور پر ناکام ہو چکا تھا۔

مجاہدین کے طوفانی حملے: مارچ 1987ء میں مجاہدین نے قندھار ائیرپورٹ پر ایک بڑا حملہ کیا جس میں روس کے 14 طیارے اور ہیلی کاپٹر تباہ ہو گئے۔ اپریل کے اواخر میں نجیب اللہ نے اعتراف کر لیا کہ اس کا یک طرفہ اعلان جنگ بندی ناکام ہو گیا ہے۔ ان دنوں شمالی اور مغربی صوبوں میں بھی مجاہدین بڑھ چڑھ کر حملے کر رہے تھے۔ 9 مئی کو مجاہدین نے ہرات کے جنوب میں 4 فوجی چوکیوں پر قبضہ کر لیا۔ 19 مئی کو بلخ میں دو بمبار طیارے اور ایک جاسوس طیارہ مار گرایا گیا۔ 21 جولائی کو کابل کے قریب 3 ہیلی کاپٹر تباہ کر دیے گئے۔ ماہ جون میں ارغنداب اور ڈنڈ کا علاقہ میدانِ جنگ بنا رہا۔ مجاہدین نے ایک طویل جنگ کے بعد سینکڑوں روسی سپاہیوں کو ہلاک کر کے دشمن کو پسپا کر دیا۔ ادھر گردیز میں لڑنے والے روسیوں کی مدد کے لیے کابل سے ایک تازہ دم لشکر روانہ ہوا۔ مگر راستے میں مجاہدین نے اسے روک لیا۔ شدید مقابلے کے بعد یہ امدادی فوج نہایت ابتر حالت میں بھاگ کھڑی ہوئی۔ یہ 24

جون 1987ء کا واقعہ ہے۔ مجاہدین نے 27 جون کو ننگرہار میں روسیوں کی اہم چوکیوں پر قبضہ کرلیا اور اسی دن لوگر میں روسی افواج کا محاصرہ توڑ دیا۔ 29 جون کو ہرات کے نواح میں اس کے ایک اڈے کو تباہ کر کے 150 فوجیوں کو ہلاک کر دیا۔ اسی روز پکتیا میں اسلحہ و گولہ بارود کا بہت بڑا ذخیرہ مجاہدین کے ہاتھ آگیا۔ 30 جون کو مجاہدین نے فراہ میں 45 روسی و افغان سپاہیوں کو ہلاک کر دیا۔ اسی دن اطلاع ملی کہ شمال میں بدخشاں کا قصبہ شہر بزرگ روسیوں کے قبضے سے آزاد کرا لیا گیا ہے۔ اسی دن سوویت حکام کا بیان شائع ہوا کہ ہم افغانستان میں اپنی فضائیہ کا مزید نقصان برداشت نہیں کریں گے۔ دنیا نے اس بیان کو روس کی جانب سے اعترافِ شکست کے مترادف سمجھا۔

دیہی طبقے کا جہاد میں حصہ: چند دنوں کی ان کامیاب کارروائیوں سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں اس سال مجاہدین کس قدر تیز رفتاری سے فتح مبین کی منزل کی طرف سفر کر رہے تھے۔ قوتِ ایمانی، اخلاص، جرأت و استقامت اور حب الوطنی کے علاوہ مجاہدین کی کامیابیوں کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ مقامی آبادی خصوصاً دیہی طبقے کی اکثریت ان کے ساتھ تھی۔ سینکڑوں دیہات ایسے تھے جہاں کے سو فیصد مرد کلی یا جزوی طور پر جہاد میں حصہ لیتے تھے۔ مقامی آبادی کا تعاون گوریلا جنگ کی کامیابی کی شرطِ اول تصور کیا جاتا ہے۔ مجاہدین کو یہ تعاون پوری طرح حاصل تھا کیونکہ یہ جنگ تمام افغان عوام کی جنگ تھی۔

مجاہدین کے خفیہ ایجنٹ: مجاہدین کی جنگیں صرف میدانوں اور پہاڑوں میں نہیں لڑی جارہی تھیں بلکہ شہروں میں بھی ان کے کارندے پھیلے ہوئے تھے۔ ان کا اپنا جاسوسی نظام بھی تھا جس کے ذریعے وہ دشمن کے عزائم سے باخبر رہتے تھے۔ ان کے جاسوس ڈرائیوروں، خاکروبوں، چرواہوں، بھکاریوں اور خوانچہ فروشوں کی شکل میں دیہاتوں سے لے کر کابل کی سرکاری عمارتوں کے آس پاس منڈلاتے رہتے تھے۔ ان میں سے بعض جاسوس جدید ترین حساس آلات سے لیس ہوتے تھے اور محیر العقول معلومات حاصل کر کے اپنی قیادت کو پہنچاتے رہتے تھے۔

رحمت خان کی داستان: رحمت خان ایک ایسا ہی مردِ مجاہد تھا جس نے اندھے فقیر کا بھیس بدل کر آٹھ سال تک مجاہدین کے لیے روسیوں کی جاسوسی کی۔ وہ کابل کے فوجی ہیڈ کوارٹر کے سامنے سڑک پر بھیک مانگا کرتا تھا۔ اس کی جیب میں ایک ننھا سا خودکار کیمرہ ہوا کرتا تھا جو ایک سیکنڈ میں بارہ تصاویر اُتار سکتا تھا۔ مجاہدین کے چند کمانڈروں کے سوا کوئی بھی رحمت خان کی اصلیت سے واقف نہیں تھا۔ رحمت خان کی جانب سے دی گئی معلومات اور تصویروں پر مبنی ٹھوس شواہد کے ذریعے مجاہد رہنما یہ جان لیتے تھے کہ کون لوگ روسیوں سے ملاقاتیں کر رہے ہیں اور کون سے غدار مجاہدین میں شامل ہو کر کابل ہیڈ کوارٹرز

سے رابطہ قائم کیے ہوئے ہیں۔ چنانچہ روسیوں کے ایسے وفاداروں کو نگاہ میں رکھا جاتا اور مزید ثبوت حاصل کرنے کے بعد انہیں ہلاک کر دیا جاتا۔ کئی برس بعد آخر ایک روسی افسر کو رحمت خان پر شک ہو گیا۔ اس نے اس کا تعاقب کیا اور کابل میں واقع اس کے خفیہ ٹھکانے پر چھاپہ مارا۔ وہاں ایک مجاہد تنظیم کے چند کارکن بھی موجود تھے۔ انہیں شہید کر دیا گیا۔ تلاشی لینے پر وہاں سے ایک فائل برآمد ہوئی جس میں افغانستان کے ایسے اڑھائی ہزار باشندوں کے کوائف موجود تھے جو روسیوں کے لیے کام کر رہے تھے۔ کمال یہ تھا کہ ہر ایک کی ایسی تصویر بھی چسپاں تھی جس میں وہ روسی افسران سے ملاقات کر رہا تھا۔ اس کے بعد رحمت خان کو فوجی ہیڈ کوارٹر کے سامنے سے بھیک مانگتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا۔ جبر وتشدد کا ہر حربہ آزمانے کے باوجود روسی افسران اس سے کچھ نہ اگلوا سکے۔ آخر کار اسے شہید کر دیا گیا۔ بہر حال افغانستان میں مجاہدین کے ایسے سرفروش جاسوس ختم نہ کیے جا سکے جو دشمنوں کی صفوں میں گھس کر ایک اعصاب شکن جنگ لڑ رہے تھے۔ ایسے جاسوسوں کی اطلاعات پر ہی مجاہدین نے 28 فروری 1987ء کو تخار میں ''خاد'' کے چار کارندوں کو گرفتار کیا تھا۔ جنہیں مجاہدین کی شرعی عدالت نے فوری سماعت کے بعد پھانسی کی سزا سنا دی تھی۔ ان جاسوسوں کی مستعدی کا یہ عالم تھا کہ وزرا، گورنر اور ان کے رشتہ دار تک ان کی نظروں میں رہتے تھے۔ چنانچہ مجاہدین ایسے لوگوں کو خاص طور پر حملوں کا نشانہ بناتے اور عموماً کامیاب رہتے۔ 2 جون 1987ء کو مجاہدین نے قندھار کے گورنر کے بھائی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ 7 جون کو اس خبر نے ذرائع ابلاغ میں ہل چل مچا دی کہ مجاہدین نے پکتیا کے گورنر کو اس کے چھ محافظوں سمیت قتل کر دیا ہے۔

نجیب کی طرف سے مجاہدین کو شراکت اقتدار کی دعوت: ادھر نجیب نے دنیا کو دھوکا دینے کے لیے جنگ بندی کی مدت میں 18 اگست 1987ء تک توسیع کا اعلان کیا اور بزعمِ خود ''سفیر امن وآشتی'' بننے کی کوشش کی مگر بے سود۔ جب یہ مدت اختتام پذیر ہوئی تو نجیب نے ایک اور چال چلی۔ اس نے مجاہدین کو شراکتِ اقتدار کی دعوت دے ڈالی۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ وزارتِ خارجہ اور وزارتِ دفاع کو مستثنیٰ کر کے، صدر اور نائب وزیر اعظم سمیت 26 وزارتوں کے عہدے مجاہد رہنماؤں کے سپرد کرنے کے لیے آمادہ ہے۔ نجیب یہ سب کچھ روس کے کہنے پر کر رہا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ کسی طرح میدانِ جنگ میں ہزیمتوں کے رسوا کن مناظر کا اختتام ہو اور مجاہدین عہدوں کی چھینا جھپٹی میں مصروف ہو کر منتشر ہو جائیں۔ مگر مجاہدین نے عواقب کا اندازہ کر کے اسے بھی مسترد کر دیا اور روسی افواج کے مکمل انخلا اور کٹھ پتلی کابل انتظامیہ کے خاتمے تک جہاد جاری رکھنے کا اعلان کیا۔

نجیب اور مولانا جلال الدین حقانی کی مکاتبت: نجیب نے صلح کے اعلان کے دوران خط و کتابت کے ذریعے مجاہد لیڈروں کو الگ الگ منانے کی بھی کوشش کی تھی۔ اس نے مولانا جلال الدین حقانی کے نام اپنے خط میں لکھا:

''جاری جنگ میں ہماری اور آپ کی جانب سے بے گناہ مسلمان مارے جا رہے ہیں۔ پشتونوں اور افغانوں کے گاؤں اور مکانات تباہ ہو رہے ہیں، ہمارے وطن کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ وطن اور قوم کی بربادی کو روکنے کے لیے ہم اپنی پارٹی کی جانب سے صلح کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ ہماری انقلابی حکومت العیاذ باللہ لادینی نہیں، وہ اسلام کے مقدس نام کو بے اعتبار کرنے اور نظروں سے گرانے کا کوئی پروگرام نہیں رکھتی۔ آئین کی دوسری شق کے مطابق اسلام کا بحیثیت دین احترام کرنا سب پر واجب ہے۔ روسی افواج کے محدود فوجی دستے جب بھی صلح کے امکانات روشن دیکھیں گے تو ہم سے صلاح و مشورے کے بعد واپس چلے جائیں گے۔ روسی دستے افغانستان میں غیر ملکی مداخلت ختم کرنے آئے ہیں تاکہ افغانستان جلد ہی ایک مستقل اور آزاد غیر جانب دار مملکت بن جائے۔ ہم آپ کو آپ کی شخصی حیثیت اور عزت برقرار رکھنے کا مکمل یقین دلاتے ہیں اور عزم کرتے ہیں کہ ایک خوشحال، پاک، تقویٰ کی حامل اسلامی مملکت تشکیل دیں گے۔''

مولانا جلال الدین حقانی نے اس خط کا مندرجہ ذیل دندان شکن جواب دیا۔

''آپ ایک طویل مدت سے کمیونزم، سوشلزم اور الحاد و دہریت کے وکیل بنے ہوئے ہیں، ان کوششوں کے نتیجے میں افغانستان کی امت اور مجاہدین کی بڑی تعداد اپنے جگر گوشوں، بھائیوں اور والدین سے محروم ہو چکی ہے۔ دس لاکھ سے زائد مسلمان آپ کی ''برکات'' سے فیضیاب ہو کر روسیوں کے ہاتھوں قتل ہو چکے ہیں، جبکہ پچاس لاکھ سے زائد پردیس میں جلاوطنی کی زندگی کاٹ رہے ہیں۔ یہ بات تو ہم بھی سمجھتے ہیں کہ جس دن افغانستان میں سرخ استعمار کی حامی حکومت مستحکم ہو جائے گی، اسی دن روسی لوٹ جائیں گے، انہیں اس کے سوا اور چاہیے بھی کیا؟ یہاں تو وہ سخت پریشانی کے عالم میں شب و روز کاٹ رہے ہیں۔

مجھے تعجب ہے کہ آپ نے تو اپنے اختیار کردہ راستے پر پورے غور و فکر سے قدم دھرا اور اشترا کی عقیدہ اختیار کیا ہوگا۔ پھر آپ نے آخر کیسے نام نہاد آئین کی دوسری شق میں اسلام کی بحیثیت دین تضمین پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اور کیا محض اس شق کی بدولت روسیوں کے مظالم، ستم، وحشت اور کئے دھرے سے نظریں پھیرنا ممکن ہے۔ پشتو کی مثال ہے کہ سورج کو دو انگلیوں سے نہیں

چھپایا جاسکتا۔ یہ کوئی خواب نہیں جیتی جاگتی حقیقت ہے کہ روسی افغانستان میں کس لیے آئے ہیں۔
کیا آپ کو گزشتہ آٹھ برس کے دوران خود اپنے بزرگوں اور کمیونزم کے استادوں کے ساتھ بیتی ہوئی داستان یاد نہیں۔ نور محمد ترہ کئی نے بھی قومی مصالحت کا اعلان کیا تھا۔ پھر وہ اپنے انجام کو پہنچا تو نئے آنے والے امین نے بھی قومی مصالحت کے اعلان میں عافیت جانی۔ لیکن اسے مہلت مل نہ پائی، جلد ہی قصر دارالامان میں روسیوں کی مرضی سے امین کے جسم کا گوشت اور ہڈیاں خاک میں ملا دی گئیں۔ پھر کارمل نے آشتی ملی کے اعلان کے ساتھ بعض دکھاوے کی مذہبی رسومات کا اجراء کیا اور قیدیوں کو رہائی دینے کا اعلان بھی کیا۔ جونہی کارمل کو پل چرخی جیل کے تاریک زندان میں دھکیلا گیا تو آپ نے اپنے بزرگوں کے اتباع میں وہی راگ الاپنا شروع کر دیا۔ اب آپ کی باری ہے۔ جلد ہی آپ کو اپنے دوست روسیوں کی مدد سے جیل یا موت میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ اگر آپ سنجیدگی سے اسلام، وطن اور ملت کی خدمت کے خواہش مند ہیں تو درج ذیل شرائط قبول کیجیے۔
خود کو ملت افغان اور اسلام کے علمبرداروں کے حوالے کر دیجیے۔ روسیوں کو غیر مشروط انخلاء پر مجبور کیجیے۔ اپنے ہاں موجود مرتد عناصر اور کمیونزم کے فلسفے پر یقین رکھنے والوں کو قتل کر دیجیے۔ خوست، گردیز، ارگون جیسے کسی اہم علاقے کو مرکز قرار دے کر وہاں فوجی کارروائی بند کر دیجیے۔ جونہی آپ کی طرف سے یہ اقدامات کیے جائیں گے ہم آپ سے گفتگو اور ملنے پر غور کریں گے۔"

نجیب اللہ کو اس قدر دندان شکن جواب کی توقع نہیں تھی۔ اس نے کچھ دنوں تک غور و فکر کے بعد اگلا خط روانہ کیا جس میں یہ تاثر دیا کہ اسے مولانا حقانی سے خاص تعلق ہے اور وہ انہیں بہت کچھ دینے کے لیے تیار ہے۔ چونکہ کمیونسٹ انقلابی ایک مدت سے مولانا حقانی کے قتل کا حکم جاری کر چکے تھے اس لیے نجیب نے اظہارِ دوستی کے لیے ساتھ ہی ایک سرکاری معافی نامہ بھی ارسال کیا جس میں یہ تحریر تھا کہ جلال الدین حقانی ولد فتح خان ساکن زوزان کے قتل کا حکم منسوخ کر کے انہیں معافی دی جاتی ہے۔ یہ خط 6 دسمبر 1987ء کو تحریر کیا گیا تھا، اس کا خلاصہ یہ تھا:
"میں نے آپ کے سوا کسی سے قلبی تعلقات نہیں رکھے، میں نے وطن، اسلام اور غیرت کی خاطر آپ کو معافی نامہ ارسال کیا ہے۔ اب ہمارے وطن میں بھڑکتے شعلوں کو بجھ جانا چاہیے۔ اس لیے ہمارا اور آپ کا ملنا نہایت ضروری ہے۔ آپ جو کچھ چاہتے ہیں میں آپ کو دینے پر تیار ہوں۔

ہم آپ کی اور زوزان کی پگڑیاں نیچی نہیں کرنا چاہتے۔ اگر آپ ملنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں تو میں ملاقات سے قبل اپنے بیس اہم وزراء اور عہدے دار آپ کے پاس بطور یرغمال چھوڑنے کو تیار ہوں۔ ہم یہ مسئلہ گفتگو سے حل کرنا چاہتے ہیں۔ اب حالات کے بگڑنے اور زوزان کے علاقے کی بیواؤں اور یتیموں کی ذمہ داری میرے بجائے آپ کے کندھے پر ہے۔ جن قیدیوں کو آپ رہا کرانا چاہتے ہیں ان کے کوائف روانہ کر دیں، میں سب کو رہا کرا دوں گا۔"

مولانا حقانی نے اس بار بھی ایمانی غیرت اور مومنانہ استقلال کا مظاہرہ کیا اور نجیب کی دسیسہ کاریوں کا منہ توڑ جواب دیتے ہوئے لکھا:

"آپ کا معافی نامہ میرے لیے کوئی قیمت نہیں رکھتا، یہ اسلام اور وطن کے سامنے ہیچ ہے، کیونکہ راہِ اسلام میں شہادت میرے لیے وجہِ افتخار ہے۔ روسی استعمار کے زیرِ سایہ رہنا خواہ کتنا ہی مقتدر اور مادی سہولیات سے لبریز ہو میرے لیے دنیا و آخرت میں طوقِ لعنت اور بے عزتی ہے۔ آپ نے تحریر کیا ہے کہ وطن میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کو ٹھنڈا ہو جانا چاہیے۔ یہ اچھی بات ہے لیکن کیا آپ نہیں جانتے کہ لہو کا یہ سیلاب روسیوں کے جلو میں آنے والے کمیونزم کے مظالم کے سبب بہنا شروع ہوا ہے۔ اگر آپ اتنی قوت اور صلاحیت رکھتے ہیں کہ کمیونزم کا خاتمہ کر سکیں تو پھر لہو کے یہ شعلے دھیمے پڑ سکتے ہیں۔

آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ آپ زوزان کی پگڑیاں نیچی نہیں کرنا چاہتے۔ حالانکہ کتنی مرتبہ روسی طیاروں کی ہوائی اور توپ خانے کی زمینی بمباری سے سینکڑوں بے گناہ معصوم بچوں، بیواؤں اور یتیموں کو اپنے ہی تباہ شدہ ملبے تلے کچل دیا گیا۔ اب زوزان کی پگڑیاں مزید کس حوالے سے بلند کرنا چاہتے ہیں۔ زوزان کی عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کرنے کی ذمہ داری آپ کی گردن پر ہے۔

قیدیوں کے بارے میں اتنا لکھ سکتا ہوں کہ اسلام کے نام پر گرفتار ہونے والے تمام افغانستان کے قیدی ہمارے بھائی ہیں اور اگر آپ کی مراد خاص پکتیا یا زوزان سے تعلق رکھنے والے قیدی ہیں تو صرف ان کی رہائی کی کوئی ضرورت نہیں۔ انہیں گرفتار ہی رکھیے۔"

مولانا حقانی کے دوٹوک جوابات نے نجیب کی چالاکی اور چرب زبانی پر خاک ڈال دی اور اسے دوبارہ کچھ لکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

فتح قریب تر: جوں جوں سال 1987ء اختتام کی جانب سرک رہا تھا، مجاہدین کی فتح مندی کے آثار واضح تر ہوتے جا رہے تھے۔ گلبدین حکمت یار، احمد شاہ مسعود، مولوی محمد یونس خالص، برہان الدین

ربانی، مولوی محمد نبی محمدی، صبغت اللہ مجددی، پروفیسر سیاف اور دیگر مجاہد رہنماؤں کے بیانات اخبارات کی شہ سرخیوں کی زینت بننے لگے تھے۔ سات جماعتی اتحاد اب خاصا مضبوط ہوگیا تھا۔ مجاہد رہنما اب فتح یابی کی منزل کے بعد حکومت سازی کے مراحل کو قریب آتا دیکھ رہے تھے۔ حزب اسلامی کے سربراہ گلبدین حکمت یار اعلان کر رہے تھے کہ افغانستان میں عبوری حکومت کے لیے جلد انتخابات منعقد کیے جائیں گے۔

جنیوا مذاکرات فیصلہ کن مرحلے میں: مجاہدین کے اس استقلال کا نتیجہ نکلا کہ فروری 1982ء سے شروع ہونے والے جنیوا مذاکرات فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہونے لگے۔ روس، امریکا، پاکستان اور افغانستان کے نمایندے ساڑھے پانچ سال سے ان مذاکرات میں شریک تھے۔ روس نے اس سال انخلا پر پوری طرح آمادگی ظاہر کی مگر وہ واپسی کے لیے چار سال کی مہلت طلب کر رہا تھا۔ جبکہ حکومت پاکستان جلد از جلد انخلا پر زور دے رہی تھی۔

امریکی وزیر دفاع کا کہنا تو یہ تھا کہ جس طرح سوویت یونین نے دو ہفتے کے اندر ایک لاکھ بیس ہزار سپاہی داخل کیے تھے، اس طرح وہ دو ہفتے کے اندر انہیں واپس بھی لے جا سکتا ہے۔

1987ء کے جنگی اعداد و شمار: 1987ء میں مجاہدین اور روسی و افغان افواج میں کل 4776 معرکے ہوئے۔ روسی افواج نے مجاہدین پر 1692 حملے کیے جبکہ مجاہدین نے 2983 بار حملے کیے۔ ان معرکوں میں روس کے 272 ہیلی کاپٹرز اور 246 جنگی طیارے تباہ ہوئے جن کا مجموعہ 518 بنتا ہے۔ یاد رہے کہ اس سے قبل 1980ء سے 1986ء کے اواخر تک مجموعی طور پر چھ سو کے لگ بھگ ہیلی کاپٹر اور طیارے تباہ کیے جا چکے تھے۔

مجاہدین نے 1987ء میں 3746 روسی اور 6573 افغان سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ نیز 7535 ایسے سپاہی قتل کیے جن کے روسی یا افغان ہونے کی شناخت نہیں ہو سکی۔ مجموعی طور پر وہ حریف کے 18057 افراد کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئے جبکہ ان کے اپنے 2857 افراد شہید ہوئے۔ یہ تعداد حریف کی نسبت چھٹا حصہ ہے۔ اس سے مجاہدین کی جنگی مہارت، حوصلہ مندی اور ان کے ساتھ نصرتِ خداوندی کی شمولیت کا یقین ہو جاتا ہے۔

پاکستان میں مہاجرین افغانستان: 1987ء میں افغانستان کے کوہسار حملہ آور سرخ افواج کو مکمل شکست سے دوچار ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے اور مستقبل کے اُفق پر سپیدہ نمودار ہونے لگا تھا لیکن ادھر پاکستان کئی نئے مسائل سے دوچار ہو رہا تھا۔ روس کے ایجنٹ بڑی کامیابی سے یہ پرچار کر رہے تھے کہ

پاکستان کے نئے مسائل کی جڑ افغان مہاجرین ہیں۔ 306 وسیع خیمہ بستیوں کے علاوہ پاکستان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے یہ تیس لاکھ مہاجرین اب پاکستان کی آبادی کا حصہ بننے لگے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں کچھ مسائل تو واقعی ان کے بعض گروہوں کی وجہ سے پیدا ہو رہے تھے مگر بعض مسائل ان پر تھوپے بھی جا رہے تھے۔

اصل میں مہاجرین کے حالات، مسائل، ضروریات اور ان کی وجہ سے پیدا شدہ اُلجھنیں ہر جگہ یکساں نہیں تھیں۔ یہ مہاجرین کئی قسم کے تھے۔ ایک قسم مالدار اور بارسوخ خاندانوں کی تھی۔ یہ لوگ خاندانی جاگیردار، رئیس اور جاہ واقتدار کے مالک تھے۔ ان کی تعداد چند فی صد سے زائد نہیں تھی۔ بیرون ممالک میں بھی ان کے سرمایے کے ذخائر اور جائیدادیں تھیں۔ انہوں نے پاکستان میں کوٹھیاں خرید لیں اور آرام سے رہنے لگے۔ کچھ مدت بعد ان میں سے کچھ لوگ بھارت جا کر بمبئی یا دہلی میں بس گئے۔ بہت سے مغربی ممالک میں جا آباد ہوئے۔ ان میں سے زیادہ تر ماڈرن، لبرل یا بے دین تھے۔

دوسری قسم اعلیٰ سرکاری ملازمین، افسران اور تعلیم یافتہ افراد کی تھی۔ ان میں سے اساتذہ وانجینئر، ڈاکٹر پروفیسر اور سائنس دان وغیرہ شامل تھے۔ ان کے جانے سے افغانستان کا ہر شعبہ بری طرح متاثر ہوا۔ ان میں آزاد خیال، قدامت پسند، دھریے اور اسلام پسند سب ملے جلے تھے۔ تناسب کے لحاظ سے یہ بھی چند فیصد تھے۔ تیسری قسم ان متوسط سرمایہ داروں کی تھی جو اپنی جمع پونجی سمیٹ کر پاکستان آگئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر ٹرانسپورٹ یا ہوٹل سازی کے شعبے سے وابستہ تھے۔ ٹرانسپورٹروں کے پاس مال برداری کی گاڑیاں ٹرک وغیرہ پہلے سے موجود تھے جنہیں یہ ساتھ لے آئے تھے یا پاکستان آکر نئی گاڑیاں خرید لی تھیں۔ یہ پاکستان کی ٹرانسپورٹ لائن میں کھپ گئے تھے۔ ہوٹل چلانے والوں نے پاکستان میں بھی شاہراہوں پر ہوٹل بنا لیے۔

چوتھی قسم خانہ بدوشوں اور گلہ بانوں کی تھی۔ یہ ہزاروں کی تعداد میں تھے جو اپنے مال مویشی سمیت آتے تھے اور چراگاہوں کی تلاش میں علاقے تبدیل کرتے رہتے تھے اسی لیے ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ یہ خود کفالتی اور جفاکشی کی زندگی گزار رہے تھے اور پاکستان کے لیے کسی مسئلے کا باعث نہیں تھے۔ پانچویں قسم ان شہری اور دیہی افراد کی تھی جو اپنا سب کچھ لٹا کر پاکستان آئے تھے اور مہاجر کیمپوں میں آبسے تھے۔ ان کی تمام کفالت حکومت پاکستان سرکاری خزانے اور امدادی رقوم سے کر رہی تھی۔ 30/لاکھ مہاجرین میں اس قسم کے افراد کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔

جنرل ضیاء الحق نے ملکی خزانے کو ناقابل تحمل بوجھ سے بچانے کے لیے انہیں اجازت دے دی تھی کہ

وہ کام کاج کر کے خود اپنا اور اپنے اہل وعیال کا پیٹ پال سکتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے بہت سے لوگ محنت مزدوری یا چھوٹے موٹے کاروبار کے لیے کراچی، راولپنڈی، پشاور اور کوئٹہ جیسے بڑے شہروں میں آجاتے تھے۔ اس طرح خیمہ بستیوں میں رش اور سرکاری خزانے پر دباؤ میں کچھ تخفیف ہو جاتی تھی۔ مگر اس آزادی کی وجہ سے مہاجرین کے روپ میں تخریب کاروں کا ایک ریلا پاکستان میں پھیل گیا جس نے ضیاء الحق کی حکومت اور پاکستان کو شدید نقصان سے دوچار کیا۔

پاکستان تخریب کاری کی زد میں: تخریب کاری کا ہوش ربا سلسلہ 1986ء میں شروع ہو چکا تھا۔ مگر 1987ء میں یہ نہایت شدت اختیار کر گیا۔ کابل انتظامیہ اور خاد نے روسی افسران کے تعاون سے افغانستان میں کئی تربیتی کیمپ قائم کر دیے تھے جہاں ہزاروں تخریب کاروں کو تربیت دی جا رہی تھی۔ یہ تخریب کار مہاجرین کے بھیس میں آسانی سے سرحدیں عبور کر جاتے تھے۔ ان کی تباہ کاریوں نے پاکستان کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان دہشت گردانہ واقعات کی ایک جھلک دیکھیے۔

یکم فروری 1987ء: دو بم دھماکوں سے کوئٹہ کو قدرتی گیس فراہم کرنے والی پائپ لائن تباہ ہو گئی۔ کوئٹہ سے 80 کلو میٹر دور قلعہ عبداللہ کے قریب ریلوے لائن کو دھماکے سے اُڑا دیا گیا۔

- 8 فروری...... پشاور کے ایک بھرے بازار میں پارسل بم دھماکے سے تین افراد جاں بحق اور 26 زخمی ہو گئے۔
- 14 فروری...... بنوں میں ایک مسافر بس بم دھماکے سے تباہ ہو گئی۔ ایک بچے سمیت تین مسافر جاں بحق اور تین شدید زخمی ہو گئے۔
- 19 فروری...... پشاور میں ایک اسکول کے سامنے سڑک میں ہولناک بم دھماکا ہوا۔ جس سے تیرہ بچے اور راہ گیر جاں بحق جبکہ 50 سے زائد زخمی ہوئے۔ یہ حادثہ اتنا الم ناک تھا کہ پشاور کے شہری سراپا احتجاج بن گئے۔ بعض سازشی عناصر یہ پروپیگنڈا کر رہے تھے کہ تخریب کاری میں تمام مہاجرین اور مجاہدین ملوث ہیں۔ دوسرا پروپیگنڈا یہ تھا کہ تخریب کاری تو روس کروا رہا ہے مگر اس کی وجہ پاکستان کا مہاجرین کو پناہ دینا تھا۔ گویا گھوم پھر کر ذمہ داری مہاجرین پر عائد ہوتی ہے یا حکومت پاکستان پر۔ چنانچہ ان پروپیگنڈوں سے متاثر افراد نے احتجاج کا رُخ مہاجرین اور مجاہدین کی طرف پھیر دیا۔
- 21 فروری...... شہریوں کے ایک مشتعل گروہ نے پشاور میں قائم مجاہد تنظیموں کے دفاتر پر حملہ بول دیا۔ اگر انتظامیہ آڑے نہ آتی تو یقیناً خون خرابا ہو جاتا۔

- 14 مئی...... پشاور کے مرکز میں اڈے میں پارسل بم دھماکا ہوا، چار مسافر جاں بحق اور 40 کے قریب زخمی ہوئے۔

2 جون کو راولپنڈی کی ایک مارکیٹ میں ایسے ہی ایک دھماکے سے 27 / افراد زخمی ہو گئے۔ اگلے ہی روز پشاور میں بم دھماکے سے دو افراد جاں بحق اور 24 زخمی ہو گئے۔

- 7 / اگست...... پشاور میں جی ٹی روڈ پر ایک دکان میں بم دھماکا ہوا۔ اندر موجود تمام افراد ختم ہو گئے۔ دکان ملبے کا ڈھیر بن گئی۔ آس پاس موجود 34 افراد زخمی ہوئے۔
- 11 / اگست...... مردان شہر میں تین دھماکوں میں 18 / افراد لقمہ اجل بن گئے۔
- 7 / ستمبر...... پشاور میں پھر دھماکا ہوا۔ دس جاں بحق اور 6 زخمی ہو گئے۔
- 12 / ستمبر...... پاراچنار میں بارودی سرنگ پھٹنے سے پانچ افراد جاں بحق ہو گئے۔

تخریب کاری کا یہ ہولناک سلسلہ پورے سال جاری رہا۔ سرحدی شہروں کے بعد پنجاب بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔

- 19 / ستمبر...... راولپنڈی کے پیرودھائی اڈے پر بم دھماکا ہوا۔ 4 / افراد جاں بحق اور 12 شدید زخمی ہو گئے۔

کراچی بھی تخریب کاروں کی یلغار کا شکار رہا۔ 15 / جولائی کو یہاں ایمپریس مارکیٹ اور بوہری بازار میں 4 ہولناک بم دھماکے ہوئے جن میں 72 افراد جاں بحق اور اڑھائی سو زخمی ہوئے۔ شہر میں آگ سی لگ گئی۔ یہاں پہلے سے پٹھان مہاجر منافرت کی فضا موجود تھی۔ اس حادثے سے پٹھانوں اور افغانوں کے خلاف مزید اشتعال پھیل گیا۔

اوجڑی کیمپ کا جگر دوز سانحہ: مجموعی طور پر 1987ء کے دوران پاکستان کے چھوٹے بڑے شہروں میں تخریب کاری کے 259 واقعات پیش آئے جن میں 264 قیمتی جانیں تلف ہوئیں اور 1069 / افراد زخمی ہوئے۔

تخریب کاری کے واقعات کی یہ جھلک دکھانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ قارئین افغان مسئلے کے بارے میں ضیاء الحق حکومت پر پڑنے والے دباؤ کا اندازہ لگا سکیں۔

تخریب کاری کے اس سلسلے کا سب سے روح فرسا سانحہ 10 اپریل 1988ء کو راولپنڈی میں پیش آیا۔ یہاں شہری آبادی میں واقع قدیم اسلحہ ڈپو 'اوجڑی کیمپ' اچانک شعلے اُگلنے لگا۔ یہاں ذخیرہ کیے گئے ہزاروں راکٹ اور میزائل لرزہ خیز دھماکوں کے ساتھ چلنے اور پھٹنے لگے۔ لگتا تھا اسلام آباد اور

راولپنڈی پر کسی دشمن فوج نے حملہ کر دیا ہے۔ اس سانحے میں 100 سے زائد شہری جاں بحق اور ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ زخمی ہوئے جبکہ چار پانچ ہزار مکانات مکمل یا جزوی طور پر تباہ ہوئے۔ ان دنوں اوجڑی کیمپ افغان مجاہدین کے لیے امریکی اسلحے کی تازہ ترین کھیپ سے بھرا ہوا تھا۔ اس حادثے سے بیشتر اسلحہ تباہ ہو گیا۔ پاک فوج کے افسران اور جوانوں خصوصاً میجر جنرل جاوید ناصر نے اس موقع پر بے پناہ ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جان ہتھیلی پر رکھ کر اوجڑی کیمپ کو باقی ماندہ اسلحے سے خالی کیا جس کے پھٹنے کا ہر آن خطرہ موجود تھا۔ اگرچہ اس حادثے کے اصل ذمہ داروں کا پتا نہ چلایا جا سکا مگر جس طرح روسی ایجنٹ سال بھر سے پاکستان کو تخریب کاری کا نشانہ بنا رہے تھے اسے دیکھتے ہوئے غالب قیاس یہی تھا کہ روس نے پاکستان کو سبق سکھانے کے لیے یہ انتہائی اقدام کیا ہے۔ اس اندازے کو اس بات سے تقویت ملتی ہے کہ ان دنوں جنیوا مذاکرات کا حتمی اجلاس ہونے والا تھا۔ معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے پاکستان پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ روس نے پاکستان کو ڈیورنڈ لائن کا مسئلہ دوبارہ کھڑا کرنے کی دھمکی بھی دی تھی مگر صدر ضیاء الحق مجاہدین کے مفادات کو نظر انداز کرنے والے اس معاہدے کو قبول کرنے کے حق میں نہ تھے۔ ممکن ہے اس دھماکے کے ذریعے صدر ضیاء کو "سیدھے ہو جانے" کا پیغام دیا گیا ہو۔

تخریب کاری کا مقصد کیا تھا؟ بہر حال تخریب کاری کے اس اعصاب شکن سلسلے کا سب سے بڑا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ افغان مجاہدین کے بیس کیمپ میں ابتری پھیلا دی جائے، ان کی سپلائی لائن کو کاٹ دیا جائے، افغان مہاجرین اور مجاہدین کو گلے لگا کر انصار کی سنت کو زندہ کرنے والے پاکستانیوں کا رویہ تبدیل کر دیا جائے اور حکومتِ پاکستان کو افغان مسئلے کے بارے میں اپنی پالیسی تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ افغانستان کی وادیوں میں ناکامی کا منہ دیکھنے والا سرخ ریچھ میدان چھوڑنے سے پہلے آخری حربے کے طور پر یہ داؤ آزما رہا تھا۔ اگر اہلِ پاکستان کی رائے عامہ مجاہدین اور افغان مہاجرین کے خلاف ہو جاتی تو لازماً ضیاء حکومت کو اپنی افغان پالیسی برقرار رکھنے میں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس صورت میں حکومتِ پاکستان مجاہدین کی سرپرستی اور ان کی کفالت سے دست کش ہو سکتی تھی۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہو جاتا تو افغانستان کے میدانوں کا نقشہ ہی بدل جاتا۔ مجاہدین کا نظم وضبط درہم برہم ہو جاتا، ان کے حوصلے پست ہو جاتے، سوویت یونین ہاری ہوئی جنگ جیت جاتا اور تحریک جہاد افغانستان کامیابی کی منزل کے قریب پہنچ کر سبوتاژ ہو جاتی۔ مگر صدر ضیاء الحق نے اس سنگین صورتِ حال کا نہایت پامردی سے سامنا کیا اور تخریب کاری کی ہولناکیوں سے متاثر ہوئے بغیر جہادِ افغانستان کی سرپرستی جاری رکھی۔

گورباچوف کا اعتراف شکست اور انخلا کا اعلان: افغان مجاہدین کے جہادِ مسلسل اور اہلِ پاکستان کے بے لوث نصرت کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1987ء کے اختتام پذیر ہونے تک سوویت یونین نے عملاً اپنی شکست تسلیم کر لی اور افغانستان سے انخلا کے لیے پر تولنے شروع کر دیے۔ روسی حکمران صدر گورباچوف نے اچانک اعلان کر دیا کہ اگر جنیوا معاہدے پر 15 مارچ 1988ء تک دستخط کر دیے جائیں تو 15 مئی 1988ء کو روس اپنی افواج کا انخلا شروع کر دے گا اور 15 ماہ میں اس کی افواج کی واپسی مکمل ہو جائے گی۔ گورباچوف کے اس اعلان سے دنیا حیرت زدہ رہ گئی۔ یہ واضح لفظوں میں اعتراف شکست تھا۔

روس اور امریکا کو اسلام سے خطرہ: سوویت یونین افغانستان سے جا رہا تھا مگر وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے بعد افغانستان میں ایک اسلامی حکومت قائم ہو جائے جو اس کے سر پر خطرے کی تلوار بن کر لٹکتی رہے۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ افغانستان سے نکل کر بھی یہاں اپنی حمایت یافتہ حکومت کو برقرار رکھے گا اور اس ملک کو اسلامی مملکت بننے کا وہ خواب پورا نہیں ہونے دے گا جو مجاہد رہنما دیکھتے آئے ہیں۔ سوویت یونین کی اس سوچ سے اس کے روایتی حریف امریکا کو بھی مکمل طور پر اتفاق تھا۔ امریکا پہلے تو صرف یہ چاہتا تھا کہ ایشیا میں سوویت یونین کے اثرات مزید بڑھنے نہ پائیں۔ افغانستان میں سوویت افواج کی تباہی سے امریکا کا یہ ہدف پورا ہو گیا تھا اور اسے اطمینان ہو چکا تھا کہ سوویت یونین اب اس کے لیے کوئی بڑا خطرہ نہیں بن سکتا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اب امریکا کے سامنے ایک نیا مسئلہ آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ خود ان مجاہدین کو تشویش کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جو افغانستان میں اسلامی حکومت کے قیام کا عزم کیے ہوئے تھے۔

روس اور امریکا کا گٹھ جوڑ: یہاں تاریخ ایک نئی کروٹ لیتی ہے اور ہم دو عالمی طاقتوں اور روایتی حریفوں کو اسلام کے خلاف ایک صف میں کھڑا دیکھتے ہیں۔ جنیوا مذاکرات جن کے تحت روس نے افغانستان سے واپسی اختیار کی تھی دراصل روس اور امریکا کی اس مشترکہ سوچ کا نتیجہ تھے کہ روسی افواج کے افغانستان سے نکل جانے کے بعد وہاں کوئی اسلامی حکومت قائم نہیں ہونی چاہیے۔ دونوں بڑی طاقتیں "اسلام" کو مستقبل قریب میں اپنا سب سے بڑا حریف تصور کرنے لگی تھیں۔ کیوں یہ "اسلام" ہی تھا جس نے ان دونوں میں سے ایک کو افغانستان کی وادیوں میں تاریخ کی عبرت ناک شکست سے دوچار کیا تھا۔

جہادِ افغانستان کیا تھا؟ یہاں ہمیں ایک بار پھر اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ جہاد افغانستان صرف افغانوں کی قومی لڑائی نہیں تھی بلکہ یہ تمام عالم اسلام سے جمع ہونے والے پختہ فکر مسلمانوں کا مقدس جہاد تھا۔ ایشیا سے لے کر افریقہ تک ہر خطے کے فرزندانِ توحید نے اس میں جانی و مالی استطاعت کے

مطابق حصہ لیا تھا۔ کروڑوں مسلمان اور ان گنت اللہ کے برگزیدہ بندے اس جہاد میں فتح یابی کے لیے شب و روز دُعائیں کرتے رہے تھے۔ ان قربانیوں کے نتیجے میں نصرتِ الٰہیہ مسلمانوں کے شاملِ حال ہوئی اور سوویت یونین کا عفریت اپنی بے پناہ طاقت اور لامحدود وسائل کے باوجود رسواکن ہزیمت سے دوچار ہوا۔ اس جہاد سے نہ صرف اس کی عسکری طاقت کو شدید نقصان پہنچا بلکہ اس کی اقتصادیات کا بھی جنازہ نکل گیا۔ یہی نہیں بلکہ خود کمیونزم کا باطل نظام لرزنے لگا اور اس کا بودا پن پوری دنیا پر عیاں ہوگیا۔

امریکا کے عزائم: اس جہاد میں اگر امریکا اور روس مخالف ممالک نے مجاہدین کی مدد کی تھی تو اس میں انسانی ہمدردی یا جذباتِ حریت کی بے لوث حمایت کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ طاقتیں صرف اپنے سیاسی، اقتصادی اور جغرافیائی مفادات کے تحفظ کے لیے مجاہدین سے تعاون کر رہی تھیں۔ امریکا کا تو شروع سے وطیرہ رہا ہے کہ وہ اپنے حریف سے کھلے میدان میں لڑنے کی بجائے اس کی مخالف قوموں کو مضبوط کر کے اسے نیچا دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی کوشش اس نے افغانستان میں اُس وقت کی جب اسے یقین ہوگیا کہ افغان مجاہدین پر سرمایہ کاری اس کے لیے نفع بخش ثابت ہوگی۔

مگر جب جہاد کے ثمرات چننے کا وقت آیا تو امریکا کو یہ گوارا نہ ہوا کہ مجاہدین آزادانہ طور پر افغانستان کا مستقبل اپنے ہاتھوں میں لے سکیں۔ اس سلسلے میں امریکا نے 1985ء میں ہی پیش بندیاں شروع کر دی تھیں اور روسی حکام کو بھی اپنے خدشات سے آگاہ کر دیا تھا۔ جنیوا مذاکرات کے نام پر ان طاقتوں میں جو گفتگو ہو رہی تھی اس کے ذریعے دونوں اپنے مفادات کا تحفظ چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ افغان مسلمانوں کو کسی نہ کسی طرح مشروط آزادی پر آمادہ کر لیا جائے تاکہ وہ مستقبل میں ان کے لیے کوئی خطرہ نہ بن سکیں۔

یہ دونوں طاقتیں جانتی تھیں کہ اسلام کا سیاسی و معاشی نظام سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام پر فوقیت رکھتا ہے اور ان دونوں نظاموں کی بہ نسبت کہیں زیادہ فطری، آزمودہ، انسان دوست اور امن پرور ہے۔ انہیں احساس تھا کہ اسلامی نظریہ ہی کمیونزم اور سرمایہ دارانہ نظریے کا توڑ ثابت ہوسکتا ہے۔

جنیوا مذاکرات میں سازشی دھندے: چنانچہ یہ دونوں طاغوتی قوتیں اپنے مفادات کے تحفظ اور اسلامی نظریے کے مقابلے کے لیے اپنے رویوں میں لچک پیدا کرنے لگیں۔ انہوں نے کئی چیزوں پر اتفاق کر لیا اور جنیوا مذاکرات کو جلد از جلد اس طور پر نتیجہ خیز بنانے کی کوششیں شروع کر دیں کہ روس اور امریکا کے مفادات محفوظ رہیں جبکہ مجاہدین کا کردار ثانوی ہو جائے۔ 1982ء میں جب جنیوا مذاکرات کا آغاز ہوا تھا تو اقوام متحدہ نے اس کے لیے چار نکاتی اُصول وضع کیے تھے۔

① افغانستان کے اقتدارِ اعلیٰ، علاقائی سالمیت، سیاسی آزادی اور غیر جانبداری کا تحفظ کرنا۔
② افغان عوام کو بیرونی مداخلت کے بغیر اپنا سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی نظام ترتیب دینے کا حق دینا۔
③ افغانستان سے غیر ملکی افواج کی مکمل واپسی۔
④ افغان مہاجرین کی بحفاظت واپسی کے لیے سازگار حالات مہیا کرنا۔

نیا ایجنڈا: یہ مذاکرات کئی سال تک نہایت ست روی سے چلتے رہے مگر اب جبکہ فیصلہ کن موڑ آ چکا تھا امریکا، سوویت یونین اور کابل انتظامیہ نے نہایت تیزی سے اس چار نکاتی فارمولے کی روح کو مسخ کرتے ہوئے نیا ایجنڈا تیار کیا۔ انہوں نے معاہدے میں ایسی شرائط شامل کر دیں جو افغان مجاہدین، مہاجرین اور ضیاء حکومت کے لیے ناقابلِ قبول تھیں۔ ان شرائط میں یہ بھی شامل تھا کہ پاکستان افغان مسئلے سے یکسوئی اختیار کرلے گا اور مجاہدین سے تعاون ختم کر دے گا۔ مگر روس اور امریکا پر یہ پابندی عائد نہیں کی جا رہی تھی بلکہ افغانستان کا مستقبل انہی کے سپرد کیا جا رہا تھا۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ افغان مجاہدین کو بھی اس معاہدے سے لاتعلق رکھا جا رہا تھا۔

اس کے بعد ان طاقتوں نے جلد از جلد معاہدے پر دستخط کرانے کے لیے پاکستان پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ مذاکرات کو حتمی شکل دینے کے لیے 22 فروری 1986ء کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ امریکی نمائندوں نے دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ معاہدے کے بعد افغانستان کو خود مختاری اور سیاسی آزادی حاصل ہو جائے گی، روس اور امریکا اس ملک کے بارے میں عدم مداخلت کی پالیسی اپنائیں گے...... مگر روس کا کابل انتظامیہ کی اور امریکا کا اپنے حامیوں کی عسکری امداد بند کرنا معاہدے میں باقاعدہ تحریری طور پر شامل نہ تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاہدہ صرف ایک چال تھی۔ اصل عزائم کچھ اور تھے۔ شیخ عبداللہ عزام شہید نے امریکا کی اس سازش کا پردہ چاک کرتے ہوئے تحریر کیا:

"امریکا کی کوشش ہے کہ وہ جہاد کے میدانوں پر قبضہ کرلے۔ جنگ کی زمام اسلام پسندوں سے چھین کر انہیں میدان سے دور کر دے۔" (آیات الرحمن فی الافغان)

امریکا اب پاکستان کے ذریعے اسلام پسند مزاحمتی تنظیموں کو ملنے والی امداد روکنا چاہتا تھا اور اس کی بجائے افغانستان کے مزاحمتی گروپوں سے براہِ راست روابط قائم کر کے ان سے سودے بازیاں کرنے کا خواہش مند تھا۔ یعنی جو گروپ امریکا کی پالیسیوں کا تحفظ کرنے کا معاہدہ کرتے، امریکا انہیں نوازتا اور جو گروپ بے لچک رویہ اختیار کرتے، امریکا انہیں عسکری، سیاسی اور اقتصادی امداد سے محروم کر کے دیوار سے لگانے کی کوشش کرتا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مجاہدین امریکا نواز اور اسلام پسند دھڑوں میں تقسیم ہو جاتے

اوران کے درمیان اقتدار کی جنگ چھڑ جاتی۔ روس کو یہ فائدہ حاصل ہوتا کہ اس کی کٹھ پتلی نجیب انتظامیہ کو اپنے پاؤں جمانے کا موقع مل جاتا۔ اس سازش کا ایک مرحلہ یہ بھی تھا کہ افغانستان کو سیاسی طور پر چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور یہاں کوئی مضبوط مرکزی حکومت کبھی قائم نہ ہونے دی جائے۔

جنیوا مذاکرات پر حکمت یار کا تبصرہ: اپریل 1988ء میں جنیوا مذاکرات کا فیصلہ کن اجلاس شروع ہو گیا۔ وزیر اعظم پاکستان محمد خان جونیجو معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے آمادہ تھے مگر صدر ضیاء الحق، وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب خان اور وزیر مملکت برائے خارجہ اُمور زین نورانی سمیت متعدد معاملہ فہم سیاست دانوں کی رائے اس کے برخلاف تھی۔ اس دوران 12 / اپریل کو حزبِ اسلامی کے امیر گلبدین حکمت یار نے جنیوا مذاکرات کے حوالے سے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: "روس مجاہدین کے ہاتھوں زچ ہو کر افغانستان سے اپنی واپسی کا اعلان کر رہا ہے مگر وہ ان لوگوں سے مذاکرات کے لیے تیار نہیں ہے جو میدانِ جنگ میں اس کا مقابلہ کر رہے ہیں بلکہ وہ مسئلہ افغانستان کے حل کے لیے بھاگ بھاگ کر واشنگٹن جاتا ہے اور اس طرح دنیا کو باور کرانا چاہتا ہے کہ جنگ افغان مجاہدین اور اس کے درمیان نہیں بلکہ امریکا اور اس کے مابین ہو رہی ہے۔ اس طرح وہ خود کو جھوٹی تسلی دے رہا ہے کہ وہ ایک سپر پاور سے لڑ کر واپس جا رہا ہے۔ حالاں کہ دنیا جانتی ہے افغانستان میں امریکی فوجیں نہیں ہیں بلکہ مجاہدین لڑ رہے ہیں مگر جنیوا مذاکرات میں مجاہدین کا کوئی حصہ نہیں۔ اس قسم کے معاہدے سے افغانستان میں امن قائم ہو سکتا ہے نہ مہاجرین اپنے وطن واپس جا سکتے ہیں۔" (نوائے وقت، 12 / اپریل 1988ء)

محمد خان جونیجو نے جنیوا معاہدے پر دستخط کر دیے: بہر کیف! 14 / اپریل 1988ء کو محمد خان جونیجو نے جنیوا معاہدے پر دستخط کر دیے۔ اس طرح مسئلہ افغانستان کے بارے میں اصولاً پاکستان کا کردار ختم ہو گیا اور یہ معاملہ روس اور امریکا کے رحم و کرم پر رہ گیا۔ مجاہدین کی قوت، تنظیم اور اتحاد کو اس سے شدید دھچکا لگا۔ صدرِ پاکستان جنرل ضیاء الحق جو کہ افغانستان میں ایک پاکستان دوست اور اسلام پسند حکومت کے خواہاں تھے اپنے منصوبوں کو تکمیل تک پہنچانے سے قاصر ہو گئے۔ وزیر خارجہ پاکستان صاحبزادہ یعقوب خان نے جونیجو کے اس فیصلے پر احتجاجاً استعفا دے دیا۔

معروف دانشور زیڈ اے سلہری نے اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: "مجھے نظر آ رہا ہے کہ ہم نے آہستہ آہستہ قدم بقدم پاکستان اور افغانستان میں اپنے ذہنی بُعد کی خلیج کی طرف پلٹنا اور کھسکنا شروع کر دیا جو بدقسمتی اور دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے آٹھ دس سال پہلے دو برادر اسلامی ملکوں میں حائل تھی اور جسے بفضل تعالیٰ افغان مجاہدین اور مہاجرین نے پاٹ دیا ہے۔ معاہدہ جنیوا پاکستان کی کشمیر اور مشرقی

پاکستان سے محرومیوں کے سلسلے کی ایک اور کڑی ہے۔'' (مسئلہ افغانستان، ص: 547)

بہرکیف جنیوا معاہدے کی رُو سے 15 مئی 1988ء کو روسی افواج آہستہ آہستہ دریائے آمو کے پار اُترنا شروع ہوگئیں مگر جاتے جاتے روس نجیب انتظامیہ کی حفاظت کے زبردست انتظامات کر کے جارہا تھا۔ نجیب کو اتنا اسلحہ فراہم کردیا گیا تھا جو کئی سالوں کی جنگ کے لیے کافی تھا۔ روسی افسران اور مشیر اب بھی اس سے تعاون کے لیے موجود تھے مگر پاکستان اب افغان مسئلے میں فعال کردار ادا کرنے سے قاصر ہوگیا تھا۔

جونیجو حکومت برطرف: جنیوا معاہدے نے جہادِ افغانستان کے شیدائی صدر ضیاء الحق کی اُمیدوں پر اس طرح پانی پھیرا کہ وہ منتخب جمہوری حکومت سے بددل ہوگئے۔ چنانچہ صرف ڈیڑھ ماہ بعد 29 مئی کو انہوں نے صدارتی اختیارات استعمال کرتے ہوئے اسمبلیوں اور سول حکومتوں کی بساط لپیٹ دی۔ اس اقدام سے ان کے مخالف حلقوں کی افرادی قوت بڑھتی چلی گئی اور اندرون خانہ ان کے خلاف سازشوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔

جون میں انہوں نے شریعت آرڈی نینس جاری کر کے پاکستان میں اسلامی نظام کی بالادستی کی جانب ایک اہم پیش رفت کی۔ 14 اگست کو قوم سے آخری خطاب میں اس مردِ مومن نے کہا: ''لاکھوں مسلمان خون کے دریا پار کر کے پاکستان آئے تھے، کیوں کہ وہ پاکستان کو اپنی آخری پناہ گاہ سمجھتے تھے۔ تحریکِ آزادی کے تمام شہیدوں اور بہادروں کو ہمارا اسلام...... ہماری حکومت پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی ریاست بنائے گی تاکہ قیامِ پاکستان کے مقاصد حاصل ہوسکیں۔ اسلام ایسا رشتہ ہے جو قوم کے اتحاد کی بنیاد ہے۔ اسلام کو باقی تمام باتوں پر بالادستی حاصل ہے۔''

صدر ضیاء الحق کی المناک شہادت: اس تقریر کے تیسرے دن 17 اگست کو بہاولپور ائیر بیس سے ان کا طیارہ اُڑا اور چند لمحوں بعد فضا میں اس کے پرخچے اُڑ گئے۔ جہادِ افغان میں صفِ اول کے سپاہی کا کردار ادا کرنے والا یہ مسلم حکمران پورے عالمِ اسلام کو سوگوار کر گیا۔ اس کے جنازے میں پندرہ بیس لاکھ افراد کی شرکت یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی تھی کہ قوم اسے امریکی مہرہ نہیں مردِ مجاہد تصور کرتی تھی اور جہادِ افغانستان کے بارے میں اس کی پالیسی پر اعتماد کرتی تھی۔ صدر ضیاء الحق کی شہادت کے پس پردہ سازشوں کا بھید آج تک نہیں کھل سکا۔ زیادہ شک روس یا امریکا پر ہی کیا جاتا ہے۔ روس کی صدر ضیاء الحق سے دشمنی تو بالکل واضح ہے مگر امریکا بھی مسئلہ افغانستان کے بارے میں صدر ضیاء الحق کے کردار کو اپنی آئندہ پالیسیوں کے حوالے سے خطرناک تصور کرتا تھا۔ اس لیے یہاں سی آئی اے کا ملوث ہونا قطعاً

بعید نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ "کے جی بی" اور "سی آئی اے" دونوں کے اشتراک سے یہ کھیل کھیلا گیا ہو۔

جہاد افغانستان کا نیا دور: جنیوا معاہدے اور صدر ضیاء الحق کی شہادت کے بعد جہادِ افغانستان اپنی تاریخ کے ایک نئے دور میں داخل ہو گیا۔ ایک ایسا دور جس میں مجاہدین کو اپنی جنگ خود لڑنا تھی۔ محبت اور اعتماد کے رشتوں کو ٹھیس پہنچانے والے امریکی ایجنٹ اب ان کی صفوں میں داخل ہو چکے تھے اور چند گام پر نظر آنے والی منزل خاصی دور ہو گئی تھی۔ مگر مجاہد رہنماؤں نے صدر ضیاء الحق کی شہادت کا صدمہ برداشت کرتے ہوئے اپنے حوصلے برقرار رکھے۔ انہوں نے اپنی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہ آنے دی اور روس کو یہ موقع نہ دیا کہ وہ انخلا کے وعدے سے منحرف ہو سکے یا اپنے عزائم کو دوبارہ پروان چڑھانے کی ہمت کرے۔ انہوں نے دنیا کو یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ جنیوا معاہدے سے ان کی قوت کو دھچکا لگا ہے۔ وہ میدانوں میں اپنی جنگ لگاتار لڑتے رہے۔

ضیاء الحق کے بعد ان کی سخت ترین سیاسی حریف پیپلز پارٹی کی رہنما بے نظیر بھٹو سیاسی دنگل جیت کر نومبر 1988ء میں پاکستان کی پہلی خاتون وزیر اعظم منتخب ہو گئی تھیں۔ مجاہدین نے اس تبدیلی کو بھی اپنے عزائم کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے دیا۔

مآخذ و مراجع

- ...... تاریخ جہاد افغانستان۔ ڈاکٹر ایچ بی خان
- ...... افغانستان ایک قوم کا المیہ۔ احمد شجاع پاشا
- ...... آیات الرحمن فی افغان۔ شیخ عبداللہ عزام شہید
- ...... ماہنامہ صدائے مجاہد: جلد 1988ء، 1989ء،
- ...... ماہنامہ الارشاد: جلد 1988ء، 1989ء
- ...... ہفت روزہ تکبیر: جلد 1988ء، 1989ء
- ...... ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک۔ مارچ 1988ء
- ...... اردو ڈائجسٹ: مارچ 1989ء، جہاد افغانستان نمبر اپریل 1989ء، جہاد افغانستان نمبر فروری 1990ء، جون 1992ء، شہید پاکستان ضیاء الحق نمبر اگست 1989ء، اگست 1990ء

اٹھائیسواں باب

سرخ ریچھ کی شکست اور نجیب اللہ کیخلاف جہاد

مجاہدین کے لیے نجیب اور روسیوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ پوری ہمت اور استقامت سے نجیب کے خلاف معرکہ آراء رہے۔ مشرقی اور جنوبی افغانستان میں نہایت ہولناک جنگیں شروع ہوگئیں۔ مجاہدین اب مورچوں، چوکیوں، چھاؤنیوں اور قلعوں پر بڑے بڑے حملے کر رہے تھے۔ 9ستمبر 1988ء کو جنوبی افغانستان کا قصبہ اسپین بولدک مجاہدین کے قبضے میں آ گیا جس سے قندھار کی طرف پیش قدمی کا راستہ کھل گیا۔

دوسری طرف 30 ستمبر کو مجاہدین نے صوبہ پکتیکا کی مرکزی چھاؤنی ''ارگون'' کے راستے میں واقع ''زامہ خولہ پوسٹ'' پر قبضہ کر لیا۔ اس لڑائی میں 22 مجاہدین زخمی جبکہ ایک شہید ہوا۔ پوسٹ سے 52 دشمنوں کو زندہ گرفتار کر لیا گیا۔ اس مہم کی قیادت حرکۃ الجہاد الاسلامی کے نامور گوریلا لیڈر، کمانڈر خالد زبیر کر رہے تھے۔ اگلے چند دنوں میں شرنہ اور ارگون چھاؤنی سمیت پورا پکتیکا مجاہدین کے قبضے میں آ گیا۔

15رفروری 1989ء روسی افغانستان سے نکل گئے: انہی معرکوں کے دوران 1989ء کا آغاز ہوا۔ اس سال 15 فروری کا دن افغانستان کی تاریخ میں کبھی نہ بھلایا جا سکے گا۔ یہ وہ دن تھا جب روس کی سرخ فوج کا انخلاء مکمل ہوا اور اس کا آخری سپاہی بھی دریائے آمو کے پار چلا گیا۔ یاد رہے کہ 1987ء کے اواخر میں جنیوا معاہدے کو نتیجہ خیز بنا کر اپنی افواج کے انخلا کا وعدہ کرتے ہوئے گورباچوف نے اس مقصد کے لیے 15رماہ کی مہلت طلب کی تھی مگر جنیوا معاہدے کے بعد روس نے صرف 8 ماہ کے اندر افواج کی واپسی مکمل کر لی۔ یہ مجاہدین کا خوف نہیں تو اور کیا تھا؟ اس تاریخی واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے اردو ڈائجسٹ کے مدیر اور ممتاز صحافی الطاف حسن قریشی لکھتے ہیں: ''15رفروری 1989ء کو افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کا واقعہ کسی طور بھی بیسویں صدی کے بہت بڑے سیاسی معجزے سے کم نہیں۔ آزاد اور غیور افغان مجاہدین کی ہمالیہ ایسی عزیمت اور ایمانی قوت نے اور

سمندروں جیسی گہری وطن کی محبت اور تاریخی شعور نے اشتراکی فلسفے، طرزِ حیات اور سرخ استعمار کو اس قدر ذلت آمیز شکست دی ہے کہ اس کے جلال وہیبت کا سینہ شق ہو گیا ہے۔ روسی قیادت کو یہ اعتراف کرنا پڑا ہے کہ افغانستان میں فوجیں بھیج کر اس نے سخت غلطی کی تھی اور آیندہ ایسی غلطی کسی بھی جگہ نہیں دہرائی جائے گی۔'' (اُردو ڈائجسٹ، مارچ 1989ء)

مجاہدین جلال آباد کی دہلیز پر: روسی افواج کے نکلتے ہی مجاہدین نے افغانستان کے بڑے اور مرکزی شہروں کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ موسمِ بہار میں وہ جلال آباد کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ثمرخیل چھاؤنی فتح ہو چکی تھی جسے جلال آباد کے لیے ریڑھ کی ہڈی کے مترادف کہا جاتا تھا۔ مجاہدین شہر کے محاصرے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ عالمی طاقتیں جو مجاہدین کو لڑانے میں ناکام ہو چکی تھیں، نجیب کو خطرے کی زد میں دیکھ کر سربگریباں تھیں۔

سومنات کے پجاری غزنوی کے دیس میں: بھارت بھی افغانستان میں پاکستان دوست اسلامی حکومت کے قیام کے امکانات سے خوفزدہ تھا۔ چنانچہ ان دنوں اس نے افغانستان میں مداخلت کا آغاز کر دیا اور اپنے مفادات کے تحفظ اور روس کا حقِ خدمت ادا کرنے کے لیے نجیب کی بھرپور مدد شروع کر دی۔ نجیب کے ''را'' سے گہرے تعلقات رہے تھے اس لیے بھارتی لابی نجیب کو اپنا دوست تصور کرتی تھی۔ جلال آباد کو مجاہدین کے نرغے میں آتا دیکھ کر بھارت نے بھاری جنگی ساز و سامان سمیت اپنے 600 عسکری مشیر اور کئی فوجی طیارے کابل اُتار دیے۔ لیفٹیننٹ جنرل گپتا اور میجر جنرل مدن کمار نے کابل میں کمیونسٹ فوجیوں کی تربیت شروع کر دی۔ اگلے ماہ جلال آباد کو بچانے کے لیے کابل سے آٹھ ڈویژن، گردیز سے دو بریگیڈ اور ہرات سے ایک بریگیڈ فوج جلال آباد میں جمع ہو چکی تھی۔

روسی اسلحے کی تازہ کھیپ: روس نے اپنی افواج کے انخلاء کے باوجود نجیب انتظامیہ کی مدد کا فیصلہ کیا تھا اس لیے وہ بھی ہر ممکن طور پر اس سے تعاون کر رہا تھا۔ جلال آباد کی جنگ میں اس کے افسران اور مشیر شریک تھے۔ اس کے علاوہ نجیب کو خفیہ طور پر چار سو نئے ٹینکوں اور 20 یو ایس بمبار طیاروں کا تحفہ بھی پہنچا دیا گیا تھا اور مزید 31 طیارے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ ادھر مجاہدین جلال آباد کے علاوہ ایک سمت سے کابل کی طرف بھی بڑھ رہے تھے۔ 11 رجون کو انہوں نے کابل ایئرپورٹ پر راکٹوں سے زبردست حملہ کیا۔ مجاہدین کا کہنا تھا کہ انہوں نے کابل انتظامیہ کی تین میں سے دو دفاعی لائنیں توڑ دی ہیں اور اب وہ شہر سے صرف تین کلومیٹر دور رہ گئے ہیں۔

نجیب محل چھوڑنے پر مجبور: اگلے دنوں میں کابل پر مجاہدین کی راکٹ باری اتنی شدید ہو گئی کہ نجیب

کے لیے صدارتی محل محفوظ نہ رہا اور اس نے فوجی ہیڈ کوارٹر میں رہائش اختیار کر لی۔ ادھر روس اپنے پٹے ہوئے مہرے کی مدد کے لیے مسلسل امداد بھیج رہا تھا۔ اس نے دو سو جدید ترین ٹینک، اسلحے کے لدے ہوئے چھ سو ٹرک اور کئی فوجی دستے کابل بھیج دیے۔

1989ء کے حالات، دو سو اضلاع پر قبضہ: اگرچہ کابل کو مجاہدین تین سال بعد فتح کر سکے اور جلال آباد کی فتح میں بھی خلاف توقع تاخیر ہوتی گئی مگر اس کی وجہ یہ تھی کہ مجاہدین ان مرکزی پر شہروں پر قبضے سے پہلے باقی افغانستان میں اپنے قدم زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنا چاہتے تھے۔ مجاہدین نے اپنی ساری طاقت جلال آباد یا کابل پر مرکوز نہیں کی بلکہ پورے ملک میں تسلسل کے ساتھ کارروائیاں جاری رکھیں۔ روسی افواج کے انخلاء کے صرف چھ ماہ کے اندر اندر انہوں نے ملک بھر میں دو سو اضلاع اور تحصیلوں اور کئی صوبائی دارالحکومتوں پر قبضہ کر لیا۔ 10 جون کو انہوں نے مزار شریف میں گولہ بارود کے ایک بڑے ذخیرے کو نشانہ بنایا، اس حملے میں سات ہزار چار سو ٹن گولہ بارود اور ہتھیاروں سمیت ایک سو ستر ٹینک بھی تباہ ہوئے۔ 25 جون 1989ء کو مجاہدین نے کابل کے شمال میں پروان کی ایک فوجی چوکی حسین کوٹ پر قبضہ کر لیا۔ 27 جون کو کابل کا سب ڈویژن ''بچہ کوٹ'' مجاہدین کے قبضے میں آ گیا۔

یاسر عرفات کا دورہ کابل: انہی دنوں تنظیم آزادی فلسطین کے رہنما یاسر عرفات کابل کے دورے پر آئے۔ ان کا مقصد کابل انتظامیہ اور مجاہدین میں تصفیہ کرانا تھا مگر مجاہدین نے ان کے کسی بھی فارمولے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ یاسر عرفات 15 فیصد رقبے پر قابض کابل انتظامیہ کو افغانستان کی حکومت باور کر رہے تھے جب کہ 85 فیصد پر تسلط رکھنے والے مجاہدین کی عبوری حکومت کو انہوں نے افغانستان کی نمائندہ حکومت تسلیم نہیں کیا تھا جب کہ مجاہدین کا اعلان تھا کہ جب تک ان کی عبوری حکومت کو افغانستان کی نمائندہ حکومت نہیں مانا جاتا وہ کسی سے مذاکرات نہیں کریں گے۔

عام معافی کا اعلان: حالات یہ تھے کہ ظالموں کا یوم حساب قریب نظر آتا تھا۔ 16 لاکھ افغان مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے میں روسیوں کا ساتھ دینے والے کمیونسٹوں کے اقتدار کے دن گنے جا چکے تھے۔ مجاہدین کی عبوری حکومت بھی قائم ہو گئی تھی جس کے وزیر اعظم پروفیسر عبدالرب رسول سیاف مقرر ہوئے تھے۔ اسی عبوری حکومت نے ایک ایسا اعلان کیا جس سے دنیا کی بڑی بڑی مہذب اور تعلیم یافتہ اقوام سر بگریباں رہ گئیں۔ مجاہدین کی عبوری حکومت نے فیصلہ سنایا: ''ہم ان لوگوں کے لیے عام معافی کا اعلان کرتے ہیں جو دشمن کے دھوکے میں آ گئے، ہم ایسے افراد سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ہتھیار ڈال دیں، ہم نجیب حکومت سے منحرف ہونے والے تمام افراد کو جان و مال کی امان دیں گے۔''

اسلامی اخلاق کی عظیم تعلیمات پر مبنی اس اعلان نے ملک میں قیام امن کو آسان کر دیا، ساتھ ہی مخالفین کی حکومت میں ہل چل مچ گئی۔ ہر صوبے سے کابل انتظامیہ کے سپاہی بھاگ بھاگ کر مجاہدین کی صفوں میں شامل ہونے لگے۔ کئی پائلٹ ہیلی کاپٹروں اور طیاروں سمیت ان سے آ ملے حتیٰ کہ اسلام آباد میں متعین افغان سفیر عبدالوکیل بہرہ مند نے بھی مجاہدین کی عبوری حکومت کے ماتحت آنے کا اعلان کر دیا۔

نجیب کی طرف سے صلح کی تجاویز: مجاہدین اور نجیب انتظامیہ کے درمیان معرکوں کا سلسلہ تیز تر ہوتا گیا۔ کابل پر مجاہدین کے راکٹ اور میزائل حملے جاری رہے۔ مجبور ہو کر اگست 1989ء میں نجیب نے مجاہدین کو صلح کی پیش کش کی جو چند تجاویز پر مشتمل تھی مگر مجاہدین نے اسے مسترد کر دیا۔ مجاہدین کی عبوری حکومت کے وزیر اعظم پروفیسر سیاف نے کہا کہ ڈاکٹر نجیب کے لیے صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے ساتھیوں سمیت خود کو ہمارے حوالے کر دیں۔

خوست کی جنگ: اگست 1989ء میں خوست ایک بار شدید جنگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ دو ہفتوں کی خون ریز جھڑپوں میں دو ہزار سے زائد کمیونسٹ سپاہی ہلاک اور 500 کے قریب گرفتار ہوئے۔ ستمبر میں بھی خوست کا معرکہ جاری رہا۔ اس میں دونوں جانب کے جانی نقصانات غیر معمولی تھے۔ یاد رہے کہ مشرقی افغانستان کے اکثر معرکوں میں پاکستانی مجاہدین تنظیمیں پیش پیش رہتی تھیں، جن میں حرکت الجہاد الاسلامی اور حرکت المجاہدین کے باہمت اور دلیر مجاہدوں کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔

شیخ عبداللہ عزام کی شہادت: مجاہدین کے لیے اس سال کا سب سے بڑا سانحہ شیخ عبداللہ العزام کی شہادت تھا۔ جو عرب مجاہدین کے سربراہ اور عالم عرب میں جہاد کے سب سے بڑے نقیب تھے۔ افغان جہاد میں ان کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ شیخ 1941ء میں فلسطین میں پیدا ہوئے تھے۔ یہودی درندوں کے مظالم اور انگریز استعمار کی چیرہ دستیوں نے فلسطینیوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا اور فلسطینی نہایت کسمپرسی کے عالم میں اپنی بقاء کی جدوجہد کر رہے تھے۔ شیخ نے قیام اسرائیل کے بعد کم عمری میں فلسطین مجاہدین کی صفوں میں شامل ہو کر برطانوی اور اسرائیلی افواج کے خلاف مزاحمت میں حصہ لیا۔ بعد میں حالات زیادہ خراب ہونے پر وہ مہاجرین کے ساتھ مشرقی اردن آ گئے۔ ابتدائی تعلیم اردن میں حاصل کرنے کے بعد الشریعۃ کالج دمشق سے 1966ء میں بی اے کیا اور عمان کے ایک اسکول میں تدریس شروع کر دی۔ 1969ء میں انہوں نے اردن یونیورسٹی سے ایم اے کی سند حاصل کی۔ اس دوران وہ ایک بار پھر ارض فلسطین کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اسرائیل کے خلاف برسرپیکار ہو گئے۔ وہ شام اور فلسطین میں کئی برس تک گوریلا کارروائیوں میں مصروف رہے۔ اس دوران انہوں

نے تنظیم آزادی فلسطین کے لادینی نظریات کی پرزور تردید کی اور یاسر عرفات کو یہ سمجھانے کی بڑی کوشش کی کہ وہ اپنی تحریک کی بنیاد عصبیت اور لادینیت کی بجائے اسلام اور دینی اخوت پر رکھیں اور اسے جہاد فی سبیل اللہ کے فریضے کے طور پر انجام دیں۔ مگر یاسر عرفات روس سے اتنے متاثر تھے کہ قائل نہ ہوسکے۔ اپنی کوششیں رائگاں دیکھ کر شیخ دوبارہ درس وتدریس میں مصروف ہو گئے۔

اس دوران انہوں نے 1973ء میں جامعۃ الازہر سے اصول فقہ میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ 1980ء تک وہ اردن یونیورسٹی میں شریعت کالج کے استاد کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ اس دوران ان کی علمی صلاحیتوں کا چرچا دور دور تک ہو چکا تھا۔ چنانچہ 1981ء میں انہیں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں تدریس کی پیش کش کی گئی۔ چنانچہ موصوف اسلام آباد منتقل ہو گئے۔ وہ پہلے سے ذہنی طور پر افغان جہاد سے پوری طرح ہم آہنگ اور اس کے پرجوش حامی تھے۔ پاکستان میں رہ کر انہیں مجاہد رہنماؤں سے قریبی روابط قائم کرنے کا موقع ملا اور ان کے جذبہ جہاد میں شدت آگئی۔ انہوں نے اپنی ملازمت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر افغانستان کا رخ کیا اور خود کو جہاد کے لیے وقف کر دیا۔ عرب نوجوانوں کو جہاد پر آمادہ کرنے کے لیے، انہوں نے جگہ جگہ تقاریر کیں جن سے لاکھوں لوگ متاثر ہوئے اور نہایت مؤثر رسالے، پمفلٹ اور مضامین لکھے۔ آپ کی تصنیف ''آیات الرحمن فی جہاد افغان'' نے دنیائے عرب میں جہاد کا ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا۔ آپ کی تقاریر اور تحریروں نے ہزاروں عرب نوجوانوں کو افغانستان میں روسیوں کے بالمقابل لا کھڑا کیا۔ سینکڑوں عرب شیوخ نے اپنی تجوریوں کے منہ مجاہدین کے لیے کھول دیے۔ افغانستان میں لڑنے والے عرب مجاہدین ان کی کمان میں جہاد کرتے تھے اور ان کے بیانات اور تقاریر سے روحانی غذا حاصل کرتے تھے۔ آپ نے احیائے جہاد کے لیے ایک ماہنامہ ''الجہاد'' بھی جاری کیا۔ جمعہ 24 نومبر 1989ء کو وہ اپنے دو بیٹوں 18 سالہ محمد اور 7 سالہ ابراہیم کے ساتھ یونیورسٹی ٹاؤن پشاور کی مسجد میں خطبہ دینے جا رہے تھے کہ راستے میں نامعلوم تخریب کاروں نے ان کی گاڑی کو بم سے اڑا دیا۔ شیخ اپنے دونوں بچوں سمیت موقعے پر ہی شہید ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون... شیخ کی وفات پر جہاد افغانستان کا ایک باب بند ہو گیا مگر انہوں نے جن نوجوانوں کو جہاد کا سبق پڑھا دیا تھا وہ نہ صرف افغانستان بلکہ دنیا بھر کے مظلوم مسلمانوں کی نصرت وحمایت کے لیے کمربستہ ہو چکے تھے۔

شیخ تمیم عدنانی کی وفات: 18 اکتوبر 1989ء کا دن بھی مجاہدین کے لیے حسرت انگیز تھا۔ اس دن انہیں شیخ تمیم محمد العدنانی کی وفات کا صدمہ سہنا پڑا تھا۔ شیخ موصوف عرب مجاہدین کے ہر دل عزیز رہنما

اور شیخ عبداللہ العزام کے دست راست تھے۔ وہ 1942ء میں بیت المقدس میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے مصر سے سیاسیات اور اقتصادیات میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ بعد میں وہ سعودی عرب میں ایک اعلیٰ عہدے پر ملازم ہو گئے۔ انہیں ماہانہ 24 ہزار ریال تنخواہ ملتی تھی مگر جب افغان جہاد شروع ہوا تو انہوں نے خود کو اس کا آوازہ بلند کرنے کے لیے وقف کر دیا۔ ساتھ گاہے گاہے افغانستان آتے اور یہ رقم مجاہدین کے فنڈ میں دے دیتے۔ ان کا اکثر وقت عالم عرب میں جہاد کا صور پھونکتے ہوئے گزرتا۔ بعد میں انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اہل وعیال کے ساتھ پاکستان آ گئے اور شیخ عزام کے شانہ بشانہ کام کرنے لگے۔ وہ مجاہدین کے ساتھ اگلے مورچوں پر لڑتے اور خود راتوں کو پہرہ دیتے۔

ان کی خواہش تھی افغانستان میں ایک مثالی اسلامی حکومت قائم ہو جس کے سپاہی قدم بقدم آگے بڑھتے ہوئے مسجد اقصیٰ کو پنجۂ یہود سے آزاد کرائیں۔ شیخ عربی اور انگلش کے زبردست مقرر تھے۔ دنیا بھر میں اس بارے میں تقاریر کرتے اور پُرمغز لیکچر دیتے۔ ان کی بلند ہمتی کا یہ عالم تھا کہ ایک معرکے میں مجاہدین دشمن کے گھیرے میں آ گئے۔۔۔۔ انہوں نے وائرلیس پر اپنی قیادت سے مدد طلب کی۔ چنانچہ وہاں سے مجاہدین کا ایک گروپ کمک کے لیے روانہ ہونے لگا۔ شیخ تمیم بیماری اور ضعف کے باوجود اس گروپ کے ساتھ چل پڑے۔ پروفیسر سیاف نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو بولے: ''مجھے گھسٹ گھسٹ کر بھی اگلے مورچوں پر جانا پڑے تو جاؤں گا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میری تقاریر سن کر اپنی جانیں داؤ پر لگانے والے دشمن کے محاصرے میں ہوں اور میں یہاں بیٹھا رہوں۔'' چنانچہ شیخ اگلے مورچوں پر پہنچ گئے اور دشمن کی ہولناک گولہ باری اور بموں کی بارش میں چار گھنٹے تک مجاہدین کی حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو فتح عنایت کی۔ موصوف احیائے جہاد کے عالمی دورے پر تھے۔ اس دوران فلوریڈا (امریکا) میں مقیم مسلمانوں کی ایک تقریب سے خطاب کیا اور اس کے بعد دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔

نوٹ: عرب مجاہدین کے ایمان افروز حالات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ان پر سینکڑوں اوراق لکھ دیے جائیں مگر اس طرح ہمارا سلسلۂ تاریخ مزید طوالت اختیار کر جائے جب کہ ہم اختصار کے درپے ہیں۔ اس لیے موضوع کو سمیٹتے ہوئے ہم آگے بڑھتے ہیں۔

1989ء کا جنگی گوشوارہ: 1989ء اختتام پذیر ہوا تو اس ایک سال میں مجاہدین کی کامیابیوں کے درج ذیل اعداد وشمار ریکارڈ پر آئے: اس ایک سال میں...... 27 ہزار 7 سو 13 دشمن ہلاک، 22 ہزار 5 سو 10 زخمی اور 5 ہزار 4 سو 4 گرفتار ہوئے...... جب کہ 12 ہزار 2 سو 71 فوجی مجاہدین سے

آملے۔ نجیب انتظامیہ اور اس کے مددگاروں کے 568 طیارے، 3 ہزار ایک سو چھ ٹینک، 4 ہزار پانچ سو پچاس گاڑیاں اور ایک ہزار دو سو 87 بھاری ہتھیار تباہ ہوئے۔ مجاہدین کو مالِ غنیمت میں 28 ٹینک، 166 گاڑیاں، 483 بھاری اسلحہ اور 16 ہزار کی تعداد میں ہلکا اسلحہ حاصل ہوا۔

کمیونزم کا جنازہ: افغانستان میں سوویت یونین کی ناکامی نے دنیا بھر میں کمیونسٹوں کو رسوا کر دیا۔ مختلف خطوں میں کمیونزم کی بنیادیں لرزنے لگیں اور کمیونسٹ پارٹیاں ہر جگہ شکست کھا کے پسپا ہونے لگیں۔ 1989ء کے اواخر میں بلغاریہ کی کمیونسٹ پارٹی کے سابق سربراہ کو پارٹی سے خارج کر دیا گیا۔ کمیونسٹ پارٹی ملکی معاملات چلانے کے اپنے کلیدی کردار سے دست بردار ہوگئی۔ اس کے بعد حیرت انگیز طور پر بلغاریہ کے مسلمانوں کے مذہبی اور ثقافتی حقوق بحال کر دیے گئے۔ مشرقی جرمنی کمیونسٹ دنیا کا مضبوط ترین ملک سمجھا جاتا تھا مگر دیوارِ برلن گرنے کے کچھ مدت بعد مشرقی جرمنی کی کمیونسٹ حکومت بھی گر گئی۔ کمیونسٹ پارٹی کے ایک ہنگامی اجلاس کے بعد پولٹ بیورو اور حکومت میں شامل تمام ارکان نے استعفے دے دیے۔ یہی نہیں بلکہ پارٹی کے سربراہ اور اس کے وزیر اعظم کو پندرہ ارکان سمیت پارٹی سے نکال دیا گیا، کیونکہ یہ ثابت ہو گیا تھا وہ کمیونزم کے نام پر قوم کو دھوکا دیتے ہوئے ملکی دولت اپنے ذاتی اکاؤنٹس میں ٹھونستے جا رہے تھے۔ چیکوسلواکیہ میں بھی یہی ہوا اور کمیونسٹ پارٹی کے 8 ممتاز ارکان کو مرکزی کمیٹی سے خارج کر دیا گیا۔ 1990ء کے شروع میں پولینڈ میں بھی کمیونسٹ پارٹی توڑ دی گئی۔ آذر بائیجان کے مسلمانوں نے بھی علیحدگی پسند تحریک شروع کر دی۔ دارالحکومت باکو میں لینن چوک کا نام آزادی چوک رکھ دیا گیا۔ مسلح نوجوانوں نے روسی چوکیاں تباہ کرنا شروع کر دیں۔ روسی ریاست لیتھونیا نے تو باقاعدہ آزادی کا اعلان کر دیا اور جب گورباچوف نے وہاں حالات پر قابو پانے کے لیے ہنگامی دورہ کیا تو اسے غیر ملکی سربراہ کا پروٹوکول دیا گیا۔

وسط ایشیا میں بیداری: روس کی وسط ایشیائی ریاستوں کا یہ حال تھا کہ وہاں جبر و ستم کی زنجیریں ٹوٹ رہی تھیں اور ستر سال سے اپنا اور اپنی تین نسلوں کا ایمان پوشیدہ رکھنے والے مسلمان تیزی سے ابھرنے لگے تھے...... ان ریاستوں میں کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی ایک نئی شکل سامنے آنے لگی۔ کہا جاتا تھا کہ اب ان کی جیب میں پارٹی کا کارڈ اور دوسری جیب میں قرآن مجید کا جیبی کا نسخہ ہوتا ہے۔ ازبکستان یونیورسٹی میں ''شعبہ الحاد'' کا پروفیسر رزمیتوف جسے پہلے لوگ کسی آفیسر کی سی عزت دیتے تھے، اب گلی سے گزرتا تو ہر طرف سے آوازیں ابھرتیں: ''وہ دیکھو! بے دین جا رہا ہے۔'' اگر وہ کہیں پھسل جاتا تو صدائیں بلند ہوتیں: ''اور کر خدا کا انکار۔''

روسی کی معاشی ابتری: روس کی معاشی ابتری اس درجے کو پہنچ گئی کہ ماسکو دیوالیہ پن سے بچنے کے لیے اپنے علاقے فروخت کرنے پر غور کرنے لگا۔ روسی صدر گوباچوف نے جاپان کو پیشکش کر دی کہ اگر وہ روس کی تباہ حال معیشت کو سہارا دینے کے لیے روس میں سرمایہ کاری کرے تو روس اسے وہ چار جزیرے واپس کر دے گا جو اس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران فتح کیے تھے۔ روس دنیا کا سب سے بڑا زرعی ملک شمار ہوتا تھا لیکن افغانستان سے پسپا ہونے کے بعد وہ دوسرے ملکوں سے غلہ برآمد کرنے پر مجبور ہو گیا کیونکہ ملک میں خوراک کی قلت کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ ڈبل روٹی خریدنے کے لیے لوگوں کو لمبی لمبی قطاریں بنانا پڑ رہی تھی۔ روسی روبل جو ڈالر کا مقابلہ کیا کرتا تھا اتنا گر گیا کہ اب ایک پاکستانی روپے کے بدلے دو سو روبل مل رہے تھے۔

افغان جہاد کے اثرات دیگر خطوں میں: ان حالات میں جنوری 1990ء میں گورباچوف نے ایک حیران کن بیان دیا جس میں کہا گیا کہ سوویت پارلیمنٹ، سوویت یونین میں شامل جمہوریاؤں سے متعلق ایک قانون وضع کرے گی جس کے تحت اگر کوئی جمہوریہ سوویت یونین میں شامل نہیں رہنا چاہتی تو اسے علیحدگی کا حق دے دیا جائے گا۔ روسی صدر کے اس بیان سے واضح ہو گیا کہ عنقریب سوویت یونین کے تار و پود بکھرنے کو ہیں اور وسط ایشیا میں ایک بار پھر اسلام کے چراغ جلنے والے ہیں۔ در حقیقت روس کی عبرتناک شکست کے بعد وسط ایشیائی مسلم ریاستوں میں آزادی کا زبردست ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ شمالی افغانستان کے گوریلا کمانڈر پہلے بھی دریائے آمو کے پار اکا دکا کارروائیاں کرتے رہتے تھے۔ اب نہ صرف ان کارروائیوں میں اضافہ ہو گیا بلکہ افغان جہاد میں شرکت کے لیے وہاں سے آنے والے مجاہدین نے اپنا نیٹ ورک قائم کر کے ان ریاستوں میں اسلامی حکومتیں قائم کرنے کی جدوجہد شروع کر دی تھی جن میں تاجکستان کے مجاہدین پیش پیش تھے۔ جنوری 1990ء میں ''کے جی بی'' نے اپنی ایک رپورٹ میں ماسکو حکومت کو خبردار کیا تھا کہ افغان تحریک مزاحمت کے اثرات وسط ایشیا میں پھیل چکے ہیں اور وہاں مسلح جدوجہد کے لیے نوجوانوں کو تربیت دی جا رہی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ وسط ایشیا کی مسلم آبادی کے دریائے آمو کے پار افغانوں سے صدیوں قدیم مذہبی اور ثقافتی رشتے ہیں۔ اس لیے جہادِ افغانستان کے اس دوسرے مرحلے کو روکنا مشکل ہو گیا ہے۔

مجاہدین میں اختلافات ...... اتحاد کی نئی کوششیں: اس دوران افغانستان میں مجاہدین کی نجیب انتظامیہ کے خلاف کارروائیاں جاری تھیں اور خوست خاص طور پر بڑی جھڑپوں کا مرکز تھا...... مجاہدین کی عبوری حکومت اپنے فرائض انجام دے رہی تھی۔ شرعی عدالتوں میں مقدمات بھی نمٹائے جا رہے

تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ مستقبل کی افغان حکومت کی تشکیل، شراکتِ اقتدار اور تقسیم اختیارات کے سوالات نے مجاہد رہنماؤں کو الجھا دیا تھا۔ ایسے میں مجاہدین کو باہم لڑانے کے لیے عالمی طاقتوں نے بھی بڑی سرگرمی سے کام شروع کر دیا۔ چنانچہ جہادی تنظیموں میں اختلافات بڑھنے لگے تھے اور اسی وجہ سے فتوحات کا دھارا ست پڑ گیا تھا جس سے نجیب انتظامیہ کو سنبھلنے کا موقع مل رہا تھا۔ مجاہدین کی اس باہمی کشاکشی میں حزب اسلامی اور جمعیت اسلامی کے اختلافات زیادہ واضح تھے...... جو اس وقت کی سب سے بڑی مجاہد تنظیمیں شمار ہوتی تھیں۔ جون 1990ء میں مجاہدین کے درمیان باہمی یکجہتی پیدا کرنے کے لیے ایک بہت بڑی مشاورتی کانفرنس ہوئی...... جہاد کے 12 سالوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ تمام تنظیموں کے کمانڈر ایک جگہ جمع ہوئے۔ اس مشاورت کے مقاصد یہ تھے کہ مجاہدین کی صفوں میں انتشار پھیلانے والے کمیونسٹ ایجنٹوں کی سرگرمیوں کی روک تھام کی جائے، قبائل کی باہمی دشمنیاں اور کمانڈروں کے ذاتی اختلافات دور کیے جائیں اور تنظیموں کے باہمی روابط مضبوط اور تعلقات بہتر بنائے جائیں...... مجاہد رہنماؤں کو یہ احساس بھی ہو گیا کہ فتح کابل کے لیے تمام تنظیموں کا ایک کمان کے تحت حملہ کرنے ناگزیر ہے۔ اسی مقصد کے تحت کمانڈر احمد شاہ مسعود نے اکتوبر 1990ء میں پاکستان کا دورہ کیا۔ 1979ء کے بعد یہ ان کا پہلا دورہ پاکستان تھا۔ انہوں نے چترال میں ہونے والی افغان کمانڈروں کی شوریٰ میں بھی شرکت کی۔ انہوں نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ حزب اسلامی کے سربراہ گلبدین حکمت یار سے کئی ملاقاتوں کے بعد مکمل اتفاق رائے ہو گیا ہے، یہ بھی طے ہو گیا کہ انتخابات کے ذریعے جو جماعت جس علاقے میں اکثریت حاصل کرے گی وہاں اس کی حکومت ہو گی۔

ان دنوں پاکستان میں انتخابات ہو رہے تھے کیوں کہ اگست 1990ء میں صدر پاکستان غلام اسحٰق خان نے صدارتی اختیارات استعمال کرتے ہوئے اسمبلیاں تحلیل کر کے بے نظیر بھٹو کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ بے نظیر بھٹو پر الزام تھا کہ وہ ملکی مفادات کے ادراک اور عوامی حمایت کو برقرار رکھنے میں ناکام رہی ہیں، چنانچہ عام انتخابات منعقد ہوئے جن میں اسلام پسند قوتیں آئی جی آئی (اسلامی جمہوری اتحاد) کے نام سے میاں نواز شریف کی قیادت میں لبرل سیاست دانوں کے مقابلے میں متحد ہو گئیں، اس طرح میاں نواز شریف نئے وزیر اعظم کے طور پر برسر اقتدار آ گئے۔ چوں کہ وہ جنرل ضیاء الحق کے مداح تھے اس لیے مسئلہ افغانستان میں ان سے بہتر کردار ادا کرنے کی توقعات تھیں۔

ظاہر شاہ ناکارہ مہرہ: ادھر 1990ء کے اواخر میں روس اور امریکا اس بات پر متفق ہو گئے کہ ڈاکٹر نجیب کو ہٹا کر جلاوطن سابق افغان بادشاہ ظاہر شاہ کو دوبارہ افغانستان کا کٹھ پتلی حکمران بنا دیا جائے۔ ان

کے خیال میں اس طرح وہ مجاہدین کی عبوری حکومت کو ایک مستقل حکومت میں تبدیل ہونے سے روک سکتے تھے۔ تاہم یہ منصوبہ عملی جامہ نہ پہن سکا۔ مجاہدین سمیت افغانستان کے ہر حلقے نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے اسے ناقابل عمل قرار دیا۔

1990ء کا جنگی گوشوارہ: 1990ء میں محاذوں کی عمومی رپورٹ اور جانی و مالی نقصانات کا تخمینہ درج ذیل ہے: نجیب انتظامیہ کے 2185 افراد ہلاک، 2910 زخمی اور 582 گرفتار ہوئے۔ 8218 دشمن مجاہدین میں شامل ہو گئے۔ مجاہدین نے 77 طیارے، 14 ہیلی کاپٹر، 203 ٹینک اور 121 بکتر بند گاڑیاں تباہ کیں، 32 ٹینک 64 بکتر مال غنیمت بھی حاصل کیں۔ مجاہدین کے 790 افراد شہید اور 900 زخمی ہوئے...... مجموعی طور پر 1990ء میں محاذوں کی سرگرمیاں گزشتہ سالوں کی بہ نسبت دھیمی پڑ گئی تھیں...... اس کی بڑی وجوہ مجاہدین کے باہمی اختلافات اور ان کے رہنماؤں کی سیاسی مصروفیات تھیں، نیز اب مجاہدین کو گزشتہ سالوں کی طرح کھلم کھلا بیرونی اسلحہ بھی نہیں مل رہا تھا۔

جنگِ خلیج کا الاؤ: جہاد افغانستان کے نتیجے میں دنیا میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ کشمیر میں غاصب بھارتی افواج کیخلاف کشمیریوں کی تحریک آزادی کو نیا ولولہ ملا تھا۔ کشمیری عوام نے قراردادوں اور نعروں سے آزادی کا حصول ناممکن محسوس کرتے ہوئے افغان مجاہدین کے طرز پر بھارتی افواج کے خلاف گوریلا جنگ شروع کر دی تھی جو روز بروز تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ ادھر سوویت ریاستوں میں آزادی کا ولولہ بیدار ہو چکا تھا۔ وسط ایشیا کی اسلامی ریاستوں میں روس کے خلاف مسلح تحریکیں ابھرنے لگی تھیں۔ چونکہ امریکا دنیا میں اسلام کو اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ تصور کرتا تھا اور جہاد افغانستان سے نمو پانے والی مسلح اسلامی تحریکیں اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھیں اس لیے اس نے ایسے تمام خطوں پر غلبہ پانے کے لیے ایک گھناؤنا منصوبہ بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ یہ منصوبہ دوسرے لفظوں میں پوری دنیا پر واحد سپر پاور کے تسلط کا پروگرام تھا۔ اسی کو بعد میں نیو ورلڈ آرڈر کا نام دیا گیا۔ امریکا کے لیے اب اس میں کوئی بڑی رکاوٹ بھی نہیں رہی تھی کیونکہ روس اس کے راستے سے ہٹ چکا تھا۔ روس کی پسپائی کے ساتھ ہی اب ساری دنیا اور بالخصوص عالمِ اسلام پر امریکی تسلط کا دور شروع ہو رہا تھا۔ امریکا کے منصوبے کا پہلا قدم خلیج میں جنگ کا الاؤ دہکانا تھا۔ 1990ء کے اواخر میں امریکا نے عراق کے صدر صدام حسین کو خفیہ طور پر کویت پر حملے کی ترغیب دی جس سے عراق کے پرانے تنازعات تھے۔ چنانچہ عراق نے کویت پر راتوں رات حملہ کر دیا۔ اس کے فوراً بعد امریکی لابی نے عربوں کو عراق سے ڈرا کر انہیں عراق کے خلاف ایک بڑی جنگ کے لیے آمادہ کر لیا۔ امریکا نے انہیں اطمینان دلایا کہ

وہ عراق کو شکست دینے کا کام اپنی افواج اور جدید اسلحے کے بل بوتے پر کر ڈالے گا مگر اس جنگ کا سارا خرچہ عرب ممالک ہی کے ذمے ہوگا۔ اس کے علاوہ امریکا نے کئی دیگر کڑی شرائط بھی منوالیں۔ کویت پر عراقی قبضے کے تین ماہ بعد، امریکی فوجیں خلیجی ممالک اور سعودی عرب میں اُتریں اور اسے اپنا مستقر بنا کر کئی اتحادی ممالک کی افواج کے ساتھ جنوری 1991ء میں عراق پر حملہ آور ہوگئیں۔ یہ جنگ تقریباً ایک ماہ تک جاری رہی۔ امریکا اور اتحادی ممالک کے طیاروں نے اوسطاً روزانہ اڑھائی ہزار حملے کر کے بغداد اور دوسرے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ آخر عراقی صدر صدام حسین کو شکست تسلیم کر کے کویت سے افواج نکالنا پڑیں اور اتحادیوں کی کڑی شرائط کے آگے سر جھکانا پڑا۔ اس جنگ کے نتیجے میں عراق کی عسکری و اقتصادی قوت پارہ پارہ ہوگئی جبکہ امریکا کو خلیج میں مستقل طور پر عسکری اڈے بنانے کا موقع مل گیا۔ یہ عربوں کی نادانی کا کرشمہ تھا کہ امریکا کے استعماری اقدامات کو کھلی چھوٹ مل گئی جن سے پوری اسلامی دنیا کی سلامتی کو خطرات لاحق ہوگئے۔ امریکا کا خلیج میں اڈے بنانا ایک طویل المیعاد منصوبے کی تکمیل کے لیے تھا جس کے تحت وہ مستقبل میں نہ صرف عرب دنیا بلکہ ایشیائی مسلم ممالک خصوصاً پاکستان، افغانستان اور ایران کو اپنے زیرِ دام رکھنا چاہتا تھا۔

خوست فتح ہوگیا: ادھر افغانستان میں کمیونسٹ حکومت کے خلاف مجاہدین کی کارروائیاں جاری تھیں۔ مارچ 1991ء میں مجاہدین نے خوست پر فیصلہ کن حملے شروع کردیے۔ بے پناہ قربانیوں پر مشتمل ایک طویل جدوجہد کے بعد آخر کار 31 مارچ کو مجاہدین خوست کی چھاؤنی اور شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ خوست چھاؤنی کی فتح نے کمیونسٹوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ نجیب نے اس موقع پر باقاعدہ سرکاری سطح پر سوگ منانے کا اعلان کیا۔ خوست کی فتح جہاد افغانستان کا ایک شاندار باب شمار ہوتی ہے۔ اس جنگ میں مجاہدین کی کئی تنظیموں کے سینکڑوں جانبازوں نے حصہ لیا۔ حرکۃ المجاہدین اور حرکۃ الجہاد الاسلامی کے نوجوان خطِ اول پر پیش پیش رہے۔ عظیم مجاہد رہنما مولانا جلال الدین حقانی کا کردار سب سے نمایاں رہا کہ انہوں نے اپنی پوری قوت اس معرکے میں جھونک دی تھی۔ مجاہدین نے اس لڑائی میں ٹینک بھی استعمال کیے جو مولانا جلال الدین حقانی نے فراہم کیے تھے۔ مولانا کے بھائی کمانڈر خلیل خود ایک ٹینک چلارہے تھے۔ جنگ کے آغاز میں مجاہدین کو سخت مشکلات کا سامنا تھا۔ کھانے پینے کی اشیا بہت کم تھیں۔ ان کے دو ٹینک تباہ بھی ہوئے۔ پھر ایک بڑے کمانڈر ملا قندھاری کی شہادت نے بظاہر ان کی پیش قدمی روک بھی دی تھی مگر اس کے باوجود قافلہ حق آگے بڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ فتح نے ان کے قدم چومے۔ مجاہدین نے فاتح بن کر قتل و غارت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے عفو و درگزر اور

فراخدلی کا ثبوت دیا۔ دشمنوں کو قتل کرنے کی بجائے گرفتاری پر اکتفا کیا۔ مولانا جلال الدین حقانی ہمیشہ جنگی لباس میں ملبوس رہا کرتے تھے۔ تاہم فتح خوست کے بعد وہ سفید لباس زیب تن کر کے شہر میں داخل ہوئے اور وہاں ایک مدرسے کے افتتاح کا اعلان بھی کیا۔

پچھلے مراکز میں موجود سینکڑوں مجاہدین بھی والہانہ انداز میں خوست پہنچنے لگے۔ شہر کے ائیر پورٹ پر حریف کے سینکڑوں طیارے مالِ غنیمت کے طور پر موجود تھے۔ مجاہدین ان میں بیٹھ کر لطف اُٹھانے لگے۔ اس کامیابی کے نتیجے میں دشمن کی کئی اہم پوسٹیں جو گیارہ سال سے ناقابلِ تسخیر تھیں، بغیر لڑائی کے فتح ہو گئیں۔ اس شاندار فتح کے بعد پاکستان سے کئی چوٹی کے علمائے کرام نے خوست کا دورہ کیا جن میں جمعیت علمائے اسلام کے رہنما مولانا فضل الرحمن بھی شامل تھے۔ مجاہد رہنماؤں نے اعلان کیا کہ خوست کی فتح پورے افغانستان کی فتح کا دروازہ ہے۔

خوست کی فتح میں اس وقت کے سینکڑوں جیالے فرزند کام آئے، بڑے بڑے نامی گرامی مجاہدین شہید ہوئے۔ ان میں ایک نام "نورالاسلام بابر" کا بھی ہے، یہ ایک بھارتی گلوکار تھا جسے اللہ تعالیٰ نے ہدایت عطا فرمائی۔ وہ اپنے دیس کے تاریک ماحول کو چھوڑ کر افغانستان آ گیا اور آخر دم تک مجاہدین کے شانہ بشانہ لڑتا رہا۔ نورالاسلام بابر کے پُرسوز جہادی نغمات آج بھی مسلمانوں کے دلوں کو ایک نیا جذبہ عطا کرتے ہیں۔

مجاہدین کی مزید کامیابیاں: خوست کی فتح کے بعد مجاہدین نے رکے بغیر ہرات، کابل اور غزنی کی طرف طوفانی پیش قدمی شروع کر دی۔ گردیز کے محاصرے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ حتیٰ کہ پہلے ہفتے میں فاریاب کے ضلع قیصر کو آزاد کرا لیا گیا۔ اس لڑائی میں 125 دشمن ہلاک اور 350 گرفتار ہوئے۔ ہزاروں کلاشن کوفیں اور 12 ٹینک مجاہدین کے ہاتھ آئے۔ مئی کے دوسرے عشرے میں تخار میں کمیونسٹوں کے پانچ ہزار فوجیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ کارروائی احمد شاہ مسعود کی کمان میں ہوئی۔ تخار کے تین اضلاع پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا۔ 28 مئی کو مجاہدین شدید جنگ اور محاصرے کے بعد قندھار میں داخل ہو گئے۔ کمیونسٹوں کو پسپا ہونا پڑا۔ مجاہدین نے قندھار ائیر پورٹ کو ناکارہ بنا دیا۔

گردیز کا محاذ: 1991ء کے پورے موسمِ گرما میں گردیز شدید ترین جنگ کا میدان بنا رہا۔ مجاہد تنظیموں کے مشترکہ لشکر نے گردیز کا سخت ترین محاصرہ کیا ہوا تھا اور کمیونسٹوں کو اپنی موت آنکھوں کے سامنے نظر آ رہی تھی۔ موسمِ سرما میں بھی یہ صورتِ حال برقرار رہی۔ دسمبر 1991ء میں مجاہدین نے کابل گردیز شاہراہ پر قبضہ کر کے کمیونسٹوں کی مشکلات میں مزید اضافہ کر دیا۔ ادھر خود کمیونسٹوں میں پھوٹ پڑ گئی اور ان میں کشت و خون کی نوبت آ گئی۔ دسمبر کے اواخر میں گردیز چھاؤنی میں نجیب افواج کے

متحارب دھڑوں میں گولہ باری سے 70 فوجی ہلاک ہو گئے۔

سوویت یونین مردار...... ریاستیں آزاد: اس دوران تیزی سے شکست وریخت کا شکار سوویت یونین اگست 1991ء میں اپنی موت آپ مرگیا۔ اس میں شامل ریاستوں نے خودمختاری کا دعویٰ کردیا۔ دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وسط ایشیا کی تمام ریاستوں نے اسلامی ممالک کی حیثیت سے آزادی کا اعلان کیا ہے۔ سوویت روس کے عوام نے خود کمیونزم سے بیزاری کا کھل کر مظاہرہ کیا۔ ماسکو میں مشتعل ہجوم نے کمیونزم کے بانی کارل مارکس کے مجسمے کے منہ پر سیاہی مل دی اور ہتھوڑوں سے اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔ کمیونسٹ انقلاب کے بانی لینن کا دیوپیکر بت کرین کے ذریعے گرا کر پاش پاش کردیا گیا۔ کمیونسٹ پارٹی تحلیل کردی گئی۔ گورباچوف سرتوڑ کوشش کے باوجود سوویت یونین کو بچا سکا اور نہ اپنی کرسی کو۔ دسمبر 1991ء میں اسے مجبوراً اپنے منصب سے استعفیٰ دینا پڑا۔ اس کی جگہ ''بورس یلسن'' نے روس کے نئے حکمران کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

نیوورلڈ آرڈر: سوویت یونین کی شکست وریخت اور جنگ خلیج 1991ء کے بعد امریکا نے پوری دنیا پر تسلط کے لیے ''نیو ورلڈ آرڈر'' کے نام سے ایک تھانیداری نظام متعارف کرایا جس کے تحت اس نے دنیا بھر میں ''امن وامان'' کے قیام کو اپنی ذمہ داری قرار دیا اور اس مقصد کے لیے ہر ممکن اقدامات کرنے کا جواز پیدا کیا۔ اس پروگرام میں روس امریکا کے شانہ بشانہ تھا۔ اس کے علاوہ برطانیہ، فرانس، جاپان اور دیگر عالمی طاقتوں نے بھی ''نیو ورلڈ آرڈر'' کے مقاصد کے حصول میں امریکا کا ساتھ دیا۔ نیو ورلڈ آرڈر کے بنیادی مقاصد تین تھے:

1. افغانستان سمیت دنیا میں کہیں بھی بنیاد پرستوں (پختہ فکر مسلمانوں) کی حکومت قائم نہ ہونے پائے۔
2. مشرق وسطیٰ میں عربوں پر اسرائیل کی عسکری وسیاسی بالادستی اس طرح مکمل طور پر قائم کردی جائے کہ عرب ممالک اسرائیل کے سامنے جھک جائیں۔
3. دنیا بھر میں اسلام کے احیاء کی مؤثر تحریکوں کو سبوتاژ کردیا جائے۔ اس سلسلے میں 13 ستمبر 1991ء کو ماسکو میں روس امریکا معاہدہ ہوا جس کا اصل مقصد یہ تھا کہ امریکا ان ممالک کو جو اس کی تھانیداری قبول کرتے ہیں، مجاہدین کا تعاون بند کرنے پر مجبور کرے گا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1991ء کے اواخر تک بہت سے پُرجوش اسلامی ممالک بھی مجاہدین کی اعانت سے دست کش ہوگئے جن میں پاکستان اور سعودی عرب بھی شامل تھے۔

امریکا کو خطرہ تھا کہ اگر افغانستان میں اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو مستقبل میں وسط ایشیا کی آزاد مسلم

ریاستیں جن میں کیمونزم کے اثرات نہایت گہرائی کے ساتھ رچ بس گئے تھے، اس اسلامی نظام کے ماتحت آجائیں گی۔ اس لیے وہ افغانستان میں اسلامی حکومت کا خواب سبوتاژ کرنے کے لیے مجاہدین کو ایسی مخلوط حکومت بنانے پر مجبور کرنے لگا جس میں بنیاد پرست مسلمانوں کی نمائندگی کم از کم ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نجیب انتظامیہ کو بھی بھرپور مدد فراہم کر رہا تھا تاکہ اس طرح مجاہدین پر سیاسی اور عسکری دباؤ ڈال کر انہیں اپنی من پسند حکومت کی تشکیل پر آمادہ کر سکے۔ خود نجیب نے نومبر 1991ء میں واشنگٹن پوسٹ کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے اس ضرورت کو کھل کر بیان کیا تھا اور کہا تھا کہ میری حکومت اس علاقے میں امریکا اور اسرائیل کے مفادات کا بہتر تحفظ کر سکتی ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر کے فوری اثرات اس وقت عیاں ہو گئے جب الجزائر میں ہونے والے عام انتخابات میں "اسلامی سالویشن فرنٹ" نے 202 نشستیں حاصل کیں جبکہ اس کی مخالف سیکولر پارٹی صرف 17 سیٹیں حاصل کر سکی مگر اس موقع پر نیو ورلڈ آرڈر کے مقاصد کے تحت الجزائر کی فوج نے مارشل لا لگا کر الیکشن کے نتائج کو کالعدم قرار دے دیا۔ اس سانحے نے ثابت کر دیا کہ امریکا افغانستان میں بھی اسلامی حکومت نہیں بننے دے گا اور اس مقصد کے لیے کسی قاعدے یا حد کا پابند نہیں رہے گا۔

پختون، ازبک اور تاجک کا فتنہ: نجیب حکومت کا دم لبوں پر دیکھ کر عالمی طاقتیں افغانستان کو مستقل خانہ جنگی میں مبتلا رکھنے کا ایک گھناؤنا منصوبہ ترتیب دے رہی تھیں۔ اس منصوبے کا خلاصہ افغانستان کی لسانی بنیادوں پر تقسیم تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ اسلام اور کیمونزم کے درمیان برپا معرکوں کو پشتون اور غیر پشتون کی لڑائیوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس طرح جہاد اور اسلامی نظام کے قیام کا ہدف پس پشت چلا جائے گا اور جنگجو افغان اپنی صلاحیتیں باہم کٹ مرنے میں ضائع کرتے رہیں گے۔ سابق افغان حکمران اور کیمونسٹ پارٹی کے "پرچم" دھڑے کے سربراہ ببرک کارمل کو اس مقصد کے لیے ایک بار پھر متحرک کیا گیا۔ اس کے دھڑے میں زیادہ تر ازبک، تاجک اور فارسی بان شامل تھے جن کی اکثریت شمالی افغانستان میں آباد تھی۔ انہوں نے کارمل کے اشارے پر شمال میں نجیب کی گرفت سے آزاد مقامی حکومتیں قائم کر لیں اور نجیب سمیت تمام پختونوں کے خلاف نفرت آمیز پروپیگنڈا شروع کر دیا۔

اس دوران مجاہدین نے خوست فتح کیا تو نجیب کی پوزیشن مزید کمزور ہو گئی۔ اس تناسب سے شمال کے کیمونسٹ جنرلوں کی خود مختاری میں اضافہ ہو گیا۔ انہوں نے پختون اور غیر پختون منافرت بڑھانے کے لیے یہ پروپیگنڈا بھی کیا کہ خوست کی فتح کے بعد فارسی، تاجک اور ازبک کیمونسٹوں کا قتل عام کیا گیا جبکہ پختون کیمونسٹوں کو زندہ چھوڑ دیا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ پختون کیمونسٹ ہوں یا مجاہد، وہ سب

ایک ہیں اور غیر پختونوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

ببرک کارمل کے اشارے پر کام کرنے والا شمال کا سب سے بڑا کمانڈر رشید دوستم تھا جس کا مرکز جوز جان تھا۔ وہ ایک اکھڑ اور ستم پیشہ انسان تھا۔ اس کے ماتحت ہزاروں جنگجو تھے۔ میزائلوں اور طیاروں سمیت اسے ہر قسم کے عسکری وسائل میسر تھے۔ اس کا بھائی مجید دوستم بھی ایک اہم کمانڈر تھا۔ ان کی فوج گلم جم میشیا کہلاتی تھی۔

انہی دنوں شمال کے "حیرتان" بارڈر پر تعینات جنرل مومن بھی (جو نظریاتی طور پر ببرک کارمل کا حامی تھا) نجیب سے نالاں ہوگیا۔ اس نے اسمگلنگ اور لوٹ مار کے ذریعے بے پناہ دولت جمع کر لی تھی اور تاشقند میں بڑے بڑے محلات تعمیر کرا لیے تھے۔ اس نے پختون کمیونسٹوں سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے نجیب کے بعض احکام کو کھلم کھلا مسترد کر دیا۔ کابل میں نجیب کا کمانڈر جنرل نبی عظیمی بھی خفیہ طور پر ببرک کارمل کے لیے کام کر رہا تھا اور نجیب سے بغاوت کے لیے تیار تھا۔ ان کے علاوہ نجیب حکومت کا وزیرِ خارجہ عبدالوکیل اور جنرل اسلم وطن یار کابل میں نجیب کے خلاف محلاتی سازشوں کے بنیادی کردار تھے۔

مجاہد رہنما لسانیت کے جال میں: یہاں تک تو بات مجاہدین کے حق میں تھی کہ کمیونسٹ پختون اور غیر پختون میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے کے خلاف سرگرم ہو چکے ہیں۔ اگر مجاہد رہنما ذاتی اغراض خصوصاً ہوسِ اقتدار سے بالاتر رہتے ہوئے اتحاد و اتفاق اور حکمت و تدبر سے کام لیتے تو اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر پورے افغانستان کو کمیونسٹوں سے پاک کر کے ملک میں اللہ کا عطا کردہ نظام نافذ کر سکتے تھے مگر ان میں سے بعضوں کی مفاد پرستی، ہوسِ وجاہ اور باہمی اعتماد کے فقدان نے کمیونسٹوں کو کھل کر یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ یہاں روس اور امریکا کی سازشوں کو کامیابی سے آگے بڑھاتے رہیں۔ مجاہدین کی جانب سے اس نادانی کا پہلی بار اظہار اس وقت ہوا جب ایک طرف احمد شاہ مسعود نے شمالی افغانستان کی مجاہد تنظیموں کے اتحاد "شورائے نظار" کے چیئرمین ہونے کی حیثیت سے شمالی افغانستان کا کنٹرول سنبھالنے والے، نجیب کے باغی کیمونسٹ کمانڈروں سے حلیفانہ تعلقات قائم کیے اور اُدھر گلبدین حکمت یار نے نجیب کے معتمد کمانڈروں جنرل رفیع اور جنرل شاہنواز تنائی سے خفیہ روابط استوار کیے۔ اگر ہم حسنِ ظن سے کام لیں تو کہہ سکتے ہیں کہ دونوں مجاہد کمانڈر کمیونسٹوں کو مجاہدین کے اقتدار کے نیک مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہ رہے تھے۔ مگر دنیا نے دیکھا کہ حالات کچھ اور رُخ اختیار کر گئے اور وہ نہ ہوا جس کی مسلمانوں کو ان قائدین کی سیاسی و عسکری بصیرت سے توقع تھی۔ گلبدین حکمت یار نے جنرل شاہنواز کو حزبِ اسلامی کا تعاون فراہم کر کے نجیب کے خلاف بغاوت کرائی مگر یہ کوشش کامیاب نہ

ہو سکی۔ بلکہ ہوا یہ کہ شمال میں اس کوشش کو بھی پختونوں کی سازش سے تعبیر کیا گیا۔

مسعود کے مددگار: اس دوران احمد شاہ مسعود، رشید دوستم اور دوسرے کمیونسٹ جنرلوں کے درمیان لسانی بنیادوں پر روابط مضبوط ہوتے گئے۔ کابل انتظامیہ کے ایک بڑے کمانڈر جنرل آصف دلاور سے بھی احمد شاہ مسعود کے خاص تعلقات قائم ہو گئے کیوں کہ آصف دلاور بھی تاجک تھا۔ انہی دنوں اہلِ شمال کے اس اتحاد میں ایک اور نئی طاقت شامل ہو گئی۔ یہ بغلان کے مشہور اسماعیلی پیشوا سید کیان اسماعیل کا پوتا منصور نادری تھا۔ وہ امریکا میں زیرِ تعلیم ایک عیاش نوجوان تھا اور شراب و شباب کا دلدادہ تھا۔ امریکا نے اسے کامیاب مہرے کے طور پر استعمال کرنے کے لیے اپنے خاص تعاون کے ساتھ افغانستان بھیج دیا۔ یاد رہے کہ منصور نادری کے دادا سید کیان کو روسی یلغار کے دوران ماسکو کی مکمل سرپرستی اور بھرپور مالی و عسکری حمایت حاصل رہی تھی۔ اب امریکا پوتے کو اسی قسم کے کردار کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ بہر کیف! یہ مختلف الخیال جنگجو گروہ ''پختون حکمرانی کے خاتمے'' کے مشترکہ ہدف کے لیے جمع ہو گئے اور ان میں شامل معروف جہادی رہنما احمد شاہ مسعود کو اب ایک لبرل مسلمان اور تاجک قوم کے نمائندے کے طور پر شہرت ملنے لگی۔

ان حلیفانہ تعلقات کی بنا پر اہلِ شمال نے نجیب انتظامیہ سے بغاوت کر کے صوبہ تخار اور پروان احمد شاہ مسعود کے حوالے کر دیے۔ اسی اتحاد کے بل بوتے پر احمد شاہ مسعود، دوستم ملیشیا اور حزبِ وحدت نے شمال کے اہم ترین شہر ''بلخ'' پر قبضہ کیا۔ شہر فتح کرنے کے بعد وہاں جو لوٹ مار ہوئی اس سے لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور یہ واضح ہو گیا کہ جمعیتِ اسلامی تمام تر دعوؤں کے باوجود کمیونسٹوں پر حاوی نہیں۔ حالانکہ اس سے قبل احمد شاہ مسعود کے بیانات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ جمعیت اسلامی جب چاہے کمیونسٹوں کو مار بھگائے گی۔ لبرل افغانستان کے خواب کی تکمیل کے لیے 1992ء کے اوائل میں عالمی طاقتوں نے ایک بار پھر ظاہر شاہ کو افغانستان واپس لانے اور اس کے ذریعے ایک وسیع البنیاد حکومت کے قیام کا شوشہ بڑے زور و شور سے اُٹھایا مگر اکثر مجاہد رہنماؤں نے اسے قبول نہ کیا۔

فتح و شکست کا وقت اللہ کے علم میں ہے: حزب اسلامی اور جمعیت اسلامی میں لسانیت کی بناء پر افتراق کی وجہ سے مجاہدین کی طاقت بکھر گئی اور فتح کابل میں تاخیر در تاخیر ہوتی چلی گئی۔ فروری 1992ء میں فاتح خوست مولانا جلال الدین حقانی نے کراچی کا دورہ کیا اور اپنی تقریر میں کہا کہ ہمارا جہاد کسی شخصیت یا نام کے خلاف شروع نہیں ہوا بلکہ باطل نظام کی سرکوبی کے لیے شروع ہوا تھا اور باطل نظام کے خاتمے تک جاری رہے گا۔ انہوں نے کابل کی فتح میں تاخیر کے بارے میں اُٹھائے گئے شبہات کی نفی

کرتے ہوئے کہا: ''لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اب تک فتح کیوں نہیں ہوتی تو یہ اعتراض بالکل عبث ہے۔ اس جہاد کی بدولت افغانستان کے کتنے علاقے آزاد ہو چکے ہیں اور سوویت ریاستیں آزاد ہو رہی ہیں۔ خود حضور اکرم ﷺ نے مکہ کئی سال بعد فتح فرمایا۔ فتح و شکست کا وقت اللہ کے علم میں ہے۔''

اس کے کچھ ہی دنوں بعد کابل کا فیصلہ کن معرکہ شروع ہو گیا۔ جس سے پوری دنیا میں کھلبلی مچ گئی۔

کابل کا محاصرہ: مارچ 1992ء میں احمد شاہ مسعود، حکمت یار، رشید دوستم اور دیگر کمانڈروں نے اپنی افواج کابل کے گرد جمع کرنا شروع کر دی تھیں۔ نجیب کی جانب سے احمد شاہ مسعود کو 40 لاکھ ڈالر کی پیش کش کی گئی کہ وہ پیچھے ہٹ جائے مگر احمد شاہ مسعود نے یہ پیش کش مسترد کر دی۔ ادھر حزب اسلامی نے نجیب کو 25 اپریل تک ڈیڈ لائن دے دی کہ وہ کابل کو مجاہدین کے حوالے کر دے ورنہ مجاہدین بزور قوت شہر میں داخل ہو جائیں گے۔

ماخذ و مراجع

- ...... افغانستان کی کہانی، حقائق کی زبانی۔ ڈاکٹر مفکر احمد
- ...... ماہنامہ صدائے مجاہد: جلد 1988ء، 1989ء، 1990ء، 1991ء، 1992ء
- ...... ماہنامہ الارشاد: جلد 1988ء، 1989ء، 1990ء، 1991ء، 1992ء
- ...... ہفت روزہ تکبیر: جلد 1988ء، 1989ء، 1990ء، 1991ء، 1992ء
- ...... اردو ڈائجسٹ: مارچ 1989ء، جہاد افغانستان نمبر اپریل 1989ء، جہاد افغانستان نمبر فروری 1990ء، جون 1992ء

انیسواں باب

فتح کابل، مجاہدین کی حکومت اور خانہ جنگی

حکومت سازی پر مجاہدین کا اختلاف: اپریل میں کابل کا محاصرہ جاری تھا مگر اس دوران مجاہد تنظیموں میں اختلافات کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ یہ بات افسوس ناک تھی کہ کابل کے دروازے پر کھڑی مجاہد تنظیموں میں اب تک حکومت بنانے کے کسی فارمولے پر مکمل اتفاق نہیں ہو سکا تھا۔ ہر ایک کا اپنا اپنا نظریہ تھا۔ گلبدین حکمت یار اور پروفیسر برہان الدین ربانی دونوں حکومت سازی کے لیے انتخابات کو واحد طریقہ تصور کرتے تھے مگر حکمت یار انتخابات کے فوری انعقاد کے خواہاں تھے جبکہ ربانی اس مرحلے کو موخر کرنا چاہتے تھے۔ بعض رہنما جیسے صبغت اللہ مجددی، پیر احمد گیلانی اور مولانا محمد نبی محمدی ان بکھیڑوں میں پڑنے کی بجائے ظاہر شاہ کی افغانستان واپسی کو ترجیح دے رہے تھے۔ ان کے نزدیک ملک کے قدیم رواج کے مطابق "لویہ جرگہ" ہونا اور ظاہر شاہ کو اقتدار سپرد کر دینا اختلافات کا واحد حل تھا۔ کسی ممکنہ حل تک پہنچنے کے لیے پشاور میں مجاہد تنظیموں کا اجلاس شروع ہوا جو کئی دن تک جاری رہا۔ پروفیسر سیاف نے اس مشاورت میں اہم کردار ادا کیا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ صدیق کانجو اور آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل جاوید ناصر بھی اس اجلاس میں شریک تھے۔ سعودی حکمران شاہ فہد نے بھی ایک خط لکھ کر مجاہدین کو تاکید کی کہ وہ آپس کے اختلافات کو احسن طریقے سے ختم کر دیں۔

گلبدین حکمت یار اس اہم اجلاس میں شرکت کیے بغیر افغانستان چلے گئے تھے کیوں کہ انہیں خدشہ تھا کہ احمد شاہ مسعود گلم جم ملیشیا اور شیعہ تنظیموں کے ساتھ مل کر کابل پر مکمل قبضے کی تیاری کر رہا تھا۔ حالانکہ یہ بات مجاہدین کے درمیان طے تھی کہ حکومت سازی کے فارمولے پر اتفاق کے بعد وہ کابل میں داخل ہوں گے کیونکہ اس کے بغیر فتح خانہ جنگی میں بدل سکتی تھی۔ حکومت سازی کے بارے میں حکمت یار کا اپنا خیال یہ تھا کہ فی الحال حکومت عبوری کونسل کے 38 ارکان کے سپرد کر دی جائے جو ایک سال تک برقرار رہے اور اس دوران مستقل حکومت کے لیے انتخابات کروائے جائیں۔

نئی عبوری حکومت کی تشکیل: بہر حال حکمت یار کی مرضی کے خلاف 24/اپریل 1992ء کو مجاہد تنظیموں کے سربراہوں کے درمیان حکومت سازی کے مندرجہ ذیل معاہدے پر اتفاق ہوگیا:

① پروفیسر صبغت اللہ مجددی (جو جہادِ افغانستان کے بزرگ رہنما تھے) دو ماہ کے لیے کابل کی عبوری حکومت کے سربراہ ہوں گے۔

② دو ماہ بعد جمعیت اسلامی کے سربراہ پروفیسر برہان الدین ربانی دو سال تک کے لیے صدر بن جائیں گے۔

③ وزارتِ عظمیٰ کا منصب گلبدین حکمت یار کو دیا جائے گا۔

④ وزارتِ داخلہ، اتحاد اسلامی کے استاذ سیاف کو، وزارتِ تعلیم مولانا یونس خالص کو اور وزارتِ خارجہ پیر سید احمد گیلانی کی تنظیم "محاذ ملی اسلامی" کو دی جائے گی۔

⑤ وزارتِ دفاع جمعیت اسلامی کے احمد شاہ مسعود کے سپرد ہوگی۔

⑥ وزارتِ عدلیہ، حرکت انقلاب اسلامی کے مولوی محمد نبی محمدی کے حوالے ہوگی۔

⑦ نیز تین وزارتیں شیعہ تنظیموں کو دی جائیں گی۔

اس معاہدے پر تمام تنظیموں کے اتفاق کے باوجود گلبدین حکمت یار نے اسے مسترد کر دیا اور اپنے حسبِ مرضی فارمولے پر اصرار جاری رکھا۔ حکمت یار خود کابل کے قریب اپنے مورچوں میں پہنچ گئے تاکہ شہر پر قبضے کی کارروائی کی براہِ راست قیادت کرسکیں۔ شیعہ تنظیموں نے شروع سے اجلاس کا بائیکاٹ کیا تھا کیونکہ وہ حکومت میں 25 فیصد حصے کی طلب گار تھیں۔

مسعود کا شیعوں اور کمیونسٹوں سے اتحاد: شیعہ تنظیموں کا عسکری اور سیاسی طور پر کوئی خاص وزن نہ تھا مگر اس موقع پر انہوں نے افغانستان کی نئی عبوری حکومت میں اپنے استحقاق سے زیادہ حصہ وصول کرنے کے لیے بھرپور کوشش کی۔ چھوٹے چھوٹے شیعہ گروپوں پر مشتمل حزبِ وحدت ان کی نمائندہ تھی۔ کریم خلیلی اس اتحاد کا مرکزی لیڈر تھا۔ چونکہ ایران اس اتحاد کا پشت پناہ تھا اس لیے خلیلی ایران اور پشاور کے درمیان چکر لگاتا رہتا تھا۔ بعد میں ان کے ایک رہنما آیت اللہ محسنی نے خلیلی سے علیحدہ ہوکر الگ شیعہ اتحاد بنالیا۔ اس گروپ نے معاہدہ پشاور کو مسترد کردیا جس میں صبغت اللہ مجددی کو عبوری حکومت کا سربراہ مقرر کیا گیا تھا اور شیعہ گروپوں کو تین وزارتوں کا حق دار تسلیم کیا گیا تھا۔ ایران کے مذہبی رہنما خامنہ ای نے کھلے لفظوں میں کہا کہ ایران صرف تین وزارتوں پر راضی نہیں، اسے پورا حق دیا جائے۔

احمد شاہ مسعود نے اس موقع پر اپنی فطری ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے شیعہ گروپوں کو اپنے قریب

کرلیا۔ ساتھ ہی رشید دوستم کی گلم جم ملیشیا اور کیمونسٹوں کا اعتماد بھی حاصل کرلیا۔ دراصل احمد شاہ مسعود بادشاہ گر بننا چاہتا تھا مگر طبقہ جو پختون طبقہ جس کا تناسب مسعود کے حامی تاجکوں سے بہرحال زیادہ تھا مسعود کو حکمران کے طور پر قبول نہیں کرسکتا تھا۔ اس لحاظ سے مسعود کے سیاسی حریف گلبدین حکمت یار کی پوزیشن بہت مضبوط تھی۔ مسعود کے نزدیک اس کا توڑ یہی ہوسکتا تھا کہ شیعوں اور کیمونسٹوں کو ساتھ ملایا جائے۔ احمد شاہ مسعود کو پہلے ہی شمالی افغانستان کی جہادی تنظیموں کے اتحاد ''شورائے نظار'' کے رئیس کی حیثیت حاصل تھی۔ اب شورائے نظار، حزب وحدت اور گلم جم ملیشیا کے اتحاد سے ایک بڑی طاقت وجود میں آگئی جو کابل پر قابض ہوکر حسب مرضی حکومت بناسکتی تھی۔

<u>نجیب کابل سے فرار کیوں نہ ہوسکا؟</u> اپریل 1992ء میں مجاہدین نے کابل کا محاصرہ کیا تو شہر میں نجیب کے خلاف بغاوت کی فضا بن چکی تھی۔ اس وقت جنرل نبی عظیمی اور دوسرے کمیونسٹ افسران نے نجیب کو یہ پُرفریب مشورہ دیا کہ وہ رشید دوستم کی ملیشیا کو کابل کی حفاظت کے لیے طلب کرلے۔ نجیب نے یہ بات مان لی، رشید دوستم گیارہ طیاروں میں مسلح جنگجو لے کر کابل کے ہوائی اڈے پر اُترا اور ائیرپورٹ، ریڈیو اسٹیشن، ٹی وی اسٹیشن اور دیگر اہم مقامات پر قابض ہوگیا۔ اس کے بعد نجیب نے جنرل عظیمی کے دباؤ پر مجبوراً اپنے عہدے سے استعفیٰ دیا اور کسی جائے پناہ کی تلاش میں بیرون ملک جانے کے لیے، ائیرپورٹ روانہ ہوگیا مگر راستے میں کیمونسٹوں کے ایک کمانڈر عبدالرزاق نے طے شدہ منصوبے کے مطابق اس کو روک کر واپس کردیا۔ آخر نجیب ایک لٹے پٹے مسافر کی طرح اقوام متحدہ کے دفتر میں پناہ لینے پر مجبور ہوگیا۔ درحقیقت قدرتِ خداوندی مسلمانوں کے اس قاتل کو فرار کا موقع نہیں دینا دینا چاہتی تھی جس کے مظالم سے سرزمین افغانستان کا سینہ شق تھا۔ اسے اپنے جرائم کی عبرتناک سزا ان سچے مومنوں کے ہاتھوں ملنا لکھی تھی، جو ابھی منظر عام پر نہیں آئے تھے۔

<u>مسعود نے دوستم ملیشیا کو کابل کیوں بلایا؟</u> نجیب کے استعفے کے بعد کابل کا انتظام وفاقی کونسل کے چیئرمین جنرل نبی عظیمی اور دوسرے کمیونسٹوں نے سنبھال لیا۔ احمد شاہ مسعود کی کوشش یہ تھی کہ وہ شمال کے کمیونسٹوں پر بھی غالب رہے اور مجاہد تنظیموں میں بھی اس کا پلہ سب سے بھاری ہو۔ پہلے مقصد کے حصول کے لیے بلخ اور مزار شریف پر تنہا جمعیتِ اسلامی کا قبضہ ضروری تھا اور دوسرے مقصد کے لیے کابل کا مکمل طور پر زیرنگین آنا شرط تھا۔

احمد شاہ مسعود نے ''ایک تیر سے دو شکار'' کرنے کی کوشش کی اور فتح کابل کے موقع پر دوستم ملیشیا کے زیادہ سے زیادہ افراد کو کابل بلالیا۔ اس طرح شمالی افغانستان میں دوستم کی عسکری طاقت کم ہوگئی جس

سے احمد شاہ مسعود مناسب موقع پر فائدہ اُٹھا کر بلخ اور مزار شریف پر مکمل تسلط حاصل کر سکتا تھا۔ دوسری طرف کابل میں جمعیت اسلامی کے حامی کیمونسٹوں کا کنٹرول ہو گیا جو مسعود کی فتح کے مترادف تھا۔ مزید برآں یہ کہ حزبِ اسلامی کے مقابل مسعود کو اپنی افواج زیادہ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں رہی کیوں کہ حزب کا مقابلہ کرنے کے لیے کیمونسٹ موجود تھے۔

اس منظر نامے کو دیکھ کر بظاہر تو ایسا لگتا تھا کہ مسعود بہت کامیاب جا رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کامیابیاں احمد شاہ مسعود کو اس کے اصل راستے سے دور لے گئیں۔ شطرنج سیاست و عسکریت کی اس بازی میں مقاصد اس طرح اُلجھ گئے کہ جہاد اور نفاذِ اسلام جیسے اہم حقائق بھولی بسری داستان بن گئے۔ یہ بھی نہ ہوا کہ جمعیت اسلامی کیمونسٹوں پر غالب رہتی بلکہ وہ خود ان کے زیرِ دام آ گئی۔ دوستم ملیشیا کو کابل میں مداخلت کا موقع دینا، کیمونسٹوں کی ان سازشوں کو تکمیل کا ذریعہ بنا جس کے تانے بانے روس امریکا نے بُنے تھے۔ اپریل 1992ء کے آخری تیرہ دن افغانستان کی تاریخ میں نہایت اہم حیثیت رکھتے ہیں اس لیے ہم ان ایام کی روداد ترتیب وار پیش کرتے ہیں۔

کابل پر قبضے کے لیے جوڑ توڑ: 18 اپریل کو پشاور کے گورنر ہاؤس میں مجاہد رہنماؤں کا طویل ترین اجلاس ہوا جس میں وزیر اعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف بھی شریک تھے۔ اجلاس کسی نتیجے کے بغیر ختم ہو گیا۔ حکمت یار اجلاس کے دوران ہی پشاور سے افغانستان چلے گئے۔ کیونکہ خبر ملی تھی ایران کے انقلابی کمانڈر شیعہ گروپوں کی مدد کے لیے زابل میں داخل ہو گئے ہیں اور شین ڈنڈ ائیر پورٹ پر قبضے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دراصل یہ سب کچھ امریکا اور دوسری عالمی طاقتوں کے ایما پر ہو رہا تھا۔ یہ طاقتیں ایران کے ذریعے افغانستان میں مجاہد تنظیموں کے مقابلے میں ایک متوازی طاقت منظم کرنا چاہتی تھیں تا کہ افغانستان میں بدامنی اور خانہ جنگی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے۔

گلبدین حکمت یار کے افغانستان پہنچنے سے ایک روز قبل حزب اسلامی نے کابل کے گرد اپنے مضبوط مورچوں سے نکل کر شہر کے شمال مغرب میں خیبر خانہ کی پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب حزبِ اسلامی کے مورچے وزارتِ دفاع کی عمارت ''دارالامان'' سے صرف 10 کلومیٹر کے فاصلے پر آ گئے تھے اور یہاں سے شہر پر میزائل داغے جا رہے تھے۔

ادھر حزبِ اسلامی کے مقابلے کے لیے رشید دوستم اور کیمونسٹ جنرل عبدالمومن کے دھڑوں نے باہم اتحاد کر لیا۔ کیمونسٹوں کے جنرل آصف دلاور، جنرل بابا جان اور جنرل نبی عظیمی بھی اس وقت حزب اسلامی کے مقابل تھے۔ احمد شاہ مسعود نے بھی کابل پر گرفت مضبوط رکھنے کے لیے طیاروں کے ذریعے

کچھ فوج بگرام ایئر پورٹ پر اُتار دی۔ شہر پر قبضے کی اس کشمکش کے دوران کئی مجاہد رہنما مجاہدین سے اپیل کرتے رہے کہ وہ کابل پر حملے سے احتراز کریں کیونکہ یہ انتقالِ اقتدار کے معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔ تاہم ایسی صدائیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں۔

پیر 20/اپریل کو پلِ چرخی جیل نجیب انتظامیہ کی گرفت سے آزاد کرالی گئی۔ یہاں موجود چار ہزار افراد کو رہائی نصیب ہوئی۔ انقلاب ثور کے بعد سے اس عقوبت خانے میں روسیوں اور کمیونسٹوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر ناقابلِ بیان مظالم کا سلسلہ جاری تھا۔ اس دن حکمت یار نے کابل کے باہر اپنے معسکر سے حزب کے ریڈیو ''پیام آزادی'' پر اعلان کیا کہ وہ کابل اور دوسرے شہروں کا محاصرہ چھوڑنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ کمیونسٹ مسلح گروپ کابل سے نکل جائیں اور اقتدار بلاشرکت غیرے مجاہدین کے حوالے کیا جائے۔ اگلے ایک دو دنوں میں یہ بات واضح ہوگئی کہ احمد شاہ مسعود کو مغربی ممالک اور امریکا کے ہاں مقبولیت حاصل ہوگئی ہے اور مغربی طاقتیں کسی تنظیم کی حمایت اور کسی کی مخالفت کر کے مجاہدین کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے درپے ہیں۔ امریکی وزارتِ خارجہ کے ترجمان نے منگل 21/اپریل کو واضح کیا کہ امریکا احمد شاہ مسعود کی سربراہی میں وسیع البنیاد حکومتی تشکیل دینا چاہتا ہے۔ بدھ 22/اپریل کو احمد شاہ مسعود نے گلبدین حکمت یار سے 40 منٹ تک وائرلیس پر بات چیت کی کہ وہ کابل پر میزائل باری کا سلسلہ بند کر دیں مگر حکمت یار نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا۔ جواباً مسعود نے اعلان کیا کہ اب وہ بزورِ قوت کابل کا دفاع کرنے پر مجبور ہوں گے۔

جلال آباد فتح ہوگیا: جمعرات 23/اپریل 1992ء کا دن جلال آباد کی فتح کا مژدہ لے کر آیا۔ مجاہدین نے تین سال سے اس کا محاصرہ کر رکھا تھا اور اس دوران یہاں ان گنت معرکے ہوئے تھے جن میں بڑے بڑے نامور مجاہدین نے جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ دو سال قبل مجاہدین کو جلال آباد سے پسپائی بھی ہوئی تھی جس کے بعد نجیب حکومت نے جلال آباد کو ناقابلِ تسخیر قرار دیا تھا مگر مجاہدین نے تیاری کر کے دوبارہ شہر کا محاصرہ کیا اور ایک سال کی لگاتار کوشش کے بعد آخر فتح کابل سے ذرا پہلے یہ شہر مجاہدین کے قبضے میں آگیا۔

عبوری حکومت کی تشکیل کا معاہدہ طے پا گیا: جمعہ 24/اپریل 1992ء کو پشاور میں مجاہدین کا اہم اجلاس ہوا جس میں حکومت پاکستان اور سعودی حکمران شاہ فہد کے نمائندہ خصوصی شہزادہ ترکی الفیصل نے متفقہ طور پر اس معاہدے کی توثیق کی جس میں صبغت اللہ مجددی کو دو ماہ کے لیے عبوری افغان حکومت کا سربراہ مقرر کیا گیا تھا۔ تاہم حزب اسلامی نے اب بھی معاہدے میں شمولیت اختیار نہ کی۔

اجلاس کے بعد صبغت اللہ مجددی نے تمام مجاہد تنظیموں سے اپیل کی کہ وہ نئی عبوری حکومت کی تابعدار رہیں۔ انہوں نے عنقریب 50/افراد کی کابینہ کے ہمراہ کابل جانے کا اعلان بھی کیا۔ بہر کیف کابل کا محاصرہ کرنے والی تنظیموں اور گروپوں نے پشاور میں ہونے والے فیصلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی روش برقرار رکھی۔ 24/اپریل کو جس دن اس معاہدے کی توثیق ہوئی، اسی دن دوستم ملیشیا نے کابل ایئر پورٹ پر قبضہ کرلیا۔ اگلا دن یعنی اتوار 25/اپریل 1992ء ''فتح کابل'' کا دن کہلاتا ہے۔ اس دن جمعیت اسلامی اور حزب اسلامی کے درمیان کابل کے زیادہ سے زیادہ علاقے پر قبضے کی دوڑ شروع ہوئی۔ جمعیت اسلامی نے کمیونسٹوں کے تعاون سے اور حزبِ اسلامی نے ان سے مزاحمت کر کے شہر کے کئی حصوں پر قبضہ کرلیا۔

فتح کابل: احمد شاہ مسعود کی فوج اور دوستم ملیشیا نے پہلے ہی بگرام اور دوسرے اہم مقامات پر قبضہ کر رکھا تھا۔ 25 اپریل کو انہوں نے خواجہ روش ایئر پورٹ، ریڈیو اسٹیشن، ٹی وی اسٹیشن اور وزارت دفاع (دارالامان) کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا۔ اُدھر حزبِ اسلامی کے دستے شہر میں داخل ہوگئے اور انہوں نے صدارتی محل اور وزارتِ داخلہ سمیت کئی اہم مقامات پر قبضہ کرلیا۔ یہ دن تین بجے کا وقت تھا۔ 4 بجے تک تقریباً پورے کابل پر جمعیت اسلامی اور حزبِ اسلامی کا قبضہ ہو چکا تھا۔ شام کو عالمی ذرائع ابلاغ زور و شور سے یہ خبریں نشر کر رہے تھے۔ افغانستان سے روسیوں کے بعد اب ان کے مہرے نجیب کا بوریا بستر بھی گول ہو چکا تھا۔ پاکستان سمیت عالمِ اسلام کے کونے کونے میں لوگ شکرانے کے نوافل ادا کر رہے تھے۔ روسیوں اور کمیونسٹوں کے خلاف مجاہدین افغانستان کا 14 سالہ جہاد ایک شاندار فتح پر مکمل ہو رہا تھا۔ اگرچہ اس فتح میں مجاہدین متحارب بھی نظر آ رہے تھے مگر اس کے باوجود کابل پر قبضہ نہایت اطمینان اور امن و سکون سے ہوگیا۔ کوئی خونریزی ہوئی نہ غارت گری۔ عوام کو عام معافی دے دی گئی۔ لوگ احتیاطاً گھروں میں بیٹھے رہے۔ کوئی خون خرابہ تھا نہ ہنگامہ۔ بجلی اور پانی کا نظام بحال تھا۔ کٹھ پتلی نجیب انتظامیہ کے خاتمے کے ساتھ ہی تاریخ افغانستان کا یہ یادگار دن اختتام پذیر ہوا۔

جمعیت اسلامی اور حزبِ اسلامی میں کشاکشی: فتح کابل میں بڑا حصہ حزبِ اسلامی اور جمعیت اسلامی کا تھا۔ بہت خوب ہوتا کہ دونوں تنظیموں کے سربراہ جو جہادِ افغانستان میں بے مثال ہمت و شجاعت اور بہترین قیادت کا ثبوت دے کر پورے عالمِ اسلام میں ایک بلند اور معزز مقام حاصل کر چکے تھے، اس موقع پر ایثار و قربانی کا ثبوت دیتے ہوئے کسی مناسب حل پر متفق ہو جاتے مگر افسوس! ایسا نہ ہوسکا۔ فتح کابل کی خوشیاں جو مسلمانوں کو 14 سالہ جہاد اور بے شمار قربانیوں کے نتیجے میں ملی تھیں، مسعود اور حکمت

یار کے اختلاف کی نذر ہو گئیں۔

گلبدین حکمت یار جو پہلے ہی مجددی کی سربراہی اور کمیونسٹوں کی شمولیت کے باعث معاہدہ انتقالِ اقتدار سے الگ رہے تھے، بدستور اپنے موقف پر اڑے رہے۔ انہوں نے فتح کابل کے فوراً بعد اعلان کیا کہ اب مجاہدین کابل پر قابض ہو چکے ہیں اس لیے پشاور معاہدے کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر صبغت اللہ مجددی نے کابل آنے کی کوشش کی تو ہم ان کے طیارے کو مار گرائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی حکمت یار نے وائرلیس پر کابل میں موجود کمیونسٹ جرنیلوں سے مطالبہ کیا کہ وہ خود کو حزبِ اسلامی کے سپرد کر دیں تو ان سے مناسب سلوک ہوگا۔ ورنہ اگر وہ فرار ہونے کی حالت میں پکڑے گئے تو ان کے لیے کوئی ضمانت نہ ہوگی۔

گلبدین حکمت یار کے سخت اور منفرد موقف نے انہیں بہت سے مجاہد رہنماؤں کی ہمدردی سے محروم کر دیا تھا۔ احمد شاہ مسعود نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا اور فتح کابل کے فوراً بعد پشاور میں موجود نئی عبوری حکومت کے کمانڈروں سے رابطہ کر کے دریافت کیا: ”کیا آپ حکمت یار سے مقابلے کے لیے آمادہ ہیں؟“

جواب ملا: ”دارالحکومت آپ کے قبضے میں ہے۔ آپ جو چاہیں اقدام کریں۔“

<u>حزبِ اسلامی اور جمعیت اسلامی کی جنگ:</u> فتح کابل کے 14 گھنٹے بعد حزبِ اسلامی اور جمعیت اسلامی کے مابین باقاعدہ جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ اتوار 26 اپریل 1992ء کو ”وزیر اکبر خان“ کا علاقہ میدانِ جنگ بنا رہا۔ حزبِ اسلامی نے دھمکی دی کہ اگر دوستم ملیشیا کابل سے نہ نکلی تو کابل پر بھرپور حملہ کر دیا جائے گا۔ احمد شاہ مسعود نے جواباً کہا:

”اگر حزب نے حملہ کیا تو ہم اس کے مورچوں کو تہس نہس کر دیں گے۔“

27 اپریل کو بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ خواجہ روش ایئرپورٹ اور بگرام ایئربیس دونوں جمعیت اسلامی اور دوستم ملیشیا کے قبضے میں تھے۔ یہاں سے کمیونسٹ ہواباز طیارے اُڑا کر حزب کے ٹھکانوں کو نشانہ بناتے رہے جبکہ احمد شاہ مسعود کے جنگجوؤں نے زمینی پیش قدمی جاری رکھی۔ انہوں نے حزبِ اسلامی کو ”قصر صدارت“ سے پسپا کر دیا اور نہایت تیزی سے شہر کے زیادہ تر حصے پر قبضہ کر لیا۔ اب لڑائی شہر کے جنوب میں ہو رہی تھی۔ گزشتہ 14 برسوں میں شہر کی یہ گت کبھی نہیں بنی تھی۔ چنانچہ بالا حصار اور دیگر محلوں کے ہزاروں افراد شہر چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ یہ لڑائی جاری تھی اور اُدھر عالمِ اسلام کے ممتاز علماء اور نامی گرامی شخصیات کی جانب سے جنگ بندی کی پرزور اپیلیں ہو رہی تھیں۔ سعودی عرب سے شیخ محمود الصواف، مصر سے ڈاکٹر یوسف القرضاوی اور شام سے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے پیغامات

بھجوائے کہ مجاہدین فوری طور پر باہمی قتل وقتال ترک کر کے مذاکرات کی میز پر آ جائیں۔

حزبِ اسلامی کے مطالبات: 27 اپریل کا دن گزرتے گزرتے کابل شہر میں حزبِ اسلامی کی پوزیشن خاصی کمزور ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس نے جنگ بندی پر آمادگی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ دونوں فریق شہر کے اہم عسکری مقامات سے سبکدوش ہو جائیں۔ حزب اسلامی نے حکمت یار کو وزارتِ عظمیٰ دینے، برہان الدین ربانی کو صدر بنانے اور دوستم ملیشیا کو کابل سے نکالنے پر بھی اصرار کیا۔ اگرچہ یہ بات طے تھی کہ صبغت اللہ مجددی صرف دو ماہ کے لیے صدر رہوں گے اور ان کے بعد برہان الدین ربانی کو صدر بنایا جائے گا، مگر حکمت یار کے لیے مجددی کا عارضی تقرر بھی ناقابل قبول تھا۔

مجاہدین کو لڑانے میں کمیونسٹوں کا حصہ: فتحِ کابل کے ساتھ مجاہد تنظیموں کے اختلافات کا شدید تر ہو کر مستقل محاذ آرائی کی صورت اختیار کر لینا، یقیناً قارئین کے لیے باعثِ تعجب ہوگا۔ مگر اس کھیل کے پس پردہ سازشوں پر غور کیا جائے تو حیرت کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ پیچھے بتایا جا چکا ہے کہ عالمی طاقتیں، مقامی قوتوں کو استعمال کر کے افغانستان کو محاذِ جنگ بنائے رکھنے کی تیاریاں بہت پہلے کر چکی تھیں۔ یہ عالمی طاقتیں امریکا اور روس تھیں جبکہ اس خطے میں ایران اور بھارت ان سے بھرپور تعاون کر رہے تھے۔ افغانستان میں اس مقصد کے لیے ان کمیونسٹ جنرلوں سے کام لیا جا رہا تھا جو تاجک یا ازبک تھے اور ببرک کارمل کی پرچم پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ خود مجاہد رہنما احمد شاہ مسعود اور حکمت یار بھی اسی سازش کا شکار ہو گئے۔ احمد شاہ مسعود نے خود کو بادشاہ گر کی حیثیت دینا چاہی اور شمال کی مجاہد تنظیموں کے اتحاد شورائے نظار کو کمیونسٹوں کی باقی ماندہ طاقتوں سے متحد کر کے یہ تصور کر لیا کہ وہ کمیونسٹوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ اسی طرح حکمت یار نے جنرل شاہنواز اور جنرل رفیع جیسے کمیونسٹوں کو اپنے منصوبوں کی تکمیل کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اصل کھیل کمیونسٹ کھیل رہے تھے۔ باقی سب شطرنج کے مہروں کی طرح استعمال ہو رہے تھے۔

صبغت اللہ مجددی مسند اقتدار پر: منگل 28 اپریل 1992ء کو پروفیسر صبغت اللہ مجددی اپنے قافلے کے ساتھ پشاور سے کابل پہنچ گئے۔ انہوں نے یہ سفر سڑک کے ذریعے کیا تھا۔ شہر کے مرکزی علاقوں پر اب جمعیت اسلامی کا کنٹرول تھا، اس لیے مجددی کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ انہوں نے پورے اطمینان سے کابل رژیم (Regime) کے وزیر خارجہ عبدالوکیل سے حکومت کا چارج لیا اور پھر ایک کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ملک کی تعمیر نو کریں۔ نجیب کو ہم

معاف نہیں کر سکتے، یہ کام عوام کا ہے۔" پھر انہوں نے حکمت یار پر تنقید کرتے ہوئے کہا: "اگر حکمت یار نے لڑائی بند نہ کی تو ان کے خلاف شرعی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا۔"

اس دن ترکی، سعودی عرب، ایران اور دیگر مسلم ممالک کی جانب سے صبغت اللہ مجددی کو افغانستان کا اقتدار سنبھالنے پر تہنیتی پیغامات موصول ہوتے رہے۔ افغانستان کی تاریخ میں ایک طویل مدت بعد یہ منظر دیکھنے میں آیا تھا کہ ایک صحیح العقیدہ دین دار مسلمان مسندِ اقتدار تک پہنچا تھا۔ کہنہ سال و سفید ریش صبغت اللہ مجددی ذاتی طور پر ایک نیک و صالح بزرگ اور صوفی منش انسان تھے۔ افغانستان میں سلسلہ نقشبندیہ کو رواج دینے میں ان کے خاندان کا کردار نمایاں ہے۔ ان کے والد شیخ اسماعیل مجددی ظاہر شاہ کے دور میں کمیونزم کے خلاف صف آراء تھے اور اسی جدوجہد میں شہید ہوئے۔

صبغت اللہ مجددی کہتے تھے: "ہم نے جہاد اس وقت شروع کیا تھا جب مجاہدین کی موجودہ نسل ظہور پذیر نہیں ہوئی تھی۔"

گلبدین حکمت یار کو بھی صبغت اللہ مجددی کی سیرت و کردار پر کوئی اعتراض نہ تھا، مگر ان کا موقف یہ تھا کہ مجددی کی پارٹی کمزور ہے لہٰذا اسے کمیونسٹ آسانی سے دبا لیں گے۔ چند روز بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ یہ خدشہ درست تھا۔ بہرکیف مجددی کو منتخب کرنے والے مجاہد رہنماؤں کا کہنا یہ تھا کہ اس وقت لچک دار رویہ رکھنے والی اقلیتی پارٹی کے سربراہ کو صدر بنا کر ہم دنیا کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں کہ کابل میں بنیاد پرست کی بجائے وسیع البنیاد حکومت وجود میں آئی ہے۔ اس طرح ہم ناقابل برداشت خارجی دباؤ سے محفوظ رہیں گے۔ مجددی کو لچکدار رویہ رکھنے والا سیاست دان اس لحاظ سے سمجھا جاتا تھا کہ وہ ظاہر شاہ کے دوبارہ افغانستان آ کر اقتدار سنبھالنے کی تجویز کی حمایت کرتے رہے تھے۔

میاں نواز شریف کابل میں: بدھ 29 اپریل کو وزیر اعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف اور سعودی حکمران شاہ فہد کے خصوصی نمائندے شہزادہ ترکی الفیصل نے کابل پہنچ کر صبغت اللہ مجددی کو مبارکباد دی۔ میاں نواز شریف نے نئے افغان حکمران کو 250 ملین روپے کا امدادی چیک بھی پیش کیا۔ اس روز کابل کے بعض حصوں میں جمعیت اسلامی اور حزب کے مابین لڑائی جاری تھی۔ جمعیت اسلامی اور دوستم ملیشیا نے مل کر حزبِ اسلامی کو وزارتِ داخلہ سے پسپا کر دیا جبکہ میاں نواز شریف کے طیارے کی واپسی کے چند منٹ بعد ایئرپورٹ کو کسی نامعلوم گروہ نے میزائلوں کا نشانہ بنایا۔

کابل کی دگرگوں حالت: کابل فتح ہو گیا تھا۔ حکومت مجاہدین کی تشکیل کردہ جماعت کے پاس تھی مگر شہر کی اب یہ حالت تھی کہ اس میں بجلی، پانی اور مواصلات کا نظام تباہ ہو چکا تھا۔ اہم سرکاری عمارتیں

کھنڈر بن گئی تھیں، اشیائے خورونوش ناپید تھیں، ایک وقت کا کھانا 55 ڈالر میں مل رہا تھا، افغان کرنسی اتنی گر گئی تھی کہ لوگ روپوں کا تھیلا بھر کر لے جاتے اور بمشکل ایک دن کا راشن حاصل کر پاتے۔ ادھر حزب اسلامی سے لڑائی بھی جاری تھی۔ شیعہ اور کمیونسٹ، مجاہدین کی اس کمزور حکومت کو پوری طرح دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔ غرض مجددی حکومت کو ان گنت مسائل کا سامنا تھا۔ اس موقع پر مجددی نے عالم اسلام سے اپیل کی کہ وہ مشکل گھڑی میں ان کا ساتھ دے اور افغانستان کی تعمیر نو میں تعاون کرے۔ یہ بات قابل اطمینان تھی کہ تمام مسلم ممالک کے علاوہ روس، بھارت اور امریکا نے بھی مجاہدین کی حکومت کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ نئی حکومت ان ممالک کے نزدیک ''بنیاد پرست'' نہیں تھی۔

نجیب کو معافی: جمعہ یکم مئی کو صبغت اللہ مجددی نے ایک تقریر کی۔ انہوں نے ہزاروں افغان مسلمانوں کے قاتل ڈاکٹر نجیب اللہ کو معاف کرنے کا اعلان کر کے لوگوں کو چونکا دیا۔ چند روز پہلے اپنے پہلے خطاب میں انہوں نے کہا تھا کہ ہم نجیب اللہ کو معاف نہیں کر سکتے۔ یہ عوام کا کام ہے کہ اسے معاف کریں، مگر اب عوام کی جانب سے کسی مطالبے کے سامنے آئے بغیر انہوں نے خود اسے معافی دینے کا اعلان کر کے خود اپنے موقف کی نفی کر دی تھی۔

ایسا لگتا تھا جیسے صبغت اللہ مجددی ان کمیونسٹ جنرلوں سے خاصے مرعوب ہیں جو کابل میں اپنی افواج کے ساتھ تعینات تھے۔ نجیب اللہ کو معافی دینے میں ان کمیونسٹ جنرلوں کا دباؤ یقیناً کارفرما تھا۔ ورنہ مجاہدین اور افغان مسلمان اس درندہ صفت انسان کو معاف کرنے کے روادار نہیں تھے جس نے ہزاروں عورتوں، بچوں اور بزرگوں کو ناقابل بیان مظالم کا نشانہ بنا بنا کر قتل کیا تھا۔

حرکت انقلاب اسلامی اور حزب میں معرکہ: دن گزرتے گئے مگر کابل میں امن و امان قائم نہ ہو سکا۔ شہر کے نواح میں قائم حزب اسلامی کے مورچوں سے شہر پر بار بار راکٹ برسائے جاتے تھے۔ یہ جنگ دوسرے صوبوں میں بھی پھیلنے لگی تھی۔ مولوی محمد نبی محمدی اور مولانا نصر اللہ منصور جو حرکت انقلاب اسلامی کے دو الگ الگ دھڑوں کے قائد تھے، ایک بار پھر متحد ہو گئے تھے کیونکہ دوسرے صوبوں پر قبضے کے لیے تیار حزب اسلامی کے مقابلے کے لیے اس اتحاد کی شدید ضرورت تھی۔ آخر 3 مئی 1992ء کو حرکت انقلاب اسلامی اور حزب اسلامی میں جنگ شروع ہو گئی۔ اس دن حزب اور حرکت کی جنگ میں 50 افراد جاں بحق اور 100 سے زائد زخمی ہوئے۔ اس جنگ کے آخر میں حزب اسلامی کا پلہ بھاری رہا اور اس نے حرکت انقلاب اسلامی سے صوبہ لغمان چھین لیا۔

پاکستان کی امدادی کارروائیاں: پاکستان اب تک افغانستان کی بھرپور مدد کر رہا تھا۔ اس نے کابل میں قحط دور کرنے کے لیے 50 ہزار ٹن گندم دینے کا وعدہ کیا۔ مئی کے پہلے ہفتے میں 70 ٹرک گندم لے کر کابل پہنچے۔ حکومت پاکستان نے 30 لاکھ افغان مہاجرین کو افغانستان واپس بھیجنے کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دی اور اعلان کیا کہ واپس جانے والے ہر افغان مہاجر کو 30 ہزار روپے اور 30 بوری گندم دی جائے گی۔

شہر پر کن کن کا قبضہ تھا؟ فتح کابل کے ایک ہفتے بعد بھی امن وامان بحال نہ ہو سکا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ کابل کے شمالی اور شمال مشرقی اضلاع سے شہر کے مرکز مقامات تک تقریباً سارا علاقہ جمعیت اسلامی اور دوستم ملیشیا کے قبضے میں تھا۔ یہ فوجیں اب سرکاری افواج کے نام سے موسوم کر دی گئی تھیں۔ حزبِ اسلامی کی اصل طاقت جنوب میں چہار آسیاب اور مشرق میں سروبی میں جمع تھی۔ مولانا یونس خالص کے کارکن بھی بڑی تعداد میں سروبی میں تھے۔ مغرب میں شیعہ تنظیم حزب وحدت مورچہ زن تھی۔

استاذ سیاف کی اتحاد اسلامی ''پغمان'' میں مورچے سنبھالے ہوئے تھی۔ یکم مئی 1992ء کو اس کی حزب وحدت سے خونریز جنگ شروع ہو گئی جو کئی دن تک جاری رہی۔ آخر ہفتہ 9 مئی کو جنگ بندی کا معاہدہ ہوا۔ ادھر کابل شہر میں مجاہدین کی بہ نسبت دوستم ملیشیا کے سپاہی زیادہ تھے۔ مجاہدین کی حکومت عملاً ان کو باہر نکالنے کی قوت نہیں رکھتی تھی۔ بلکہ در حقیقت یہ حکومت ان کے رحم وکرم پر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب ایک صحافی نے صدر مجددی سے سوال کیا کہ آپ کابل پر حزبِ اسلامی کے حملوں کا دفاع کیسے کریں گے؟ تو انہوں نے جواب دیا: ''برادر رشید دوستم ہماری مدد کریں گے۔''

مولانا جلال الدین حقانی کی مصالحتی کوششیں: حزب اور جمعیت اسلامی میں بھی جنگ وجدل کا سلسلہ جاری رہا۔ 4 مئی 1992ء کو حزبِ اسلامی نے ''ٹپہ نادر خان'' پر قبضہ کر لیا۔ ادھر جمعیت اسلامی کے سربراہ برہان الدین ربانی پشاور سے افغانستان پہنچ گئے۔ انہوں نے ''لوگر'' میں حکمت یار سے مل کر جنگ بندی کی کوشش شروع کر دی۔ نامور مجاہد کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی نے ان دنوں دو سو مجاہد رہنماؤں کا وفد لے کر حکمت یار سے ملاقات کی اور جنگ بندی کا ایک معقول فارمولا تیار کیا جسے ربانی نے منظور کر لیا مگر مسعود لیت ولعل سے کام لیتا رہا۔ دراصل اسے بغلان سے اسماعیلی ملیشیا کے تین ہزار جنگجوؤں کی کمک بھی مل گئی تھی جس کا کمانڈر منصور نادری تھا۔ اسماعیلی ملیشیا اس کی قیادت میں طیاروں کے ذریعے کابل پہنچی اور کئی اہم مقامات پر قابض ہو گئی۔ اس طرح کابل میں احمد شاہ مسعود کے حامیوں کی پوزیشن مزید مضبوط ہو گئی۔ ایسے میں مسعود کے لیے کسی امن فارمولے پر عمل کرنا بے معنیٰ تھا۔

مجددی پر قاتلانہ حملہ: صدر مجددی کو احمد شاہ مسعود کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ سے طرح طرح کے

خدشات لاحق ہورہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبغت اللہ مجددی برائے نام حکمران تھے۔ ان کی کمزوری کا یہ عالم تھا کہ وہ خود کابل میں محفوظ نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے اقتدار کی طے شدہ مدت میں توسیع کرالیں مگر بظاہر یہ ممکن نہیں تھا۔ مسعود اور دوستم جب چاہتے انہیں جبراً معزول کر سکتے تھے۔ اس صورتحال میں مئی کے آغاز میں صدر مجددی نے پاکستان کا دورہ کیا تاکہ اپنی پوزیشن بہتر بنائی جاسکے۔ حکومت پاکستان اوراس کے وزیراعظم میاں محمد نواز شریف مجددی صاحب کے ہمدرد تھے اس لیے پاکستان میں حاکمِ افغانستان کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ اس دورے پر تبصرہ کرتے ہوئے حرکت انقلاب اسلامی کے امیر مولانا نصر اللہ منصور نے جو مجددی حکومت میں ڈپٹی چیف جسٹس تھے، ایک انٹرویو میں کہا: ''مجددی صاحب کے دورۂ پاکستان کے موقع پر حکومت پاکستان نے ان کا جوشایان شان استقبال کیا اور عظیم الشان پروٹوکول دیا اس نے ہمارے حوصلوں کو مہمیز دی ہے۔''

مگر 8 رمئی کو جوں ہی مجددی صاحب کا طیارہ پشاور سے واپس کابل پہنچا اس پر میزائلوں کی بارش کردی گئی۔ جہاز کا اگلا حصہ تباہ ہوگیا جبکہ صبغت اللہ مجددی بال بال بچ گئے۔ عام خیال تھا کہ یہ عبوری حکومت کی مخالف، حزبِ اسلامی کا کارنامہ ہے مگر صبغت اللہ مجددی نے اس بارے میں خاموشی اختیار کرلی۔ حکومت سے الگ ہونے کے بعد انہوں نے انکشاف کیا کہ یہ ان کے اپنے لوگوں کی سازش تھی یعنی اس میں دوستم ملیشیا یا احمد شاہ کے لوگ ملوث تھے۔

معاہدۂ ضیاء الحق: فتح کابل کا سہانا سپنا مجاہدین کے لیے ایک المیہ حقیقت ثابت ہوا تھا۔ کمیونسٹوں کے تسلط، ایران نواز ملیشیاؤں کی مداخلت اور عالمی طاقتوں کی خفیہ سازشوں نے کابل میں اسلامی حکومت کے قیام اور بحالی امن سے متعلق عالمِ اسلام کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ اس صورتِ حال میں سعودی عرب کے شاہ فہد نے خاص طور پر اصلاح احوال کی کوشش کی۔ ان کی دلچسپی کے باعث وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف ایک بار پھر کابل میں جنگ بندی کے لیے متحرک ہوئے۔ انہوں نے جہادِ افغانستان کے تاریخی کردار صدر ضیاء الحق کے بیٹے اعجاز الحق کو نمایندہ بنا کر کابل بھیجا۔ شاہ فہد کی جانب سے شہزادہ نائف بن سلطان بھی ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے مجاہدین کے مصالحتی کمیشن کے چیئرمین کمانڈر جلال الدین حقانی کے ساتھ مل کر مجاہد رہنماؤں میں تصفیے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کی۔

25 مئی کو کابل کے جنوب میں حزبِ اسلامی کے ہیڈ کوارٹر میں گلبدین حکمت یار اور احمد شاہ مسعود اکٹھے ہوئے۔ افغان جہاد کے چودہ برسوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ دونوں لیڈر آمنے سامنے تھے اور دوبدو گفتگو کر رہے تھے۔ صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک گفت وشنید جاری رہی اور آخر صلح کا معاہدہ

طے پا گیا۔ اس معاہدے کو "معاہدہ ضیاء الحق" کا نام دیا گیا۔ معاہدے میں تحریر کیا گیا تھا کہ سوویت افواج کی واپسی اور کٹھ پتلی نجیب حکومت کے خاتمے کے بعد جہاد کے مقاصد پورے ہو چکے ہیں لہٰذا جنگ بند کی جاتی ہے۔ اب ہر قسم کے تنازعے مذاکرات کے ذریعے حل کیے جائیں گے۔ ایک خالص اسلامی حکومت قائم کی جائے گی۔ عبوری حکومت میں کوئی توسیع نہیں ہوگی۔ چھ ماہ کے اندر انتخابات کروائے جائیں گے۔ شمال سے آئی ہوئی ملیشیائیں ایک طے شدہ طریقہ کار کے مطابق واپس چلی جائیں گی اور دارالحکومت کا انتظام مقامی کمانڈروں کے سپرد ہوگا۔

<u>مجددی توسیع اقتدار کے خواہش مند:</u> کچھ مدت کابل میں امن وامان رہا اور شہر کی رونقیں بحال ہونے لگیں۔ 28 جون 1992ء کو صبغت اللہ مجددی کی صدارت کے طے شدہ دو ماہ پورے ہو رہے تھے اور اب انہیں معاہدہ پشاور کے مطابق صدارت پروفیسر برہان الدین ربانی کے حوالے کرنا تھی مگر اس سے قبل صبغت اللہ مجددی نے ایسے بیانات دینا شروع کر دیے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس منصب پر برقرار رہنا چاہتے ہیں۔ یہ صورتِ حال احمد شاہ مسعود کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ احمد شاہ مسعود کا کہنا تھا کہ مجددی کو وقت مقررہ پر عہدہ چھوڑ دینا چاہیے جبکہ صبغت اللہ مجددی کہتے تھے: "لوگوں کا اصرار ہے کہ میں مزید دو سال تک حکومت کروں۔" احمد شاہ مسعود اور صدر مجددی کے درمیان فاصلے بڑھتے گئے۔ صبغت اللہ مجددی یہ محسوس کر کے نہایت برداشتہ تھے کہ مسعود اور ربانی جو انہیں حکمت یار سے لڑواتے رہے تھے اب خود حکمت یار سے صلح کا معاہدہ کر چکے ہیں۔ چنانچہ وہ ذہنی طور پر جمعیت اسلامی سے دور ہوتے چلے گئے۔ اب انہیں نئے ہمدردوں کی تلاش تھی۔ اِدھر افغانستان کے سیاسی بحران کی ذمہ دار مغربی طاقتوں کے پاس دوستم ملیشیا اور حزب وحدت کی شکل میں دو ایسے مددگار موجود تھے جو حسبِ موقع اپنی وفاداریاں تبدیل کر کے نت نئے المیوں کو جنم دینے میں ماہر تھے۔ ان مددگاروں نے صدر مجددی کو مسعود سے دور ہوتا دیکھ کر انہیں اپنے دام میں لانے کی کوشش کی اور بے یار و مددگار صدر مجددی ان کے بل بوتے پر توسیع اقتدار کی منزل کو قریب تر محسوس کرنے لگے۔ بدلے میں حزب وحدت اور دوستم ملیشیا کو حکومت میں غالب حصہ ملنے کے امکانات روشن ہونے لگے۔ چونکہ یہ صورتحال پاکستان کے مفادات کے خلاف تھی اس لئے پاکستان نے اس موقع پر مجددی صاحب کی حمایت نہ کی۔ حرکت انقلاب اسلامی کے سربراہ مولوی نبی محمدی اور محاذ اسلامی کے قائد پیر سید احمد گیلانی نے بھی اس سے اتفاق نہ کیا۔ پھر صورتحال کو سنبھالنے کے لئے پروفیسر برہان الدین ربانی خود افغان رہنماؤں کا ایک وفد لے کر پاکستان گئے۔ 13 جون 1992ء کو انہوں نے صدر پاکستان غلام اسحاق خان سے ملاقات کی۔ صدر پاکستان نے وفد سے اتفاق کرتے

ہوئے دوٹوک موقف اختیار کیا کہ معاہدہ پشاور کی پاسداری کرتے ہوئے صدر مجددی کو دو ماہ پورے ہونے پر اقتدار سے علیحدہ ہوجانا چاہیے۔ اس وضاحت کے بعد صدر مجددی کے لئے حزب وحدت اور دوستم کو ملا کر اقتدار میں توسیع کے منصوبے پر عملدرآمد کرنا مشکل ہوگیا۔

حقیقت یہ ہے کہ صدر مجددی کا اگر کوئی وزن تھا تو اس کا سبب پاکستان کی جانب سے ان کی مکمل حمایت تھی۔ حکومت پاکستان جو افغانستان میں ایک پاکستان دوست حکومت کا قیام چاہتی تھی، صبغت اللہ مجددی کے پورے دور میں ان سے ہر طرح تعاون کرتی رہی تھی۔ مگر اب خود پاکستان مجددی صاحب سے مایوس تھا، لہٰذا وہ بالکل تنہا نظر آرہے تھے۔ یاد رہے کہ اتنی مدت تک صبغت اللہ مجددی کے ساتھ پاکستان کے اس تعاون کے پیچھے امریکی ایماء کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ مجددی حکومت بڑی حد تک ویسی ہی تھی جیسی امریکا کابل میں دیکھنا چاہتا تھا، یعنی ایک مخلوط قسم کی کمزور حکومت جو اپنے فیصلوں میں غیروں کی محتاج ہو۔ اپنے مختصر دور حکمرانی کے آخری ایام میں مجددی کی کوشش تھی کہ وہ حکمت یار سے تعلقات بہتر بنالیں انہوں نے حکمت یار کو اپنا بھائی قرار دیا اور اپنے بیانات میں ان کے کردار کو سراہا...... اس طرح حکمت یار کی پوزیشن مزید بہتر ہوگئی۔ تاہم صبغت اللہ مجددی کی حیثیت حسب سابق کمزور ہی رہی۔

مجددی کے غلط فیصلے: صبغت اللہ مجددی نے اپنے مختصر دور اقتدار میں کئی ایسے فیصلے کئے جن سے مجاہد رہنما ناراض تھے۔ مثلاً:

1. پختون قوم پرستوں اور کیمونسٹوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے نجیب کو معافی دینا۔
2. وطن پارٹی کی حمایت حاصل کرنے کے لیے کیمونسٹ جنرل آصف دلاور کو آرمی کا سربراہ بنانا۔ یاد رہے کہ اس اقدام میں اصل کردار احمد شاہ مسعود کا تھا مگر فیصلہ صبغت اللہ مجددی ہی کے قلم سے صادر ہوا تھا۔
3. رشید دوستم اور اس کے کیمونسٹ ساتھیوں کے جنرل کے عہدے پر ترقی دینا۔
4. یہ بیان دینا کہ لوگ مجھ پر دو برس تک اقتدار سنبھالے رہنے کے لئے دباؤ ڈال رہے تھا۔

بہر حال مجددی صاحب کا توسیع اقتدار کا ارمان پورا نہ ہوسکا۔ ان کے مذکورہ اقدامات نے ان کو مجاہد رہنماؤں کی حمایت سے محروم کر دیا جو اب بھی ایک بڑی طاقت تھے۔

برھان الدین ربانی، نئے عبوری صدر: آخر کار دو ماہ بعد 28 جون 1992ء کو صبغت اللہ مجددی اپنی مدت پوری کر کے خاموشی سے معزول ہو گئے۔ ان کی جگہ جمعیت اسلامی کے سربراہ پروفیسر برہان

الدین ربانی نے چار ماہ کے لیے عبوری صدارت کا منصب سنبھال لیا۔ ان کی ذمہ داری یہ تھی کہ چار ماہ کے اندر انتخابات کرا کے اقتدار منتخب حکومت کو سونپ دیں۔ طے شدہ لائحہ عمل کے مطابق ربانی کے برسر اقتدار آجانے سے امید تھی کہ افغانستان میں قیام امن کا خواب پایہ تکمیل کو پہنچے گا خصوصاً اس تناظر میں کہ مجددی کوئی تنازعہ کھڑا کیے بغیر سبکدوش ہو گئے تھے اور جمعیت و حزب میں ''معاہدہ ضیاء الحق'' کے مطابق صلح کا ماحول برقرار تھا۔ اب کمیونسٹوں کو کابل سے بے دخل کرنا بھی کوئی مشکل کام نہ تھا بشرطیکہ مجاہدین اس طرح متحد رہتے۔

حزب اسلامی اور ملیشیا کا معرکہ: دنیا کو حزب اسلامی کی قوت کا اندازہ اگست 1992ء میں اس وقت ہوا جب چہار آسیاب میں واقع حزب اسلامی کے ہیڈ کوارٹر سے دوستم ملیشیا کے خلاف ایک بڑی کارروائی شروع کی گئی۔ وجہ یہ تھی کہ ملیشیا کے طیارے حزب کے ٹھکانوں پر گاہے گاہے بمباری کرتے رہتے تھے، لہٰذا اس کا موثر اور منہ توڑ جواب دینا ضروری تھا، یہ لڑائی ''اسد سنبلہ'' کی جنگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں دوستم ملیشیا کا خاصا نقصان ہوا جس کے بعد کیمونسٹوں کو یقین ہو گیا کہ جب تک حکمت یار اور مسعود میں صلح کا ماحول برقرار ہے ان کی دال نہیں گلے گی۔ چنانچہ اس کے بعد افغانستان میں مجاہدین کے اتحاد کو سبوتاژ کرنے کے لیے ایک بار پھر خفیہ ہاتھ تیزی سے حرکت میں آگئے، نئی منصوبہ بندیاں ہوئیں اور مجاہدین کو لڑانے والے جنگجو گروہوں نے ایک نئے زاویے پر پیش قدمی شروع کر دی۔ اس سے قبل وہ مسعود اور ربانی کے ساتھ مل کر حزب اسلامی کے خلاف محاذ بنائے ہوئے تھے۔ اب انہوں نے پینترا بدل کر حکمت یار کے گرد جمع ہونا شروع کر دیا تاکہ انہیں ایک غالب قوت ہونے کا احساس دلا کر پھر سے جمعیت اسلامی کے خلاف محاذ گرم کیا جا سکے۔

عبدالعلی مزاری، حکمت یار کے ساتھ: اس منصوبے پر عمل درآمد کے لیے پہل ''حزب وحدت'' کے سربراہ عبدالعلی مزاری نے کی اور شورائے نظار سے اتحاد ختم کر کے حزب اسلامی سے تعلقات استوار کر لیے۔ نئے اتحادی میسر آجانے سے حزب کی طاقت میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا۔ مگر ان نئے اتحادیوں نے حزب اسلامی کو راہِ اعتدال سے دور کرنے اور دیگر جماعتوں کے ساتھ اس کے تعلقات کو مزید کشیدہ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

حزب وحدت کے مسلح ہزارہ جات دستے جو کابل کے صوبے میں کئی اہم مقامات پر قابض تھے ایران سے اسلحے اور کرنسی کی شکل میں بھرپور امداد وصول کر رہے تھے۔ حزب وحدت کے رہنماؤں عبدالعلی مزاری، کریم خلیلی اور آیت اللہ محسنی میں اختلافات ضرور تھے مگر وہ بہر صورت حکومت میں اپنی آبادی کے

تناسب سے کہیں بڑھ کر حصہ چاہتے تھے۔ حکومت ایران حزب وحدت کے ساتھ ساتھ کیمونسٹ جنرل رشید دوستم کی بھی مدد کر رہی تھی۔ ہفت روزہ "تکبیر" 18 جون 1992ء کی اشاعت میں انکشاف کرتا ہے کہ ایران نے حال ہی میں رشید دوستم کے لیے ایک ٹرالر بھر کر افغان کرنسی نوٹ فراہم کیے ہیں۔

صدر ربانی، دوستم سے مرعوب: پروفیسر برہان الدین ربانی بھی اپنے دور اقتدار میں صدر مجددی کی طرح کمزور اور عملاً بے بس ثابت ہوئے۔ حکمت یار اور مسعود کے مابین معاہدہ ضیاء الحق کے مطابق رشید دوستم کی فوج کو غیر مسلح کر کے کابل سے نکالنا طے ہو گیا تھا مگر دوستم ملیشیا اب بھی کابل میں ڈٹی ہوئی تھی۔ رشید دوستم نے برملا اعلان کر رکھا تھا کہ اگر اس کی فوج کو کابل سے نکالنے کی کوشش کی گئی تو وہ افغانستان کے پانچ (5) شمالی صوبوں کو لے کر الگ مملکت بنا لے گا۔ دوستم کی اس دھمکی سے مرعوب ہو کر صبغت اللہ مجددی کو اس کے خلاف کسی کارروائی کی ہمت ہو سکی نہ پروفیسر ربانی کو۔ حالاں کہ ان کے پاس احمد شاہ مسعود کی زبردست فوج موجود تھی۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حالات بگاڑنے کے اس کھیل میں متعدد اندرونی و بیرونی طاقتیں ملوث تھیں، جن کی خفیہ یا اعلانیہ حمایت کیمونسٹوں کے ساتھ تھی۔ اس کھیل میں امریکا، روس اور ایران کے ساتھ برطانیہ بھی شامل ہو چکا تھا۔ تکبیر اپنی مذکورہ اشاعت میں رپورٹ دیتا ہے کہ رشید دوستم شمالی افغانستان میں ازبک ریاست کے قیام کے لیے امریکا کی ہدایت پر عمل کر رہا ہے اور اس منصوبے میں انگلستان اور ایران بھی شریک ہیں۔ الغرض اس طرح دوستم ملیشیا تقسیمِ وطن کی دھمکی دے کر پروفیسر ربانی کے سینے پر مونگ دلتی اور کابل میں راج کرتی رہیں۔ پروفیسر ربانی اپنے اختیارات کو بروئے کار نہ لا سکے۔ کابل میں فحاشی و بے حیائی کا وہ عالم تھا کہ الامان والحفیظ۔ کیمونسٹ دور کی طرح اب بھی جگہ جگہ شراب خانے اور قحبہ خانے کھلے تھے۔ سرکاری دفاتر میں عریانی کا مظاہرہ کرتی ماڈرن خواتین حسب سابق کام کر رہی تھیں۔ نظام حکومت پر بالائی سے لے کر نچلی سطح تک اب بھی ملحدوں اور دھریوں کی اجارہ داری تھی۔ اسلامی حکومت کے اثرات دور دور تک نظر نہیں آتے تھے۔

حزبِ اسلامی اور کیمونسٹوں کا اتحاد: حکمت یار کو اس بات کا نہایت صدمہ تھا کہ وزیر اعظم ہوتے ہوئے بھی عملاً انہیں حکومت سازی کا موقع نہیں دیا جا رہا تھا کہ وہ کابل میں داخل تک نہیں ہو سکتے۔ حکمت یار کے یہ جذبات کیمونسٹوں سے پوشیدہ نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی جلتی پر تیل ڈالنے میں کسر نہ چھوڑی۔ رشید دوستم نے مجاہدین کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے اور انہیں ایک دوسرے سے بدظن کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ عبدالعلی مزاری کی طرح اس نے بھی احمد شاہ مسعود کی بجائے حکمت یار کی

طرف جھکاؤ ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ حکمت یار کو اعتماد میں لینے کے لیے وہ خود حزب اسلامی کے "فلاچی" مرکز میں آیا اور دوبدو ملاقات کی۔ وہ اپنے ساتھ ایک مولوی صاحب کو بھی لایا تھا جس نے باقاعدہ گفتگو کے آغاز سے قبل قرآن مجید کی تلاوت کی۔ اس طرح دوستم نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ کمیونسٹ نہیں، ایک اچھا مسلمان ہے۔ اس نے حکمت یار کو مکمل تعاون کا یقین بھی دلایا۔

غرض اس ملاقات کے ذریعے دو کٹر نظریاتی حریفوں میں اقتدار کی خاطر دوستانہ تعلقات کی بنیاد پڑ گئی۔ حکمت یار اور دوستم اس سے قبل ایک دوسرے کے سخت ترین دشمن تصور کیے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ حکمت یار نے فتح کابل کے بعد مجددی حکومت کو بھی صرف اس بنیاد پر قبول کرنے سے انکار کیا تھا کہ کابل میں دوستم کی گلم جم ملیشیا موجود تھی۔ حکمت یار کہتے تھے کہ چوں کہ دوستم مجددی حکومت کا حلیف ہے لہٰذا یہ اسلامی حکومت نہیں مانی جاسکتی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ پہلے دوستم کو غیر مسلح کر کے کابل سے نکالا جائے تب وہ مجددی حکومت کو مجاہدین کی حکومت کے طور پر قبول کر لیں گے مگر اب وہ خود دوستم کے شانہ بشانہ کھڑے تھے اور اس سے مدد لے کر خوشی محسوس کر رہے تھے۔

صدر ربانی کا دورہ بھارت: صدر برہان الدین ربانی بھی صدر مجددی کے طرزِ فکر کی پیروی کرتے ہوئے اپنی مدتِ اقتدار کو طویل سے طویل تر کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ان بیرونی طاقتوں سے روابط بڑھانے کی کوشش کی جو پہلے ہی افغانستان میں مداخلت کے لیے سرگرم تھیں اور کابل میں کسی اسلامی حکومت کے خلاف تھیں۔ ان ممالک میں بھارت سرفہرست تھا۔ صدر ربانی نے بھارتی حکومت کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے بھارت کا دورہ بھی کیا۔ وہ انڈونیشیا جاتے ہوئے پانچ گھنٹوں کے لیے دہلی میں رکے اور بھارتی حکام سے ملاقات کی۔ اس کے بعد برہان الدین ربانی کو بھارت سرکار کی نظر میں ایک دوست کا مقام حاصل ہو گیا اور بھارتی حکومت ہمیشہ ان کی معاون رہی۔

مدتِ صدارت میں توسیع: 28 اکتوبر 1992ء کو برہان الدین ربانی کی عبوری صدارت کی مدت ختم ہو رہی تھی مگر انہوں نے ایک بہانہ پیش کر کے اس مدت میں دو ماہ کی توسیع کرالی۔ بہانہ یہ تھا کہ جب تک "شورائے حل وعقد" کا اجلاس نہ ہو، انتقالِ اقتدار ممکن نہیں۔ اس عذر کو دور کرنے کے لیے دیگر مجاہد رہنماؤں نے شورائے حل وعقد کا اجلاس منعقد کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں مگر جب اجلاس کے انعقاد کا ماحول بننے لگا تو مجاہد رہنماؤں میں اختلافات مزید کھل کر سامنے آگئے۔ پیر گیلانی اور مولوی محمد نبی محمدی، ربانی کے مقابلے میں صدارتی امیدوار بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مولانا یونس خالص، مولوی نبی محمدی کے حامی بن گئے۔ اس طرح معاہدہ پشاور کے ذریعے عام انتخابات تک تشکیل دی

جانے والی لیڈر شپ کونسل کے 9 ارکان دو ٹکڑوں میں بٹ گئے۔ اس ماحول میں دسمبر 1992ء شروع ہو گیا اور برہان الدین ربانی کی عبوری صدارت کی دو ماہی توسیعی مدت بھی ختم ہو گئی۔ اب ان پر لازم تھا کہ وہ انتخابات کرا کے اقتدار منتخب حکومت کے حوالے کر دیتے مگر ربانی اس ذمہ داری کی ادائیگی میں مسلسل لیت و لعل سے کام لیتے رہے اور طے شدہ وقت گزر جانے کے باوجود مسندِ اقتدار سے الگ ہونے پر آمادہ نہ ہوئے۔ گلبدین حکمت یار اس بدعہدی پر سراپا احتجاج بن گئے اور ان کی طرف سے صدر ربانی پر صدارت چھوڑنے کے لیے دباؤ بڑھنے لگا۔

جمعیت اسلامی اور حزبِ اسلامی کا معرکہ: ادھر صدر ربانی اور ان کے دستِ راست احمد شاہ مسعود کو انتخابات کے مطالبے سے چڑ تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں یہ بھی دکھ تھا کہ ان کے مضبوط حلیف عبدالعلی مزاری نے گلبدین حکمت یار سے اتحاد کر لیا ہے۔ آخر انہوں نے ایک بار پھر میدان جنگ میں قوت آزمائی کے ذریعے اپنے اختلافات کا فیصلہ کرنے کی کوشش کی۔ جنگ کا آغاز ربانی حکومت کی افواج کی طرف سے ہوا جنہوں نے کابل کے مشرق میں واقع حزب اسلامی کے مورچوں پر اچانک حملے شروع کر دیے۔ جنگ کے پہلے دن شورائے نظار اور جنرل بابا جان کی فوجیں آگے بڑھتی چلی گئیں لیکن اگلے دن حزب اسلامی نے بھرپور مزاحمت کرتے ہوئے اپنے علاقے واپس لے لیے اور چہل ستون پر بھی قبضہ کر لیا۔

صلح و صفائی کی کوششیں۔ معاہدہ اسلام آباد: افغانستان میں ایک بار پھر خوں ریزی اور خانہ جنگی کا آغاز پاکستان سمیت تمام عالم اسلام کے لیے انتہائی پریشان کن تھا۔ چنانچہ از سر نو جنگ بندی اور مصالحت کے لیے دوڑ دھوپ شروع ہوئی، خادم الحرمین والشریفین شاہ فہد، وزیر اعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف، آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل حمید گل اور جماعتِ اسلامی پاکستان کے امیر قاضی حسین احمد اس سلسلے میں پیش پیش تھے۔ ان کوششوں کے نتیجے میں 7 مارچ 1993ء کو اسلام آباد میں مجاہد رہنماؤں کے درمیان ایک اور معاہدہ ہوا۔ اس بار بھی حسب سابق اصل فریق حزبِ اسلامی اور جمعیتِ اسلامی تھے۔ فرق یہ تھا کہ سابقہ معاہدوں میں جمعیتِ اسلامی کا پلہ بھاری تھا جب کہ معاہدہ اسلام آباد میں حزبِ اسلامی کی حیثیت غالب تھی۔ اس معاہدے میں گلبدین حکمت یار کو افغانستان کا با اختیار وزیرِ اعظم تسلیم کیا گیا تھا جو اپنی مرضی کی کابینہ تشکیل دے سکتا تھا۔ تاہم جمعیتِ اسلامی کے نمائندے نے خاصی تگ و دو کے بعد معاہدے میں یہ ترمیم کرا لی کہ وزیرِ اعظم کابینہ کی تشکیل میں صدر اور دیگر رہنماؤں سے مشورہ کرے گا۔ بہر حال اس ترمیم سے وزیرِ اعظم کے اختیارات میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوتی تھی کیوں کہ اسے مشورے پر عمل درآمد کا پابند نہیں کیا گیا تھا۔ معاہدے کے مطابق صدر برہان الدین ربانی

کی مدتِ صدارت میں توسیع کردی گئی تھی مگر اب وزیر اعظم کے اختیارات میں اضافے کی وجہ سے ربانی کی حیثیت قانوناً کمزور ہوگئی تھی۔ ہاں عملاً ربانی اور مسعود ہی سیاہ و سپید کے مالک تھے کیوں کہ ان کے اتحادیوں کی قوت زیادہ تھی۔ پھر پروفیسر سیاف، مولوی محمد نبی محمدی اور مولانا یونس خالص بھی ازراہِ مصلحت انہی کے ساتھ تھے۔ چوں کہ مصالحت کے لیے سرگرم قوتوں کو مجاہدین کی جانب سے بار بار معاہدوں کی خلاف ورزی کا تجربہ ہو چکا تھا اس لیے اس معاہدے کی توثیق حرمین شریفین میں کرانے کا فیصلہ ہوا۔ معاہدے میں شامل فریق اور مجاہد رہنما فرمانروائے سعودی عرب شاہ فہد بن عبدالعزیز کی دعوت پر اگلے دن 8 مارچ 1993ء کو حجازِ مقدس حاضر ہوئے اور عمرے کی سعادت حاصل کرنے کے بعد اس مقدس سرزمین اور پاکیزہ فضا میں حلف اٹھایا کہ معاہدے کی مکمل پاسداری کی جائے گی۔

جلال آباد مذاکرات: افغان عوام کو اب پختہ امید تھی کہ ان کے ایامِ مصائب ختم ہونے کو ہیں مگر صد افسوس کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں کیے گئے قول و قرار بھی مجاہد رہنماؤں کو بدعہدی سے باز نہ رکھ سکے۔ معاہدہ اسلام آباد اور حرمین کا حلف نامہ بھی نقش برآب ثابت ہوا۔ ابھی اس معاہدے کی روشنائی خشک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ مجاہد تنظیموں میں ایک بار پھر محاذ آرائی کا ماحول بننے لگا۔ وجہ یہ تھی کہ صدر برہان الدین ربانی نے حکمت یار کو وزیر اعظم کی حیثیت سے ملنے والے اختیارات کو دل سے قبول نہیں کیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ یہ اختیارات کم کر کے صدر کی حیثیت کو غالب رکھا جائے۔ جب یہ کشاکشی بڑھنے لگی تو خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں دوبارہ جنگ نہ چھڑ جائے۔ چنانچہ حکومت سازی کے تمام معاملات کو حتمی طور پر طے کرنے کے لیے جلال آباد میں مذاکرات کا انعقاد کیا گیا جہاں سابق افغان بادشاہوں کے سرمائی شاہی محل میں 9 جہادی تنظیموں کے سربراہ ایک بار پھر سر جوڑ کر بیٹھے۔ اجلاس میں پروفیسر ربانی، مولانا یونس خالص، گلبدین حکمت یار، مولوی محمد نبی محمدی، پیر سید احمد گیلانی اور استاذ عبدالرب رسول سیاف سمیت تمام بڑے لیڈر شریک تھے۔ اجلاس کئی دن تک جاری رہا مگر حکومت سازی کے معاملات طے نہ ہو سکے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ متحارب فریقوں میں کوئی ثالث طے نہیں ہو سکا تھا۔ حالاں کہ ثالث کا تعین ضروری تھا جیسا کہ پہلے پاکستان یہ کردار ادا کرتا رہا تھا۔

افغانستان کے عوام کی نظریں جلال آباد پر مرکوز تھیں اور لوگ دھڑکتے دلوں کے ساتھ منتظر تھے کہ دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اس دوران ایک بدترین المیہ یہ ہوا کہ جمعیت اسلامی اور حزب اسلامی میں کابل کے شمال میں جنگ چھڑ گئی۔ احمد شاہ مسعود کی افواج نے کاپیسا اور پروان میں حکمت یار کے ٹھکانوں پر اچانک حملہ کر کے ان دونوں صوبوں پر مکمل قبضہ کر لیا اور پھر پیش قدمی کرتے کرتے

سروبی تک پہنچ گئیں جو حزب اسلامی کا خاص گڑھ تھا۔ حزب اسلامی نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے کابل میں جنرل بابا جان اور جنرل مؤمن کے خلاف فوج کشی کی اور ان کے دو فوجی ڈویژنوں سمیت قصرِ دارالامان پر قبضہ کرلیا۔ اس خانہ جنگی کی وجہ اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں ہوتی تھی کہ میدان جنگ میں اپنی قوت دکھا کر دونوں فریق مذاکرات کی میز پر اپنا وزن بڑھانا چاہتے تھے۔ مگر درحقیقت اس صورتحال میں مذاکرات کے بالکل سبوتاژ ہو جانے کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

ممکن تھا کہ یہ اجلاس بے نتیجہ ختم ہو جاتا کہ اچانک دو ہزار اپاہج اور معذور افراد نے شاہی محل کا گھیراؤ کرلیا۔ یہ وہ مخلص مجاہد کارکن تھے جنہوں نے جہادِ افغانستان کے دوران اپنے قیمتی اعضاء قربان کیے تھے۔ انہوں نے محل کا محاصرہ کر کے اعلان کر دیا کہ مجاہد رہنما اپنے جھگڑوں کا فیصلہ کیے بغیر محل سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ یہ دھمکی کام کر گئی اور ملکی تاریخ کے اس طویل ترین سیاسی اجلاس میں جو 21 دنوں پر محیط تھا، حکومت سازی کا تفصیلی معاہدہ طے پا گیا جس کے مطابق 28 جون 1994ء تک حکمت یار کو وزیراعظم اور برہان الدین ربانی کو صدر مملکت مان لیا گیا۔

صدر ربانی کو توقع تھی کہ وہ ان مذاکرات میں مولانا یونس خالص، پیر سید احمد گیلانی، استاذ سیاف اور دیگر رہنماؤں کو قائل کر کے وزیراعظم کے اختیارات کم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں ایک توازن برقرار رہا جو ایک خوش آئند بات تھی۔ پھر بھی ان مذاکرات کے ذریعے جو فائدہ ربانی صاحب نے اٹھایا وہ کچھ کم نہیں تھا کیوں کہ وہ اپنی مدتِ صدارت ختم ہونے کے بعد ازسرِنو صدر بن گئے تھے۔ بہرحال معاہدہ جلال آباد کے بعد حالات پرامن ہونے لگے۔ افغانستان کے جنگ زدہ عوام کو اب توقع تھی کہ امن وامان بحال رہے گا اور وہ چین کی نیند سو سکیں گے۔

پاکستان میں نئی حکومت: اس دوران پاکستان میں 18 جولائی 1993ء کو میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم ہو گئی۔ بلخ شیر مزاری نے عبوری حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے عام انتخابات کرائے جن کے نتیجے میں اکتوبر کے مہینے میں محترمہ بے نظیر بھٹو برسرِاقتدار آ گئیں۔ افغانستان کے بارے میں ان کی پالیسی بھی میاں نواز شریف سے مختلف نہیں تھی۔ یعنی ہمسائیگی کے حقوق کا خیال رکھتے ہوئے افغانستان میں پاکستان دوست حکومت کے قیام اور استحکام کو ترجیح دینا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ میاں نواز شریف کی طرح محترمہ کی افغان پالیسی میں بھی امریکی تحفظات کو پوری طرح ملحوظِ خاطر رکھا جا رہا تھا۔

معاہدہ جلال آباد کے بعد: معاہدے کے بعد جب حکومت سازی کا مرحلہ درپیش ہوا تو مجاہد تنظیموں میں رشید دوستم کے مسئلے پر ایک بار پھر اختلاف ہو گیا۔ حرکت انقلابِ اسلامی اور اتحادِ اسلامی حکومت

میں دوستم کی شمولیت کو نا قابلِ برداشت قرار دے رہی تھیں۔ صدر ربانی کی جمعیت اسلامی اس مسئلے پر معنی خیز خاموشی اختیار کیے رہی جبکہ حزبِ اسلامی کا پُرزور اصرار تھا کہ دوستم کو حکومت میں شامل کیا جائے۔ سابق صدر صبغت اللہ مجددی بھی حزبِ اسلامی کے موقف کے حامی تھے۔ آخر کار بڑی بحث وتمحیص کے بعد مندرجہ ذیل شرائط کے تحت دوستم کو حکومت میں شامل کرنے پر اتفاق کر لیا گیا۔

① دوستم کی گلم جم ملیشیا فوری طور پر اپنا تمام اسلحہ حکومت کے حوالے کرے۔

② کابل خالی کر دے۔

③ دوستم کی جانب سے دو مجاہد رہنماؤں کو حکومت میں نمایندگی دی جائے گی۔

اس اتفاقِ رائے کے بعد کابل میں حکومت سازی کا کام شروع ہو گیا اور افغان عوام نے سکھ کا سانس لیا۔

حکمت یار کے بیرونی طاقتوں سے روابط: چاہیے تھا کہ اس کے بعد جمعیت اسلامی اور حزب اسلامی کی کشا کشی کا خاتمہ ہو جاتا مگر...... اندر ہی اندر اب بھی آگ مسلسل سلگ رہی تھی۔ لڑائی بھڑکانے والی طاقتیں بدستور سرگرم تھیں اور افغان رہنما ان کی شہ پر کسی بھی لمحے جنگ کے الاؤ میں کودنے کو تیار تھے۔

''جلال آباد مذاکرات'' کے دوران مسعود کے جنگ جوؤں نے پروان اور کاپیسا میں حزب اسلامی کے مراکز پر قبضہ کر لیا تھا اور مذاکرات کے بعد بھی یہ علاقے خالی نہیں کیے تھے۔ یہ صورتحال حکمت یار کے لیے سخت تکلیف دہ تھی۔ کمیونسٹ لابی اور بعض بیرونی طاقتیں پہلے ہی گلبدین حکمت یار کو اپنے تعاون کا یقین دلا کر افغانستان پر بلا شرکت غیرے حکومت کرنے کا خواب دکھا رہی تھیں۔

اس صورتحال میں حکمت یار جو حزبِ وحدت کے عبدالعلی مزاری اور شمال کے رشید دوستم کا اعتماد حاصل کر چکے تھے، اپنے اثر ورسوخ میں اضافے کے لیے نئے راستے تلاش کرنے لگے۔ انہوں نے خود ایران کا دورہ کیا اور صدر ہاشمی رفسنجانی کی پشت پناہی اور تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر ان کے نمایندوں نے تاشقند میں رشید دوستم کے نمایندوں سے مذاکرات کیے اور ایک نئے معاہدے پر دستخط کر کے باہم حلیف بن گئے۔ اس طرح حزب اسلامی، حزبِ وحدت، گلم جم ملیشیا اور ایران باہم متحد ہو گئے۔

''رابطہ کونسل'' نیا اتحاد: ان تینوں اتحادیوں کو لازمی طور پر حکومت پاکستان کا اعتماد درکار تھا، اس مقصد کے لیے چارسدہ میں ایک اجلاس ہوا جس میں حکمت یار کے داماد ہمایوں جریر اور دوستم کے نمایندے جنرل فوزی نے شرکت کی۔ جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد اور اجمل خٹک بھی موجود تھے۔ یہاں حزبِ اسلامی، حزبِ وحدت اور دوستم ملیشیا کے اتحاد کو ''رابطہ کونسل'' کے نام سے باقاعدہ ایک شکل دی گئی اور افغانستان میں ایک نئی حکومت کے قیام کا خاکہ بنایا جانے لگا۔ جناب حکمت یار کے

اس تفرد پسند طرزِ سیاست نے تمام مجاہد رہنماؤں کو ان سے متنفر کر دیا۔ استاذ سیاف، مولانا محمد یونس خالص، مولانا نبی محمدی اور پیر گیلانی اگرچہ صدر ربانی سے بھی مطمئن نہیں تھے مگر حکمت یار کو کمیونسٹوں کے ساتھ متحد دیکھ کر انہیں صدر ربانی سے تعاون میں عافیت نظر آ رہی تھی۔ ادھر حکمت یار معاہدہ جلال آباد کو نظر انداز کر کے اب زیادہ ٹھوس لہجے میں مطالبہ کر رہے تھے کہ ربانی عہدۂ صدارت سے مستعفی ہو جائیں جبکہ ربانی اس مطالبے کو پرِ کاہ کی حیثیت دینے کو بھی تیار نہیں تھے۔

یکم جنوری 1994ء کا خونریز معرکہ: آخر کار اپنی قوت کا اچھی طرح اندازہ کرنے کے بعد حکمت یار اور ان کے اتحادیوں نے کابل پر قبضے کا منصوبہ طے کر لیا۔ 31 دسمبر 1993ء کی یخ بستہ رات کے آخری پہر "رابطہ کونسل" میں شامل تینوں طاقتوں نے کابل پر اچانک یلغار کر دی۔ حزبِ اسلامی نے چہار آسیاب سے پیش قدمی کی اور بالا حصار کے نشیبی علاقے "پل محمود" سے کابل پر گولہ باری شروع کر دی۔ ادھر نادر خان میں موجود گلم جم ملیشیا بھی آگے بڑھی اور حزبِ اسلامی کے دستوں کے ساتھ شامل ہو گئی۔ جنوب سے حزبِ وحدت نے بھی لشکر کشی شروع کر دی۔ جلد ہی کابل ایئر پورٹ، ریڈیو اسٹیشن اور دیگر اہم عمارتوں پر رابطہ کونسل کے جنگجو قابض ہو گئے۔ کونسل کے تینوں بڑے رہنماؤں حکمت یار، رشید دوستم اور عبد العلی مزاری نے پاکستان اطلاع بھجوادی کہ کابل پر ہمارا قبضہ ہو گیا ہے اور برہان الدین ربانی شہر چھوڑ گیا ہے۔ مگر "رابطہ کونسل" کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہوا۔ کابل حکومت کے وزیر دفاع احمد شاہ مسعود نے اسی دن بھرپور جوابی کارروائی کر کے حزبِ اسلامی، حزبِ وحدت اور گلم جم ملیشیا کو باہر دھکیل دیا۔ شام تک ایئر پورٹ بھی واپس لے لیا گیا۔ لڑائی میں فریقین کی بھاری نفری کام آئی۔ سینکڑوں شہری بھی جاں بحق ہوئے۔ انجام کار میدان ربانی حکومت کے ہاتھ رہا۔ اس کامیابی کے بعد حکومت کابل نے حزبِ اسلامی، حزبِ وحدت اور دوستم ملیشیا کو "باغی" قرار دے دیا۔ یوں افغانستان کے عسکری گروہوں کے درمیان فضا اس قدر کشیدہ ہو گئی کہ لوگ کسی تصفیے کے امکان اور امن و امان کے قیام سے بالکل مایوس ہو گئے۔

ملک ٹکڑے ٹکڑے: 1994ء کا پورا سال اسی طرح مجاہد رہنماؤں کے مابین خانہ جنگی اور سیاسی کشمکش میں گزرا جس کی تفصیل میں جانا لاحاصل ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ اس خانہ جنگی نے ملک کو نہ ختم ہونے والے انتشار اور مکمل بربادی کے گڑھے میں دھکیل دیا۔

ایک جائزے کے مطابق ان دنوں افغانستان 9 واضح حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔

① کابل اور اس کے زیر انتظام شمالی علاقے: جن میں چہاریکار، پنج شیر، بدخشاں اور تخار شامل تھے۔

یہ علاقہ تاجک لیڈروں صدر برہان الدین ربانی اور احمد شاہ مسعود کے پاس تھا۔ بھارت اور روس ان کے مددگار تھے۔ پاکستان کی بعض جہادی تنظیموں اور دینی مدارس کا ان سے حسن ظن اب تک برقرار تھا اس لیے وہ بھی ان کے حامی تھے۔

② مشرقی افغانستان کے صوبے: ننگرہار، جنوبی کا پیسا، کابل کے نواحی علاقے لوگر، وردک، چہار آسیاب اور سروبی...... یہاں گلبدین حکمت یار اور ان کے اتحادیوں کا قبضہ تھا۔ انہیں کسی حد تک پاکستان اور بعض پاکستانی مذہبی تنظیموں خصوصاً جماعت اسلامی کی مدد حاصل تھی۔

③ شمالی افغانستان: بلخ، مزار شریف، جوزجان، فاریاب اور قندوز...... یہاں ازبک لیڈر، رشید دوستم کا راج تھا جسے روس، بعض وسطی ایشیائی ریاستوں اور کسی حد تک ایران کی بھی حمایت حاصل تھی۔

④ شمال مغربی افغانستان: جہاں ہرات، بادغیس، فراہ اور نیمروز پر فارسی بان کمانڈر توروں اسماعیل خان کی حکومت تھی۔ ایران اس کی پشت پناہی کر رہا تھا۔

⑤ خوست اور اس کے نواح میں پاکستانی سرحد سے متصل علاقے: یہاں مولانا جلال الدین حقانی کی حکومت قائم تھی جو شریعت اسلامیہ کے مطابق کام کر رہی تھی۔

⑥ بامیان: یہ ہزارہ جات قبائل کی نمائندہ حزب وحدت کے پاس تھا جسے ایران کی پوری سرپرستی اور امداد حاصل تھی۔

⑦ درۂ کیان اور پل خمری: آغا خانی لیڈر منصور نادری کے قبضے میں تھے۔ اسے آغا خان کی وساطت سے مغربی دنیا کا بھرپور تعاون مل رہا تھا۔

⑧ مشرقی افغانستان میں صوبہ کنڑ (اسعد آباد): شروع سے یہ علاقہ علماء ومجاہدین کا مرکز رہا ہے۔ سوویت یونین کے خلاف جہاد کی ابتداء میں یہاں کے علماء کا بہت اہم حصہ ہے۔ یہاں کے ایک اہل حدیث بزرگ مولانا جمیل الرحمن کو مشرقی افغانستان میں جہاد کا بانی کہا جاتا ہے۔ روسی افواج اپنی یلغار کے 12 سالوں میں یہاں قدم جمانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوئیں۔

کابل میں جمعیت اسلامی اور حزب اسلامی کی نہ ختم ہونے والی محاذ آرائی سے مایوس ہو کر کنڑ کے علماء نے اپنی آزاد حکومت قائم کر لی جس کے سربراہ مولانا جمیل الرحمن تھے۔ چونکہ یہ حکومت مرکز سے آزاد تھی اس لیے جمعیت اسلامی اور حزب اسلامی دونوں کے نزدیک معتوب رہی۔ چند سال بعد مولانا جمیل الرحمن پراسرار طریقے سے قتل کر دیے گئے۔ ان کے حامی اس کا الزام حزب اسلامی کو دیتے رہے۔ یہ حکومت، ستمبر 1996ء تک برقرار رہی۔

⑨ جنوبی افغانستان: یہاں درجنوں کمانڈر قدم قدم پر مورچہ زن تھے۔

ان علاقوں میں سے چند کو مستثنٰی کر کے ہر طرف قتل و غارت اور لاقانونیت کا بازار گرم تھا۔ کابل میں حزبِ اسلامی اور جمعیت اسلامی کی جھڑپیں روز کا معمول بن چکی تھیں۔ روزانہ حزب اسلامی کے مورچوں سے شہر پر راکٹ برستے اور ربانی کی فوجیں جوابی گولہ باری کرتیں۔ اس کشاکشی میں 63 ہزار افراد لقمہ اجل بن چکے تھے۔

مآخذ و مراجع

- ...... افغانستان کی کہانی، حقائق کی زبانی۔ ڈاکٹر مظفر احمد
- ...... ماہنامہ صدائے مجاہد، جلد 1992ء، 1993، 1994ء
- ...... ماہنامہ الارشاد، جلد 1992ء، 1993، 1994ء
- ...... ہفت روزہ تکبیر، جلد 1992ء، 1993، 1994ء
- ...... اردو ڈائجسٹ، جون 1992ء

تیسواں باب

طالبان کا ظہور

بھیڑیوں کی شکار گاہ، بدامنی اور لوٹ مار: مجاہدین کی دونوں بڑی جماعتوں حزبِ اسلامی اور جمعیت اسلامی میں مصالحت کی تمام کوششیں ناکام ہوجانے کے بعد صلح جُو رہنما مایوس ہوکر گوشہ نشین ہوگئے۔ ملک میں اب مرکزیت کا دور دور تک کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ ان حالات میں ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے سینکڑوں جنگجو کمانڈر اپنی اپنی جگہ عملاً خودمختار حکمران بن گئے کیونکہ انہیں کسی بالادست قوت سے باز پرس کا اندیشہ نہ تھا۔ ایسے کمانڈروں نے جگہ جگہ چوکیاں بنالیں اور سڑکوں پر پھاٹک اور آہنی زنجیریں نصب کرکے متوازی حکومتیں قائم کرلیں۔ کوئی گاڑی انہیں ٹیکس ادا کیے بغیر وہاں سے نہیں گزر سکتی تھی۔ مسافروں اور تاجروں کو ہر ایک ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر کوئی نہ کوئی زنجیر تنی ہوئی نظر آتی اور ٹیکس ادا کرنا پڑتا۔ صرف قندھار سے اسپین بولدک تک 20 سے زائد زنجیریں تھیں۔ مسافران سے گزرتے گزرتے قلاش ہوجاتے تھے۔ اگر کوئی ڈرائیور ٹیکس ادا کرنے میں پس وپیش سے کام لیتا تو اس کا حشر بہت برا ہوتا۔ افغانستان کا دورہ کرنے والے ایک صحافی راجہ عبدالوحید لکھتے ہیں:

''لوگوں نے مجھے بتایا ایسے بے شمار واقعات ہوئے کہ کسی پوسٹ پر ڈرائیور نے مسلح افراد کو یہ جگا ٹیکس ادا کرنے سے انکار کردیا تو اسے گاڑی کے نیچے لٹا کر اوپر جیک رکھ کر گاڑی کو اُٹھا دیا گیا جس سے اس کی کمر کی ہڈیاں اور سینے کی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ بعض جگہ ایسے ''نافرمان'' ڈرائیوروں کے جسم کا گوشت پلاسوں سے نوچا گیا اور کھال کھینچی گئی۔'' (پندرہ روزہ جہادِ کشمیر، جنوری 1996ء)

ان کی خرمستیوں کا یہ عالم تھا کہ خواتین کی عصمتیں تک محفوظ نہیں رہی تھیں۔ وہ جسے چاہتے تھے گاڑی سے اُتار کر اغوا کرلیتے اور عصمت دری کرکے قتل کردیتے۔ حد تو یہ ہے کہ لڑکے تک ان کی ہوسناکی کا شکار بننے لگے تھے۔ یہ مسلح کمانڈر نہ صرف راہزنی کے عادی تھے بلکہ اپنے زیرِ تسلط بستیوں میں بھی دن دیہاڑے غنڈہ گردی کرتے تھے۔ انہوں نے ''مجاہدین'' کے پاکیزہ نام کو دل کھول کر بدنام کیا۔ ورنہ

حقیقت میں یہ مجاہدین نہیں مفاد پرست عناصر تھے جنہوں نے ذاتی مفادات کے لیے مجاہدین کا بھیس بدل لیا تھا۔ انہوں نے منشیات فروشی کے ذریعے خوب دولت کما کر اسلحے کے بڑے بڑے ذخائر جمع کر لیے تھے اور کرائے کے غنڈوں اور اجرتی قاتلوں کو بھرتی کر کے لوگوں پر دہشت بٹھا دی تھی۔

انہیں مجاہد مت کہو: ان دنوں کابل کے حالات کیا تھے، ایک واقعے سے اندازہ لگائیے۔ کابل میں کام کرنے والی ایک رفاہی تنظیم کے رکن کا بیان ہے: ''میں ایک دن کہیں جا رہا تھا مگر راستہ معلوم نہ تھا۔ دیکھا کہ ایک گاڑی آ رہی ہے۔ گاڑی قریب آئی تو میں نے ہاتھ دیا لیکن گاڑی میں بیٹھے ہوئے بندوق برداروں نے بریک نہ لگائی۔ میں نے زور سے کہا: مجھے راستہ بتاؤ۔ مگر وہ قہقہے لگاتے گزر گئے۔

پیچھے ایک گھر تھا میں اس طرف چلا گیا تا کہ راستہ معلوم کروں۔ دیکھا تو گھر میں ایک لڑکی سر جھکائے بیٹھی ہے۔ میں نے اسے مخاطب کر کے کہا: ''یہ کیسے مجاہدین تھے جو ابھی یہاں سے گزرے ہیں۔ میں نے ان سے راستہ پوچھنا چاہا مگر انہوں نے میری بات سننا تک گوارا نہ کی۔''

یہ سن کر لڑکی نے سر اوپر اُٹھایا۔ میں نے دیکھا وہ رو رہی تھی۔ اس نے کہا: ''خدا کے لیے انہیں مجاہدین نہ کہو۔ یہ تو لٹیرے ہیں۔ ابھی ابھی میرے باپ کے سامنے میری اور میری ماں کی آبرو لوٹ کر گئے ہیں۔ اس صدمے سے میرا باپ بے ہوش ہو گیا ہے۔''

افغانستان ایک عبرت کدہ: یہ تو ایک مثال ہے ورنہ ان دنوں وہاں اس سے بڑھ کر ایسے ایسے ہوش ربا مظالم توڑے جا رہے تھے جنہیں سن کر یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کیا واقعی کوئی مسلمان بلکہ کوئی ابن آدم اس حد تک گر سکتا ہے اور کیا انسانیت کی اس قدر تذلیل بھی ہو سکتی ہے۔ اس دہشت گردی کی وجہ سے ایک طرف تو افغان عوام کا جینا دوبھر ہو گیا تھا اور دوسری طرف اندرونی و بیرونی تجارت کے راستے بھی بند ہو گئے تھے۔ ہاں منشیات کی تجارت کو خوب فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ افغانستان گویا جرائم پیشہ افراد کی جنت بن چکا تھا۔ جہاں وہ ہر طرح کی من مانی کر سکتے تھے جہاں ہر طرف غنڈوں اور بدمعاشوں کا راج تھا اور ہر شریف انسان اپنی زندگی سے عاجز تھا۔

فاتحین، علماء، صوفیا، اور غیرت مند مسلمانوں کا یہ ملک اب ایسے بھیڑیوں کی شکار گاہ بن چکا تھا جو کسی پر رحم کرنا نہیں جانتے تھے۔ جو انسان کے روپ میں شیطان تھے۔ ان کے مظالم اور شرمناک کارستانیوں نے لوگوں کو سابقہ ادوار کے مصائب بھلا دیے تھے۔ افغانستان کے چپے چپے سے گھٹی گھٹی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا ذرہ ذرہ بلک رہا تھا۔ سفید ریش بوڑھے مسجد کی محرابوں میں، عورتیں گھر کی تاریک کوٹھڑیوں میں سجدہ ریز ہو کر خدائے عزوجل سے رحم کی التجا کر رہی تھیں۔ ان

آہوں اور سسکیوں کے پیچھے کچھ قہقہے بھی گونج رہے تھے۔ یہ آوازیں امریکا، روس، اسرائیل اور بھارت کے ایوانوں سے آرہی تھیں۔ جو مجاہدین کی سرزمین کو خانہ جنگی کی آگ میں جھونک کر خوشیاں منا رہے تھے۔ انہیں اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ انہوں نے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے خواب کو سبوتاژ کر دیا تھا۔ جہاد کو دنیا بھر میں بدنام کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ کیونکہ اب تو خود مسلمان یہ کہہ رہے تھے کہ اگر جہاد اس عمل کا نام ہے جو افغانستان میں ہو رہا ہے اور جہاد کے ثمرات وہی ہیں جو وہاں ظاہر ہو رہے ہیں تو ہم ایسے جہاد کے بغیر بھلے۔ مجاہدین کے حامیوں کے پاس اب نہ تو حکمت یار کی وکالت کے لیے کوئی دلیل تھی نہ وہ احمد شاہ مسعود اور ربانی کے کارناموں کی کوئی وجۂ جواز جانتے تھے۔ ان حالات میں افغانستان ایک عبرت گاہ بن گیا تھا جسے دیکھ کر ہر دردمند مسلمان تنہائی میں خون کے آنسو روتا تھا مگر دنیا جو افغانستان کو حشرات الارض کا ایک جنگل قرار دے چکی تھی بے فکر تھی۔ کسی کو پروا نہ تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے عالمی طاقتیں اسے نمونۂ عبرت بنا کر مطمئن تھیں اور مسلم ممالک وہاں اصلاح احوال سے مایوس ہو کر منہ پھیر چکے تھے۔ ظاہری اسباب و وسائل کے لحاظ سے اب افغانوں کا بحیثیت قوم باقی رہنا مشکل نظر آتا تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ آیندہ دو چار سالوں میں یہ ملک اپنی جغرافیائی وحدت کھو بیٹھے گا اور عالمی طاقتیں اس جاں بلب مریض کے اعضا تک نیلام کر دیں گی۔

جنوبی افغانستان سے ایک نئی قوت کا ظہور: مگر یاس و حرماں نصیبی کی ان گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں اچانک افغانستان کے جنوبی اُفق پر روشنی کی ایک کرن نمودار ہوئی اور افغانستان کے باشندے دم بخود ہو کر اس سمت دیکھنے لگے۔ سحر کا یہ دھندلکا بڑھتا گیا حتیٰ کہ لوگوں نے جنوبی افغانستان سے ایک نئی قوت کو نمودار ہوتے دیکھا۔ اس قوت نے دیکھتے ہی دیکھتے ملک کی سیاست میں ایک فیصلہ کن مقام حاصل کر کے عالمی طاقتوں کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ یہ نئی طاقت ''طالبان'' کے نام سے ظہور پذیر ہوئی تھی۔ یہ دینی مدارس کے طلبہ کا گروہ تھا جو حالات کی اصلاح کے لیے میدان میں اُترا تھا۔

طالبان کون تھے؟ کہاں سے آئے؟ طالبان کی اکثریت کا تعلق مجاہدین کی اس دوسری نسل سے تھا جو سوویت افواج کے خلاف جہاد کے آخری دور میں میدان میں اتری یا سوویت افواج کے انخلاء کے بعد نجیب انتظامیہ کے خلاف نبرد آزما رہی۔ نجیب حکومت کے خاتمے کے بعد یہ ہزاروں نوجوان اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ ان کی بڑی تعداد دینی مدارس میں اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنے لگی۔ یہ مدارس قندھار، خوست اور دوسرے افغان شہروں کے علاوہ پاکستان کے صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان میں قائم تھے۔ ان میں جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک اور جامعہ منبع العلوم میران شاہ زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ کوئٹہ میں بھی کئی مدارس ایسے تھے جہاں افغان مہاجرین کے بچے زیر تعلیم تھے۔ یہ ہزاروں نوجوان طالبان تحریک کا حصہ بننے میں پیش پیش تھے۔

تحریک کے اکثر سرکردہ افراد گمنام تھے مگر آہستہ آہستہ اس میں مشہور اور با اثر علماء و مشائخ بھی شامل ہوتے چلے گئے۔ یوں طالبان تحریک تیزی سے مقبول ہونے لگی۔ بہرحال تحریک کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ جن کی عمریں 18 سے 25 سال کے درمیان تھیں۔ ان میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جو پہلے کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ یہ تحریک کسی بڑی منصوبہ بندی یا وسیع اہداف کو سامنے رکھ کر شروع نہیں کی گئی تھی بلکہ یہ مقامی کمانڈروں کے ظلم و تشدد کے خلاف ایک فوری ردِ عمل تھا۔ طالبان کے رہنما ملا محمد عمر نے صرف پندرہ سولہ افراد کے ساتھ ان درندہ صفت افراد کو سبق سکھانے کا تہیہ کیا تھا جو افغان معاشرے میں رچی بسی شرم و حیا اور غیرت و حمیت کی دھجیاں اُڑا رہے تھے۔

ملا محمد عمر مجاہد: ملا محمد عمر مجاہد کے شب و روز جنوبی افغانستان کے شہروں، دیہاتوں اور جنگلات میں بسر ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کابل بھی صرف دو مرتبہ گئے۔ وہ انتہائی سنجیدہ، باوقار اور کم گو انسان ہیں۔ ان کا قد ساڑھے چھ فٹ کے قریب ہے اور چہرے پر گھنی ڈاڑھی ہے۔ میڈیا سرتوڑ کوشش کے باوجود ان کی کوئی تصویر لینے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ وہ خود محفلوں، میڈیا اور غیر ضروری میل ملاپ سے گریز کرتے ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی مغربی صحافی کو انٹرویو نہیں دیا۔ دورِ حکمرانی میں یا اس سے پہلے بھی کبھی بیرونِ افغانستان کا سفر نہیں کیا۔ ہاں صرف جہاد میں زخمی ہو کر دو تین بار علاج کے لیے کوئٹہ آئے تھے۔ ان کی زندگی ایک قلندرانہ راز کی مانند ہے۔

وہ 1960ء میں قندھار کے ایک نواحی گاؤں "نودیہہ" میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد مولوی غلام نبی اس گاؤں کی مسجد کے امام تھے۔ ان کا نسبی تعلق پختونوں کے قبیلے "غلزئی" کی شاخ "ہوتک" سے ہے۔ "ہوتک" وہی قبیلہ ہے جس کے سردار "میرویس" نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں افغانوں کو متحد کر کے "غلزئی افغان سلطنت" کی بنیاد رکھی تھی جو افغانستان کے علاوہ ایران کے شہر اصفہان تک پھیلی ہوئی تھی۔

مگر ملا عمر کسی رئیس یا جاگیردار گھرانے کے نہیں، ایک غریب کنبے کے فرد تھے۔ ان کا بچپن، لڑکپن اور جوانی نہایت عسرت میں گزرے۔ ان کا خاندان کسی چھوٹی سی جائیداد کا مالک بھی نہیں۔ ہاں علم و فضل اور احسان و معرفت کی دولت سے مالا مال ہے۔ خاندان میں علماء و مشائخ بھی تھے اور امامت و خطابت اور درس و تدریس بھی ان کا خاندانی منصب تھا مگر اس حوالے سے بھی یہ خاندان زیادہ مشہور نہیں تھا۔ ان کے والد، چچا اور دوسرے بزرگ گمنامی کے ساتھ دین کی خدمت کرنے اور جفاکشی کے ساتھ

رزق حلال کمانے کے عادی تھے۔یہی خصلتیں ملا محمد عمر کو ورثے میں ملیں۔

ملا محمد عمر مجاہد جہادِ روس میں: محمد عمر ابھی تین سال کے تھے کہ ان کے والد مولوی غلام نبی چل بسے۔ان کے بڑے چچا مولوی محمد انور نے انہیں اپنی کفالت میں لے لیا اور اپنے بچوں کی طرح ان کی پرورش کی۔ انہوں نے مرحوم بھائی کی بیوہ سے نکاح کرلیا،اس طرح وہ محمد عمر کے سوتیلے باپ بھی بن گئے۔یہ بڑے چچا ارزگان کے ضلع بیروت کی ایک مسجد کے امام اور مدرس تھے۔زابل کا ضلع ''شنکئے'' اور بیروت وہ علاقے ہیں جہاں محمد عمر کا قبیلہ طویل مدت سے آباد تھا۔اب اپنے چچا کے ساتھ محمد عمر بھی وہیں منتقل ہوگئے۔یہاں انہوں نے انور چچا کے علاوہ دوسرے چچا مولوی محمد جمعہ سے علوم اسلامیہ کی ابتدائی کتب پڑھیں۔

1978ء میں جب محمد عمر ہدایہ پڑھ رہے تھے،افغانستان میں کمیونسٹ انقلاب آگیا۔یہ محمد عمر کی زندگی کا اٹھارہواں سال تھا۔اسی سال وہ تعلیم کا سلسلہ موقوف کرکے کمیونزم کے خلاف میدان میں اُترنے والے اولین مجاہدین کی صفوں میں شامل ہوگئے۔ڈیڑھ سال بعد روسی افواج باقاعدہ افغانستان میں داخل ہوگئیں۔ان کے ہوش ربا مظالم سے بچنے کے لیے لاکھوں افراد پاکستان چلے گئے مگر ملا محمد عمر مجاہد کا خاندان ان سخت ترین حالات میں بھی مادرِ وطن کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا۔شروع شروع میں محمد عمر بیروت کے آس پاس کمیونسٹوں اور روسیوں سے نبرد آزما رہے۔اس دوران وہ دوبار شدید زخمی ہوئے۔ایک بار ٹانگ متاثر ہوئی،دوسری بار مشین گن کی گولیوں نے ان کا جسم چھید دیا مگر محمد عمر نے جہاد جاری رکھا۔

ایک عرصے بعد وہ چچا کے مشورے سے قندھار کے جنوب مغربی ضلع ''پنج وائی'' منتقل ہوگئے۔ انہوں نے گاؤں ''سنگ حصار'' کو مرکز بنا کر روسیوں پر حملے شروع کیے۔اس دوران ایک بار پھر وہ حد درجے گھائل ہوئے حتیٰ کہ دائیں آنکھ بھی کام آگئی۔کوئٹہ ہسپتال میں علاج ہوا اور تندرست ہوتے ہی وہ دوبارہ محاذ پر پہنچ گئے۔اس دوران ان کی والدہ اور اہل خانہ ارزگان میں تھے جو نسبتاً محفوظ علاقہ تھا۔محمد عمر سال ڈیڑھ سال میں ان سے ملنے چلے جاتے تھے۔

ان مہمات میں 14 برس بیت گئے۔محمد عمر کمانڈر مولوی یونس خالص کی حزب اسلامی اور مولوی نبی محمدی کی حرکت انقلاب اسلامی کے علاقائی کمانڈر کے طور پر میدان جہاد میں دادِ شجاعت دیتے رہے۔1989ء سے 1992ء کے دوران وہ کمانڈر نیک محمد کی کمان میں نجیب حکومت کے خلاف مصروف پیکار رہے۔وہ راکٹ لانچر استعمال کرنے کے ماہر تھے۔روسیوں اور کمیونسٹوں کے بہت سے ٹینک ان کے چلائے ہوئے راکٹوں سے تباہ ہوئے۔کئی مہمات میں انہوں نے مجاہد گروپوں کی قیادت کی اور اپنے اہداف کامیابی سے حاصل کیے۔اب جنوبی افغانستان کے مجاہدین میں وہ ملا محمد عمر کے نام سے مشہور ہوچکے تھے۔

خانہ جنگی کے دور میں: نجیب حکومت کے خاتمے اور کابل پر مجاہدین کے قبضے کے بعد ملا محمد عمر نے قندھار کے ضلع میوند کے دیہات ''سنگ حصار'' کی ایک مسجد کی امامت کے فرائض سنبھال لیے۔ ساتھ ہی ایک مدرسہ بھی کھول لیا جس میں طلبہ تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ملا عمر خود بھی اب تک پورے عالم دین نہیں بنے تھے۔ ہدایہ سے آگے کی کتب باقی تھیں، چنانچہ وہ خود بھی باقی ماندہ کتب کی تکمیل کرنے لگے۔ ایک روایت کے مطابق ان دنوں وہ مختصر المعانی اور مشکوٰۃ شریف پڑھ رہے تھے۔ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مدرسے میں پڑھاتے تھے۔ دونوں روایات میں تطبیق کس طرح ہو؟ قرین قیاس یہ ہے کہ اس وقت وہ مشکوٰۃ پڑھنے کے ساتھ ساتھ نچلے درجات کے طلبہ کو پڑھاتے بھی ہوں گے۔ بہر حال پڑھائی کی مشغولیت کے باوجود وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر نہیں تھے۔ اپنے وطن کی حالت زار پر وہ نہایت متفکر رہا کرتے تھے۔ یہ بے چینی غالب آئی تو تعلیم کے ساتھ ساتھ انہوں نے پندرہ بیس ہم خیال طلبہ کی ایک جماعت بنا کر اصلاح معاشرہ کی ایک خاموش کوشش شروع کر دی۔

طریقہ کار یہ تھا کہ وہ وفد کی شکل میں مختلف گروپوں کے کمانڈروں سے ملتے، انہیں حالات کی سنگینی اور قوم کی ابتری کا احساس دلاتے اور ترغیب دیتے کہ وہ باہمی تنازعے ترک کر دیں، لوٹ مار اور غارت گری بند کرائیں اور شرعی احکام کا نفاذ کر کے عوام کو امن و امان کی فراہمی یقینی بنائیں۔ تین چار ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ حاجی بشیر اور چند مخلص مجاہد رہنما ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہے مگر اس ترغیبی کوشش کا اکثر کمانڈروں پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔

یہ گھڑی محشر کی ہے: شاید ان کی عمر اسی طرح درس و تدریس اور ترغیب و تبلیغ میں گزر جاتی اور تاریخ میں ان کا نام کبھی ثبت نہ ہو پاتا مگر 1994ء کے موسم خزاں میں ایک لرزہ خیز واقعے نے ان کی زندگی اور افغانستان کی تاریخ کا دھارا بدل دیا۔ انہیں اطلاع ملی کہ ایک ظالم کمانڈر نے دو نوعمر لڑکیوں کو اغوا کر لیا ہے، ان کے سر مونڈ دیے ہیں اور انہیں مردانہ لباس پہنا کر اپنے فوجی کیمپ لے گیا ہے جہاں کئی بار ان کی عصمت دری کی گئی ہے۔

یہ دردناک واقعہ سن کر ملا محمد عمر سے برداشت نہ ہو سکا۔ انہوں نے فوراً اپنے مدرسے کے طلبہ کو جمع کیا جو تیس کے لگ بھگ تھے۔ ان میں سے صرف 16 کے پاس رائفلیں تھیں۔ ملا محمد عمر ان طلبہ کو لے کر اس بے سروسامانی کے عالم میں اس ظالم کمانڈر کی چوکی پر ٹوٹ پڑے۔ یہ چوکی ''پاشمون'' کہلاتی تھی۔ اس کارروائی کے نتیجے میں مظلوم لڑکیوں کو چھڑوا لیا گیا۔ کمانڈر کو توپ کے دہانے سے لٹکا کر پھانسی دے دی گئی اور چوکی پر قبضہ کر لیا گیا۔

یادرہے کہ قندھار کے لوگ یہ واقعہ معمولی فرق کے ساتھ مختلف انداز میں سناتے ہیں۔ایک مقامی روایت اس طرح ہے کہ مہاجرین کا ایک خاندان چمن سے قندھار آرہا تھا۔راستے میں ان کی گاڑی کو ایک چیک پوسٹ پر روکا گیا۔ مسلح افراد کے کمانڈر نے گاڑی میں سوار دو کم عمر لڑکیوں کو زبردستی اتروالیا۔ جب ان کے والدین نے احتجاج کیا تو مسلح افراد نے ان پر فائرنگ کی کوشش کی۔ڈرائیور بڑی مشکل سے گاڑی بھگا کر خاندان کے بقیہ افراد کو بچانے میں کامیاب ہوا اور لوگوں کو اپنی بپتا سنائی مگر کسی کو مدد کی ہمت نہ ہوئی۔اگلے دن ان معصوم بچیوں کی لاشیں ایک مقامی مدرسے کے دروازے پر ملیں۔ملا محمد عمر یہ دیکھ کر تڑپ اُٹھے اور ان ظالموں سے بدلہ لینے پر تل گئے۔چونکہ ان ایام میں ایسے واقعات کثرت سے پیش آرہے تھے اس لیے کوئی بعید نہیں کہ ایسے ایک سے زائد سانحے قریب قریب وقوع پذیر ہوئے ہوں جن کے ردِعمل میں ملا محمد عمر کو میدان میں اُترنا پڑا ہو۔

بہرکیف یوں سنگ حصار کے قریب واقع پاشمون چوکی پر قبضہ ان کے طویل سفر کا سنگ میل بن گیا۔اس چوکی سے انہیں اسلحے اور دیگر ساز وسامان کے علاوہ دو عورتوں کی سر بریدہ لاشیں بھی ملی تھیں۔کہا جاتا ہے کہ غنڈوں نے عصمت دری کے بعد شناخت مٹا ڈالنے کے لیے ان مظلوم عورتوں کے سر قلم کردیے تھے۔

درندگی کی انتہا: طالبان تحریک کے آغاز کا سبب بننے والے واقعات میں ایک اور لرزہ خیز واقعہ بھی ثقہ راویوں نے بیان کیا ہے۔ان کے بیان کے مطابق قندھار کے دیہی علاقے کا ایک شخص اپنی بیوی کو کرایے کی گاڑی پر زچگی کے لیے ہسپتال لے جارہا تھا۔عورت شدید تکلیف کی حالت میں تھی کیوں کہ بچے کی ولادت کا وقت قریب تھا۔راستے میں اس گاڑی کو چیک پوسٹوں پر حسبِ معمول روک کر اس دیہاتی سے ٹیکس لیا گیا۔تین چیک پوسٹوں پر بھاری ٹیکس ادا کرنے کے بعد بے چارے دیہاتی کی جیب خالی ہوگئی۔جب گاڑی چوتھی چیک پوسٹ پر پہنچی اور اس کا کمانڈر دیہاتی سے کچھ وصول کرنے میں ناکام رہا تو مشتعل ہوکر اس نے دیہاتی کو گاڑی سے نیچے گھسیٹ لیا۔دیہاتی نے گڑگڑا کر انہیں اپنی مجبوری اور اپنی بیوی کی نازک حالت سے آگاہ کیا تو جنگجوؤں کے چہروں پر شیطانی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ان کے کمانڈر نے کہا: ''ہم نے آج تک ہر قسم کے فحش مناظر دیکھے ہیں مگر کبھی بچے کی پیدائش کا تماشا نہیں دیکھا۔تم بیوی کو یہیں چھوڑ جاؤ۔ہم یہ منظر دیکھ کر رہیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ بے رحم اس تڑپتی ہوئی عورت کو گھسیٹتے ہوئے چیک پوسٹ میں لے گئے۔تکلیف سے ادھ موئی خاتون خود کو عصمت کے لٹیروں میں گھرتا دیکھ کر اس قدر مضطرب اور خوف زدہ ہوئی کہ اس نے وہیں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔جب ملا محمد عمر کو اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ اس بدمعاشی اور درندگی کو

مٹا کردم لیں گے چاہے انہیں اپنی جان کی قربانی بھی کیوں نہ دینا پڑے۔

<u>یہ اس زمانے کی بات ہے:</u> تحریک کے آغاز کے بارے میں ایک نہایت اہم روایت خود بانئ تحریک ملا محمد عمر سے منقول ہے۔ یہ روایت اس اجلاس میں پڑھ کر سنائی گئی تھی جس میں ملا عمر کو ''امیر المؤمنین'' کا لقب دیا گیا۔ بعد میں یہ روایت طالبان حکومت کے ترجمان ماہنامہ ''امارت اسلامیہ'' میں بھی شائع ہوئی۔ اس روایت میں ملا محمد عمر کہتے ہیں:

''یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں قندھار کے علاقے ''سنگ حصار'' کے ایک چھوٹے سے مدرسے میں زیر تعلیم تھا۔ ایک دن افغانستان میں ہونے والے مظالم، ہولناک اور خونچکاں حالات کی تصویر اچانک آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگی۔ جس نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ملک میں جوروستم کی گرم بازاری اور جاہل وسفاک حکمرانوں کے ہوتے ہوئے ان مدارس اور علم کے حصول کا کیا فائدہ۔ یہ سوچ کر میں نے دل ودماغ میں ایک منظم اسلامی تحریک چلانے کا نقشہ کھینچا۔ چنانچہ درس وتعلیم کا مشغلہ ترک کر کے میں اپنے ایک رفیق کار کے ہمراہ ''زنکاوات'' روانہ ہوا۔ وہاں سے ایک دیرینہ ساتھی سے موٹر سائیکل لی جس پر میں اور میرے ساتھی نے سوار ہو کر شہروں اور بستیوں میں پھیلے ہوئے مختلف مدارس کا دورہ کیا۔ طلبہ کے سامنے اپنا ایجنڈا پیش کیا۔ شام تک تقریباً 53 طلبہ ساتھیوں کو میں نے اس تحریک میں کام کرنے کے لیے تیار کیا۔ سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ وہ کل میرے مدرسے میں حاضر ہوں گے اور اس تحریک کو فعال بنانے کے لیے غور وخوض کریں گے لیکن کل تک وہ سب صبر کی قدرت نہ رکھ سکے اور اسی رات میرے ہاں جمع ہو گئے۔ صبح ہم مجاہدین کے سرپرست الحاج بشیر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چنانچہ حاجی بشیر صاحب اور دیگر تنظیموں کے قائدین نے ہمیں ضرورت کے مطابق اسلحہ دیا۔ یہی ہمارے لیے اس تحریک کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔''

تحریک کے آغاز میں فقروفاقے اور مالی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے وہ انکشاف کرتے ہیں:

''میں نے ساتھیوں سے کہا اپنا کام کرتے رہیے اور شہر میں واقع گھروں میں روٹی سالن جمع کرتے رہیے۔ اگر کچھ مل گیا تو کھالیں گے اور اگر کچھ نہ ملا تو صبر ہی سے کام لیں گے۔''

(ماہنامہ امارت اسلامیہ، ص:16، محرم 1422ھ، از سید محمد طیب آغا)

اس طرح ملا محمد عمر نے سنگ حصار اور گردونواح کے طلبہ کو جمع کر کے انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں اصلاح معاشرہ کا کام شروع کیا۔ ابتدائی یہ کوشش غیر مسلح انداز میں تھی مگر پرامن انداز میں تحریک کے آغاز

کے بعد خواتین کی آبروریزی کے وہ جگر دوز واقعات پیش آئے جنہوں نے ملا محمد عمر کو یکدم ہتھیار اُٹھانے پر مجبور کردیا۔ یوں قندھار کے گردونواح کے لوگ پہلی بار ملا محمد عمر مجاہد سے متعارف ہوئے۔ چونکہ ان کے ساتھیوں میں دینی مدارس کے طلبہ کی اکثریت تھی جنہیں افغانستان میں ''طالبان'' کہا جاتا ہے اس لیے یہ جماعت خود بخود ''طالبان'' کے نام سے مشہور ہوتی چلی گئی۔ اب مقامی لوگوں کی نظریں ملا محمد عمر اور اس کے طالب علم ساتھیوں پر لگ گئی تھیں کہ شاید وہ انہیں جبر و جور کی زندگی سے نجات دلائیں۔ وہ گردونواح سے اپنے علاقوں کے بے رحم سرداروں کے مظالم کی داستانیں لے کر ان کے پاس آنے لگے۔

اسپین بولدک کی طرف: ملا محمد عمر اپنے ساتھیوں سے صلاح و مشورے کرتے رہے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ اس تحریک کو آگے بڑھایا جائے۔ پاشمون چوکی پر قبضے اور عوام کے خوشگوار ردِعمل نے طالبان کو بڑا حوصلہ بخشا تھا۔ چنانچہ انہوں نے تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے مختلف علاقوں میں اپنے ان طلبہ ساتھیوں سے رابطے شروع کردیے جو جہاد افغانستان میں شرکت کرچکے تھے اور اب حالات سے مایوس ہو کر اپنے گھروں میں بند تھے۔ اس طرح نئے افراد آتے چلے گئے۔ جلد ہی ان کی تعداد ایک سو تک پہنچ گئی تب طالبان کی قیادت نے سڑکوں پر لوٹ مار اور رہزنی کے مستقل سدباب کے لیے دیگر اہم چوکیوں پر قبضہ کرنے اور وہاں سے زنجیریں کاٹنے کا فیصلہ کیا۔

ان دنوں پاکستانی سرحد کے قریب واقع بستی ''اسپین بولدک'' پر حزبِ اسلامی کے اختر جان نامی کمانڈر کا قبضہ تھا۔ طالبان نے پہلے اسے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ سڑک سے زنجیریں ہٹا دے اور قیامِ امن میں ان کا دست و بازو بن جائے مگر متواتر 24 دن پند و نصیحت کے باوجود وہ نہ مانا۔ یوں تصادم ناگزیر ہوگیا اور طالبان اسپین بولدک کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کی تعداد 100 تھی اور وہ ایک ٹرک پر سوار تھے۔ اس ٹرک کے پچھلے حصے کو ترپال سے ڈھانپ دیا گیا۔ 100 کے قریب مسلح طلبہ اس ترپال کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔ انہیں خاموش رہنے کی تاکید کی گئی تھی۔ راستے میں جب بھی کوئی چیک پوسٹ آتی تو ڈرائیور بتاتا کہ وہ چمن بارڈر پر فروخت کے لیے بھیڑ بکریاں لے جا رہا ہے۔ چونکہ اس طرح کے ٹرک عام طور پر گزرتے رہتے تھے اس لیے کسی جگہ کمانڈروں کو ٹرک کی تلاشی کا خیال نہ آیا۔ ڈرائیور کو اس مہم کے لیے خاصی رقم دے دی گئی تھی لہٰذا وہ ہر چیک پوسٹ پر کمانڈروں کو منہ مانگی رقم دیتا رہا اور ہر کمانڈر نے اسے بخوشی گزرنے دیا۔ جب یہ ٹرک اسپین بولدک کے ضلعی دفتر کے پاس پہنچا تو شاہراہ پر آگے بڑھنے کی بجائے ذیلی سڑک پر مڑ کر دفتر کی مرکزی عمارت کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ آس پاس تعینات اہلکار سنبھل پاتے، سو کے سو مسلح طلبہ ٹرک سے کود کر ہر طرف پھیل گئے۔

اسپین بولدک کا کمانڈر اختر جان اپنے کئی محافظوں سمیت فرار ہو گیا۔ طالبان نے باقی مسلح افراد کو آناً فاناً نہتا کر دیا۔ طالبان کو اس چیک پوسٹ سے پچاس کلاشن کوفیں، دوسرا اسلحہ اور گولہ و بارود مالِ غنیمت میں ملا۔ یہ تاریخی واقعہ 12 اکتوبر 1994ء کا ہے۔

اسپین بولدک پاکستان اور افغانستان کے درمیان ایک اہم سرحدی مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ جگہ قندھار شہر سے 100 کلومیٹر دور اور پاکستان کے سرحدی شہر چمن سے بہت نزدیک ہے۔ افغانستان اور پاکستان کے درمیان چلنے والے تجارتی قافلے یہاں رکتے اور ڈیزل بھرواتے ہیں۔ افغان ٹرک یہاں ان پاکستانی ٹرکوں سے سامان اُٹھاتے ہیں جنہیں سرحد عبور کرنے کی اجازت نہیں ملتی۔ ان وجوہ سے یہ جگہ نہایت اہمیت کی حامل رہی ہے۔ اس پر قابض ہو کر طالبان قندھار کے گردونواح میں ایک نمایاں قوت کی حیثیت اختیار کر گئے جس سے قندھار کے کمانڈروں کو غیر معمولی تشویش لاحق ہوگئی اور وہ طالبان کو پاکستانی ایجنسی "آئی ایس آئی" کے گماشتے قرار دے کر عوام کو ان سے متنفر کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ حالانکہ طالبان اور حکومتِ پاکستان میں اس وقت تک کوئی شناسائی نہیں تھی۔

<u>پاکستان کا تجارتی قافلہ</u>: طالبان کا حکومتِ پاکستان کے نمایندوں سے پہلا رابطہ اسپین بولدک پر قبضے کے کچھ دنوں بعد ہوا۔ ہوا یہ تھا کہ طالبان کے اُبھرنے سے پہلے ہی حکومت پاکستان وسط ایشیا سے تجارتی تعلقات بڑھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وزیر اعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو اس میں خاصی دلچسپی لے رہی تھیں۔ وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر اس سلسلے میں ان کے دستِ راست تھے۔ نصیر اللہ بابر نے کچھ دنوں قبل افغانستان کا دورہ کیا تھا اور وسط ایشیا کو جانے والے راستے پر قابض کمانڈروں سے وعدہ لیا تھا کہ وہ پاکستان کے تجارتی قافلوں کو تحفظ فراہم کریں گے۔ قندھار کے ایک بڑے کمانڈر گل آغا نے بھی جسے "گورنر" کی حیثیت حاصل تھی، حکومت پاکستان سے تجارتی قافلوں کو تحفظ دینے کا معاہدہ کر لیا تھا مگر بعض مقامی کمانڈر اس معاہدے کے خلاف تھے۔ خود گل آغا کے قول وقرار کا بھی کوئی اعتبار نہ تھا۔ وہ ایک دھوکے باز اور لالچی شخص تھا۔ اس معاہدے کے کچھ دنوں بعد اسپین بولدک پر طالبان کا قبضہ ہو گیا۔ ادھر 28 اکتوبر 1994ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو نے ہرات کے حاکم اسماعیل خان تورون اور شمالی افغانستان کے حکمران رشید دوستم کو بھی تجارتی راستے کھولنے میں اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی۔ مثبت ردِ عمل ملنے پر اگلے ہی دن (29 اکتوبر کو) 30 ٹرکوں کا ایک بڑا قافلہ کوئٹہ سے ترکمانستان کے دارالحکومت اشک آباد کے لیے روانہ ہو گیا۔ نصیر اللہ بابر خود اس قافلے کی کمان کر رہے تھے۔ اسے قندھار اور ہرات سے گزر کر ترکمانستان میں داخل ہونا تھا، اگرچہ گل آغا کی بد طینتی کے پیشِ نظر اس قافلے کا افغانستان جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔

گل آغا کی چال: جب یہ قافلہ چمن کی سرحد عبور کر کے اسپین بولدک پہنچا تو وہاں منظر بالکل بدلا ہوا تھا۔ سابق کمانڈر کی جگہ اب یہاں طالبان کا قبضہ تھا جن کا پاکستان سے کوئی معاہدہ نہیں تھا۔ طالبان نے قافلے کو روک لیا اور مطالبہ کیا کہ پہلے کراچی کی بندرگاہ پر افغان تاجروں کا سالہا سال سے رکا ہوا مال واسباب واگزار کیا جائے، تب وہ قافلے کو آگے جانے دیں گے۔ نصیر اللہ بابر طالبان کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس دوران ملا محمد عمر کو گل آغا کا پُرفریب پیغام موصول ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ ہمارا جنرل نصیر اللہ بابر سے معاہدہ ہو چکا ہے۔ عہد شکنی سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ قافلے کو نہ روکا جائے۔ دراصل گل آغا خود اس قافلے کو لوٹنا چاہتا تھا مگر طالبان اس کی نیت سے لاعلم تھے۔ انہوں نے گل آغا کی بظاہر معقول بات پر مثبت ردِعمل ظاہر کرتے ہوئے قافلے کا راستہ چھوڑ دیا۔

اب قافلہ اطمینان کے ساتھ قندھار کو روانہ ہوا جہاں گل آغا اور اس کے ہمنوا کمانڈر اسے لوٹنے کے لیے تیار تھے۔ یہ سب لٹیرے اور مفاد پرست کمانڈر تھے۔ انہی کی غنڈہ گردی کے باعث قندھار میں حالات نہایت خراب تھے، اگرچہ گل آغا گورنر تھا مگر وہ خود لوٹ مار میں شریک تھا۔ ان کمانڈروں نے عملاً شہر کو کئی حصوں میں بانٹ رکھا تھا اور عوام کو یرغمال بنایا ہوا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ قندھاری کمانڈروں کی بے شرمی کا یہ عالم تھا کہ ان میں سے ایک کمیونسٹ کمانڈر منصور نے ایک شریف دین دار گھرانے کے خوبصورت لڑکے کو اغوا کر کے اس کے ساتھ زبردستی شادی رچائی تھی۔ اس دوران ایک دوسرے کمانڈر نے بھی اس لڑکے کے حسن کی تعریف سن کر اسے اغوا کرنا چاہا۔ اس بات پر دونوں کمانڈروں میں ٹھن گئی۔ دونوں طرف سے گولیاں چلیں اور بہت سے لوگ مارے گئے۔

منصور کا اعلان تھا کہ ہمارے علاقے میں لڑکوں سے شادی جائز ہے۔ اس نے چند نام نہاد دانشوروں کو مفتی کا لقب دے کر ان سے یہ "فتویٰ" بھی لے لیا تھا کہ 16 برس سے کم عمر لڑکے سے شادی کی جا سکتی ہے۔ یہ حالات ملا محمد عمر کے علم میں بھی تھے جس کے باعث وہ قندھاری کمانڈروں سے سخت متنفر تھے۔ اُدھر قندھاری کمانڈر طالبان کا صفایا کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اسپین بولدک کا مفرور کمانڈر اختر جان، بدنام زمانہ کمیونسٹ منصور اچکزئی اور گورنر قندھار گل آغا یہ طے کر چکے تھے کہ وہ مل کر طالبان کے خلاف بھرپور کارروائی کریں گے اور دوبارہ سڑکوں پر زنجیریں لگا کر ٹیکس وصول کریں گے۔

پاکستانی قافلہ نرغے میں: اس منصوبہ بندی کے ساتھ یہ لوگ اسپین بولدک پر چڑھائی کے لیے روانہ ہوئے۔ اس گروہ میں منصور اچکزئی، گل آغا اور اختر جان کے علاوہ استاذ حلیم، امیر لالائی اور سرکاتب بھی شامل تھے۔ ابھی یہ لوگ قندھار سے نکلے ہی تھے کہ انہیں پاکستان کے تجارتی قافلے کی آمد کی خبر ملی جو

اب اسپین بولدک سے قندھار کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ کمانڈروں نے سوچا کہ کیوں نہ طالبان پر حملے سے پہلے اس قافلے پر ہاتھ صاف کیا جائے۔ چنانچہ وہ تختہ پل کے مقام پر گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ یہ مقام قندھار ائیر پورٹ کے قریب اور شہر سے تقریباً 12 میل کے فاصلے پر ہے۔ کمانڈروں کو توقع تھی کہ اس قافلے میں دیگر ساز و سامان کے علاوہ اسلحہ بھی آرہا ہے۔ جوں ہی قافلہ تختہ پل پہنچا، اسے گھیرے میں لے لیا گیا۔ جب یہ اطلاع پاکستان پہنچی تو وہاں کھلبلی مچ گئی۔ اسلام آباد میں ایک اعلیٰ سطحی اجلاس بلا کر قافلے کو رہائی دلانے کے لیے مختلف تجاویز پر غور ہونے لگا مگر کوئی قابلِ عمل صورت سمجھ نہ آسکی۔ آخرکار جنوبی افغانستان کی نئی طاقت ''طالبان'' سے مدد لینے کا فیصلہ کیا گیا۔

طالبان کی لٹیروں کے خلاف کارروائی: طالبان اس سے پہلے ہی قندھار کے سرکش کمانڈروں کے عزائم سے مطلع ہو چکے تھے۔ اب انہیں پاکستان کے تجارتی قافلے کے گھیرے میں لیے جانے سے سخت تشویش ہوئی۔ ملتِ پاکستان نے افغان جہاد کے دوران افغانوں کا جس طرح ساتھ دیا تھا اس کے بدلے میں افغان کمانڈروں کا یہ سلوک شرمناک تھا۔ کوئی بھی شریف انسان اسے پسند نہیں کر سکتا تھا۔ طالبان پاکستان کو اپنا محسن تصور کرتے تھے کیونکہ اس سرزمین میں ان کے اکثر خاندانوں کو پناہ میسر آئی تھی۔ ان میں سے بہت سے پاکستان کے دینی مدارس میں تعلیم حاصل کر چکے تھے اور اس ملک کو اپنی مادرِ علمی سمجھتے تھے۔ ان وجوہ سے انہوں نے فوری طور پر ایک وفد بھیج کر لٹیرے کمانڈروں کو کہا کہ وہ قافلے کو جانے دیں مگر کمانڈر اپنی ضد پر اڑے رہے اور مقابلے پر اُتر آئے۔ ادھر پاکستانی ایجنسیوں نے بھی طالبان سے رابطہ کر کے اس قضیے کے حل کی درخواست کی اور بدلے میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے برادرانہ تعلقات کا یقین دلایا۔

تب 3 نومبر 1994ء کو طالبان نے قندھاری کمانڈروں کے خلاف کارروائی کا آغاز کر دیا۔ ایک زوردار جھڑپ کے بعد کمانڈر منصور اچکزئی، گل آغا اور ان کے حامی بھاگ نکلے۔ طالبان بیابانوں میں دور تک منصور کا تعاقب کرتے رہے، حتیٰ کہ قندھار ائیر پورٹ تک پہنچ گئے اور اسے دس محافظوں سمیت گرفتار کر لیا۔ چونکہ کمانڈر منصور لوٹ مار، ظلم و ستم اور بے حیائی میں مشہور تھا اس لیے اسے کسی رعایت کا مستحق سمجھے بغیر قندھار ائیر پورٹ پر پھانسی دے دی گئی اور لاش عبرت کے لیے سرِعام لٹکا دی گئی۔ اسی پیش قدمی کے دوران طالبان نے قندھار ائیر پورٹ کو کسی مزاحمتی قوت سے خالی پا کر 4 نومبر کو صبح 4 بجے اسے بھی قبضے میں لے لیا۔

فتح قندھار: تختہ پل کے معرکے میں گل آغا اور منصور کے گروہ کو کچلنے اور ائیر پورٹ پر قبضے کے فوراً بعد طالبان نے قندھار شہر کا رُخ کر لیا۔ اس دوران جنوبی افغانستان اور پاکستان کے سرحدی شہروں میں خبر

تعلیم سینکڑوں طلبہ ان سے آملے تھے۔ صبح سویرے طالبان جنوب سے یلغار کرتے ہوئے قندھار کے گورنر ہاؤس تک پہنچ گئے۔ دن چڑھے تک پورا شہر ان کے قدموں میں تھا۔ شہر کے ایک بڑے کمانڈر ملا نقیب نے بھی طالبان کی آمد کا سنتے ہی ان کی حمایت کا اعلان کر دیا اور اس کے جنگجو طالبان کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ قندھار کا گورنر گل آغا اور دوسرے سرکش کمانڈر فرار ہو گئے تھے۔ 24 گھنٹے کے اندر اندر طالبان کسی قابلِ ذکر کشت وخون کے بغیر افغانستان کے اس دوسرے بڑے شہر پر قابض ہو گئے۔

صرف مغرب میں ''باغ پل'' کا علاقہ رہ گیا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں تختہ پل سے فرار ہونے والا کمانڈر سرکاتب مورچہ زن تھا۔ طالبان نے اسے تنبیہ کرنے کے بعد تیسری رات کو کارروائی شروع کی۔ چوطرفہ حملہ ہوا اور دو گھنٹے میں باغ پل بھی فتح ہو گیا۔ اب قندھار سے لے کر اسپین بولدک تک ایک وسیع علاقہ ان کے ہاتھ آ گیا جس کے بعد طالبان نے اپنی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔

قندھار پر قبضہ کرنے اور ظالم کمانڈروں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد جہاں دیگر درجنوں مظلوموں کو انصاف ملا وہاں اس اغوا شدہ بچے کو بھی آزاد کرا لیا گیا جس پر دو کمانڈروں کی جنگ ہوئی تھی۔

طالبان کا سب سے بڑا ہدف شریعت کا نفاذ اور قیامِ امن تھا اس لیے عوام نے ان کا خیر مقدم کیا۔ شریعت کے نفاذ کے لیے طالبان نے شرعی عدالتیں قائم کیں اور تمام معاملات قرآن وسنت کے ماتحت چلانے کا اعلان کیا۔ قیامِ امن کے لیے، انہوں نے سڑکوں سے زنجیریں کاٹ ڈالیں۔ تمام رکاوٹیں ہٹا دیں۔ صرف اسپین بولدک پر ایک چنگی خانہ قائم کیا اور حکومت پاکستان سے کہا کہ آیندہ پاکستان سے آنے والے ہر قافلے کو سرحد عبور کرنے کے لیے طالبان سے اجازت لینا ہو گی۔ طالبان کے ترجمان ملا محمد غوث نے 16/ نومبر 1994ء کو ایک بیان میں کہا کہ پاکستان طالبان کو نظر انداز کر کے کسی بھی قبائلی سردار سے معاہدہ نہ کرے۔

امن وامان کا قیام: طالبان نے سڑکوں کی حفاظت کے لیے گشتی دستے مقرر کیے جس سے لوٹ مار کا خاتمہ ہو گیا۔ آبادی کو مکمل طور پر غیر مسلح کرنے کی مہم شروع کی گئی۔ لوگوں نے قیامِ امن کو یقینی بنانے کے لیے رضا کارانہ طور پر اسلحہ جمع کرایا۔ یہ وہ اسلحہ تھا جو مقامی کمانڈروں اور ان کے ماتحت لوگوں کو بڑے کمانڈروں کی جانب سے جہاد کے لیے امانت کے طور پر ملا تھا مگر اب لوگ اس کے مالک بن کر اسے بدامنی کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ ایسا تمام اسلحہ واپس لینا ضروری تھا۔

فتوحات کا سیلاب: تین ماہ کے اندر اندر طالبان کا سیلِ رواں افغانستان کے 31 صوبوں میں سے 12 پر چھا چکا تھا۔ جنوبی اور مشرقی افغانستان کے تمام اضلاع اب مکمل طور پر ان کے قبضے میں تھے۔ ان تمام علاقوں میں طالبان کے سفید پرچم لہرا رہے تھے جن پر کلمہ طیبہ جگمگا رہا تھا۔ طالبان نے اس وسیع

وعریض رقبے کو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح اعلیٰ اخلاق، ہمدردی ورواداری، نیک شہرت اور شر پسندوں کے دلوں میں بیٹھتی چلی جانے والی خداداد ہیبت کے ذریعے فتح کیا تھا۔ اکثر علاقوں میں جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی۔ طالبان کے قافلے سفید پرچم لیے قرآن وسنت کا نظام نافذ کرنے کا اعلان کرتے ہوئے جہاں بھی پہنچتے لوگ جوق در جوق ان کا استقبال کرتے، جبکہ ظالم کمانڈر فرار ہوجاتے۔ ارزگان، نیمروز، زابل، پکتیکا، لوگر، پکتیا اور غور جیسے بڑے بڑے صوبے آناً فاناً فتح ہوگئے۔ خوست کے حاکم مولانا جلال الدین حقانی نے اپنا علاقہ اور اسلحہ طالبان کی نذر کردیا اور اپنے مجاہدین سمیت طالبان میں شمولیت اختیار کرکے اس تحریک کے سرپرست بن گئے۔

ہلمند میں عبدالغفار اخوندزادہ کی حکومت تھی۔ ایک وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے منشیات کے کھیت 16 برس سے اس کے قبضے میں تھے۔ طالبان نے حسبِ روایت یہاں بھی ابتدائی ایک وفد بھیج کر اخوندزادہ سے اسلحہ جمع کرانے، شریعت نافذ کرنے اور قیامِ امن میں مدد دینے کا مطالبہ کیا۔ عبدالغفار اخوندزادہ نے بظاہر سرِ تسلیم خم کردیا مگر وہ اسلحہ جمع کرانے میں ٹال مٹول کرتا رہا۔ جلد ہی اس کی بدنیتی ظاہر ہوگئی۔ اس کے سپاہیوں نے طالبان پر بے خبری میں حملہ کردیا۔ طالبان بھی جنگ پر مجبور ہوگئے۔ اخوندزادہ کے کئی کمانڈروں نے طالبان کا ساتھ دیا۔ اس طرح دسمبر 1994ء میں منشیات کی پیداوار کا یہ عالمی مرکز بھی طالبان کے قبضے میں آگیا۔

برھان الدین ربانی کی طرف سے طالبان کی حمایت: کابل حکومت نے بھی قیامِ امن کے لیے طالبان کی کوششوں اور فتوحات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ 1994ء کے آخری ایام تھے، طالبان قندھار پر قبضے کے بعد گردونواح کی فتوحات میں مصروف تھے کہ اس دوران صدر برہان الدین ربانی کی جانب سے ایک وفد نے قندھار آکر ملا محمد عمر سے ملاقات کی تھی اور صدر ربانی کا یہ پیغام پیش کیا تھا کہ ہم بھی ملا محمد عمر کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور طالبان تحریک کے ہمنوا ہیں۔ طالبان قیادت کو کابل حکومت کی حمایت سے غیر معمولی اطمینان ہوا اور ان کے کارکنوں کے حوصلے مزید بڑھ گئے۔

غزنی کے دروازے پر: ماہِ رمضان (1415ھ) کی عبادت گزاری کے دوران بھی طالبان کی پیش قدمی ایک سیلابی دھارے کی طرح جاری رہی۔ نیا شمسی سال شروع ہوگیا۔ جنوری 1995ء کی سرد ترین راتوں میں وہ غزنی کے دروازے پر تھے۔ یہاں کا گورنر قاری بابا طالبان سے جنگ پر تلا ہوا تھا کیونکہ مخالفین نے طالبان کو امریکی اور آئی ایس آئی کے ایجنٹ مشہور کردیا تھا، مگر غزنی کے نائب گورنر حاجی خیال محمد نے خفیہ طور پر طالبان کو خوش آمدید کہا۔ طالبان کے نمائندے اس سے گفت وشنید کررہے

تھے کہ اس دوران حزبِ اسلامی کے سربراہ گلبدین حکمت یار نے جو دیگر کئی کمانڈروں کی طرح طالبان کو تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، یہ الزام تراشی شروع کر دی کہ طالبان بیرونی طاقتوں کے ایجنٹ ہیں۔ حکمت یار نے یہاں تک دعویٰ کیا کہ ان کے پاس ایسے ثبوت موجود ہیں جن کے مطابق طالبان تحریک اسلام آباد میں مقیم برطانوی سفیر کے اشارے پر وجود میں آئی ہے۔

غزنی۔ طالبان اور حزبِ اسلامی آمنے سامنے: اختلافات کے باوجود طالبان کے دلوں میں حکمت یار کے لیے احترام پایا جاتا تھا اس لیے کہ وہ روس کے خلاف جہاد افغانستان کے سب سے نامور اور بڑے قائد تھے مگر اس بیان بازی سے طالبان اور حزبِ اسلامی کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی۔ مزید تناؤ اس وقت پیدا ہوا جب حزب اسلامی کے دستے غزنی کی سرحدی پہاڑیوں پر نمودار ہوئے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ طالبان سے پہلے وہ غزنی پر تسلط حاصل کر لیں مگر غزنی کے عوام طالبان کی طرف مائل تھے۔ کئی مقامی کمانڈر بھی حزب اسلامی کا تسلط پسند نہیں کرتے تھے۔ جب حزب اسلامی کے دستوں نے غزنی پر قبضے کی کوشش کی تو طالبان اپنے ہم خیال مقامی کمانڈروں کے تعاون سے شہر میں داخل ہوگئے۔ شہر کا کنٹرول سنبھالتے ہوئے انہوں نے حزب اسلامی کا بھرپور مقابلہ کیا۔ اس دوران پکتیکا سے عظیم کمانڈر نصر اللہ منصور (جو کچھ مدت پہلے شہید ہو گئے تھے) کے مجاہدین بھی طالبان کی مدد کے لیے پہنچ گئے۔ اس جھڑپ کے نتیجے میں حزب اسلامی کے دستے پسپا ہو کر چہار آسیاب کی طرف سمٹ گئے اور تقریباً پورا مشرقی افغانستان طالبان کے قبضے میں آ گیا۔ غزنی پر طالبان کے قبضے کے فوراً بعد کابل حکومت نے ایک اہم وفد طالبان کے پاس بھیجا جس میں وزیر مملکت فائز صدیق چکسری، راحت اللہ واحد یار اور مولوی جلیل اللہ شامل تھے۔ انہوں نے پیغام دیا کہ ہم کابل حکومت کی جانب سے ملا محمد عمر کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔

کیا طالبان کسی کے آلہ کار تھے؟ ان دنوں طالبان کے بارے میں امریکی اور پاکستانی ایجنٹ ہونے کی افواہیں متواتر پھیلائی جا رہی تھیں۔ اس کی ایک دلیل یہ پیش کی جا رہی تھی کہ امریکا نے اب تک طالبان کی فتوحات پر کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس نئی طاقت کا پشت پناہ ہے۔ حالانکہ امریکا کی خاموشی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ طالبان کی ''بنیاد پرستی'' سے آگاہ ہونے کے باوجود ان کو دوسری بنیاد پرست جماعت ''حزب اسلامی'' سے ٹکراتا دیکھ کر مسرور اور مطمئن تھا اور اسے یقین تھا کہ افغانستان میں اب جلد خانہ جنگی کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔ پھر امریکا کی یہ خاموشی خود طالبان کے خلاف پروپیگنڈے کو تقویت دے رہی تھی اور امریکا اس ماحول کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، اسے واقعی افغانستان میں ایک پاکستان دوست حکومت کی ضرورت

تھی۔ افغان جہاد میں 14 برس کی پُر مشقت اور گراں قیمت حمایت کے بدلے پاکستان کی یہ خواہش برمحل تھی۔ حکومت پاکستان اب مسعود اور ربانی سے مکمل طور پر مایوس تھی کیونکہ مسعود کی جانب سے پاکستان کو افغانستان میں مداخلت پر سنگین نتائج کی دھمکیاں مل رہی تھیں۔ حکومت پاکستان نے متبادل افغان حکومت بنانے کے لیے ہی حزب اسلامی اور دوستم ملیشیا کے اتحاد ''رابطہ کونسل'' کی در پردہ حمایت شروع کر رکھی تھی۔ طالبان کے ظہور کے وقت پاکستان کی رابطہ کونسل سے دوستی برقرار تھی۔ تاہم پاکستان نے اپنے تجارتی قافلے کی آزادی میں طالبان کی بہترین کارکردگی دیکھنے کے بعد یہ سمجھ لیا تھا کہ وقت آنے پر طالبان بھی اس کے اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہیں۔

اس وقت حکومت پاکستان کو قطعاً توقع نہ تھی کہ طالبان اتنی جلد آدھے ملک پر قابض ہو جائیں گے مگر جب طالبان نے آناً فاناً مشرقی صوبوں کو فتح کر لیا تو حکومت پاکستان انہیں ''رابطہ کونسل'' کے متبادل درجہ دینے پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے لگی۔ حکومت پاکستان کو طالبان کے نظریات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو بہرحال ایک پُر امن اور دوست افغانستان چاہیے تھا جو اس کے لیے وسط ایشیائی ریاستوں سے مواصلات کا دروازہ بن سکے۔ طالبان نے دکھا دیا تھا کہ وہ کسی بھی گروہ کی بہ نسبت افغانستان کو بہتر اور یقینی امن کی ضمانت دے سکتے ہیں۔ اس پس منظر میں طالبان کے ساتھ پاکستان کے مثبت رویے کو سرپرستی کا نام دینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ بعد میں پاکستان اور طالبان حکومت کے درمیان بہترین مراسم ضرور پیدا ہوئے مگر ایسا موقع کبھی نہیں آیا کہ طالبان نے پاکستانی ایجنٹوں کے طور پر کام کیا ہو۔ وہ اپنے فیصلوں میں آزاد تھے۔ اپنی پالیسیوں میں وہ اوّلاً پاکستان سمیت کسی مسلم یا غیر مسلم طاقت کی خوشنودی ملحوظ نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کے نزدیک آئین سازی و دستور سازی سے لے کر پالیسیوں اور فیصلوں تک ہر معاملے میں شریعت ہی حرفِ اول و آخر تھی۔

اگر طالبان کسی بیرونی حکومت کے ایجنٹ ہوتے تو ان کے ہاں دولت کی ریل پیل ہوتی۔ ان کے حکام اور افسران کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھنے کے قابل ہوتے۔ کیونکہ کوئی کسی بیرونی طاقت کا آلہ کار بنتا ہے تو اس کی بھاری قیمت ضرور وصول کرتا ہے۔ مگر طالبان کے ہاں سادگی اور غربت کا یہ عالم تھا کہ عام طور پر ان کے سپاہیوں کو دورانِ جنگ پیٹ بھر کر کھانا بھی بمشکل نصیب ہوتا تھا۔ طالبان کے امیر ملا محمد عمر سمیت تمام وزرا اور گورنر عام لوگوں کی طرح رہتے تھے۔ وہ روکھی سوکھی کھاتے، بوسیدہ لباس پہنتے اور نہایت درویشانہ زندگی گزارتے تھے۔ مجمع میں یہ پہچان مشکل ہو جاتی تھی کہ ان میں امیر اور حاکم کون ہے اور ماتحت کون؟ ان کے گورنر مہمانوں کے لیے اپنی گاڑی چھوڑ کر خود پیدل چل پڑتے۔

میڈیا سے دوری: طالبان کے خلاف غلط فہمیاں پھیلنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان درویشوں کی میڈیا تک کوئی رسائی نہیں تھی بلکہ ان کے اکثر عہدیدار میڈیا سمیت شہرت اور خودنمائی کے تمام ذرائع سے دور بھاگتے تھے۔ میڈیا سے ان کے فاصلوں کے باعث شروع ہی سے ان کے مخالفین کو ان کے خلاف ہر قسم کی باتیں پھیلانے کا کھلا موقع میسر رہا۔ تحریک کے ابتدائی دو سالوں میں میڈیا سے طالبان کے گریز کا یہ عالم تھا کہ وہ اخبارات کو اپنی فتوحات اور اہم بیانات کی خبریں تک نہیں دیتے تھے۔ معروف اسکالر مولانا زاہد الراشدی اس کی ایک مثال دیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ وہ 8 جون 1996ء کو کوئٹہ پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ قندھار میں طالبان قیادت کے ساتھ سرکردہ جہادی رہنماؤں کی ایک اہم ملاقات ہوئی ہے۔ چونکہ یہ خبر اخبارات میں نہیں چھپی تھی اس لیے مولانا نے خبر تحریر کر کے کوئٹہ میں تعینات طالبان کے ترجمان مولوی معصوم افغانی کے حوالے کی کہ وہ اسے اخبارات کو فیکس کر دیں، مگر اس کے باوجود خبر فیکس نہ ہو سکی کیونکہ طالبان کے دفتر کے جس کمرے میں فیکس مشین تھی اس کی چابی گم ہو گئی تھی۔ مولانا زاہد الراشدی تحریر کرتے ہیں:

> ”اس سے نہ صرف مجھے طالبان کی اصل کمزوری کا اندازہ ہو گیا بلکہ ان کے خلاف امریکا اور پاکستان کی پشت پناہی کے الزام کی حقیقت بھی سامنے آ گئی کیوں کہ اگر انہیں امریکا یا پاکستان کی پشت پناہی حاصل ہوتی تو اتنی اہم خبر کے حصول کے لیے درجنوں بیرونی صحافی سرگرم عمل ہوتے یا کم از کم کوئٹہ میں سرکاری محکمہ اطلاعات کا کوئی کارندہ اس خبر کی اشاعت کے لیے تگ و دو کر رہا ہوتا۔“

حکمت یار اور احمد شاہ کی ضد: 1995ء کے آغاز میں صورتِ حال یہ تھی کہ مشرقی افغانستان میں طالبان نے اپنے زیر قبضہ صوبوں کو اسلحے سے پاک کر کے وہاں مکمل امن و امان قائم کر دیا تھا۔ شرعی سزاؤں کے اجراء سے جرائم کا خاتمہ ہو گیا تھا اور لوگ برسوں بعد سکھ کا سانس لے کر معمول کی زندگی گزارنے لگے تھے۔ اس کے برعکس کابل اور اس کے گرد و نواح میں صدر ربانی اور وزیر اعظم حکمت یار کے مابین کشمکش بدستور جاری تھی اور وہاں امن و امان کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ اقوامِ متحدہ کا نمائندہ محمود مستری ایک سال سے وہاں قیام امن کی نمائشی کوششوں میں مصروف تھا مگر اب اس کے پاس کوئی نیا ”امن فارمولا“ باقی نہیں بچا تھا۔ جنوری 1995ء میں اس نے جلال آباد میں حکمت یار سے ملاقات کر کے متحارب رہنماؤں کو کسی نئے حل پر متفق کرنے کی ایک اور کوشش شروع کی۔

حکمت یار نے تجویز پیش کی کہ تمام متحارب دھڑے کابل شہر سے پانچ کلومیٹر پیچھے ہٹ جائیں، صدر ربانی مستعفی ہو جائیں، غیر جانبدار افراد کی عارضی حکومت معاملات سنبھالے اور چھ ماہ میں انتخابات

کرا کے اقتدار منتخب نمائندوں کے حوالے کر دے۔ تمام دھڑے بھاری اسلحہ اس نئی حکومت کے پاس جمع کرا دیں۔ مگر اس فارمولے پر بھی حسبِ سابق اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ خصوصاً اسلحہ جمع کرانے کی شق کو احمد شاہ مسعود نے سختی سے مسترد کر دیا۔

حزبِ اسلامی نے کابل کا محاصرہ کر لیا: احمد شاہ مسعود سے مکمل طور پر مایوس ہو جانے اور طالبان کو روز بروز پیش قدمی کرتا دیکھنے کے بعد گلبدین حکمت یار کو محسوس ہوا کہ اگر طالبان مزید آگے بڑھے تو حزب اسلامی کو کابل سے توجہ ہٹا کر پوری طرح طالبان کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا اور اس طرح کابل پر قبضے کی ان کی کئی سالہ مہم جوئی ناکامی سے دوچار ہو سکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے جلد از جلد کابل پر قبضے کی کوشش شروع کر دی۔

ان دنوں صورتِ حال یہ تھی کہ ربانی اور احمد شاہ مسعود نے مطلق العنان بننے کی کوششوں کے باعث اپنے تمام اتحادیوں سے تعلقات بگاڑ لیے تھے۔ اب ہزارہ جات اور دوستم ملیشیا حزب اسلامی کے اتحادی تھے۔ پاکستان بھی ربانی حکومت سے مایوس ہو کر ایک بار پھر حکمت یار کو آزمانا چاہ رہا تھا۔ ان مواقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے حزبِ اسلامی نے اپنے اتحادیوں کے ساتھ ایک بار پھر کابل پر قبضے کے لیے ایک بڑی کارروائی کا آغاز کر دیا جس میں ان گنت راکٹ داغے گئے، سینکڑوں شہری لقمہ اجل بنے اور شہر کی درجنوں عمارتیں زمین بوس ہو گئیں۔ کابل کی گلیوں میں ایک بار پھر خون بہنے لگا۔ اتحادیوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ شہر کی سخت ترین ناکہ بندی کر کے خوراک و رسد کے راستے مسدود کر دیے جس کے باعث کابل میں قحط جیسی صورتِ حال پیدا ہونے لگی۔ کابل کے شہری اب دارالحکومت کی بجائے ان پسماندہ شہروں اور دیہاتوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے جہاں طالبان نے مکمل امن و امان بحال کر دیا تھا۔

طالبان کا وردک پر قبضہ: طالبان کی قیادت بھی اس صورتِ حال کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ جلد ہی انہوں نے یلغار کی اور برف باری کے موسم میں 2 فروری 1995ء کو صوبہ وردک پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح وہ کابل سے صرف 35 میل دور رہ گئے۔ اس صورتِ حال نے حزب اسلامی کے کمانڈروں کو ششدر کر دیا جو کہ کابل پر قبضے کی تگ و دو میں مصروف تھے۔ طالبان کو وردک پر قابض ہوتے دیکھ کر انہیں محسوس ہوا کہ اب وہ ایک طرف سے احمد شاہ مسعود اور دوسری طرف سے طالبان کے حملوں کی زد میں آ کر پس جائیں گے۔ چنانچہ وہ نفسیاتی طور پر پہلے ہی مرعوب ہو گئے۔

میدان شہر کی فتح: طالبان نے حزب اسلامی کے خلاف مہم جوئی جاری رکھی۔ اس سے قبل وہ کئی بار وفود بھیج کر صدر برہان الدین ربانی اور وزیر اعظم حکمت یار سے نفاذ شریعت اور قیام امن کے مطالبات کر چکے

تھے۔ ان میں کئی بار مذاکرات اور بعض معاہدے بھی ہوتے تھے مگر مذاکرات کا کوئی ثمر برآمد ہوا نہ معاہدوں پر عمل، بلکہ کابل اور گردونواح میں بدامنی اور لاقانونیت اسی طرح برقرار تھی۔ صدر اور وزیر اعظم کے معرکے حسب سابق جاری تھے۔ یہ دیکھ کر طالبان کو یقین ہوگیا کہ مزید مذاکرات کرنا خلق خدا کا ناحق خون بہانے والوں کو ڈھیل دینے کے مترادف ہوگا چنانچہ وردک کے فوراً بعد انہوں نے حزب اسلامی کے مضبوط گڑھ میدان شہر پر حملہ کر دیا جسے کابل کا دروازہ سمجھا جاتا ہے۔ ایک خونریز معرکے کے بعد 10 رفروری 1995ء کو طالبان نے میدان شہر بھی فتح کر لیا۔ لڑائی میں دوسو افراد کام آگئے۔ اس واقعے سے دنیا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کسی کو توقع نہ تھی کہ طالبان حزب اسلامی جیسی طاقت کو یوں دھکیلتے چلے جائیں گے۔

احمد شاہ مسعود سے میدان شہر میں مذاکرات: صوبہ وردک کے صدر مقام میدان شہر پر قبضے سے طالبان کو کابل کے جنوب مغرب میں ایک مستحکم عسکری پوزیشن حاصل ہوگئی تھی اور اس صورتِ حال سے کابل حکومت غیر معمولی خطرہ محسوس کر رہی تھی۔ احمد شاہ مسعود نے اس موقع پر طالبان سے تعلقات بہتر بنانے کے لیے از خود پیش رفت کی اور اپنے نمایندوں کے ذریعے طالبان کمانڈروں نے دوبدو ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ اس وقت چوٹی کے طالبان افسران ملا بورجان اور ملا عبدالرزاق کے علاوہ ملا محمد عمر کے نائب ملا محمد ربانی بھی اس محاذ پر موجود تھے۔ انہوں نے احمد شاہ مسعود کی جانب سے مذاکرات کی پیش کش قبول کر لی۔ طالبان کی ان مہمات کی مرکزی کمان قندھار میں ملا عمر خود کر رہے تھے۔ طالبان کمانڈروں کا ان سے مسلسل رابطہ رہتا تھا۔ وہ مرکز کو تازہ بتازہ صورتِ حال سے مطلع رکھ رہے تھے۔ احمد شاہ مسعود سے ملاقات سے قبل ملا محمد ربانی کو ملا محمد عمر کا پیغام ملا کہ احمد شاہ مسعود ایک نامور مجاہد کمانڈر رہیں، ان کی حیثیت کو ملحوظ رکھا جائے، انہیں خاص امتیاز دیا جائے اور مذاکرات میں ایسا رویہ اختیار نہ کیا جائے کہ وہ ناراض ہوں۔

سب سے پہلے میرا پستول: آخر کار شیرِ پنج شیر احمد شاہ مسعود کی اپنے چند خاص رفقاء کے ساتھ میدان شہر میں آمد ہوئی۔ طالبان کے لیے یہ نہایت خوشی کا موقع تھا۔ ملا محمد ربانی اور ملا عبدالرزاق نے معزز مہمانوں کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور نہایت پرسکون ماحول میں بات چیت کا آغاز ہوا۔ طالبان نے اپنا موقف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہم آپ کے قدردان ہیں، آپ پر جنگ مسلط کرنا نہیں چاہتے، بس آپ ہمارے مطالبات تسلیم کر لیں، کابل میں احکام شریعت نافذ کر دیں، کمیونسٹوں کو اہم عہدوں سے برطرف کر دیں، خواتین کو پردے کا پابند کر دیں اور مسلح گروہوں سے ہتھیار واپس لے لیں۔ احمد شاہ مسعود نے خوش گوار موڈ میں طالبان کمانڈروں کی باتیں سنیں اور جذباتی انداز میں کہا: ”طالبان تحریک میرے دل کی آواز ہے۔ لوگوں کو غیر مسلح کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ آپ اسلحہ جمع کرنا چاہتے ہیں

ناں!......تو یہ لیجیے......سب سے پہلے میں اپنا پستول آپ کے پاس جمع کرا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر احمد شاہ مسعود نے اپنا پستول طالبان کمانڈروں کی طرف بڑھا دیا۔ یہ احمد شاہ مسعود اور طالبان کمانڈروں کی پہلی ملاقات تھی جس کے باعث طالبان مکمل طور پر مطمئن ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کابل کی طرف پیش قدمی کا ارادہ ترک کر دیا۔

لوگر پر بلا مزاحمت قبضہ: ان دنوں عسکری تبصرہ نگار میدان شہر پر قابض لشکر طالبان کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ یہ تو سب جانتے تھے کہ وہ کسی بھی وقت کابل کی طرف پیش قدمی کر سکتے تھے۔ تاہم عام خیال یہ تھا کہ وہ لوگر کی طرف بڑھنے کی بجائے لغمان کے راستے کابل پر یلغار کریں گے۔ یہ راستہ مختصر بھی تھا اور اس میں مزاحمت کا خطرہ بھی کم تھا۔ مگر حیران کن طور پر طالبان کابل کی بجائے لوگر کی طرف بڑھنے لگے جو حزبِ اسلامی کا مضبوط مرکز تھا اور جہاں شدید مزاحمت کا خطرہ بھی تھا۔ جب طالبان "لوگر" کے قریب پہنچے تو غیر متوقع طور پر حزبِ اسلامی کی قیادت نے مزاحمت نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی اب رائے عامہ حزبِ اسلامی کے خلاف ہوتی جا رہی تھی۔ لوگ یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ جب دیگر تنظیموں کے کمانڈر طالبان سے صلح کر رہے ہیں تو اسلام کے نام پر سرگرم "حزب اسلامی" طالبان سے کیوں اُلجھ رہی ہے جو کہ امن اور شریعت کا پیغام لے کر آرہے ہیں۔ رائے عامہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے حزب اسلامی کے تمام کمانڈر طالبان کی آمد سے پہلے ہی اپنی تمام عسکری طاقت کے ساتھ لوگر سے نکل کر چہار آسیاب چلے گئے۔ یہ فروری 1995ء کے پہلے عشرے کا واقعہ ہے۔

حزبِ اسلامی اور طالبان کی کشمکش کے عوامل: حزب اسلامی اور طالبان کی کشمکش کے سلسلے میں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بنیادی طور پر یہ دونوں اسلام پسند طبقات تھے جو گردشِ حالات سے باہم مقابل آ گئے تھے۔ مشرقی افغانستان میں طالبان کے مدمقابل اور ہم پلہ واحد قوت حزبِ اسلامی ہی تھی۔ جب طالبان کا ظہور ہوا تب لوگر، وردک، میدان شہر، چہار آسیاب، جلال آباد اور سروبی حزب اسلامی کے مضبوط گڑھ تھے اور یوں عملاً کابل تک پہنچنے کے تمام راستے حزب اسلامی کے پاس تھے۔ الغرض اس وقت افغانستان میں حزب اسلامی ہی طالبان کی سب سے بڑی حامی یا سب سے مضبوط حریف بن سکتی تھی۔ بدقسمتی سے حزب اسلامی نظریاتی طور پر ایک اسلامی جماعت ہونے کے باوجود طالبان کے خلاف کیے جانے والے پروپیگنڈے سے نہ صرف متاثر ہوئی بلکہ اس کا حصہ بن گئی۔ اس کے عہدیدار طالبان کے خلاف بے سروپا باتیں پھیلانے میں شریک ہو گئے۔ طالبان کی محیر العقول فتوحات کے پس پردہ کبھی امریکا کا ہاتھ بتایا جا رہا تھا، کبھی برطانیہ اور کبھی آئی ایس آئی کا۔ دراصل برسوں

سے میدان جہاد میں قیادت کرنے والے حزب اسلامی کے کمانڈروں کے لیے یہ بات قبول کر لینا بہت مشکل تھا کہ گمنام نوجوانوں کی ایک جماعت آگے بڑھ کر ان سے حالات کی باگ ڈور چھین لے۔

اس ذہنی خلیج میں عصری اور دینی تعلیم کی الگ الگ حلقہ بندی کا بھی خاصا دخل تھا۔ طالبان کا تعلق اس دینی طبقے سے تھا جن کی قیادت دینی مدارس کے راسخ العلم علماء اور مشائخ کرتے تھے۔ ان کے بہت سے نامور عہدے دار پاکستان کے دینی مدارس کی پیداوار اور علمائے دیوبند کے تلامذہ تھے۔ حزب اسلامی کے قائدین اور عہدے داروں میں اکثریت عصری تعلیمی اداروں کے اسلام پسند فضلاء کی تھی۔ دینی مدارس کے فضلاء اور یونیورسٹیوں کے اسلام پسندوں میں فاصلے کی یہ فضا دیگر اسلامی ممالک میں بھی ہے۔ پاکستان کی سیاست میں بھی یہ اختلاف جمعیت علمائے اسلام اور جماعت اسلامی کی شکل میں موجود ہے۔ یہ دونوں جماعتیں افغانستان کی اس کشاکشی میں واضح فریق کا کردار ادا کر رہی تھیں۔ جمعیت علمائے اسلام اور دینی مدارس کی ہمدردیاں مکمل طور پر طالبان کے ساتھ وابستہ ہوتی جارہی تھیں جبکہ جماعت اسلامی کا میڈیا طالبان کی مخالفت میں سرگرم تھا۔

اس صورتِ حال نے افغانستان میں طالبان اور حزب اسلامی کے درمیان مزید دوریاں پیدا کیں۔ یہی وجہ تھی کہ جنوبی اور مشرقی افغانستان میں وہ تمام صوبے جو علماء کے زیر قیادت تنظیموں کے پاس تھے، فوراً طالبان کی حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوئے، مولانا نصر اللہ منصور شہید اور مولانا محمد نبی محمدی کے مجاہدین جوق در جوق ان کے ہمراہ ہوگئے۔ مولانا جلال الدین حقانی اور ان کے بھائی نے خوست طالبان کے حوالے کر دیا۔ مولانا یونس خالص کے افراد بھی قدرے تذبذب کے بعد جلد ہی طالبان سے آن ملے۔ پکتیا اور پکتیکا میں لوگوں نے سڑکوں پر آکر طالبان کا استقبال کیا مگر جب طالبان حزب اسلامی کے زیر قبضہ صوبوں تک پہنچے تو وہاں کی فضا اس کے خلاف تھی۔

چونکہ طالبان کے سامنے مخالفت کا پہلا پتھر حزب اسلامی کی شکل میں سامنے آیا تھا اس لیے قدرتی طور پر انہوں نے گلبدین حکمت یار کو سب سے بڑے مخالف کی حیثیت دی۔ جبکہ احمد شاہ مسعود کے بارے میں وہ دیر تک خوش فہمی میں مبتلا رہ کر اسے عظیم قائد کا درجہ دیتے رہے۔ یہی تاثر پاکستان میں طالبان کے حامیوں کا تھا کہ حزب اسلامی کی مخالفت کے ساتھ ساتھ احمد شاہ مسعود سے ان کا حسن ظن بہت قوی تھا۔ مگر آیندہ حالات نے ثابت کیا کہ نہ تو حزب اسلامی طالبان کے حق میں اتنی مضر تھی نہ احمد شاہ مسعود اور ربانی طالبان کے اتنے ہمدرد نکلے بلکہ معاملہ اندازے کے برعکس رہا۔

چہار آسیاب پر حملے کی تیاری: لوگر کی فتح کے فوراً بعد طالبان نے ''چہار آسیاب'' پر حملے کی تیاری

شروع کردی۔ ''چہار آسیاب'' کا معنیٰ ہے ''چار پن چکیاں'' یہ مقام نہ صرف حزب اسلامی کا سب سے بڑا عسکری گڑھ تھا بلکہ رابطہ کونسل میں شامل تمام جماعتوں کے لیے ایک مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ ''حزب اسلامی'' جو اپنی تمام قوت یہاں جمع کر چکی ہے، اب طالبان سے بھرپور ٹکر لے گی اور خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ عسکری ماہرین کا اندازہ تھا کہ طالبان کو یہاں کئی مہینوں کی مہم جوئی کے بعد ہی کامیابی نصیب ہو سکتی ہے۔

اس دوران حزب اسلامی کے رہنما گلبدین حکمت یار حالات کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ غزنی سے لوگر تک طالبان کی سیلابی فتوحات اور عوام کی طرف سے طالبان کو ملنے والی بھرپور پذیرائی ان سے مخفی نہ تھی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ افغان قوم کے دلوں میں علمائے دین کا کتنا احترام ہے، لہٰذا جس تحریک کو علماء کی سرپرستی حاصل ہو چکی ہو، اس کا مقابلہ عقل و دانش کے خلاف تھا۔ مگر اس کے باوجود چونکہ حکمت یار طالبان کے ''اسلامی نظام'' یا ''اسلامی نظریے'' سے ذہنی طور پر پوری طرح ہم آہنگ نہیں تھے اس لیے وہ اب بھی طالبان کی بالادستی قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے بلکہ حسب سابق انہیں ایک مخالف گروہ کی حیثیت دیتے تھے۔

بہر حال زمینی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے اس موقع پر انہوں نے ایک اہم فیصلہ کیا جو ان کے تدبر اور عسکری مہارت کا ثبوت تھا۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ ''چہار آسیاب'' کو خالی کر کے اپنی پوری طاقت ''سروبی'' میں جمع کر لیں اور طالبان کے لیے کابل کا جنوب مشرقی راستہ بالکل کھلا چھوڑ دیں۔ اس طرح طالبان حزب اسلامی سے ٹکرائے بغیر سیدھا کابل پر قابض احمد شاہ مسعود اور ربانی کی افواج کے مقابل آجائیں گے۔ اس کے بعد اگر طالبان احمد شاہ مسعود اور ربانی کو کابل سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے تو حزب اسلامی کی دلی مراد بر آئے گی اور اگر احمد شاہ مسعود طالبان کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا تو حزب اسلامی کو طالبان کے خون میں ہاتھ رنگنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

طالبان کا چہار آسیاب پر قبضہ: ان امکانات پر غور کرتے ہوئے آخر کار حزبِ اسلامی نے اپنی تمام عسکری طاقت، افراد، گولہ بارود، ہلکے و بھاری ہتھیار اور خوراک کے ذخائر چہار آسیاب سے سروبی منتقل کرنا شروع کر دیے۔ لوگر کی فتح کے دوسرے دن 13 رفروری 1995ء کو طالبان کا لشکر سفید علم لہراتا، چہار آسیاب کے قریب پہنچا تو وہاں سے حزبِ اسلامی کے انخلاء کا عمل آخری مرحلے میں تھا۔ طالبان کی آمد کا غلغلہ سن کر حزب کے کارکنان نے باقی ماندہ ساز و سامان وہیں چھوڑ دیا اور تیزی سے فرار ہو گئے۔

طالبان چہار آسیاب میں واقع گلبدین حکمت یار کے دفتر میں داخل ہوئے تو انہیں نامور جہادی رہنما کے ذاتی کپڑے اور اہم فائلیں بھی ملیں۔ شاید بھولے میں یا عجلت کی وجہ سے یہ اشیاء وہیں رہ گئی تھیں۔

بہر کیف حزب اسلامی اپنے اکثر عسکری ذخائر اور اثاثے بحفاظت لے جانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ البتہ بھاری توپیں جنہیں پہاڑوں پر چڑھانا بے حد مشکل تھا اور کچھ ٹینک جو سفر کے قابل نہ تھے، پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے۔

مآخذ و مراجع

- ......طالبان جند اللہ۔ فہمی ہویدی
- ......ہفت روزہ ضرب مؤمن، جلد 1، 2، 3
- ......ہفت روزہ تکبیر: جلد 1994, 1995ء
- ......ماہنامہ امارت اسلامی افغانستان جلد 1422ء
- ......قومی اخبارات۔ امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور ہفت روزہ جرائد۔ فائل 1994ء، 1995ء

اکتیسواں باب

ملا محمد عمر، امیر المومنین

چہار آسیاب پر قبضے کے بعد کابل پر طالبان کی گرفت بہت مضبوط ہوگئی۔ ادھر احمد شاہ مسعود اور برہان الدین ربانی طالبان کی آمد اور حزب اسلامی کی پسپائی کو نیک شگون قرار دے رہے تھے اور اپنے بیانات میں مسلسل طالبان کی تعریف کر رہے تھے جنہوں نے ان کے سب سے بڑے دشمن گلبدین حکمت یار کو آناً فاناً کنارے پر کر دیا تھا۔

طالبان نے چہار آسیاب فتح کرنے کے بعد کابل جانے والے وہ تمام راستے کھول دیے جن کی ناکہ بندی کر کے حزبِ اسلامی نے کابل کو محاصرے میں لیا ہوا تھا۔ اس محاصرے کی وجہ سے دارالحکومت میں قحط کی سی صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی۔ مگر اب جب طالبان نے شاہراہ کو عوام اور تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کے لیے کھولا تو کابل میں دوبارہ زندگی معمول پر آگئی اور اشیائے صرف کی قیمتوں میں غیر معمولی کمی ہوگئی۔

ان اقدامات کی وجہ سے طالبان کے وقار میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ کابل میں ان کے بارے میں جو بے سروپا شکوک وشبہات گردش کر رہے تھے، وہ از خود ختم ہوگئے۔ رائے عامہ کو مدنظر رکھتے ہوئے احمد شاہ مسعود اور برہان الدین ربانی بھی طالبان کی تعریف وتوصیف میں مسلسل رطب اللسان رہے۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ طالبان ملائکۃ اللہ (فرشتوں کی جماعت) اور جنود اللہ (اللہ کا لشکر) ہیں۔

طالبان نے کابل پر حملہ کیوں نہ کیا؟ مبصرین کی آرا کے بالکل برعکس چہار آسیاب پر قبضے کے بعد بھی طالبان نے کابل پر حملے سے گریز کیا۔ یہ ان کی کمزوری نہیں تھی بلکہ انہیں شرعی یا اخلاقی لحاظ سے کابل پر حملے کا کوئی جواز سمجھ نہیں آرہا تھا۔ انہیں احمد شاہ مسعود اور برہان الدین ربانی سے شکایات ضرور تھیں مگر اس کے باوجود وہ ان پر اعتماد کر رہے تھے جس کی بڑی وجہ ان دونوں رہنماؤں کا طالبان سے حد درجے خوشگوار رویہ تھا جس نے طالبان کو خوش فہمیوں میں مبتلا کر رکھا تھا۔ انہوں نے قندھار اور غزنی

کی فتح کے بعد اپنے وفود بھیج کر طالبان کی حمایت کا اعلان کیا تھا۔ میدان شہر میں طالبان کے فاتحانہ داخلے کے موقع پر احمد شاہ مسعود نے خود اپنے کمانڈروں کے ساتھ وہاں آ کر طالبان کی حوصلہ افزائی کی تھی اور اپنا پستول طالبان کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ رویہ طالبان کو مطمئن کرنے کے لیے کافی تھا۔

اور اب جبکہ طالبان چہار آسیاب کو فتح کر کے کابل کی دہلیز پر کھڑے تھے، ریڈیو کابل سے روزانہ طالبان کی حمایت کا اعلان کیا جا رہا تھا اور ان کی تعریف و توصیف میں پروگرام پیش کیے جا رہے تھے۔ صدر ربانی نے طالبان کی حمایت پر مبنی بیانات دینے کے علاوہ طالبان کے پاس ایک وفد بھی بھیجا جس نے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی اور کہا:

''اللہ کی مقدس کتاب گواہ ہے کہ ہم طالبان کے ساتھ ہیں۔''

یہ وہ برتاؤ تھا جس کی وجہ سے طالبان نے کابل حکومت کے بارے میں کسی خدشے کو دل میں جگہ نہ دی۔ انہیں یقین تھا کہ کابل حکومت اسلامی نظام کے نفاذ میں ان کا بھرپور ساتھ دے گی۔ چنانچہ طالبان نے کابل پر قبضے کا خیال دل سے نکال دیا۔ ان کے اطمینان کا یہ عالم تھا کہ کابل کے سامنے انہوں نے نہ تو باقاعدہ لشکر ترتیب دیا نہ ہی وہاں بھاری اسلحے کی کھیپ پہنچائی بلکہ نگرانی کے معمولی عسکری انتظامات کو کافی سمجھا۔ ان دنوں اقوام متحدہ کے خصوصی نمایندے محمود مستری کی افغانستان میں قیام امن کے لیے کوششیں معنی خیز انداز میں جاری تھیں۔ طالبان نے اسے بھی قیام امن کے لیے ایک فارمولا پیش کیا تھا جس میں دو باتیں بنیادی تھیں:

① کابل میں طالبان پر مشتمل فوج تعینات کی جائے جو غیر جانبدار ہوگی۔
② کابل میں صالح مسلمانوں کی عبوری انتظامیہ قائم کی جائے جس میں ملک کے تمام صوبوں کے نمایندے ہوں۔

مگر محمود مستری نے اس فارمولے کو سنجیدگی سے نہیں لیا اور یوں بات چیت کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔

طالبان کے مطالبات: ادھر احمد شاہ مسعود اور ربانی طالبان کے خلوص اور ناتجربہ کاری سے فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ پہلے اپنے تمام مخالفین کو ایک ایک کر کے چاروں شانے چت کریں گے اور اس کے بعد ان بھولے بھالے طالب علموں سے بھی با آسانی نمٹ لیں گے۔ انہوں نے طالبان کی حمایت اس لیے کی تھی کہ ان کی مخالف ''رابطہ کونسل'' (شوریٰ ہم آہنگی) کی سب سے بڑی جماعت ''حزب اسلامی'' کی قوت کو وہی پاش پاش کر سکتے تھے۔ اور واقعی طالبان کی یلغار کی وجہ سے حزب اسلامی سروبی کی طرف سمٹنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اب مسعود اور ربانی ''رابطہ کونسل'' کی دوسری پارٹی

''حزب وحدت'' کا کام تمام کرنا چاہتے تھے جو بدستور کابل کے کنارے مقابلے پر موجود تھی۔ حزب وحدت کا قصہ نمٹانے تک طالبان کو اعتماد میں لیے رکھنا ضروری تھا۔ مسعود کو یہ بھی احساس تھا کہ اب تک ان کی حکومت نے طالبان کے مطالبات کے جواب میں عملاً کوئی مثبت قدم نہیں اُٹھایا ہے اور یہ بات طالبان کو جو بے چینی سے کابل میں اسلامی نظام کے نفاذ کے منتظر ہیں، شک میں ڈال سکتی ہے۔

حزبِ وحدت پر حملہ کرنے سے قبل طالبان کی طرف سے یقینی مہلت حاصل کرنے اور انہیں پوری طرح مطمئن کرنے کے لیے احمد شاہ مسعود نے ایک بار پھر طالبان کی عسکری کمان سے چہار آسیاب میں ملاقات کی۔ طالبان کے مرکزی کمانڈروں ملا محمد ربانی، ملا بورجان اور ملا غوث نے احمد شاہ مسعود کا خیر مقدم کیا۔ احمد شاہ مسعود نے غیر معمولی عاجزی کا مظاہرہ کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی، ایک کونے میں جہاں چپل پڑے تھے، بیٹھنا چاہا اور زبانِ حال سے خود کو علماء و طلبہ کی خاکِ پا قرار دیا۔ طالبان اس طرزِ عمل سے بڑے متاثر ہوئے۔ ملا بورجان اور ملا ربانی نے بڑی عزت واحترام سے تاجک لیڈر کو ساتھ بٹھایا اور گفت وشنید شروع ہوئی۔ طالبان احمد شاہ مسعود سے متاثر ضرور ہوئے تھے مگر ان کا اُصولی موقف برقرار رہا۔ انہوں نے کسی لگی لپٹی بغیر احمد شاہ مسعود کو مشورہ دیا کہ صدر ربانی کو اپنے عہدے سے دست بردار ہو جانا چاہیے کیوں کہ حالات کے بگاڑ کو سدھارنے کے لیے یہ ضروری ہے۔

طالبان نے اس گفت وشنید کے دوران کابل حکومت کو اپناوہ فارمولا بھی پیش کیا جو اقوام متحدہ کے نمائندے محمود مستری نے نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ طالبان نے مندرجہ ذیل مطالبات بھی پیش کیے:

① کابل میں خالص اسلامی نظام کے نفاذ کا اعلان کیا جائے۔

② کابل انتظامیہ، سرکاری فوج اور حساس اداروں میں کلیدی عہدوں پر فائز تمام کمیونسٹوں کو باہر نکال کران پر شرعی عدالتوں میں مقدمہ چلایا جائے۔

③ کابل میں بے پردگی، بدکاری، فحاشی، رقص وموسیقی، شراب نوشی اور دیگر کھلے عام منکرات پر پابندی لگائی جائے۔

④ اخلاق باختہ کمیونسٹ خواتین کو دفاتر سے بے دخل کیا جائے۔

احمد شاہ مسعود نے طالبان کے باقی مطالبات پر کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا مگر کابل شہر میں صرف طالبان فوج کی تعیناتی کو (جو فارمولے کا اہم حصہ تھی) بعض وجوہ سے ناقابلِ عمل قرار دیا۔ اس طرح کابل حکومت سے بھی بات چیت التوا میں پڑ گئی۔ درحقیقت مسعود اور ربانی طالبان کے مذکورہ مطالبات میں سے کسی ایک کے بھی حق میں نہ تھے مگر فی الحال بات چیت کو ٹالنے کے لیے ایک شق سے اختلاف کا بہانہ ہی کافی تھا۔

احمد شاہ مسعود کا حزب وحدت پر حملہ: بہر کیف اس گفتگو کی ناکامی کے بعد احمد شاہ مسعود کو یقین ہو گیا کہ طالبان کے ساتھ ڈرامہ بازی زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتی۔ بہت جلد انہیں حقیقت کا اندازہ ہو جائے گا اور وہ کابل پر فیصلہ کن حملے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ چنانچہ احمد شاہ مسعود نے چند دنوں کے اندر اندر پہلے حزب وحدت اور پھر طالبان کو کچلنے کا فیصلہ کر لیا۔

طالبان کی مغرب کی طرف پیش قدمی: طالبان مسعود کے ارادوں سے بالکل بے خبر تھے۔ کابل کے محاذ کو کسی خطرے سے خالی سمجھ کر انہوں نے مغرب کی طرف توجہ دینا زیادہ ضروری سمجھا جہاں ہرات کا حاکم اسماعیل تورون ایک نئی مخالف قوت بن کر ابھر رہا تھا۔ گزشتہ سال قندھار، زابل اور ہلمند کے درجنوں کمانڈر اور ہزاروں بدقماش جنگجو طالبان سے شکست کھانے کے بعد فرار ہو کر اسماعیل تورون سے جا ملے تھے اور وہ ان کی مشترکہ طاقت سے طالبان کے خلاف ایک بڑی جنگ کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ طالبان نے چہار آسیاب پر قبضے کے بعد کابل کا رخ کرنے کی بجائے فروری 1995ء کے اواخر میں اپنی افواج کا ایک بڑا حصہ ان مغربی اضلاع کی طرف روانہ کر دیا تھا جو اسماعیل تورون کے قبضے میں تھے۔ طالبان طوفانی انداز میں مغربی صوبوں تک پہنچ گئے اور ایک خونریز جنگ کے بعد انہوں نے فراہ اور نیمروز کے صوبے اسماعیل تورون سے چھین لیے۔ ادھر احمد شاہ مسعود نے اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے یہ وقت مناسب جانا اور حزب وحدت کو کابل سے پیچھے دھکیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ 6 مارچ 1995ء کو اس کی افواج نے یکایک شہر کے جنوب میں ''حزب وحدت'' کے ٹھکانوں پر چڑھائی کر دی۔ اس غیر متوقع حملے میں بڑی تعداد میں ٹینکوں کی مدد لی گئی۔ ''حزبِ وحدت'' اس لڑائی کے لیے بالکل تیار نہ تھی۔ ان کے سربراہ عبدالعلی مزاری سمیت بڑے بڑے لیڈر جو مورچوں میں موجود تھے افراتفری کے عالم میں پسپا ہونے لگے۔

مزاری کا طالبان سے رابطہ: شیعہ لیڈر مسعود کی بدعہدیوں سے واقف تھے اور اس پر اعتماد نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے اس موقع پر عبدالعلی مزاری نے مجبور ہو کر طالبان سے رابطہ کیا اور جان کی امان کے ساتھ ہتھیار ڈالنے کے لیے انہیں واسطہ بنانے کی کوشش کی، اس نے کہا:

> ''حکمت یار کے سروبی چلے جانے کے بعد شوریٰ ہم آہنگی عسکری طور پر غیر فعال ہو گئی ہے۔ اب اس میں مسعود سے جنگ کی سکت نہیں رہی۔ لہٰذا طالبان درمیان میں پڑ کر ہم سے ہتھیار لے لیں اور اس کے بدلے ہمیں جان کے تحفظ کی یقین دہانی فراہم کریں۔''

ملا محمد عمر کے نائب ملا محمد ربانی نے جو طالبان کے صدر کی حیثیت رکھتے تھے، اس پیغام پر غور کیا اور

پھر احمد شاہ مسعود کو پیغام بھیجا: ''حزب وحدت اور آپ کے مابین سالہا سال سے جنگ جاری ہے۔ اس وقت وہ ہتھیار ڈالنا چاہتے ہیں مگر انہیں آپ پر وثوق نہیں۔ البتہ وہ طالبان کے پاس ہتھیار جمع کرانے کے لیے تیار ہیں۔ لہٰذا آپ حزبِ وحدت کے خلاف کارروائی روک کر طالبان کو موقع دیں کہ وہ آپ کی اور حزب وحدت کی افواج کے درمیان حائل ہو کر حزب کو غیر مسلح کر دیں۔''

احمد شاہ مسعود کی طرف سے اس پیش کش کا مثبت جواب ملنے پر ملا محمد ربانی نے اپنے دو اعلیٰ ترین افسران ملا عبدالرزاق اور ملا بورجان کو طالبان کی ایک مختصر فوج کے ساتھ اس میدان جنگ کی طرف روانہ کر دیا جہاں کچھ دیر پہلے مسعود اور مزاری کے درمیان معرکہ برپا تھا۔

<u>طالبان سے بد عہدی......اچانک حملہ:</u> جب ملا عبدالرزاق اور ملا بورجان اپنے جوانوں کے ساتھ وہاں پہنچے تو دونوں طرف کے مورچے خاموش تھے۔ بظاہر حالات سازگار تھے مگر اس سے پہلے کہ طالبان حزب وحدت سے اسلحہ جمع کرنا شروع کرتے، ایک عجیب ترین بات ہوئی۔ ان پر یکایک گولیوں اور گولوں کی بارش شروع ہوگئی۔ طالبان اس غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ لہٰذا ان کی خاصی تعداد شہید ہوگئی۔ بہت سے اس ہنگامے میں اِدھر اُدھر نکل کر لاپتا ہوگئے، کئی دنوں بعد ان کے بارے میں احمد شاہ مسعود کی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہونے کی خبر ملی۔

بہر کیف اس وقت ملا عبدالرزاق اور ملا بورجان اکثر طلبہ کو بحفاظت واپس لانے میں کامیاب ہوگئے۔ تب نہایت افراتفری کا عالم تھا۔ یہ بھی واضح نہیں تھا کہ حملہ احمد شاہ مسعود کی افواج نے کیا ہے یا حزبِ وحدت نے۔ یا دونوں اس خونیں کھیل میں شریک تھے۔ (بعد میں پتا چلا کہ یہ دونوں طاقتوں کی ملی بھگت تھی کہ بجائے آپس میں ٹکرانے کے، پہلے طالبان کو ٹھکانے لگایا جائے۔)

طالبان کے خلاف کارروائی میں احمد شاہ مسعود کا ساتھ دینا حزبِ وحدت کی سنگین سیاسی و عسکری غلطی تھی جس سے اسے ذرہ برابر متوقع مفادات حاصل نہ ہوئے۔ احمد شاہ مسعود کی افواج اگلے دن ایک بار پھر حزب وحدت پر چڑھائی کے لیے تیار نظر آئیں جبکہ اب طالبان بھی حزب وحدت کو محفوظ راستہ دینے کے لیے اتنی آسانی سے رضامند نہیں ہو سکتے تھے۔ آخر کار خود کو دو طرفہ خطرات میں گھرا دیکھ کر حزب وحدت کی مرکزی کمان نے راہِ فرار اختیار کرنے کو ترجیح دی، پارٹی کے سربراہ عبدالعلی مزاری ٹیکسی میں بیٹھ کر ایک محفوظ علاقے کی طرف روانہ ہوگئے۔ مگر یہ راستہ طالبان کے علاقے سے گزرتا تھا جہاں ان کی چیک پوسٹیں موجود تھیں۔ چوں کہ طالبان غیر محرم خواتین پر نگاہ ڈالنے سے سخت پرہیز کرتے تھے اس لیے عبدالعلی مزاری برقع پہن کر چند خواتین کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھے تھے۔ تاکہ طالبان انہیں چیک

نہ کر پائیں، مگر طالبان نے ہر موقع کے لیے مناسب انتظامات کر رکھے تھے۔

عبدالعلی مزاری کی گرفتاری: جب یہ ٹیکسی طالبان کی چیک پوسٹ سے گزری تو محافظوں نے ایک تربیت یافتہ کم سن بچے کو اشارہ کیا کہ وہ خواتین کو دیکھے بھالے۔ بچے نے تمام خواتین کے نقاب اُٹھا کر دیکھے اور پھر حواس باختہ انداز میں واپس آکر چوکی کے محافظوں سے کہا:

''ان میں سے ایک عورت کی...... اتنی ......لمبی ڈاڑھی ہے۔''

اس نے اپنے سینے تک اشارہ کر کے بتایا۔ یہ سن کر طالبان چونک گئے۔ بچے کی نشاندہی پر برقع میں ملبوس عبدالعلی مزاری کو گرفتار کرلیا گیا۔ شیعہ عسکری تنظیموں کے اتحاد کے مرکزی قائد کی گرفتاری کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ عبدالعلی مزاری کو فوری طور پر بڑے کمانڈروں کے پاس لے جایا گیا۔ انہوں نے طے کیا کہ شیعہ لیڈر کو مرکزی قیادت کے پاس قندھار بھیج دیا جائے۔ چنانچہ مزاری کو اسی وقت ایک ہیلی کاپٹر میں قندھار روانہ کر دیا گیا۔

اس ہیلی کاپٹر میں ایک رائفل بردار محافظ اور پائلٹ کے سوا کوئی نہ تھا۔ ہاں ایک تابوت تھا جس میں کابل کے محاذ پر کام آنے والے ایک طالب علم کی لاش تھی۔ مرتبے کا لحاظ کرتے ہوئے 55 سالہ تندرست وتوانا عبدالعلی مزاری کے ہاتھ بھی کھلے رکھے گئے گویا حفاظتی انتظامات برائے نام ہی تھے۔

مزاری نے ہیلی کاپٹر اغوا کرلیا: اس صورتِ حال نے مزاری کو ایک غلط فیصلے پر آمادہ کر دیا۔ جب ہیلی کاپٹر غزنی کے قریب پہنچا تو مزاری نے یکا یک بے فکر محافظ پر حملہ کر دیا اور اس سے رائفل چھین کر اسے وہیں قتل کر دیا۔ اس کے بعد پائلٹ کو گن پوائنٹ پر حکم دیا کہ ہیلی کاپٹر نیچے اُتار لو۔ جب پائلٹ نے انکار کیا تو مزاری نے گولی چلا کر اسے بھی زخمی کر دیا۔ آخر پائلٹ ہیلی کاپٹر نیچے اُتارنے پر مجبور ہو گیا۔ نیچے اُترتے ہی مزاری نے قریبی دیہات کی طرف دوڑ لگادی اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کچھ طالبان جو کابل سے قندھار جا رہے تھے، اس راستے سے گزرے۔ ہیلی کاپٹر دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھنکا۔ قریب پہنچ کر انہوں نے ہیلی کاپٹر میں محافظ کو مقتول اور پائلٹ کو شدید زخمی پایا۔ جب پائلٹ نے انہیں بتایا کہ قیدی قریبی گاؤں کی طرف فرار ہوا ہے تو طالبان نے فوری طور پر اس دیہات کا محاصرہ کرلیا اور جلد ہی مزاری کو برآمد کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

مزاری کا قتل اور اس کے اثرات: اس وقت تک مشہور ہو چکا تھا کہ حزب وحدت نے ہتھیار ڈالنے کی پیش کش کر کے طالبان کو اپنے مورچوں کے سامنے بلایا اور پھر بیسیوں طلبہ کو دھوکے سے قتل کر دیا ہے، اس لیے طالبان کے عام کارکن سخت مشتعل تھے۔ پھر مزاری کا محافظ کو قتل کر کے فرار ہونا بھی

اشتعال انگیز تھا، اس لیے کچھ طالبان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، مزاری کو وہیں موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اس واقعے کے بعد حزبِ وحدت نے جو افغانستان کے شیعہ گروپوں کی بڑی نمایندہ جماعت تھی، طالبان سے دشمنی اپنی گرہ میں باندھ لی اور ہر موقع پر انہیں انتقام کا نشانہ بنانے میں پیش پیش رہی۔

طالبان کا احمد شاہ مسعود سے حسنِ ظن: مسعود کی حزب وحدت کے مورچوں پر یلغار، حزبِ وحدت کی طالبان سے مصالحت اور قیامِ امن کی دعوت، طالبان پر بے خبری میں حملہ اور پھر مزاری کا قتل...... یہ سب کچھ اس طرح آناً فاناً ہوا کہ کسی کو اس کے پس پردہ اصل سازش پر غور کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ طالبان کی قیادت بھی نہ سمجھ سکی کہ یہ احمد شاہ مسعود کی کارستانی ہے۔ طالبان لیڈر یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ کابل کے جنوب میں ان پر کیے جانے والے خوفناک حملے میں حزبِ وحدت کے ساتھ مسعود کی فوج نہ صرف شریک تھی بلکہ اصل منصوبہ ساز وہی لوگ تھے۔

طالبان کے بعض دوستوں کا خیال تھا کہ اس حملے کے ذمہ دار کابل انتظامیہ کے کمیونسٹ عہدے دار جنرل آصف دلاور اور بابا جان ہیں۔ احمد شاہ مسعود کا اس سازش سے کوئی تعلق نہیں۔ طالبان اس حسن ظن پر مجبور تھے کیونکہ دینی مدارس میں پلنے بڑھنے والا طبقہ، احمد شاہ مسعود کو احمد شاہ ابدالی کا دوسرا روپ تصور کرتا تھا۔ طالبان کی مسعود سے عقیدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ایک شخص نے ملا محمد عمر کو بتایا کہ طالبان پر اس حملے میں اصل کردار احمد شاہ مسعود کا ہے اور وہ بد عہدی کا مرتکب ہوا ہے تو ملا محمد عمر نے اس اطلاع دہندہ کو ڈانٹ کر کہا:

''ایسے عظیم مجاہد کو آپ دھوکے باز کہہ رہے ہیں؟''

احمد شاہ مسعود کا دوسرا حملہ: مگر جلد ہی احمد شاہ مسعود کا اصل روپ طالبان کے سامنے آگیا۔ کابل حکومت نے 6 مارچ کی اس جنگ کے بعد جو حزبِ وحدت کے خلاف شروع ہو کر طالبان پر پلٹ گئی تھی، طالبان کے خلاف ایک بڑے حملے کی تیاری کرلی۔ 11 / مارچ 1995ء کو طالبان پر اچانک ایک اور بھرپور حملے کا آغاز ہوا۔ طالبان اب تک احمد شاہ مسعود کے عزائم سے بے خبر تھے۔ انہوں نے کسی قسم کی جنگی تیاری نہیں کی تھی۔ ان کی دفاعی لائن بھاری اسلحے سے بالکل خالی تھی۔ ایسے میں جب کمیونسٹ افسران جنرل بابا جان اور جنرل آصف دلاور منظم انداز میں ان پر حملہ آور ہوئے تو وہ ہکا بکا رہ گئے۔ یہ حملہ زمین اور فضائی دونوں انداز سے کیا جارہا تھا۔ طالبان نے زمینی حملے کا تو حتی الامکان مقابلہ کیا اور ہلکے ہتھیاروں کے ذریعے دیر تک لڑتے رہے، کابل کی مضافاتی بستیوں میں دست بدست لڑائی ہوتی رہی مگر جب وہ فضائی حملے کی زد میں آئے تو ان کے پاس سوائے پسپائی کے کوئی راستہ باقی نہ بچا۔

کیمونسٹ پائلٹ طالبان کو نیپام بموں اور کلسٹر بموں کا نشانہ بنا رہے تھے۔اس لڑائی میں طالبان کے کم از کم اڑھائی سو افراد شہید ہوئے جن میں اکثریت علمائے کرام، حفاظ کرام اور قراء حضرات کی تھی۔

احمد شاہ مسعود اور برہان الدین کی اس کھلی بدعہدی کے باعث طالبان کو ایک بڑے جانی نقصان کے ساتھ ساتھ شدید ذہنی صدمہ بھی پہنچا مگر ان کے حوصلے میں کوئی کمی نہیں آئی۔ کسی تاخیر کے بغیر انہوں نے کابل کے قریب اپنے دفاعی خط کو مضبوط کیا تاکہ کابل حکومت کے مزید حملے کامیاب نہ ہوسکیں۔تازہ کمک اور بھاری اسلحے کے ذریعے انہوں نے خود کو مسعود کے مقابلے میں بھرپور مزاحمت کے قابل بنالیا تاہم ابھی وہ کابل پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

مغربی محاذ...... اسماعیل خان تورون سے کشمکش: کابل پر براہِ راست حملے کے منصوبے کو موخر کرتے ہوئے اب انہوں نے مغرب کی طرف توجہ مرکوز کردی جہاں ہرات کے گورنر اسماعیل تورون سے جنگ جاری تھی، مغربی محاذ بدستور گرم تھا اور طالبان کا لشکر تیزی سے پیش قدمی کرتے ہوئے ہرات کے جنوب میں سوویت یونین کے تعمیر کردہ شین ڈنڈ ائربیس تک جا پہنچا تھا۔احمد شاہ مسعود کو طالبان پروار کرنے کے لیے مناسب موقعے کی تلاش تھی۔اس نے فوری طور پر اسماعیل خان کی مدد کا فیصلہ کرلیا، اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر طالبان شین ڈنڈ ایرپورٹ پر قابض ہوگئے تو انہیں فضائی قوت حاصل ہوجائے گی جس کے بعد وہ کابل حکومت سے بھرپور ٹکر لے سکیں گے۔

احمد شاہ مسعود نے بلا تاخیر دو ہزار کہنہ مشق تاجک سپاہیوں کو طیاروں کے ذریعے شین ڈنڈ اور ہرات بھیج دیا تاکہ وہ طالبان کو آگے بڑھنے سے روکیں۔ساتھ ہی کابل حکومت کے طیاروں نے بگرام سے پرواز کرکے طالبان کے خطِ اوّل پر اندھا دھند بمباری شروع کردی۔فضائی طاقت سے محروم طالبان اس خوفناک حملے کی تاب نہ لاسکے اور شدید جانی ومالی نقصان اُٹھا کر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگئے۔اس کے بعد کئی ماہ تک مغرب میں ان کی پیش قدمی رکی رہی۔

طالبان، دوستم اور آئی ایس آئی: 1995ء کا موسم گرما خاموشی سے گزرتا جارہا تھا۔مگر اس خاموشی کے پس پردہ ایک طوفان جنم لینے کو تھا۔احمد شاہ مسعود، اسماعیل خان تورون اور طالبان، تینوں اپنی اپنی جگہ نئے مورچے تیار کررہے تھے۔طالبان نے اس دوران اپنی افواج کی تنظیم بہتر بنانے پر توجہ مرکوز کی، رضا کاروں کی سخت تربیت کا انتظام کیا گیا۔ پاکستان میں روابط رکھنے والے طالبان عہدے داروں نے یہاں کے بڑے بڑے دینی مدارس میں اپنے لیے فضا ہموار کرنے کی کوششیں شروع کیں۔ ادھر حکومت پاکستان کو یقین ہو چلا تھا کہ افغانستان میں ایک پاکستان دوست حکومت کے قیام کے لیے

طالبان سے بہتر فریق کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ حکومت پاکستان اور آئی ایس آئی نے طالبان کو اس انداز میں تعاون فراہم کرنا شروع کر دیا جس پر کھلم کھلا تعاون کی تہمت نہیں لگ سکتی تھی۔

طالبان کو اسلحے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ انہیں قندھار، غزنی، میدان شہر اور لوگر سے اس کے بڑے بڑے ذخائر مل چکے تھے۔ جہاں تک افرادی قوت کا تعلق ہے، اس کے لیے افغانستان کے دینی مدارس اور متدین طبقے کے ان گنت نوجوان موجود تھے۔ پھر پاکستان کی مغربی سرحدیں بھی کھلی تھیں۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان کے نوجوان بڑی تعداد میں طالبان کے شانہ بشانہ لڑنے کے لیے پہنچ جاتے تھے، پنجاب اور سندھ سے بھی طالبان کو رضا کار مل جاتے تھے۔ البتہ طالبان فضائی طاقت سے یکسر محروم تھے۔ اس کے علاوہ ان کا سفارتی محاذ خاصا کمزور تھا۔ انہیں دوسرے فریقوں سے ازراہ مصلحت معاہدے کرنے اور مفادات حاصل کرنے کا تجربہ نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا کوئی اتحادی نہیں تھا۔ افغانستان کے تمام سیاسی دھڑے ان کے مخالف تھے اور ان سب سے طالبان کو تنہا جنگ کرنا پڑ رہی تھی۔

اس موقع پر آئی ایس آئی نے طالبان اور جنرل رشید دوستم میں ایک عسکری معاہدہ کرالیا، جس کے نتیجے میں دوستم نے ازبک ماہرین کو بھیج کر قندھار ائرپورٹ پر کھڑے قابلِ مرمت طیاروں اور ہیلی کاپٹروں کو درست کرنے میں مدد دی۔ اس طرح طالبان کو پہلی بار فضائی قوت حاصل ہوئی۔

طالبان کے خلاف لشکرِ جرار کی روانگی: شین ڈنڈ کے محاذ پر طالبان کی پسپائی ان کی پہلی شکست تھی جس نے طالبان مخالف عناصر کو بڑا حوصلہ بخشا تھا۔ پھر احمد شاہ مسعود اور اسماعیل خان کا اتحاد بھی طالبان کے لیے خطرات میں اضافہ کر چکا تھا۔ ادھر ہلمند کا شکست خوردہ سردار عبدالغفار اخوندزادہ جو فرار ہو کر غور بند پہنچ چکا تھا، اسماعیل خان کے ساتھ مل کر طالبان سے ٹکر لینے پر آمادہ تھا۔ اس صورتِ حال نے اسماعیل خان کو بے حد خوش فہمی میں مبتلا کر دیا۔ اس نے طے کرلیا کہ ایک ہی بار بھرپور انداز میں حملہ کر کے طالبان کا قصہ پاک کر دیا جائے۔

اسماعیل خان تین چار ماہ تک زبردست جنگی تیاریوں میں مصروف رہا۔ اگست 1995ء کے گرم موسم میں اتحادیوں کا ایک لشکرِ جرار تیار ہو گیا جس کے بارے میں وثوق سے کہا جا رہا تھا کہ یہ قندھار کو فتح کیے بغیر نہیں لوٹے گا۔ اس میں سپاہیوں کی تعداد 25 ہزار سے کم نہ تھی۔ اس کی قیادت دو کمیونسٹ کمانڈروں جنرل علاؤالدین اور جنرل ہلالی کے سپرد تھی۔ یہ ایک غیر معمولی فوج تھی جس کی جنگی تیاریوں، ساز و سامان، جدید بھاری اسلحے اور افراد کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ دیکھنے والوں کے دل دہل جاتے تھے۔

اس لشکر میں شامل ایک کمیونسٹ جرنل کی خودنوشت سوانح عمری کے مطابق:

''یہ پہلا منظم ترین لشکر تھا جو جنوب مغربی علاقے سے روانہ ہوا تھا۔ اگرچہ اس سے قبل بھی فاریاب اور دوسرے علاقوں سے ہمارے لشکر گئے تھے مگر کیفیت اور تعداد کے لحاظ سے وہ ہرگز اس لشکر کے مقابلے کے نہ تھے۔''

ہراتی لشکر کا دل آرام اور ہلمند پر قبضہ: مغربی سرحدوں پر تعینات طالبان کے دستے اس سیلاب کے سامنے بند نہیں باندھ سکتے چنانچہ وہ تیزی سے پسپا ہوگئے اور یوں اسماعیل خان کی افواج آرام سے ایک اہم مغربی ضلع ''دل آرام'' پر قابض ہوگئیں۔ دریائے دل آرام کے دونوں کنارے اب ان کی گرفت میں تھے۔ طالبان دل آرام سے اس طرح پسپا ہوئے کہ پھر ان کے قدم کہیں جم نہ سکے اور اسماعیل خان کی فوج نے طوفانی رفتار سے پیش قدمی کر کے ہلمند پر بھی قبضہ کرلیا۔ اب وہ براہِ راست قندھار پر قبضہ کرنے کی پوزیشن میں تھیں۔

قندھار خطرے کی زد میں: طالبان کے لیے یہ نہایت نازک وقت تھا۔ ان کی افواج مختلف محاذوں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ قندھار کے دفاع کے لیے بہت کم فوج موجود تھی اور جو سپاہی تھے وہ بھی دل شکستہ ہو رہے تھے۔ دریائے دل آرام سے 20 کلومیٹر آگے، 25 ہزار سپاہ کا اجتماع ایک ایسا منظر تھا جو بڑے بڑے بہادروں کے ہوش اُڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ طالبان کو قندھار کے دفاع کے لیے نئے رضا کاروں کی بھرتی کی اشد ضرورت تھی مگر اس وقت اہلِ قندھار خوف کی وجہ سے گھروں میں دبک رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر قندھار کی ایک ضعیف بڑھیا بندوق لے کر باہر نکل آئی۔ اس نے طالبان کی جیپ پر سوار ہو کر پورے شہر کا چکر لگایا، وہ لوگوں پر چوڑیاں پھینکتی اور ان کی غیرت کو آواز دیتی۔ تب قندہاریوں کو جوش آیا اور بہت سے لوگ قول اردو (قندہار کے معسکر) میں جمع ہوگئے، جن سے طالبان کو بقدر ضرورت رضا کار میسر آگئے۔ ملا محمد عمر نے یہاں ایک میز پر چڑھ کر لوگوں سے خطاب کیا اور ان کی ہمت بڑھائی۔

ملا محمد عمر کا عجیب فیصلہ: ملا محمد عمر نے اس وقت ایک عجیب فیصلہ کیا جو بظاہر عقل و دانش کے خلاف تھا، مگر ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''ان کے بہت سے فیصلے الہامی ہوا کرتے ہیں۔'' ان کے قریبی مشیر بھی ظاہری امکانات کی روشنی میں ان فیصلوں سے اختلاف کرجاتے ہیں مگر ان پر عمل کے بعد کامیابی کی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔

اس وقت ان کا فیصلہ تھا کہ طالبان شہر کا دفاع کرنے کی بجائے باہر نکلیں اور آگے جا کر دشمن کو روکیں۔ طالبان قندہار سے باہر ایک ندی تک پہنچے تو ملا عمر نے حکم دیا کہ وہ ندی کا پل عبور کر کے دو

گروہوں میں تقسیم ہو جائیں، سڑک کھلی چھوڑ دیں اور سڑک کے دائیں بائیں مورچے بنالیں۔ یہ فیصلہ بڑا عجیب تھا۔ دفاعی حکمت عملی بظاہر یہ ہونا چاہیے تھی کہ پل توڑ دیا جاتا اور طالبان ندی کے اِس طرف مورچے بنا کر دشمن کو روکتے۔

ہراتی لشکر رات کی تاریکی میں اسی سڑک پر پیش قدمی کر رہا تھا۔ طالبان کے مخبروں نے بتایا کہ گاڑیوں کی سینکڑوں بتیوں کی روشنی سے صحرا میں اجالا ہو رہا ہے جس سے حملہ آوروں کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ندی کے پار مورچے بنا کر طالبان ساری رات دشمن کے حملے کا انتظار کرتے رہے۔ انہیں اپنے امیر کی حکمت عملی سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ بار بار کہہ رہے تھے کہ اگر ہم ندی کے اِدھر ہی مورچے بناتے تو بہتر تھا کہ شکست کھا کر بھاگ تو سکتے تھے، یہاں تو سڑک بھی صاف ہے جس پر دشمن دندناتا چلا آئے گا۔ ہم فرار بھی نہیں ہو سکیں گے۔

مگر طالبان کی اس مورچہ بندی سے خود حملہ آوروں پر رعب طاری ہو گیا۔ جب مخبروں نے بتایا کہ طالبان کھلے میدان میں سڑک کو خالی چھوڑ کر دائیں بائیں ان کے منتظر ہیں تو جنرل ہلالی اور جنرل علاؤالدین نے پیش قدمی روک دی۔ انہوں نے سوچا کہ رات کی تاریکی میں دشمن کی قوت کا اندازہ نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے ایک دن ٹھہر کر تازہ دم ہونے اور دشمن کی طاقت کا صحیح پتا چلانے کے بعد آگے بڑھنا مناسب ہوگا۔ طالبان تمام رات اور اگلے دن بھی دشمن کے حملے کا انتظار کرتے رہے مگر ہراتی لشکر نے ہلنے کا نام نہ لیا۔

اگلی رات ملا عمر نے طالبان کو ایک اور عجیب حکم دیتے ہوئے کہا کہ وہ دشمن کے اس کیمپ پر جس میں 25 ہزار سپاہی، بری اور فضائی طاقت سمیت تیار کھڑے تھے، اچانک حملہ کر دیں۔ طالبان نے امیر کے حکم پر لبیک کہا اور رات کی تاریکی میں کئی ٹرکوں میں بھر کر دشمن کے پڑاؤ کی طرف بڑھنے لگے۔ انہوں نے جاسوسوں کے ذریعے دشمن کا نام شب (کوڈ ورڈ) معلوم کر لیا تھا اور خود کو ہراتی لشکریوں سے مشابہہ بنانے کے لیے اپنے لمبے کرتوں کو گرہیں لگا لگا کر چھوٹا کر لیا تھا۔ ان انتظامات کے ساتھ طالبان صرف ہلکے اسلحے کے ساتھ یکایک دشمن کے خطِ اوّل (فرنٹ لائن) پر حملہ آور ہو گئے۔ ہراتی سپاہیوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ ان پر یوں اچانک حملہ ہو جائے گا۔ وہ بے فکری کے ساتھ صبح سویرے کوچ کر کے شام تک قندھار پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے، مگر مسلسل فائرنگ اور زخمیوں کی چیخ و پکار سے ان کی خوابیدہ آنکھیں کھل گئیں اور وہ افراتفری میں نادیدہ دشمنوں کو نشانہ بنانے کی ناکام کوشش کے بعد اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ ان کا خطِ اوّل دیکھتے ہی دیکھتے ٹوٹ گیا۔ طالبان ان کی بدحواسی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ان کی صفوں کے درمیان پہنچ گئے۔

یہاں طالبان نے ''نام شب'' کا پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ جب کوئی طالب کسی ہراتی کی زد پر آتا تو نام شب پکار کر صاف بچ نکلتا۔ بہت سے طالبان نے خود کو ''اخوندزادہ'' یا کسی اور حلیف کمانڈر کا ساتھی بتا کر ان کے بیچوں بیچ گھسنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اس طرح وہ دائیں بائیں کو نظر انداز کر کے، ان کی تمام دفاعی لائنیں عبور کر کے سیدھے آگے بڑھتے چلے گئے۔ عسکری لحاظ سے یہ طریقہ بے حد خطرناک ہے مگر اس سے دشمن پر نفسیاتی دباؤ ضرور پڑ جاتا ہے اور یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ دشمن اپنی فضائیہ کو حرکت میں لا سکا نہ بھاری توپوں اور ٹینکوں کو۔ جوں جوں طالبان آگے بڑھتے گئے، ہراتی لشکر کے چھکے چھوٹتے چلے گئے۔ طالبان ان کی فرنٹ لائن کو توڑنے کے بعد بلا توقف صف بندی کے ابتدائی حصے (خطِ منتظرہ) تک جا پہنچے۔ اب لشکر کا کوئی گوشہ ان کی زد سے محفوظ نہ تھا۔ سپاہی توپیں، ٹینک اور دیگر بھاری اسلحہ وہیں چھوڑ کر اپنی جانیں بچانے کے لیے بھاگے پھر رہے تھے۔ خود جنرل ہلالی دو مرتبہ طالبان کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے بال بال بچا۔ غرض اس رات کی بازی پوری طرح طالبان کے حق میں رہی۔

23 ہزار سپاہی اسلحے کے عظیم انبار چھوڑ کر یوں فرار ہوئے کہ صبح تک کہیں ان کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا تھا جبکہ دو ہزار کے لگ بھگ طالبان کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔

<u>طالبان کی مزید پیش قدمی:</u> اس کامیابی نے طالبان کے حوصلے اس قدر بلند کر دیے کہ وہ اگلے دن سورج کی روشنی میں بھی آگے بڑھتے رہے۔ اس دوران دشمن کی بعض گاڑیوں سے ان کی جھڑپیں بھی ہوئیں۔ جنرل علاؤالدین نے اس دن پوری کوشش کی کہ کسی جگہ دوبارہ دفاعی خط بنا کر طالبان کا مقابلہ کرے مگر عصر کے وقت طالبان کا ایک دستہ اس تک پہنچ گیا۔ دو بدو فائرنگ میں علاؤالدین ایسا شدید زخمی ہوا کہ اس کے بچنے کی اُمید نہ رہی۔ اس کے بعد جنرل ہلالی نے شکست خوردہ فوج کی کمان سنبھالی اور اسے بیس کلومیٹر پیچھے لے جا کر دریائے دل آرام کے کنارے دفاعی خط بنا لیا۔ تاہم فوج کی حالت ابتر تھی اور اس میں طالبان سے لڑنے کی ہمت نہیں رہی تھی اور خطرہ تھا کہ یہاں سے پسپائی کے بعد طالبان شین ڈنڈ ائیر پورٹ تک پہنچ جائیں گے۔

<u>اسماعیل خان، ربانی سے مدد کا طلب گار:</u> اس دوران اسماعیل خان ہرات میں اپنے مشیروں اور فوج کے کمانڈروں سے صلاح و مشورے میں مصروف تھا۔ طے یہ ہوا کہ کابل سے فوری مدد مانگی جائے۔ چنانچہ اسماعیل خان نے فون پر برہان الدین ربانی سے بات چیت کی اور فوری طور پر 5 ہزار مسلح افراد کی کمک طلب کی۔ مگر اسماعیل خان کی تمام کوششیں ریت کی دیوار کو سہارا دینے کے مترادف ثابت ہوئیں۔ طالبان ایک آندھی کی طرح آگے بڑھے اور ستمبر 1995ء کے آغاز میں شین ڈنڈ ائیر پورٹ تک پہنچ گئے۔ یہ

اسماعیل خان کا آخری مورچہ تھا جس کے بعد طالبان کو ہرات تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

اسماعیل خان جلاوطن، طالبان ہرات پر قابض: اسماعیل خان نے آخری کوشش کے طور پر شین ڈنڈ ائرپورٹ کے راستے میں بارودی سرنگوں کا جال بچھا دیا، مگر طالبان جو شہادت کے متوالے تھے، اس آزمائش کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ ان کی لاشوں پر لاشیں گرتی رہیں مگر وہ بارودی سرنگوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ 3 ستمبر 1995ء کو شین ڈنڈ ائرپورٹ بھی ان کے قبضے میں آ گیا۔

اسماعیل خان اب مزاحمت سے مایوس ہو چکا تھا۔ طالبان کے مسلح قافلوں نے جوٹرکوں اور جیپوں پر کئی اطراف سے پیش قدمی کر رہے تھے، اس کے لیے تمام راستے مسدود کر دیے تھے اور اس کے خلاف گھیرا تنگ کرتے چلے جا رہے تھے۔ آخرکار اسماعیل خان اپنے کئی کمانڈروں اور کئی سو ماتحتوں کے ساتھ ایران چلا گیا جو اس کی سرپرستی کرتا چلا آیا تھا۔ 5 ستمبر 1995ء کو طالبان نے کسی لڑائی کے بغیر ہرات پر قبضہ کر لیا۔ یوں طالبان حکومت کابل اور شمالی اضلاع کو چھوڑ کر ملک کے 15 صوبوں تک پھیل گئی۔

اتحادِ اسلامی کے کمانڈر بھی طالبان کے حامی: ان فتوحات نے طالبان کے اثر ورسوخ میں بے پناہ اضافہ کر دیا اور مخالف کمانڈر یکے بعد دیگرے ان کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے لگے۔ 25 اکتوبر 1995ء کو کابل حکومت کی سب سے بڑی اتحادی جماعت ''اتحادِ اسلامی'' کے 16 کمانڈروں میں سے 11 نے طالبان کی حمایت کا اعلان کر دیا جبکہ بقیہ نے بھی طالبان سے مذاکرات شروع کر دیے۔ خود اتحادِ اسلامی کے سربراہ استاذ عبدالرب رسول سیاف کے کابل حکومت سے اختلافات بڑھتے چلے گئے، جس کے ردِعمل میں حکومت نے انہیں گرفتار کر کے جبل السراج میں نظر بند کر دیا۔

کابل کا محاصرہ بدستور جاری: اس دوران طالبان نے کابل کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ کابل حکومت سے اب ان کی کھلی جنگ تھی۔ طالبان کا مطالبہ تھا کہ صدر ربانی فوری طور پر مستعفی ہو جائیں اور شہر کا انتظام ان کے حوالے کر دیں۔ طالبان کی طرف سے شہر پر اکا دکا حملے بھی جاری تھے اور دشمن کی چھوٹی موٹی پوسٹوں پر وہ آہستہ آہستہ قبضہ کرتے جا رہے تھے۔ تاہم انہوں نے عمومی حملے کا فیصلہ نہیں کیا تھا کیونکہ خدشہ تھا کہ ایسی کسی کوشش میں اَن گنت بے گناہ شہریوں کی جانیں ضائع ہو جائیں گی۔

اکتوبر 1995ء کے اوائل میں طالبان کابل کے گرد مورچے مضبوط کر کے بڑے حملے کی تیاری کرتے رہے۔ 10 اکتوبر کو قندھار سے 400 ٹینکوں پر مشتمل تازہ دم فوج کابل کے محاذ پر پہنچ گئی اور شہر پر حملے کے لیے کمر کس لی گئی۔ اگلے دن باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔ کچھ دن قبل چہار آسیاب طالبان کے قبضے سے نکل گیا تھا۔ 11 اکتوبر کی لڑائی میں طالبان نے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ایک ماہ تک وقفے

وقفے سے کابل کے محاذ پر جھڑپیں جاری ہیں۔ 11 نومبر کو طالبان نے راکٹوں سے ایک بڑا حملہ کر کے کابل انتظامیہ کو شدید زک پہنچائی۔ 26 نومبر کو فریقین میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ طالبان شہر میں داخل نہ ہوسکے اور قدرے پیچھے ہٹ کر از سرِ نو مورچے مستحکم کرنے لگے۔

1995ء کے آخر میں صورتِ حال: 1995ء کے اواخر میں صورتِ حال یہ تھی کہ ملک کے تیس صوبوں میں سے 15 پر طالبان کا قبضہ ہو چکا تھا۔ بقیہ 15 صوبوں میں سے 7 شمالی صوبے رشید دوستم کے پاس تھے جس نے از راہ مصلحت طالبان سے معاہدہ کیا ہوا تھا۔ بقیہ 8 صوبوں میں سے ''کنڑ'' اہل حدیث حضرات کے پاس تھا۔ بامیان حزب وحدت کے قبضے میں تھا۔ سروبی اور جلال آباد حزب اسلامی کے کنٹرول میں تھے۔ اس طرح کابل حکومت کے پاس صرف پانچ صوبے رہ گئے تھے۔ اس لحاظ سے یہ حکومت کسی طرح بھی افغانستان کی نمائندہ حکومت کہلانے کی حق دار نہ تھی۔ مگر اقوام متحدہ سمیت تمام دنیا نے طالبان کی نمائندہ حیثیت کو تسلیم کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔

دیو ہیکل روسی طیارہ طالبان کے قبضے میں: طالبان کا کہنا تھا کہ کابل حکومت اب صرف بھارت اور روس کے سہارے چل رہی ہے۔ یہ بات اس وقت کھل کر سامنے آ گئی جب طالبان کے جیٹ طیاروں نے قندھار کے اوپر محوِ پرواز ایک دیو ہیکل روسی طیارے کو قندھار ایئر پورٹ پر اُترنے پر مجبور کر دیا۔ یہ طیارہ سات روسی افراد کے عملے کے ساتھ دہلی سے کابل جا رہا تھا، اس میں کابل حکومت کے لیے جنگی ساز و سامان تھا جس میں کلاشن کوف کی 34 لاکھ گولیاں بھی شامل تھیں۔ طالبان نے طیارہ مع ساز و سامان ضبط کر لیا۔ تاہم عملے کی رہائی کے لیے یہ شرط پیش کی کہ روسی حکومت جہادِ افغانستان کے دوران گرفتار اور لاپتا کیے جانے والے علماء اور شہریوں کے بارے میں معلومات فراہم کرے۔

طالبان کے اس رویے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے خمیر میں وہ شے کس قدر گندھی ہوئی تھی جسے مغربی دنیا ''بنیاد پرستی'' سے تعبیر کرتی ہے۔ سو ایسی حکومت بھلا طاغوتی طاقتوں کے لیے کیسے قابل قبول ہو سکتی ہے۔ افسوس ہے ان لوگوں پر جو ان واضح حقائق سے آنکھیں موندتے ہوئے طالبان کو مغربی ایجنٹ کہتے چلے آ رہے ہیں۔

طالبان کے خلاف متحدہ کونسل کا قیام: نیا شمسی سال (1996ء) شروع ہوا تو نام نہاد کابل حکومت طالبان کے فیصلہ کن حملے سے پہلے پہلے اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پیر مارتی نظر آئی۔ چند ہفتوں کی برف باری کے باعث جنگی سرگرمیاں معطل رہی تھیں مگر بہار آتے ہی ایک نئی جنگ چھڑنے کا خدشہ سامنے تھا۔ صدر ربانی کے نمائندے ڈاکٹر عبدالرحمن نے گلبدین حکمت یار، رشید دوستم اور حزب وحدت کے

لیڈروں سے الگ الگ ملاقاتیں کیں۔ جنوری 1996ء میں یہ مشورے جاری رہے اور فروری میں ان دھڑوں نے ایک دس رکنی کونسل بنانے پر اتفاق کر لیا جس میں طالبان شامل نہیں تھے۔ اس کونسل کا اصل ہدف باقی ماندہ افغانستان کو طالبان کے قبضے میں جانے سے روکنا تھا مگر بظاہر یہ بتایا جا رہا تھا کہ کونسل تمام گروہوں کے اتفاق سے ملک میں قیام امن کی داعی ہے۔

طالبان کا اتحاد سے انکار: حکومتِ پاکستان کو اس کونسل کے قیام پر تشویش تھی کیونکہ افغانستان کی سیاست سے طالبان کی بے دخلی کے بعد وہاں ایک پاکستان دشمن حکومت کا مستحکم ہونا یقینی تھا۔ چنانچہ حکومتِ پاکستان نے ایک طرف حکمت یار، دوستم اور حزبِ وحدت کے لیڈروں کو طالبان سے مصالحت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف طالبان پر زور دیا کہ وہ اپنی بعض شرائط سے دستبردار ہو کر ان دھڑوں سے اتحاد کر لیں اور ان کے ساتھ مل کر کابل پر قبضے کی کوشش کریں۔ حکومت پاکستان نے طالبان کے رویے میں لچک پیدا کرنے کے لیے انہیں چمن سے ترکمانستان کی سرحد تک کئی ملین ڈالر کے خرچ سے ایک تجارتی شاہراہ بنوا دینے کا لالچ بھی دیا مگر طالبان کسی اور طاقت سے برابر کی سطح پر اتحاد پر آمادہ نہ ہوئے۔ جن لیڈروں کے دامن پر ہزاروں بے گناہوں کا خون تھا اور جن کے ہاں عہد و پیمان کی کوئی حیثیت نہیں تھی، طالبان اپنی موجودہ پوزیشن میں ان سے اتحاد فضول سمجھتے تھے۔

ربانی کا بیرونی دورہ اور امداد: صدر ربانی نے جب دیکھا کہ حکومتِ پاکستان طالبان کا دوسرے دھڑوں سے اتحاد کرانے میں ناکام ہو گئی ہے تو وہ ایک بار پھر اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے پر امید ہو گئے۔ 3 مارچ 1996ء کو صدر ربانی ساٹھ ارکان کا قافلہ لے کر ایران، ترکمانستان، تاجکستان اور ازبکستان کے دورے پر نکلے۔ اس مہم میں انہوں نے بین الاقوامی حمایت حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں کئی ممالک نے کابل حکومت کی امداد میں اضافہ کر دیا۔ روسی ٹرانسپورٹ طیارے تاجکستان اور یوکرائن سے لد کر کابل آنے لگے۔ ان میں گولہ بارود اور جدید اسلحہ بھرا ہوتا تھا۔ بھارتی طیاروں نے بھی بگرام تک پروازوں کا معمول بنا لیا اور دھڑا دھڑ وہاں کرنسی کے ڈھیر، زمینی ریڈار اور طیاروں کے فاضل پرزہ جات منتقل کرنے لگے۔ بھارت نے کابل کی ایرلائن آریانہ کو بھی منظم کر دیا۔

ایران بھی کابل حکومت کی مدد پر آمادہ ہو گیا۔ اگرچہ گزشتہ سال احمد شاہ مسعود نے کابل میں حزب وحدت کے سینکڑوں افراد قتل کر کے ایران کو برافروختہ کر دیا تھا مگر اب طالبان کا خطرہ بڑھتا دیکھ کر ایران نے احمد شاہ مسعود سے اس دشمنی کو فراموش کر دیا۔ ایرانی حکومت نے مشہد کے قریب پانچ عسکری کیمپ بنا کر اسماعیل خان کے حامی پانچ ہزار جنگجوؤں کو تربیت دینا شروع کر دی تا کہ وہ طالبان کیخلاف

جنگ میں حصہ لیں۔ مشہد ایر پورٹ سے طیارے اسلحہ لے کر روزانہ بگرام ہوائی اڈے پر اُترنے لگے۔ بعض اوقات ایک ہی دن میں دس دس بارہ بارہ پروازیں ہوتیں۔

طالبان تشکیل حکومت کے موڑ پر: ہمسایہ ممالک کی ان تمام تر سازشوں کے جواب میں طالبان کی توجہ اپنی صفوں میں اتحاد اور تنظیم پیدا کرنے پر مرکوز رہی۔ طالبان کے سربراہ ملا محمد عمر کے لیے فیصلہ کن وقت آچکا تھا۔ وہ 15 صوبوں کے حکمران ہوتے بھی اگر محض ایک فوج کے سپہ سالار کی طرح رہتے تو کبھی بھی ان بڑی بڑی آزمائشوں کا سامنا نہیں کر سکتے تھے جن کے شعلے اُفق پر لپکتے دکھائی دے رہے تھے۔

ملا محمد عمر کے مخلص ساتھی جو علماء اور مجاہد تھے، انہیں احساس دلا رہے تھے کہ اب وہ لمحہ آچکا ہے کہ انہیں ایک باقاعدہ اسلامی حکمران کے طور پر عنانِ حکومت سنبھالنے کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ نہ صرف افغان عوام بلکہ دنیا کے کونے کونے سے افغانستان میں جہاد کے لیے جمع ہونے والے مجاہدین میں اتحاد و تنظیم قائم کرنے کے لیے بھی یہ فیصلہ ناگزیر تھا۔ طالبان یہ فیصلہ شورائیت کے ذریعے کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ مارچ 1996ء کے اواخر میں سینکڑوں علماء امیر کے انتخاب کے لیے قندھار میں جمع ہوگئے۔ حکمران کے انتخاب کا یہ طریقہ مروجہ جمہوریت کے اصول پر پورا نہیں اترتا تھا مگر خلیفہ، سلطان یا امیر کے انتخاب کے جو طریقے اسلامی شریعت اور کتب فقہ میں مذکور ہیں، ان کے لحاظ سے یہ سب سے موزوں تر انداز تھا۔ آنے والے علماء کی تعداد ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ یہ افغانستان کی قریبی تاریخ میں علمائے دین کی سب سے بڑی مجلس شوریٰ تھی جس نے ہر پہلو سے ملک کو درپیش سیاسی اُلجھنوں اور مشکلات کا جائزہ لیا۔

20 مارچ سے لے کر 3 اپریل تک کئی مجلسوں میں یہ مشورے جاری رہے۔ نیا نظام حکومت کیا ہو؟ اسلامی حکومت کا منشور اور آئین کیا ہوگا؟ سیاسی چیلنجوں کا سامنا کس طرح کیا جائے گا؟ غیر ملکی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا جواب کیسے دیا جائے گا؟ شریعت کے نفاذ کے لیے موثر طریقے کیا ہوں گے؟ عسکری تنظیم کس طرح بہتر بنائی جائے گی؟ نظام تعلیم کیا ہوگا اور لڑکیوں کی تعلیم کا بندوبست کس طرح مناسب ہوگا؟ اس طرح کی کئی اہم بحثیں جاری رہیں اور بہت سے اہم فیصلے ہوئے جن کی روشنی میں طالبان کی حکومت کا ایک مربوط خاکہ طے پا گیا۔

ملا محمد عمر امیر المومنین: 10 ذی قعدہ 1416ھ (4 اپریل 1996ء) تاریخ افغانستان کا ایک یادگار دن تھا۔ اس دن ملا محمد عمر کو "امیر المومنین" کے لقب کے ساتھ افغانستان میں طالبان کی حکومت کا متفقہ سربراہ اور امیر تسلیم کر لیا گیا۔ ملا محمد عمر نے اس دن حضور نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب وہ جبہ زیب تن کیا ہوا تھا جو قندھار کی مشہور زیارت گاہ "خرقہ شریف" میں محفوظ چلا آرہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جبہ افغانستان

کے حکمران احمد شاہ ابدالی کو اُس دور کے عثمانی خلیفہ نے عطا کیا تھا اور صرف انتہائی خاص مواقع پر اس کی زیارت کرائی جاتی تھی۔ مقامی روایت یہ بھی ہے کہ جبہ ایک آہنی صندوق میں مقفل تھا اور زمانہ دراز سے یہ صندوق کسی سے کھل نہیں پایا تھا۔ مگر اس دن ملا محمد عمر کے ہاتھ لگاتے ہی صندوق آسانی سے کھل گیا۔ یہ ایک غیبی شہادت تھی جس کا چرچا آناً فاناً دور دور تک ہو گیا۔

ملا محمد عمر جب یہ مبارک جبہ پہن کر مجمع عام میں نمودار ہوئے تو ہزاروں علماء اور قبائل کے عمائد نے نعرہ بلند کیا:

''امیر المؤمنین، امیر المؤمنین''

یہ ایک تاریخی جلسہ تھا جس کی صدارت ملک کے بزرگ ترین عالم دین [illegible]لانا عبدالغفور سیمانی کر رہے تھے۔ ڈیڑھ ہزار علماء، سینکڑوں قبائلی عمائد اور ہزاروں عوام ہمہ تن گوش تھے۔

طالبان سربراہ کا تاریخی خطاب: اس دن ملا محمد عمر نے اپنے مخصوص [illegible]ادہ مگر موثر لہجے میں ایک ناقابلِ فراموش تقریر کی۔ انہوں نے قرآن مجید کی آیت ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ پڑھ کر اپنی گفتگو کا آغاز کیا اور کہا:

''عالمِ اسلام میں علماء کی مثال ایسی ہے جیسے جسم میں شریانیں کہ انہی پر زندگی کا دارومدار ہے۔ جب تک شریانیں فعال رہیں جسم نشوونما پاتا ہے اور مضبوط رہتا ہے۔ جب شریانیں کمزور ہو جائیں اور اپنا کام چھوڑ دیں تو روح جسم کا ساتھ چھوڑنے لگتی ہے، افعال معطل ہو جاتے ہیں اور جسم مردہ ہو جاتا ہے۔ اگر عالمِ اسلام کے علمائے کرام فکر اور عمل میں متفق ہو جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس لیے کہ مسلمانوں کی سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی ترقی مسلمانوں کی جماعتوں کے اتحاد پر منحصر ہے اور ان جماعتوں کے قائد علمائے راسخین ہیں۔ اگر ہم متحد ہو جائیں تو کامیاب ہو جائیں گے اور اُمت کو مشقتوں اور مصائب سے نجات دلا دیں گے۔ حکومت اور صالح قیادت ہماری رفیق ہوگی۔ لیکن اگر ہم بکھر گئے اور اللہ کی اطاعت سے دور رہے تو خسارے میں پڑ جائیں گے۔ ہم دشمنوں سے مغلوب اور ان کی قوت کے آگے مجبور ہو جائیں گے۔ اب جواب دہی ہمارے کندھوں پر ہے۔ میں ایک بار پھر تاکید کرتا ہوں کہ اے برادر علمائے کرام! آپ متحد رہیں اور اس تحریک میں ہمارے ساتھ جو تعاون ممکن ہو، کر گزریں۔ بعض لوگ ہمارے اہداف کے بارے میں استفسار کرتے ہیں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے اہداف و مقاصد آفتابِ نصف النہار سے زیادہ روشن ہیں۔ لوگ محروسہ صوبوں میں ہماری

کارکردگی اور نظام دیکھ چکے ہیں کہ ہم کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرتے ہیں، اس کے احکام نافذ کر رہے ہیں، حدود شرعیہ قائم کر رہے ہیں، فتنہ وفساد کو جڑ سے اُکھاڑ رہے ہیں، سنت رسول اللہ کو زندہ کر رہے ہیں، امن بحال کر رہے ہیں، لوگوں کا سکون اور چین لوٹا رہے ہیں۔

بہر حال اس کے باوجود میں سب لوگوں کے سامنے پوری صراحت سے اعلان کرتا ہوں کہ ہمارے اہداف وہی ہیں جن کے لیے رسول اللہ ﷺ کو مبعوث کیا گیا تھا، جن کے لیے قرآن مجید نازل کیا گیا، جن کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جہاد کیا اور انہیں خیر القرون کے زمانے میں نافذ کر کے دکھادیا۔ یہ وہی اہداف ہیں جن کے لیے ہمارے 15 لاکھ شہداء نے اپنا خون پیش کیا۔ یاد رکھیے! ہمارا ہدف اسلام کے اس کامل نظام کا قیام ہے جو دنیا اور آخرت میں انسان کی کامیابی کا ضامن ہے...... جو کہ کتاب وسنت کو تمام شعبوں میں نافذ کرنے پر مشتمل ہے۔"

چھ نکاتی قرارداد اور بیعت: ملا محمد عمر کی تقریر کے بعد ان کے نائب ملا محمد ربانی اور دیگر علماء نے خطاب کیا۔ اس موقع پر پانچ روزہ اجلاس کے خلاصے کے طور پر درج ذیل چھ نکاتی قرارداد منظور ہوئی:

① برہان الدین ربانی کو حکمرانی سے معزول کر کے ملا محمد عمر کو افغانستان کا حکمران چن لیا گیا ہے۔
② معزول حکومت سے جنگ جاری رہے گی۔
③ ہم اپنے پیارے وطن میں اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد کرتے رہیں گے۔
④ غیر ملکی طاقتوں کو اپنے ملک میں مداخلت کی اجازت نہیں دیں گے۔
⑤ ملک کی سرحدوں کی حفاظت کریں گے۔
⑥ مخالف دھڑوں کے تمام قیدیوں کو توبہ تائب ہونے اور علمائے کرام کی ضمانت ملنے پر رہا کر دیا جائیگا۔

جلسے کے برخاست ہونے سے قبل حاضرین نے ملا محمد عمر کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان میں پختون، فارسی، ازبک، بلوچ، ترکمان اور تمام نسلی گروہوں کے عمائد اور نمایندے شامل تھے۔ بیعت کرتے اور ملا محمد عمر کو مبارکباد دیتے ہوئے بہت سے افراد کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے کہ مدتوں بعد غزنوی، غوری اور احمد شاہ ابدالی کے اجڑے ہوئے چمن میں بہار آئی تھی۔

(ماخوذ از ماہنامہ الطالب، عربی۔ اپریل 1996ء)

حاضرین نے ملا عمر کے ہاتھ پر بالکل اس طرح بیعت کی جیسے اسلام کے سنہرے دور میں خلفا وسلاطین کی بیعت کی جاتی تھی۔ اس دن سے "امیر المؤمنین" کا لقب ان کے نام کا جزو بن گیا۔

ملا محمد عمر کو اب عوام، علمائے کرام اور قبائلی سرداروں کا بھرپور اعتماد حاصل ہو چکا تھا۔ اجلاس کے

اختتام پر انہوں نے 15 صوبوں کے عمائد کے اتفاق کے ساتھ یہ فیصلہ سنا دیا تھا کہ کٹھ پتلی ربانی حکومت کے خلاف جہاد جاری رہے گا۔ علماء نے بھی اتفاق رائے سے اس جنگ کو "جہاد" کا نام دیا۔ قندھار کے ایک گمنام جہادی رہنما کا اس طرح قدیم اسلامی طرز پر "امیر المومنین" بن جانا، دنیا کے لیے حیرت انگیز بات تھی۔ اگر یہ طرز حکومت کامیاب ثابت ہو جاتا تو "جمہوریت" کے وہ جال کٹتے چلے جاتے جنہیں مغربی طاقتوں نے اپنے استعماری مقاصد کے تحت عالمِ اسلام میں پھیلا رکھا ہے۔ افغانستان میں متعین اقوام متحدہ کے سفیر محمود مستری کو طالبان کے اس فیصلے سے اس قدر مایوسی ہوئی کہ ایک ماہ بعد انہوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے کر واپسی اختیار کر لی۔ محمود مستری کے بعد جولائی 1996ء میں جرمن سفارت کار نورٹ ہال کو افغانستان میں اقوامِ متحدہ کا سفیر مقرر کیا گیا۔

<u>امریکا کی افغانستان میں دوبارہ دلچسپی:</u> امریکا گزشتہ چار سال سے افغانستان کے مسائل سے تقریباً لاتعلق تھا۔ کیونکہ وہاں جاری خانہ جنگی کے بعد اسے شیروں کی کچھار سے کوئی خدشہ نہیں رہا تھا مگر 4 اپریل 1994ء کو جب قندھار میں علماء و عمائد افغانستان ملا محمد کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے، امریکا میں افغانستان کی صورتِ حال پر بڑی سرگرمی سے غور و خوض ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یکدم امریکا کی توجہ اس تباہ حال ملک پر مرکوز ہو گئی ہو۔

صرف چھ دن بعد 10 اپریل 1996ء کو اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کا اجلاس طلب کر لیا گیا۔ کونسل کے ارکان چھ سال بعد پہلی بار مسئلہ افغانستان پر سر جوڑ کر بیٹھے۔ اجلاس کا ایجنڈا یہ تھا کہ افغانستان میں قیام امن کے لیے وہاں بین الاقوامی مغربی امداد پر پابندی عائد کی جائے۔ جنوبی ایشیا کے لیے امریکی نمائندہ مسز رابن رافیل یہ چاہتی تھیں اس پابندی کا سہارا لے کر افغانستان کے تمام ہمسایہ ممالک کو وہاں مداخلت سے باز رکھنے پر مجبور کر دیا جائے۔ اس کے فوراً بعد 19 اپریل کو مسز رابن رافیل پہلے افغانستان اور پھر وسط ایشیائی ممالک کے تین دارالحکومتوں کا طوفانی دورہ کرتی نظر آتی ہیں اور کئی افغان لیڈر واشنگٹن میں دکھائی دیتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر امریکا کو یکدم افغانستان میں قیام امن سے اتنی دلچسپی کیوں کر پیدا ہو گئی؟ اس کی وجہ جاننے کے لیے ہمیں ذرا گہرائی میں جانا ہوگا۔

<u>تیل کا سمندر اور افغانستان:</u> امریکا اور یورپی ممالک کو اپنی صنعتی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے چند عشروں کے اندر اندر توانائی کے نئے ذخائر کی ضرورت تھی۔ ادھر سوویت یونین سے آزادی حاصل کرنے کے بعد آزاد مسلم ریاستوں ازبکستان، قازقستان اور ترکمانستان کے معدنی ذخائر کے بارے میں تازہ ترین تہلکہ خیز رپورٹوں نے مغرب کی آنکھیں چکا چوند کر دی تھیں۔ رپورٹوں کے مطابق ان ممالک میں

زیرزمین تیل کے بڑے بڑے سمندر اور گیس کے عظیم ذخائر محفوظ تھے۔قازقستان میں 85 بلین بیرل، ترکمانستان میں 32 بلین بیرل جبکہ ازبکستان میں ایک بلین بیرل تیل موجود تھا۔اس کے علاوہ ترکمانستان میں 159 ٹریلین کیوبک فٹ، ازبکستان میں 110 ٹریلین کیوبک فٹ اور قازقستان میں 88 ٹریلین کیوبک فٹ گیس مدفون تھی۔وسطی ایشیائی ریاستیں اپنی غربت کی وجہ سے خود یہ دولت استعمال اور برآمد کرنے سے قاصر تھیں لہٰذا اسے فروخت کر کے اپنے مالی کمزوریوں پر قابو پانا چاہتی تھیں۔1994ء میں ارجنٹائن کی تیل کمپنی بریداس نے جسے ترکمانستان میں تیل اور گیس کی تلاش کی اجازت حاصل تھی، منصوبہ بنایا کہ ایک 1200 میل طویل پائپ لائن ڈالی جائے جو افغانستان اور پاکستان کے راستے بحر ہند تک پہنچے جس سے مغربی ممالک کو گیس فراہم ہوگی۔اس کے بعد 1995ء میں امریکی تیل کمپنی ''یونوکال'' نے بھی ایسا ہی ایک منصوبہ پیش کیا جسے امریکی حکومت کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔

امریکا نہیں چاہتا تھا کہ ارجنٹائن کی کمپنی اس کام میں سبقت لے جائے۔وہ یونوکال کے لیے راستہ صاف کرنے کا خواہش مند تھا مگر سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ پائپ لائن کے مجوزہ تمام راستوں میں سے مختصر ترین راستہ جو افغانستان سے گزرتا تھا، خانہ جنگی کے باعث محفوظ نہ تھا۔یہی وجہ تھی کہ 1995ء میں امریکی حکومت افغانستان میں قیامِ امن کے لیے کسی قدر فکرمند ہوگئی تھی۔مگر امریکا یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ قیامِ امن کی صورت میں وہاں کوئی اسلام پسند حکومت قائم ہو۔وہ جانتا تھا کہ اس کے مفادات بے دین عناصر پر مشتمل ایک کٹھ پتلی حکومت کے برسرِاقتدار آنے ہی سے پورے ہوسکتے تھے۔انہی دنوں طالبان کا ظہور ہوا جو پکے بنیاد پرست تھے۔امریکا یقیناً ان پر احمد شاہ مسعود، ربانی اور دوسرے دھڑوں کو ترجیح دیتا تھا مگر 1995ء میں افغانستان کے نصف رقبے پر طالبان کے قبضے نے امریکا کو یہ سوچنے پر مجبور ضرور کر دیا کہ کہیں مستقبل قریب میں اسے بادل نخواستہ ایسا کوئی معاہدہ طالبان سے کرنے پر مجبور نہ ہونا پڑے۔یہ احتمال امریکا کے لیے پریشانی کا باعث تھا۔وہ ایسا سنہرا موقع بنیاد پرست طالبان کو نہیں دینا چاہتا تھا جن کے ہاں اصولوں پر لچک کا دور دور تک کوئی نام نشان نہیں تھا۔

اب جب 1996ء میں ملا محمد عمر شورائی طریقے کے مطابق امیر المؤمنین بنے تو امریکا پر یہ مزید واضح ہوگیا کہ طالبان کو مروجہ سیاست کے جھمیلوں میں اُلجھا کر مفادات کا غلام بنانا اور ان سے مطلب برآری کی امید رکھنا بہت مشکل ہے۔چنانچہ اس نے فوری طور پر دوسرے دھڑوں کو غالب کرنے اور تیل کی دولت ہتھیانے کے لیے انہیں استعمال کرنے کا فیصلہ کرلیا۔اس فیصلے کے ساتھ ہی افغانستان میں قیامِ امن کے نام پر امریکی نمائندوں کو متحرک کر دیا گیا۔سلامتی کونسل کا اجلاس بھی اسی سلسلے میں تھا اور اس کے

فوراً بعد رابن رافیل کا کابل، تاشقند اور اشک آباد کا دورہ بھی اسی مقصد کے لیے تھا۔ یاد رہے کہ اس موقع پر رابن رافیل نے کابل میں یہ معنی خیز بیان دیا تھا کہ اگر افغانستان کو سیاسی استحکام حاصل نہ ہوا تو اس ملک کی اقتصادی بحالی کے امکانات معدوم ہو جائیں گے۔ رابل رافیل کا مدعا یہ تھا کہ قیام امن اور سیاسی استحکام کے بعد ہی پائپ لائن منصوبے کا آغاز ہو سکے گا جس سے افغانستان کو اپنی تعمیر نو کے لیے خطیر رقم میسر آئے گی۔ اگر اس نے یہ موقع کھو دیا تو پائپ لائن متبادل راستے سے گزاری جائے گی اور افغانستان کی اقتصادی بحالی اور تعمیر نو کے امکانات ختم ہو جائیں گے۔ امریکا چاہتا تھا کہ اس سفارت کاری کے ذریعے ایک طرف تو افغان متحارب دھڑوں کو متفق کر کے افغانستان میں متبادل حکومت قائم کی جائے اور دوسری طرف وسط ایشیا کی ریاستوں کو اپنی تیل کمپنیوں "یونوکال" اور اس متبادل حکومت افغانستان سے معاہدے پر تیار کیا جائے۔ رابن رافیل نے اس دورے میں خود طالبان سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ دوسرے امریکی سفیر جو اس موقع پر افغانستان آئے تھے، انہوں نے بھی قندھار سے زیادہ کابل پر توجہ دی حالانکہ انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ پہلے طالبان کو اعتماد میں لیا جاتا کیونکہ پائپ لائن کا اکثر مجوزہ راستہ انہی کے علاقوں سے گزرتا تھا۔ امریکی نمایندوں کا کابل انتظامیہ اور دیگر دھڑوں کو طالبان پر ترجیح دینا واضح کرتا ہے کہ امریکا شروع سے طالبان کو اپنا حریف اور ان کے مخالفین کو قابل اعتماد دوست تصور کرتا تھا۔

چین اور امریکا طالبان کے مخالف اتحاد بنانے میں کوشاں: ادھر قندھار میں ملا محمد عمر کی امارت کا اعلان ہوا اور ادھر چین نے جو طالبان کے اسلامی انقلاب سے شدید خطرہ محسوس کر رہا تھا، افغانستان اور وسط ایشیا میں اسلامی تحریکوں کے غلبے کا راستہ روکنے کے لیے اپریل 1996ء میں "شنگھائی 5" کے نام سے ایک اتحادی قائم کر لیا جس میں رُوس، تاجکستان اور وسط ایشیا کے دیگر ممالک شامل ہو گئے۔ امریکا پہلے ہی طالبان مخالفین کو گلے لگانے پر آمادہ تھا۔ اس نے طالبان کے سوا تمام گروہوں کے سربراہوں سے گفت وشنید شروع کر دی۔ کئی لیڈروں نے خود واشنگٹن جا کر امریکی قیادت سے سازباز کی۔ ملا محمد عمر کے امیر المؤمنین بننے کے صرف ایک ہفتے بعد 11 اپریل 1996ء کو رشید دوستم واشنگٹن میں امریکی افسران سے ملاقات کرتا نظر آتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے افغان لیڈروں یا ان کے سفیروں نے 25 جون کو امریکی ارکان کانگریس سے ملاقاتیں کیں۔ اس گٹھ جوڑ کے نتیجے میں 26 جون کو ایک بار پھر کابل میں نیا حکومتی ڈھانچا وجود میں آیا۔ اس بار بھی برہان الدین ربانی صدر اور حکمت یار وزیر اعظم تھے۔ البتہ نئی بات یہ تھی کہ حکمت یار 15 برس میں پہلی بار کابل میں داخل ہوئے اور ان کے 9 رفقائے کار ربانی کی کابینہ میں شامل ہو گئے۔ عوام کو شک تھا کہ یہ نئی حکومت خفیہ طور پر

امریکا کی پروردہ ہے۔اس کامیابی کے فوراً بعد صدر ربانی نے جلال آباد جا کر وہاں کی شوریٰ کو بھی کابل حکومت میں شمولیت کی دعوت دی جو قبول کر لی گئی۔

طالبان کی یلغار کے نئے زاویے: یہ اگست 1996ء کے ایام تھے۔طالبان کے دارالحکومت قندھار میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ملا محمد عمر اور ان کے رفقاء طویل مشوروں میں مصروف تھے۔طالبان کے لیے اب آگے بڑھنا ناگزیر تھا۔ان کی یلغار جسے سیلاب سے تشبیہ دی جاتی تھی تقریباً ایک سال سے رکی ہوئی تھی۔ستمبر 1995ء میں ہرات پر قبضے کے بعد سے ان کے قدم زمین میں گڑ گئے تھے۔جو مبصرین سال گزشتہ کابل کو طالبان کے لیے تر نوالہ قرار دیتے تھے،اب برملا کہتے تھے کہ طالبان تحریک اپنی طبعی وسعت کی حد تک پھیل چکی ہے۔یہ پختونوں کی تحریک ہے جسے مزید فتوحات حاصل نہیں ہوں گی۔اس وقت کابل انتظامیہ سے حزبِ اسلامی، دوستم کی جنبش ملی اور حزبِ وحدت کے اشتراک کے بعد گویا طالبان کے تمام مخالف ایک صف میں تھے اور مشترکہ خطرے سے مدافعت کے لیے یک جان ہو چکے تھے۔دوستم نے جو 11/اپریل کو واشنگٹن میں امریکی افسران سے ملا تھا،اس مہینے (اگست 1996ء میں) کابل کے شمال میں شاہراہ سالانگ کو کھول دیا تھا اور یوں مدتوں بعد کابل کا شمالی افغانستان سے زمینی راستہ بحال ہو گیا تھا۔طالبان یہ سب کچھ نہ صرف دیکھ رہے تھے بلکہ کابل پر آخری ضرب لگانے میں مزید تاخیر نہ کرنے کا بھی فیصلہ کر چکے تھے۔

مآخذ و مراجع

...... حسبِ سابق

بتیسواں باب

فتح کابل اور سانحہ مزار شریف

جلال آباد مسخر ہو گیا: اگست 1996ء کے آخری عشرے میں طالبان کی افواج جلال آباد کی طرف بڑھنے لگیں۔ جلال آباد کی شوریٰ کے سربراہ حاجی عبدالقدیر کو قطعاً توقع نہیں تھی کہ طالبان کابل کی بجائے جلال آباد کو زیادہ اہمیت دیں گے۔ مگر طالبان کے سربراہ ملا محمد عمر کی عسکری منصوبہ بندی یہی تھی کہ پہلے جلال آباد پر قبضہ کیا جائے اور اس کے بعد کابل پر کئی اطراف سے یلغار کی جائے۔

10 ستمبر 1996ء کو طالبان ننگر ہار کے دو اضلاع پر قابض ہو چکے تھے۔ حاجی عبدالقدیر نے طالبان سے مقابلہ ناممکن خیال کرتے ہوئے راہ فرار اختیار کی اور پاکستان میں پناہ لے لی۔ تاہم اس کے نائب، گورنر محمود نے طالبان سے شدید جنگ جاری رہی۔ طالبان کے حوصلے بلند تھے۔ انہیں مقامی عوام کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اس لیے وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ 11 ستمبر کو وہ جلال آباد کے باہر کھڑے تھے، گورنر محمود نے شکست سامنے دیکھی تو جان بچانے کی خاطر پاکستان جانے والی شاہراہ پر بھاگ نکلا مگر طالبان نے تعاقب کر کے اسے اس کے چھ محافظوں سمیت قتل کر دیا۔ غروب آفتاب سے پہلے طالبان کے فاتح دستے ملا بورجان کی زیر قیادت جلال آباد میں داخل ہو رہے تھے۔ ناقابل تسخیر جلال آباد طالبان کے سامنے سرنگوں ہو چکا تھا۔

جلال آباد میں طالبان پہلی بار عرب مجاہدین کے عالمی شہرت یافتہ لیڈر شیخ اسامہ بن لادن سے ملے۔ اسامہ بن لادن کچھ دنوں پہلے ہی صومالیہ سے افغانستان پہنچ کر جلال آباد میں قیام پذیر تھے۔ ان کے اس سے پہلے طالبان سے کوئی روابط نہیں تھے۔ جلال آباد کی فتح کے بعد طالبان نے ان کا بھرپور اعزاز و اکرام کیا اور انہیں ہر قسم کے مطلوبہ تعاون اور تحفظ کا یقین دلایا۔ شیخ اسامہ بھی طالبان سے بے حد متاثر ہوئے اور ان کے بارے میں ان کے سابقہ خدشات دور ہو گئے۔

ننگر ہار اور کنڑ کی فتح: طالبان نے کابل کی طرف بڑھنے سے پہلے ایک بار پھر گرد و پیش پر گرفت

مضبوط کرنا ضروری سمجھا۔ تین مشرقی صوبے ننگرہار، کنڑ اور پغمان اب تک ان کی عملداری سے باہر تھے۔ طالبان نے اس مہم میں زیادہ وقت صرف نہیں کیا۔ ایک ہفتے کے اندر یہ تینوں صوبے ان کے قبضے میں آگئے۔ کنڑ میں علمائے اہل حدیث کی سرکردگی میں قائم اسلامی حکومت جس کے بانی مولانا جمیل الرحمن کو کچھ مدت قبل پراسرار انداز میں شہید کر دیا گیا تھا، طالبان کی آمد پر تحلیل ہوگئی اور کنڑ طالبان کی عملداری میں شامل ہوگیا۔ غرض کنڑ، ننگرہار اور پغمان کے عوام کی حمایت کے باعث طالبان بہت جلد ان علاقوں کی مہم سے فارغ ہوگئے۔

سروبی کی طرف: اب ان کا یقینی ہدف کابل تھا۔ فلک بوس پہاڑوں میں گھرا ہوا افغان حکمرانوں کا یہ دارالحکومت ہمیشہ فاتحین کی اولوالعزمی کا امتحان لیتا آیا ہے۔ اب یہی امتحان طالبان کو درپیش تھا جو ہر قیمت اسے فتح کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ 24 ستمبر 1996ء کو طالبان ''سروبی'' کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پہاڑوں کی آغوش میں واقع یہ شہر کابل کی تحصیل ہے۔ یہ دفاعی اعتبار سے اتنا محفوظ ہے کہ یہاں عموماً ہوائی حملے بھی ناکام رہتے ہیں۔ اگر طالبان جلال آباد پر قابض نہ ہو چکے ہوتے تو سروبی پر حملہ کرنا تقریباً ناممکن تھا مگر اب طالبان جلال آباد سے سروبی پر عقب سے حملہ کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود یہ مہم نہایت خطرناک تھی۔ سروبی کی بل کھاتی شاہراہ جو دونوں طرف سے پہاڑی دیواروں میں گھری ہوئی ہے کسی بھی حملہ آور کا حوصلہ توڑنے کے لیے کافی ہے۔ اس شاہراہ پر بڑی سے بڑی فوج کو چند سو مورچہ زن افراد کی مدد سے پسپا کیا جا سکتا ہے۔ حزبِ اسلامی نے گزشتہ سال چہار آسیاب سے پسپائی کے بعد اپنی تمام طاقت اور اسلحہ سروبی میں جمع کر لیا تھا۔ یہاں اس کی پوزیشن بے حد مضبوط تھی۔ پھر سروبی سے لے کر پل چرخی تک تمام مورچے اور چوکیاں حزبِ اسلامی کے اس مرکز کو مزید تحفظ فراہم کرتی تھیں۔ اس لیے کسی کو توقع نہیں تھی کہ طالبان آسانی سے سروبی کی دفاعی لائن عبور کر سکیں گے۔

طالبان سربراہ کی حکمت عملی: مگر طالبان سربراہ ملا محمد عمر کی جنگی حکمت عملی حیران کن تھی۔ وہ وائرلیس پر مسلسل اپنی افواج کو ہدایات دے رہے تھے۔ 24 ستمبر کو جب طالبان سروبی کے لیے پابہ رکاب ہوئے تو افواج کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ ایک طرف سے ہرات کے گورنر ملا عبدالرزاق اپنی فوج کے ساتھ پیش قدمی کر رہے تھے جس کے ہراول دستے کی کمان نامور طالبان کمانڈر ملا بورجان کے ہاتھ میں تھی اور دوسری سمت سے، ملا فضل بڑھے چلے آرہے تھے۔ اُدھر حزب اسلامی کے جنگجو سروبی کے دفاع کے لیے پوری طرح کمربستہ تھے۔

ملا بورجان کی شہادت: ملا بورجان جب، ہراول دستے کے ساتھ سروبی کی سرنگ نما شاہراہ کے دہانے

میں داخل ہوئے تو ہر طرف سے گولوں، بموں اور گولیوں کی بارش شروع ہوگئی۔ حریف بلندی پر تھا اور طالبان نشیب میں کھلی سڑک پر...... جہاں چھپ کر مورچہ زن ہونا ناممکن تھا مگر ملا بور جان نے طالبان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے پیش قدمی جاری رکھی۔ پر پیچ پہاڑی شاہراہ کے ایک موڑ پر ملا بور جان جو سب سے آگے جارہے تھے جوابی حملے کی زد میں آکر شدید زخمی ہوگئے۔ اس حالت میں بھی انہوں نے طالبان سے کہا: ''میری پروانہ کریں...... آگے بڑھتے جائیں۔''

چند لمحوں بعد ملا بور جان نے دم توڑ دیا۔ ملا عبدالرزاق فوراً وہاں پہنچے، نعش کو کپڑے سے ڈھانکا اور شاہراہ کے کنارے ڈال دیا۔ بعد میں یہی جگہ ان کا مقبرہ بن گئی۔ اس مقام کو ''ریشمین مکئے'' کہا جاتا ہے۔

34 سالہ ملا بور جان طالبان کے نہایت مقبول، تجربہ کار اور ہر دلعزیز کمانڈر تھے۔ ان کی قیادت میں طالبان نے بڑے بڑے معرکوں میں شاندار فتوحات حاصل کی تھیں۔ وہ سترہ سال کی عمر میں جہاد افغانستان میں شریک ہوئے تھے۔ اس کے بعد ان کی تمام زندگی معرکوں میں گزر گئی۔ ان کی شہادت کی خبر کو چھپا لیا گیا کیوں کہ اس سے حریف کی ہمت بلند ہوجاتی جبکہ طالبان بد دل ہوسکتے تھے۔

سروبی کی اس تنگ اور پُر پیچ گھاٹی میں جان کی قربانی دے کر ملا بور جان نے فتح کابل کی بنیاد رکھ دی۔ ان کی کمان میں پیش قدمی کرنے والے طالبان اپنے قائد کے نقش قدم پر دوڑتے رہے، گرتی لاشوں اور زخمیوں کی پروا کیے بغیر وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ طالبان کی اس محیر العقول بے جگری نے حریف پر حد درجے دہشت طاری کردی۔ اس دوران حزبِ اسلامی کے کمانڈروں کو یہ بھی معلوم ہوچکا تھا کہ ملا فضل کی قیادت میں ایک اور لشکر بھی سروبی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ حزب کے کمانڈروں کو خطرہ محسوس ہوا کہ اگر طالبان اس طرح آگے بڑھتے رہے تو کچھ دیر بعد ان کے لیے کوئی جائے فرار نہیں رہے گی۔ اس صورتِ حال میں کئی کمانڈروں نے ہتھیار ڈال دیے اور طالبان سے جاملے جبکہ بقیہ فوری طور پر میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

<u>سروبی فتح ہوگیا:</u> اس شام دنیا بھر کے نشریاتی ادارے خبریں نشر کر رہے تھے کہ طالبان سروبی پر قبضہ کر چکے ہیں اور حزبِ اسلامی کی فوجیں پسپا ہوکر کابل کی طرف چلی گئی ہیں۔ گزشتہ سال جب حزب اسلامی نے اسی طرح طالبان کے مقابلے میں اپنے مضبوط مراکز لوگر اور چہار آسیاب کو خالی کردیا تھا تو تب اس پسپائی کی کچھ توجیہات قابلِ فہم تھیں مثلاً حزبِ اسلامی نے اس طرح اپنی طاقت کو سروبی میں مجتمع اور محفوظ کرلیا ہے مگر سروبی سے حزبِ اسلامی کی پسپائی کو شکستِ فاش کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس شکست کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حزبِ اسلامی کے کئی کمانڈر طالبان سے جاملے تھے۔ جس کے باعث

باقی کمانڈروں کے لیے دیر تک لڑنا ممکن نہیں رہا تھا۔

25 ستمبر 1996ء کو جب ملا عبدالرزاق اور ملا فضل اپنی افواج کے ساتھ دوطرفہ یلغار کرتے ہوئے سروبی میں جمع ہوئے تو یہ علاقہ حزبِ اسلامی کے جنگجوؤں سے خالی ہو چکا تھا۔ اب طالبان کمانڈروں کی نگاہیں کابل پر مرکوز تھیں جو سروبی سے صرف 45 میل دور تھا۔ طالبان نے کابل کی دہلیز عبور کر لی تھی۔ اب وہ کئی اطراف سے دارالحکومت پر بھرپور حملہ کر سکتے تھے۔ ربانی انتظامیہ حوصلہ ہار چکی تھی، احمد شاہ مسعود کی عسکری مہارت دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ آخری اُمید کے طور پر اس نے شمالی افغانستان کے آمر رشید دوستم سے رابطہ کر کے کمک طلب کی۔ رشید دوستم نے مسعود کو مشورہ دیا: ''آپ سرِ دست کابل کو خالی کر دیں۔ میں بعد میں آپ کے شانہ بشانہ لڑوں گا...... لیکن اگر آپ نے کابل میں ڈٹے رہنے کا فیصلہ کیا تو میں کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔''

ربانی انتظامیہ کا اجلاس، انخلا کا فیصلہ: اسی دن 25 ستمبر کو صدر ربانی کی صدارت میں اعلیٰ سطحی اجلاس منعقد ہوا۔ وزیر اعظم حکمت یار سمیت بڑے بڑے طالبان مخالف لیڈر سر جوڑ کر بیٹھے مگر انہیں دارالحکومت کو بچانے کی کوئی صورت سمجھ نہیں آرہی تھی۔ لگتا تھا کھیل کی تمام گوٹیاں طالبان کے پاس ہیں۔ آخر کار فیصلہ ہوا کہ فوری طور پر کابل کو خالی کر دیا جائے، افواج اور گولہ بارود کے ذخائر محفوظ علاقوں میں منتقل کر دیے جائیں، بعد میں طالبان کو جنگ یا مذاکرات کے ذریعے رام کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ربانی اور مسعود کا کابل سے فرار: کابل انتظامیہ طالبان سے اس حد تک مرعوب ہو چکی تھی کہ اس نے شہر کا دفاع کرنے کا خیال بالکل ترک کر دیا اور فیصلے کے فوراً بعد اپنی افواج، خزانہ اور اسلحے کے ذخائر شمالی علاقوں کی طرف منتقل کرنا شروع کر دیے۔ 25 ستمبر کی شام کو یہ کارروائی شروع ہوئی اور نہ صرف رات بھر بلکہ اگلی صبح سے دوپہر تک پوری سرعت سے جاری رہی۔ احمد شاہ مسعود نے فوجیوں کے چھوٹے چھوٹے دستے مختلف مقامات پر صرف اس لیے تعینات کر دیے تھے تاکہ وہ طالبان کی ناقابلِ مزاحمت یلغار کی رفتار سست کرنے کی کوشش کریں اور اس دوران انخلاء کا عمل مکمل ہو جائے۔

سروبی سے پل چرخی تک: ادھر طالبان سروبی میں دم لینے کے بجائے نہایت برق رفتاری سے کابل کے لیے پیش قدمی شروع کر چکے تھے۔ مشرق سے آنے والی افواج ایک بار پھر ملا فضل اور ملا عبدالرزاق کی کمان میں، دو حصوں میں تقسیم ہو کر الگ الگ راستوں سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ سروبی کی فتح کے بعد کابل کا مشرق بالکل کھلا تھا۔ اس لیے اب آگے بڑھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ طالبان کی فوج کا ایک حصہ سروبی سے شمال میں بگرام ایئرپورٹ کی طرف بڑھتا جا رہا تھا تاکہ حریف کو فضائی قوت سے محروم کر دے۔ ایک اور

فوج جنوب سے کابل پر حملہ آور تھی مگر یہاں راستہ مختصر ہونے کے باوجود آگے بڑھنا خاصا مشکل تھا کیونکہ بہترین دفاعی مورچے حریف کے پاس تھے اور جگہ جگہ بارودی سرنگوں کے جال بچھے تھے۔ ملا فضل اور ملا عبدالرزاق کی افواج الگ الگ راستوں سے ہوتے ہوئے دوپہر تک پل چرخی پہنچ کر باہم مل گئیں۔ ملا محمد عمر وائرلیس پر پل پل کی خبریں لے رہے تھے اور براہ راست ہدایات دے رہے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ اصل حملہ پل چرخی کی طرف سے ہو جبکہ بقیہ اطراف سے صرف دباؤ بڑھانے کے لیے حملے کیے جائیں۔

ربانی کا جھوٹا بیان: ملا عبدالرزاق پل چرخی سے طالبان کی قیادت کرتے ہوئے آگے بڑھے تو ایک ساتھی نے کہا: ''کیوں نہ فیصلہ کن حملہ رات کو کیا جائے؟ تاریخ بتاتی ہے کہ کابل کو دن کے اُجالے میں فتح کرنا بے حد مشکل ہے۔''

مگر حوصلہ مند کمانڈر نے اسے اطمینان دلایا کہ اللہ کی مدد و نصرت سے سب کچھ دن کی روشنی میں ہو جائے گا۔

جب کابل کا ایوانِ صدر چار پانچ کلومیٹر دور رہ گیا تو ملا عبدالرزاق نے ریڈیو آن کر کے بی بی سی سروس سننا شروع کی۔ صدر ربانی اور وزیر اعظم حکمت یار انٹرویو دے رہے تھے کہ ہم کابل میں موجود ہیں اور خون کے آخری قطرے تک کابل کا دفاع کریں گے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ دونوں لیڈر کب کے دارالحکومت سے فرار ہو چکے تھے۔

طالبان کابل میں: لشکرِ طالبان جو ملا عبدالرزاق کے بارہ تیرہ سو افراد پر مشتمل تھا، دن کے تقریباً ایک بجے فاتحانہ انداز میں، کئی اطراف سے کابل میں داخل ہوا۔ شہر میں کسی قسم کی مزاحمت کے کوئی آثار نہیں تھے۔ احمد شاہ مسعود کے متعین کردہ مختصر دستے گولہ بارود کے بچے کھچے ذخائر تباہ کرنے کے بعد شمال کی طرف فرار ہو چکے تھے۔ یہ 26 ستمبر 1996ء کا واقعہ ہے۔ طالبان کی اس شاندار فتح کے بارے میں لندن کے ''ٹیلی گراف'' اخبار کے نمائندے احمد رشید لکھتے ہیں: ''طالبان کی فتح ہر اعتبار سے مکمل تھی۔ حکومت یا اپوزیشن میں سے کسی نے اتنے بڑے عرصہ جنگ میں، اس سرعتِ رفتار سے اتنی پیچیدہ نوعیت کی جنگی چالیں کبھی نہیں چلی تھیں۔''

نجیب پر راہِ فرار مسدود: طالبان کے کئی جوشیلے نوجوان قندھار سے عہد کر کے چلے تھے کہ وہ کابل میں داخل ہوتے ہی ہزاروں افغان مسلمانوں کے قاتل سابق صدر نجیب کو تلاش کریں گے اور اگر وہ مل گیا تو اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ 1992ء سے نجیب اللہ کابل میں اقوام متحدہ کی عمارت میں مقیم تھا۔ طالبان کے کابل میں داخلے کے وقت بھی وہ وہیں تھا۔ یہ بظاہر بڑی عجیب بات تھی کیونکہ اس کے پاس فرار ہونے کا خاصا وقت تھا۔ وہ احمد شاہ مسعود اور ربانی کی طرح آرام سے کسی محفوظ جگہ پہنچ سکتا تھا۔ مگر اللہ کی لاٹھی

بے آواز ہے۔ قدرت کی گرفت سے کسی کو راہِ فرار نہیں مل سکتی۔ نجیب اللہ کے فرار کے انتظامات مکمل تھے۔ سروبی پر طالبان کا قبضہ ہوتے ہی نجیب نے اسلام آباد میں اقوام متحدہ کے مرکزی دفتر فون کر کے اقوام متحدہ کے نمایندے ''فورٹ ہال'' سے اپیل کی تھی کہ اسے، اس کے بھائی شاہ پور احمد اور سیکرٹری کو کابل سے باہر لے جانے کا انتظام کر دیا جائے۔ اس اپیل کے جواب میں طالبان کے کابل میں داخلے سے چند گھنٹے پہلے اقوام متحدہ کے نمائندے بن سیوان نے نجیب کو بحفاظت شہر سے لے جانے کی تیاریاں کر لی تھیں مگر نا معلوم وجوہ کی بنا پر آخری لمحات تک نجیب کو لینے کوئی گاڑی اور سیکیورٹی نہ پہنچ سکی۔ اس موقع پر احمد شاہ مسعود نے نجیب کو پیش کش کی کہ وہ اس کے تاجک سپاہیوں کے ساتھ شہر سے نکل چلے مگر نجیب کو جو نسلاً پختون تھا، تاجکوں کے ساتھ جانا خطرناک لگا۔ اسے انجانے خدشات نے گھیر لیا۔ درحقیقت خدائی ارادہ اور قسمت کا فیصلہ اس کے قدموں کی زنجیر بن گیا تھا، اس نے تاجکوں کے ساتھ نکلنے سے انکار کر دیا۔ تاجکوں سے زیادہ اسے ان تین محافظوں پر بھروسہ تھا جو اقوام متحدہ نے اس کے لیے مقرر کر رکھے تھے۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ طالبان شہر میں داخل ہو گئے۔ فائرنگ کی آواز سن کر تینوں محافظ نجیب کو وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ چند منٹ بعد طالبان کا ایک کمانڈر 35 افراد کے ساتھ اقوامِ متحدہ کے دفتر کے باہر پہنچ گیا۔ یہ طالبان کا پہلا دستہ تھا جو کابل میں داخل ہوا تھا۔

نجیب کا عبرتناک انجام: کمانڈر نے افسر اعلیٰ ملا عبدالرزاق سے وائرلیس پر بات کی اور نجیب کو تلاش کرنے کی اجازت مانگی۔ اجازت ملنے پر وہ دفتر میں داخل ہو گیا جہاں 50 سالہ نجیب تھر تھر کانپ رہا تھا۔ کمانڈر نے ملا عبدالرزاق کو نجیب کی موجودگی کی اطلاع دے کر پوچھا کہ اب کیا حکم ہے؟ جواب ملا:

''قتل کر دیا جائے۔''

آناً فاناً چند طالبان اندر گھسے اور نجیب کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئے۔ یہاں اسے لاتیں اور گھونسے مارنے کے بعد گولیوں سے بھون دیا گیا۔ کمانڈر نے ملا عبدالرزاق سے دوبارہ رابطہ کر کے لاش کو عبرت کے لیے سرعام لٹکانے کی اجازت مانگی۔ اثبات میں جواب ملنے پر نجیب کا لاشہ قریبی چوراہے ''آریانہ چوک'' پر ٹریفک کنٹرول کے کھمبے سے لٹکا دیا گیا۔ اس کے بھائی کا بھی یہی انجام ہوا۔ دونوں کی لاشیں لٹکانے کے بعد ان کی جیبوں میں افغان نوٹ بھر دیے گئے۔ یہ وہی نوٹ تھے جن کے لیے ان ملت فروشوں نے افغان قوم کو ان کے مذہب سے برگشتہ کرنے اور سوویت یونین کا غلام بنانے کی پوری کوشش کی تھی۔ ہزاروں مردوں، عورتوں اور بچوں کو بے رحمی سے تڑپا تڑپا کر مارنے والا ''خاد'' کا سربراہ آج اپنے عبرتناک انجام کو پہنچ چکا تھا۔ طالبان دن کے ڈیڑھ بجے اقوام متحدہ کے دفتر پہنچے تھے۔ آدھے گھنٹے کے

اندروہ نجیب اللہ کو چوک پر لٹکا چکے تھے۔ 2 بجے ملا عبدالرزاق نے طالبان سربراہ کو وائرلیس پر فتح کابل کی خوشخبری دی۔ ملا محمد عمر نے جواباً کہا: ''آپ سب کو مبارک ہو کہ اتنا عظیم کارنامہ انجام دیا۔''

کابل میں اسلام نافذ، مکمل امن وامان، عام معافی: کابل کی فتح کے فوراً بعد طالبان نے یہاں خالص اسلامی احکام کا نفاذ کر دیا۔ شرعی حدود وقصاص کے قوانین لاگو کر دیے گئے۔ ٹی وی اسٹیشن بند کر دیا گیا۔ ''ریڈیو کابل'' کو ''ریڈیو صدائے شریعت'' کا نام دے کر موسیقی اور بے مقصد پروگراموں کو ختم کر دیا گیا۔ جسم فروشی، سینما، ڈش انٹینا، عورتوں کے بے پردہ گھومنے، گانے بجانے، رقص وسرود اور اخلاق باختگی کا محرک بننے والے تمام عوامل پر پابندی لگا دی گئی۔

کابل کی فتح بلاشبہ ایک مثالی فتح تھی۔ اتنے بڑے معرکے میں خون ریزی برائے نام ہی ہوئی۔ طالبان کے صرف 15، 16 جوان کام آئے جبکہ حریف افواج فرار ہو گئی تھیں۔ طالبان نے شہر میں داخل ہونے کے بعد بھرے پُرے بازاروں کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ کسی دکان یا ریڑھی سے ایک دانہ تک نہیں لوٹا۔ نجیب کو اسلام دشمنی اور مسلمانوں کا بے دریغ خون بہانے کی جو ماورائے عدالت سزا ملی، سو ملی، مگر اس کے علاوہ طالبان نے کسی شہری کو زدوکوب تک نہ کیا۔ کسی عورت کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔ حالانکہ سپاہی فتوحات کا جشن عموماً اس طرح منایا کرتے ہیں کہ چند دنوں تک مفتوحین کی عزت وآبرو اور جان ومال کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ خود طالبان کے مخالفین کا اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی یہی وطیرہ رہا مگر طالبان کی فتح مکمل طور پر پُرامن تھی۔ طالبان سربراہ نے اعلان کر دیا کہ کابل کے تمام باشندوں کو، چاہے ان کا ماضی کیسا ہی ہو، عام معافی دی جاتی ہے۔ اس اعلان نے عوام کو بالکل مطمئن کر دیا اور 24 گھنٹے کے اندر اندر کابل کی تمام رونقیں لوٹ آئیں۔

اغیار کی گواہی: مغربی میڈیا کے نمائندے ان دنوں بڑی تعداد میں کابل پہنچ چکے تھے۔ وہاں مقامی لوگوں کا اطمینان وسکون دیکھ کر انہیں حیرت کے ساتھ ساتھ مایوسی بھی ہوئی۔ وہ طالبان کے مظالم کے فرضی افسانے گھڑنے وہاں آئے تھے مگر ایسا کوئی ثبوت ان کے ہاتھ نہ لگ سکا۔ نامور برطانوی مصنفہ ''پیٹر مارسڈن'' نے اس زمانے میں افغانستان کا دورہ کیا اور پھر اپنی مشہور کتاب ''TALBAN'' (طالبان) تحریر کی۔ اس کتاب میں طالبان پر ناروا الزامات عائد کرنے کے باوجود وہ تسلیم کرتی ہیں کہ طالبان امن وسلامتی کی علامت بن گئے تھے۔ وہ کابل کی فتح کے بارے میں تحریر کرتی ہیں:

''اس مرحلے پر کابل کے لوگ دارالحکومت کے محاصرے کے مزید طویل ہونے سے ہراساں تھے۔ بہت سے لوگ اپنی ضرورت کی بنیادی اشیاء بھی فروخت کر چکے تھے اور انتہائی غربت کی

حدود کے قریب پہنچ چکے تھے۔اس لیے جب طالبان وہاں پہنچے تو لوگوں کو کافی سکون ملا اور اُمید پیدا ہوئی کہ امن بحال ہوگا اور مقامی معیشت کی بہتری کے امکانات پیدا ہوں گے۔ یہ بھی یاد رہے کہ لوگوں کے درمیان پائے جانے والے اس خیال سے ربانی اور مسعود بھی آگاہ تھے اور شاید کابل کے آخری انچ تک نہ لڑنے کے فیصلے میں یہی ایک عنصر کارفرما تھا۔'' (یعنی انہیں عوامی حمایت سے محرومی نے انخلا پر مجبور کر دیا تھا۔)

طالبان کی شرافت کا اعتراف کرتے ہوئے پیٹر مارسڈن نے لکھا ہے:

''یہ حقیقت ہے کہ طالبان کسی علاقے پر قابض ہونے کی صورت میں لوٹ مار، زنا بالجبر یا بلا جواز تباہی نہیں کرتے تھے۔''

مغربی میڈیا کا شرمناک کردار: مگر اکثر مغربی نامہ نگاروں کو سچ کہنے کی ہمت نہ ہوسکی۔ان میں سے اکثر طالبان کے بارے میں حتی الامکان جھوٹی باتیں پھیلاتے رہے اور جن کا ضمیر اس پر آمادہ نہ ہوا وہ بھی حقائق واضح کرنے کی بجائے چپ چاپ واپس چلے گئے۔ پاکستانی صحافی اور پندرہ روزہ ''جہاد کشمیر'' کے نامہ نگار حسن احمد ان دنوں کابل میں گئے تھے، وہ لکھتے ہیں:

''کابل میں عام لوگوں میں طالبان کے بارے میں اطمینان پایا جاتا ہے سوائے چند اقدامات کے جن میں نجیب اللہ کو گولی مارنا اور اس کی لاش کی بے حرمتی کرنا بھی شامل تھا۔(چونکہ کابل کے باشندوں کی خاصی تعداد کمیونسٹوں پر مشتمل تھی اس لیے وہ لوگ طالبان کی اس حرکت سے ناراض تھے۔ یہی ردِعمل پاکستان سمیت دنیا بھر کے کمیونسٹوں اور ماڈرن مسلمانوں کا تھا) مگر مغربی صحافی حقیقت کے بالکل برعکس رپورٹنگ کرتے ہیں۔ مجھے حیرانی ہوتی ہے کہ اتنے جدید دور میں اتنی صفائی سے کیسے جھوٹ بولا جاسکتا ہے؟ مغربی صحافی کہہ رہے تھے لوگوں کو مارا جارہا ہے۔ خواتین کو گھسیٹا جارہا ہے...... مگر مجھے اس کے شواہد نہیں ملے۔انہوں نے طالبان کے وزراء کی پریس کانفرنسوں میں بھی ایسے سوالات کیے جن کی تردید ہوئی مگر مغربی پریس والوں کا رویہ معاندانہ ہی نہیں جانبدارانہ بھی ہے۔ایک انگریز صحافی ''مسٹر ایلکس'' میرے ساتھ جرمن کلب میں مقیم تھا۔ وہ میرے ساتھ مارا مارا پھرتا رہا۔ پریس کانفرنسوں میں بھی ساتھ گیا۔لوگوں نے اسے کہا کہ کابل میں امن ہے اور ہم امن چاہتے ہیں۔ خواتین پر پابندیوں پر بھی عوام میں کوئی احتجاج نظر نہ آیا۔ تو ایلکس نے مایوس ہو کر مجھ سے کہا: ''اب تم ہی بتاؤ میں کیا رپورٹ کروں؟ اس میں میرے لیے کیا ہے؟'' میں نے کہا: ''تم صحافی ہو۔تم نے جو سنا اور دیکھا ہے، وہ رپورٹ

کرو۔ صحافتی دیانت داری کا تقاضا تو یہی ہے۔'' اس پر وہ بولا: ''نہیں بھائی! میں یہاں اس لیے نہیں آیا تھا۔ میں تو اس لیے آیا تھا کہ لوگوں سے معلوم کروں کہ وہ طالبان سے کتنی نفرت کرتے ہیں؟ طالبان بنیاد پرست اور انتہا پسند ہیں اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ اگر یہ نہیں تو پھر (میرے پاس لکھنے کو) کچھ نہیں۔''

قارئین! اس ایک مثال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ طالبان کے بارے میں مغربی میڈیا شروع سے کس قدر متعصبانہ رپورٹنگ کر رہا تھا۔

دارالحکومت قندھار ہی رہا: کابل کا انتظام سنبھالنے کے لیے ایک چھ رکنی شوریٰ قائم کر دی گئی۔ اس کے سربراہ ملا محمد ربانی تھے جن کا مرتبہ وزیر اعظم کا سا تھا۔ ملا غوث وزیر خارجہ اور ملا امیر خان متقی وزیر اطلاعات مقرر ہوئے۔ عام خیال یہ تھا کہ فتح کابل پر طالبان اور طالبان سربراہ ملا محمد عمر تاریخی جشن مسرت منائیں گے مگر طالبان سربراہ کا تبصرہ صرف اتنا تھا: ''کابل بھی دیگر صوبوں کی طرح ایک صوبہ ہے، باقی صوبوں کی طرح وہاں بھی شریعت نافذ کریں گے۔''

یہی جذبہ تھا جس کی بنا پر کابل فتح ہونے کے 24 گھنٹے کے اندر اندر وہاں اسلامی نظام نافذ ہو گیا۔

کابل فتح ہو گیا مگر قندھار کے بوریہ نشین حکمران نے وہاں کا دورہ نہ کیا۔ دارالحکومت بدستور قندھار ہی رہا حالانکہ مبصرین گمان کر رہے تھے کہ ملا محمد عمر فوراً بڑے طمطراق سے افغانوں کے روایتی دارالحکومت کو اپنا مرکز بنائیں گے۔ کئی دنوں بعد رفقاء نے درخواست کی: ''کابل کو آ کر دیکھیں تو سہی...... کیسا شہر ہے جہاں سالہا سال اقتدار کی جنگ ہوتی رہی۔'' مگر اس کے باوجود طالبان سربراہ کابل کا دورہ کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ہاں کچھ دنوں بعد جب کابل پر احمد شاہ مسعود نے حملہ کیا تب وہ اپنے رفقاء کے کہنے پر اگلے مورچوں کے مجاہدین کی ہمت بڑھانے کے لیے پہلی بار کابل گئے اور محاذ پر کچھ وقت گزار کر سیدھا قندھار واپس ہو گئے۔ ساتھیوں کی فرمائش کے باوجود انہوں نے کابل شہر اور قصرِ صدارت وغیرہ کی سیر کرنا گوارا نہ کیا۔

رشید دوستم سے پالا: کابل پر قبضے کے بعد ایک ہفتے کے اندر اندر طالبان کی افواج شمال مشرق کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے جبل السراج تک پہنچ گئی تھیں جبکہ احمد شاہ مسعود شاہراہ سالانگ تک پیچھے ہٹتے ہٹتے وادی پنج شیر میں داخل ہو گیا تھا۔ طالبان اس کے تعاقب میں رہے مگر وہ وادی پنج شیر میں داخل نہ ہو سکے۔ جب وہ سالانگ شاہراہ کے گرد و نواح میں مختلف دیہاتوں پر قبضہ کرتے ہوئے درّۂ سالانگ تک پہنچے تو درّے پر قابض رشید دوستم کی افواج نے ان کا راستہ روک لیا۔ اس وقت تک یہ واضح

نہیں تھا کہ رشید دوستم اب کس کا ساتھ دے گا۔ طالبان رہنما ملا محمد ربانی نے دوستم کو غیر جانبدار بنانے کے لیے 8/اکتوبر کو اس سے گفت وشنید کی جو ناکام رہی۔ دراصل دوستم شمال کی بے تاج بادشاہت کا دعوے دار تھا اور یہ حیثیت طالبان کے لیے قابلِ قبول نہ تھی۔

دوستم اور احمد شاہ مسعود کا مشترکہ حملہ: جب دوستم کو یقین ہو گیا کہ طالبان سے اسے اپنے اغراض حاصل نہیں ہوں گی تو اس نے احمد شاہ مسعود اور ربانی سے اتحاد برقرار رکھنے کو ترجیح دی۔ 10/اکتوبر کو اس نے اہم ایک اجلاس میں شرکت کی جس میں احمد شاہ مسعود، برہان الدین ربانی اور کریم خلیلی موجود تھے۔ فیصلہ کیا گیا کہ طالبان سے مزاحمت کے لیے سب مل کر لڑیں گے۔ اس مقصد کے لیے ایک ''سپریم کونسل'' قائم کر دی گئی اور طالبان مخالف قوتیں ایک بار پھر شانہ بشانہ کھڑی ہو گئیں۔ عسکری قیادت اب بھی احمد شاہ مسعود کے ہاتھ میں تھی جو پنج شیر کی فلک بوس چوٹیوں سے طالبان کو کابل اور درۂ سالانگ کے درمیان تیزی سے پھیلتا دیکھ رہا تھا۔

مسعود نے ان کی یہ کمزوری فوراً نوٹ کی کہ اگرچہ طالبان اس طرح زیادہ سے زیادہ رقبے پر قابض ہو رہے ہیں مگر ساتھ ساتھ ان کی قوت بکھرتی جا رہی ہے اور ان کا کوئی مورچہ زیادہ مضبوط نہیں رہا ہے۔ مسعود کے پاس پندرہ بیس ہزار تجربہ کار جنگجو تھے۔ ان کی مدد سے اس نے 12/اکتوبر 1996ء کو سالانگ شاہراہ کے ساتھ ساتھ طالبان کے دفاعی خطوط پر ایک بھرپور حملہ کیا۔ طالبان اس کی تاب نہ لا سکے اور درجنوں لاشیں چھوڑ کر پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ مسعودی ملیشیا نے آگے بڑھتے بڑھتے 18/اکتوبر کو بگرام ایئرپورٹ پر دوبارہ قابض ہو کر کابل پر اندھا دھند بمباری شروع کر دی۔ احمد شاہ مسعود کی توپیں بگرام ایئرپورٹ سے کابل ایئرپورٹ کو نشانہ بنا رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ وہ زمینی پیش قدمی کر کے طالبان کو مسلسل پیچھے ہٹنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ آخر کار طالبان کابل شہر کے شمال میں واقع پہاڑوں پر آ گئے۔ یہاں انہوں نے مضبوط مورچہ بندی کر لی۔ انہیں پورا پورا اندازہ تھا کہ اگر وہ یہاں سے پیچھے ہٹے تو کابل کو احمد شاہ مسعود کے قبضے میں جانے سے نہیں بچایا جا سکتا۔ اس لیے کہ ان پہاڑوں کے بعد کابل تک کوئی قدرتی دفاعی آڑ موجود نہیں تھی۔

کابل کے دفاع کی جنگ: کابل کے شمال میں نومبر اور دسمبر کی سردی ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ سائبیریا سے چلنے والی برف ریز ہوائیں جب پامیر کی چوٹیوں سے بل کھاتی ہوئی ہندوکش کے دامن میں آتی ہیں تو رگوں میں لہو جمنے لگتا ہے۔ مگر اس موسم میں بھی کابل کا یہ خونی معرکہ پوری شدت سے لڑا جاتا رہا۔ مسعودی افواج کا دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ ہر وقت کابل کے سرنگوں ہونے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ اس

دوران کابل اور گردونواح میں چھپے سینکڑوں افراد نے طالبان کے خلاف بغاوت بھی کی مگر طالبان نے یہ کوشش ناکام بنادی۔

ان دنوں دوستم کی فضائی بمباری اور مسعود کی توپوں کی گولہ باری کے باعث ہزاروں شہری کابل سے بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔ کابل کے دفاع کو محفوظ بنانے کے لیے سرحد پار سے سینکڑوں پُرجوش نوجوان بھی طالبان سے آملے مگران میں تجربہ کار افراد کم تھے۔

مولانا حقانی کی امدادی فوج کی آمد: طالبان کو اصل تقویت اس وقت ملی جب خوست سے مولانا جلال الدین حقانی کے چنیدہ مجاہدین کے دستے کابل پہنچے۔ یہ پینتیس سے پچاس سال تک کی عمر کے جہاں دیدہ سپاہیوں کی جماعت تھی جو روس کے خلاف جہاد میں شریک رہی تھی۔ ان کے پاس پرانی وضع کی تھری ناٹ تھری رائفلیں تھیں۔ وہ شاہراہ پر مارچ کرتے ہوئے سیدھا طالبان کے مورچوں تک آئے اور حملہ آوروں کے خلاف منہ توڑ کارروائی شروع کردی۔ تین ماہ تک جاری یہ خونریز لڑائی جنوری 1997ء کے اواخر میں اس طرح ختم ہوئی کہ میدان مکمل طور پر طالبان کے ہاتھ میں تھا۔ وہ شاہراہ سالانگ کے گردونواح اور بگرام ایرپورٹ سمیت اس تمام علاقے پر دوبارہ قابض ہوگئے جو احمد شاہ مسعود نے لڑائی کے آغاز میں ان سے چھینا تھا۔

ہرات کے دفاع کا معرکہ: اس معرکے کے دنوں میں مغربی افغانستان میں بھی ایک ہولناک جنگ لڑی گئی۔ کابل کی فتح کے فوراً بعد ایران نے اپنے مہرے اسماعیل خان تورون کو دوہزار جنگجوؤں اور اسلحے کے بے پناہ ذخائر کے ساتھ مغربی صوبے ''بادغیس'' پہنچادیا تھا کہ وہ ہرات پر قبضہ کرلے۔ طالبان نومبر اور دسمبر 1996ء میں کابل کے ساتھ ساتھ ہرات اور اپنے دیگر مغربی صوبوں کا دفاع بھی کرتے رہے۔ بادغیس کی سرحدیں دوماہ تک میدان جنگ بنی رہیں۔ افغانستان کا سابق کمیونسٹ حکمران ببرک کارمل اسی ماہ دسمبر میں بحالت جلاوطنی ماسکو میں راہی عدم ہوا۔ بہرحال! موسم سرما گزرتے گزرتے مخالفین کا دم خم جواب دے گیا اور انہیں یقین ہوگیا کہ طالبان ایک ایسی چٹان ہیں جسے پاش پاش کرنا آسان نہیں۔

معرکہ کابل جو ستمبر 1996ء میں شروع ہوا تھا، صحیح معنوں میں جنوری 1997ء میں اس وقت اختتام پذیر ہوا جب پنج شیری اور جوزجانی ملیشیائیں کابل پر دوبارہ قبضے سے مایوس ہوکر اپنے آبائی علاقوں کی طرف پسپا ہوگئیں۔ طالبان جو ستمبر 1996ء میں پندرہ صوبوں کے حاکم تھے، اب 22 صوبوں میں اسلامی احکام نافذ کرچکے تھے۔

پاکستان میں سیاسی تبدیلی: ادھر نومبر 1996ء میں پاکستان کے صدر فاروق لغاری نے بے نظیر بھٹو کی

حکومت توڑ دی تھی اور 1997ء میں پاکستان میں از سرِ نو انتخابات ہوئے جن میں ایک بار پھر مسلم لیگ کے قائد میاں نواز شریف بھاری اکثریت سے کامیاب ہو کر ملک کے وزیر اعظم بن گئے تھے۔ بے نظیر حکومت نے بھی طالبان سے اچھے روابط رکھے تھے مگر نواز شریف سے طالبان کو نسبتاً زیادہ بہتر توقعات تھیں۔

طالبان سے مسلم دنیا کی بے اعتنائی: بلاشبہ طالبان اب اس کے اہل تھے کہ اقوام متحدہ اور عالمی برادری انہیں افغانستان کا جائز حکمران تسلیم کر لیتی مگر یہودی میڈیا کے سحر میں گرفتار دنیا طالبان کی فتوحات کو تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ صرف پاکستان، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات نے فتح کابل کے بعد طالبان حکومت کو تسلیم کیا تھا، تین سال بعد شیشانی مجاہدین کی حکومت نے بھی طالبان سے برادرانہ تعلقات قائم کر لیے تھے، مگر اقوام متحدہ اور اس کی تقلید میں اکثر مسلم ممالک طالبان حکومت کو ماننے اور اس سے سفارتی تعلقات استوار کرنے میں پس و پیش سے کام لیتے رہے۔ افغانستان کے ہمسایہ ممالک روس، ترکمانستان، تاجکستان اور ازبکستان کا رویہ تو معاندانہ تھا۔ فتح کابل کے فوراً بعد وہ طالبان حکومت کو دھمکیاں دینے لگے تھے کہ وہ شمالی افغانستان کی طرف مزید نہ بڑھیں ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ سرعام طالبان مخالف قوتوں کو عسکری و مالی امداد فراہم کرنے کا اعلان کر رہے تھے اور دنیا اس ''دخل در معقولات'' پر خاموش تھی۔

رابن رافیل کو منہ توڑ جواب: 27 جنوری 1997ء کو جنوبی ایشیائی امور کی امریکی عہدیدار رابن رافیل نے ایک بار پھر طالبان حکومت کو ناقابل تسلیم قرار دیتے ہوئے کہا کہ افغانستان میں کوئی قانونی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے ہم طالبان حکومت کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ اس موقف کے جواب میں 23 مئی کو طالبان کے وزیر ملا امیر خان متقی نے کابل میں اقوام متحدہ کے سفیر سے دو بدو گفت و شنید کی اور کہا کہ اقوام متحدہ کے قوانین کے مطابق چار قسم کی حکومتیں قابل قبول ہیں:

① انقلابی
② شورائی
③ جمہوری
④ ہر وہ حکومت جسے 60 فیصد عوام کی حمایت حاصل ہو۔

طالبان چاروں لحاظ سے قابل تسلیم حکومت ہیں کیونکہ

1. یہ ایسی انقلابی حکومت ہے جو نہایت مختصر مدت میں ملک میں انقلاب لائی ہے۔
2. یہ ایسی شورائی حکومت ہے جس میں ہر صوبے اور علاقے کے علماء اور کمانڈروں کو شامل کیا گیا ہے۔

۳ یہ جمہوری حکومت بھی ہے کیونکہ اسے مقبوضہ صوبوں کے عوام کا مکمل اعتماد حاصل ہے۔

۴ 60 فیصد کی جگہ 80 فیصد عوام طالبان کے حامی ہیں۔

ملا متقی کے ان زبردست دلائل کے سامنے اقوام متحدہ کے سفیر کو کوئی جواب نہ سوجھ سکا۔

1997ء کے اوائل کے کچھ اہم واقعات: اس سے پہلے کہ ہم طالبان دورِ حکومت کے سب سے بڑے سانحے کا تفصیلی جائزہ لینے کے لیے اپنی سوچ کو یکسو کریں، مناسب ہوگا کہ اس سال کے شروع کے چند اہم واقعات کا سرسری جائزہ لے لیں جن سے اندازہ ہوگا کہ ان دنوں حالات کا رُخ کیا تھا؟

- فروری کے مہینے میں کنڑ میں کچھ مخالف عناصر نے طالبان کے خلاف بغاوت برپا کرنے کی کوشش کی جو ناکام ہوئی۔
- اس دوران احمد شاہ مسعود اور حزب اسلامی میں ایک بار پھر چپقلش شروع ہو گئی۔ یکم مارچ کو حزب اسلامی کے ترجمان نے الزام لگایا کہ احمد شاہ مسعود نے حکمت یار کو قتل کرنے کی سازش کی ہے۔ احمد شاہ مسعود کی جانب سے الزام کی تردید کی گئی۔
- مارچ میں طالبان نے کابل یونیورسٹی کھول دی۔ وہاں تعلیمی سرگرمیاں زور و شور سے شروع ہو گئیں جس سے یہ پروپیگنڈا غلط ثابت ہو گیا کہ طالبان عصری تعلیمی اداروں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔
- مارچ کے دوران اسلام آباد میں او آئی سی کا اجلاس ہوا جس میں طالبان کو بطور مندوب شرکت کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ طالبان کے نمائندے اس میں مہمان کے طور پر شریک ہوئے۔ چوں کہ اقوام متحدہ نے ابھی تک طالبان کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس لیے او آئی سی میں بھی افغانستان کی نشست پر طالبان کی بجائے صدر ربانی ہی کے نمائندے براجمان تھے۔
- مئی میں جلال آباد کے سابق گورنر حاجی عبدالقدیر کو حکومت پاکستان نے ملک سے بے دخل کر دیا۔
- عرب نژاد مجاہد شیخ اسامہ جو افغان مجاہدین کی باہمی جنگوں کے دوران افغانستان سے سوڈان چلے گئے تھے، چند ماہ قبل دوبارہ افغانستان آ گئے تھے۔ وہ صومالیہ میں امریکی فوج کے خلاف کارروائیوں میں مزاحمت کاروں کو مدد دینے کے الزام میں امریکا کو مطلوب تھے۔ خود سعودی حکومت کے نزدیک بھی وہ قابل عتاب تھے۔
- مئی کے مہینے میں میڈیا نے بعض ایسی رپورٹوں کی تشہیر کی جن میں کہا گیا تھا کہ طالبان شیخ اسامہ کو سعودی حکومت کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ طالبان ذرائع نے ان میڈیا رپورٹوں کی تردید کی۔
- مئی کے مہینے میں جلال آباد کا بڑا اسلحہ ڈپو ایک دھماکے سے تباہ ہو گیا۔ 50 افراد جاں بحق اور 300

زخمی ہو گئے۔

- 12 مئی کو کوئٹہ میں 60 ہزار افغان مہاجرین نے ایک اجتماع میں ملا محمد عمر کی غائبانہ بیعت کی۔
- انہی دنوں اسامہ بن لادن کا یہ بیان منظر عام پر آیا کہ امریکا ہیروئن کے عالمی کاروبار پر قبضہ کرنے کی تگ ودو میں ہے۔
- بی بی سی کے نمائندے رحیم اللہ یوسف زئی نے طالبان سربراہ سے ملاقات کے بعد ان کی ترغیب پر ڈاڑھی رکھ لی۔
- مئی کے مہینے میں درّہ سالانگ پر طالبان اور دوستم ملیشیا کے درمیان جھڑپیں جاری تھیں اور دوستم کی فوج کو پسپائی ہو رہی تھی۔ یہ تھیں 1997ء کے ابتدائی ساڑھے چار ماہ کی چند جھلکیاں......

آیئے! اب دل تھام کر سانحہ مزار شریف کا ذکر کرتے ہیں۔

طالبان کے خلاف خفیہ سازش کا تانا بانا: طالبان کا افغانستان کے اتنے بڑے رقبے پر چودہ صدیاں قبل والا خالص اسلام نافذ کر دینا اسلام دشمن طاقتوں کو کسی طرح ہضم نہیں ہو سکتا تھا اس لیے موسم بہار میں وہ شمالی افغانستان میں سازشوں کا ایک نیا جال بُننے لگیں۔ یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ طالبان کو صرف طاقت سے شکست نہیں دی جا سکتی اس لیے اب طاقت سے زیادہ دھوکے اور مکاری سے کام لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس نئے کھیل کا سب سے بڑا پشت پناہ ایران تھا۔ اس کا بنیادی مہرا جنرل رشید دوستم کا دست راست جنرل عبدالمالک تھا۔ جنرل عبدالمالک کا آبائی علاقہ شبرغان تھا۔ اس کے بھائی گل محمد عرف گلو پہلوان اور رؤف پہلوان بھی فاریاب کے اہم کمانڈر شمار ہوتے تھے۔ کچھ عرصے ان کا تعلق جمعیت اسلامی سے رہا۔ 1992ء میں نجیب انتظامیہ کے خاتمے کے بعد عبدالمالک نے دوستم کے ساتھ مل کر ''جنبش ملی اسلامی'' کی داغ بیل ڈالی اس طرح یہ کمانڈر مجاہدین کی حکومت سے الگ ایک آزاد طاقت بن گئے جس کا سربراہ دوستم تھا جبکہ عبدالمالک خارجہ امور کا ذمہ دار تھا۔ جب طالبان کو عروج ملا تو ان دنوں دوستم اور عبدالمالک کے باہمی اعتماد میں دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جون 1996ء میں ایک قاتلانہ حملے میں عبدالمالک کا بھائی رؤف پہلوان اپنے 15 محافظوں سمیت مارا گیا۔ عبدالمالک نے اس کا الزام دوستم پر لگایا۔ اس دن کے بعد دونوں میں کشیدگی بڑھتی چلی گئی۔ 1997ء کے موسم گرما میں عبدالمالک نے اچانک دوستم کا ساتھ چھوڑ کر طالبان کی طرف دستِ تعاون بڑھا دیا۔ 19 مئی 1997ء کو اس نے دوستم سے علیحدگی کا اعلان کیا اور طالبان سے مدد مانگی۔ تین بڑے ازبک کمانڈر جنرل روزی، جنرل غفار اور اس کا بھائی گل محمد اس کے ہم نوا تھے۔

مزار شریف: فتح کابل کے بعد شمالی افغانستان خصوصاً اس کا سب سے بڑا شہر مزار شریف طالبان کی نظروں میں تھا۔ یہ شہر بلخ کے جنوب مشرق میں متبادل شہر کی حیثیت سے گزشتہ صدی عیسوی میں ابھرا ہے۔ پہلے بلخ قدیم شاہراہ ریشم پر تجارتی قافلوں کی آماجگاہ تھا۔ مگر مزار شریف کی رونقوں نے بلخ کو اس طرح دھندلا دیا ہے کہ وہ ایک پسماندہ قصبہ بن کر رہ گیا ہے۔ مزار شریف کی وجہ تسمیہ، وجہ شہرت اور وجہ آبادی وہ مزار ہے جو شہر کے وسط میں بڑی آن بان سے قائم ہے۔ مزار کے قدیم مجاوروں نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ یہاں حضرت علی ؓ مدفون ہیں۔ حالانکہ اس بات کا بے حقیقت ہونا سب کو معلوم ہے مگر افغانستان کے حکمران اور امراء محض اپنی "خوش عقیدگی" ظاہر کرنے کے لیے اس مزار کی آرائش میں دل کھول کر حصہ لیتے رہے۔ کمیونسٹ نظریات رکھنے والے جنرل دوستم نے بھی اس مزار پر سونے کی تختیوں پر کلمہ طیبہ لکھوا کر اپنے "حامی دین مبین" ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔

اس مزار کی وجہ سے یہاں ازبکوں اور تاجکوں کے علاوہ بڑی تعداد میں ہزارہ شیعہ بھی آباد چلے آرہے ہیں۔ یہ شہر پاکستان، ایران، افغانستان اور وسط ایشیا کے لیے تجارت اور اسمگلنگ کا مرکز ہے اور اسی تجارت کے محاصل یہاں کے کمانڈروں کا بڑا ذریعہ آمدن ہیں۔ دوستم نے ان دنوں یہاں بلخ ایر لائنز کا آغاز بھی کر دیا تھا۔

طالبان اور جنرل عبدالمالک کے مذاکرات: طالبان موسم بہار میں شمالی افغانستان پر فیصلہ کن حملے کے لیے تیار تھے۔ مئی میں خوست کے بڑے اسلحہ ڈپو سے 36 ہزار توپ کے گولے شمالی محاذ پر پہنچا دیے گئے۔ ان تیاریوں کو دیکھ کر ایرانی حکومت شور مچا رہی تھی کہ اقوام متحدہ مداخلت کر کے طالبان کو شمالی افغانستان پر حملے سے باز رکھے۔ ادھر جنرل عبدالمالک نے دوستم سے علیحدگی کا اعلان کر کے طالبان کو شمالی افغانستان پر بھرپور چڑھائی کا بہترین موقع فراہم کر دیا تھا۔ ملا عمر کے نمائندے ملا عبدالرزاق نے فوری طور پر بادغیس پہنچ کر "درۂ بغباز" میں عبدالمالک سے ملاقات کی۔ عبدالمالک نے کہا کہ وہ اسلام کے نفاذ میں مخلص ہے اور چاہتا ہے کہ دوستم جیسے کمیونسٹ سے اہل وطن کو نجات ملے اور ایک مستحکم مرکزی حکومت قائم ہو جائے۔ اس گفت وشنید کے بعد فوری طور پر فاریاب، شبرغان اور پھر مزار شریف پر حملے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ ہر صوبے کے انتظام کے لیے چھ رکنی کونسل اور حفاظت کے لیے دو دو سو افراد بھی تیار کر لیے گئے۔ عبدالمالک کے ساتھ خاصی عجلت میں ایک معاہدہ بھی طے کر لیا گیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ طالبان قیادت کا وفادار رہے گا اور طالبان اسے کوئی بڑا عہدہ دیں گے۔ عبدالمالک نے طالبان کو یقین دلایا کہ وہ مزار شریف تک آسانی سے یلغار کر سکتے ہیں۔ تاہم اس نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ کہیں دوستم

اپنے حامی پڑوسی ملک ازبکستان سے فوج لے کر نہ آ جائے۔ ملا عبدالرزاق نے عبدالمالک کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں، طالبان نے چند سو افراد کے ساتھ ہی کابل فتح کیا تھا۔

مزار شریف پر دوطرفہ یلغار: طالبان قیادت نے آناً فاناً نقشہ جنگ ترتیب دیا۔ 20 مئی کو دو اطراف سے طالبان کے لشکروں نے شمال کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ ایک لشکر ہرات سے نکل کر فاریاب، سرپل اور شبرغان کو فتح کرتے ہوئے مغرب سے مزار شریف کا محاصرہ کرنے جا رہا تھا جبکہ دوسرے لشکر کو جو کہ کابل سے روانہ ہوا تھا، بغلان اور بامیان پر قبضہ کرتے ہوئے مزار شریف پہنچنے کا ہدف دیا گیا تھا۔

فاریاب فتح، اسماعیل توروِن گرفتار: ہرات سے یلغار کرنے والا لشکر پے در پے میدان مارتا چلا گیا۔ 21 مئی کو فاریاب پر حملہ ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے شہر فتح ہو گیا۔ 100 کمیونسٹ جنرل اور 1000 سپاہی گرفتار ہوئے۔ ہرات کا مفرور سابق حاکم اسماعیل خان توروِن ان دنوں حکومتِ ایران کے ایماء پر شمالی افغانستان کا دورہ کر کے سازشوں کے جال بُن رہا تھا۔ جب طالبان نے فاریاب پر حملہ کیا تو وہ وہیں تھا۔ اسے بھاگنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ طالبان کے سپہ سالار عبدالرزاق نے اسے گرفتار کر کے قندھار جیل بھیج دیا۔ وہاں ایک انٹرویو میں اس نے اعتراف کیا کہ شمالی افغانستان میں بدامنی اور سازشوں کا ذمہ دار ایران ہے۔ اس نے الزام لگایا کہ اس کی وہ تمام دولت بھی ایران نے ضبط کر لی ہے جو وہ ہرات سے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ فاریاب اور سرپل پر قبضے کے ساتھ ہی کابل سے روانہ ہونے والا لشکر بغلان میں داخل ہو گیا تھا اور ''درۂ شبر'' کے دہانے تک پہنچ کر بامیان کے اہم دفاعی نقاط پر قبضہ کر چکا تھا۔

دوستم جلاوطن: جنرل دوستم طالبان کی یلغار سے گھبرا کر ازبکستان فرار ہو گیا۔ سرحد عبور کر کے ''ترمذ'' پہنچنے کے لیے اسے خود اپنے ہی سپاہیوں کو ڈالروں کی رشوت دینا پڑی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ جنگجو سردار اب ہمیشہ کے لیے افغانستان کی سیاست سے خارج ہو گیا ہے۔ جنرل دوستم 1955ء میں شبرغان کے ایک مضافاتی دیہات میں پیدا ہوا تھا۔ ایک غریب گھرانے کا یہ فرد 1978ء تک کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ کمیونسٹ انقلاب کے بعد وہ فوج میں شامل ہوا۔ ایک مدت تک وہ دریائے آمو کی بندرگاہ حیرتان پر مامور اس حفاظتی دستے میں شامل رہا جو سوویت یونین سے افغانستان بھیجے جانے والے سامان کی بحفاظت ترسیل کا ذمہ دار تھا۔ بعد میں وہ ترقی کر کے اس دستے کا افسر بن گیا۔

1989ء میں روسی فوج کے انخلاء کے بعد دوستم شمال کا ایک بڑا کمانڈر بن کر ابھرا جو نیم خودمختار اور نجیب اللہ کا وفادار تھا۔ اس نے ازبکوں کی نہایت سخت کوش اور تشدد پسند ملیشیا ترتیب دی جسے ''جوزجانی ملیشیا'' کہا جاتا تھا۔ یہ فوج نجیب کے اشارے پر مجاہدین کے خلاف لڑتی رہی۔ مگر 1992ء میں

مجاہدین کو کابل پر حملے کے لیے تیار دیکھتے ہی اس نے نجیب سے علیحدگی اختیار کر لی اور مزار شریف کو مرکز بنا کر چھ صوبوں کا خود مختار حکمران بن بیٹھا۔

طالبان کے عروج کے ساتھ دوستم مزار شریف کی رونقوں کو بڑھاتا چلا گیا کیونکہ طالبان کے نظام سے برگشتہ سینکڑوں شرابی، اسمگلر، فاحشہ عورتیں، رقاصائیں، گلوکار، سازندے اور میراثی مزار شریف میں پناہ لے چکے تھے۔ دوستم نے ان کی خوب آؤ بھگت کی اور اپنی محفلوں کو مزید دو آتشہ کیا مگر اب دوستم جلاوطن ہو کر ازبکستان اور پھر ترکی میں پناہ لے رہا تھا جبکہ مزار شریف میں طالبان کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔

طالبان مزار شریف میں: 25 مئی کو طالبان فاتحانہ انداز میں کسی کشت و خون کے بغیر مزار شریف میں داخل ہو گئے۔ طالبان کی باقاعدہ فوج جو شہر پر قبضہ کرنے آئی تھی، بہت مختصر تھی۔ البتہ شمال کے سب سے بڑے شہر کی فتح میں شرکت کرنے اور وہاں اسلامی نظام کے نفاذ کا دلکش منظر دیکھنے کے لیے ہزاروں طلبہ، مجاہدین، علماء اور دین دار افراد طالبان کے ساتھ ساتھ مزار شریف پہنچنا شروع ہو گئے، ان میں خاصی تعداد پاکستانیوں کی بھی تھی۔ یہ لوگ اور خود طالبان کے باقاعدہ سپاہی بھی پہلی بار شمالی افغانستان آئے تھے۔ وہ اہلِ شمال کی طبیعت اور مزاج سے ناواقف تھے۔ انہیں شہر کے راستوں، اہم ناکوں اور دفاعی نقاط کا بھی علم نہیں تھا۔ دوست نما دشمن جنرل عبدالمالک نے بھی طالبان کو جان بوجھ کر اہم دفاعی خطوط سے آگاہ نہیں کیا تھا۔

طالبان کی بہت بڑی تعداد غیر مسلح تھی۔ جو مسلح تھے ان میں تجربہ کار افراد کم تھے۔ اکثر کم عمر نوجوان تھے۔ انہیں قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ کتنی بڑی تباہی ان کے سروں پر منڈلا رہی ہے؟

فاریاب کی طرح مزار شریف کی فتح کے فوراً بعد یہاں بھی شریعت کے نفاذ کا اعلان کر دیا گیا۔ شراب خانے، سینما اور ویڈیو سینٹرز بند کر دیے گئے۔ کمیونسٹ اور ماڈرن طبقے کی عورتیں جو سرِعام اپنے اعضاء کی نمائش کرتی پھرتی تھیں، پردے کی پابند کر دی گئیں۔ شہر کے تمام مسلح افراد سے اسلحہ جمع کیا جانے لگا۔

جنرل عبدالمالک کا فریب: ملا محمد عمر نے ملا عبدالرزاق کو مزار شریف اور شمال نو مفتوحہ صوبوں کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ جنرل عبدالمالک اب تک ملا عبدالرزاق کے ساتھ تھا۔ اس نے مزار شریف کی فتح پر معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے انہیں مبارکباد دی اور کہا: ''اب میں طالبان بن گیا ہوں۔''

ملا عبدالرزاق نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی نظر آ رہی ہے۔ پھر اس نے ملا عبدالرزاق سے فرمائش کی کہ اس کے لیے آریانہ ایرلائن کا طیارہ منگوایا جائے تاکہ وہ خود قندھار جا کر

طالبان سربراہ کو مبارکباد پیش کرے۔ ملا عبدالرزاق مان گئے اور قندہار سے ایک خصوصی طیارہ مزار شریف طلب کر لیا۔ جو طیارہ آیا اس میں طالبان کے مزید چند اہم عہدے دار ملا غوث اور مولوی احسان اللہ احسان بھی مزار شریف آ گئے۔ مگر اس کے بعد نا معلوم کیا ہوا؟ عبدالمالک قندھار جانے سے پس و پیش کرنے لگا۔ وہ کوئی معقول وجہ نہ بتا سکا بس اتنا کہا کہ چند خاص مہمان آ گئے ہیں اس لیے کچھ دنوں بعد ہی قندھار جاؤں گا۔

بغاوت کے شعلے: طالبان کے مزار شریف فتح کرنے کے تین دن بعد تک وہاں شرعی احکام نافذ کرنے اور افغانستان و پاکستان سے لوگوں کے جوق در جوق مزار شریف پہنچنے کی خبریں آتی رہیں مگر اس کے بعد 28 مئی 1997ء کی شام کو حالات اچانک تبدیل ہو گئے۔ اس رات بی بی سی نے خبر نشر کی کہ مزار شریف سے طالبان کو نکال دیا گیا ہے۔ اگلے دن تک افواہوں کی عجیب فضا قائم رہی۔ تاہم 29 مئی کی شام تک مزار شریف سے طالبان کے انخلاء کی تصدیق ہو گئی۔ ہوا یہ تھا کہ 28 مئی کو طالبان مزار شریف میں آباد ہزارہ قبیلے سے ہتھیار جمع کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے ایران کی تیار کردہ سازش کے مطابق ہتھیار دینے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ اسلحہ جمع کرنے کے لیے آنے والے طلبہ کی ٹولی پر حملہ کر دیا۔ جس سے تین طلبہ شہید ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی شہر میں جگہ جگہ ہزارہ جات، دوستم اور عبدالمالک کے آدمی مورچے بنا بنا کر طالبان پر گولیاں برسانے لگے۔

طالبان کی اکثریت شہر کے راستوں سے ناواقف تھی۔ وہ اس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ وہ سڑکوں سے گزرتے تو مکانات کی چھتوں اور کھڑکیوں سے ان پر گولیوں کی بارش ہونے لگتی۔ بہت سے طالبان اپنی پک اپ گاڑیاں بند گلیوں میں لے گئے اور نتیجتاً ہر طرف سے گھر گئے۔ ہزارہ جات کی عورتیں تک طالبان پر ان حملوں میں پورے جوش و خروش سے شامل تھیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے سینکڑوں ساتھی شہید ہو گئے۔

طالبان راہنماؤں کی گرفتاری: جنرل عبدالمالک اس دن بھی طالبان کمانڈروں کے ساتھ تھا۔ اس نے اپنے رویے سے ذرا بھی یہ اندازہ نہ ہونے دیا کہ اس کے کیا عزائم ہیں؟ اس دن جب ہزارہ جات نے اسلحہ دینے سے انکار کر کے طالبان پر حملہ کیا تو فوری طور پر ملا عبدالرزاق کو اطلاع دی گئی۔ اس وقت دن کے 12 بجے تھے۔ ملا عبدالرزاق نے وائرلیس پر یہ تشویش ناک خبر سن کر عبدالمالک کو اطلاع دی۔ اس نے بھی یوں ظاہر کیا جیسے اسے اس واقعے پر بڑی حیرت ہوئی ہو۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے ملا عبدالرزاق اور دوسرے طالبان کمانڈروں کو وائرلیسوں پر شہر کے مختلف حصوں سے اسی قسم کی اطلاعات

ملتی رہیں۔ شام کے چار بجے تک طالبان اور مزار شریف کے مسلح گروہوں میں جگہ جگہ باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی۔ ملا عبدالرزاق وائرلیس پر اس انتہائی گھمبیر صورتِ حال میں طالبان کی کمان کر رہے تھے۔ ان کا حکم تھا جہاں سے فائرنگ ہو طالبان وہاں منہ توڑ جواب دیں۔

شام کے سائے پھیلنے لگے تو عبدالمالک نے ملا عبدالرزاق سے کہا:

''جنبش ملی، حزبِ وحدت اور حزبِ اسلامی نے ہمارے خلاف مشترکہ محاذ بنالیا ہے۔ اب ہمیں باقاعدہ جنگ کرنا ہوگی۔''

یہ کہہ کر عبدالمالک انہیں نقشۂ جنگ اور دفاعی مورچے تیار کرنے کے بہانے اپنے ساتھ قلعہ جنگی لے گیا۔ وہاں ملا عبدالرزاق سے الگ ہو کر وہ وائرلیس پر جنبش ملی کے سپاہیوں کے حوصلے بڑھاتا رہا اور انہیں کہتا رہا کہ طالبان جہاں ملیں انہیں ختم کر ڈالو۔ ملا عبدالرزاق نے ساری رات بے چین اور اصل حالات سے بے خبری میں گزاری۔ صبح کے وقت جب کہ بغاوت کی کامیابی اور طالبان کی شکست واضح ہوگئی تھی، عبدالمالک کے افسران نے انہیں گرفتار کرلیا۔ پہلے انہیں شبرغان اور پھر فاریاب کے بستی فیض آباد کی جیل میں بھیج دیا گیا۔

ملا عبدالرزاق کے بعد طالبان کی عالی شوریٰ کے رکن ملا صادق، ایرفورس کے نگران کمانڈر جیلانی اور افغان فضائیہ کے سربراہ ملا اختر منصور بھی اسی جیل میں لائے گئے۔ ایک موقع پر احمد شاہ مسعود نے اپنے دست راست جنرل فہیم کو بھیج کر عبدالمالک سے ان طالبان راہنماؤں کا لاکھوں ڈالر میں سودا کرنے کی کوشش کی مگر عبدالمالک بڑے سیاسی مفادات اور سودے بازیوں کے لیے ان گرفتار شدہ راہنماؤں کو کارڈ کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے احمد شاہ مسعود کی پیش کش کو مسترد کردیا۔ طالبان کے ایک اور اہم راہنما وزیر خارجہ ملا غوث بھی گرفتار کرلیے گئے تھے جبکہ مرکزی بینک کے گورنر مولوی احسان اللہ احسان اور دس سے زائد بڑے بڑے عہدے دار اس قتل عام میں شہید کردیے گئے۔

<u>عبدالمالک شمال کا نیا حکمران:</u> 30 مئی تک یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ جنرل عبدالمالک نے طالبان کو فتح دلانے کے بہانے، شمالی افغانستان پر قبضے کا گھناؤنا منصوبہ بنایا تھا اور وہ اس میں کامیاب ہو چکا ہے۔ عبدالمالک کی افواج نے مزار شریف کے علاوہ تخار، فاریاب، شبرغان، جوزجان اور سرائے پل پر بھی آناً فاناً قبضہ کرلیا تھا۔ اب ان تمام علاقوں پر ان کے قابض ہوجانے کی وجہ سے طالبان کے لیے مغرب کی طرف راہِ فرار بالکل بند ہوگئی۔ وہ جگہ جگہ ان دشمنوں کے گھیرے میں آتے چلے گئے جو صرف پانچ دن پہلے دوستی کا نقاب اوڑھ کر انہیں اس جال میں لائے تھے۔

ہزاروں طالبان عبدالمالک اور اس کے اتحادی حزبِ وحدت کے ہزارہ جات کے ہاتھوں گرفتار ہوگئے۔ پاکستان سے مزار شریف جانے والے سینکڑوں افراد بھی شہید، گرفتار یا لاپتا ہوئے جن میں جامعہ بنوری ٹاؤن کے استادِ حدیث حضرت مولانا فضل محمد کے بھائی مولوی جان محمد بھی شامل تھے جو ایک صحافی کے طور پر وہاں گئے تھے۔

قتل عام کا یہ سلسلہ وقفے وقفے سے جاری رہا۔ اگست کے وسط میں شبرغان میں 28 طلبہ قیدیوں کو شہید کیا گیا جن میں جمعیت علمائے اسلام چمن کے امیر مولانا عبدالحمید بھی تھے۔

عبدالمالک کے جنگجوؤں کو پہلی بار اتنی مطلق العنانی حاصل ہوئی تھی۔ انہوں نے مزار شریف میں ناقابل بیان تباہی مچائی۔ جو ملا اسے لوٹ لیا۔ سرکاری گوداموں اور عمارتوں کا تمام ساز و سامان لپیٹ ڈالا۔ حد تو یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے دفاتر اور ایجنسیاں بھی ان کی لوٹ مار سے محفوظ نہ رہیں اور ان کا عملہ شہر سے نکل بھاگنے پر مجبور ہوگیا۔ جہاں تک گرفتار کیے جانے والے طالبان سے ان کے رویے کا تعلق ہے وہ اتنا بھیانک تھا کہ الفاظ اس کی پوری وضاحت سے قاصر ہیں۔ ہزاروں طالبان، حفاظ قرآن، قراء اور علمائے دین کو دشت لیلیٰ اور دوسرے بیابان علاقوں میں بڑی بڑی اجتماعی قبریں کھود کر زندہ دفن کر دیا گیا۔ یہ قبریں بعد میں دریافت ہوتی رہیں۔ طالبان نے اگلے برس مزار شریف فتح کر کے مدفون شہداء کی تعداد کا تخمینہ لگایا تو وہ آٹھ ہزار سے متجاوز تھے۔

طالبان قیادت کا غم: مزار شریف میں طالبان کے خلاف بغاوت، ان کا قتل عام اور گرفتاریاں...... یہ ایسی روح فرسا خبریں تھیں جن سے طالبان قیادت کو ناقابلِ برداشت صدمہ پہنچا۔ مجاہد کمانڈر اور علمائے کرام مبہوت رہ گئے۔ دینی مدارس میں سوگ کا سماں تھا۔ طالبان کے امیر ملا محمد عمر اس سانحے کی خبریں سن کر سراپا حزن و غم بن گئے۔ ان کے رفقاء بتاتے ہیں کہ تین دن تک ایک لقمہ ان کے حلق سے نیچے نہ اُتر سکا۔ وہ اس دکھ کے سبب بیمار پڑ گئے۔ ادھر احمد شاہ مسعود نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہوئے زبردست جنگی چالیں چلیں۔ اس نے فوراً اپنی افواج کو آگے بڑھا کر درّہ سالانگ کے جنوب میں جبل السراج تک کا علاقہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ یوں مزار شریف میں شکست کھانے والے ہزاروں طالبان کا اپنے مرکز سے زمینی رابطہ بالکل کٹ گیا۔ اس سے قبل ان کے مختلف گروہ قتلِ عام اور گرفتاری سے بچ بچا کر جنوب کی طرف بڑھتے آرہے تھے تاکہ شاہراہ سالانگ کے ذریعے کابل پہنچ جائیں۔ انہیں یہ بھی اُمید تھی کہ کابل سے طالبان کی تازہ دم افواج ان کی کمک کے لیے آجائیں گی۔ مگر مسعود کی جنگی چال نے یہ سب کچھ ناممکن بنا دیا۔ اس نے کابل کے اردگرد طوفانی حملے جاری رکھے اور

شمال مشرقی افغانستان کے کئی چھوٹے شہر اور عسکری لحاظ سے کئی اہم مورچے طالبان سے چھین لیے......ان علاقوں میں بھی سینکڑوں طالبان شہید اور گرفتار ہوئے۔

مختلف محاذوں سے طالبان کی پسپائی: ادھر طالبان کی وہ فوج بھی جو بامیان کو فتح کرنے کے لیے درۂ شبر تک پہنچ چکی تھی، مزار شریف کی شکست کے بعد پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئی۔ ہزارہ جات کے حوصلے بلند ہو گئے۔ وہ طالبان کا محاصرہ توڑ کر ارد گرد پھیل گئے۔ جلد ہی کریم خلیلی نے انہیں منظم کر کے جنوب کی طرف بڑھنا شروع کر دیا تا کہ کابل کا محاصرہ کر سکے۔ راستے میں وہ پشتونوں کے ہر دیہات کو اُجاڑتا اور آبادی کو تہ تیغ کرتا چلا آیا۔ ہزاروں دیہاتی اس کے خوف سے مشرقی علاقوں کی طرف بھاگ نکلے۔

نفیر عام اور مقابلے کی تیاری: طالبان کو پہلی بار اتنی بڑی شکست کا تلخ تجربہ ہوا تھا۔ ان حالات میں طالبان سربراہ ملا محمد عمر نے نفیرِ عام کا اعلان کر دیا جس کے بعد قندھار کے بازار بند ہو گئے اور ہزاروں افراد شمالی صوبوں کی بغاوت پر قابو پانے کے لیے رضا کارانہ طور پر تیار ہو گئے۔ پاکستان کے دینی مدارس اور سرحدی قبائل سے بھی سینکڑوں نوجوان قندھار اور کابل پہنچ گئے۔ یوں 30 ہزار سپاہیوں کا لشکر مرتب ہوا مگر اس لشکر کو زیادہ توجہ کابل کے محاذ پر دینا پڑی کیونکہ طالبان مخالف گروہوں نے اسے کمان کی طرح گھیر لیا تھا اور کابل کے سقوط کا خطرہ سر پر تھا جبکہ شمال میں گھرنے والے طالبان کو کمک پہنچانے کا کوئی زمینی راستہ باقی نہیں بچا تھا۔

طالبان، پلِ خمری میں: جو طالبان مزار شریف کے قتل عام اور گرفتاریوں سے بچ نکلے تھے، انہوں نے پیچھے ہٹ کر پلِ خمری میں مورچے بنا لیے تھے جو مزار شریف کی فتح سے چند دن پہلے ہی ان کے قبضے میں آیا تھا۔ پلِ خمری کے علاوہ قندوز، تخار اور سمنگان بھی اب تک طالبان یا ان کے حامی کمانڈروں کے پاس تھے۔ طالبان مخالف گروہوں نے پلِ خمری پر دو ہفتے تک لگاتار حملے کیے تا کہ طالبان کو وہاں سے بے دخل کر دیں مگر تین اطراف سے گھرے ہوئے ان مجاہدوں نے بھرپور مقابلہ کیا اور حریف افواج کو پلِ خمری سے دور رکھا۔

ضربِ مؤمن کی رپورٹ کے مطابق ان دو ہفتوں میں طالبان مخالف گروہوں نے پلِ خمری پر 10 بڑے حملے کیے جن میں ان کے 500 افراد ہلاک ہوئے۔ طالبان کو توقع تھی کہ کابل سے طالبان کی تازہ دم کمک سالانگ شاہراہ کو کھول دے گی اور انہیں محفوظ عقب میسر آ جائے گا مگر جب کابل کے گرد مخالفین کا گھیرا سخت ہو گیا اور پلِ خمری کا مستقبل مخدوش نظر آنے لگا تو طالبان نے قندوز کی طرف نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ پہلے ان کے مسلح دستوں نے بغلان پر قبضہ کیا اور پھر شمال کی طرف بڑھتے ہوئے رات کی

تاریکی میں قندوز پر قبضہ کرلیا۔ یہ منگل 16 / جون 1997ء کا واقعہ ہے۔ قندوز پر قبضہ کرنے میں طالبان کو مقامی عوام اور کمانڈروں کا پورا تعاون حاصل رہا۔ خاص طور پر قندوز کے مشہور کمانڈر اور رئیس ارباب ہاشم نے اس موقع پر طالبان کا جس طرح ساتھ دیا، اسے طالبان تحریک کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

خونریز لڑائیاں: اس دوران طالبان کے خلاف جاری جنگ کو مکمل فتح سے ہمکنار کرنے کے لیے افغانستان کے بدخواہ، ہمسایہ ممالک پوری طرح سرگرم تھے۔ روس کے تعاون سے شمالی افغانستان کے تمام طالبان مخالف دھڑوں کو منظم کیا جارہا تھا۔ اس مہم میں آغا خانی راہنما جعفر نادری کا کردار سب سے نمایاں تھا جس کو افغانستان میں ایک خودمختار اسماعیلی ریاست کے قیام کی اُمید دلائی گئی تھی۔ مزار شریف سے طالبان کے بے دخل کیے جانے کو ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا کہ طالبان مخالف تمام دھڑے نادرن الائنس (شمالی اتحاد) کے نام سے ایک نئے اتحاد میں ڈھل گئے اور شمالی افغانستان میں اس اتحاد کی حکومت کا اعلان کردیا گیا۔ نادرن الائنس کے جنگجوؤں نے جن کی بڑی تعداد کمیونسٹوں پر مشتمل تھی طالبان کو قندوز سے نکالنے کے لیے ایک بڑا حملہ کیا مگر قندوز میں محصور طالبان نے بھرپور دفاع قائم کرکے یہ حملہ پسپا کردیا۔ اس جنگ میں 500 کمیونسٹ گرفتار اور اتنے ہی ہلاک ہوئے۔

قندھار اور کابل میں شمال کے طالبان کی مدد کے لیے تازہ دم دستے مرتب ہوتے رہے۔ تقریباً ہر روز کابل سے طیارے پرواز کرتے اور قندوز ایرپورٹ پر اُترتے۔ اس طرح قندوز کے محصور طالبان کو خوراک، اسلحہ اور افراد کی کمی نہ ہونے پائی۔ جلد ہی ان کے قدم اتنے مضبوط ہوگئے کہ وہ تخار اور بدخشاں پر حملے کی تیاری کرنے لگے۔

ادھر بادغیس سے طالبان کا لشکر فاریاب کی طرف بڑھنے کی تیاری کرنے لگا۔ طالبان نے 8 جولائی کو فضائی حملہ کرکے فاریاب چھاؤنی تباہ کردی اور زمینی حملے میں ضلع غورمارچ فتح کرلیا مگر اس دوران کابل کی طرف احمد شاہ مسعود کی مسلسل پیش قدمی نے طالبان کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

کابل اور قندوز کی جنگ: جولائی 1997ء کے دوسرے عشرے میں احمد شاہ مسعود کی افواج چھاریکار اور پھر بگرام ہوائی اڈے پر بھی قابض ہوگئیں۔ کابل کی شمالی وادیوں میں ہفتوں خونریز جنگ جاری رہی۔ اس میں فریقین کے سینکڑوں افراد کام آئے۔ کابل کے شمال مشرق دیہاتوں میں آباد ڈیڑھ لاکھ سے زائد افراد جن کی اکثریت تاجک تھی اس جنگ زدہ علاقے سے نقل مکانی پر مجبور ہوگئے۔

احمد شاہ مسعود کی فوجیں آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہیں حتیٰ کہ وہ کابل سے صرف 20 کلومیٹر کے فاصلے

پر پہنچ گئیں۔ اس موقع پر مولانا جلال الدین حقانی نے، جواب کابل میں طالبان کے وزیر بھی تھے، ایک بار پھر اپنی تجربہ کار فوج کے ساتھ کابل کے محاذ کو سنبھالا اور نہ صرف احمد شاہ مسعود کی فوج کو مزید آگے بڑھنے سے روک لیا بلکہ چاریکار کے 5 نواحی گاؤں واپس لے لیے۔ ادھر قندوز کے محاذ پر بھی طالبان کو ایک بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ طالبان مقامی پختون کمانڈروں کی مدد سے قندوز کا محاصرہ توڑتے ہوئے مزار شریف کی طرف بڑھنے لگے۔

طالبانِ قندوز کی ہمت: 9 جولائی 1997ء کو انہوں نے مزار شریف کے مشرق میں ''درّہ یرگنک'' پر قبضہ کر کے مخالفین کو سراسیمہ کر دیا اور رسد کے بڑے ذخیرے کو لوٹ لیا۔ مزار شریف کا کنٹرول اس وقت عبدالمالک کی فوج کے ہاتھ میں تھا۔ اس صورتِ حال سے وہ لوگ حواس باختہ ہو گئے۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مفرور جنرل دوستم کے وفاداروں نے عبدالمالک کے خلاف بغاوت کی تیاریاں شروع کر دیں۔ 15 جولائی کو قندوز کے طالبان نے شمال کی طرف ہلہ بول کر دشت ارچی اور دریائے آمو کے کنارے واقع ضلع ''امام صاحب'' پر قبضہ کر لیا۔

سیاف طالبان کے حامی: انہی دنوں مشہور جہادی راہنما پروفیسر عبدالرب رسول سیاف کا 18 گاڑیوں پر مشتمل قافلہ بدخشاں میں شمالی اتحاد کے ہاتھوں لوٹا گیا جس کے بعد پروفیسر سیاف نے طالبان کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ طالبان کو ایک خوشی یہ بھی ملی کہ جبل السراج کے محاذ پر گرفتار ہونے والے ان کے کمانڈر ملا خان محمد، احمد شاہ مسعود کی جیل توڑ کر ان کے پاس واپس پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

طالبانِ قندوز کی یلغار: قندوز کے طالبان محصور دکھائی دینے کے باوجود مشرق، مغرب اور شمال میں آزادانہ کارروائیاں کر رہے تھے۔ 22 جولائی کو انہوں نے طالقان ایرپورٹ پر حملہ کیا۔ فریقین میں زبردست کشمکش دیکھنے میں آئی، اس دوران طالبان کے نشانہ بازوں نے طالقان سے اُڑنے والا مسعود کا ایک طیارہ مار گرایا۔ مہینے کے اواخر میں قندوز کے طالبان نے بدخشاں کے دو قلعے فتح کر لیے۔ جبکہ وسطی افغانستان میں تعینات طالبان نے غوربند پر حزبِ وحدت کا ایک بڑا حملہ ناکام بنا دیا۔ احمد شاہ مسعود نے کابل پر قبضے کی مہم بہتر بنانے کے لیے چاریکار اور بگرام ایرپورٹ کے محاذ جنرل بابا خان اور جنرل آصف دلاور کے حوالے کر دیے۔

شمال میں ایک نئی حکومت: ماہ اگست میں بھی یہ معرکے جاری رہے مگر اس کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سفارتی میدانوں میں بھی فریقین کی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ اگست کے پہلے ہفتے میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے افغانستان کے لیے لخذار براہیمی کو نیا نمائندہ مقرر کر دیا۔ لخذار براہیمی 16

اگست 1997ء کو متحارب افغان لیڈروں سے گفت وشنید کے لیے اسلام آباد آئے مگر انہیں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ ادھر برہان الدین ربانی نے اپنی صدارت پکی رکھتے ہوئے شمال کے کمیونسٹ گروپوں کے ساتھ ایک نیا حکومتی ڈھانچہ تشکیل دے دیا جس میں حکمت یار کی جگہ عبدالرحیم غفورزئی کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا عبدالرحیم غفورزئی بڑا شاطر، تجربہ کار اور سیاسی جوڑ توڑ کا ماہر کمیونسٹ تھا۔ اس کا شمالی حکومت کا وزیر اعظم بننا مستقبل میں طالبان کے لیے پریشان کن ہو سکتا تھا۔ اس نئے حکومتی ڈھانچے کے وجود میں آتے ہی احمد شاہ مسعود نے عالمی سطح پر اپنی ساکھ بہتر بنانے کے لیے میڈیا مہم تیز کر دی۔ اس نے وائس آف امریکا کو انٹرویو دیتے ہوئے اعلان کیا کہ کابل پر قبضہ کر کے ہم خواتین کو آزادی دے دیں گے۔

ان دنوں کابل میں غیر ملکی صحافیوں کی نقل وحرکت نہ صرف بڑھ گئی تھی بلکہ کئی صحافی مشکوک حرکات میں ملوث پائے گئے تھے۔

<u>طالبان کی صحافیوں پر پابندی:</u> ان مشکوک سرگرمیوں کی وجہ سے طالبان حکومت نے ملکی سلامتی کے پیش نظر صحافیوں پر درج ذیل پابندیاں عائد کر دیں:

① ہر صحافی کو قندھار سے خصوصی اجازت نامہ لینا لازمی ہوگا۔
② صحافی کابل کے مخصوص ہوٹل میں قیام کریں گے۔
③ زیر استعمال گاڑی کا نمبر اور مالک کا پتا درج کروائیں گے۔
④ طالبان کے ایک نمائندے کو ہمراہ رکھیں گے۔
⑤ ویڈیو کیمرہ اور ٹی وی سیٹ استعمال نہیں کریں گے۔
⑥ جاندار کی تصویر نہیں اُتاریں گے۔

دنیا بھر کے صحافیوں نے طالبان کی ان پابندیوں کا بُرا منایا اور اسے آزادی اظہار رائے کے منافی قرار دیا۔

<u>شمال کا نیا وزیر اعظم ہلاک:</u> اگست کے وسط میں ایک عجیب حادثہ رونما ہوا۔ شمالی حکومت کا نیا وزیر اعظم عبدالرحیم غفورزئی ایک فضائی حادثے میں ہلاک ہوگیا۔ اس کے ساتھ برہان الدین ربانی کے مشیر خاص کے علاوہ کئی اہم فوجی وسیاسی شخصیات بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ شروع میں یوں لگا جیسے طیارے کی تباہی ایک سوچی سمجھی کارروائی کا نتیجہ ہوگی مگر بعد میں خود شمالی اتحاد کے ذرائع نے تصدیق کی کہ یہ ایک حادثہ تھا۔ طیارہ لینڈنگ کے دوران پائلٹ سے بے قابو ہو کر ایک کھائی میں جا گرا تھا۔

<u>طالبان قندوز سمنگان پر قابض:</u> تین ماہ کی صبر آزما جنگ اور زبردست جانی نقصان برداشت کرنے

کے بعد طالبان کے لیے فتوحات کے دروازے ایک بار پھر کھلنے لگے۔ طالبان کے وزیر اطلاعات ملا امیر خان متقی تین ماہ کا پر صعوبت سفر کر کے قندوز سے بخیریت قندھار پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ ستمبر 1997ء کے اوائل کا واقعہ ہے۔

اس کے چند دن بعد قندوز کے طالبان حیرت انگیز رفتار کے ساتھ قندوز سے نکلے اور سمنگان کے اہم شہر "تاشبرغان" (خلم) پر قابض ہو گئے۔ انہیں اس پیش قدمی کا موقع خود شمالی اتحاد کی شرارت نے مہیا کیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ 7 ستمبر تک طالبان مزید آگے بڑھنے کی کسی منصوبہ بندی کے بغیر قندوز کے باہر "درّۂ یر گنک" پر واقع اپنے مورچوں میں آرام کر رہے تھے۔ اچانک انہیں اطلاع ملی کہ شمالی اتحاد کی فوجیں سمنگان پر قبضے کی کوشش کر رہی ہیں اور سمنگان کا گورنر مجید خان جو حزبِ اسلامی سے تعلق رکھتا تھا، ان کا مقابلہ کر رہا ہے۔ طالبان اس جنگ کی خبریں لیتے رہے۔ چار دن کی مسلسل جنگ کے بعد شمالی اتحاد نے سمنگان کے شہر "خلم" پر قبضہ کر لیا اور کمانڈر مجید خان فرار ہو گیا۔

اس فتح کے بعد شمالی اتحاد کی فوج کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور اس نے اپنی چھاؤنی سے جو خلم سے 40 کلومیٹر دور شاہ باغ علی کے مقام پر تھی، قندوز کی طرف کوچ کر دیا تا کہ طالبان کو بھی قندوز سے بے دخل کر دیں مگر قندوز کے طالبان نے کمر کس کر مقابلہ کیا اور چند گھنٹے تک گھمسان کی جنگ کے بعد شمالی اتحاد کی افواج اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹتی چلی گئیں اور قندوز کے طالبان آگے بڑھتے بڑھتے سمنگان ایئر پورٹ تک پہنچ گئے جہاں نماز ظہر ادا کر کے انہوں نے خلم شہر کی طرف کوچ کر دیا۔ شام تک خلم شہر طالبان کے پاس آ گیا تھا۔ خلم سالانگ شاہراہ کا اہم دفاعی نقطہ ہے۔ پروان، کاپیسا، پلِ خمری اور سمنگان کے مرکز ایک کے راستے یہاں آ کر ملتے ہیں۔ یہاں قبضے کے بعد سالانگ شاہراہ پر واقع ان تمام شہروں کا رابطہ مزار شریف سے کٹ گیا جو مخالفین کے قبضے میں تھے۔

حیرتان بندرگاہ: طالبان نے خلم میں مورچے مضبوط کرتے ہی مزار شریف کی طرف کوچ کیا۔ شہر کا گردونواح سے رابطہ منقطع کرنے کے لیے انہوں نے پیر 9 ستمبر کی شام حیرتان دورا ہے پر قبضہ کر لیا جو مزار شریف سے صرف 15 کلومیٹر دور ہے۔ اس کے بعد وہ دریائے آمو کی طرف بڑھتے رہے اور رات کی تاریکی میں حیرتان بندرگاہ پر قابض ہو گئے جو دریائے آمو کے کنارے وسط ایشیا اور افغانستان کے درمیان اہم تجارتی مرکز کے طور پر مشہور ہے۔

طالبان کے قتل عام کا سب سے بڑا ذمہ دار عبد المالک اس صورتِ حال سے ایسا بدحواس ہوا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور اپنے آبائی علاقے فاریاب جا کر دم لیا۔ اس کی غیر

موجودگی میں مزار شریف پر ایک بار پھر حزب وحدت کے بے رحم جنگجو قابض ہو گئے اور شہر میں لوٹ مار کا بازار پھر گرم ہو گیا۔ ادھر طالبان نے مزار شریف کے ایئر پورٹ پر قبضہ کر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک دن میں دوبارہ شہر پر قبضہ کر لیں گے۔ مگر طالبان اب پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ انہوں نے شہر کے اردگرد تمام بستیوں اور شاہراہوں میں مورچہ بندی جاری رکھی۔ محاصرہ سخت اور طویل ہوتا چلا گیا۔ مزار شریف کے اردگرد تمام مقامی کمانڈر طالبان سے جا ملے تھے۔

دوستم کی واپسی، طالبان کی پسپائی: بظاہر حالات طالبان کے حق میں نظر آتے تھے مگر اس پردے میں ایک طوفان کے آثار جنم لے رہے تھے۔ حزب وحدت اور دوستم کے گروہوں کو بھرپور امداد ملنے لگی تھی۔ وہ طالبان سے جا ملنے والے کمانڈروں کو خفیہ طور پر خرید رہے تھے۔ حزب وحدت (خلیلی گروپ) کے رہنماؤں استاد محقق وغیرہ نے دوستم کے ساتھ اتحاد کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کی واپسی کے لیے زمین ہموار کرنے میں کامیاب ہوتے جا رہے تھے۔ اس مہم کے نتیجے میں اکتوبر کے وسط میں دوستم اچانک شمالی افغانستان میں نمودار ہو گیا۔ اس نے قلعہ جنگی میں قیام کیا اور فوراً یہ اعلان نشر کیا کہ وہ آدھ گھنٹہ قبل وطن واپس آ پہنچا ہے۔ طالبان سربراہ ملا محمد عمر کو جوں ہی یہ خبر ملی انہوں نے فوری طور پر طالبان کو مزار شریف کا محاصرہ اُٹھا کر پسپائی کا حکم دے دیا۔ تاخیر کی صورت میں خطرہ تھا کہ طالبان خود باغی کمانڈروں کے گھیرے میں آ جاتے۔ طالبان نے پہلے حیرتان بندرگاہ خالی کی۔ اس کے فوراً بعد 20 روز سے مزار شریف کو گھیرے ہوئے طالبان سپاہی بھی قندوز کی طرف پسپا ہو گئے۔ یہ اکتوبر 1997ء کے دوسرے عشرے کا واقعہ ہے۔

دوستم کی آمد سے مزار شریف اور گردونواح کے ازبک کمانڈروں نے ایک بار پھر اس کی حلقہ بگوشی اختیار کر لی۔ انہوں نے مزار شریف میں خوب لوٹ مار کر کے فتح کا جشن منایا۔ اقوام متحدہ کی ایجنسیوں کے دفاتر اور رفاہی اداروں کے مراکز بھی لوٹ لیے۔ ان کا عملہ ازبکوں کے خوف سے شہر چھوڑ کر فرار ہو گیا تاہم مزار شریف پر عملاً ہزارہ جات کا قبضہ برقرار رہا۔ مزار شریف سے طالبان کی دوبارہ پسپائی نے طالبان مخالف گروہوں کے حوصلے بلند کر دیے تھے اور طالبان کے خلاف جاری سازشوں کی کامیابیاں واضح ہو گئیں۔ شمالی اتحاد کے جنگجو کمانڈروں نے باہمی اختلافات دور کرنے کی ضرورت بھی محسوس کر لی۔

شمالی اتحاد کا نیا خاکہ: اکتوبر 1997ء کے آخری عشرے میں برہان الدین ربانی کی زیر صدارت تمام جنگجو کمانڈروں کا اعلیٰ سطحی اجلاس ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ مزار شریف پر جنرل عبدالمالک کے نائب جنرل فوزی، شبرغان پر جنرل دوستم، سرپل پر کمانڈر عبدالغفار اور فاریاب پر جنرل عبدالمالک کی حکومت ہو گی۔ دوستم کو خوش کرنے کے لیے ربانی نے اسے اپنے نائب کا عہدہ بھی دے دیا۔ دوستم مزار شریف سے دستبردار

ہونے کو کبھی تیار نہ ہوتا مگر فی الحال اس کے ازبک دستے منظم نہیں تھے اس لیے اس نے مزار شریف پر جنرل فوزی کا اقتدار بادلِ نخواستہ تسلیم کرلیا ویسے بھی جنرل فوزی کا مزار شریف میں اثر بہت کم رہ گیا تھا۔ وہاں کی اصل طاقت اب ہزارہ جات اور حزبِ وحدت تھے۔ حزبِ وحدت نے دوستم کی واپسی میں خاص تعاون کیا تھا اس لیے دوستم ان کے خلاف زبان کھول کر بدمزگی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ اس نے عبدالملک کے خلاف خوب بیانات دیے اور طالبان کے قتل عام میں اس کے جرائم کی تفصیلات میڈیا کو بتائیں۔

طالبان پر شمالی اتحاد کے مظالم: مبصرین کے مطابق دوستم اس طرح طالبان کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے دشت لیلی میں طالبان کی اجتماعی قبروں کی تلاش میں اقوام متحدہ کے تفتیش کارکنوں کو مدد دی۔ سانحہ مزار شریف کو 5 ماہ گزر چکے تھے اور اب مختلف ذرائع سے اس سانحے کی روح فرسا تفصیلات سامنے آنے لگی تھیں۔ ان ذرائع کے مطابق اس سانحے میں ہزاروں طالبان گرفتار ہوئے تھے۔ ان کی اکثریت کو بڑی بے رحمی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا جبکہ باقی ماندہ قید خانوں میں بدترین اذیتیں برداشت کرتے رہے۔

سب سے پہلے ان مظالم کی خبریں ہفت روزہ ''ضربِ مؤمن'' نے شائع کیں اور 21 نومبر 1997ء کی اشاعت میں یہ تہلکہ خیز انکشاف کیا کہ جوزجان اور شبرغان کے گردونواح میں کم از کم دو ہزار طالبان مدفون ہیں جنہیں 120 اجتماعی قبروں اور 9 کنوؤں میں زندہ دفن کر دیا گیا تھا۔

بعد میں قتل عام سے بچ نکلنے والے چند خوش قسمت طلبہ نے مزید روح فرسا انکشافات کیے۔ انہوں نے بتایا کہ قتل کرنے سے پہلے طالبان کو اتنی دیر تک بھوکا پیاسا رکھا گیا کہ ان میں سے کئی نقاہت کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ گئے۔ اس کے بعد ان کو گروہوں کی شکل میں ٹرکوں پر لادا گیا، کنٹینروں میں ٹھونسا گیا اور پھر انہیں دشت لیلی اور دوسرے ویران علاقوں میں لے جایا گیا۔ یہاں بڑے بڑے گڑھے اور کنویں پہلے سے کھود لیے گئے تھے۔ طالبان کو جن کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے، دھکے دے دے کر ان گڑھوں میں گرا دیا گیا۔ مزاحمت کرنے والے طالبان کو باہر ہی گولیوں سے بھون دیا گیا۔ پھر انہیں بھی کنوؤں میں پھینک دیا گیا۔ اس کے بعد دیر تک اندھادھند فائرنگ کی گئی جس سے کنوؤں میں گرے ہوئے قیدی مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔ اس پر بھی اکتفا نہ کیا گیا بلکہ دستی بموں سے قیدیوں کے پرخچے اُڑا دیے گئے۔ آخر میں تمام کنوؤں کو بلڈوزروں کے ذریعے پاٹ دیا گیا۔ طالبان کا یہ بہیمانہ قتل عام جون 1997ء میں ہزارہ جات اور عبدالمالک کی ملیشیا کے ہاتھوں ہوا۔

اگلے سال اگست 1998ء میں جنیوا میں انسانی حقوق کمیشن کے ترجمان جان ولز نے یہاں تحقیقات

کے بعد اجتماعی قتل عام کی تصدیق کی اور بتایا کہ شبرغان کے نزدیک دشت لیلی اور مزار شریف اور حیرتان کے مابین وسیع صحرا میں کئی بڑی بڑی اجتماعی قبریں ہیں جن میں صرف دشت لیلی کے مدفنوں میں دو ہزار سے زائد لاشیں ملی ہیں۔ اقوام متحدہ کے خصوصی نمایندے پیک چونک ہیرن نے بھی اس کی تصدیق کی۔

عبدالمالک کے ایک وفادار افسر سلیم صابر نے ان جرائم کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ طالبان کو ایسے کنٹینروں میں بند کر کے صحرا تک لے جایا جاتا تھا جن میں ہوا کا بالکل گزر نہیں ہوتا تھا۔ بہت سے طالبان دم گھٹنے اور تپش کی وجہ سے جاں بحق ہوئے۔ کنٹینروں کی گرمی کی وجہ سے ان کی کھال جسموں سے اُتر چکی تھی۔

عبدالمالک کی درندہ صفت فوج اور ہزارہ جات نے نہ صرف طالبان کا قتل عام کیا تھا بلکہ انہوں نے مزار شریف کے گردونواح میں کئی ماہ تک ایسی آبادیوں میں خون کی ندیاں بہائیں جن کے بارے میں انہیں شک تھا کہ یہاں طالبان کی حمایت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ ستمبر 1997ء مزار شریف ہوائی اڈے کے قریب فیض آباد نامی چھوٹا سا گاؤں ان کی خون آشامی کی بھینٹ چڑھا۔ یہاں 150 افراد جن میں بچوں اور بچیوں کی اکثریت تھی، اس الزام میں قتل کر دیے گئے کہ وہ طالبان کے حامی ہیں۔

<u>قیدی طالبان سے بے رحمانہ سلوک:</u> طالبان کے جو افراد قیدی بنا لیے گئے تھے، ان کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کیا جارہا تھا۔ انہیں تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند رکھا جارہا تھا اور سخت جبری مشقت لی جارہی تھی۔ انہیں کوڑوں سے پیٹنا، لاتوں اور مکوں کا نشانہ بنانا، روزانہ بجلی کے پچاس پچاس جھٹکے دینا، گرم لوہے سے داغ دینا عام معمول تھا۔ کھانے کے لیے برائے نام غذا دی جاتی۔ یہ قیدی طبی سہولتوں سے محروم تھے اور ان کے زخم گلتے سڑتے رہتے تھے۔ احمد شاہ مسعود ان میں سے بہت سے طالبان کو اپنی ہوسِ انتقام کا نشانہ بنانے کے لیے پنج شیر لے گیا تھا۔ پنج شیر جیل میں پہلے سے بہت سے طالبان قید تھے۔ ان پر جو مظالم توڑے جاتے تھے، انہیں سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

پنج شیر میں قید کاٹنے والے ایک طالب علم کا بیان ہے کہ ان کی بیرکیں گندگی و غلاظت کا ڈھیر تھیں۔ صرف ان میں رہنا ہی آدمی کا جینا دوبھر کرنے کے لیے کافی ہے۔ انہیں ہر وقت سخت اور غلیظ گالیاں دی جاتیں۔ سخت جسمانی تشدد کیا جاتا۔ پورے چھ مہینے انہیں روٹی تک نہیں دی گئی۔ کھانے کے لیے اور گھاس پھوس اور درختوں کے پتے ان کے آگے ڈال دیے جاتے تھے۔ پاکستان کی جہادی تنظیموں نے ان کے لیے خورونوش کا سامان اور کچھ رقم بھیجی تو "پنج شیری مجاہد" اسے شیرِ مادر سمجھ کر ہضم کر گئے۔

ضربِ مؤمن نے 5 دسمبر 1997ء کی اشاعت میں ایک لرزا دینے والی خبر شائع کی جس کے مطابق پنج شیر کی جیل میں قید ایک حافظ قرآن طالب علم کی زبان کاٹ دی گئی۔ اس بہیمانہ سزا سے پہلے وہ

طالب علم چیخ چیخ کر فریاد کرتا رہا کہ چاہے کوئی بھی سزا دی جائے اسے قبول ہے مگر زبان نہ کاٹی جائے کیونکہ اس نے چھ سال کی محنت سے قرآن مجید حفظ کیا ہے اور یہ زبان تلاوت میں مصروف رہتی ہے۔ مگر پنج شیری افسران پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

مآخذ و مراجع

- ...... طالبان جند اللہ۔ فہمی ہویدی
- ...... ہفت روزہ تکبیر: جلد 1997,1996ء
- ...... ہفت روزہ ضرب مؤمن، جلد 1، 2
- ...... امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور ہفت روزہ جرائد

تینتیسواں باب

فتحِ مزارشریف وبامیان

1998ء کا آغاز: نیا سال شروع ہوا تو طالبان ایک بار پھر شمال پر فوج کشی کے لیے تازہ دم نظر آئے۔ جنوری 1998ء کے پہلے ہفتے میں انہوں نے دوستم کے علاقے پر حملہ کر کے ''قیصار'' سمیت 50 کلومیٹر کا علاقہ چھین لیا۔ ادھر طالبان مخالفین نے زیرزمین سرگرمیاں شروع کر رکھی تھیں۔ سروبی میں مقامی کمانڈروں میں اڑھائی لاکھ ڈالر تقسیم کیے گئے تاکہ وہ بغاوت کر دیں۔ قندھار میں طالبان کے مردِ آہن ملا داداللہ کے قتل کی سازش تیار تھی۔ ایک دن چند مسلح افراد راستے میں گھات لگا کر بیٹھ گئے مگر ملا داد اللہ کی گاڑی سے پہلے وہاں سے ایک اور گاڑی گزری۔ گھات میں چھپے مسلح افراد نے غلط فہمی سے اس کو نشانہ بنا ڈالا حالانکہ یہ گاڑی ان کے اپنے کمانڈر ملا نقیب کی تھی جو ربانی کا سابق کمانڈر تھا۔ کچھ دیر بعد ملا داداللہ وہاں سے گزرے تو تباہ شدہ گاڑی سے زخمیوں کو نکال کر خود ہسپتال پہنچا آئے۔ انہیں بعد میں معلوم ہوا کہ حملہ آوروں کا اصل ہدف وہی تھے۔

اپنی تنظیم بہتر بنانے کے لیے ان دنوں طالبان نے ایک اہم نوعیت کا فیصلہ کیا۔ اب تک وہ رضا کاروں اور مجاہدین کے گروہوں کے انداز میں لڑتے تھے۔ باقاعدہ فوجی نظم ونسق سے بہت دور تھے مگر اب ''قومی فوج'' یا ''طالبان مسلح افواج'' بنانے کا اعلان کیا گیا۔ تاہم وسائل کی کمی کی وجہ سے یہ کوئی ''جدید'' یا ''مرتب فوج'' نہ بن سکی۔

شعبۂ امر بالمعروف کا قیام: فروری کے آغاز میں ایک اور اہم شعبہ قائم کیا گیا۔ اسے ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کا نام دیا گیا۔ اس کے عہدے داروں کی ذمہ داری تھی کہ وہ معاشرے سے گناہوں، شرعی محرمات اور اخلاقی برائیوں کا خاتمہ کریں اور لوگوں کو نیکی کی تلقین کریں۔ اس شعبے کے عہدے داروں کو گورنروں تک سے باز پرس کے اختیارات حاصل تھے۔ ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' نے ملک میں برائیوں کے ازالے کے لیے بھرپور کام کیا۔

طالبان دھیرے دھیرے شمالی اتحاد کی سرحدوں پر حملے کر کے ان کی دفاعی قوت کا اندازہ کرتے رہے۔ قندوز کے علاوہ غور بند میں بھی طالبان کی خاصی تعداد اب تک محاصرے میں تھی۔ ان کے مسائل کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری تھا۔ جنوری 1998ء میں غور بند کے محصور طالبان کو 240 ٹن گندم پہنچائی گئی تھی۔ یہ سلسلہ وقفے وقفے سے جاری تھا۔ ساتھ ساتھ اِدھر اُدھر حملے بھی ہو رہے تھے۔ فروری کے دوران قیصار (فاریاب) میں رشید دوستم طالبان کی مارٹر توپ کی زد میں آ کر شدید زخمی ہو گیا اور اسے علاج کے لیے بیرون ملک لے جایا گیا۔ طالبان کوئی بڑا حملہ کرنے میں تامل کرتے رہے۔ دراصل شمال میں اتحادی آپس میں ٹکرا رہے تھے اور طالبان ان کی ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری رہنے دینا چاہتے تھے۔

شمالی اتحاد کی باہمی لڑائیاں: مارچ کے آخری عشرے میں شمالی اتحاد کی خانہ جنگی عروج پر پہنچ گئی۔ اب لڑائی حزب وحدت اور دوستم کے درمیان ہو رہی تھی۔ دوستم نے حزب وحدت کے 70 افراد گرفتار کر کے انہیں زندہ دریائے آمو میں پھینک دیا۔ جواب میں حزب وحدت نے دوستم کے 100 اہلکار قتل کر دیے۔ اس کے بعد مزار شریف کے گردونواح میں فسادات کی آگ بھڑک اُٹھی۔ ازبک اور ہزارہ جات ایک دوسرے پر پل پڑے۔ حزب وحدت نے اپنا غصہ مزار شریف پر نکالا اور شہر کے بازاروں، گوداموں اور سرکاری عمارتوں کو لوٹ لیا۔ دوستم نے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے حیرتان کو لوٹ لیا۔ یوں نظر آنے لگا جیسے شمال میں صرف ڈاکوؤں کا راج ہے۔ فسادی یو این او کے دفاتر پر حملے کرتے رہے۔ شاہراہوں اور تاجروں کو لوٹنا تو روز کا معمول تھا ہی، حاجیوں کے قافلوں کو بھی نہ بخشا گیا۔ اس صورت حال میں اسلام آباد میں مقیم طالبان کے قائم مقام سفیر مولانا طیب آغا نے بجا طور پر اقوام متحدہ سے مطالبہ کیا کہ شمالی اتحاد ڈاکوؤں کا گروہ ہے اس لیے اقوام متحدہ کو فوری طور پر اس کی رکنیت منسوخ کر دینا چاہیے۔

اسامہ بن لادن افغانستان میں: ہم ذکر کر رہے ہیں 1998ء کا اور یہ وہ سال ہے جس میں شیخ اسامہ بن لادن امریکا کے سب سے بڑے مخالف کی صورت میں عالمی اُفق پر اُبھرے اور اس کے بعد وہ میڈیا کا اہم ترین موضوع بن گئے۔ افغانستان کی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ اسامہ بن لادن 1957ء میں سعودی عرب میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد بن لادن سعودی عرب کے نامور تاجر تھے۔ اسامہ بن لادن کا بچپن مدینہ منورہ میں گزرا۔ جدہ کی درسگاہوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی سے بزنس مینجمنٹ اور اقتصادیات کی اسناد پائیں۔ برطانیہ سے انجینئرنگ میں گریجویشن کیا۔ تعلیم کا سلسلہ تھما تو خاندانی کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ محمد بن لادن فوت ہوئے تو اسامہ بن لادن کو ورثے میں 25 کروڑ ڈالر ملے جس سے انہوں نے بن لادن کمپنی قائم کی۔

سول انجینئرنگ کے فن میں انہیں کمال حاصل تھا، ان کی تعمیری کمپنی کا دائرہ پوری دنیا میں پھیل گیا۔
افغانستان پر روس کے یلغار کے فوراً بعد شیخ اسامہ نے جہاد میں حصہ لیا۔ وہ 1979ء کے دوران 22 سال کی عمر میں روسیوں کے خلاف لڑے۔ اپنی فنی مہارت کو کام میں لا کر انہوں نے مجاہدین کے لیے پاک افغان سرحدی علاقوں میں ایسے زمین دوز بینکر اور مورچے تعمیر کیے جو ہوائی حملوں سے بالکل محفوظ تھے۔ ان عمارتوں کی تعمیر میں کس قدر مہارت سے کام لیا گیا تھا اس کا اندازہ لگانے کے لیے ہم کوہِ سفید کی خفیہ عمارت کی مثال دیتے ہیں جو استاد سیاف کے مرکز کے قریب ہزاروں فٹ بلند سلسلۂ کوہ کو اندر سے کھوکھلا کر کے بنائی گئی تھی۔ اس عمارت میں رہائشی کمروں، اسلحہ خانوں، خوراک کے گوداموں اور پارکنگ کے علاوہ سو بستروں کا جدید ترین ہسپتال بھی تھا۔ عمارت کی مرکزی سرنگ کی بلندی 200 فٹ تھی۔ اس سے نکلنے والی ذیلی سرنگیں پورے پہاڑی سلسلے میں پھیل گئی تھیں جن میں ایک ساتھ کئی گاڑیاں چل سکتی ہیں۔ یہ حیرت انگیز منصوبہ بن لادن نے صرف ایک سال میں مکمل کیا تھا۔

1989ء میں سوویت یونین افغانستان سے نکل گیا اور جہاد فتح سے ہمکنار ہوا مگر بن لادن کا سفر جاری رہا۔ وہ شیخ عبداللہ عزام شہید کے گرویدہ تھے اور ان کے افکار و کردار سے بے حد متاثر تھے۔ وہ جہاد کو پوری دنیا میں زندہ کرنا چاہتے تھے۔ 1989ء میں شیخ عزائم کی شہادت کے بعد بن لادن ہی عرب مجاہدین کے عالمی قائد کے طور پر سامنے آئے۔ ان دنوں افغان مجاہدین کے گروپوں میں سیاسی چپقلش بہت بڑھ گئی تھی اس لیے اسامہ بن لادن اس صورتِ حال سے اُکتا کر واپس سعودی عرب آ گئے اور شہداء کے ہزاروں خاندانوں کی کفالت کے منصوبے پر کام شروع کر دیا۔ 1990ء میں کویت پر عراق کے حملے کے بعد شیخ اسامہ سعودی وزیر دفاع شہزادہ نائف بن سلطان سے ملے اور ڈیزرٹ اسٹارم آپریشن کے لیے اپنی خدمات پیش کیں مگر ساتھ ہی شرط عائد کی کہ امریکا کو مداخلت کا موقع نہ دیا جائے۔ سعودی حکمرانوں نے اس پیش کش کو مسترد کرتے ہوئے امریکا کو خوش آمدید کہا جس کے نتائج وہ آج تک بھگت رہے ہیں۔ چونکہ سعودی شہزادے نائف بن سلطان نے امریکا کو جزیرۃ العرب میں مداخلت کا موقع دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا اس لیے شیخ اسامہ نے ایک ملاقات میں نائف پر اسلام سے غداری کا الزام لگایا۔ اس پر سعودی حکومت نے اسامہ بن لادن کو "ناپسندیدہ شخصیت" قرار دیا۔ یہ 1992ء کا واقعہ ہے۔

اسامہ بن لادن سوڈان میں: اس دوران سوڈان میں "حسن ترابی" اسلامی انقلاب کی داغ بیل ڈال چکے تھے۔ شیخ اسامہ ان کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ 1994ء میں سعودی حکومت نے اسامہ بن لادن کی مسلسل تنقید سے برافروختہ ہو کر انہیں جلاوطن کر دیا۔ اس وقت انہیں سوڈان ہجرت کر جانا بہتر نظر

آیا۔ چنانچہ وہاں منتقل ہو کر انہوں نے عرب اور افغان مجاہدوں کا ایک مضبوط گروہ بنا لیا۔ 1993ء میں یہیں سے انہوں نے صومالیہ میں مداخلت کرنے والی امریکی فوجوں کے خلاف کارروائیوں کی قیادت کی۔ میگا دیشو (صومالیہ) میں 18 امریکی فوجی مارے گئے اور امریکا صومالیہ سے نکل گیا۔ اب اس نے اسامہ بن لادن کو اپنا سخت ترین حریف تصور کر لیا۔

اپریل 1996ء میں امریکی صدر بل کلنٹن نے دہشت گردی کے خلاف قانون کی منظوری دے کر بن لادن کمپنی کے 300 ملین ڈالر ضبط کر لیے۔ اس دوران طالبان کا ظہور ہو چکا تھا اور افغانستان کے مشرقی اور جنوبی علاقوں کا امن و امان بحال ہو رہا تھا۔ ان حالات میں شیخ اسامہ مئی 1996ء میں دوبارہ افغانستان آ گئے۔ ان کے ہمراہ ان کے بیوی بچے بھی تھے۔ وہ طالبان قیادت سے بالکل ناواقف تھے اس لیے ان پر اعتماد نہیں کر سکتے تھے اس لیے وہ سیدھا جلال آباد ایئر پورٹ پر اُترے اور کئی ماہ تک جلال آباد میں علاقائی شوریٰ کی امان میں رہے جس کا سربراہ حاجی عبدالقدیر تھا۔

اس دوران امریکا کی جانب سے شیخ اسامہ کو حوالے کر دینے کے مطالبات شروع ہو گئے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اگست 1996ء میں شیخ اسامہ نے امریکا کے خلاف جہاد کا آغاز کرنے کا اعلان کیا تھا۔ امریکا کے نزدیک اسامہ کو گرفتار کرنا ضروری تھا۔ یہ کام ان دنوں زیادہ مشکل نہ تھا کیونکہ افغانستان کے مقامی کمانڈروں میں سے درجنوں کمانڈر خود مختار تھے اور ان کی وفاداریاں ڈالروں کے عوض بکتی تھیں۔ اسامہ بن لادن صرف مقامی مجاہد رہنماؤں کے بھروسے پر محفوظ تھے ورنہ درحقیقت ربانی کو طالبان سے مقابلہ کے لیے امریکا کی مزید حمایت کی ضرورت تھی۔ اسے خوش کرنے کے لیے ربانی حکومت اس موقع سے فائدہ اُٹھا سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے امریکا سے اسامہ بن لادن کو حوالے کرنے کا معاہدہ کر لیا۔ قرین قیاس ہے کہ جلال آباد کے گورنر حاجی عبدالقدیر کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہوگا۔ بہر صورت اسامہ بن لادن کو اس سازش کا قطعاً علم نہ تھا ورنہ وہ افغانستان سے نکلنے یا طالبان کے علاقے میں پناہ لینے کی کوشش ضرور کرتے۔ تاہم اس سے قبل کہ اسامہ بن لادن پر ہاتھ ڈالا جاتا، طالبان نے اچانک جلال آباد فتح کر لیا اور شیخ کی گرفتاری کا امریکی منصوبہ ادھورا رہ گیا۔ یہ ستمبر 1996ء کے اواخر کا واقعہ ہے۔

<u>طالبان اور بن لادن:</u> طالبان نے شیخ اسامہ بن لادن کو معزز مہمان کی حیثیت دے کر ہر ممکنہ سہولت فراہم کی۔ ادھر سی آئی اے نے اسامہ بن لادن کی گرفتاری کو اپنا ہدف بنا لیا۔ 1997ء کے شروع میں سی آئی اے کے کمانڈروں نے پاکستانی اہلکاروں اور افغان باشندوں کی مدد سے شیخ کے خلاف ایک خفیہ آپریشن کیا مگر وہ انہیں اغوا نہ کر سکے۔ اس کے بعد اسامہ بن لادن امریکا کے خلاف مسلسل بیانات

دیتے رہے۔ 23 فروری 1998ء کو خوست میں واقع القاعدہ کے مرکز سے ایک اعلامیہ جاری ہوا جس میں یہود و نصاریٰ کے خلاف اعلان جہاد کیا گیا اور کہا گیا کہ امریکا عالم اسلام کے مقامات مقدسہ پر قابض اور مسلمانوں کے وسائل کا غاصب ہے اس لیے امریکا اور اس کے اتحادیوں کے خلاف جہاد فرض ہے۔ 14 راپریل 1998ء کو قندھار کے گورنر ملا حسن رحمانی نے امریکا کے مطالبے کے جواب میں کہا کہ ہم اسامہ بن لادن کو کسی قیمت پر امریکا کے حوالے نہیں کر سکتے۔ اگلے ماہ میڈیا پر یہ خبریں گشت کرنے لگیں کہ اسامہ کی گرفتاری کے لیے امریکی کمانڈرز پاکستان پہنچ گئے ہیں اور سرحدوں کے آس پاس ان کی نقل و حرکت جاری ہے۔

<u>پاکستان کا ایٹمی دھماکا:</u> یہ دن پاکستان پر بھی سخت دباؤ کے تھے۔ بھارت نے ایٹمی دھماکے کر کے اسے مرعوب کرنے کی کوشش کی تھی۔ پاکستانی وزیر اعظم میاں نواز شریف پر جوابی دھماکے نہ کرنے کے لیے امریکی دباؤ بڑھ رہا تھا۔ تاہم پاکستان نے خطرہ مول لیتے ہوئے 28 مئی 1998ء کو ایٹمی دھماکے کر ہی دیے اس طرح پہلی اسلامی ایٹمی طاقت ہونے کا اعزاز حاصل کر لیا۔ طالبان نے اس اقدام کا خیر مقدم کیا۔ 15 جون کو طالبان کے وزیر اطلاعات ملا امیر خان متقی نے پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کی حمایت کرتے ہوئے میڈیا پر کہا کہ اگر ایٹمی دھماکے کرنا جرم ہے تو اسرائیل کو امریکا نے ایٹمی صلاحیت کیوں فراہم کی؟

جون 1998ء میں شمالی اتحاد کے علاقے تخار میں ہولناک زلزلہ آیا۔ 5 ہزار افراد جاں بحق ہو گئے۔ طالبان نے شمالی اتحاد سے اختلافات بھلا کر متاثرین کو امداد کی پیش کش کی۔ تاہم یہ پیش کش شکوک و شبہات کی نذر ہو گئی۔

<u>طالبان کا فاریاب پر حملہ:</u> جون 1998ء کے وسط میں طالبان دوستم کے علاقوں پر حملے کے لیے تیار تھے۔ دوستم کو زیادہ خطرہ یہ تھا کہ طالبان دشت لیلیٰ کے مختصر صحرائی راستے سے گزر کر "شبرغان" پر بھی حملہ کر سکتے تھے مگر طالبان نے خلافِ توقع ایک غیر معروف راستے سے ہوتے ہوئے فاریاب کے ضلع "اندخوئی" پر جو دولت آباد سے 70 کلومیٹر دور تھا، حملہ کر دیا۔ یہی راستہ آگے شبرغان کو بھی جاتا تھا۔ طالبان جمعہ 26 جولائی 1998ء کو اندخوئی پر قابض ہو گئے۔ ہفتے کو وہ دن بھر مقامی لوگوں سے اسلحہ جمع کرتے رہے اور سورج ڈھلتے ہی شبرغان کی طرف یلغار کر دی۔ تاریکی پھیلنے سے قبل شبرغان کے دفاع کا خط اول ٹوٹ چکا تھا اور ازبک سپاہی شبرغان سے فرار ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے مگر طالبان شبرغان سے 25 کلومیٹر دور رُک گئے اور حالات کا جائزہ لینے لگے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کیوں رُک گئے اور ان کا اگلا حملہ کہاں سے ہوگا؟

ایک دن نماز فجر ادا کرتے ہی طالبان نے شبرغان جانے والی شاہراہ کو چھوڑ دیا اور ایک کچے غیر معروف راستے پر چل دیے جو کہ ''خواجہ دوکوہ'' سے گزرتا ہے۔ یہ راستہ جو آگے جا کر مزار شریف شبرغان شاہراہ سے مل جاتا ہے، طالبان کے قبضے میں آ گیا۔ اس طرح تین شہر، تکاپ، فیض آباد اور موسیٰ آباد دونوں طرف سے طالبان کے محاصرے میں آ گئے۔ یہ جمعرات 9 جولائی 1998ء کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد عام حملہ شروع ہوا جس میں 250 کیمونسٹ مارے گئے اور بڑی تعداد میں گرفتار ہوئے۔ مذکورہ تینوں شہر طالبان کے قبضے میں آ گئے۔

''میمنہ'' پر قبضہ: اتوار 12 جولائی کو طالبان نے فاریاب کے دارالحکومت ''میمنہ'' پر حملہ کیا۔ یہاں جنرل دوستم کے چنیدہ جنگجوؤں کی بڑی تعداد موجود تھی جنہیں طالبان کے خلاف ایک بڑے حملے کے لیے تیار کیا گیا تھا مگر اس سے پہلے ہی طالبان نے انہیں جا لیا۔ ''میمنہ'' کی فتح میں گیارہ سو ازبک سپاہی گرفتار ہوئے۔ ایک ہیلی کاپٹر، سینکڑوں روسی گائیڈڈ میزائل، 108 ٹینک، 250 پک اَپ گاڑیاں اور 50 بکتر بند گاڑیاں مال غنیمت کے طور پر ہاتھ لگیں۔ میمنہ کے پہاڑوں میں ایرانی اسلحے کے 20 بڑے گودام دریافت ہوئے جن میں موجود اسلحہ منتقل کرنے کے لیے ٹرالروں اور کنٹینروں کے کئی قافلے کئی دن تک مصروف رہے۔

شبرغان کی فتح: طالبان خاموشی سے آگے بڑھتے ہوئے شبرغان مزار شریف شاہراہ پر آ گئے۔ اب وہ ان دونوں شہروں کے بیچ میں تھے۔ اگر دشمن تیار ہوتا تو انہیں دونوں طرف سے گھیر سکتا تھا مگر طالبان کی نقل و حرکت پوشیدہ رہی۔ یکم اگست 1998ء کو جب وہ یکایک مزار شریف کی طرف سے شبرغان پر حملہ آور ہوئے تو شبرغان کی دوستم ملیشیا کے چھکے چھوٹ گئے۔ دوستم سب سے پہلے فرار ہو کر ازبکستان میں پناہ گزین ہوا اور وہاں سے ترکی چلا گیا۔ اس کے بھاگتے ہی ازبک کمانڈروں نے فوراً ہتھیار ڈال دیے اور شبرغان کسی خاص مزاحمت کے بغیر سرنگوں ہو گیا۔

طالبان نے یہاں دم نہ لیا اور فوراً سرپل پر چڑھائی کر دی۔ پہلے وہاں چہل میلے کے پانچ میزائل یکے بعد دیگرے داغے۔ کوئی جواب نہ آیا تو طالبان آگے بڑھتے چلے گئے۔ شبرغان کی فتح کے ایک گھنٹے بعد ''سرپل'' بھی فتح ہو چکا تھا۔ دو دن کے اندر اندر شبرغان سمیت جوزجان کا پورا صوبہ طالبان کے کنٹرول میں آ گیا۔ دوستم کے ہزاروں سپاہی فرار ہو گئے۔ بعد میں ان کی اکثریت نے کوئی جائے پناہ نہ ملنے پر طالبان کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ یہاں 10 بلین (گیارہ کھرب) مکعب میٹر گیس کے قدرتی ذخائر اور 365 کلومیٹر طویل گیس لائن بھی طالبان کے قبضے میں آ گئی۔

مزار شریف پر براہِ راست حملے کی تیاری: اب طالبان مزار شریف کے چاروں طرف مورچے مضبوط کر چکے تھے۔ اس کے باوجود احتیاط کے طور پر انہوں نے اپنے جاسوس بلخ اور مزار شریف کے دیگر اضلاع میں بھیج کر حالات معلوم کیے جن کے مطابق چار اضلاع میں طالبان کے حامیوں کی اکثریت تھی۔ ان مقامی باشندوں کے ذریعے فتح مزار میں حائل ممکنہ رکاوٹوں کو دور کرنے یا کچلنے کی حکمت عملی واضح کی جاتی رہی۔ تین چار دن اس تگ و دو میں گزرے۔

جمعہ ۷ اگست کا دن طالبان کے لیے کئی اہم کامیابیاں لایا۔

- طالبان کا ایک دستہ سرپل کے ضلع ''ٹینک چارک'' پر قبضہ کر کے مزار شریف سے بامیان جانے والے راستے کے قریب تر آ گیا۔ جس کی وجہ سے مزار شریف کے جنگجوؤں کو خطرہ لاحق ہو گیا کہ وہ پیچھے سے بھی گھیرے میں آ سکتے ہیں اور شکست کھانے کے بعد بامیان کی طرف راہ فرار بھی بند ہو سکتی ہے۔
- دولت آباد میں اچانک کمیونسٹوں نے طالبان کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ طالبان نے جوابی حملے کے لیے پہلی بار شبرغان ایرپورٹ استعمال کیا اور فضائی حملے کر کے دولت آباد کے کمیونسٹوں کو ازبکستان کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔
- حزب وحدت کے جنگجوؤں نے مزار شریف سے نکل کر بلخ پر حملہ کر دیا جہاں طالبان کے حامی کمانڈروں کا غلبہ تھا۔ طالبان کے چند گروپوں نے خفیہ راستوں سے کارروائیاں کر کے یہ حملہ ناکام بنا دیا۔
- طالبان کمانڈر ملا محمد فضل مزار شریف پر فیصلہ کن حملہ کرنے کے لیے 5 ہزار طالبان سپاہیوں کے ساتھ بلخ پہنچ گئے۔
- شام کو بارش کی وجہ سے مزار شریف کے گرد صحرائی علاقے میں ریت جم گئی تھی جس سے طالبان کے پیادہ دستوں کے لیے نقل و حرکت آسان ہو گئی۔

ملا فضل کی حکمت عملی: ہفتہ 8 اگست کی صبح طالبان مزار شریف پر یلغار کے لیے تیار تھے۔ اسی دن طالبان کی توجہ مزار سے ہٹانے کے لیے جنرل روزی نے ازبکوں کو منظم کر کے دولت آباد پر حملہ کر دیا۔ تاہم وہاں تعینات طالبان نے مقامی لوگوں کی مدد سے یہ حملہ ناکام بنا دیا۔ جنرل روزی کئی ٹینک اور 13 ہزار لیٹر تیل سے لدے ہوئے ٹینکر چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ طالبان مزار شریف پر حملے کے لیے پوری طرح چوکس رہے۔ بلخ کے مقامی مجاہدین نے طالبان کو مزار شریف پر حملے کے لیے تمام راستے سمجھا دیے تھے اور ان کے تین ہزار رضا کار طالبان کے ساتھ اس یلغار میں شریک تھے۔

طالبان مزار شریف کے شمال، مغرب اور مشرق میں موجود تھے۔ صرف جنوبی راستہ ان کے قبضے میں

نہیں تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ مزار کے جنوبی پہاڑی دروں پر بھی کنٹرول حاصل کرلیں اور پھر مغرب، شمال اور جنوب سے بیک وقت حملہ کریں۔ مزار شریف کے دفاع کے لیے اب صرف حزب وحدت کے ہزارہ جنگجو رہ گئے تھے۔ گردونواح سے ازبکوں کی طاقت کا صفایا ہوگیا تھا۔ مزار شریف کی شہری آبادی کا بڑا حصہ جنگ کے خوف سے محفوظ مقامات کی طرف نقل مکانی کر گیا تھا جن میں اکثریت ازبکوں اور تاجکوں کی تھی۔ البتہ ہزارہ جات اب بھی شہر میں ڈٹے ہوئے تھے۔ ان کی بستیوں اور آبادیوں میں رونق نظر آتی تھی۔ یہ لوگ شہر کے گرد خندقیں کھود کر زبردست دفاعی تیاریاں کر رہے تھے۔

مزار شریف سرنگوں ہوگیا: ہفتہ 8 اگست 1998ء کی صبح طالبان کی ہائی کمان نے فوج کو مزار شریف پر فیصلہ کن حملے کا حکم دے دیا۔ صبح 8 بجے طالبان کے دستے مزار شریف کی طرف بڑھتے نظر آئے۔ ہزارہ جات خندقوں اور مورچوں سے گولوں اور گولیوں کی بارش کر رہے تھے۔ مگر طالبان رکنے میں نہ آئے۔ ان کے سپہ سالار ملا محمد فضل بذاتِ خود گولیوں کی برسات میں گھس گئے۔ پیچھے پیچھے طالبان بھی لپکتے آرہے تھے۔ ان کے پیادہ دستوں نے نہایت سرعت سے یلغار کی اور دیکھتے ہی دیکھتے شہر کی دہلیز پر پہنچ گئے۔

طالبان نے فضائی طاقت بھی استعمال کی اور حریف کے ٹھکانوں پر شدید بمباری کی۔ اس کے علاوہ توپ خانے سے ٹینک اور دوسیلے گرجتے رہے، راکٹ داغے جاتے رہے، بکتر بند گاڑیاں آگے بڑھتی رہیں، مشین گنوں کے دہانے کھلے رہے۔ صبح 10 بجے طالبان مزاحمت کی ہر چٹان کو توڑتے پھوڑتے شہر میں داخل ہو چکے تھے۔ جو مسلح آدمی یا ہزارہ جات میں سے جو شخص ان کے سامنے آیا مارا گیا۔ ہزارہ جات کے بہت سے مسلح افراد گھروں کی کھڑکیوں اور چھتوں پر مورچے بنا کر طالبان پر فائرنگ کرتے رہے مگر جلد ہی ان کی مزاحمت دم توڑ گئی۔ دو گھنٹے کی خونریزی کے بعد شہر مکمل طور پر طالبان کے قبضے میں آگیا۔ اس کارروائی میں طالبان کے تیس افراد کام آئے جبکہ حزبِ وحدت کے جو افراد شہر میں رہ گئے تھے ان میں سے سو دو سو کے سوا سب مارے گئے۔ اس سے قبل ان کی ایک بڑی تعداد بامیان کی طرف روانہ ہوگئی تھی۔ طالبان نے مزار شریف میں قید اپنے 118 ساتھی رہا کرا لیے جبکہ 31 طالبان قیدیوں کو ہزارہ جات اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

مزار کے مفرورین کا تعاقب: عام حالات میں شاید طالبان مفرورین کا تعاقب نہ کرتے مگر انہیں یقین تھا کہ حزبِ وحدت کے جنگجو بامیان سے ازسرِ نو منظم ہو کر مزار شریف پر چڑھائی کریں گے چنانچہ مفرورین کا پوری سرعت سے تعاقب کیا گیا جس میں طالبان کے پیادہ دستوں کے علاوہ فضائیہ نے بھی حصہ لیا۔ مفرورین کی خاصی تعداد طالبان کی گولہ باری اور بمباری کی زد میں آکر ہلاک ہوگئی مگر بہت

سے افراد درۂ صوف تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں انہوں نے شاہراہ کا پُل اُڑا کر زمینی تعاقب ناممکن بنا دیا اور بامیان کی طرف نکل گئے۔ اس کارروائی میں طالبان کی فضائیہ کی عمدہ کارکردگی پر ملا محمد عمر کی جانب سے پائلٹوں کو خصوصی انعامات دیے گئے۔

طالبان مزار شریف میں: ادھر مزار شریف میں طالبان نے شہر کی تمام سڑکوں، چوکیوں اور عسکری مقامات پر قبضہ کرنے کے بعد فحش کیسٹوں کی دکانوں کو تباہ کر دیا، جگہ جگہ آویزاں خمینی اور مزاری کی تصاویر کو جلا دیا۔ شہر میں ایک ٹی وی اسٹیشن بھی تھا جو ایران نے حال ہی میں بنوایا تھا۔ برہان الدین ربانی نے صرف تین ہفتے پہلے اس کا افتتاح کیا تھا۔ اس پر روزانہ تین گھنٹے تک ایرانی نشریات چلا کرتی تھیں، طالبان نے اسے بند کر دیا۔ مزار شریف سے جو اسلحہ طالبان کے ہاتھ لگا اس میں روسی ساخت کے گیارہ اسکڈ میزائل بھی شامل تھے۔ حزب وحدت کے قیدیوں کو شبرغان جیل بھیج دیا گیا۔ ان میں 45 ایرانی ٹرک ڈرائیور بھی شامل تھے جو ایرانی سرحد سے حزب وحدت کے لیے ہتھیار لاتے ہوئے راستے میں گرفتار کر لیے گئے تھے۔

ایرانی سفارت کاروں کا قتل: مزار شریف پر قبضے کے دوران طالبان کو ایک سنگین مسئلے سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کے ایک کمانڈر نے ایرانی قونصل خانے میں گھس کر وہاں موجود ایرانی سفارت کاروں کو قتل کر ڈالا۔ اس واقعے پر ایران نے زبردست احتجاج کیا اور ساری دنیا نے اس کا ساتھ دیا۔ طالبان شروع میں ایرانی سفارت کاروں کے بارے میں لاعلمی ظاہر کرتے رہے۔ ان کے ترجمان کا کہنا تھا کہ شاید وہ لوگ طالبان کے حملے سے قبل خوفزدہ ہو کر کہیں فرار ہو گئے تھے۔ مگر جب بیرونی دباؤ حد سے بڑھ گیا تو طالبان حکومت نے تسلیم کیا کہ ایرانی سفارت کار مزار شریف کی جنگ کا نشانہ بن گئے تھے۔ تاہم ان کا قتل طالبان کے ایک کمانڈر دوست محمد نے ازخود کیا تھا، طالبان قیادت کا یہ حکم نہیں تھا۔ ایرانی سفارت کاروں کے قتل پر افغانستان اور ایران کے تعلقات آیندہ ہفتوں میں اتنے کشیدہ ہو گئے کہ دونوں ملکوں میں جنگ چھڑ جانے کے خطرات پیدا ہو گئے اور سرحدوں پر دونوں ملکوں کی فوجیں چوکس ہو گئیں۔

طالبان کا طالقان پر قبضہ: مزار شریف فتح کرنے کے بعد طالبان نے کسی وقفے کے بغیر اسی دن طالقان کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ 10 گھنٹے بعد وہ طالقان پر بھی قبضہ کر چکے تھے۔ احمد شاہ مسعود آخر تک طالقان میں تھا مگر طالبان کی اچانک یلغار سے وہ ششدر رہ گیا۔ اسے افراتفری میں طالقان سے فرار ہو کر ''پنج شیر'' جانا پڑا۔ ادھر گلبدین حکمت یار اور برہان الدین ربانی مزار شریف سے فرار ہو کر بدخشاں پہنچ چکے تھے جبکہ حزب وحدت کے لیڈر استاد محقق نے بامیان میں پناہ لے لی تھی۔ اس

پسپائی کے دوران حزب وحدت کے جنگجو مزار سے بامیان تک مختلف شہروں میں پھیل گئے تھے۔ انہوں نے سالانگ شاہراہ کے کئی اہم نقاط پر قبضہ بھی کر لیا تھا۔

قتیبہ بن مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے نقوشِ قدم پر: طالبان حزب وحدت کا قضیہ نمٹانے کے لیے جلد از جلد بامیان پر دھاوا بولنا چاہتے تھے مگر اس سے قبل سالانگ شاہراہ کو مکمل طور پر حزب وحدت سے واپس لینا ضروری تھا۔ چنانچہ طالبان نے اگلا ہدف ''خلم'' کو قرار دیا جو مزار شریف سے 60 کلومیٹر مشرق میں واقع ہے۔ کئی گھنٹوں کی جنگ کے بعد طالبان نے ''خلم'' پر قبضہ کر لیا اور حزب وحدت کے جنگجو فرار ہو کر جنوب میں نئے مورچے بنانے لگے۔ انہوں نے ''خلم'' سے 15 کلومیٹر دور ''درۂ صیاد'' کو کنٹینروں سے بند کر کے بارودی دھماکے کر دیے جس سے شاہراہ بالکل مسدود ہو گئی۔

اسی شب بی بی سی نے حزب وحدت کے ترجمان کا انٹرویو نشر کیا جس نے دعویٰ کیا کہ سمنگان میں طالبان کے حامی کمانڈروں کو بھگا دیا گیا ہے اور صوبے کے مرکز ''ایبک'' پر حزب وحدت کا کنٹرول ہو چکا ہے۔ دیگر ذرائع سے معلوم ہوا کہ ان علاقوں میں حزب وحدت طالبان کے حامیوں کا بے دریغ قتل عام کر رہی ہے۔ ادھر شاہراہ سالانگ بند ہو جانے کے بعد طالبان کی پیش قدمی رک گئی تھی۔ کنٹینروں کو ہٹانے اور ملبہ اُٹھانے میں اب تک کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔ یہ نہایت دشوار گزار مقام تھا۔ سمنگان کی طرف بڑھنے کے لیے کوئی متبادل راستہ دور دور تک موجود نہ تھا۔ کتب تاریخ کے مطابق 91ھ میں فاتح خراسان قتیبہ بن مسلم باہلی سمنگان فتح کرنے کے لیے اسی راستے سے گزرے تھے۔ اس وقت بھی حریف فوج نے اس درّے کو بند کر دیا تھا جس کی وجہ سے قتیبہ بن مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی پیش قدمی خاصے دنوں تک رکی رہی تھی۔ تیرہ سو سال کے بعد طالبان بھی اس جگہ آ کر رکنے پر مجبور ہو گئے تھے مگر ان کے پاس انتظار کا وقت نہیں تھا۔ ان حالات میں طالبان کے کمانڈروں وزیر داخلہ ملا خیر اللہ خیر خواہ اور سپہ سالار ملا فضل نے ایک عجیب منصوبہ ترتیب دیکر راتوں رات اس پر عمل کر ڈالا، انہوں نے دیکھا کہ سیدھا سفر جاری رکھنا کئی دنوں تک ممکن نہیں تو ایک نہایت طویل اور چکر دار راستہ تجویز کیا جو کئی صوبوں سے گزر کر حزب وحدت کے مورچوں کی پشت پر جا نکلتا تھا اگرچہ اسطرح تیس چالیس کلومیٹر کی جگہ اڑھائی تین سو کلومیٹر طویل سفر کرنا پڑتا مگر طالبان نے مزید تاخیر اور انتظار کی بجائے اس پر عمل کرنا ضروری سمجھا۔

طالبان کی حیرت انگیز جنگی چال: ان کی فوج کا کچھ حصہ نمائشی طور پر وہاں رکا رہا جبکہ بڑا حصہ خلم سے جنوب کی طرف آگے بڑھنے کی بجائے مشرق میں قندوز کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس فوج کی قیادت ملا فضل کر رہے تھے۔ 7 گھنٹوں میں یہ فوج قندوز پہنچی۔ قندوز سے اس نے صحرا کا دشوار گزار راستہ

اختیار کیا اور بغلان پہنچ کر جنوب کی طرف مڑ گئی۔ یہاں سے اس نے ایک غیر معروف کچے راستے پر پیش قدمی کی۔ 25، 26 گھنٹوں کے مسلسل سفر کی وجہ سے طالبان بھوک اور پیاس سے بے حال ہو رہے تھے۔ تاہم وہ سمنگان کے مرکز ''ایبک'' کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

''ایبک'' اور ''پل خمری'' کے درمیان ''اباطک'' کے مقام پر طالبان کی چند ٹولیاں موجود تھیں جبکہ اس جگہ سے 35 میل دور ''ایبک'' شہر کسی فوج سے بالکل خالی تھا کیوں کہ حزب وحدت کے تمام جنگجو طالبان کو روکنے کے لیے درّۂ صیاد کی طرف چلے گئے تھے۔ انہیں پشت سے کسی حملے کا خیال تک نہیں تھا۔

ملا فضل کے تھکے ماندے مگر پُر جوش لشکر نے ''ایبک'' کو ایک گولہ داغے بغیر اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس کے بعد یہ لشکر حزب وحدت پر بڑا حملہ کرنے آگے روانہ ہوا جہاں درے پر حزب وحدت کے سپاہی پہرہ دے رہے تھے جبکہ خلم میں موجود طالبان کی تھوڑی سی فوج ان پر ہلکی پھلکی گولہ باری کر رہی تھی تا کہ وہ پشت سے بالکل غافل رہیں۔ ملا فضل کا لشکر جب درّے کے قریب پہنچا تو حزب وحدت کے اکثر جنگجو بے فکر ہو کر آرام کر رہے تھے۔ بہت سے سپاہی قریب بہتے دریا میں تیر رہے تھے۔ طالبان کا یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ وہ ہکا بکا رہ گئے۔ کسی کو بھاگنے کا موقع نہ مل سکا۔ بہت سے مارے گئے جبکہ باقی ماندہ تمام افراد گرفتار ہو گئے۔ اس طرح مزار شریف سے لے کر خلم، ایبک اور سمنگان تک کا پورا علاقہ طالبان کے کنٹرول میں آ گیا۔ شاہراہ سالانگ بھی اب ان کے قبضے میں تھی۔

درّۂ کیان کی پراسرار دنیا: افغانستان میں غیر ملکی سازشوں کا ایک اور اہم مرکز ''درّہ کیان'' تھا۔ یہ گزشتہ 800 برس سے اسماعیلی فرقہ (آغا خانیوں) کا مرکز تھا۔ یہ جماعت دراصل حسن بن صباح کے ''باطنی گروہ'' سے تعلق رکھتی ہے۔ پانچویں صدی ہجری کے اواخر میں حسن بن صباح نے شمالی ایران کے کوہستانی علاقے ''قزوین'' میں ''الموت'' نامی پہاڑ کی چوٹی پر ایک ناقابل تسخیر قلعے کو اپنا مرکز بنایا تھا۔ اس قلعے کو ''آشیانۂ عقاب'' بھی کہا جاتا تھا۔ حسن بن صباح نے اپنے خنجر بردار فدائیوں کے ذریعے پوری دنیا کو اتنا دہشت زدہ کیا کہ بہت سی حکومتیں اسے خراج دیتی تھیں۔ اس کے جانشینوں نے مزید ڈیڑھ صدی تک اس سلسلے کو قائم رکھا۔ آخر کار ساتویں صدی ہجری میں ہلاکو خان کے ہاتھوں ''الموت'' کا قلعہ تباہ اور باطنی گروہ ختم ہوا۔ اس جماعت کے باقی ماندہ افراد ادھر اُدھر بکھر گئے۔

ان کے کچھ لوگ افغانستان کے درّۂ کیان میں آ کر آباد ہو گئے۔ رفتہ رفتہ یہ جگہ ان کا نیا مرکز بن گئی۔ ''الموت'' کی یاد میں یہاں بھی جگہ جگہ عقاب کی تصاویر، مجسمے اور علامات نمایاں تھیں۔ منصور نادری اس مرکز کا سربراہ تھا۔ وہ طالبان مخالف گروہوں اور کمانڈروں کو معاشی امداد دینے میں سب سے آگے آگے

تھا۔صرف ان تین مہینوں میں اس نے طالبان مخالف کمانڈروں میں 5 کروڑ تقسیم کیے تھے۔طالبان کے حملے کے خطرے پیش نظر اس نے فرانس سے رابطے تیز کر دیے تھے جہاں آغا خانی جماعت کے پیشوائے اعظم ”آغا خان“ کی سکونت ہے۔طالبان کو درۂ کیان کے قریب دیکھ کر آغا خان کے حکم کے مطابق دنیا بھر کی تمام آغا خانی عبادت گاہوں میں ”ستارۂ“ نامی خاص عبادت شروع کر دی گئی جو عموماً سات دن تک کی جاتی ہے مگر اس نازک وقت میں یہ ایک تسلسل سے کی جاتی رہی۔

طالبان کی منصور نادری کو دھمکی: فتح مزار شریف کے تین دن بعد طالبان پل خمری تک پہنچ گئے۔منصور نادری کا بیٹا سید نادری جو یہاں کا کنٹرول سنبھالے ہوا تھا، فرار ہو گیا۔11 راگست کو طالبان نے پل خمری پر قبضہ کر لیا۔ساتھ ہی انہوں نے منصور نادری کو دھمکی دی کہ وہ دس دن کے اندر اندر درۂ کیان کو خالی کر دے۔

منصور نادری نے فوراً آغا خان سے رابطہ کیا۔جواب میں آغا خان نے اسے اطمینان دلایا اور خاص مدد کا وعدہ کیا۔تاہم کئی دنوں تک خاموشی چھائی رہی۔جب طالبان کی دی ہوئی ڈیڈ لائن میں صرف ایک دن رہ گیا، تب اچانک امریکا نے شمال مشرقی افغانستان پر حملہ کر دیا۔یہ حملہ کروز میزائلوں سے کیا گیا تھا۔اس کا خاص نشانہ خوست میں اسامہ بن لادن کے عسکری تربیتی کیمپ تھے۔20اگست 1998ء کو کی جانے والی اس کارروائی میں 20 افراد شہید اور 30 زخمی ہوئے جن میں زیادہ تر افغان اور پاکستانی تھے۔امریکا دنیا کو یہ باور کرانے لگا کہ اس نے جوابی کارروائی کی ہے۔7اگست 1998ء کو کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارت خانوں کو بموں سے اُڑا دیا گیا تھا جس میں 224 افراد ہلاک اور 500 کے لگ بھگ زخمی ہوئے تھے۔امریکا کا کہنا تھا کہ یہ کارروائیاں اسامہ بن لادن نے کروائی تھیں جن کا جواب دینا ناگزیر تھا۔تاہم طالبان حکومت اور عوام نے امریکی الزام کو مسترد کر دیا۔ملک بھر میں امریکا کے خلاف احتجاجی مظاہرے ہوئے۔طالبان سربراہ ملا محمد عمر نے اپنے بیان میں کہا کہ امریکی صدر بل کلنٹن نے وائٹ ہاؤس کے شرمناک اسکینڈل سے دنیا کی توجہ ہٹانے کے لیے یہ کارروائی کی ہے۔ (واضح رہے کہ ان دنوں صدر کلنٹن کو ”مونیکا لیونسکی“ نامی ایک لڑکی سے ناجائز تعلقات رکھنے کی وجہ سے عالمی سطح پر شدید خفت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔)

درۂ کیان طالبان کے قبضے میں: خوست کے معسکر پر امریکی حملے سے طالبان مخالف قوتوں کو اطمینان ہو گیا کہ طالبان اب امریکا کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں گے اور امریکا دباؤ ڈال کر درۂ کیان پر ان کا حملہ بھی رکوا دے گا۔حملے کی خبر سن کر منصور نادری بے حد خوش تھا۔درۂ کیان میں جشن منایا گیا اور منصور نادری نے فون کر کے آغا خان کا ”خصوصی مدد“ پر شکریہ ادا کیا۔رات بھر وہ شراب کے جام

لنڈھاتا اور اپنے پالتو کتے سے کھیلتا رہا۔ مگر صبح دم طالبان کی یلغار کی خبر نے اس کا نشہ ہرن کردیا۔ طالبان کی مارٹر توپ کا ایک گولہ سیدھا اس طاقتور سیٹلائٹ فون سسٹم کو آ کر لگا جس سے نادری فرانس میں آغا خان سے رابطہ کیا کرتا تھا۔ انجام قریب دیکھ کر اس نے راہ فرار اختیار کرنے میں عافیت جانی۔ دو دن بعد طالبان درۂ کیان میں داخل ہو گئے۔ وادی کی خوبصورت عمارتوں کی رعنائی اور عقاب کی شکل والا محل دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ پہاڑ پر چڑھنے والی ٹرین نما لفٹ بھی ایک نئی چیز تھی۔ یہاں سے اسلحے کے اتنے زیادہ انبار برآمد ہوئے کہ صرف ایک ڈپو کو 500 کارکن تین دن تک ٹرکوں میں لادتے رہے۔ عقاب کی شکل والا محل توپوں سے اڑا دیا گیا۔

تخار بھی طالبان کے ہاتھ میں: شمال میں بھی طالبان کی فتوحات جاری تھیں۔ انہوں نے طالقان کے مرکز تخار پر حملہ کیا اور آناً فاناً شہر پر قبضہ کرلیا۔ مسعود نے وہاں مشہور کر رکھا تھا کہ طالبان شہر پر قبضہ کر کے عورتوں کو باندیاں بنائیں گے۔ اس خوف سے ہزاروں لوگ طالبان کے آنے کی خبر سن کر بھاگ نکلے تھے مگر بعد میں جب انہیں طالبان کی طرف سے مکمل تحفظ کا یقین ہوا تو وہ آہستہ آہستہ اپنے گھروں کو واپس آ گئے۔

اسامہ کی حوالگی۔ ملا عمر اور سعودی شہزادہ: کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارت خانوں کی تباہی کے بعد امریکا نے سعودی عرب اور پاکستان پر دباؤ بڑھا دیا کہ وہ طالبان کو رضا مند کر کے اسامہ بن لادن کو گرفتار کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ چنانچہ 19 راگست 1998ء کو سعودی عرب کے محکمہ خفیہ اطلاعات کے سربراہ شہزادہ ترکی الفیصل اور پاکستان کی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل محمود احمد، ملا محمد عمر سے قندھار میں ان کی رہائش گاہ پر ملے۔

یہ دونوں ملا محمد عمر پر دباؤ ڈالتے رہے کہ اسامہ کو ملک بدر یا حکومت سعودیہ کے حوالے کردیا جائے۔ جب طالبان سربراہ نے اسامہ کو ملک بدر کرنے یا سعودی عرب کے حوالے کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ اسامہ کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے سعودی اور افغان علماء کی ایک کونسل تشکیل دی جا سکتی ہے تو شہزادہ ترکی کو غصہ آگیا اور انہوں نے ملا محمد عمر کو اسامہ بن لادن کے جرائم کی سنگینی بتانا شروع کی مثلاً یہ کہ وہ سعودی شاہی خاندان کا مخالف ہے اور امریکی افواج کو وہاں سے نکالنے کے نام پر عرب نوجوانوں کو بھڑکا رہا ہے۔ ملا محمد عمر نے صبر وتحمل سے کام لیتے ہوئے شہزادے کو سمجھایا کہ امریکی افواج کی سرزمین عرب میں موجودگی واقعی ناقابل برداشت چیز ہے اور نئی سعودی نسل اس کے خلاف ہے۔

طالبان سربراہ نے شہزادے کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ اور دنیا کے تمام مسلمان مل کر ان کی مدد کریں گے اور ان کے ملک کو امریکی تسلط سے آزاد کرائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کے پاس

اسامہ بن لادن کا تحریری وعدہ ہے کہ وہ افغانستان کی سرزمین سے کسی تشدد آمیز کارروائی میں حصہ لے کر طالبان کا اعتماد پاش پاش نہیں کرے گا۔ مگر ملا محمد عمر کی ان سنجیدہ باتوں کے جواب میں شہزادے نے مزید برافروختہ ہو کر ان پر سعودی شاہی خاندان کی بے عزتی کا الزام عائد کر دیا اور گفتگو منقطع کر کے واپس چلے گئے۔ آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل بھی خاموشی سے لوٹ آئے اور یہ بات چیت لاحاصل رہی۔ اس کے بعد سعودی عرب سے طالبان کے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور پاکستان سے بھی روابط میں اعتماد کا فقدان دیکھنے میں آیا۔

هزارہ جات: ہزارہ شیعوں کا مرکز بامیان اب طالبان کی زد میں تھا۔ یہ مقام وسطی افغانستان میں کوہ بابا کے بلند و بالا پہاڑوں اور نہایت پر پیچ درّوں کے درمیان واقع ہے۔ اس لیے تاریخ عالم میں بہت کم فاتح یہاں تک پہنچنے کی ہمت کر سکے۔ ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) میں چنگیز خان بامیان کا محاصرہ کرنے اور اسے فتح کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس زمانے میں یہاں جس نسل کے مسلمان آباد تھے وہ سب تاتاریوں کے ہاتھوں تہ تیغ ہو گئے تھے۔ بعد کی صدیوں میں یہاں فاتح تاتاریوں اور مفتوح تاجک اور ترک باشندوں کے درمیان ازدواجی سلسلے شروع ہوئے تو ایک نئی نسل وجود میں آئی جو ہزارہ جات کہلائی۔ ان کے چھریرے جسم، تیکھے نقوش اور قدرے پستہ قد و قامت سے بھی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ 1893ء میں امیر عبدالرحمن نے یہ علاقہ فتح کیا تھا۔ اس سے قبل کئی صدیوں تک یہ لوگ آزاد رہے تھے۔ طالبان نے ایک سال سے بامیان کو جانے والے کئی راستے بند کر رکھے تھے جس سے محاصرے کی شکل پیدا ہو گئی تھی مگر اس کے باوجود فضائی راستے سے ایرانی طیارے ہر قسم کی رسد لا رہے تھے۔ ایران نے یہاں ایک بڑا رن وے بھی تعمیر کرا دیا تھا۔ اب طالبان کو بامیان کے دروازے پر دیکھ کر ایران سب سے زیادہ واویلا کر رہا تھا۔ اس نے اپنی فوج کا ایک حصہ افغانستان کی سرحد پر لا کھڑا کیا تھا تاکہ طالبان پر دباؤ ڈال کر انہیں بامیان پر لشکر کشی سے باز رکھے مگر طالبان نے کسی قسم کے دباؤ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ستمبر 1998ء کے آغاز میں بامیان پر ہلا بول دیا۔

بامیان پر قبضہ: طالبان دنیا کا ایک مشکل ترین دفاعی مقام "درۂ شبر" عبور کر کے اتوار 12 ستمبر کو بامیان میں داخل ہو گئے۔ 13 ستمبر 1998ء کو بامیان مکمل طور پر ان کے قبضے میں آ گیا۔ اس سے قبل شیعہ لیڈر کریم خلیلی اور حزب وحدت کے دوسرے کمانڈر ہزاروں جنگجوؤں اور مقامی باشندوں کے ساتھ پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ کریم خلیلی نے آخری لمحات میں احمد شاہ مسعود سے درخواست کی تھی کہ وہ بامیان کے دفاع میں اس کی مدد کرے مگر مسعود نے صاف انکار کر دیا۔ بامیان پر طالبان کے قبضے کو

ایک تاریخ ساز فتح کہا جاتا ہے۔

کابل سائنس اکیڈمی کے سربراہ محمد حسین کے بقول ''اسلامی تاریخ کی چودہ صدیوں میں طالبان وہ پہلے مسلمان حکمران ہیں جنہوں نے اس مقام کو بزور قوت فتح کیا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم درہ شبر تک آئے تھے اور جزیہ لے کر واپس چلے گئے تھے۔ کوئی فاتح اس درے سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ یہ توفیق صرف طالبان کو ملی۔''

بامیان سے طالبان کو بہت بڑی مقدار میں ایرانی اسلحہ ہاتھ لگا۔ راکٹ، مشین گن اور کلاشن کوف کی گریس بند پیٹیوں کے انبار تھے جو کئی ڈپوؤں میں محفوظ تھے۔ 4 ہیلی کاپٹر اور 30 ٹینک بھی ملے۔ گزشتہ چار سال سے یہ مقام ایران کی سازشوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ یہاں رن وے تعمیر کرا کے ایران نے مسلسل پروازوں کے ذریعے کمک اور اسلحہ بھیجنے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا، روزانہ دس تا پندرہ پروازیں آتی تھیں۔

قیدیوں پر مظالم: بامیان کی جیل میں طالبان کے 98 قیدی محبوس تھے جنہیں ہزارہ جات مزار شریف سے فرار ہوتے ہوئے ساتھ لے آئے تھے۔ ان میں سے کچھ قیدی احمد شاہ مسعود کے حوالے کر دیے گئے تھے جنہیں وہاں سے ایران لے جایا گیا تھا۔ طالبان کے بامیان پر حملے کے وقت باقی ماندہ قیدیوں کے بارے میں کریم خلیلی نے فرار ہونے سے قبل حکم دیا تھا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ حزب وحدت کے جنگجوؤں نے دستی بموں، راکٹوں اور رائفلوں سے ان کوٹھڑیوں پر ہلہ بول دیا جن میں طالبان بند تھے۔ یہ 10x14 فٹ کے کمرے تھے جن میں قیدی بری طرح ٹھونسے گئے تھے۔ اندھا دھند فائرنگ، راکٹ باری اور دستی بموں کے پھٹنے سے 28 قیدی موقع پر شہید ہو گئے جبکہ تقریباً باقی تمام قیدی بری طرح زخمی ہوئے۔ اکا دکا ہی معجزانہ طور پر محفوظ رہے۔

حزب وحدت کے جنگجو یہ دیکھے بغیر کہ قیدیوں کا کیا انجام ہوا، طالبان کی آمد کے پیش نظر بھاگ نکلے۔ چھ گھنٹے بعد طالبان وہاں پہنچے تو ایک طالب علم جیل کی چھت پر چڑھ گیا۔ اس نے اپنے پھٹے ہوئے کرتے سے سفید پرچم بنا کر لہرایا تا کہ طالبان حملہ نہ کر بیٹھیں۔ زخمی قیدیوں نے حزب وحدت کے مظالم کی جو تفاصیل بیان کیں، وہ نہایت لرزہ خیز تھیں۔ قیدیوں کو گرم سلاخوں سے داغا جاتا تھا حتیٰ کہ ان کا گوشت جھڑ جاتا تھا۔ بعض قیدیوں کو گاڑی تلے کچل کر ہلاک کیا گیا۔ کئی قیدیوں کی داڑھیاں بال بال کر کے نوچ ڈالی گئیں۔ اذیت ناک سزائے موت کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ دو تیز دھار خنجروں کے دستے زمین میں گاڑ کر قیدی کو ان کی نوک پر پیٹ کے بل لٹا دیا جاتا۔ ایک اور بہیمانہ انداز یہ تھا کہ ٹانگیں رسوں کے ذریعے دو گاڑیوں سے باندھ کر گاڑیاں مخالف سمت چلائی جاتیں جن سے جسم دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا۔ ذہنی اذیتوں کی بھی انتہا کر دی گئی تھی۔ خلفائے ثلاثہ کے اسمائے گرامی زمین پر لکھ کر

انہیں جوتوں سے روندا جاتا۔ ناپاکی سے ان مقدس شخصیات کے ناموں کو آلودہ کیا جاتا۔ (نعوذ باللہ)

ایرانی فوج کا افغان سرحد پر اجتماع: بامیان پر طالبان کے قبضے سے افغانستان میں ایران نواز حزبِ وحدت کا عسکری و سیاسی اثر و رسوخ ختم ہو کر رہ گیا۔ ایران جو صدیوں سے افغانستان کے سیاسی معاملات میں دخل اندازی کا عادی تھا، اسے برداشت نہ کر سکا۔ وہ ہر حال میں افغانستان میں اپنے نمایندوں کو مضبوط تر دیکھنا چاہتا تھا۔ ایران کی قومی اسمبلی میں افغانستان کے خلاف فوجی کارروائی کی قرارداد منظور ہوئی اور اکتوبر 1998ء میں دو لاکھ ایرانی فوج افغانستان کی سرحدوں پر امنڈ آئی۔ طالبان نے اس صورتِ حال کا نہایت پامردی سے سامنا کیا۔ 2 لاکھ ایرانی فوج کے مقابلے میں وہ صرف پانچ ہزار افراد کھڑے کر سکے مگر ساتھ ہی انہوں نے ایران کو خبردار کیا کہ جنگ کی صورت میں وہ ایران کے اندر گھس جائیں گے، طالبان کی بے خوفی دیکھ کر حکومت ایران یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

صلح وصفائی: اب سلامتی کونسل بھی دونوں ملکوں میں بیچ بچاؤ کے لیے متحرک ہوگئی۔ اس کے نمایندے لخدار براہیمی نے طالبان سربراہ ملا محمد عمر سے ملاقات کی اور آخر کار معاملہ خوش اسلوبی سے سلجھ گیا۔ طالبان نے گرفتار شدہ ایرانی ٹرک ڈرائیور اور فوجی افسران رہا کر دیے۔ مقتول ایرانی سفارت کاروں کی لاشیں واپس کر دیں۔ ایران نے اپنی افواج پیچھے ہٹا لیں۔

فتوحات کا دھارا تھم گیا: بامیان کی فتح طالبان کے سات سالہ دورِ حکومت میں فتوحات کا نقطۂ عروج تھا۔ اس فتح کے ساتھ طالبان احمد شاہ مسعود کے زیرِ قبضہ شمال مشرق کے تھوڑے سے علاقے کو چھوڑ کر پورے افغانستان کے بلا شرکتِ غیرے مالک بن گئے تھے۔ ملک کا 90 فیصد رقبہ اب ان کے پاس تھا۔ طورخم سے لے کر مزار شریف تک اور اسپین بولدک سے دریائے آمو تک کے وسیع و عریض علاقے میں کوئی مزاحمتی قوت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ حزبِ اسلامی، جمعیت اسلامی، جنبش ملی، حزبِ وحدت اور آغانی عناصر سمیت تمام مخالفین کا قلع قمع ہو گیا تھا۔ بلاشبہ ان دنوں طالبان کی سطوت کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی عجیب حقیقت تھی کہ طالبان کی فتوحات کا دھارا یہاں پہنچ کر ایسا تھما کہ پھر کسی طرح آگے بڑھنے میں نہ آیا۔ 1995ء سے شروع ہونے والی حیرت ناک کامیابیوں کی کہانی یہاں آکر ختم ہوگئی۔ اس کے بعد طالبان کو پیچھے تو ہٹنا پڑا مگر آگے بڑھنے کا موقع نہ مل سکا۔

احمد شاہ مسعود کے جارحانہ حملے: بامیان پر طالبان کے تسلط کے ساتھ افغانستان میں طاقت کا توازن یکدم بدل گیا۔ اب طالبان کے مدِ مقابل کوئی نہ تھا سوائے احمد شاہ مسعود کے جو پنج شیر سے لے کر تخار

تک کوہ ہندوکش کی چوٹیوں پر مورچے بنا کر طالبان کے سامنے ڈٹا ہوا تھا۔ وہ اپنے دفاع کے ساتھ ساتھ جارحانہ حملوں کی بھی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ بلاشبہ وہ نہایت زیرک، ماہرفن، اور کہنہ مشق کمانڈر تھا۔ اس نے تین اطراف سے طالبان کے سخت ترین محاصرے میں رہنے کے باوجود ہتھیار نہ ڈالے اور پنج شیر سمیت اپنے بچے کھچے تمام علاقے کا بڑی کامیابی سے دفاع کیا۔ طالبان سرتوڑ کوشش کے باوجود آخر تک اس پر قابو نہ پاسکے۔

لاحاصل لڑائیاں: اکتوبر 1998ء میں جبکہ طالبان ایران سے جنگ کی تیاری میں مشغول تھے، احمد شاہ مسعود نے شمال مشرقی وادیوں میں نئی جنگ چھیڑ کر کا پیسا، پروان اور قلعہ مراد بیگ سمیت طالبان سے کئی اضلاع واپس لے لیے۔ ان میں تاجکستان اور ازبکستان کی سرحدوں سے ملا ہوا علاقہ بھی شامل تھا۔ یہ علاقہ دوبارہ ہاتھ آجانے سے احمد شاہ مسعود کے لیے کمک و رسد کا راستہ کھل گیا اور طالبان کا محاصرہ بے اثر ہو گیا۔ افغانستان میں طالبان کے مخالف کمانڈر اب احمد شاہ مسعود کے گرد جمع ہو گئے تھے کیونکہ اس کے سوا کوئی اور بڑا لیڈر باقی نہیں رہا تھا جو طالبان سے مقابلے کی ہمت کر سکتا۔ ان کمانڈروں نے 7 دسمبر 1998ء کو اتفاق رائے سے احمد شاہ مسعود کو طالبان مخالف گروپوں کا سربراہ منتخب کر لیا۔ اگست 1999ء میں طالبان نے کابل کے شمال مشرقی اضلاع مسعود سے دوبارہ چھین لیے اور پنج شیر کے قریب پہنچ گئے مگر چند دنوں بعد انہیں الٹے قدموں پیچھے ہٹنا پڑا اور تاجکوں کی بغاوت کے خوف سے وہ ایک بار پھر کابل کی طرف پسپا ہو گئے۔ اس کے بعد ستمبر 1999ء سے لے کر ستمبر 2001ء تک طالبان اور احمد شاہ مسعود کے زیر کمان جنگجوؤں میں وقتاً فوقتاً خونریز جنگیں ہوتی رہیں مگر کوئی بڑی تبدیلی رونما نہ ہو سکی۔ کبھی طالبان ان کی دو چار چوکیوں پر قبضہ کر لیتے اور کبھی وہ طالبان کو کچھ پیچھے دھکیل دیتے، دو سالوں میں طالبان اور احمد شاہ مسعود کی پوزیشن تقریباً جوں کی توں رہی۔

مآخذ و مراجع

...... حسب سابق۔ نیز 1998ء تا 2001ء کے قومی اخبارات و جرائد

چونتیسواں باب

طالبان کے خلاف عالمی سازشیں

1999ء کے اہم واقعات: اپنی فتوحات کے نقطۂ عروج پر پہنچنے اور ملک کے 90 فیصد سے زائد رقبے پر چودہ سو سال قبل کے اسلامی احکام نافذ کرنے کے بعد طالبان دنیا بھر میں ایک مسلم بنیاد پرست حکومت کی حیثیت سے مشہور ہو گئے تھے۔ غیر انہیں تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے جبکہ پوری دنیا میں کفریہ طاقتوں سے نبرد آزما اسلامی تحریکیں اور مجاہدین ان کو ایک قابلِ تقلید مثال کے طور پر قبول کرتے جا رہے تھے۔ یہ طالبان کی حکومت کا چوتھا سال تھا۔ اس میں طالبان کے اثر و رسوخ میں نہ صرف علاقائی بلکہ عالمی طور پر بھی اضافہ ہوا تاہم ان کے خلاف زیرِ زمین سازشیں بھی پروان چڑھتی رہیں۔

وردک کا زلزلہ: سال کے آغاز میں جب برف باری زوروں پر تھی طالبان کو ایک سنگین مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ وسط فروری 1999ء کے دن تھے کہ صوبہ کابل کے علاقے ''وردک'' میں ہولناک زلزلے سے درجنوں دیہات تہ و بالا ہو گئے۔ سات ہزار مکانات ملبے کا ڈھیر بن گئے۔ طالبان حکومت پہلے ہی مالی طور پر کمزور تھی تاہم اس نے پوری تندہی سے متاثرین کی از سرِ نو آبادکاری کا کام شروع کر دیا۔ حکومت پاکستان نے امدادی کاموں کے لیے 10 کروڑ روپے کا عطیہ دیا جبکہ پاکستانی عوام نے بھی دل کھول کر مدد کی۔

بامیان پر حزبِ وحدت کا قبضہ: مارچ 1999ء کے اواخر میں ''میمنہ'' کے علاقے میں ایرانی اسلحے کا ایک بہت بڑا خفیہ ڈپو دریافت ہوا جس میں ایرانی G-3 رائفل کی 72 لاکھ گولیاں اور D-C توپ کے 6 ہزار گولے تھے۔ اب تک دریافت ہونے والے ذخائر میں یہ ایرانی اسلحے کا سب سے بڑا ذخیرہ تھا۔ طالبان کو اتنا احساس تو تھا کہ بامیان کی فتح کے بعد بھی حزب وحدت اور ایران احمد شاہ مسعود کی ملی بھگت سے کسی نئے آپریشن کی تیاری میں مصروف ہیں۔ مگر وہ ان کے منصوبوں کی تفصیل سے واقف نہ تھے۔ ایران اور احمد شاہ مسعود میں گہرے تعلقات استوار ہونے کا پتا اس سے بھی چلتا ہے کہ کچھ مدت قبل احمد

شاہ مسعود نے پنج شیر جیل میں قید 85 طالبان کو تاجکستان کے راستے ایران بھیج دیا تھا۔ ان قیدیوں میں بامیان جیل کے 15 طالبان قیدی بھی شامل کر لیے گئے تھے۔ ان کو چھ ماہ تک ایرانی جیل خانے میں رکھا گیا۔ اب مارچ 1999ء کے وسط میں ایران نے اچانک یہ قیدی دوبارہ احمد شاہ مسعود کے سپرد کر دیے تھے۔ ان انکشافات کے باوجود یہ جاننا مشکل تھا کہ اندر کیا کھچڑی پک رہی ہے؟ حقیقت یہ تھی کہ مسعود اور کریم خلیلی ایک نئی جنگ کی منصوبہ بندی کر چکے تھے۔ جس کے لیے طالبان بروقت مناسب پیش بندی نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ 21 اپریل 1999ء کو حزب وحدت کے جنگجو اچانک پہاڑوں سے نیچے اُترے اور دیکھتے ہی دیکھتے بامیان پر دوبارہ قابض ہو گئے۔ انہوں نے حسب عادت اردگرد کی شاہراہوں پر لوٹ مار شروع کر دی۔ بہت سے مسافروں کو قتل کر دیا گیا۔ ان کی زد سے بچ نکل کر آنے والے ایک ڈرائیور نے صحافیوں کو بتایا کہ اس کے سامنے پانچ گاڑیوں کو مسافروں سمیت جلا دیا گیا۔ کئی افراد کے سروں میں میخیں ٹھونکی جا رہی تھیں۔

بعد میں گھیر کر مارنا: بامیان پر ازسرنو قبضہ کر لینا حزبِ وحدت کی بہت بڑی کامیابی تھی مگر یہ خوشی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی کیونکہ جلد ہی کابل سے ملا فضل اور ملا برادر کی کمان میں تازہ دم طالبان بامیان کے قریب آن پہنچے۔ جب انہوں نے حزب وحدت کو پسپا کر کے بامیان جانے والے راستے کی ایک اہم چوکی ''آق رباط'' پر قبضہ کیا تو کریم خلیلی نے احمد شاہ مسعود سے رابطہ کر کے مشورہ طلب کیا۔ مسعود نے اپنی جنگی مہارت کے زعم میں اس موقع پر ایک عجیب مشورہ دیا۔ اس نے کہا: ''طالبان کو ''آق رباط'' سے آگے آنے دو۔ بعد میں گھیر کر مارنا۔'' طالبان کمانڈر ملا فضل جب آق رباط پر قبضہ مستحکم کرنے کے بعد آگے بڑھے تو کریم خلیلی مسعود کی حکمت عملی پر آنکھیں بند کر کے عمل کرتے ہوئے انہیں کھلی پیش قدمی کا موقع دیتا رہا۔ جب طالبان بامیان کے قریب تنگ گھاٹیوں میں پہنچے تو کریم خلیل نے انہیں گھیرنے کی کوشش کی مگر اسے معلوم نہ تھا کہ طالبان کا دوسرا لشکر ملا برادر کی قیادت میں دوسری سمت سے آزادانہ نقل وحرکت کر رہا ہے۔ جب ملا برادر نے دوسری طرف سے حزبِ وحدت پر حملہ کیا تو طالبان کو گھیرنے کی منصوبہ بندی خاک میں مل گئی۔ کریم خلیلی اپنی ملیشیا کے ساتھ فرار ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اتوار 10 مئی 1999ء کو دن بارہ بجے طالبان بامیان پر دوباہ قبضہ کر چکے تھے۔

قندھار کی علماء ومشائخ کانفرنس: اس سال طالبان قیادت نے ملکی وغیر ملکی علماء ومشائخ اور دینی جماعتوں کے سربراہوں سے روابط مزید بہتر اور پختہ بنانے پر بھی توجہ دی جس کی بنا پر عالمِ اسلام کے ایک بڑے حلقے میں ان کے لیے فضا ہموار ہوئی۔ اس سلسلے میں قندھار کی ''علماء ومشائخ کانفرنس'' خاص

اہمیت رکھتی ہے۔ جولائی 1999ء کے اواخر میں منعقد ہونے والی اس کانفرنس میں 20 ہزار سے زائد علمائے کرام، مشائخ تصوف اور دینی راہنماؤں نے شرکت کی اور طالبان سے یکجہتی کا اظہار کیا۔

ملا محمد عمر پر قاتلانہ حملہ: طالبان حکومت کو ہر لحاظ سے اپنے مقاصد کے خلاف پا کر مغربی طاقتوں نے افغانستان میں موجود اپنے گماشتوں کو براہ راست طالبان قیادت کو قتل کرنے کا ہدف دے دیا۔ جنگی مہمات میں کروڑوں ڈالر جھونکنے کی بہ نسبت یہ ہدف حاصل کرنا آسان تھا کیونکہ نہ صرف طالبان کے قائدین اور جرنیل بلکہ سربراہ مملکت ملا محمد عمر بھی کسی خاص سیکیورٹی کے بغیر رہتے تھے۔ منصوبے کے مطابق ایک دن پانچ ہزار کلوگرام بارود سے لدا ہوا ٹرک ملا محمد عمر کی رہائش گاہ کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ کسی نے اس ٹرک کو روکنے یا چیک کرنے کی کوشش نہ کی۔ جب یہ دھماکا خیز مواد پھٹا تو ہر طرف آگ اور دھوئیں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ خوفناک دھماکا میلوں دور تک سنا گیا۔ اردگرد کے راہ گیر، طالبان کے کئی کارکن اور ملا عمر کے اہل خاندان میں سے کئی افراد اس کی لپیٹ میں آ کر جاں بحق ہو گئے۔ البتہ ملا محمد عمر خود معجزانہ طور پر محفوظ رہے۔ حملے کی تحقیقات کے بعد طالبان کی تفتیشی ٹیم نے بتایا کہ اس میں بیرونی طاقتیں ملوث تھیں۔ ماہرین کی رپورٹ کے مطابق دھماکے میں ایٹمی مواد بھی استعمال کیا گیا تھا۔ یہ اگست 1999ء کے آخری ہفتے کا واقعہ ہے۔

میاں نواز شریف کا تختہ اُلٹ دیا گیا: مغربی طاقتوں کو طالبان کے ہاں اسامہ بن لادن کے تربیتی کیمپوں سے تشویش تھی تو حکومت پاکستان کو بھی شکایت تھی کہ پاکستان کے کئی مطلوبہ ملزم افغانستان میں پناہ لیے ہوئے ہیں جو شیعہ سنی دہشت گردی میں ملوث ہیں۔ اکتوبر 1999ء کے آغاز میں پاکستان کے وزیر اعظم میاں نواز شریف کا لہجہ اس بارے میں نہایت سخت ہو گیا۔ انہوں نے طالبان پر یہ الزام عائد کیا کہ پاکستان میں دہشت گردی کرنے والے مجرم ان کی حدود میں عسکری تربیت لے رہے ہیں۔ میاں نواز شریف نے طالبان حکومت پر زور دیا کہ وہ دہشت گردی ختم کرنے میں ان سے تعاون کریں۔ طالبان سربراہ نے جواب میں ان الزامات کو مسترد کرتے ہوئے یہ یقین دلایا کہ وہ ہر قسم کی دہشت گردی کے خلاف ہیں اور اس بارے میں ہر ممکنہ تعاون کے لیے تیار ہیں۔ ہو سکتا تھا کہ اس بارے میں دونوں حکومتوں میں مزید ... لے دے ہوتی مگر اچانک 12 اکتوبر 1999ء کو پاکستان کے چیف آف آرمی اسٹاف جنرل پرویز مشرف نے میاں محمد نواز شریف کا تختہ اُلٹ دیا اور خود ملک کی باگ ڈور سنبھال لی۔ پرویز مشرف شروع میں طالبان کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنے کے خواہاں نظر آئے اور نواز شریف کے آخری ایام میں دونوں حکومتوں کے درمیان کشیدگی کا جو ماحول پیدا ہونے جا رہا تھا وہ ختم ہو گیا۔

طالبان اور دنیا کے مظلوم مسلمان: اس سال عالم اسلام کے مختلف حصوں میں مسلمانوں پر مظالم کے نئے سلسلے شروع ہوئے۔ طالبان حکومت نے ہر موقع پر مظلوم مسلمانوں کی بھرپور حمایت کی۔ مئی میں سربیا کی دہشت گرد فوج نے کوسوو پر یلغار کی تو طالبان نے سرب درندگی کی کھل کر مذمت کی۔ اسی ماہ کشمیر کا میدان کارزار اس قدر گرم ہوا کہ پاکستان اور بھارت جون میں کارگل کے محاذ پر ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ کشمیری مجاہدین کی اس گرم جوشی میں طالبان حکومت کی اخلاقی مدد کا بھی ہاتھ تھا۔ دسمبر 1999ء میں روس نے چیچنیا پر فوج کشی شروع کی جس کا چیچن مجاہدین نے بڑی پامردی سے جواب دیا۔ یہ جنگ اگلے سال کے وسط تک بڑے شدومد سے جاری رہی۔ بے سروسامان طالبان نے اس موقع پر چیچنیا کی جس طرح مدد کی اس کی مثال عالم اسلام کا کوئی اور ملک پیش نہ کر سکا۔

انڈین ایرلائن کا طیارہ اغوا: دسمبر 1999ء کے آخری ہفتے میں طالبان کو ایک نہایت کڑے امتحان سے گزرنا پڑا۔ چند ہائی جیکرز انڈین ایرلائن کا طیارہ اغوا کر کے اسے قندھار لے آئے۔ انہوں نے مسافروں کی جان کے بدلے ان کشمیری مجاہد لیڈروں کی رہائی کا مطالبہ کیا جو بھارت کی جیل میں تھے۔ ان میں سرفہرست حرکۃ الانصار کے لیڈر مولانا محمد مسعود اظہر تھے۔ طالبان ایک طرف کشمیر کی تحریک جہاد کے حامی ہونے کے ناتے ہائی جیکرز سے ہمدردی رکھتے تھے تو دوسری طرف بھارت کا خیال رکھنے پر بھی مجبور تھے جسے پوری دنیا کی اخلاقی ہمدردی حاصل تھی۔ بہرکیف طالبان نے معاملے کو بڑی خوش اسلوبی سے سنبھالا جس کے نتیجے میں مولانا مسعود اظہر اور مشتاق زرگر جیسے نامور مجاہد لیڈر بھارتی جیلوں سے رہا ہو کر پاکستان آگئے اور انڈین ایرلائن کے مسافر بخیر و عافیت اپنے گھروں کو پہنچ گئے۔

اگر آدھا افغانستان تباہ ہو جائے: اس سال بھی اسامہ بن لادن کی سپردگی کے بارے میں افغانستان پر سعودی عرب اور امریکا کا دباؤ رہا۔ مگر طالبان سربراہ کا موقف بے لچک تھا۔ انہوں نے اکتوبر میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا:

> "اسامہ بن لادن کو حوالے کرنا اسلام کا رکن ترک کرنے کے مترادف ہوگا۔ اسامہ مسلمان ہے۔ مجاہد ہے اور مہمان ہے۔ اگر آدھا افغانستان تباہ ہو جائے تب بھی اسے کسی کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔"

انہوں نے مذاکرات کی پیش کش قبول کرتے ہوئے کہا کہ اگر سعودی عرب اور افغانستان کے چند نمائندہ علماء مل کر اسامہ بن لادن کے مستقبل کا فیصلہ کریں تو انہیں قبول ہوگا۔ طالبان نے اس مسئلے پر عالمی دباؤ کی وجہ سے اپنی ناقابل برداشت مشکلات کے پیش نظر نومبر 1999ء میں اسامہ بن لادن کو مشورہ دیا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے ازخود افغانستان چھوڑ کر کسی نامعلوم مقام کی طرف نکل جائیں تاکہ

افغانستان پر امریکا کے دباؤ کا جواز ہی ختم ہو جائے۔ شیخ اسامہ بھی اس پر تیار ہو گئے۔ میڈیا میں یہ ظاہر بھی کر دیا گیا کہ اسامہ بن لادن افغانستان چھوڑ کر جا رہے ہیں۔

مزید بات چیت نہیں ہوگی: مگر امریکی حکومت نے ایسی کسی صورتِ حال کو ناقابلِ فہم بات اور حیلہ جوئی قرار دیتے ہوئے اصرار کیا کہ طالبان بہر صورت اسامہ بن لادن کو اس کے حوالے کر دیں۔ امریکا کے اس اصرار کے جواب میں ملا محمد عمر کا نہایت سخت ردِ عمل سامنے آیا۔ انہوں نے نومبر 1999ء میں اپنے جوابی بیان میں کہا:

> ''امریکا کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اب اس موضوع پر مزید بات چیت نہیں ہوگی۔ عالمی دباؤ کے باوجود ہم اسامہ بن لادن کو ملک سے نکالیں گے نہ کسی کے حوالے کریں گے۔ اب ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اسلام کے لیے اپنے سروں کو قربان کر دیں۔''

2000ء اور 2001ء کے حالات

طالبان امارت اور حکومتِ شیشان: شیشان (چیچنیا) کی جنگ اگلے برس (2000ء میں) بھی جاری رہی۔ اس دوران 2000ء جنوری کے اواخر میں شیشان کی تحریک آزادی کے بانی اور سابق صدر سلیم خان اندر بایوف ملا محمد عمر سے ملاقات کے لیے قندھار آئے۔ ان کے ساتھ شیشان کے نامور کمانڈر شامل بسایوف کے سیاسی مشیر ''مولادی اودیوکوف'' بھی تھے۔ اس تاریخی ملاقات کے بعد افغانستان نے تمام دنیا کے دباؤ کو مسترد کرتے ہوئے شیشان کو ایک آزاد مسلم ریاست کے طور پر قبول کر کے اسے کابل میں اپنا سفارتخانہ کھولنے کی اجازت دے دی حالانکہ اب تک عالمِ اسلام کے کسی ملک نے آٹھ برس گزرنے کے باوجود شیشان کو ایک آزاد ریاست کے طور پر تسلیم کرنے ہمت نہیں کی تھی۔ وجہ صرف یہ تھی کہ شیشان کے رہنمایانِ آزادی پختہ فکر مسلمان اور خالص اسلامی نظام کے نفاذ کے قائل تھے، اس لیے عالمی طاقتوں کے نزدیک وہ بھی دہشت گرد اور معتوب تھے۔

افغان طیارے کا اغوا: فروری 2000ء کے پہلے ہفتے میں طالبان کو اس وقت ایک غیر متوقع صورتحال کا سامنا کرنا پڑا جب افغانستان کی آریانہ ایرلائن کا ایک طیارہ اغوا کر کے برطانیہ لے جایا گیا۔ ہائی جیکروں کا تعلق احمد شاہ مسعود کے گروہ سے تھا۔ طالبان سربراہ نے ہائی جیکروں کے مطالبات کو مسترد کر دیا۔ اس کے باوجود حیرت انگیز طور پر معاملہ حل ہو گیا اور مسافر بخیریت رہا ہو کر وطن واپس آ گئے۔

اُسامہ بن لادن کے حوالے سے مغربی محاذ قدرے خاموش تھا۔ درحقیقت اب افغانستان کی دُشمن

طاقتیں گفت و شنید یا دھمکیوں کی بجائے عملی اقدامات شروع کرنے جا رہی تھیں۔ اس وقت تک پاکستان کے نئے حکمران پرویز مشرف ان کے ساتھ نہیں تھے۔ پرویز مشرف نے جو اس وقت تک ''چیف ایگزیکٹو'' کہلاتے تھے، 15 مارچ کو اُسامہ کے حوالے سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں طالبان پر اُسامہ کی گرفتاری کے لیے کوئی دباؤ نہیں ڈال سکتا کیونکہ وہ آزاد اور خود مختار حکمران ہیں۔ اس سال طالبان مخالف لابی کو ایک کامیابی اس وقت ملی جب مارچ کے اواخر میں طالبان کا مشہور مخالف کمانڈر اسماعیل خان تو رون جو ہرات کا سابق گورنر تھا، جیل سے فرار ہو گیا۔

طالبان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ارد گرد کوئی ہمسایہ ان کا حامی نہ تھا۔ ان کے بے شمار مسائل کے حل کے لیے کوئی ایک ملک بھی معاون نہ تھا۔ پاکستانی عوام ان سے محبت اور ہمدردی رکھتے تھے مگر حکومت کا رویہ محتاط تھا۔ اس کے مقابلے میں افغانستان کی دیگر ہمسایہ ریاستیں خصوصاً ایران، تاجکستان اور ازبکستان طالبان کے مخالف گروہوں کے مددگار تھیں۔ امریکا کے علاوہ دنیا کی دو بڑی طاقتیں چین اور رُوس طالبان کو مشرق اور شمال میں گھیرے ہوئے تھیں اور دونوں طالبان کو خطرہ گردانتی تھیں۔

ملا محمد عمر مجاہد کا انتباہ: طالبان سربراہ ملا محمد عمر نے ان طاقتوں کی افغانستان میں دخل اندازی کے جواب میں 8 مئی 2000ء کو ایک انتباہی بیان جاری کیا جس میں تاجکستان اور ازبکستان کو افغان دُشمنی سے باز رہنے کی تلقین کی گئی۔

بہر صورت طالبان کے گرد کئی طرح کی محاصرہ بندی کا آغاز ہو گیا تھا۔ مئی کے مہینے میں اقوام متحدہ نے مفلوک الحال اور قحط زدہ افغانستان پر اقتصادی پابندیاں عائد کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہ افغان عوام کو موت کے منہ میں دھکیلنے اور طالبان حکومت کو مالی بوجھ تلے دب کر ختم کر دینے کی مذموم کوشش تھی۔ ملا محمد عمر نے 20 مئی کو اقوامِ متحدہ کے اس ناروا فیصلے پر احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ اقوام متحدہ اس غیر منصفانہ فیصلے پر نظر ثانی کرے ورنہ حالات کی ذمہ داری اس پر ہوگی۔ تاہم عالمی امن کے نام نہاد ٹھیکے دار اس یہودی ادارے پر کوئی اثر ہونا تھا نہ ہوا۔

شنگھائی کانفرنس: چین چار سال پہلے ہی ''شنگھائی 5'' کے نام سے ایک اتحاد قائم کر کے رُوس، تاجکستان اور وسط ایشیا کے دیگر ممالک کو طالبان کے اسلامی انقلاب کے مقابلے میں ابھار چکا تھا۔ ان اتحادیوں نے 7 جولائی 2000ء کو تاجکستان کے دار الحکومت ''دوشنبے'' میں ''شنگھائی کانفرنس'' کا انعقاد کیا۔ چین، رُوس، تاجکستان، قازقستان، کرغیزستان اور ازبکستان کے حکمرانوں نے کانفرنس کی قرارداد میں منظور کیا کہ خطے میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی اور انتہا پسندی پر قابو پانے کی کوشش کی جائے گی اور

سرحد پار سے آنے والی دہشت گردی کی لہر کو روکنے کے لیے ایک مشترکہ مرکز قائم کیا جائے گا۔" شنگھائی 5" کے شرکاء نے اعلان کیا کہ خطے کو مذہبی انتہا پسندی، علیحدگی پسندی اور عالمی دہشت گردی سے خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔ ان ممالک نے الزام عائد کیا کہ کابل (یعنی طالبان حکومت) مذہبی انتہا پسندی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے اور خطے میں دہشت گردی کے فروغ کا ذمہ دار وہی ہے۔

اس کانفرنس کی دوسری قرارداد میں شیشان پر رُوس کے ظالمانہ قبضے کو سراہا گیا اور اسے رُوس کا داخلی معاملہ قرار دے کر اس کی تصویب کی گئی۔

افغانستان میں پوست کی کاشت ختم: دنیا طالبان کے ساتھ جو سلوک کر رہی تھی وہ کسی طرح بھی قرینِ انصاف نہ تھا۔ خصوصاً اقوام متحدہ کا اقتصادی پابندیاں عائد کرنا تو کھلم کھلا ظلم تھا جس کے جواب میں طالبان کسی بھی انتہاء تک جا سکتے تھے، مگر طالبان نے نہ صرف صبر و تحمل سے کام لیا بلکہ دنیا کو امن و سکون کا گہوارہ بنانے کی حتی المقدور کوشش کرتے رہے۔ اس سلسلے میں طالبان سربراہ نے یکم اگست 2000ء کو یہ حکم جاری کیا کہ آئندہ افغانستان کے کسی حصے میں بھی پوست (افیون) کی کاشت نہیں کی جائے گی۔

افغانستان دنیا بھر میں افیون کی پیداوار کا سب سے بڑا مرکز تھا، مگر طالبان سربراہ نے اپنے اقتصادی مسائل میں شدید اضافے کو بھی برداشت کرتے ہوئے افیون کی کاشت پر پابندی لگا کر دنیا کو منشیات سے پاک کرنے کی جرأت مندانہ کوشش کی۔ افسوس کہ اہلِ مغرب کو طالبان حکومت کے اس کارنامے پر شکریہ کے دو لفظ کہنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی اور وہ طالبان کا اس قدر مثبت رویہ دیکھنے کے باوجود انہیں عالمی امن و امان سبوتاژ کرنے کا ملزم گردانتے رہے۔

اسلامی تحریکیں اور طالبان: طالبان حکومت پاکستان سے بہرصورت اچھے تعلقات قائم کیے ہوئے تھے۔ کشمیر کا محاذ ان دنوں گرم تھا۔ اس مسئلے پر پاکستان کی سب سے زیادہ حمایت کرنے والا ملک افغانستان ہی تھا۔ 25 اگست 2000ء کو طالبان سربراہ نے ایک بیان میں واضح طور پر کہا کہ آزادی کشمیری مسلمانوں کا بنیادی حق ہے۔ ستمبر کے اواخر میں اسرائیل نے بیت المقدس، غزہ، بیت اللحم اور مغربی اردن میں فلسطینیوں کے خون کی ندیاں بہانا شروع کر دیں۔ حماس نے اس موقع پر اسرائیل کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ یہ جنگ چار پانچ ماہ تک جاری رہی اور طالبان ہر مرحلے میں حماس کی اخلاقی حمایت کرتے رہے۔

ستمبر میں طالبان کی افواج نے ایک بار پھر احمد شاہ مسعود کے خلاف پیش قدمی میں کچھ کامیابیاں حاصل کیں۔ یکم ستمبر 2000ء کو وہ طالقان پر قابض ہو گئے۔ اس کے بعد وہ تخار کی طرف بڑھنے لگے۔

25 ستمبر کو انہوں نے فرخار کی دہلیز "چال" پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح وادی پنجشیر میں احمد شاہ مسعود کے لیے سخت خطرات پیدا ہوگئے۔ 20 دسمبر 2000ء کو افغانستان میں کام کرنے والے 74 بیرونی امدادی اداروں نے اقوامِ متحدہ کے حکم پر اپنی سرگرمیاں بند کر کے واپسی اختیار کرلی۔ بے کس اور مصیبت زدہ افغان عوام کے خلاف اقوام متحدہ کا یہ دوسرا بڑا ظالمانہ اقدام تھا۔

صدر بش کا اقتدار: 2001ء کا آغاز ہوا تو طالبان حکومت بظاہر مستحکم تھی مگر درحقیقت ہولناک خطرات اس کے گرد منڈلا رہے تھے۔ امریکا میں نئے صدر جارج واکر بش نے اقتدار سنبھال لیا تھا اور اسکے ساتھ ہی یہود کی وہ اسلام مخالف سازشیں عروج پر پہنچ گئی تھیں جن کا سلسلہ گزشتہ برس شروع ہو چکا تھا۔ بعض میڈیا رپورٹوں میں کیے جانے والے انکشافات کے مطابق اکتوبر 2000ء میں عالمی طاقتوں اور اس خطے میں ان کے ہمدرد ممالک نے طالبان کے خاتمے کے لیے ایک مربوط پروگرام طے کرلیا تھا جس میں واحد اسلامی ایٹمی طاقت اور طالبان کے تنہا حامی ملک پاکستان کو نمٹا کرنا بھی تھا۔ اس پروگرام میں امریکا اور روس کے ساتھ بھارت اور ایران بھی شریک تھے۔ طالبان ان خطرات سے واقف تھے اور انہیں اس بات کا یقین تھا کہ آج نہیں تو کل یہ طاقتیں ان پر چڑھائی ضرور کریں گی تاہم وہ خطرات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی پالیسی پر نہ صرف گامزن رہے بلکہ ان کے رویے میں بھی مزید شدت پیدا ہوگئی۔

مشنری سرگرمیوں کا انسداد: اس سال طالبان حکومت نے اسلامی شریعت کے ان تمام احکام کو نافذ کرنے کی طرف توجہ دی جن میں ازراہِ مصلحت تاخیر کی جاتی رہی تھی۔ 5 جنوری 2001ء کو طالبان سربراہ نے امدادی کاموں کی آڑ میں عیسائیت کی تبلیغ کرنے والی این جی اوز کے مضر اثرات کی روک تھام کے لیے یہ فرمان جاری کیا کہ اسلام سے برگشتہ ہونے والے کو شرعی سزا کے مطابق قتل کیا جائے گا اور اسلامی عقائد کے خلاف تبلیغی لٹریچر کی اشاعت یا اس میں تعاون کی سزا 5 سال قید ہوگی۔ اس حکم کے نفاذ سے این جی اوز کی ارتدادی سرگرمیاں بند ہوگئیں۔

طالبان کی خارجہ پالیسی پر اُٹھنے والے سوالات کے جواب میں ملا محمد عمر نے 15 فروری کو اپنے بیان میں کہا: "افغانستان کی پالیسی کا عالمی قوانین سے کوئی تضاد نہیں، مگر بعض مغربی قوتیں ہماری دینی وملکی روایات کو برداشت نہیں کر سکتیں۔" اُسامہ بن لادن کے مسئلے پر انہوں نے ایک بار پھر اپنے موقف کا اعادہ کرتے ہوئے امریکا کو موردِ الزام ٹھہرایا اور کہا: "امریکا اُسامہ بن لادن پر شک کرتا ہے اور صرف اسی بنیاد پر وہ اسی کی حوالگی کا مطالبہ کرنا اپنا حق سمجھتا ہے جبکہ خود امریکا نے 8 ہزار طلبہ کے قتل کے مجرم جنرل مالک کو اپنی آغوش میں پناہ دے رکھی ہے۔"

طالبان نے افغانستان کو کیا دیا؟ 2001ء میں طالبان اپنی حکومت کے ساتویں سال سے گزر رہے تھے۔ یہی ان کی حکومت کے خاتمے کا سال ثابت ہوا، مگر اس سے قبل کہ ہم طالبان حکومت کے سقوط کا مرحلے وار جائزہ لیں، ہمیں ایک خاص سوال پر غور کرنا چاہیے جو بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ وہ یہ کہ آخر طالبان کے سات سالہ اقتدار میں عوام کو کیا ملا۔ طالبان نے اپنے دورِ حکومت میں افغانستان کو کیا دیا؟۔

یہ سوال اس لیے اہم ہے کہ آج دنیا طالبان کو انسانی حقوق کا غاصب اور افغانستان کی تباہی کا ذمہ دار قرار دیتی ہے، مگر حقائق کیا ہیں؟ آیئے! غیر جانبداری سے موازنہ کرتے ہیں۔

امن و امان، جینے کا حق اور عدل و انصاف: طالبان سے قبل افغان عوام دیگر حقوق تو کجا زندہ رہنے کے حق سے بھی محروم تھے...... کسی شخص کی جان محفوظ نہ تھی۔ مسلح افراد کسی کو بھی قتل کر سکتے تھے اور کوئی عدالت باز پرس کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ طالبان نے برسوں سے جاری اس خونی کھیل کو ختم کیا۔ لوگوں کو زندہ رہنے کا حق دیا جو "بنیادی حقوق" میں سے سب سے بڑا حق ہے۔ لوگ عدل و انصاف کو خواب و خیال سمجھنے لگے تھے۔ طالبان نے مثالی عدل قائم کر کے دکھایا جس میں امیر و وزیر تک کی تخصیص نہ تھی۔ ہر شخص چاہے وہ طالبان کا مخالف ہی کیوں نہ ہو، یہ گواہی دے گا کہ طالبان کے ہاں مفت، فوری اور یقینی انصاف ملتا تھا۔ ایسی مثال پوری دنیا میں کہیں اور پیش نہیں کی جا سکتی۔

عدالتوں تک عوام کی رسائی کو آسان بنانے کے لیے طالبان نے کئی اہم اقدامات کیے۔ کسی بھی زیر سماعت مقدمے سے متعلقہ افراد کی عدالتوں تک آمد و رفت کا خرچہ حکومت نے اپنے ذمے لے لیا۔ مقدمے کے دوران انہیں عدالت کے قریب رہائش اختیار کرنے کی ضرورت پڑتی تو طالبان حکومت یہ سہولت بھی مہیا کرتی تھی۔

مدعی اور مدعی علیہ کو جج کے سامنے براہِ راست بات چیت کی اجازت تھی۔ اسی طرح غریب لوگ وکلاء کی بھاری فیسوں سے بچ جاتے تھے۔ جج یا قاضی قرآن و سنت اور فقہ حنفی کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ افسران، وزراء، حتیٰ کہ سربراہِ مملکت بھی قانون سے بالاتر نہ تھا۔ عدل و انصاف میں امیر و غریب کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ بعض اوقات خود طالبان اہلکاروں کو کڑی سزائیں دی گئیں حتیٰ کہ ان کو قصاص میں قتل کرنے کی مثالیں بھی سامنے آئیں۔ سرکاری ادارے تک عوام کے حقوق کے لیے عدالت میں جوابدہ تھے۔

اگست 1997ء کا وہ مقدمہ نہایت دلچسپ تھا جس میں ایک معذور شخص نے وزارتِ دفاع کی ایک عمارت پر اپنا حق ثابت کرنے کیلئے کابل کی عدالتِ شرعیہ سے رجوع کیا اور آخر کار مقدمہ جیت گیا۔ عدلیہ نے اپنے فیصلے میں وزارتِ دفاع کے ذمہ داروں کو حکم دیا کہ وہ عمارت فوری طور پر اس شخص کو دے دیجائے۔

خوفِ خدا اور شرعی سزائیں: یہ اسلامی نظام عدل اور حدود و قصاص کی شرعی سزاؤں کے احیاء کی برکت تھی کہ لوگوں میں بھی خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کا جذبہ بیدا ہونے لگا۔ چوری، زنا اور شراب نوشی جیسے اخلاقی جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ قرونِ اولیٰ کی طرح ایسے مناظر بھی سامنے آئے کہ مجرم خود عدالت میں پیش ہو کر شرعی سزا کے خواہش مند ہوئے تاکہ ان کا گناہ معاف ہو جائے۔ 10 مئی 2001ء کو افغانستان کی سپریم کورٹ میں ایک کنوارے نوجوان نے زنا کا چار بار اقرار کر کے شرعی حد جاری کرنے کی درخواست کی۔ اسے عدالت کے احاطے میں لوگوں کے سامنے سو درّے مارے گئے۔ سزا پانے کے بعد نوجوان کے چہرے سے مسرت کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ بلاشبہ اس کا ایمان قابل رشک تھا۔ اس نے حضرت ماعزؓ کی یاد تازہ کر دی تھی۔ یہ اسلامی نظام عدل ہی کی تو برکات تھیں۔

قومی مرکزیت: طالبان سے پہلے افغانستان ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔ طالبان نے اس کو از سرِ نو ایک وحدت عطا کی جس سے مغربی طاقتوں کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ طالبان نے افغان عوام کو ایک مضبوط مرکزی حکومت کے تحت متحد کر دیا اور ملک کے ایک مختصر سے حصے کو چھوڑ کر تقریباً 95 فیصد رقبے کو ملک دشمن طاقتوں کی سازشوں کے جال سے آزاد کرایا۔ حالانکہ یہ کام بظاہر ناممکن نظر آتا تھا۔ حکمت یار، ربانی اور احمد شاہ مسعود اس ہدف کو حاصل کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہے تھے۔

اسلحہ کلچر کی روک تھام: طالبان سے پہلے اسلحہ اتنا عام تھا کہ ہر گلی اور محلے میں الگ الگ مسلح گروہوں کی اجارہ داری تھی۔ خودسر کمانڈروں کے پاس توپیں، ٹینک، ہیلی کاپٹر حتیٰ کہ جنگی جہاز تک موجود تھے۔ دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں انہیں غیر مسلح کرنے میں ناکام رہی تھیں کیوں ہر طاقت ایک گروہ کو نہتا کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ دوسرے گروہ کو نوازتی جاتی تھی۔ 1992ء میں اقوام متحدہ نے تین بلین ڈالر کے بدلے افغان کمانڈروں سے یہ ہتھیار جمع کرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ طالبان نے یہ ناممکن کام ممکن کر دکھایا۔ عوام نے ان پر اعتماد کر کے خود ہتھیار جمع کرائے اور سرکش کمانڈروں کو طالبان نے اللہ کی مدد و نصرت سے مختصر سے عرصے میں زیر کر کے دکھا دیا۔

منشیات کی پیداوار بند: طالبان سے پہلے افغانستان افیون کی پیداوار اور اسمگلنگ کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ دنیا بھر میں 75 فیصد افیون کی کاشت یہیں ہوتی تھی۔ اقوام متحدہ بھرپور کوشش کے باوجود افغانستان سے افیون کی اسمگلنگ رکوانے میں ناکام رہی۔ اس کا ذیلی ادارہ ''یونائیٹڈ نیشن ڈرگ پروگرام'' اپنے 700 ماہرین پر کروڑوں ڈالر خرچ کر کے اس ہدف کے قریب بھی نہ پہنچ سکا۔ وجہ یہ تھی کہ خود امریکی سیاست دانوں اور سرمایہ داروں کا ایک گروہ اس اسمگلنگ کے ذریعے دولت کما رہا تھا۔

طالبان سربراہ ملا محمد عمر نے صرف ایک امتناعی حکم جاری کر کے ملک بھر میں افیون کی کاشت کا خاتمہ کر دیا جس سے دنیا بھر کے منشیات کے اسمگلر ششدر رہ گئے اور اقوام متحدہ کے ادارے یونائیٹڈ نیشن ڈرگ پروگرام کے 700 ماہرین بے کار قرار دے کر فارغ کر دیے گئے۔

اس ادارے کے سربراہ برنارڈ لیف نے تصدیق کی کہ طالبان کی جانب سے اس پابندی کے بعد اس سال افیون کی پیداوار صفر فیصد رہی، مگر یہودی لابی کے زیر اثر میڈیا اس کارنامے کو چھپانے یا نظر انداز کرانے میں کامیاب رہا۔ دنیا نے طالبان کی اس حیران کن خدمت پر انہیں کسی ہمدردی، عزت یا ستائش کے قابل نہیں سمجھا جو صریح بے انصافی تھی۔

ظالمانہ ٹیکسوں سے نجات: عرصۂ دراز سے افغانستان میں عوام کی کمائی کا خاصا حصہ حکومتی ٹیکسوں پر صرف ہو جاتا تھا۔ طالبان سے پہلے کے پُرآشوب زمانے میں تو جبری بھتوں اور پھاٹکوں کے ٹیکسوں نے لوگوں کی کمر توڑ دی تھی۔ طالبان نے عوام سے تمام ٹیکس اُٹھا لیے۔ یہ دنیا کی واحد حکومت تھی جہاں عوام پر کوئی سرکاری ٹیکس نہیں تھا۔ مالدار لوگ زکوٰۃ و عشر ادا کرنے کے پابند تھے جو شرعی فریضہ ہے۔ اس کے علاوہ سب کچھ ان کا اپنا تھا۔ سرکاری کارکن، نجی ملازم، مزدور، دکاندار حتیٰ کہ پھیری اور خوانچے والے کی بھی سو فیصد کمائی اسی کی جیب میں جاتی تھی۔ حکومت ان سے کچھ بھی نہیں لیتی تھی۔ کئی علاقوں میں طالبان نے بجلی تک مفت دے رکھی تھی۔ خصوصاً غریبوں کو بجلی کے بلوں سے تقریباً ہر جگہ مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔

آب پاشی اور زرعی ترقی: طالبان سے قبل ملک کا زرعی نظام تباہ ہو چکا تھا۔ طالبان نے اس جانب خاص توجہ دی۔ جگہ جگہ نہریں نکلوائیں، پرانی نہروں کی صفائی کی، ٹیوب ویل لگوائے۔ صرف چمن سے قندھار تک کئی ہزار ٹیوب ویل نظر آتے تھے جبکہ طالبان سے قبل یہاں دھول اُڑ رہی تھی۔ عوام کو صاف پانی مہیا کرنے کے لیے ہزاروں کنویں کھودے گئے۔ صرف کابل میں نئے کھودے جانے والے کنوؤں کی تعداد 1999ء کے آغاز میں بارہ سو سے زائد ہو چکی تھی۔

نومبر 1998ء میں طالبان نے دریائے ہلمند سے لشکر گاہ تک وسیع صحرا کا سینہ چیر کر 10 کلومیٹر لمبی اور 6 میٹر چوڑی نہر کی کھدائی کا کام مکمل کر دیا۔ لشکر گاہ کو آب رسانی کا یہ کارنامہ نہایت حیرت انگیز تھا۔

دسمبر 1998ء میں کجکی ڈیم کے بجلی گھر سے لشکر گاہ کو بجلی کی فراہمی شروع ہو گئی۔ یہ 18 کروڑ کا منصوبہ صرف 40 لاکھ میں مکمل کیا گیا۔ صوبہ نیمروز کے عوام کھارا پانی پیتے تھے۔ طالبان نے صرف 6 ماہ میں 4 کلومیٹر طویل نہر کھود کر صوبے کو میٹھے پانی کی فراہمی ممکن بنائی۔ یہ کام دسمبر 1998ء میں مکمل ہوا۔

دسمبر 1997ء میں طالبان حکومت نے غور اور بادغیس میں سینکڑوں میل پر پھیلے ہوئے پستے کے جنگلات

نجی مد پر طویل مدت کے لیے لیز پر دینے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے فرموں سے ٹینڈر طلب کر لیے گئے۔ جنگلات کمپنیوں کے سپرد کر دیے گئے۔ اس طرح قومی خزانے کو خطیر آمدن ملنے لگی۔ اسی ماہ جلال آباد ڈیم کی مرمت کا کام مکمل کر کے اسے از سر نو فعال کر دیا گیا اور اس سے 70 ہزار ایکڑ زرعی زمین سیراب ہونے لگی۔ برسوں سے ملک میں گندم کی پیداوار اتنی کم چلی آرہی تھی کہ ہر حکومت، پاکستان سے گندم درآمد کرنے پر مجبور تھی۔ طالبان حکومت کی زرعی اصلاحات کی بدولت 2000ء میں افغانستان گندم کی پیداوار میں خود کفیل ہو گیا۔ صرف ہلمند میں پیدا ہونے والی گندم کا تخمینہ 62 ہزار ٹن تک جا پہنچا۔ پوست کی کاشت پر پابندی کے بعد پوست کے کھیتوں کی جگہ بھی گندم کی فصلیں لہلہاتی نظر آنے لگیں۔

مواصلات کا نظام بحال: افغانستان میں مواصلات کا نظام تباہ ہو چکا تھا۔ طالبان نے اسے بحال کیا۔ اکتوبر 1997ء میں بیرونی دنیا سے مواصلاتی رابطے کا نظام شروع کرنے کے لیے سویڈن کی کمپنی ''پان ایشین'' کو ٹھیکہ سپرد کیا۔ 6 ملین ڈالر کی لاگت سے طے پانے والے اس منصوبے نے دنیا بھر سے افغانستان کا مواصلاتی رابطہ قائم کر دیا۔

اندرونِ ملک بھی ٹیلی فون کا نظام بہتر بنایا گیا۔ مارچ 1998ء تک کابل میں 21 ہزار، ہرات میں 17 سو، جلال آباد میں 14 سو اور قندوز میں ایک ہزار مقامی فون بحال کر دیے گئے تھے۔

دینی و عصری تعلیم: طالبان سے قبل ملک میں تعلیمی سرگرمیاں تقریباً بند ہو چکی تھیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کو بے دین اساتذہ نے صرف ملحدانہ عقائد کی تبلیغ کا مرکز بنایا ہوا تھا۔ بدمعاش قسم کے طلبہ نے وہاں شریف طلبہ کا گزرنا دوبھر کر دیا تھا۔ طالبان نے تعلیم گاہوں کو ان خرافات سے پاک کر کے صاف ستھرا ماحول دیا اور انہیں اپنے اصل اہداف پر گامزن کر دیا۔ گاؤں گاؤں اور شہر شہر اسکول اور مکاتب کھول دیے جن کی تعداد کئی ہزار تھی۔ عصری تعلیم گاہیں اتنی آباد ہوئیں کہ صرف کابل یونیورسٹی میں طلبہ کی تعداد 18 ہزار تک پہنچ گئی۔

طالبان نے ملک میں دینی علوم کی اشاعت کے لیے بھرپور کوشش کی۔ جا بجا مدارس اور مکاتب کھولے۔ نومبر 1997ء میں طالبان سربراہ کی نگرانی میں قندھار میں جامعہ عمر کے نام سے ایک بڑی اسلامی درس گاہ کے قیام کا اعلان ہوا۔ طے ہوا کہ اس درس گاہ کو ایک ہزار طلبہ کی اعلیٰ تعلیم کا مرکز بنایا جائے گا۔ ایک سادہ سی عمارت میں اس درس گاہ کی تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا گیا جبکہ شاندار عمارت کا تعمیراتی کام وسائل کی قلت کے باعث قدرے سستی سے چلتا رہا۔ تاہم تعلیمی سرگرمیاں بھرپور انداز میں جاری رہیں۔ طالبان دور میں ملک بھر میں دینی تعلیم کا اس قدر چرچا ہوا کہ دینی مکاتب کے لیے قرآن مجید اور

دینی مدارس کے لیے حدیث کی کتب کی ضروریات پوری کرنے کا خرچ کئی ارب روپے تک جا پہنچا تھا۔

ائمہ و مؤذنین کے وظائف: طالبان نے پہلی بار ائمہ مساجد اور مؤذنین حضرات کی کفالت کی طرف توجہ دی۔ یہ اُمت کا انتہائی قابلِ احترام طبقہ صدیوں سے بے قدری کا نشانہ بنتا چلا آیا ہے۔ طالبان نے ان کی تنخواہیں سرکاری خرچ پر مقرر کیں۔ صرف جلال آباد میں 335 ائمہ حضرات اور مؤذنین کو تنخواہیں دی جارہی تھیں۔

سڑکوں کی مرمت، کابل ماسٹر پلان: اٹھارہ برس کی جنگوں نے ملک کی سڑکوں کے بخیے ادھیڑ دیے تھے۔ سڑکوں کی تعمیرِ نو کے لیے اربوں ڈالر درکار تھے۔ طالبان بیرونی طاقتوں اور عالمی اداروں کی پرفریب شرائط پر کے جال میں آنے کے لیے تیار نہیں تھے اس لیے وہ ان منصوبوں کے لیے قرضے حاصل نہ کر سکے تاہم انہوں نے اپنی مدد آپ کے تحت مٹی کی بھرائی کر کے اکثر جگہوں پر سڑکوں کو دوبارہ اس حد تک درست کر دیا کہ گاڑیاں گزر سکیں۔ کابل شہر میں سڑکوں کی استرکاری کا کام شروع کیا جو فروری 1999ء میں مکمل ہوا۔ اس کے بعد طالبان کابل کی سابقہ خوبصورتی کو بحال کرنے کے لیے مستعد ہوئے جس کے نتیجے میں جدید منصوبہ بندی کے ساتھ جولائی 2001ء میں کابل کی تعمیرِ نو کے لیے "ماسٹر پلان" کی منظوری دے دی گئی۔ اگر طالبان کو چند سال مزید مل جاتے تو ایک بار پھر کابل دنیا کے حسین ترین شہروں میں شامل ہو جاتا۔ طالبان دور میں شاہراہیں یقیناً خوبصورت اور پختہ نہیں تھیں مگر ان کا امن و امان مثالی تھا۔ لوٹ مار کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ شاہراہوں پر جگہ جگہ مساجد تعمیر کرائی گئیں اور کنویں کھودے گئے تھے تاکہ مسافروں کو نماز اور دیگر ضروریات کے لیے دقت نہ ہو۔

سود کا خاتمہ: معیشت کا سودی نظام درحقیقت اقتصادی ترقی کے لیے زہرِ قاتل ہے۔ طالبان نے ملک سے سودی کاروبار کا خاتمہ کر دیا۔ بینکاری کا تمام نظام سود کی لعنت سے پاک کر دیا اور اسلام کے سادہ، ٹھوس اور نافعِ انسانیت اقتصادی نظام کو اپنا لیا گیا۔

صنعتی ترقی: طالبان نے ملک میں صنعت و حرفت کو از سرِ نو زندہ کیا، پرانی فیکٹریوں کو بحال کیا، نئے کارخانے کھولے اور توانائی کے کئی منصوبوں کا آغاز کیا۔ رقم کی کمی کی وجہ سے وہ کئی منصوبوں میں بیرونی کمپنیوں سے مدد نہ لے سکے مگر جب انہوں نے اپنی مدد آپ کے تحت وہ منصوبے خود شروع کیے تو حیرت انگیز طور پر کم خرچ بالانشین کا مصداق سامنے آیا۔ فروری 1998ء میں طالبان نے قندھار سے 400 کلومیٹر دور ایک بجلی گھر سے قندھار شہر تک بجلی کی فراہمی کا منصوبہ مکمل کر لیا۔ اس طرح قندھار اور گردونواح کے علاقے روشنی سے جگمگا اُٹھے۔ یاد رہے کہ ظاہر شاہ کے دور میں امریکا نے اس منصوبے

کا آغاز کیا تھا، مگر امریکی انجینئروں نے بھاری اخراجات وصول کر کے بھی طویل مدت تک منصوبے کو تکمیل تک نہ پہنچایا۔ طالبان نے اس کو از سر نو شروع کرنے کے لیے ایک بیرونی کمپنی سے بات چیت کی تو اس نے 50 ملین ڈالر کا خرچہ بتایا جو طالبان کے لیے بہت مہنگا تھا۔ تب انہوں نے مقامی ہنر مندوں کی مدد سے یہ کام شروع کیا اور مطلوبہ وقت سے بھی بہت پہلے صرف چھ ماہ بائیس دن میں اسے مکمل کر لیا۔ خرچہ بھی 50 ملین ڈالر کی بجائے صرف 20 ملین ڈالر ہوا۔

ملک میں صنعتیں ٹھپ ہو چکی تھیں۔ کارخانے بند پڑے تھے۔ طالبان حکومت نے انہیں بحال کیا۔ مارچ 1999ء میں انہوں نے 102 نئے صنعتی منصوبوں کی منظوری دی جن میں دوائیں، ماچس، تعمیراتی سامان، کارٹن، پلاسٹک کی اشیاء وغیرہ کی تیاری شامل تھیں۔ اس طرح ملک میں کئی نئی صنعتوں کا اجراء ہوا اور ہزاروں افراد کو روزگار میسر آیا۔ کابل میں پلاسٹک کے سامان کے کئی کارخانے کام کرنے لگے۔ جلال آباد میں ماربل کے کارخانوں کی سرگرمیاں از سر نو شروع ہو گئیں۔ جلال آباد کی ٹیکسٹائل مل جو عرصہ دراز سے بند پڑی تھی طالبان نے خطیر رقم خرچ کر کے جنوری 1999ء میں بحال کر دی۔ اس کا عمدہ کپڑا جلد ہی ملک کے کونے کونے میں فروخت ہونے لگا۔ ہرات اور مزار شریف میں آئل ریفائنری کا آغاز بھی طالبان کا کارنامہ ہے۔

روسی یلغار سے قبل افغانستان کھاد کی پیداوار کا بڑا مرکز تھا، مگر مدت دراز سے کھاد کی پیداوار بہت کم رہ گئی تھی۔ طالبان نے حکومت کے دور میں کھاد کا ایک بڑا پلانٹ از سر نو فعال کر دیا گیا جس سے یومیہ 5 ہزار بوری کھاد کی پیداوار ملنے لگی۔ شبرغان، مزار شریف اور قندوز کی ٹیکسٹائل ملوں کو بھی بحال کر دیا گیا۔

ملک کے صنعتی شہروں میں صنعتی زون رہائشی علاقوں سے ملے ہوئے تھے جن کے باعث شہریوں کو مختلف تکالیف کا سامنا رہا کرتا تھا۔ طالبان نے جب صنعتی سرگرمیاں بحال کیں تو ساتھ ہی اس مسئلے کا حل نکالنے کے لیے بھی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ سب سے پہلے جولائی 2001ء میں انہوں نے جلال آباد کے انڈسٹریل زون کے لیے 525 ایکڑ زمین مختص کرنے کا اعلان کیا۔ شہری آبادی کے تمام کارخانے وہاں منتقل کرنے کے علاوہ اس جگہ کئی نئے کارخانے تعمیر کرنے کا بھی فیصلہ ہوا۔

افغان ہلال احمر: غریب عوام کی رفاہی خدمات کے لیے ملا محمد عمر مجاہد نے ایک مستقل فلاحی ادارہ ''افغان ہلال احمر'' قائم کیا جس کے دفاتر پورے افغانستان میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس ادارے کی سرگرمیوں سے ہزاروں لوگ مستفید ہو رہے تھے۔ غیر ملکی امداد سے محرومی کے باوجود طالبان ''افغان ہلال احمر'' کو بڑی سرگرمی سے چلا رہے تھے۔ جولائی 1998ء میں سامنے آنے والی رپورٹ کے

مطابق افغان ہلال احمر نے ایک سال میں ایک ہزار ایک سو 69 بیوگان اور ایک ہزار دو سو 80 معذور افراد کو امداد فراہم کی۔ ڈاکٹر ملا احمد اللہ کے بیان کے مطابق جون 1997ء سے جون 1998ء تک ایک سال میں صرف بلمند کے علاقے میں 50 ہزار مریضوں کا مفت علاج کیا گیا۔

طالبان کی کوششوں سے درجنوں ہسپتال جو بند تھے، کھل گئے تھے اور کئی نئے ہسپتال قائم کیے گئے تھے۔ اکثر ہسپتالوں میں یومیہ دو دو تین تین سو مریضوں کا علاج ہو رہا تھا۔ قندھار کا ''مستشفیٰ عمر'' نامی ہسپتال اس کی زندہ مثال ہے۔

نظریاتی اور اصلاحی بگاڑ کی روک تھام: طالبان نے عوام کے عقائد و نظریات بگاڑنے والے عوامل کی بھی روک تھام کی۔ عیسائی مشنریوں پر پابندی لگائی۔ جعلی عاملوں اور مجاوروں کے بھیس میں بہت سے ٹھگ اور غیر ملکی ایجنٹ مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث تھے۔ طالبان نے ان کا بوریا بستر گول کر دیا۔ اس سلسلے کی ایک دلچسپ مثال بلوچستان کے سرحد کے قریب افغان حدود میں ''سانپوں والی سرکار'' کا مزار ہے۔ یہاں مزار کے گنبد پر سانپ کا 300 سال قدیم مجسمہ نصب تھا۔ مزار کے مجاوروں نے دو سانپ پالے ہوئے تھے جنہیں لوگ مشکل کشا اور حاجت روا تصور کرتے تھے۔ مزار کے سامنے مندروں کی طرح گھنٹیاں نصب تھیں۔ گویا یہ اسلام کے لبادے میں ہندوانہ عقائد کا پرچار ہو رہا تھا۔ طالبان نے سانپ کا مجسمہ مسمار کر دیا اور مجاوروں کو بھگا دیا۔ اندر موجود دونوں سانپوں کو بھی مار ڈالا۔ اس طرح شرک کی یہ دکان بند ہو گئی۔

قندھار کی عیدگاہ: طالبان بڑی بڑی عمارتیں تو تعمیر نہ کرا سکے مگر قندھار میں دس لاکھ افراد کی گنجائش رکھنے والی دنیا کی سب سے بڑی عیدگاہ تیار کرائی جس کے قبلہ رخ پر دنیا کا سب سے بڑا گنبد طالبان کے ذوق تعمیرات کا گواہ ہے۔

طالبان نے اپنے ہم وطنوں کو مال و دولت سے نہال تو نہیں کیا، ان پر عیش و عشرت کے دروازے تو نہیں کھولے مگر انہیں اچھے اخلاق و کردار کا نہایت گراں قدر تحفہ دیا۔ انہوں نے بے حد سادہ زندگی اپنا کر لوگوں کو ایک ایسا عملی نمونہ دیا جس کی مثالیں صرف قرونِ اولیٰ میں نظر آتی ہیں۔ طالبان قیادت کی درویشانہ زندگی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو گا کہ عید الفطر کے دن بھی گورنر قندھار ملا حسن رحمانی کے بچے نئے کپڑوں میں نظر نہیں آتے۔ طالبان کے قائدین کا نقطہ نظر یہ تھا کہ خود بھوکا رہ کر عوام کو سیر کیا جائے اور جو شے عوام کی دسترس میں نہ ہو حکمران بھی اسے اپنے لیے روا نہ سمجھیں۔ بلاشبہ یہ دور فاروقی اور دور عمر بن عبدالعزیز کی جھلکیاں تھیں جو عمر ثالث کے دور میں ایک بار پھر نظر آئیں۔ افغان قوم کو ان

فاقہ مست حکمرانوں سے جو روشن نمونہ ملا اس پر دنیا کی کروڑوں نعمتیں قربان کی جاسکتی ہیں۔

تجارتی رونقیں بحال: افغانستان میں بدامنی نے تجارت پر بڑے منفی اثرات مرتب کیے تھے اور تاجروں نے اس ملک کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ طالبان نے شاہراہوں کو محفوظ کر کے تاجروں کو ہر طرح کی سہولیات دیں۔ یوں تجارتی شاہراہیں آباد ہوگئیں۔

8 اکتوبر 1997ء کو طالبان سربراہ نے وزارتِ صنعت وتجارت کو حکم دیا کہ پاکستانی تاجروں سے مکمل تعاون کیا جائے۔ اعلان کیا گیا کہ ''ہر مسلمان تاجر، وسط ایشیا یا افغانستان سے ہر جائز تجارت کرسکتا ہے۔ تاجروں کے لیے اسپین بولدک اور تورغنڈی (سرحد ترکمانستان) میں گوداموں کا اور ہرات وقندھار میں رہائش کا انتظام کردیا گیا ہے۔ راستے کا تحفظ اور ٹرانسپورٹ کا انتظام افغان حکومت کے ذمے ہوگا۔''

اپریل 1998ء میں طالبان حکومت نے ''افغان انٹرنیشنل ٹرانسپورٹ'' کو بحال کردیا۔ ملک بھر میں اس ادارے کی شاخیں کھول دی گئیں۔ اس ادارے کی خدمات کی بے حد مانگ موجود تھی۔ ایک پاکستانی کمپنی نے فوراً سالانہ 10 لاکھ ٹن سامان کی باربرداری کا معاہدہ کرلیا۔ اس طرح دونوں ملکوں میں تجارت کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ طالبان نے عوام کو سہولت دینے کے لیے ایک حیرت انگیز کام یہ کیا کہ افغانستان آنے والی تمام درآمدات پر محصول (کسٹم) معاف کردیا۔ چنانچہ افغان عوام کو دنیا بھر کی اشیا نہایت سستے داموں ملنے لگیں۔ پاکستان کی زرعی اجناس خصوصاً پھل اور سبزیاں افغانستان میں ہاتھوں ہاتھ خریدی جانے لگیں۔ آلو اور پیاز صرف 5 روپے کلو فروخت ہو رہے تھے۔

طالبان کی ملکی وعوامی خدمات کا یہ ایک مختصر سا تذکرہ ہے۔ اس پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ طالبان صرف فاتح اور کشور کشا ہی نہیں بلکہ جہاں دار بھی تھے۔ انہوں نے نہایت محدود وسائل کے ساتھ اپنے دور حکمرانی میں برسوں سے تباہ حال ملک کو ازسر نو آباد کرنے اور عوام کو بنیادی سہولیات بہم پہنچانے کی جو کوششیں کی تھیں ان کو فراموش کرنا بہت بڑی زیادتی ہوگی۔

طالبان حکومت کا ڈھانچا: طالبان حکومت کا ڈھانچا اور نظام بڑا سادہ تھا۔ اسے ہم بڑی حد تک قدیم دور کے مسلم سلاطین اور خلفاء کے طرز حکومت سے مشابہ کہہ سکتے ہیں۔ مغربی جمہوریت سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ طالبان حکومت کے سربراہ ملا محمد عمر مجاہد تھے۔ ملا محمد ربانی نائب سربراہ مملکت تھے۔ حکومتی ڈھانچے کے اہم ستون تین مرکزی ادارے تھے جنہیں ریاست الوزراء، عسکری شوریٰ اور مرکزی شوریٰ کہا جاتا تھا۔

ریاست الوزراء 16 وزراء پر مشتمل ادارہ تھا۔ اس میں ملا عبید اللہ وزیر دفاع، ملا نور الدین ترابی

وزیر انصاف، مولانا جلال الدین حقانی وزیر قبائلی امور وسرحدات، ملا محمد عباس وزیر صحت، ملا امیر خان متقی وزیر اطلاعات وثقافت، قاری دین محمد وزیر منصوبہ بندی، ملا احمد اللہ وزیر مواصلات، ملا احمد جان وزیر معدنیات وصنعت، مولوی کلام الدین وزیر برائے مذہبی پولیس اور دیگر وزراء شامل تھے۔ اس ادارے کو ''کابل شوریٰ کی کابینہ'' بھی کہا جاتا تھا۔

''عسکری شوریٰ'' طالبان کا سب سے اعلیٰ عسکری ادارہ تھا۔ اس میں ملا محمد عمر کمانڈر انچیف، ملا محمد حسن ملٹری چیف آف آرمی اسٹاف اور ملا رحمت اللہ اخوند چیف آف آرمی اسٹاف تھے۔ ملا محمد فضل بری افواج کے سربراہ ونائب وزیر دفاع تھے، جبکہ ملا جمعہ خان، ملا محمد یونس اور تین دیگر کمانڈر بھی عسکری شوریٰ میں شامل تھے۔

''مرکزی شوریٰ'' طالبان حکومت کا سب سے اعلیٰ سطحی ادارہ تھا۔ اس میں ملا محمد حسن رحمانی، ملا محمد فضل، مولانا عبدالستار ستانی (چیف جسٹس آف افغانستان) ملا محمد غوث، ملا خیر الدین خیر خواہ (وزیر داخلہ) ملا احسان اللہ احسان (گورنر اسٹیٹ بینک) اور ملا عبدالجلیل (وزیر خارجہ) شامل تھے۔

ریاست الوزراء (کابل شوریٰ) اور عسکری شوریٰ اپنی سفارشات مرکزی شوریٰ کو پیش کرتی تھیں۔ ملا محمد عمر مرکزی شوریٰ سے مشورے کے بعد تمام سیاسی، عسکری اور اقتصادی مسائل کا فیصلہ خود کرتے تھے۔

ان کے علاوہ ''شعبہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' بھی نہایت بااختیار ادارہ تھا۔ اس کے سربراہ مولوی کلام الدین تھے۔ یہ ادارہ براہِ راست سربراہِ حکومت ملا محمد عمر سے احکام لیا کرتا تھا۔ اس کے ضابطوں اور احکام کے اعلانات ریڈیو کابل سے مسلسل نشر ہوتے رہتے تھے۔

تیل کا کھیل، وسط ایشیا سے افغانستان تک: طالبان کی مشکلات اور عالمی سطح پر ان کے خلاف پھیلائے گئے جال کا صحیح تجزیہ اس وقت تک نہیں کیا جاسکتا جب تک ہم تیل کے اس کھیل سے واقف نہ ہوں جو 1990ء کی دہائی میں وسط ایشیا میں کھیلا جا رہا تھا اور جس میں امریکا اور روس سمیت کئی بڑی طاقتیں شریک تھیں۔ بات یہ تھی کہ روس سے آزاد ہونے والی ریاستوں میں معدنی وسائل کے بے پناہ ذخائر تھے۔ بحیرۂ خزر (کیسپین سی) سے لے کر وسطِ ایشیا (آذربائیجان، ترکمانستان، ازبکستان اور قزاقستان) تک کا علاقہ تیل اور گیس کے عظیم الشان خزانوں سے بھرپور ہے۔ اس خطے میں تیل کے ذخائر کا محتاط اندازہ 150 بلین بیرل سے زائد ہے جو کہ امریکا کے اپنے تیل کے کل ذخائر سے سات گنا ہے۔ یہی وجہ ہے مغربی تیل کمپنیاں اس خطے پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تاب تھیں۔

1990ء کی دہائی میں ان کمپنیوں نے یکے بعد دیگرے قازقستان، آذربائیجان اور پھر ترکمانستان سے معاہدے کیے۔ قازقستان میں 58 بلین بیرل تیل، آذربائیجان میں 27 بلین بیرل تیل اور ترکمانستان

میں 32 بلین بیرل تیل موجود ہے۔ جہاں تک گیس کا تعلق ہے وہ قازقستان میں 88، آذربائیجان اور تاجکستان میں سے ہر ایک کے پاس 35 اور ازبکستان میں 10 ٹریلین کیوبک فٹ ہے۔ اس سلسلے میں ترکمانستان سب سے آگے ہے جس کے پاس 159 ٹریلین کیوبک فٹ گیس کا عظیم ذخیرہ ہے۔

ترکمانستان اپنی آمدن کا بیشتر حصہ قدرتی گیس فروخت کر کے ہی حاصل کرتا تھا، مگر اس کے باوجود پیداوار زیادہ تھی اور گاہک کم۔ ملک کی معیشت بہتر کرنے کے لیے ترکمانستان نئے خریداروں کی تلاش میں تھا۔ یہی کیفیت وسط ایشیا کے دوسرے ممالک کی تھی۔ چنانچہ مغربی کمپنیوں سے ان کے معاہدے ہوئے اور وسط ایشیا کا تیل اور گیس دوسرے ملکوں تک لے جانے کے لیے ہزاروں کلومیٹر طویل پائپ لائنوں کے کئی نقشوں پر غور ہونے لگا۔ ترکمانستان سے تیل اور گیس کے ذخائر بحرِ ہند تک لانے کے لیے افغانستان اور بلوچستان (پاکستان) سے بہتر کوئی اور روٹ نہیں ہو سکتا تھا اس لیے افغانستان تیل کے عالمی بیوپاریوں کی نگاہ میں بڑی اہمیت حاصل کر گیا۔

اس سلسلے میں پہلا منصوبہ ارجنٹائن کی کمپنی بریداس نے بنایا۔ اس نے 1994ء میں یہ منصوبہ پیش کیا کہ ترکمانستان سے افغانستان کے راستے ہندوستان تک گیس پائپ لائن بچھائی جائے۔ چونکہ یہ منصوبہ ''کم خرچ بالا نشین'' کا مصداق تھا اس لیے اگلے برس (1995ء میں) ایک امریکی کمپنی یونوکال نے بھی اس منصوبے کو اپنانے کی کوشش شروع کر دی۔ یونوکال کو امریکی حکومت کی پوری سرپرستی حاصل تھی۔ بڑے بڑے امریکی سیاست دان اس کے حصہ دار تھے۔ دو برس تک اس کے لیے تیاری ہوتی رہی مگر افغانستان میں خانہ جنگی کے سبب اس پر عملدرآمد کی نوبت نہیں آسکی تھی۔ تیل کمپنیاں حیران تھیں کہ آخر وہ کس کمانڈر سے جا کر بات کریں۔ ہر وادی میں ایک الگ گروہ کی حکومت تھی۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے اس منصوبے کا آغاز ممکن نہ تھا۔ تاہم طالبان کی فتوحات کے پیشِ نظر تیل کمپنیوں کو یہ اُمید بندھ گئی تھی کہ افغانستان میں امن قائم ہو جائے گا اور پائپ لائن منصوبے پر کام شروع کیا جا سکے گا۔

امریکی کمپنیوں کی طالبان سے بات چیت: اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ افغانستان میں قیامِ امن امریکی مفادات کے لیے بہتر تھا اور خود امریکا کو بھی اس کا احساس تھا۔ دوسرے لفظوں میں طالبان حکومت کا استحکام اس منصوبے کی تکمیل کے لیے سازگار ثابت ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ طالبان کی اٹل اسلام پسندی اور بے لچک پالیسیاں مغرب اور امریکا کے لیے باعثِ اضطراب تھیں۔ وہ افغانستان سمیت تمام عالمِ اسلام کو جن ''مُلّاؤں'' سے دور رکھنا چاہتے تھے، اب وہی ان کی مجبوری بنتے جا رہے تھے۔

آج اگر اس دور کے حالات کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ امریکا طالبان اور ان کی پالیسیوں سے سخت نفرت کرنے کے باوجود تیل اور گیس کے لالچ میں ان سے اس قسم کا تعاون چاہتا تھا جیسا کہ سعودی حکمرانوں اور مغربی طاقتوں کے مابین چلا آیا ہے۔ سعودی عرب میں حدود و قصاص اور اسلامی احکام کے نفاذ کو امریکا نے بادلِ نخواستہ قبول کر کے اسے اس لیے اپنے دوست کی حیثیت دی کہ اس کے ذریعے تیل کی دولت حاصل کرنا امریکا کی مجبوری تھی۔

کچھ ایسا ہی معاملہ طالبان کے ساتھ بھی تھا۔ وہ ایک طرف ملا اور مجاہد ہونے کے ناتے معتوب اور قابلِ نفرت تھے تو دوسری طرف پائپ لائن منصوبے کے بہترین راستے کے مالک ہونے کے باعث مغربی دنیا ان کے تعاون کی محتاج تھی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکا اور دوسری مغربی طاقتوں نے طالبان کو عروج پاتا دیکھ کر ان سے روابط پیدا کرنا شروع کر دیے تھے۔ دراصل انہیں اُمید تھی کہ وہ طالبان کو جلد ہی رام کر کے اس حد تک لچکدار بنا دیں گے کہ وہ حدود و قصاص اور شرعی احکام کے نفاذ کے باوجود سیاسی طور پر مغربی طاقتوں کے لیے بے ضرر ثابت ہوں گے۔ وہ ان کے صدیوں پر محیط منصوبوں کے لیے توانائی مہیا کریں گے، ان کی پالیسیوں پر عمل پیرا ہوں گے اور دیگر مسلم ملکوں کی طرح امریکا کے مددگاروں کی صف میں شامل ہو جائیں گے۔ اس طرح اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا وہ خطرہ جو امریکا و یورپ کو ”جہادیوں“ اور علمائے اسلام سے لاحق ہے، جلد دور ہو جائے گا۔ کچھ اس قسم کی اُمیدوں اور خدشوں کے مابین لٹکتے ہوئے امریکا نے تیل کمپنیوں کی وساطت سے طالبان سے گفت و شنید کا آغاز کیا تھا۔

تیل کمپنیوں کا طالبان سے رابطہ کب ہوا: طالبان کے ساتھ تیل کمپنیوں کے تعلقات کا آغاز 1996ء کے وسط میں ہوا تھا اور جب طالبان نے کابل فتح کیا تو ان روابط میں تیزی آگئی۔ امریکا نے تیل کمپنیوں کے ذریعے طالبان سے گفت و شنید شروع کی، قحط زدہ افغانستان کے محافظ طالبان کے لیے یہ پیش کش بڑی پُرکشش تھی۔ انہیں ان کمپنیوں کو اپنے ملک سے پائپ لائنوں کو گزارنے کی اجازت دینے پر بیٹھے بٹھائے اتنی خطیر رائلٹی مل سکتی تھی جس سے ملک کا نقشہ بدلا جا سکتا تھا۔ چنانچہ طالبان نے بھی اس منصوبے میں دلچسپی لینا شروع کر دی، مگر ان کا انداز باوقار تھا۔

طالبان بریداس کے ہیڈ کوارٹر میں: مغربی کمپنیوں نے طالبان کو رام کرنے کے لیے طرح طرح کے جتن شروع کر دیے۔ بریداس نے پہل کی اور 1997ء کے آغاز میں طالبان کو اپنے ملک کے دورے کی دعوت دی جس کے نتیجے میں فروری 1997ء میں طالبان کا وفد ارجنٹائن کے دارالحکومت بیونس آئرس میں بریداس کے ہیڈ کوارٹر پہنچا۔ اس دن طالبان کے احترام میں کمپنی کی تمام خاتون

سیکرٹریوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنا جسم زیادہ سے زیادہ ڈھانپ کر رکھیں کیونکہ طالبان عریانیت سے نفرت کرتے ہیں۔ اس دوران طالبان کا ایک اور وفد واشنگٹن پہنچ کر یونوکال کے منتظمین سے تبادلہ خیال کر رہا تھا۔ طالبان نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے اس وقت کوئی فیصلہ نہ کیا اور حالات کا جائزہ لے کر واپس آ گئے۔ ان روابط کا اتنا فائدہ ہوا کہ مارچ 1997ء میں بریداس نے کابل میں اپنا دفتر کھول لیا اور طالبان حکام سے ان کے رابطے تیز تر ہو گئے۔ جلد ہی بات بننے لگی اور کئی ہفتوں کی گفت وشنید کے بعد 150 صفحات پر مشتمل معاہدے کا مسودہ تیار ہو گیا، مگر اس پر دستخط باقی تھے۔

یونوکال کو کھرا جواب: امریکا اور اس کے زیر اثر پاکستان کی خواہش تھی کہ طالبان یونوکال سے معاہدہ کریں چنانچہ ستمبر 1997ء میں طالبان کے وزیر صنعت ملا احمد جان دوسری بار ارجنٹائن کے دورے پر روانہ ہونے لگے تو پاکستان نے طالبان پر دباؤ ڈالا کہ وہ یونوکال سے بھی مذاکرات کریں۔ طالبان کو یونوکال سے کوئی عناد نہیں تھا مگر وہ اس کے سرپرست امریکی سیاست دانوں کے رویے سے متنفر تھے۔ وہ برابر کی سطح پر سودے بازی کے لیے تیار تھے مگر امریکا انہیں خیرات لینے والا بھکاری تصور کر رہا تھا۔ چنانچہ اگست 1997ء میں امریکا نے موقف اختیار کیا کہ پائپ لائن معاہدہ تب کیا جائے گا جب اسامہ بن لادن کو امریکا کے حوالے کر دیا جائے اور افغانستان میں جہادی تربیت گاہیں بند کر دی جائیں۔ طالبان کے نائب امیر ملا محمد ربانی نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا تھا اور اصولی موقف اختیار کرتے ہوئے کہا تھا:

''معاہدے کی ضرورت آپ کو ہے۔ ضرورت مند کو شرائط عائد کرنے کا کیا حق ہے؟''

اکتوبر کے اواخر میں افغانستان، پاکستان اور ترکمانستان گیس پائپ لائن کے لیے ایک مجلس کی تشکیل میں متفق ہو گئے۔ طالبان کے سفیر مولوی شہاب الدین نے ترکمانستان کا دورہ کیا اور واپسی پر بیان دیا کہ از بک کمپنی سمیت نصف درجن سے زائد کمپنیاں اُمیدوار ہیں، ان میں سے جو ہماری شرائط پر پوری اُترے گی اسے کام کا موقع دیں گے۔ اِدھر پاکستان کے اصرار پر نومبر 1997ء میں طالبان کے ایک اور وفد نے ملا محمد غوث کی قیادت میں امریکا کا بھی دورہ کیا اور یونوکال سے دوبارہ بات چیت کی۔ اب تک یہ واضح نہیں ہو سکا تھا کہ طالبان کس کے گلے میں ہار ڈالیں گے۔ جلد ہی ان طاقتوں کو اندازہ ہو گیا کہ طالبان ان کی توقعات سے کہیں زیادہ اٹل اور بے لچک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بار بار جال ڈالنے کے بعد آخر میں امریکا طالبان سے مستقل طور پر بیزار اور نا اُمید ہو گیا۔

بات چیت ختم: دسمبر 1997ء سے لے کر فروری 1998ء تک افغانستان میں برف باری کی وجہ سے یہ معاملات رکے رہے۔ پھر موسم بہار میں طالبان کی مخالف گروہوں سے جنگ چھڑ گئی۔ تاہم مغربی کمپنیوں کو

اُمید تھی کہ طالبان جلد ہی جنگ سے فارغ ہو کر زیادہ مستحکم انداز میں تیل کے عالمی کھیل کا حصہ بن سکیں گے مگر سات اگست 1998ء کو کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارت خانوں کو نامعلوم افراد نے بموں سے اڑا دیا جس کا الزام اسامہ بن لادن پر لگا دیا گیا اور امریکا نے القاعدہ کو سزا دینے کے عنوان سے 20 اگست کو بحیرہ عرب میں کھڑے اپنے بحری بیڑے سے افغانستان میں القاعدہ کے معسکر پر کروز میزائل داغ دیے۔ اس طرح دونوں ملکوں میں تعلقات کشیدہ تر ہو گئے اور یونوکال نے قندھار سے اپنا عملہ واپس بلا لیا۔ امریکا کا موقف تھا کہ اسامہ بن لادن کی موجودگی میں کوئی مغربی کمپنی افغانستان میں پائپ لائن تعمیر نہیں کر سکتی۔ قصہ تو ختم ہو چکا تھا مگر اس کے باوجود پاکستان پائپ لائن کے معاملے کو دوسرے انداز میں حل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اپریل 1999ء میں حکومت پاکستان نے اسلام آباد میں ترکمانستان اور افغانستان کے نمائندوں کو جمع کر کے گیس پائپ لائن کے لیے نئے معاون اور سرپرست تلاش کرنے کی کوشش کی مگر اب مغربی کمپنیاں افغانستان میں قدم رکھتے ہوئے گھبرا رہی تھیں۔ کلنٹن انتظامیہ کے سامنے یہ سوال تھا کہ آیا طالبان سے عناد ترک کر کے گیس لائن منصوبے کو فراخدلی کے ساتھ شروع کیا جائے یا اپنی آن بان قائم رکھنے کے لیے افغانستان میں کوئی کٹھ پتلی حکومت قائم کرنے پر سرمایہ کاری کی جائے۔

بل کلنٹن اس سوال کے جواب میں متذبذب رہا مگر جب 20 جنوری 2001ء کو تیل کے عالمی بیوپاری جارج ڈبلیو بش نے امریکا کے نئے صدر کی حیثیت سے اقتدار سنبھالا تو وہ تیل کے دھاروں کا رخ امریکا کی طرف کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ کلنٹن انتظامیہ جن اہداف کو دھیرے دھیرے حاصل کرنا چاہتی تھی جوشیلا اور من چلا بش انہیں ایک ہی جست میں سر کر لینے کے لیے بے تاب تھا۔ اس کی حریصانہ نگاہیں بحیرۂ خزر سے قزاقستان تک زیر زمین تیل کے متلاطم سمندر پر جمی تھیں۔ اس کے سامنے توانائی کا وہ بحران بھی تھا جو امریکا کو چند عشروں بعد مفلوج کر سکتا تھا جبکہ بش پوری دنیا کو امریکی شکنجے میں لینے کا خواہاں تھا۔ اس کے نزدیک یہ ضروری تھا کہ جلد از جلد افغانستان کو تیل اور گیس کے ذخائر کی گزرگاہ بنائے، چاہے سودے بازی کر کے، چاہے خون کی ندیاں بہا کر۔

بامیان کے بت: جوں جوں دنیا طالبان سے رشتے ناتے توڑتی گئی، طالبان بھی ان کی خوشی یا ناراضی سے بے پروا ہوتے گئے۔ شاید انہیں بھی اندازہ تھا کہ ان کی حکومت جلد ختم کر دی جائے گی اس لیے وہ اس سے پہلے پہلے اپنا ہر ارمان پورا کر لینا چاہتے تھے۔ فروری 2001ء کے وسط میں طالبان مخالف طاقت حزب وحدت نے ایک بار پھر بامیان پر قبضہ کر کے طالبان کو وہاں سے نکال دیا۔ تاہم ایک ہفتے بعد 20 فروری کو طالبان نے دوبارہ بامیان کا کنٹرول سنبھال لیا۔ اس موقع پر طالبان قیادت نے فیصلہ

کیا کہ اب بامیان کے دو ہزار سال قدیم بتوں کو تباہ کر دینا چاہیے جو بدھ مت کے کروڑوں پیروکاروں کے نزدیک سب سے بڑے معبود کا درجہ رکھتے ہیں۔

یہ بت پہاڑوں کو تراش کر بنائے گئے تھے۔ ان میں سے ایک بت 177 فٹ اور دوسرا 120 فٹ بلند تھا۔ ان کی تعمیر میں کانگرو مٹی اور خاص قسم کے پتھر استعمال کیے گئے تھے جن کی وجہ سے یہ نہایت ٹھوس اور مضبوط تھے۔ کتبِ تاریخ کے مطابق یہ دیو پیکر بت بدھ مت کے پیروکار حکمران ''کنشک'' کے حکم سے بنائے گئے تھے۔ ان کی تعمیر کا زمانہ 120ء سے 160ء تک بتایا جاتا ہے۔ کنشک کا تعلق کوشانی خاندان سے تھا۔ اس خاندان کے دور میں بدھ راہبوں نے بامیان کے پہاڑوں میں شہد کی مکھیوں کے چھتوں جیسے غار بنائے تھے جن میں وہ یکسوئی سے پوجا پاٹ کیا کرتے تھے۔ بامیان پہلی صدی عیسوی سے ساتویں صدی عیسوی تک بدھ مت کا مرکز رہا۔ مشہور چینی سیاح ''آفاشتین'' نے پانچویں صدی عیسوی میں ان بتوں کا معاینہ کیا تھا۔ ایک اور چینی سیاح ''ہوان تسینگ'' نے 630ء میں ان بتوں کا مشاہدہ کیا اور بتایا کہ یہ مجسمے سونے اور قیمتی جواہر سے مرصع تھے۔

اس کے چند عشروں بعد سرزمین عرب سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قافلے اسلام کی مشعل لیے افغانستان پہنچے۔ اس وقت بامیان کی بدھ حکومت نے جزیہ دے کر صلح کر لی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بامیان میں داخل ہوئے بغیر واپس چلے گئے۔ اگلی صدی میں بامیان کی حکومت ایک بدھ شہزادی کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اپنے خاندان اور رعایا سمیت مشرف بہ اسلام ہوگئی۔ ان نومسلموں نے کدالوں اور ہتھوڑوں سے ازخود یہ بت توڑنے کی کوشش کی مگر وہ ان پہاڑ نما مجسموں کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ نویں صدی عیسوی (تیسری صدی ہجری) میں حاکم خراسان یعقوب بن لیث صفاری بھی انہیں توڑنے میں ناکام رہا اور ان میں جڑے ہوئے قیمتی پتھر نکال کر واپس چلا گیا۔ بارود کا زمانہ آیا تو سترہویں صدی عیسوی میں اورنگ زیب عالمگیر نے افغانستان فتح کرنے کے بعد پہلی بار توپوں کے ذریعے انہیں تباہ کرنے کی کوشش کی۔ انیسویں صدی عیسوی میں امیر عبدالرحمن کی ملکہ کے حکم سے انہیں ایک بار پھر گولہ باری کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کارروائیوں سے ان بتوں کو نقصان تو ضرور پہنچا مگر انہیں منہدم نہ کیا جا سکا۔

بتوں کو توڑنے کا فیصلہ: طالبان امارت اسلامی شروع سے اسلامی شعائر کو زندہ اور کفریہ آثار کو سرزمین اسلام سے مٹانے کا تہیہ کیے ہوئے تھی، اس لیے بامیان کے بتوں کو بہر صورت ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ حکومتی سطح پر اس فیصلے سے قبل سپریم کورٹ اور مرکزی دارالافتاء سے استفتاء کیا گیا کہ آیا ان بتوں اور مجسموں کو توڑا جائے یا باقی رکھا جائے؟ دونوں اداروں نے جواب دیا کہ اسلامی شریعت کی رو سے

تمام بتوں اور مجسموں کو توڑنا ضروری ہے۔ چنانچہ 28 فروری 2001ء کو طالبان سربراہ ملا محمد عمر مجاہد نے ملک بھر میں موجود تمام مجسموں اور بتوں کو ختم کر دینے کا حکم دے دیا۔ ملا محمد عمر نے کہا: ''معبود حقیقی صرف اللہ ہے۔ ناحق معبودوں کو اس لیے ختم کر رہے ہیں کہ مستقبل میں کوئی ان کی پوجا نہ کرے۔''

طالبان سربراہ کے اس اعلان سے دنیا بھر میں کھلبلی مچ گئی کہ افغانستان کا قومی ورثہ تباہ ہو جائے گا، دنیا اس کی ثقافت سے محروم ہو جائے گی۔ بدھ مت ملکوں جاپان، تھائی لینڈ، سری لنکا نے آسمان سر پر اُٹھا لیا مگر طالبان نے پروانہ کی۔ ملا محمد عمر نے عید الاضحیٰ کے خطبے میں بانگِ دہل کہا:

''یہ بت ہمارے تاریخی ورثے کا صرف ایک فیصد حصہ ہیں۔ باقی ننانوے فیصد حصہ اب بھی بدستور باقی ہے جو ہماری ثقافتی تاریخ اور فخر کے لیے کافی ہے۔ یہ بت شرعی حکم کی بنا پر توڑے جا رہے ہیں۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار سے زائد پیغمبروں نے اس شرک کا مقابلہ کیا تھا۔''

بت فروش نہیں بت شکن: جاپان سمیت کئی ممالک نے طالبان کو بت نہ توڑنے کی شرط پر بھاری مالی امداد کی پیش کش بھی کی مگر ملا محمد عمر نے سلطان محمود غزنوی کے انداز میں جواب دیا: ''ہم بت فروش نہیں بت شکن کہلوانا پسند کریں گے۔'' اس اعلان کے بعد یکم مارچ 2001ء کو سینکڑوں طالبان ٹینکوں، گولہ بارود کی بھاری کھیپ اور راکٹ لانچروں سمیت بامیان کے بتوں کے سامنے پہنچ گئے۔ اس مہم کی نگرانی ملک کے وزیر دفاع ملا عبید اللہ، سرپل کے گورنر ملا عبد المنان حنفی اور ملا شہزادہ کر رہے تھے۔ دونوں بتوں کو بارود کا لباس پہنا دیا گیا جس کی مقدار 1250 من تھی۔ اس کے علاوہ 200 ٹینک شکن بارودی سرنگیں اور ایک ہزار کلوگرام اور پانچ سو کلوگرام کے ایسے 42 بڑے بم بھی نصب کیے گئے جو جیٹ طیاروں سے گرائے جاتے ہیں۔ یہ منصوبہ بندی قندھار سے آئے ہوئے بارود کے ماہر ملا لعل محمد نے کی تھی۔

جب بارودی دھماکا کیا گیا تو زلزلہ سا آ گیا۔ سرخ شعلوں، دھویں کے بادلوں اور گرد و غبار کے مرغولوں نے فضا کو ڈھانپ لیا۔ دور دور تک پتھروں کے ٹکڑے اولوں کی طرح برسنے لگے۔ مطلع صاف ہوا تو دونوں بتوں کے سر اور چہرے غائب ہو چکے تھے۔ بڑے بت کا زیر ناف حصہ بھی تباہ ہو گیا تھا۔ اسی روز کابل اور غزنی کے عجائب گھروں کے بتوں کو بھی توڑ پھوڑ دیا گیا۔ ملا محمد عمر نے اس نیک کام میں تاخیر کے کفارے اور عمل کی تکمیل کے شکرانے کے طور پر 100 گائیں ذبح کرا کے ان کا گوشت غریبوں میں تقسیم کرایا۔ بت شکنی کے اس تاریخی واقعے کے ساتھ ہی ملک بھر میں جاری کئی ماہ کی خشک سالی دور ہو گئی۔ موسلا دھار بارشوں کی صورت میں ابرِ کرم برس پڑا اور کچھ ہی دنوں میں ہر طرف ہری بھری فصلیں لہلہانے لگیں۔

اسلام پر سمجھوتا نہیں ہو سکتا: بامیان کے بتوں کی تباہی کا یہ واقعہ عالمی طاقتوں کو طالبان کے خلاف مزید

منتقل کرنے کا سبب بنا۔ 15 مارچ 2001ء کو برطانوی جینز انٹرنیشنل سیکیورٹی رپورٹ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ بش انتظامیہ طالبان حکومت کے خلاف بھرپور آپریشن کے لیے بھارت، ایران اور روس کے ساتھ مل کر کام کر رہی ہے۔ بھارت اور روس تاجکستان اور ازبکستان کے ہوائی اڈوں سے احمد شاہ مسعود اور رشید دوستم کو عسکری سامان، فوجی مشیر، ہیلی کاپٹر اور مواصلاتی آلات فراہم کر رہے ہیں۔

عالمی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں دن بدن بڑھتی گئی مگر طالبان اپنی جگہ اٹل تھے۔ پاکستان کی جمعیت علمائے اسلام نے 4 اپریل 2001ء کو پشاور میں عالمی دیوبند کانفرنس منعقد کی تو اس میں طالبان سربراہ کے نمایندے نے اپنے امیر کا یہ پیغام پڑھ کر سنایا: ''عالمی طاقتیں ہمارے خلاف یکجا ہو چکی ہیں مگر اسلام پر کوئی سمجھوتا نہیں ہوسکتا۔'' ملا عمر کے پیغام میں اس طرف اشارہ تھا کہ نئے امریکی صدر بش کی نگاہیں وسط ایشیا کی معدنی دولت پر مرکوز ہیں اور وہ اس پر قبضے کے لیے افغانستان کو فتح کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

ملا محمد ربانی کی وفات: 12 اپریل 2001ء کا دن طالبان کے لیے نہایت غم انگیز تھا۔ ملک کی چھ رکنی مرکزی وزارت کونسل ''ریاست الوزراء'' کے سربراہ ملا محمد ربانی وفات پا گئے تھے۔ وہ ملا محمد عمر کے سب سے قریبی ساتھی تھے۔ 1960ء میں پیدا ہوئے، 20 سال کی عمر میں روس کے خلاف جہاد میں شریک ہو گئے اور مولانا یونس خالص کی تنظیم میں نائب کمانڈر کے طور پر ان گنت کارنامے انجام دیے۔ وہ ''حاجی معاون'' کے لقب سے مشہور تھے۔ ملا محمد عمر کے ساتھ طالبان تحریک کو منظم کرنے میں ان کا مرکزی کردار تھا۔ جلال آباد اور کابل کی فتح میں بھی وہ پیش پیش تھے۔ آخر تک ملک کے سب سے بڑے حکومتی ادارے ریاست الوزرا کے سربراہ رہے۔ ان کی حیثیت وزیر اعظم کی سی تھی۔ ان کی وفات سے طالبان قیادت ایک شدید صدمے سے دوچار ہوئی۔

اگرچہ ان دنوں ملک میں عمومی طور پر امن وامان تھا مگر باغیوں کی سازشیں جاری تھیں، جن کے طشت ازبام ہونے پر طالبان کو بار بار حرکت میں آنا پڑتا تھا۔ ہر دو تین ہفتوں میں ایسا کوئی نہ کوئی واقعہ رونما ہوتا رہتا تھا۔ مئی 2001ء میں ایک غیر معمولی جنگ برپا ہوئی۔ دوستم نے ساز باز کر کے سرپل، مزار اور شبرغان پر قبضے کا منصوبہ بنالیا تھا۔ وہ اپنے گروہ کے ساتھ یک دم چال کے قریب نمودار ہوا اور طالبان پر ٹوٹ پڑا۔ تاہم طالبان نے بھرپور انداز میں دفاع کیا۔ ان کے جوابی حملوں میں دوستم کے چار بڑے کمانڈر مارے گئے اور وہ فرار ہو کر سرحدی قصبے بندر آئی خانم میں روپوش ہو گیا۔ اسی طرح اس کا مزار شریف پر از سر نو تسلط کا خواب پورا نہ ہوسکا۔ یہ واقعہ 12 مئی 2001ء کا ہے۔

شرعی پابندیاں اور اقتصادی پابندیاں: طالبان حکومت نفاذ شریعت کے مراحل کی تکمیل کی طرف

گامزن رہی۔ ۲۶ جولائی کو ملا محمد عمر نے غیر شرعی اشیاء کی درآمد پر پابندی عائد کر دی۔ ان اشیا میں ڈش انٹینا، پروجیکٹر، آلاتِ موسیقی، کیرم بورڈ، شطرنج، الکحل مشروبات، تصاویر، پٹاخے، مجسمے، ٹائی اور سور کا گوشت وغیرہ کو شامل کیا گیا تھا۔

ادھر اقوام متحدہ کے موقف میں بھی روز بروز سختی آتی جا رہی تھی۔ اگست کے آغاز میں اقوام متحدہ نے 20 ماہرین کی ٹیم پاکستان بھیجنے کا اعلان کیا۔ ان ماہرین کا کام یہ تھا کہ وہ دیکھیں کہ طالبان کے خلاف سلامتی کونسل کی منظور شدہ قرارداد میں عائد کردہ پابندیوں کی تعمیل ہو رہی ہے یا نہیں؟ اس قرارداد کی ایک شق یہ بھی تھی کہ پڑوسی ممالک طالبان کو اسلحہ فراہم نہیں کریں گے۔ امریکا کو شک تھا کہ پاکستان طالبان کو اسلحہ دیتا ہے یا اس کی فراہمی میں تعاون کرتا ہے۔

امریکا چاہتا تھا کہ طالبان کو نہتا کر دیا جائے اور ان کے مخالفین کو طاقت ور بنا کر امارتِ اسلامیہ کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اس مقصد کے تحت اگست 2001ء کے دوسرے عشرے میں امریکا اور اس کے اشتراک سے طالبان مخالف گروہوں کو بھرپور امداد دے کر طالبان کے خلاف "آپریشن ورق پلٹنا" کا آغاز کیا جس کے تحت دوستم اور احمد شاہ مسعود کے جنگجوؤں کو بالترتیب فاریاب، شبرغان، بلخ، مزار شریف، سمنگان اور کابل پر قبضہ کرنا تھا۔ مگر طالبان نے بھرپور مزاحمت کرتے ہوئے اس سازش کو قبل از وقت ناکام بنا دیا اور باغیوں کے 25 سرغنے اور 400 کارکن گرفتار کر لیے۔ دوستم حسب معمول فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

مآخذ و مراجع

- ...... طالبان جند اللہ۔ فہمی ہویدی
- ...... ہفت روزہ ضرب مؤمن، جلد 3، 4
- ...... طالبان اور تیل کا کھیل۔ احمد رشید (نمائندہ ٹیلی گراف)
- ...... ہفت روزہ تکبیر: جلد 1999ء، 2000ء، 2001ء
- ...... ماہنامہ امارتِ اسلامی افغانستان جلد 1422ء
- ...... قومی اخبارات۔ امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور ہفت روزہ جرائد۔ 1999ء، 2000ء، 2001ء

پینتیسواں باب

گیارہ ستمبر، امریکا کی افغانستان پر یلغار

احمد شاہ مسعود کا قتل: ستمبر 2001ء کا مہینہ ایک گھمبیر خاموشی کے ساتھ شروع ہوا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ سکوت کی اس تہہ میں کتنا بڑا زلزلہ انگڑائیاں لے رہا ہے۔ طالبان معمول کے مطابق ملکی امور انجام دے رہے تھے۔ شاید سب ہی آنے والے وقت سے بے خبر تھے۔ کچھ دنوں پہلے مشنری سرگرمیوں میں ملوث این جی اوز کے کئی مرد و خواتین کارکنوں کو گرفتار کیا گیا تھا۔ ان کے قبضے سے 100 کے لگ بھگ سی ڈیز بھی برآمد ہوئی تھیں۔ طالبان کہہ رہے تھے کہ ان سی ڈیز میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کو توہین آمیز انداز میں دکھایا گیا تھا اس لیے گرفتار شدگان پر توہین عیسیٰ علیہ السلام کا مقدمہ بھی چلے گا۔ دنیا والوں کے لیے یہ خبر کوئی عجیب نہ تھی۔ طالبان کئی برس سے ایسے اقدامات کرتے آ رہے تھے۔ عجیب خبر تو وہ تھی جو 10 ستمبر کو سنی گئی۔ شمالی اتحاد کے سربراہ احمد شاہ مسعود کو دن دیہاڑے قتل کر دیا گیا تھا۔ قاتل دو عرب مجاہد تھے جو صحافیوں کے بھیس میں احمد شاہ مسعود سے ملے تھے۔ انتہائی سخت تلاشی کے باوجود ان سے وہ بم برآمد نہ کیا جا سکا جو ویڈیو کیمرے میں نصب تھا۔ انٹرویو لیتے ہوئے انہوں نے کیمرہ احمد شاہ مسعود کے چہرے کے بالمقابل لا کر بم دھماکا کر دیا۔ وادی پنجشیر کا وہ نامور کمانڈر جسے بڑی بڑی فوج زیر نہ کر سکی، دیکھتے ہی دیکھتے دو عربوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس خبر سے شمالی اتحاد کی صفوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ احمد شاہ مسعود کے مقبوضات جو پنج شیر سے طالقان تک پھیلے ہوئے تھے، اب طالبان کے رحم و کرم پر تھے۔ طالبان نے موقع غنیمت جان کر طالقان کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ منگل 11 ستمبر 2001ء کی صبح طالبان طالقان کے دروازے پر تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے تین دن میں وہ افغانستان کے بقیہ 10 فیصد حصے پر بھی قبضہ کر لیں گے مگر......

ورلڈ ٹریڈ سینٹر زمین بوس: اسی دن امریکا کے مقامی وقت کے مطابق صبح 8 بج کر 48 منٹ پر ایک مسافر طیارہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے جنوبی ٹاور سے جا ٹکرایا۔ جس سے ہر طرف کہرام مچ گیا۔ اس افراتفری

کے عالم میں نو بج کر تین منٹ پر ایک اور طیارہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے شمالی ٹاور میں گھس گیا۔ ہر طرف آگ اور دھوئیں کے بادل چھا گئے۔ یہ ایک سو دس منزلہ کوہ پیکر عمارت دیکھتے ہی دیکھتے زمین بوس ہو گئی۔ ہزاروں لوگ اس کی زد میں آ کر ہلاک اور زخمی ہو گئے۔

9 بج کر 38 منٹ پر ایک اور مسافر طیارہ امریکا کی وزارتِ دفاع کے مرکز پینٹا گون پر آن گرا جس سے 29 ایکڑ پر مشتمل ہیڈ کوارٹر کی 5 منزلیں بالکل تباہ ہو گئیں۔ یہاں زیادہ تر ہلاک ہونے والے فوجی افسران تھے۔

یہ امریکا کی تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ تھا جس نے نہ صرف امریکا بلکہ دنیا کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ ایک ایسا دور جس میں ہر طرف ہلاکتیں، بربادیاں اور تباہیاں نظر آتی ہیں...... اور اس کا انجام تاحال نظروں سے اوجھل ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پینٹا گون کی تباہی کے بعد پورے امریکا میں ہنگامی حالت نافذ کر دی گئی۔ تمام ہوائی اڈے بند کر دیے گئے۔ وائٹ ہاؤس خالی کرا لیا گیا۔ صدر بش دن بھر روپوش رہے۔ شام کو وہ منظرِ عام پر نمودار ہوئے اور ٹی وی پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے کسی ثبوت اور کسی تحقیق کے بغیر نہایت جذباتی انداز میں مسلمانوں کو اس حملے کا مجرم قرار دیا، اسامہ بن لادن کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا، اپنے دشمنوں کے خلاف ہر سرحد سے ماورا جنگ چھیڑنے کا اعلان کیا اور اسے صلیبی جنگ کا نام دیا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ بش ہر قیمت پر جنگ چھیڑنا چاہتا ہے۔ ستمبر کے بقیہ ایام ایک بڑی جنگ کی تیاری میں گزرے۔ اس دوران امریکا اپنے گرد زیادہ سے زیادہ اتحادی جمع کرتا رہا۔ صدر بش نے طالبان حکومت کو دھمکی دی کہ اسامہ بن لادن کو فوراً امریکا کے حوالے کر دیا جائے ورنہ افغانستان کو تہس نہس کر دیا جائے گا۔

پرویز مشرف کا کردار: ادھر پاکستان کے صدر پرویز مشرف نے امریکا کا ایک فون سن کر ہی اس کے اتحادی کے طور پر اس جنگ میں شرکت کا فیصلہ کر لیا تھا۔ افغان پالیسی پر یہ یوٹرن لیتے ہوئے انہوں نے اپنی کابینہ سے مشاورت کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ پرویز مشرف نے اس موقع پر امریکی ایجنٹ کا کردار ادا کرتے ہوئے یک طرفہ طور پر طالبان حکومت پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی کہ امریکا کا مطالبہ مان کر اسامہ کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ پرویز مشرف نے اپنی سوانح حیات میں تحریر کیا ہے کہ 11 ستمبر کے بعد طالبان اور افغانستان کے خلاف امریکا کے غیظ و غضب سے بچنے کا واحد راستہ یہ تھا کہ اسامہ بن لادن اور اس کے ساتھیوں کو افغانستان سے نکال دیا جاتا۔

حکومت پاکستان نے اس مقصد کے لیے اعلیٰ فوجی افسران اور مقتدر علمائے کرام کا ایک وفد بھی

قندھار روانہ کیا۔ یہ حکومت پاکستان کی جانب سے اسامہ بن لادن کے مسئلے پر ملا محمد عمر سے دوسری اعلیٰ سطحی بات چیت تھی۔ (پہلی بات چیت 1998ء میں شہزادہ ترکی الفیصل کی موجودگی میں ہوئی تھی)۔ چونکہ وفد میں پاکستان کے بڑے بڑے علماء شریک تھے اس لیے اُمید کی جاسکتی تھی کہ طالبان سربراہ کو اپنے رویے میں لچک لانے پر آمادہ کرلیا جائے گا۔ ملا محمد عمر وفد کے ارکان کی باتیں خاموشی سے سنتے رہے اور آخر میں انہوں نے بڑے ٹھوس لہجے میں اعلان کیا کہ وہ اپنے مہمان اور مسلمان بھائی اسامہ بن لادن کو کسی قیمت پر دشمنوں کے حوالے نہیں کریں گے چاہے اس کے لیے انہیں اپنی حکومت اور اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں۔

طالبان کو تنہا چھوڑنے کا قطعی فیصلہ: اس وفد کی ناکام واپسی کے بعد حکومت پاکستان نے طالبان کو تنہا چھوڑ دینے کا قطعی فیصلہ کرلیا کیونکہ جو چیز ملا محمد عمر اور طالبان کے نزدیک غیرت، عزت اور حمیت تھی وہ پرویز مشرف کی دانست میں پاگل پن اور جنون تھا۔ اِن دنوں پاکستانی قوم کو اس جنگ میں افغانستان سے لاتعلق رکھنے بلکہ امریکا کی صف میں شامل کرنے کے لیے حکومتی سطح پر میڈیا کا زبردست استعمال کیا گیا۔ ہر جگہ ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ نمایاں کیا گیا اور اپنے قریب ترین مسلم ہمسایہ ملک کو مصیبت کی سخت ترین گھڑی میں اکیلا چھوڑ دیا گیا۔ 16 ستمبر تک یہ بات واضح ہوگئی کہ پرویز مشرف نے امریکی مطالبات کو من وعن قبول کرلیا ہے جن میں امریکی فوج کو افغانستان پر حملے کرنے کے لیے راہداری اور اڈے فراہم کرنا بھی شامل تھے۔ تب اسلام آباد میں طالبان کے سفیر ملا عبدالسلام ضعیف نے پہلی بار سخت زبان استعمال کرتے ہوئے کہا کہ ہم امریکا کو فوجی اڈے فراہم کرنے والے ملک پر حملہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ طالبان کو اُفق پر تباہی و بربادی کے مہیب شعلے رقص کرتے نظر آرہے تھے مگران حالات میں بھی ان کی استقامت میں فرق نہ آیا تھا۔

ملا عمر کے جرأت مندانہ بیانات: ملا محمد عمر نے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی اور صدر بش کے اعلان جنگ کے بعد کئی تاریخ ساز بیانات دیے تھے۔ اپنے پہلے بیان میں جو 14 ستمبر کو شائع ہوا، انہوں نے کہا:

''عالم کفر اسلامی نظام کو مٹانے کے لیے متحد ہوگیا ہے۔ افغان مجاہد اور عوام قربانیوں کے لیے تیار ہوجائیں۔ نمازوں میں قنوت نازلہ کا اہتمام کیا جائے۔''

22 ستمبر کو انہوں نے امریکا کو متنبہ کرتے ہوئے کہا:

''میرے یا اسامہ کے قتل سے امریکا بحران سے نہیں نکل سکتا۔ اگر وہ دہشت گردی کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے تو اپنی افواج جزیرۂ عرب سے نکال لے، مسئلہ فلسطین پر جانبداری ترک کردے اور

اسلامی قوانین میں مداخلت چھوڑ دے۔"

مگر اس خیر خواہانہ نصیحت کے جواب میں امریکا اپنے لاؤ لشکر کی تیاری میں جتا رہا۔ نہ صرف نیٹو کے 19 ممالک اس کے ساتھ تھے بلکہ پوری دنیا اس کے ہمرکاب تھی۔ یہ دن زبردست نفسیاتی جنگ کے تھے۔ ایک اعصاب شکن مرحلہ تھا جس سے دنیا دھڑکتے دل کے ساتھ گزر رہی تھی۔ کیا امریکا افغانستان پر حملہ کرے گا؟۔ کیا یہ محض دھمکیاں ہیں؟۔ اگر حملہ ہوا تو طالبان مدافعت کر پائیں گے؟ ہر شخص اس ادھیڑ بن میں غلطاں تھا۔ تاہم ستمبر کے اواخر تک امریکا کی جنگی تیاریاں اس نہج پر پہنچ گئیں کہ حملے کا خطرہ صاف سامنے نظر آنے لگا۔ اس مرحلے پر طالبان سربراہ نے مقابلے کا چیلنج قبول کرتے ہوئے کہا: "امریکا نے حملہ کیا تو گوریلا جنگ شروع کریں گے۔ امریکا کے آگے جھک کر اسلام کو نیچا نہیں کریں گے۔"

صلیبی جنگ کا آغاز: آخر کار 7 اکتوبر 2001ء کو امریکا نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ یہ اتوار اور پیر کی درمیانی شب تھی۔ رات کے 9 بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے کہ افغانستان کے شہروں کابل، قندھار، جلال آباد، مزار شریف اور ہرات پر کروز میزائل برسنے لگے۔ اس پہلے حملے میں امریکا اور برطانیہ کی افواج شامل تھیں۔ بی باون، بی ٹو اور C-130 طیاروں نے کابل ایئرپورٹ اور قندھار میں طالبان کے کمانڈ بیس اور بجلی گھر پر بمباری کی۔

اس کارروائی کے ساتھ ہی امریکا میں صدر بش نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "امریکا اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان پر حملہ کر دیا ہے۔ یہ مہم دہشت گردی کے خاتمے تک جاری رہے گی۔ برطانیہ کے علاوہ کینیڈا، آسٹریلیا، جرمنی اور فرانس اس کارروائی میں ہمارے ساتھ ہیں جبکہ 40 ممالک خفیہ معلومات اور دیگر حوالوں سے ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ ہمارا مقصد دہشت گردوں کا نیٹ ورک تباہ کرنا ہے۔ دہشت گردوں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے گا۔ یہ جنگ وسیع ہوگی اور جو حکومت بھی بے گناہ لوگوں کے قاتلوں کو پناہ دے گی اس کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔ اس جنگ میں امریکا تھکے گا نہ ناکام ہوگا اور نہ ہی کوئی غلطی کی جائے گی۔"

امریکا کے حملے کے ساتھ ہی پنج شیر میں محصور شمالی اتحاد کے جنگجو بھی منظم انداز میں حرکت میں آگئے اور انہوں نے طالبان کے علاقوں کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

طالبان قیادت اور اسامہ محفوظ: امریکا کا سب سے بڑا ہدف اسامہ بن لادن اور طالبان قیادت تھی لیکن تین دن تک مسلسل حملوں کے باوجود امریکا یہ ہدف حاصل نہ کر سکا اور شہری آبادی اس کے حملوں کا نشانہ بنتی رہی۔

9 / اکتوبر کو اسلام آباد میں طالبان کے سفیر ملا عبدالسلام ضعیف نے انکشاف کیا کہ ملا محمد عمر خیریت سے ہیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ جس طرح افغان قوم نے روس کے خلاف جہاد میں 20 لاکھ جانوں کی زبانی دی تھی، اسی طرح ہم مزید 20 لاکھ جانیں قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔

10 / اکتوبر کو صبح 8 بجے سے رات 12 بجے تک...... مسلسل 16 گھنٹے......قندھار پر ہولناک بمباری کی گئی۔ قندھار ہوائی اڈے، ملا محمد عمر کی رہائش گاہ اور عرب مجاہدین کے محلے کو نشانہ بنایا گیا۔ دن بھر قندھار دھوئیں کے بادلوں میں چھپا رہا۔ درجنوں شہری اس بہیمانہ کارروائی میں شہید ہو گئے۔ قندھار کے ہسپتال زخمیوں سے بھر گئے۔

11 / اکتوبر کو جلال آباد کے نواحی گاؤں کرَم کو شدید بمباری کر کے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ یہاں کم از کم 200 افراد شہید اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔

چوں کہ بمباری کرتے وقت امریکا کے طیارے طالبان کی توپوں کی پہنچ سے بہت بلند پرواز کرتے تھے اس لیے طالبان انہیں نشانہ نہیں بنا سکتے تھے۔ ان مصائب کے باوجود طالبان کے حوصلے بلند تھے اور ان کو دیکھ کر عوام بھی جذبہ جہاد سے معمور ہو رہے تھے۔ برطانوی اخبار ''گارڈین'' نے اس کیفیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ جنگ اسامہ نے پہلے ہی جیت لی ہے کیونکہ انہوں نے پوری دنیا کو کفر اور ایمان میں تقسیم کر دیا ہے۔

امریکا کا جارج بش، برطانیہ کا ٹونی بلیئر، اٹلی کا برلسونکی، فرانس کا شیراک، روس کا پیوٹن اور پاکستان کا جنرل پرویز مشرف تو پہلے ہی اس جنگ میں اسلام کے قلعے کو ڈھانے کے لیے پیش پیش تھے، مگر جنگ کے دو تین دن گزرنے پر تاجکستان کے صدر علی رحمانوف نے بھی امریکا کو اپنے ہوائی اڈے پیش کر دیے۔ ایران بھی امریکا کی مدد کر رہا تھا۔

افغان عوام کے جوش اور بے خوفی کا یہ عالم تھا کہ وہ بموں کے گرتے ہی ان کے ٹکڑے جمع کرنے کے لیے لپکتے تھے۔ امریکی فوجیوں کے اسلحے اور لباس کے نرخ بھی طے ہو گئے تھے۔ بازاروں میں امریکی فوجی کی ٹوپی 500 ڈالر، پینٹ شرٹ 1200 ڈالر، کمانڈو جیکٹ 1000 ڈالر، جوتے 500 ڈالر اور گھڑی 300 ڈالر میں بکنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ بمباری سے ہزاروں گھرانے تباہ ہو چکے تھے۔ متاثرین کی خاصی تعداد ہجرت کر کے پاکستان کی سرحد کی طرف آ رہی تھی مگر حکومت پاکستان نے سرحد بند کر دی تھی جس کی وجہ سے یہ بے خانماں افراد مزید مشکلات کا شکار ہو گئے تھے۔

پاکستان کا کردار: جنگ کے ان ابتدائی دنوں میں طالبان نے امریکا کو ایک بار پھر پیش کش کی کہ

اسامہ بن لادن پر افغانستان میں مقدمہ چلایا جا سکتا ہے، امریکا حملے بند کر کے مذاکرات کرے مگر امریکا طاقت کے نشے میں اندھا اور بہرا ہو چکا تھا۔ اس کے ردِ عمل میں 12 / اکتوبر کو طالبان سربراہ ملا محمد عمر کا بیان نشر ہوا کہ ہم امریکیوں سے انتقام لیں گے۔ انہوں نے او آئی سی کے بزدلانہ کردار اور 45 سے زائد مسلم ممالک کی اس جنگ میں افغان عوام کے خلاف شرکت پر افسوس کا اظہار بھی کیا۔ سب سے عجیب کردار پاکستان کا تھا جو اس صلیبی جنگ میں امریکا کے فرنٹ لائن اتحادی کا کردار ادا کر رہا تھا۔ امریکی طیارے بحیرۂ عرب میں کھڑے اپنے بحری بیڑے سے پرواز کرتے اور پاکستانی حدود سے گزر کر افغانستان پر بمباری کرتے تھے۔ جنگ کے آغاز ہی میں جیکب آباد کے شہباز ایر بیس پر امریکا کے سینکڑوں کمانڈوز، گن شپ ہیلی کاپٹر، بی باون اور سی 130 طیارے اُتر چکے تھے۔ حکومت پاکستان کئی دنوں تک غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے عوام کو یقین دلاتی رہی کہ ہماری سرزمین افغانستان پر حملوں کے لیے استعمال ہوئی ہے نہ آیندہ ہوگی۔ مگر 12 / اکتوبر کے قومی اخبارات میں جیکب آباد میں 14 سو امریکی کمانڈوز کی آمد اور پسنی میں مزید دستوں کے اُترنے کی اطلاعات شائع ہو ہی گئیں۔

اتحاد کے عہد و پیمان کو مضبوط کرنے کے لیے 16 / اکتوبر کو امریکی وزیر خارجہ کولن پاوَل نے اسلام آباد آکر جنرل پرویز مشرف سے ملاقات کی۔ جنرل پرویز نے امریکی وزیر خارجہ کو یقین دلایا کہ پاکستان امریکا کو حساس معلومات اور لاجسٹک سپورٹ مہیا کرتا رہے گا اور پاکستان کی فضائی حدود امریکی طیاروں کے لیے کھلی رہیں گی۔ پاکستان کی اس وفاداری کے جواب میں امریکی حکومت نے 30 کروڑ ڈالر کا قرضہ فراہم کرنے، اس کے اتحادی جاپان نے اپنا 5 / ارب ڈالر کا قرضہ معاف کرنے اور برطانیہ نے یورپ سے مراعات دلوانے کا امکان ظاہر کیا۔

پاکستانی عوام کا جذبہ: ان دنوں حکومتِ پاکستان اور عوام کے رویے میں کھلا تضاد نظر آتا تھا۔ عوام کی اکثریت افغانستان کے مسلمانوں سے گہری ہمدردی رکھتی تھی۔ انہوں نے مصیبت زدہ افغانوں کی مدد کے لیے دل کھول کر امداد فراہم کی۔ شہروں سے نقد رقم، غذائی اجناس اور دیگر اشیاء کے بڑے بڑے ذخائر افغانستان پہنچ رہے تھے جن سے ان مصیبت زدگان کی کسی قدر اشک شوئی ہو رہی تھی۔ صوبہ سرحد کے عوام اس مہم میں سب سے آگے تھے۔ صرف باجوڑ سے طالبان کے لیے 40 کلو سونا بھیجا گیا۔ عورتوں نے اپنے زیور اُتار کر ایثار و قربان کی یہ عظیم مثال پیش کی تھی۔

سرزمین پاکستان پر امریکی افواج کی موجودگی سے عوام خصوصاً دینی طبقہ اس قدر نالاں تھا کہ بغاوت کی سی فضا پیدا ہونے لگی تھی۔ عوام یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ امریکی دہشت گردی میں ہم کیوں شامل کیے

جا رہے ہیں؟ 14 / اکتوبر کو جمعیت علمائے اسلام کے کارکنوں نے احتجاجاً جیکب آباد ایر بیس کا گھیراؤ کرلیا اور یہ علاقہ میدانِ جنگ بن گیا۔ اس جھڑپ میں جمعیت علمائے اسلام کے چھ کارکن اور چار سرکاری اہلکار جاں بحق ہو گئے۔

کراچی میں لانگ مارچ: 26 / اکتوبر کو کراچی میں افغانستان پر امریکی حملے کے خلاف عظیم الشان مارچ ہوا۔ ڈیڑھ لاکھ افراد نے ایم اے جناح روڈ پر احتجاج کر کے امریکا سے اپنی نفرت اور افغان بھائیوں سے دلی یگانگت کا ثبوت دیا۔ پاکستان کے نامور علماء اور مفتیانِ کرام نے امریکی حملے کو صلیبی جنگ قرار دیا۔ حضرت مفتی رشید احمد لدھیانوی کا یہ فتویٰ 15 / اکتوبر کے ضربِ مومن میں شائع ہوا تھا کہ افغانستان پر صلیبی حملے کا دفاع فرض عین ہو چکا ہے۔ مفتی نظام الدین شامزئی نے بھی امریکا کے خلاف جہاد کا فتویٰ دے دیا تھا اور ہزاروں افراد طالبان کے شانہ بشانہ امریکا کے خلاف لڑنے کے لیے سرحدوں کا رخ کر رہے تھے۔ دس دن تک افغانستان کے طول و عرض پر مسلسل بمباری کے بعد 17 / اکتوبر کو امریکا نے پہلی بار اپنے کمانڈوز زمین پر اُتارنے کی کوشش کی مگر طالبان نے یہ کوشش ناکام بنا دی۔ قندھار کے نواح میں ہیلی کاپٹرز کے ذریعے اُترنے والے کمانڈوز طالبان کے راکٹ لانچروں کی زد میں آکر پسپا ہو گئے۔ اسی دن طالبان سربراہ نے میزائلوں کی بارش کے دوران وائرلیس پر 31 صوبوں کے طالبان سے خطاب کر کے ان کے حوصلے بلند کر دیے۔

ہتھیاروں کی جنگ کے ساتھ ساتھ طالبان کے خلاف زیرزمین سازشیں بھی جاری تھیں۔ درجنوں امریکی ایجنٹ ڈالروں کی بھاری کھیپ کے ساتھ مزار شریف، قندھار اور کابل میں سرگرم ہو چکے تھے اور طالبان کے خلاف فضا ہموار کر کے بغاوت برپا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پختون علاقوں میں طالبان کے خلاف سازش کا سرغنہ ایک سابق مجاہد کمانڈر عبدالحق تھا۔ وہ معروف کمانڈر حاجی عبدالقدیر کا بھائی تھا اور ایک مدت سے پاکستان کے افغان پناہ گزین کیمپوں میں طالبان مخالف جنگجوؤں کو جمع کرنے کا کام کر رہا تھا۔ صدر بش کے برسرِاقتدار آنے کے بعد اس کا رابطہ وائٹ ہاؤس سے ہوا۔ بش انتظامیہ کے اعلیٰ اہلکاروں نے 2001ء کے موسم گرما میں عبدالحق کی ملاقات احمد شاہ مسعود سے کرائی اور طے پایا کہ اگست میں عبدالحق جنوبی افغانستان کے پختون کمانڈروں کو مجتمع کر کے طالبان کے خلاف بڑے پیمانے پر بغاوت کرائے گا اور ادھر شمال سے احمد شاہ مسعود یلغار کر دے گا۔ مگر اس بغاوت کی تیاری میں تاخیر ہوتی چلی گئی اور 11 / ستمبر کے واقعے کے بعد امریکا خود افغانستان پر حملہ آور ہو گیا۔

اس دوران عبدالحق بغاوت کے لیے تیاری مکمل کر چکا تھا، تاہم طالبان کے جاسوس بروقت اس تک

پہنچ گئے۔ عبدالحق اپنے 8 سرکردہ ساتھیوں سمیت گرفتار ہوگیا۔ اسے بچانے کے لیے امریکی ہیلی کاپٹروں نے حملہ کیا مگر طالبان نے انہیں پسپا کردیا۔ مجلس شوریٰ کے علماء کے فتوے کے مطابق 26؍ اکتوبر کو عبدالحق اور اس کے 8 ساتھیوں کو گولیوں سے اُڑا دیا گیا۔ واشنگٹن ٹائمز نے اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ طالبان نے جاسوسی کا مضبوط جال پھیلایا ہوا ہے جس کے باعث کسی بھی اجنبی کا ان میں داخل ہونا بے حد مشکل ہے۔

مہلک اور ممنوع بموں کا استعمال: جنگ کے تیسرے ہفتے میں امریکا نے طالبان اور افغان عوام کے خلاف بین الاقوامی طور پر ممنوع انتہائی مہلک کلسٹر بموں کا استعمال شروع کردیا۔ ایک کلسٹر بم میں 202 تباہ کن بم ہوتے ہیں جو بھیانک تباہی پھیلاتے ہیں۔ ہیومن رائٹس واچ نے کلسٹر بموں کے استعمال پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اس سے افغان شہریوں کو شدید خطرات لاحق ہوچکے ہیں لہٰذا ان کا استعمال بند کیا جائے۔ عالم اسلام میں یہ تشویش بھی پھیل چکی تھی کہ امریکا اب کابل، قندھار اور مزار شریف پر ایٹمی حملہ کردے گا۔ یہ خبریں بھی ملی تھیں کہ امریکا نے نیوٹرون بم وسط ایشیا میں منگوا لیے ہیں۔ امریکی طیارے طالبان کو پہاڑی پناہ گاہوں اور غاروں سے نکالنے کے لیے یورینیم کے ممنوعہ کیمیائی ہتھیار بھی استعمال کررہے تھے۔ ماہرین ماحولیات نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ کیمیائی بمباری سے افغان سرزمین بنجر ہوجائے گی۔ انہی دنوں اسامہ بن لادن نے امریکا کو خبردار کرتے ہوئے کہا کہ کیمیائی یا ایٹمی حملے کا جواب اسی انداز میں دیا جائے گا۔

شاہراہِ ریشم بند: ادھر پاکستان میں سرحد اور ہزارہ کے عوام نے افغانستان کے خلاف پاکستان کی سرزمین کے مسلسل استعمال سے مشتعل ہوکر شاہراہِ ریشم بند کردی تھی۔ وہ چلاس اور تانگیر پر قابض ہوکر مقامی انتظامیہ کو بے دخل کرچکے تھے۔ حکومت پاکستان نے یہ صورتِ حال دیکھ کر وہاں فوج بھیج دی۔ فوج اور قبائل کو ٹکراؤ سے بچانے کے لیے پاکستان کے اکابر علماء بیچ میں آگئے۔ 30؍ اکتوبر کو شاہراہ ریشم کھول دی گئی اور یوں ایک خونریز تصادم ہوتے ہوتے رہ گیا۔

نومبر کے آغاز کے ساتھ افغانستان کے کوہ ودمن میں شمال کی برف خیز ہوائیں بل کھانے لگیں، مگر موسم کی یہ شدت جنگ کی گرمی پر اثر انداز نہ ہوسکی۔ طالبان اب بھی اپنی زمین کے ایک ایک انچ کی حفاظت کررہے تھے۔ امریکا کے ہیلی کاپٹر تباہ ہورہے تھے، کمانڈوز اور جاسوس جگہ جگہ پکڑے جارہے تھے۔ طالبان کے دعوے کے مطابق اب تک 100 امریکی فوجی ہلاک کیے جاچکے تھے۔ چمن سے اسپین بولدک میں داخل ہونے والے ایک امریکی جاسوس میجر مظہر ایوب کو بھی گرفتار کرلیا گیا تھا۔

برطانوی صحافی خاتون ایوان ریڈلی بھی پکڑی گئی تھیں۔

3 نومبر کو طالبان دو ہیلی کاپٹروں کے علاوہ ایک طیارہ گرانے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ ایک ہیلی کاپٹر سے جیکب آباد کے نقشے برآمد ہوئے جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ حملے جیکب آباد سے ہو رہے ہیں۔ امریکی طیارے اب بھی نہایت بلندی سے بمباری کر رہے تھے۔ امریکی وزارتِ دفاع اعتراف کر چکی تھی کہ ہم زمینی جنگ نہیں جیت سکتے البتہ شمالی اتحاد یہ مہم انجام دے سکتا ہے۔ چنانچہ اب امریکا کی حکمت عملی یہ تھی کہ قندھار یا کابل کو فتح کرنے کے بجائے پہلے شمال میں طالبان کے مورچوں کو تہس نہس کیا جائے اور شمالی اتحاد کو آہستہ آہستہ آگے بڑھایا جائے۔ اس طرح مزار شریف اور قندوز سے طالبان کا صفایا کرنے کے بعد کابل اور قندھار کا رُخ کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ اب امریکا نے کلسٹر بموں کے علاوہ آگ کا آتش فشاں بھڑکانے والے نیپام بم اور پہاڑوں کو مٹی بنا دینے والے چھوٹے ایٹم بم (ڈیزی کٹر بم) بھی استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ایسے بم بھی پھینکے جا رہے تھے جو فضا سے آکسیجن ختم کر کے جانداروں کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ قندھار کے طالبان کور کمانڈر ملا اختر عثمانی کے بیان کے مطابق امریکی طیارے ایسے بم استعمال کر رہے تھے جن کے پھٹنے کے بعد مجاہدین کے کان، ناک اور منہ سے خون جاری ہو جاتا تھا اور وہ تڑپ تڑپ کر شہید ہو جاتے تھے۔ غرضیکہ ایٹم بم کے سوا امریکا نے ہر طرح کا ممنوع اسلحہ طالبان کے خلاف جھونک ڈالا۔

اس کے علاوہ امریکی ڈالروں کا سیلاب طالبان کے حامی پختون کمانڈروں کی وفاداریوں کو بہائے لے جا رہا تھا۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے جگہ جگہ بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔ بغلان میں شبیر سالانگی اور شاہراہ سالانگ کے دیگر نقاط پر کئی دوسرے کمانڈروں نے بغاوت کر کے کابل سے مزار شریف کی مرکزی سپلائی لائن مسدود کر دی۔ اس کے ساتھ ساتھ شمال میں طالبان کے سب سے بڑی فوجی مورچے ''تخار'' کا کابل سے زمینی رابطہ دشوار تر ہو گیا۔ قندوز کے طالبان تقریباً محصور ہو گئے کیونکہ ان دونوں چھاؤنیوں کے لیے طالبان کی سپلائی لائن بغلان سے گزرتی تھی۔ غرض اس طرح کابل یا قندھار سے تخار قندوز اور مزار شریف تک کمک پہنچانا ممکن نہ رہا اور شمال میں طالبان محاصرے کی کیفیت میں آنے لگے۔

مریم ریڈلی کی گواہی: طالبان کے خلاف یہ کامیابیاں حاصل کرنے کے لیے امریکی اور اس کے اتحادیوں نے کس کس طرح لوگوں کو خریدا ہوگا اور کس حد تک گھناؤنی اور ناپاک سازشیں کی ہوں گی، شاید ہم اس کا تصور نہ کر سکیں۔ البتہ ایک حد تک اندازہ لگانے کے لیے ہمیں برطانوی خاتون صحافی ایوان ریڈلی کی سرگزشت پڑھنی چاہیے۔

ریڈلی 11 ستمبر کے واقعے کے کچھ دنوں بعد افغانستان کے حالات معلوم کرنے کے لیے ویزے کے بغیر سرحد عبور کر گئی تھیں۔ طالبان نے شک کی بنا پر انہیں گرفتار کرلیا اور چند دنوں تک نہایت عزت واحترام کے ساتھ حراست میں رکھا۔ اس واقعے سے برطانوی حکومت نے ایک مذموم مقصد حاصل کرنا چاہا۔ برطانیہ کے خفیہ اداروں نے کوشش کی کہ طالبان کو ریڈلی کے یہودی جاسوس ہونے کا یقین دلا دیا جائے تاکہ وہ اسے قتل کردیں اور اتحادیوں کو دنیا میں یہ بات پھیلانے کا موقع مل جائے کہ طالبان صحافیوں کو بھی قتل کررہے ہیں۔ چنانچہ طالبان کو ایسے جعلی ثبوت کئی ذرائع سے مہیا کیے گئے جن سے ریڈلی کا یہودی جاسوسہ ہونا ثابت ہوتا تھا۔ مگر طالبان مشتعل ہوئے بغیر ریڈلی سے تفتیش کرتے رہے اور جلد ہی سمجھ گئے کہ ریڈلی بے گناہ ہے۔ اپنی ایمانی فراست کی بدولت انہوں نے یہ بھی محسوس کرلیا کہ انہیں ریڈلی کے قتل پر اکسانے کی سازش ہورہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ریڈلی کو آزاد کردیا اور وہ باعزت طور پر برطانیہ واپس آگئی۔

طالبان کے حسن سلوک نے اسے اسلام اور قرآن مجید کے مطالعے کی طرف راغب کیا اور ایک سال تک حق کی تلاش میں غور وفکر کرنے کے بعد اس نے اسلام قبول کرکے اپنا نام ''مریم'' رکھ لیا۔ اسلام قبول کرنے سے کئی ماہ قبل ریڈلی نے اپنی کتاب ''طالبان کی قید میں'' تحریر کی تھی جس میں ایک طرف طالبان کے حسن سلوک، دلیری اور اصول پسندی کی تعریف کی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ طالبان کو ان کے خلاف جعلی ثبوت فراہم کرنے والے خود برطانوی اور اتحادی اہلکار تھے جو استعماری منصوبوں کی تکمیل کے لیے اپنے معزز اور بے گناہ شہری کو موت کی بھینٹ چڑھانے سے ذرا بھی شرم محسوس نہیں کررہے تھے۔ مریم ریڈلی کی یہ گواہی اس جنگ میں حق وباطل کا واضح فیصلہ کردیتی ہے۔

<u>مزار شریف سے انخلا:</u> 7 نومبر 2001ء تک طالبان مزار شریف پر امریکا اور شمالی اتحاد کے شدید ترین حملوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے، مگر یہاں غداروں کی کمی نہیں تھی۔ مقامی کمانڈروں کے جاسوس طالبان میں گھل مل گئے تھے۔ وہ طالبان کے مورچوں اور خفیہ پناہ گاہوں کا کھوج لگا کر اپنے کمانڈروں کو بتاتے جو سیٹلائٹ فون پر امریکی افسران کو یہ معلومات مہیا کرتے۔ ان درست معلومات کے مطابق 8 نومبر کو امریکا نے مزار شریف کے گرد طالبان کے مورچوں پر 15، 15 ہزار پونڈ کے ڈیزی کٹر بم گرانے شروع کیے جس سے طالبان کا زبردست جانی نقصان ہونے لگا۔

طالبان کو یہ اطلاعات بھی مل چکی تھیں کہ کابل اور مزار شریف کے درمیانی شاہراہیں مقامی کمانڈروں کی بغاوت کے باعث مسدود ہوچکی ہیں۔ خود قندھار کے گرد اسپین بولدک اور دیگر علاقوں میں بغاوت کی

تیاریاں زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ ایسے میں طالبان کا شمال میں ٹھہر کر مزاحمت کرنا بے سود تھا۔ انہوں نے قندھار میں اپنی اعلیٰ قیادت سے وائرلیس پر رابطہ کیا اور ملا محمد عمر کے حکم کے مطابق جمعہ 22 شعبان، 9 نومبر 2001ء کو یکدم مزار شریف خالی کر دیا۔

وہ رات کی تاریکی میں مزار شریف سے نکلے، پسپائی اس تیزی سے ہوئی تھی کہ بہت سے طالبان شہر میں سوتے رہ گئے جن کی اکثریت کا تعلق پاکستان سے تھا۔ شمالی اتحاد کے جنگجو فاتحانہ کروفر کے ساتھ مزار شریف میں داخل ہوئے۔ رشید دوستم اور کمانڈر عطا ان کی قیادت کر رہے تھے۔ وہ پیچھے رہ جانے والے طالبان کو بڑی بے رحمی سے قتل کرنے لگے۔

پاکستانیوں کا قتل عام: شمالی اتحاد کے 6 ہزار مسلح افراد نے مزار شریف میں جگہ جگہ پوزیشنیں سنبھال لیں۔ چار سال بعد شہر کی فضاؤں میں موسیقی کی تانیں گونجتی سنائی دیں۔ پس منظر میں ان زخمیوں کی چیخ و پکار بھی تھی جنہیں شمالی اتحاد کے جنگجو اذیتیں دے دے کر قتل کر رہے تھے۔ پاکستان مردہ باد کے نعرے بھی سنائی دے رہے تھے۔

سلطانہ رضیہ اسکول میں 700 سے زائد پاکستانی مجاہدین نے پناہ لے رکھی تھی۔ شمالی اتحاد کی فاتح فوج نے پہلے امریکی طیاروں کے ذریعے اسکول پر اندھا دھند بمباری کروائی اور اس کے بعد زمینی جنگ میں اپنی دھاک بٹھانے کے لیے اسکول کو گھیر لیا۔ اندر محصور درجنوں افراد شہید ہو چکے تھے، بیسیوں زخمی تھے۔ بھوک پیاس سے سب بے حال تھے۔ ان میں سے سو کے قریب افراد نے جان کی امان کے وعدے پر ہتھیار ڈال دیے اور گرفتاری دینے کے لیے عمارت سے باہر نکلے، مگر شمالی اتحاد کے سورماؤں نے یکدم فائر کھول کر ان کی اکثریت کو شہید کر دیا۔ ان میں سے کچھ اردگرد کے خالی مکانات اور گلیوں کی طرف بھاگ نکلے، مگر حملہ آوروں نے ان کا تعاقب کیا اور چن چن کر مار ڈالا۔ سلطانہ رضیہ اسکول کے اردگرد کی گلیوں اور مکانات سے ریڈ کراس کے عملے کو ایسے 80 پاکستانیوں کی لاشیں ملیں۔ اس صورتِ حال میں باقی محصور پاکستانیوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ شمالی اتحاد کے جنگجو جب ان پر قابو نہ پا سکے تو پیر 12 نومبر کی سہ پہر کو اسکول کے گرد پیٹرول چھڑک کر اسے آگ لگا دی۔

رات بھر اسکول الاؤ بنا رہا۔ اگلے دن جب شمال کے فاتحین اسکول میں داخل ہوئے تو انہیں 400 جلی ہوئی لاشیں ملیں جن پر انہوں نے اپنی فتح کا جشن منایا۔ ان لاشوں کو سڑکوں پر گھسیٹا گیا۔ برہنہ کر کے ان کی تصاویر اُتاری گئیں۔ جب یہ تصاویر میڈیا پر آئیں تو ہر دردمند پاکستانی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

ملا محمد عمر نے مزار شریف کے سقوط کے بعد ریڈیو صدائے شریعت سے قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہا

کہ فتح حق کی ہوگی، اسلامی نظام کے دفاع کے لیے ہم سب کچھ قربان کر دیں گے۔

بامیان سے پسپائی: مزار شریف میں طالبان کی شکست کے اثرات دور دور تک پڑے۔ سمنگان میں طالبان درۂ صوف سے شمالی اتحاد کے حملوں اور امریکی بمباری کی زد میں تھے۔ ان کے قدم بھی اکھڑنے لگے۔ ادھر کابل سے بامیان کی سپلائی لائن کے راستے پر طالبان کے حامی کمانڈر ملا ربانی نے بھی مزار شریف پر شمالی اتحاد کے قبضے کی اطلاع ملتے ہی بغاوت کر دی۔ اس طرح طالبان کی وہ واحد سپلائی لائن جو اب تک محفوظ تھی، ہاتھ سے نکل گئی۔ حزب وحدت کے جنگجوؤں نے یہ خبر سنتے ہی ایرانی اسلحے کے بل بوتے پر بامیان کو زبردست حملوں کا نشانہ بنالیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ طالبان کو بامیان خالی کر کے پسپا ہونا پڑا۔

قندوز شمالی افغانستان کے ان اکا دکا علاقوں میں سے ایک ہے جہاں کے لوگ بلا کے دلیر اور مہمان نواز واقع ہوئے ہیں۔ یہ صوبہ شمالی افغانستان میں طالبان کا سب سے مضبوط مرکز شمار ہوتا تھا۔ یہاں کی آبادی دل وجان سے طالبان کے ساتھ تھی۔ امریکا سے جنگ کے ان ہولناک دنوں میں قندوز میں طالبان کی باقاعدہ فوج بہت کم تھی۔ زیادہ تر طالبان مزار شریف اور تخار میں تھے۔ اس کے باوجود قندوز میں ان کا کنٹرول بہت مضبوط تھا۔ آبادی کی حمایت حاصل ہونے کے علاوہ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان دنوں یہاں القاعدہ سے وابستہ مجاہدین کی بڑی تعداد موجود تھی۔ قندوز کا دفاع عملاً انہی کے ہاتھ میں تھا۔ یہ مجاہدین کئی روز سے قندوز پر حملوں کا بھرپور دفاع کر رہے تھے۔

القاعدہ مجاہدین کا قندوز سے انخلا: اسامہ بن لادن کے ایک قریبی ساتھی ابومصعب نے جو قندوز کی اس جنگ میں شریک تھے، میڈیا پر کئی ماہ بعد یہ حیرت انگیز انکشاف کر کے تہلکہ مچا دیا کہ قندوز کی جنگ کی قیادت خود اسامہ بن لادن کر رہے تھے۔ امریکی افواج انہیں قندھار اور کابل میں تلاش کر رہی تھیں جبکہ وہ قندوز ایر پورٹ پر کھلے آسمان تلے اپنا کوارٹر بنا کر "محمد داد اللہ" کے فرضی نام سے مجاہدین کی کمان کر رہے تھے اور وائرلیس پر انہیں ہدایات دے رہے تھے۔ (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

کئی دن کی جنگ کے بعد القاعدہ کے ان مجاہدین کے پاس اسلحے کے ذخائر کم پڑنے لگے۔ زخمیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جمعرات 8 نومبر کو جب انہیں اطلاع ملی کہ طالبان سربراہ نے طالبان کو مزار شریف سے انخلا کا حکم دے دیا ہے اور اب طالبان ایک طویل المیعاد گوریلا جنگ شروع کرنے کے لیے جنوب کو مرکز بنا کر وہاں سمٹنے کی حکمت عملی اپنانے لگے ہیں تو قندوز کے القاعدہ مجاہدین نے بھی مقامی طالبان کمانڈروں سے مشورے کے بعد فوری طور پر انخلاء کا فیصلہ کر لیا۔ اب تک شمالی اتحاد نے قندوز کا محاصرہ مکمل نہیں کیا تھا۔ کئی راستے کھلے ہوئے تھے۔ ویسے بھی شمالی اتحاد اور امریکیوں کی توجہ شاہراہوں پر تھی جبکہ القاعدہ کے سپاہی

کابل تک کے کئی خفیہ راستوں سے واقف تھے۔ مشکل یہ تھی کہ خاصے مجاہدین زخمی اور بیمار تھے۔ وہ یہیں مورچہ بند ہوکر لڑنا چاہتے تھے تاکہ سفر کی صعوبت سے محفوظ رہیں۔ ان کی تعداد 600 تھی۔ ان میں سے 210 پاکستانی، 90 ازبک، 13 عرب اور 107 افغان تھے۔ انہیں یقین تھا وہ خاصے دنوں تک دشمن کو اُلجھائے رکھیں گے اور پھر محاصرہ توڑ کر کابل یا قندھار پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ ان 6 سو مجاہدین کو قندوز میں چھوڑ کر القاعدہ کی بقیہ فوج کئی غیر معروف راستوں سے ہوکر قندوز سے کابل کی طرف روانہ ہوگئی۔

ابو مصعب کے دعوے کے مطابق اس قافلے کی سب سے پہلی گاڑی کے پیچھے شیخ اسامہ بن لادن کی گاڑی تھی۔ اس قافلے کے شرکاء کی تعداد 1460 تھی۔ ان میں 400 افغان اور پاکستانی مجاہدین تھے جبکہ اکثریت عربوں اور ازبکوں کی تھی۔ یہ قافلہ تین دن تک مسلسل سفر میں رہا۔ راستے میں اکا دکا جھڑپوں اور بارودی سرنگوں کے پھٹنے کے واقعات میں ان کے 6 افراد شہید ہوئے جبکہ باقی سب بحفاظت قندھار کے نواح میں طالبان کے خفیہ ہیڈکوارٹر تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ القاعدہ فورسز کے بحفاظت انخلاء کا یہ واقعہ نہایت حیرت انگیز ہے کیونکہ ان دنوں امریکی طیاروں نے زمین پر طالبان اور مجاہدین کی نقل و حرکت ناممکن بنا رکھی تھی۔ گائیڈڈ میزائل آناً فاناً گاڑیوں کے قافلوں کو تباہ کردیتے تھے۔ اس لیے اگر یہ واقعہ سچ ہے تو اسے ایک کرامت ہی کہا جاسکتا ہے۔

<u>طالقان سے ازبک مجاہدوں کا انخلا:</u> تخار اور طالقان میں بھی طالبان کے حفاظتی حصار ایک ایک کرکے ٹوٹتے جارہے تھے۔ دشمن کا دباؤ دن بدن بڑھ رہا تھا۔ یہاں طالبان کے ساتھ IMU (اسلامک موومنٹ آف ازبکستان) کے کئی ہزار نہایت لڑاکا جانباز بھی تھے۔ اگر طالبان فتح کی طرف گامزن ہوتے تو فرخار، پنج شیر اور بدخشاں کے ساتھ ساتھ ازبکستان کے سرحدی علاقے بھی ان کی زد میں آتے اور ازبک مجاہدین طالبان کی مدد سے سرحد عبور کرکے تاجکستان اور ازبکستان کے ایک بڑے رقبے پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے، مگر اب حالات خلافِ تصور حد تک بگڑ گئے تھے۔ طالبان گھیرے میں آتے جارہے تھے۔ خطرہ یہ تھا کہ شمالی اتحاد فتح پانے کے بعد ازبک مجاہدین کے ساتھ سب سے زیادہ سخت سلوک کرے گا کیوں کہ شمالی اتحاد کے کمانڈر ازبک مجاہدین سے سخت متنفر تھے اور موقع ملنے پر ان سے ہولناک انتقام لینے کے لیے تلے بیٹھے تھے۔ اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے طالبان سربراہ ملا محمد عمر نے ان ازبک مجاہدین کو فوری انخلا کا حکم دے دیا جس کے بعد یہ مجاہدین تاول درہ کے راستے طالقان سے ازبکستان کی طرف روانہ ہوگئے۔ طالبان انہیں آخر تک خصوصی کور فراہم کرتے رہے۔ ان کی بحفاظت پسپائی کے بعد باقی طالبان بھی طالقان سے قندوز کی طرف روانگی کی تیاری کرنے لگے کیونکہ ان کے سب

سے بڑے مورچے "درہ بنگی" سے تشویش ناک خبریں آرہی تھیں اور مزار شریف بھی ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

مزار شریف اور تخار کے طالبان بھی قندوز میں: مزار شریف سے پسپا ہونے والے طالبان کی تعداد 2600 تھی۔ ان میں سے 186 افراد راستے میں امریکی بمباری کی زد میں آکر شہید ہوگئے، جبکہ بقیہ 2240 بحفاظت قریبی صوبے قندوز پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ ان میں 713 پاکستانی، عرب اور ازبک مجاہدین تھے۔ باقی افغان طالبان تھے۔ مئی 1997ء کے سانحہ مزار شریف کے بعد بھی قندوز مفرور طالبان کی پناہ گاہ بنا تھا۔ اب طالبان ایک بار پھر اسے مورچہ بنانے پر مجبور تھے مگر اب حالات پہلے کی نسبت زیادہ سنگین تھے۔

ادھر قندوز کے مشرق میں تخار کے اہم ترین مورچے درۂ بنگی میں بھی طالبان امریکی طیاروں کی اندھا دھند بمباری اور شمالی اتحاد کے شدید حملوں کا سامنا کررہے تھے اور اب ان کی مزاحمت کا دم ٹوٹ رہا تھا۔ ہفتہ 10 نومبر کو درۂ بنگی پر ڈیزی کٹر بموں کی بارش کے بعد طالبان کے درجنوں افراد شہید اور کئی مورچے تہ وبالا ہوگئے۔ طالبان مجبوراً درۂ بنگی کو خالی کرکے پیچھے ہٹنے لگے۔ شمالی اتحاد کا کمانڈر داؤد خان ان کا تعاقب کرتا رہا۔ یہ پسپائی انہیں قندوز تک لے آئی۔ اس طرح مزار شریف، تخار اور طالقان کے محاذوں پر پھیلے ہوئے تمام طالبان قندوز میں محصور ہونے پر مجبور ہوگئے۔ شمالی اتحاد نے آناً فاناً طالبان کے چھوڑے ہوئے تمام علاقوں کا کنٹرول سنبھال لیا۔ اب قندوز کے مشرق میں طالقان، مغرب میں مزار شریف اور جنوب میں سالانگ شاہراہ پر اس کا قبضہ تھا۔ قندوز میں جمع ہونے والے لگ بھگ پندرہ ہزار طالبان کے لیے جن میں 5 ہزار افراد غیر افغان تھے، راہ فرار مسدود ہوگئی تھی۔ ان میں آخر دم تک لڑنے کی قسمیں کھانے والے وہ بیمار اور مجروح مجاہدین بھی تھے، جو القاعدہ فورسز کے ساتھ انخلاء سے رہ گئے تھے۔ ان میں جذبہ جہاد سے معمور پاکستانی بھی تھے اور ہزاروں میل کا سفر کرکے کفر و ایمان کے معرکوں میں کودنے والے چیچن بھی۔ طالبان کے نائب وزیر دفاع کمانڈر ملا فضل اب ان سب کی قیادت کررہے تھے۔

شمالی اتحاد کابل کی دہلیز پر: مزار شریف اور تخار پر قبضے اور شمال کے طالبان کو ملک کے دیگر حصوں سے منقطع کرنے کے بعد شمالی اتحاد کا لشکرِ بے اماں دندناتا ہوا کابل کی طرف بڑھنے لگا۔ پیر 12 نومبر 2001ء (25 شعبان 1421ھ) سہ پہر کے وقت اس نے کابل سے 28 میل شمال میں اپنے مورچوں سے کابل کی طرف پیش قدمی شروع کی تو اسے کسی خاص مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ طالبان کے مورچوں پر امریکی طیاروں کی اندھا دھند بمباری نے ان کا راستہ بڑی حد تک صاف کردیا تھا۔ شام تک شمالی اتحاد کا لشکر قرہ باغ پہنچ چکا تھا۔

کابل میں تعینات 8 ہزار طالبان کو جونہی قرہ باغ پر شمالی اتحاد کے قبضے کی خبر ملی، انہوں نے کابل خالی کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ حکم ان کی اعلیٰ قیادت نے دیا تھا جو قندھار یا اس کے آس پاس تھی تاکہ طالبان کی قوت بھی محفوظ رہے اور کابل کے شہری بھی جنگ کے شعلوں سے مامون رہیں۔ وگرنہ طالبان کابل میں مزید کئی ہفتے مزاحمت کر سکتے تھے کیونکہ قندھار تک تمام صوبوں میں ان کی حمایت کا عنصر غالب تھا۔

کابل بھی ہاتھ سے نکل گیا: پیر اور منگل کی درمیان شب طالبان کابل خالی کرتے رہے۔ بجلی کا نظام تباہ ہونے کی وجہ سے شہر مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ فضا میں ایک مہیب سناٹا تھا جسے امریکی گن شپ ہیلی کاپٹروں کی گڑگڑاہٹ توڑ دیتی تھی۔ یہ ہیلی کاپٹر رات بھر نچلی پرواز کر کے طالبان کے متوقع مورچوں پر راکٹ داغتے رہے۔

طالبان کی بڑی تعداد سینکڑوں گاڑیوں پر سوار ہو کر میدان شہر، گردیز، لوگر اور غزنی کی طرف نکل گئی۔ جبکہ عرب مجاہدین کی بڑی تعداد صوبہ ننگرہار کے مرکز جلال آباد اور تورا بورا کے پہاڑوں کی طرف چلی گئی جہاں غاروں میں القاعدہ کا محفوظ کیمپ تھا۔ طالبان نے شہر خالی کرتے وقت توپیں، ٹینک اور بھاری ہتھیار وہیں چھوڑ دیے تھے۔ کابل میں افغان حکومت کا خزانہ جو کئی ٹن سونے پر مشتمل تھا، جوں کا توں رہنے دیا گیا۔ حالانکہ طالبان چاہتے تو اسے آسانی سے ہمراہ لے جا سکتے تھے۔

شمالی اتحاد کے کابل میں مظالم: منگل کی صبح طلوع آفتاب کے ساتھ شمالی اتحاد کے جنگجو کابل کے سامنے پہنچ گئے۔ ان کی قیادت جنرل گل حیدر کر رہا تھا۔ اپنے مغربی سرپرستوں کے کہنے پر وہ کئی گھنٹے وہاں رکا رہا۔ اتنے میں کمانڈر بسم اللہ خان ایک اور فوج کے ساتھ آن پہنچا۔ مغربی صحافی بھی بڑی تعداد میں آ گئے۔ اب دوبارہ پیش قدمی شروع ہوئی۔ انہیں راستے میں کئی جگہ زخمی طالبان اور پاکستانی مجاہد پڑے نظر آئے جو زخموں کی شدت کی وجہ سے فرار نہیں ہو سکے تھے۔ شمالی اتحاد کے فوجی بے دریغ انہیں گولیوں سے چھلنی کرتے چلے گئے۔ کئی زخمیوں کے گہرے زخموں میں سنگینیں بھونک کر انہیں شدید اذیت کے ساتھ قتل کیا گیا۔ ہفت روزہ ٹائم نے طالبان کے ایک مجاہد کی شہادت کی بڑی دردناک تصویر شائع کی جو کابل جانے والی سڑک کے کنارے نہایت شدید زخمی حالت میں ایک کھائی میں چھپا ہوا تھا۔ شمالی اتحاد کے سپاہی جب وہاں سے گزرے تو اسے دیکھ کر طیش سے بھر گئے۔ وہ اسے گھسیٹتے ہوئے سڑک پر لائے اور لاتوں سے اس قدر روندا کہ اس کی شناخت مشکل ہو گئی۔ پھر ایک سپاہی نے اس کے کپڑے اُتار کر اسے برہنہ کر دیا۔ دوسرے نے اس پر گولیوں کی بارش کر دی۔ پھر سب نے اس کی لاش پر خوشی کے نعرے لگائے اور رقص کیا۔

کابل کی سڑکوں پر ایسے واقعات کئی جگہ پیش آئے۔ درجنوں طالبان اسی طرح بے دردی سے شہید کیے گئے۔ اگلے دو تین دنوں تک ان کی مسخ شدہ لاشوں کی تصاویر پاکستان سمیت دنیا بھر کے اخبارات میں شائع ہوتی رہیں۔ زبردستی ڈاڑھیاں مونڈنے اور برقعے اُتارنے کے واقعات بھی پیش آئے۔ ہر شخص یہ دیکھ کر اندازہ لگا سکتا تھا کہ اب افغانستان پر وہ سرکش طاقتیں قابض ہو چکی ہیں جن کے پاس انسانیت نامی کوئی شے نہیں۔

درندگی کا برہنہ رقص: شمالی اتحاد کے کابل پر قبضے کے ساتھ ہی وہ امن وامان رخصت ہو گیا جو طالبان دور میں یہاں نظر آتا تھا۔ لٹیروں اور ڈاکوؤں کی چاندی ہوگئی۔ وہ جگہ جگہ لوٹ مار کرنے لگے۔ کوئی انہیں روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ طالبان کے حامی عام شہریوں کو بڑی تعداد میں قتل کیا جا رہا تھا۔ مزار شریف کی طرح کابل میں بھی شمالی اتحاد کے ہاتھ لگنے والے کئی پاکستانی اور عرب مجاہد ایسے تھے جو بے خبری میں پیچھے رہ گئے تھے۔ وہ رات کو حسبِ معمول سوئے، صبح بیدار ہوئے تو طالبان جا چکے تھے۔ ایسے تین عرب اور تین پاکستانی مجاہد کابل میں علی الصبح سڑک پر گھومتے ہوئے شمالی اتحاد کے نرغے میں آگئے۔ خود کو گولیوں کی زد میں دیکھ انہوں نے پوزیشن سنبھال لی۔ کچھ دیر مقابلہ کرنے کے بعد آخر ان میں ان سے تین شہید ہو گئے۔ تین سخت زخمی حالت میں گرفتار ہو گئے۔ شمالی اتحاد کے ایک ظالم نے خنجر نکال کر ان میں سے ایک کی آنکھوں میں گھونپ دیا اور آنکھیں باہر نکال کر اپنے ابلیسی کارنامے پر قہقہہ لگایا۔ پھر ان تینوں زخمیوں کو گولیوں سے اُڑا دیا گیا۔

شمالی اتحاد کے یہ مظالم دیکھ کر ایک امریکی صحافی یہ تحریر کرنے پر مجبور ہو گیا:

> ''شمالی اتحاد نے صابرہ اور شتیلا کی یاد تازہ کردی جہاں لبنان کے عیسائیوں نے فلسطینی پناہ گزینوں کا قتل عام کیا تھا۔'' (روزنامہ جنگ: 15 نومبر 2001ء)

سقوط کابل کا یہ دلگداز واقعہ منگل 13 نومبر 2001ء (26 شعبان 1421ھ) کی صبح پیش آیا۔ یہ تاریخ افغانستان کا ایک حسرت ناک دن تھا جس میں غیر ملکی طاقتیں مقامی باشندوں کی مدد سے ایک بار پھر افغانستان کے مرکز پر قابض ہو گئیں۔

طالبان کی حکمت عملی: طالبان نے اپنی اکثر افرادی قوت کو کابل سے بحفاظت نکال کر مشرقی اور جنوبی صوبوں میں محفوظ کر لیا تھا۔ طالبان کی اعلیٰ قیادت نے کابل سے اپنی افواج کے انخلاء کے وقت تمام شہروں کو چھوڑ دینے اور حکومتی ذمہ داریوں سے دستبردار ہو کر پہاڑوں اور جنگلوں میں ایک طویل گوریلا جنگ کے لیے خود کو منظم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دراصل اب صوبوں اور شہروں پر قبضے کی بات

ثانوی درجے میں چلی گئی تھی۔ اصل اہمیت اپنی طاقت کو محفوظ رکھنے کی تھی۔ شہروں کا نظم ونسق سنبھالتے ہوئے ایسا ممکن نہیں تھا۔ اگر دیکھا جائے تو اس وقت تک افغانستان کا نصف سے زائد حصہ طالبان کے پاس ہی تھا۔ خصوصاً مشرقی اور جنوبی علاقوں پر ان کی گرفت بے حد مضبوط تھی۔ غزنی، گردیز، جلال آباد، پکتیکا، خوست وغیرہ میں طالبان مزید کئی ماہ تک آسانی سے امریکی حملوں کا مقابلہ کرسکتے تھے کیونکہ یہاں شمالی اتحاد کا کوئی اثرورسوخ نہیں تھا، مگر طالبان نے فوری طور پر تمام شہروں کی حکومت چھوڑ کر امریکا اور اس کے افغان اتحادیوں کو سیاست بازی میں الجھا دیا۔ امریکا نے شمالی اتحاد کو پابند کیا تھا کہ وہ کابل میں اس وقت تک داخل نہیں ہوگا جب تک ایک عبوری حکومت تشکیل نہ دے دی جائے مگر شمالی اتحاد اسے نظرانداز کر کے بڑی ہٹ دھرمی کے ساتھ کابل میں گھس گیا اس طرح امریکا اور شمالی اتحاد کا باہمی اعتماد شروع ہی میں متزلزل ہونے لگا۔

طالبان نے دوسرا کام یہ کیا کہ کابل سے نکل کر وہ کہیں نہ رکے بلکہ زیادہ تر صوبوں کا انتظام پرانے مجاہدین یا اچھی شہرت کے غیر طالبان کمانڈروں کے حوالے کرتے چلے گئے۔ انہوں نے جلال آباد سمیت تین مشرقی صوبوں کے مستقبل کا فیصلہ نامور مجاہد کمانڈر مولانا محمد یونس خالص کے ہاتھ میں دے دیا جنہوں نے طالبان کے حامی اور مخالف طبقات کے درمیان ایک قابلِ قبول شخصیت مولوی معلم کو جلال آباد کا حاکم بنادیا۔

خوست کا انتظام علماء کی ایک مجلس شوریٰ کے تحت مولانا عبدالحلیم شرعی کے حوالے کردیا گیا۔ گردیز اور لوگر کمانڈر عبدالرحمن حقانی کے اور وردگ مقامی شوریٰ کے سپرد کردیے گئے۔ غزنی کمانڈر خیال محمد کے ماتحت کردیا گیا۔

یہ نئے صوبے دار طالبان میں سے نہیں تھے مگر شمالی اتحاد سے ان کی دوستی بھی نہیں تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ یہ کمانڈر اپنے علاقوں کو شمالی اتحاد کے قبضے میں نہیں جانے دیں گے۔ اس طرح طالبان نے افغانستان میں کسی نئے حکومتی سیٹ اپ کے وجود میں آنے تک شمالی اتحاد کی ریشہ دوانیوں سے یکسو ہو کر خود کو منظم کرنے اور ایک نئی طویل گوریلا جنگ کی منصوبہ بندی کرنے کی مہلت حاصل کرلی تھی۔ اب وہ جنوب میں جمع ہو رہے تھے۔ صرف قندھار اور گردونواح کے تین صوبے ارزگان، زابل اور ہلمند اب تک ان کے قبضے میں تھے، مگر عن قریب وہ یہاں کی حکومت بھی دوسروں کے سپرد کر کے خود منظرِ عام سے غائب ہونے والے تھے۔

جلال آباد طالبان کے بعد: طالبان دور میں جلال آباد کے بازار رات گئے تک کھلے رہتے تھے، مگر اب سرِشام یہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ 13 نومبر سے 17 نومبر تک شہر کا کوئی والی وارث نہیں تھا۔ 80 سالہ مولوی محمد یونس خالص اور ان کے نائب مولوی معلم سخت آزمائش میں پڑ گئے تھے۔ 17 نومبر کو

ایک مشہور کمانڈر حضرت علی اپنے گروہ کو لے کر شہر میں گھس گیا اور ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ ادھر جلال آباد کا سابق گورنر حاجی عبدالقدیر بھی اپنے مسلح افراد کے ساتھ جلال آباد میں داخل ہو گیا اور دونوں گروہوں کے درمیان سخت تناؤ کی کیفیت میں حکومت سازی کی گفتگو شروع ہوئی۔

پاکستان سے جلال آباد جانے والے صحافیوں کے مطابق جلال آباد کے عوام سخت خوف و ہراس کی کیفیت میں تھے۔ انہیں طالبان سے کچھ نئی پابندیوں کے سوا کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ برملا طالبان کی تعریف کر رہے تھے مگر موجودہ گروہ بندی سے ان کی زندگیاں داؤ پر لگ رہی تھیں۔ جلال آباد کے گورنر ہاؤس میں نئی حکومت تشکیل دینے کے لیے مشاورت جاری تھی۔ نئی حکومت کو اپنی حمایت کا یقین دلانے والوں میں جلال آباد کے سکھ باشندوں کا وفد بھی شامل تھا۔ ان کے قائد گورلکھ سنگھ نے اپنے بیان میں کہا کہ طالبان خدا پرست اور بھلے لوگ تھے۔ ان کی وجہ سے سکھوں کو کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ چند دنوں بعد حضرت علی اور حاجی عبدالقدیر نے مشترکہ طور پر جلال آباد کا انتظام سنبھال لیا۔

ان دنوں جلال آباد کے قریب واقع تورابوڑا کے پہاڑوں میں عرب مجاہدین کی موجودگی کے باعث اسامہ بن لادن کے وہاں پناہ لینے کا شک ظاہر کیا جا رہا تھا۔ حضرت علی اور حاجی عبدالقدیر نے اپنی پہلی پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ وہ بہت جلد تورابوڑا میں چھپے ہوئے اسامہ بن لادن کے خلاف کارروائی شروع کریں گے۔

تورابوڑا کا محاذ: کوہِ تورابوڑا مشرقی افغانستان سے صوبہ ننگر ہار کے ضلع ''سرخرود'' میں واقع ہے جو جلال آباد سے 56 کلومیٹر دور ہے۔ 1982ء میں حزبِ اسلامی کے کمانڈر زاہد ابراہیمی نے یہاں مورچے بنائے تھے۔ حکمت یار اور مولانا یونس خالص کے مجاہدین یہاں سے روسی افواج پر حملے کیا کرتے تھے۔ پھر عرب مجاہدین نے ان غاروں، سرنگوں اور زمین دوز مورچوں کو اپنا مسکن بنا لیا۔ یہاں تعمیراتی کام حیرت انگیز تھا۔ خفیہ مورچوں، بنکروں اور اسلحے کے ڈپوؤں کے علاوہ یہاں چار مساجد اور آٹھ ہاسٹل (مہمان خانے) بھی تھے۔ یہی نہیں بلکہ سالہا سال تک غذائی خود کفالت کے لیے سبزی کے کھیت بھی تھے اور پولٹری فارم بھی۔ اسپین غر کے پہاڑی چشموں پر لگائے گئے جنریٹر اس کمپلیکس کو بجلی فراہم کرتے تھے۔ اسامہ بن لادن 1996ء میں افغانستان آئے تو اپنے اہل و عیال سمیت پہلے یہیں رہائش پذیر ہوئے۔ اس کے بعد بھی ان کا یہاں آنا جانا رہا۔ اس لیے امریکا اور شمالی اتحاد کو شک تھا کہ اسامہ بن لادن وہیں روپوش ہیں۔ چنانچہ کابل اور جلال آباد پر قبضے کے کچھ دنوں بعد شمالی اتحاد نے امریکی طیاروں کی مدد سے ماہِ رمضان کے آغاز میں تورابوڑا پر حملے شروع کر دیے۔

تقریباً ایک ماہ تک امریکی طیاروں نے یہاں کارپٹ بمباری کی۔ اس وقت یہاں کم از کم تین ہزار عرب، چیچن، پاکستانی اور یورپی مجاہدین مورچہ بند تھے۔ وہ ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے۔ شمالی اتحاد کا ہر زمینی حملہ ناکام ہوتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجاہدین خفیہ راستوں سے آہستہ آہستہ دوسرے علاقوں کی طرف نکلتے رہے۔

مزار شریف اور کابل سے طالبان کی پسپائی کوئی اچھنبے کی بات نہیں تھی بلکہ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ آخر طالبان نے ایک ماہ سے زائد مدت تک اتنی بڑی قوت کا بھرپور مقابلہ کس طرح کیا؟ امریکا نے ساری دنیا کو ان کے خلاف جمع کرلیا تھا۔ 23 ممالک نے اپنے ہزاروں فوجی امریکا کی کمان میں دیے تھے۔ 55 ممالک نے دامے درمے سخنے امریکا کی حمایت کی تھی۔ 76 ممالک امریکی طیاروں کی لینڈنگ اور لاجسٹک سپورٹ فراہم کررہے تھے۔ 89 ممالک نے اپنی فضاؤں کو امریکا کے اختیار میں دے کر امریکی طیاروں کو گزرنے کی اجازت دی تھی۔ کوئی ایک ملک بھی طالبان کے ساتھ نہیں تھا۔ کسی میں اخلاقی حمایت تک کی جرأت نہیں تھی۔ ایسے میں طالبان کا مقابلے کا ارادہ کرلینا ہی بڑی بات تھی چہ جائیکہ انہوں نے چار ہفتوں سے زائد مدت تک امریکیوں کے ناپاک قدم اپنی سرزمین پر نہ لگنے دیے۔

قندوز میں 15 ہزار طالبان محصور: کابل کے سقوط کے بعد عملاً طالبان کی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ اب تک جنہیں یقین تھا کہ امریکا طالبان حکومت کو ختم نہیں کرپائے گا اور دو تین ماہ تک ناکام فضائی حملے کرنے کے بعد ذلیل وخوار ہو کر لوٹ جائے گا وہ محو حیرت تھے کہ یہ کیا ہوگیا؟ طالبان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اپنی اس افرادی قوت کو بچانا تھا جو قندوز میں محصور تھی اور ایک بار پھر سانحہ مزار شریف جیسے حالات کا سامنا کررہی تھی۔ اقوام متحدہ اس عظیم انسانی المیے سے جان بوجھ کر لاتعلق بن رہی تھی۔ طالبان کمانڈر ملا داد اللہ اپنی ہائی کمان کی اجازت ملنے پر اقوام متحدہ سے جان کے تحفظ کی یقین دہانی کی شرط پر ہتھیار ڈالنے کی پیش کش کئی بار کرچکے تھے مگر اقوام متحدہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ جب حکومت پاکستان نے اقوام متحدہ سے محصورین کی مدد کی درخواست کی تو اقوام متحدہ نے صاف کہہ دیا کہ یہ لڑائی شمالی اتحاد اور طالبان کے درمیان ہورہی ہے۔ اس لیے اقوام متحدہ اس میں فریق نہیں بن سکتی۔ اقوام متحدہ کی مسلم دشمنی کا یہ ایک اور بڑا ثبوت تھا۔

17 نومبر کو ماہ رمضان کا آغاز ہوگیا۔ قندوز میں محصور دس ہزار طالبان اور پانچ ہزار کے لگ بھگ غیر ملکی مجاہدین چاروں طرف سے شمالی اتحاد کے حملوں کا مقابلہ کررہے تھے۔ وہ دن کو روزے رکھتے اور رات کو تراویح وتہجد پڑھتے تھے۔ افطار کے وقت شہر میں مکمل تاریکی کا راج ہوتا تھا۔ امریکی طیاروں کی

بمباری کے خوف سے کوئی سحری کی تیاری کے لیے بھی چولہا جلانے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ طالبان کے نائب وزیر دفاع ملا فضل اخوند، سپہ سالار ملا نور اللہ نوری اور نامور کمانڈر ملا داد اللہ کی موجودگی سے مجاہدین کی ہمت برقرار تھی، مگر سب جانتے تھے کہ وہ بہت زیادہ وقت تک نہیں لڑ سکتے اور ان کا یہاں سے بچ نکلنا کوئی معجزہ ہی ہوسکتا ہے۔ طالبان کے قائدین اب دشمن سے مذاکرات کے بارے میں سوچ رہے تھے کیونکہ کابل کے سقوط کے بعد اب زمینی اور فضائی دونوں راستے بند ہو چکے تھے۔

قلعہ جنگی اور کمانڈر شمس الحق ناصری: ادھر مزار شریف کے شمال میں واقع قلعہ جنگی ایک نئی کہانی کا موضوع بننے جارہا تھا۔ یہ قلعہ 1885ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کا رقبہ تقریباً نصف کلومیٹر ہے۔ یہ آس پاس کی ریگستانی زمین سے تقریباً 60 فٹ بلند ایک ٹیلے پر واقع ہے۔ ان دنوں یہاں شمالی اتحاد کے ایک بڑے کمانڈر شمس الحق ناصری کے گھوڑوں کا اصطبل تھا۔

کمانڈر شمس الحق ناصری 11 ستمبر سے پہلے میں امریکیوں کے آلہ کار کے طور پر طالبان حکومت کے خلاف بغاوتیں برپا کرنے کے لیے سرگرم تھا۔ پھر امریکی حملے کے بعد جب شمال کے کمانڈروں میں سے عبدالرشید دوستم کو تین لاکھ ڈالروں کا امریکی انعام ملا تو اس میں سے 50 ہزار ڈالر شمس الحق کے حصے میں آئے۔ اس کی دی ہوئی معلومات سے فائدہ اُٹھا کر امریکی طیارے مزار شریف میں طالبان کے مورچوں کو تباہ کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

اب جبکہ شمال کے بچے کھچے تمام طالبان قندوز میں جمع ہو چکے تھے شمس الحق ناصری کی توجہ بھی قندوز پر مرکوز ہوگئی۔ رشید دوستم نے بھی اس پر زور دیا کہ وہ قندوز کو جلد از جلد طالبان سے آزاد کرائے۔ شمس الحق جانتا تھا کہ مزار شریف کے برعکس قندوز سے طالبان کو نکالنا زیادہ مشکل ہے کیونکہ شمال کا یہ صوبہ مکمل طور پر طالبان کا حامی تھا۔ شمس الحق نے مذاکرات کے ذریعے قندوز پر قبضہ کرنے کے بارے میں غور کیا اور آخر کار ایک مقامی کمانڈر امیر جان کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کمانڈر امیر جان پہلے طالبان کا حامی تھا، مگر اب وہ امریکی ڈالروں کے عوض شمالی اتحاد کی صف میں کھڑا ہو گیا تھا۔ شمس الحق کی ہدایات کے مطابق کمانڈر امیر جان نے قندوز میں طالبان کے قائد ملا فضل سے ملاقات کی اور مذاکرات کی دعوت دی۔ ملا فضل نے وائرلیس کے ذریعے طالبان کی اعلیٰ قیادت سے مذاکرات کی اجازت حاصل کر لی۔ ویسے بھی اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا۔

چند دنوں کے وقفے کے بعد ملا فضل اور جنرل دوستم نے مذاکرات کے لیے باہمی ملاقات کی۔ اس نشست میں کمانڈر عطاء، کمانڈر محقق اور ایک امریکی آفیسر شامل تھے۔ دوستم کی پیش کش تھی کہ اگر

طالبان قندوز سے نکل جائیں تو وہ انہیں غیر مشروط طور پر ہرات تک راہداری کی سہولت مہیا کرے گا جہاں سے ان کے لیے قندھار پہنچنا کوئی مشکل نہیں ہوگا۔ ملا فضل نے اس پیش کش کو پسند کرتے ہوئے اس پر زور دیا کہ غیر ملکی مجاہدین کو بھی طالبان کے ساتھ اس معاہدے میں شامل کیا جائے، مگر دوستم نے دوٹوک لہجے میں کہا: ''غیر ملکی مجاہدین کو ہم امریکا کے حوالے کریں گے۔''

ملا فضل نے اسے ماننے سے انکار کر دیا اور مذاکرات کا عمل رُک گیا۔ تاہم دوستم نے اپنے مشیروں سے الگ بات چیت کرنے کے بعد یکدم اعلان کیا کہ غیر ملکی مجاہدین بھی طالبان کے ساتھ جاسکتے ہیں۔ یوں باہمی معاہدہ طے پا گیا اور انخلا کے لیے تاریخ طے ہوگئی۔ ملا فضل نے واپس آکر طالبان کو یہ خوش خبری سنادی۔ یہ معاہدہ جمعہ 23 نومبر بمطابق 8 رمضان کو ہوا تھا۔

ایک ہزار غیر ملکی مجاہدین کی الگ راہ: دوستم کا پہلے غیر ملکی مجاہدین کو معاہدے میں شامل کرنے سے انکار کرنا اور بعد میں بمشکل اس پر رضا مند ہو جانا بہت سے لوگوں کے لیے شک وشبے کا باعث تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ 23، 24 نومبر کی درمیانی شب ایک ہزار غیر ملکی مجاہدین نے اپنا راستہ الگ کر لیا اور چپکے سے قندوز سے نکل کر کسی انجانی منزل کی طرف چل پڑے۔ ملا فضل انہیں سمجھانے کے لیے ان کے پیچھے دوڑے۔ ان میں سے چار سو افراد تو لوٹ آئے باقی 600 نے اپنا سفر جاری رکھا۔ ان کا رُخ ہرات کی طرف تھا۔ ملا فضل نے کمانڈر امیر جان کو اس صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ مجاہدین بہر حال معاہدے میں شامل ہیں، بس انہوں نے انخلا میں جلدی کی ہے، لہٰذا دوستم کو کہا جائے کہ انہیں ہرات تک راہداری دی جائے اور ان کا راستہ نہ روکا جائے۔ ملا فضل کو ڈر تھا کہ کہیں انجانے میں یہ مجاہدین دوستم یا امریکا کی افواج کے سامنے نہ آجائیں اور جنگ شروع نہ ہو جائے۔

چھ سو مجاہدین سے بدعہدی اور گرفتاری: ملا فضل کے خدشات درست ثابت ہوئے۔ چھ سو مجاہدین کے اس قافلے کو امریکی و برطانوی افواج اور شمالی اتحاد کے جنگجوؤں نے قندوز اور مزار شریف کے درمیان روک لیا۔ انہیں راہداری کی سہولت مہیا کرنے کی بجائے ان پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اسلحہ جمع کرا کے گرفتاری دے دیں۔ مجاہدین بڑی مشکل سے اس پر آمادہ ہوئے مگر ان کی پہلی شرط یہ تھی کہ ان پر امریکی افسران مسلط نہ کیے جائیں۔ دوسری شرط یہ تھی کہ وہ اپنا اسلحہ کمانڈر امیر جان کے پاس ہی جمع کرائیں گے کیونکہ اس نازک صورتِ حال میں وہ امیر جان کے سوا کسی پر اعتماد نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں اُمید تھی کہ وہ سابقہ تعلقات کا لحاظ کر کے انہیں ہرات تک پہنچا دے گا۔ انہیں گھیرنے والے کمانڈروں نے اس کا وعدہ کر لیا، مگر عین وقت پر دوستم کے جنگجوؤں نے وعدے کی خلاف ورزی کی اور خود مجاہدین

سے اسلحہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ وہ ان کی تلاشی لے کر جیبیں تک خالی کر رہے تھے۔
یہ دیکھ کر کئی مجاہد سمجھ گئے کہ ان سے کیا گیا معاہدہ پورا نہیں ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے چپکے چپکے کئی پستول اور دستی بم اپنے پاس چھپا کر رکھ لیے۔ تلاشی کے اس عمل کے دوران رات ہوگئی۔ دشمنوں نے مشورہ کر کے مجاہدین کے اس قافلے کو قلعہ جنگی روانہ کر دیا۔ دوستم کو ڈر تھا کہ اگر انہیں کھلا چھوڑا گیا تو وہ رات کی تاریکی میں مار دھاڑ کرتے ہوئے فرار ہو سکتے ہیں۔ قلعہ جنگی میں مجاہدین کو اس طرح ٹھہرایا گیا کہ عملاً ان میں اور قیدیوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ جنرل دوستم کا کمانڈر نادر علی اور حزب وحدت کا کمانڈر اسد اللہ سرور ان سے اسلحہ جمع کرنے کے لیے وہاں پہنچ گئے۔ مجاہدین پر واضح ہو چکا تھا کہ ان کو راستہ نہیں دیا جائے گا بلکہ اسلحہ چھین کر ان کا قتل عام کیا جائے گا۔

<u>177 مجاہدین صحرا میں جاں بحق:</u> ابھی تلاشی کا آغاز ہوا ہی تھا کہ تلاشی دینے والے ایک مجاہد نے دستی بم سے دشمنوں پر حملہ کر دیا۔ ایک دھماکا ہوا اور قلعے کے مالک شمس الحق کے دو جنگجو اس کی زد میں آ کر مارے گئے۔ جوابی فائرنگ میں مجاہد بھی شہید ہو گیا۔ اب تلاشی کا عمل صبح پر ملتوی کر دیا گیا۔ یہ رات مجاہدین نے قلعے کے تہ خانے میں گزاری۔ اب وہ 600 نہیں 423 تھے۔ ان میں سے 177 مجاہدین کو اب تک قلعے میں نہیں پہنچایا گیا تھا۔ دراصل انہیں صحرا سے قلعے کی طرف لایا جا رہا تھا کہ قلعے میں ہونے والے اس دھماکے کی خبر ہر طرف مشہور ہوگئی، چنانچہ دشمن نے طیش میں آ کر ان 177 مجاہدین کو کنٹینرز میں بند کر کے صحرا میں چھوڑ دیا اور وہ وہیں بھوک پیاس اور دَم کشی کے باعث شہید ہو گئے۔

25 نومبر (9 رمضان) کی صبح قیدیوں کی تلاشی اور تفتیش کا عمل دوبارہ شروع ہوا۔ قیدیوں میں امریکا کا ایک نومسلم نوجوان عبدالحمید (جان واکر) بھی شامل تھا۔ وہ سان فرانسسکو کا رہنے والا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ کر اسے امریکی افسران ''مائک'' اور ''ڈیپ'' کے سامنے گھٹنوں کے بل بٹھا دیا گیا۔ دونوں اس سے سوال جواب کرنے لگے مگر انہیں بالکل اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ کسی امریکی مسلمان سے مخاطب ہیں۔ اس وقت دن کے 11 بج چکے تھے۔ قلعہ جنگی کا نگران جنرل فوزی، ریڈ کراس کے نمائندے سیمن بروکس سے مل کر قیدیوں کے مستقبل کے بارے میں بریفنگ دینے والا تھا کہ اچانک قلعے کے جنوبی حصے سے فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں اور ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔

<u>خونریز معرکے کا آغاز:</u> اس کارروائی کی ابتدا تہ خانے میں موجود عرب مجاہدین نے کی تھی۔ انہوں نے تہ خانے کی نگرانی پر تعینات پہرے داروں کو دستی بم پھینک کر راستے سے ہٹایا تھا اور پھر بھاگتے ہوئے سپاہیوں سے اسلحہ چھین کر قلعے کے جنوبی حصے پر کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ جلد ہی وہ قلعے کے اسلحہ ڈپو پر بھی

قابض ہو گئے۔ اس ہنگامے کی ابتداء میں تفتیشی افسر مائیک، عرب مجاہدین کے ہاتھوں مارا گیا تھا جبکہ جوابی فائرنگ میں عبدالحمید (جان واکر) کی ٹانگ بری طرح زخمی ہو گئی تھی۔ بہر کیف! ایک خونریز معرکے کے بعد مجاہدین نے شمالی اتحاد کے سپاہیوں کو قلعے سے پسپا کر دیا اور ظہر کے وقت وہ قلعے کے مرکزی دروازے تک پہنچ گئے۔ اس صورتِ حال میں امریکی اسپیشل فورسز کے افسران وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنی فوج سے رابطہ کر کے فضائیہ کو طلب کیا اور قلعے کے جنوبی حصے پر شدید بمباری کی تاکید کی، مگر طیاروں کی بمباری سے مجاہدین کو کوئی نقصان نہ پہنچا بلکہ طیارے غلط اہداف کو نشانہ بناتے رہے جس کی زد میں آ کر تین امریکی اور برطانوی کمانڈوز ہلاک اور بیس زخمی ہو گئے۔

آخر طیاروں سے بمباری کا سلسلہ روک کر گن شپ ہیلی کاپٹروں کے ذریعے حملے شروع کیے گئے۔ مجاہدین ہلکے اسلحے کے ذریعے دو دن تک بھرپور مقابلہ کرتے رہے۔ وہ اسلحے کے ڈپو سے زیادہ مدد نہ لے سکے کیونکہ گن شپ ہیلی کاپٹر جلد ہی اسے تباہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ امریکی فورسز کے ساتھ ساتھ شمالی اتحاد کے ٹینک بھی قلعے کی دیواروں پر گولے داغ رہے تھے۔ دو روز تک جاری یہ گولہ باری اتنی شدید تھی کہ قلعے کی اکثر دیواریں ملبے کا ڈھیر بن گئیں۔ بدھ 28 نومبر (12 رمضان) کی صبح تک اکثر مجاہدین شہید ہو چکے تھے جبکہ باقی ماندہ زخمی حالت میں تہ خانے میں چھپ گئے تھے۔

اب امریکی اسپیشل فورسز فاتحانہ انداز میں قلعے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے تہ خانے کے دھانے پر آگ لگا دی۔ دھوئیں اور تپش سے گھبرا کر کئی مجاہدین زخمی حالت میں باہر نکل آئے جن میں عبدالحمید بھی شامل تھا۔ انہیں گرفتار کر لیا گیا، مگر کچھ جانباز اب بھی تہ خانے میں ڈٹے ہوئے تھے۔ امریکی کسی قیمت پر اندر داخل ہونے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ جمعے کے دن انہوں نے تہ خانے میں پانی چھوڑ دیا۔ شمالی افغانستان میں نومبر کی راتیں بہت سرد ہوتی ہیں، اس لیے یخ بستہ پانی مجاہدین کے جسموں کو شل کیے دے رہا تھا مگر وہ رات بھر اسی پانی میں کھڑے رہے اور از خود گرفتاری نہیں دی۔ آخر ہفتہ یکم دسمبر (15 رمضان) کی صبح جب دشمن کے سپاہیوں نے اندر داخل ہو کر انہیں گرفتار کر لیا تو وہ اس قدر نحیف ہو چکے تھے کہ ان میں چلنے پھرنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ مجموعی طور پر قلعہ جنگی کے چھ سو مجاہدین میں سے 240 شہید اور 83 گرفتار ہوئے تھے جبکہ 177 کو قلعے میں پہنچانے کی بجائے راستے ہی میں زندہ درگور کر دیا گیا تھا۔

هزاروں طالبان قیدی بن گئے: اس دوران 26 نومبر (10 رمضان) کو معاہدے کے مطابق قندوز کے بقیہ ساڑھے چودہ ہزار طالبان کا صوبے سے انخلا شروع ہو گیا تھا۔ انہیں قندوز اور مزار شریف کے درمیان صحرا میں جمع کیا جا رہا تھا۔ سامنے دوستم کی فوجیں تھیں اور فضا میں امریکی طیارے مسلسل پرواز

کررہے تھے۔ یہاں طالبان کے لیے کہیں چھپنے یا مورچے بنانے کا موقع بھی نہیں تھا۔ دوستم انہیں یقین دلا رہا تھا کہ انہیں بحفاظت ہرات پہنچا دیا جائے گا، مگر اس کی نیت میں فتور تھا۔ طالبان کمانڈر ملا داداللہ یہ خطرہ محسوس ہوتے ہی معاہدے میں شمولیت سے برأت ظاہر کرتے ہوئے رات کی تاریکی میں چپکے سے ایک طرف نکل گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے علاوہ طالبان کے اور بھی کئی گروپ جن میں سینکڑوں افراد شامل تھے، صحرا میں جمع ہونے سے پہلے اپنے طور پر مختلف راہوں پر نکل گئے تھے۔ ان میں سے کچھ قافلے راستے میں شمالی اتحاد اور حزب وحدت کے ہاتھوں گرفتار ہوگئے۔ کئی امریکی طیاروں اور گائیڈڈ میزائلوں کا نشانہ بن گئے۔ 17 گاڑیوں کا ایک قافلہ تو بالکل قندھار کے قریب پہنچ کر امریکی بمباری کا شکار ہوا۔ اس کے باوجود کئی خوش قسمت قافلے خیریت سے قندھار پہنچ گئے۔ نامور کمانڈر ملا داداللہ بھی ایک ہفتے کے مسلسل سفر کے بعد 4 دسمبر (17 رمضان) کو صحیح سلامت قندھار پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔

صحرا میں رہ جانے والے بقیہ طالبان کے ساتھ وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ دوستم نے بدترین بدعہدی کا ارتکاب کیا۔ اس نے امریکی فوج کے ساتھ مل کر صحرا میں جمع ہونے والے طالبان کا محاصرہ کرلیا اور اسلحہ جمع کرنے کے بعد انہیں قیدی بنا لیا۔ ملا فضل، ملا نوراللہ نوری، ملا شہزادہ اور کئی بڑے طالبان کمانڈر بھی گرفتار شدگان میں شامل تھے۔ میڈیا پر ان قیدیوں کی تعداد آٹھ ہزار بتائی جاتی رہی ہے مگر صحیح تعداد 13 ہزار سے زائد تھی۔ ان میں افغان، پاکستانی، عرب، ازبک، چیچن اور دوسرے ملکوں کے مجاہدین بھی تھے۔

<u>طالبان قیدیوں پر بدترین مظالم</u>: یہ بات شک وشبہے سے بالاتر ہے کہ ان 13 ہزار طالبان قیدیوں نے جان کی امان اور راہداری فراہم کرنے کی یقین دہانی پر ہتھیار ڈالے تھے مگر ان کے ساتھ جو سلوک ہوا، اس کا تصور کر کے ہی روح کانپ اُٹھتی ہے۔ ان پر امریکی افواج اور شمالی اتحاد کے جنگجوؤں نے جو مظالم کیے، ان کا تذکرہ کرنے کے لیے سینکڑوں صفحات درکار ہیں۔ تاہم ان کی ایک ہلکی سی جھلک پیش کی جارہی ہے تاکہ اندازہ کیا جاسکے کہ دنیا سے دہشت گردی کے خاتمے اور قیام امن وامان کے نام پر شروع کی جانے والی اس جنگ کی حقیقت کیا تھی اور اس کے علمبرداروں کے ہاتھ خود انسانیت کے خون سے کس قدر آلودہ ہیں؟

<u>کنٹینروں سے ٹپکتا خون</u>: جن 13 ہزار مجاہدین نے امریکی اور شمالی اتحاد کے افواج کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے، ان میں سے 4400 افراد کو الگ کر کے ہوا بند کنٹینروں میں سوار کر دیا گیا۔ ایسے ایک کنٹینر میں بمشکل ساٹھ ستر افراد کی گنجائش ہوتی ہے، مگر ایک ایک کنٹینر میں دو دو، تین تین سو طالبان کو بری طرح ٹھونس دیا گیا اور چودہ کنٹینروں پر مشتمل یہ قافلہ شبرغان کی طرف روانہ ہوا۔ اگرچہ سخت سردی

کا موسم تھا مگر کنٹینروں میں بند طالبان ہوا کا گزر نہ ہونے کی وجہ سے پسینے میں شرابور ہو گئے۔ پیاس سے ان کی بری حالت ہوگئی۔ دم گھٹنے کی وجہ سے ہر کنٹینر میں کئی کئی طالبان تڑپ تڑپ کر راہی عدم ہو گئے۔ درجنوں افراد سانس بحال نہ رہنے کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے۔ مظلوم قیدی کنٹینروں کی آہنی دیواروں سے سر ٹکرانے لگے اور پاگلوں کی طرح چیخنے چلانے لگے کہ انہیں سانس نہیں آرہا، ہوا کا راستہ دیا جائے۔ فتح کے نشے میں چور ایک امریکی کمانڈر کو قیدیوں کی تکلیف کا علم ہوا تو فائرنگ کر کے کنٹینروں کی دیوار میں سوراخ بنانے کا حکم دیا۔ فائرنگ سے کنٹینروں میں بند درجنوں طالبان شدید زخمی اور کئی جاں بحق ہو گئے۔ راستے میں مقامی لوگوں اور دوسری گاڑیوں کے ڈرائیوروں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کنٹینروں سے طالبان کا خون ٹپک ٹپک کر سڑک پر ایک سرخ لکیر بناتا جارہا ہے۔ جب یہ قافلہ شبرغان پہنچا تو ڈیڑھ سو سے زائد طالبان زخموں اور گھٹن کی وجہ سے اندر ہی دم توڑ چکے تھے۔

صحرا کی قبر: شبرغان پہنچتے ہی امریکی کمانڈر نے حکم دیا کہ ان تمام قیدیوں کو ''دشتِ لیلیٰ'' میں لے جا کر دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ قافلہ ایک بار پھر روانہ ہوا۔ معلوم ہوتا ہے امریکیوں نے پہلے ہی طالبان کے قتل عام اور انہیں دفن کر کے اپنا جرم دنیا کی نظروں سے چھپانے کی تیاری کر رکھی تھی۔ کیونکہ آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد جب یہ ٹرک صحرا میں پہنچے تو وہاں چار چار ایکڑ وسیع اور پانچ پانچ فٹ گہری اجتماعی قبریں پہلے سے تیار تھیں۔ جب قیدیوں کو ٹرکوں سے اُتارا گیا تو ان میں سے بہت سے پہلے ہی شہید ہو چکے تھے۔ اکثر زندہ تھے مگر ان کی حالت نہایت دگرگوں تھی۔ امریکی فوج کا ایک مسلح دستہ آگے بڑھا اور قیدیوں کے ہاتھ پشت پر باندھنے لگا۔ اس کے بعد ان میں سے ہر ایک کے سر پر گولی داغی گئی تا کہ اس کی موت یقینی ہو جائے۔ پھر ان تڑپتے پھڑکتے چار ہزار چار سو جسموں کو فوری طور پر اجتماعی قبروں میں پھینک کر اوپر بھاری مشینری کی مدد سے مٹی ڈال دی گئی۔ یہ وہ سفاکانہ سلوک تھا جس کا دنیا کے کسی قانون اور کسی تہذیب میں جواز نہیں مل سکتا۔ عالمی قوانین کے علاوہ خود امریکی قانون کے تحت بھی یہ سلوک سنگین جنگی جرائم کے زمرے میں آتا ہے۔

مغربی میڈیا کا اعتراف: تین سے ساڑھے چار ہزار تک طالبان قیدیوں کے اس اجتماعی قتل اور صحرا میں تدفین کے اندوہناک واقعے کو خود مغربی صحافیوں نے طشت ازبام کیا ہے۔ آئرلینڈ کے ایک صحافی جیمی ڈوران نے 12 جون 2003ء کو جرمنی کی پارلیمنٹ میں اس جنگی جرم کے ٹھوس ثبوتوں پر مشتمل ایک ویڈیو فلم پیش کی۔ اس فلم میں مزار شریف اور شبرغان کے قریب دریافت ہونے والی دو ایسی اجتماعی قبریں دکھائی گئی ہیں جن میں ہزاروں طالبان دفن کیے گئے تھے۔ پی ایچ آر (فزیشن فار ہیومن

رائٹس) کے مطابق انہیں دسمبر 2001ء میں دفن کیا گیا تھا اور فروری 2002ء میں یہ قبریں دریافت ہوئیں۔ ویڈیو فلم میں قبروں سے انسانی باقیات اُبھرتے واضح دکھائی دے رہی ہیں۔ صحرا میں طالبان کی کھوپڑیاں، پنجر، ہڈیاں، کپڑے، جوتے، تسبیحات اور ٹوپیاں جگہ جگہ بکھری نظر آرہی تھیں۔

دوستم کے مظالم: یہ تو ان شہداء کا ذکر ہے جو امریکیوں کے ظلم کا شکار ہوئے اور جن کی شہادتوں کی گواہی اجتماعی قبروں نے دی اور عالمی میڈیا کے علاوہ اقوام متحدہ نے بھی کسی حد تک سچائی کو تسلیم کیا مگر ان کے علاوہ ہزاروں قیدی ایسے تھے جو دوستم اور دوسرے سنگ دل کمانڈروں کے ہاتھوں قتل ہوئے اور ان کی قبروں کا نام ونشان تک نہ ملا۔ ان قیدیوں پر ڈھائے گئے مظالم سن کر ہی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

ملا عبدالسلام ضعیف نے اپنی آپ بیتی ''گوانتانا موبے کی کہانی'' میں قلعہ جنگی سے زندہ گرفتار کیے جانے والے دو مجاہدوں محمد یوسف تاجکستانی اور مختار یمنی کے بیانات نقل کیے ہیں جن کے مطابق امریکیوں کے ہاتھوں صحرا میں دفن کیے جانے والے ساڑھے چار ہزار طالبان کے علاوہ پانچ سے آٹھ ہزار تک طالبان کو صرف رشید دوستم نے قتل کیا تھا۔ ملا ضعیف ان چشم دید گواہوں کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''دوستم اور ان کے ساتھی طالبان مجاہدین کو گولی نہ مارتے بلکہ برہنہ کر کے میدان میں پھرایا جاتا، پھر ہاتھ پاؤں باندھ کر کنٹینروں میں بند کر دیا جاتا اور تالا لگا کر کنٹینر کے نیچے آگ لگا دی جاتی۔ اس طریقے سے دوستم نے پانچ سے آٹھ ہزار تک طالبان کو جان سے مارا۔ ایک کنٹینر میں 300 طالبان کو ٹھونس ٹھونس کر بند کر دیا جاتا۔'' (گوانتانا موبے کی کہانی، ص: 47،48)

ہفت روزہ ضربِ مؤمن نے 25 جنوری 2002ء کی اشاعت میں مزار شریف کے نواح میں طالبان قیدیوں کی اجتماعی قبروں کی موجودگی کا انکشاف کرتے ہوئے یہ بھی ذکر کیا تھا کہ رشید دوستم بعض طالبان قیدیوں کو ذبح کر کے اور بعض کو زندہ ہی دفن کرتا رہا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہتھیار ڈالنے والے 13 ہزار طالبان میں سے ساڑھے چار ہزار امریکی فوجیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ پانچ ہزار سے زائد افراد دوستم کے مظالم سے شہید ہوئے۔ بقیہ افراد میں سے تین ہزار کے لگ بھگ شبرغان جیل پہنچا دیے گئے۔ اپریل 2002ء میں ان کی تعداد 2770 تھی۔ دراصل ان میں سے بہت سے تشدد کی وجہ سے جاں بحق ہوتے رہتے تھے۔

شبرغان جیل کے قیدیوں کے بیان کے مطابق:

''طالبان قیدیوں پر بدترین تشدد کیا جاتا تھا۔ امریکی فوجی ان کے سر مونڈ کر ان پر تیزاب ڈالتے، قیدی تڑپتے تو امریکی قہقہے لگاتے۔ وہ طالبان کی انگلیاں اور زبانیں کاٹتے تھے، ان کی

ڈاڑھیاں مونڈتے تھے اور انہیں اس قدر تشدد کا نشانہ بنائے کہ وہ بے ہوش ہو جاتے تھے۔ یہ سب کچھ وہ صرف اپنا دل بہلانے یا غصہ نکالنے کے لیے کرتے تھے۔ بعض اوقات وہ قیدیوں کو جیل سے نکال کر لے جاتے تھے اور وہ قیدی پھر کبھی واپس نہیں آتے تھے۔''

س کے بعد چند سو قیدیوں کا حساب رہ جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں ''خطرناک دہشت گرد گروپ'' کی حیثیت دے کر گوانتاناموبے کے ایکسرے کیمپ میں لے جایا گیا تھا۔ ان میں طالبان کے نائب وزیر دفاع ملا فضل، ملا شہزادہ اور دیگر کمانڈر شامل تھے۔ قلعہ جنگی کے بیشتر قیدی بھی اس عقوبت خانے میں پہنچائے گئے۔ پاکستان سے گرفتار کیے گئے طالبان سفیر ملا عبدالسلام ضعیف کو بھی آخر میں یہیں بھیج دیا گیا تھا۔

شہید کا جو خون ہے: یہ ان ہزاروں حوصلہ مند، پُرجوش اور بااصول مسلمانوں کا انجام تھا جو دنیا سے کفر کی بالادستی ختم کرنے اور اسلام کو ایک زندہ و جاوید دستورِ حیات کے طور پر سارے عالم پر غالب کرنے کے لیے اپنے گھر بار چھوڑ کر افغانستان کے کہساروں میں جمع ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے موقف اور مشن کو نہیں چھوڑا، دنیا کی تمام طاغوتی طاقتوں کے مشترکہ دباؤ سے ہراساں نہیں ہوئے۔ اپنا ایمان اور ضمیر فروخت نہیں کیا۔ وہ اللہ کے قانون کے مطابق سخت امتحان کی زد میں آئے اور اپنا سب کچھ قربان کر کے اس میں ثابت قدم رہے۔ قوموں کی بقا ایسے ہی لوگوں کے دم سے ہوتی ہے۔ اسلام کی سربلندی انہی مجاہدوں کے خون سے ہوگی۔

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے شہید کا جو خون ہے وہ قوم کی زکوۃ ہے

طالبانِ امارتِ اسلامی کا سقوط: قندوز کے محصور طالبان کی گرفتاری کے بعد بھی قندھار میں طالبان اپنے مرکز میں ڈٹے رہے۔ امریکی طیارے ماہِ رمضان کے آغاز سے قندھار پر شدید بمباری کر رہے تھے، مگر طالبان نے شہر کا کنٹرول نہیں چھوڑا تھا۔ کئی بار امریکی چھاتہ بردار فوجیوں نے قندھار کے گرد اترنے کی کوشش کی مگر طالبان نے ان کی ہر کوشش ناکام بنادی۔ یہاں امریکا کے پاس شمالی اتحاد نہیں تھا جو زمینی جنگ میں ان کا ساتھ دیتا۔ 25 نومبر (19 رمضان) کو طالبان نے قندھار سے دور بلند میں 24 امریکی چھاتہ بردار ہلاک کر دیے۔ اگلے روز ایسی ہی کارروائی میں 60 چھاتہ بردار مارے گئے۔

اس مزاحمت کے ساتھ ساتھ طالبان اپنی افرادی قوت اور اسلحہ پہاڑوں میں منتقل کرتے رہے۔ لوگ ان حالات سے بے خبر تھے اور جنوبی افغانستان میں طالبان کے قدم جمے دیکھ کر انہیں اُمید ہو چلی تھی کہ امریکی افواج پانچ چھ ماہ کی فضائی مہم جوئی کے بعد ناکام لوٹ جائیں گی اور طالبان قندھار سے

نکل کر دوبارہ کابل تا مزار شریف اپنے علاقے واپس لے لیں گے۔ مگر ملا محمد عمر اور ان کے رفقاء تو امریکا سے ایک طویل جنگ لڑنے کے لیے قندھار کو بھی چھوڑ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ انہوں نے قندھار کے نواحی قصبے شاہ ولی کوٹ میں آباد کرزئی خاندان کے رؤساء کو شہر کا انتظام سپرد کر دیا۔ جمعہ 7 دسمبر کو انہوں نے اس شہر میں آخری بار نماز جمعہ ادا کی اور پھر اسی یخ بستہ رات کو ملا محمد عمر قندھار سے کسی نامعلوم مقام کی طرف کوچ کر گئے۔ یہ رمضان 1421ھ کی 22 ویں شب اور دسمبر 2001ء کی 8 تاریخ تھی۔ صبح تک طالبان قندھار خالی کر چکے تھے۔ افغانستان سے طالبان کی حکومت کا ساڑھے سات سالہ بابرکت دور ختم ہو چکا تھا۔ صبح جب یہ خبر میڈیا پر نشر ہوئی تو مسلمان دھک سے رہ گئے۔ کتنے دل دھڑکنا بھول گئے اور کتنی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے۔

صحرا سے لے کے آئے جو تا منزلِ مراد کر کے ہمیں فلک کے حوالے کہاں گئے

<u>اصل مشن امریکا کی تباہی:</u> طالبان حکومت 3 نومبر 1994ء کو قندھار پر قبضے کے ساتھ وجود میں آئی تھی اور سات سال ایک ماہ چار دن تک قائم رہ کر 7 دسمبر 2001ء کو ختم ہوئی۔ اپنی روپوشی سے قبل جنگ کی ہولناکیوں کے دوران 20 نومبر (4 رمضان) کو ملا محمد عمر نے بی بی سی کی وساطت سے دنیا کو ایک حیرت انگیز پیغام دیا تھا جو آج بھی طالبان تحریک کی روح کو جوان اور ان کے حامیوں کی امیدوں کو روشن رکھے ہوئے ہے، ملا محمد عمر نے کہا تھا:

> ”ہمارا اصل مشن امریکا کی تباہی ہے۔ عنقریب امریکا تباہ ہونے والا ہے۔ بہت بڑا منصوبہ تیار ہے۔ پیش گوئی یاد رکھیں۔ علاقے حکمت عملی کے تحت چھوڑے گئے ہیں۔ دنیا افغانستان میں جلد تبدیلی دیکھے گی۔ وسیع البنیاد حکومت کے نام پر قائم کی جانے والی شر پسندوں کی حکومت میں شمولیت پر موت کو ترجیح دیں گے۔ ہم از سرِ نو منظم ہو رہے ہیں۔“

<u>ملا عبدالسلام ضعیف کی گرفتاری:</u> 2 جنوری 2002ء کو اسلام آباد میں افغان امارت اسلامی کے سفیر ملا عبدالسلام ضعیف کو پاکستانی حکام نے حراست میں لے کر امریکی فورسز کے حوالے کر دیا۔ امریکیوں نے انہیں بے لباس کر کے شدید تشدد کا نشانہ بنایا اور بحیرۂ عرب میں موجود امریکی بحری بیڑے پر لے جا کر قید کر دیا۔ ان سے ملا محمد عمر، اسامہ بن لادن اور طالبان راہنماؤں کے ٹھکانوں کا پتا پوچھا جاتا رہا۔ کچھ دنوں بعد انہیں بگرام ایئرپورٹ پر واقع امریکی عقوبت خانے میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں شدید برف باری کے موسم میں انہیں برہنہ کر کے برف پر لٹا دیا گیا۔ اس کے بعد انہیں پانچ ماہ تک قندھار جیل میں رکھا گیا۔ یہاں بھی بدترین تشدد کا سلسلہ جاری رہا۔ جولائی 2002ء میں انہیں کیوبا کے امریکی عقوبت

خانے گوانتا ناموبے لے جایا گیا جہاں ان سے قبل سینکڑوں طالبان اور القاعدہ مجاہدین کو قید کر کے ناقابل بیان اذیتوں کا نشانہ بنایا جارہا تھا۔

تورا بوڑا کے محاذ کا انجام: تورا بوڑا کے مجاہد قندھار سے طالبان کے انخلاء کے بعد دو ہفتے تک امریکی افواج کا مقابلہ کرتے رہے۔ یہ محاذ دسمبر کے دوسرے عشرے کے اختتام پر سرد پڑا۔ تب تک مجاہدین کی بڑی تعداد پسپا یا شہید ہو چکی تھی۔ ان میں سے کچھ موقع پر زخمی حالت میں گرفتار کر لیے گئے جبکہ درجنوں پاکستانی سرحدوں کے قریب سے پکڑے گئے۔ بہت سے مجاہدین کو پاکستان نے پکڑ کر امریکا کے حوالے کیا۔ اسامہ بن لادن کا پھر بھی کچھ پتا نہ چلا۔

ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کابل سے طالبان کے انخلاء کے وقت ایک ہزار رفقاء کے ہمراہ بالا حصار کے راستے مرکزی شاہراہ پر رات 8 تا صبح 3 بجے تک سفر کرتے ہوئے گردیز چلے گئے تھے۔ اس کے بعد ان کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ تاہم ان کے آڈیو اور وڈیو پیغامات میڈیا پر آتے رہتے ہیں۔

طالبان پر اعتراضات کی حقیقت: افغانستان پر امریکی حملے اور امارتِ اسلامیہ افغانستان کے سقوط نے اسلام مخالف عناصر کے حوصلے بے حد بڑھا دیے۔ اس تناظر میں میڈیا نے طالبان، اسلامی بنیاد پرستی اور مسلمانوں کو مسلسل تنقید کا نشانہ بنایا جس کے نتیجے میں طالبان کے بارے میں اعتراضات اور الزامات کا ایک انبار لگ گیا۔ سچ اور جھوٹ کی تمیز مشکل ہوگئی۔ اکثر الزامات نہایت فرسودہ تھے، مگر لوگوں نے ان الزامات کو بلا سوچے سمجھے قبول کر لیا اور افغانستان پر امریکی قبضے کے لیے طالبان کو موردِ الزام ٹھہرانے لگے۔ ماڈرن طبقے کے نزدیک تو طالبان پہلے بھی اجڈ، گنوار اور بدتہذیب تھے، اب ان کو یہ کہنے کو موقع بھی مل گیا تھا کہ طالبان نے اپنی ضد اور جہالت کا مزہ چکھا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ہمدردی کے لہجے میں طالبان کے ماضی وحال کے نقائص چن چن کر بیان کرتے تھے اور ان کی شکست پر اظہار افسوس کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ طالبان غلطیوں سے مبرا نہ تھے، مگر عام طور پر ان کی جن پالیسیوں اور اقدامات کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے وہ اسلام کے مطابق تھیں، اس تنقید کے پس پردہ مسلمانوں کا نہیں، یہودی میڈیا کا ذہن کام کرتا رہا ہے۔ ہاں جو لوگ افغانستان کے طالبان سے براہِ راست واقف رہے ہیں وہ حقائق کو خوب جانتے ہیں اور میڈیا کی اس اڑتی ہوئی دھول میں بھی طالبان کی وکالت کرتے رہے ہیں، جیسا کہ پاکستان کے نامور صحافیوں عرفان صدیقی، اوریا مقبول جان، جاوید چودھری اور سلیم صافی کے بہت سے کالم اس کی واضح مثال ہیں۔

آیئے ذرا ایسے چند الزامات کا جائزہ لیتے ہیں جو طالبان افغانستان پر عام طور پر عائد کیے جاتے رہے ہیں۔

دہشت گردی کی سرپرستی: امریکا اور مغربی طاقتیں طالبان حکومت پر دہشت گردوں کی سرپرستی کا الزام بھی عائد کرتی رہیں۔ خاص طور پر انہوں نے اسامہ بن لادن پر دہشت گردی کا الزام تھوپنے کے بعد طالبان کو ان کی میزبانی کرنے پر شدید تنقید کا نشانہ بنائے رکھا۔ اس الزام تراشی میں کئی حقائق کو نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ اسامہ بن لادن، طالبان کی آمد سے سترہ سال پہلے سے افغانستان میں سرگرم تھے اور اس وقت خود امریکی حکومت انہیں حق کے لیے لڑنے والا، حریت پسند اور مجاہد کہتی تھی، مگر شکستِ روس کے بعد جب امریکا کے مفادات تبدیل ہو گئے تو یہی لوگ راتوں رات دہشت گرد قرار دیے گئے۔ آخر کیوں؟ کیا صرف اس لیے کہ امریکا دنیا میں کسی آزاد مسلم طاقت کا وجود برداشت نہیں کر سکتا؟ چاہے وہ طاقت صرف ایک چھوٹے گروہ ہی کی کیوں نہ ہو۔

امریکا جن کارروائیوں میں بن لادن کے ملوث ہونے کا الزام عائد کرتا رہا ہے، ان کا کوئی ٹھوس ثبوت کسی عدالت میں پیش نہیں کیا جا سکا۔ طالبان نے امریکا کو کئی بار پیش کش کی کہ وہ اسامہ کے خلاف ان کی عدالت میں ثبوت فراہم کردے تو اسامہ کو شریعت اسلامیہ کے مطابق سزا دی جائے گی مگر امریکا نے اس پیش کش کو قابل اعتنا نہ سمجھا۔ اس کی بجائے اس نے اگست 1998ء میں از خود افغانستان میں موجود بن لادن کے تربیتی کیمپ کو کروز میزائلوں کا نشانہ بنایا۔ اب بنظرِ انصاف دیکھا جائے تو ایسا کر کے امریکا خود دہشت گرد بن گیا۔ اس کے بعد وہ اسامہ بن لادن پر دہشت گردی اور طالبان پر دہشت گردی کی سرپرستی کا الزام کس منہ سے عائد کر سکتا تھا؟

ورلڈ سینٹر پر حملے کے بعد امریکا نے مزید جنونی انداز کا ثبوت دیا۔ حملے کی تحقیق سے پہلے ہی القاعدہ اور طالبان کو موردِ الزام ٹھہرا دیا۔ طالبان سربراہ کی پیش کش کے باوجود مسئلہ مذاکرات سے حل نہ کیا گیا اور اپنے الزام کا ثبوت پیش کیے بغیر افغانستان پر چڑھائی کر دی گئی۔ اب خود ہی غور کر لیا جائے کہ دہشت گرد کون ہے اور اپنے دفاع کے لیے لڑنے والا کون؟

ہر شخص غور کرے کہ اگر کوئی دوسرا ملک اس کے وطن پر یہ کہہ کر حملہ کر دے کہ اس کے اندازے کے مطابق اس کے مطلوب ملزمان یہاں چھپے ہوئے ہیں تو کیا اسے برداشت کیا جا سکتا ہے۔ کیا ایسی صورت میں حملہ آور ملک کے خلاف فوراً اعلان جنگ نہ ہو جائے گا۔ طالبان نے تو پھر بھی خاصی برداشت سے کام لیا۔ 1998ء کے حملے کو وہ چپ چاپ سہہ گئے، امریکا کے خلاف کوئی اعلان جنگ نہیں کیا...... مگر جب ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی کی آڑ میں امریکا نے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ ان پر چڑھائی کر دی جس میں بے قصور عورتیں، بوڑھے اور معصوم بچے بھی شہید ہو رہے تھے تو کیا اس کے بعد طالبان اپنا دفاع کیے بغیر رہ سکتے تھے! اس تناظر میں

امریکا کا اپنی جنگ کو دہشت گردی کے خلاف جنگ کہنا ایک بھیانک مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟

خواتین کے حقوق غصب: طالبان کو خواتین کے حقوق کا غاصب کہا جاتا رہا ہے مگر ایسی کوئی مثال اب تک سامنے نہیں آئی جس میں واقعی کسی عورت نے ان پر حقوق کی پامالی کا الزام لگایا ہو۔ طالبان سے قبل دہشت گرد کمانڈروں نے عورتوں کی عصمت دری کو معمول بنالیا تھا۔ طالبان نے عورت کی عزت و آبرو کا تحفظ یقینی بنایا۔ افغان ماؤں بہنوں کو نہ صرف وہ مقام واپس دلایا جو صدیوں سے اس معاشرے میں ان کی پہچان تھا بلکہ ایسے اقدامات بھی کیے جن کی پہلے کسی کو توفیق نہیں ہوئی تھی۔ افغان قبائل میں عورتوں کی زوخت عام تھی۔ باپ پیسے لے کر لڑکی کسی کو بھی بیچ دیتا کہ وہ نکاح کرلے۔ اس میں لڑکی کی اجازت کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ طالبان نے اس خلافِ انسانیت اور غیر شرعی رسم کو ختم کرادیا۔ نکاح میں عورتوں کی مرضی کو لازمی قرار دیا۔ قبائل آپس کی دشمنی ختم کرنے اور صلح صفائی کا معاملہ طے کرنے کے لیے تحفے کے طور پر عورتوں کا تبادلہ کرتے تھے جیسے پرانے بادشاہ باندیوں کا تبادلہ کرتے تھے۔ طالبان نے اس رواج کا خاتمہ کرڈالا۔ طالبان دور میں عورتوں کے اغوا، آبروریزی یا مجرمانہ حملے کا گراف گر کر صفر پر آگیا۔ ایسی مثال پوری دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔

عورتیں گھروں میں قید: طالبان پر عورتوں کو گھروں میں مقید کرنے اور زبردستی پردے کا پابند کرانے کا الزام بھی حقیقت سے دور ہے۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے 1996ء میں کابل پر قبضے اور اس طرح 1998ء میں مزار شریف وغیرہ کی فتح کے بعد عورتوں کو گھروں میں رہنے کے لیے کہا تھا مگر اس کا مطلب انہیں قید کرنا نہیں بلکہ ان کا تحفظ تھا جو فتح کے ابتدائی دنوں میں جنگی ماحول ہونے کے باعث انہیں سڑکوں پر فراہم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بعد میں عورتیں اپنے قدیم طرز کے مطابق پردہ کر کے ضروریات کے لیے باہر نکلنا شروع ہوئیں تو انہیں کہیں نہیں روکا گیا۔

جہاں تک برقعے یا پردے کا تعلق ہے تو اکثر افغان عورتیں طالبان سے پہلے بھی ٹوپی نما برقع اوڑھتی تھیں اور اب بھی اپنی اس روایت پر عمل پیرا ہیں۔ صرف چند فیصد عورتیں برقعے کے بغیر نکلتی ہیں مگر وہ بھی چادر یا دوپٹہ لیتی ہیں، ایسی عورتیں جو سر کھول کر باہر نکلتی ہوں ایک فی صد سے بھی کم ہیں، معاشرے میں انہیں بہت برا سمجھا جاتا ہے اور اس حالت میں کوئی بھی افغان مرد مشتعل ہو کر انہیں نقصان پہنچا سکتا ہے یا کوئی شیطانی ذہن کا فرد اس سے غلط فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ چنانچہ طالبان نے برائی کا راستہ بند کرنے کے لیے ان بے پردہ عورتوں کو بھی برقعے کی پابندی کی ہدایت کی جسے افغان عوام نے بالکل ناگوار نہیں سمجھا کیونکہ یہ ان کے معاشرے کے ایک انفرادیت پسند گروہ کو قومی دھارے میں شامل

کرنے اور انہیں اپنی اسلامی تہذیب سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش تھی۔

عصری تعلیم کی مخالفت: طالبان کو عصری تعلیم کا مخالف بتایا جا تا رہا ہے جو کہ حقیقت سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔ طالبان نے وقتی طور پر اسکولوں کو اس لیے بند کیا تھا کہ وہاں غیر مفید بلکہ نقصان دہ قسم کے نصابِ تعلیم چل رہے تھے۔ کسی صوبے میں ظاہر شاہ کے دور کا، بادشاہی نظام کے ملازم تیار کرنے والا نصاب تھا۔ کسی میں مجاہد تنظیموں کا عجلت میں تیار کردہ نصاب چل رہا تھا۔ اکثر بڑے شہروں کابل، مزار شریف وغیرہ میں کمیونسٹوں کا نظام تعلیم مروج تھا۔

طالبان نے متبادل نصابِ تعلیم پیش کرنے تک اسکولوں کی سرگرمیاں بند کردیں اور جونہی ملک کے قومی، مذہبی اور تہذیبی نقوش کے ہم آہنگ جدید نصاب مرتب ہوا، انہوں نے فوراً اسکول، کالج وغیرہ کھول کر تعلیمی سرگرمیاں شروع کرادیں۔ اس میں اگر ان کی جانب سے کوئی کمزوری نظر آتی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ عصری تعلیم کے مخالف تھے بلکہ اس کی وجہ صرف اور صرف وسائل کی کمی تھی۔ الزام تراشی کرنے والی طاقتیں تعلیمی سلسلے میں امداد اس شرط پر دیتی تھیں کہ نصابِ تعلیم کے بارے میں ان کی سفارشات مان جائیں جبکہ طالبان ان کی امداد کے عوض نسلِ نو کا مستقبل برباد کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ ان رکاوٹوں کے باوجود طالبان نے اکثر اسکولوں اور کالجوں کو فعال کردیا۔ کابل اور قندھار کی یونیورسٹی آف میڈیکل سائنسز بھی بھرپور انداز میں کام کرنے لگی۔

لڑکیوں کی تعلیم سے محرومی؟ لڑکیوں کو عصری تعلیم سے محروم رکھنے کا الزام بھی اسی طرح بے بنیاد ہے۔ طالبان لڑکیوں کی تعلیم کے نہیں، مخلوط نظامِ تعلیم کے مخالف تھے۔ انہوں نے اپنے محدود وسائل کے مطابق لڑکیوں کے چند الگ اسکول شروع بھی کردیے تھے۔ اگر وسائل ہوتے تو یہ سلسلہ پورے ملک میں پھیل سکتا تھا مگر تنگ دستی ان کے کئی منصوبوں کی طرح اس منصوبے کے راستے میں رکاوٹ بنی رہی۔ تاہم کئی تعلیمی اداروں میں لڑکیاں پردے میں جوق در جوق پڑھنے جارہی تھیں۔ میڈیکل یونیورسٹیوں میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ تھی۔

طالبان لڑکیوں کو قومی دھارے سے الگ کرنے یا عضو معطل بنانے کے قائل نہیں تھے مگر وہ انہیں شوپیس بنانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے عورتوں کو اشتہارات اور سینما میں کام کرنے کی اجازت نہیں دی مگر ان کے دور میں وزارتِ صحت، وزارتِ داخلہ، وزارتِ تعلیم اور وزارتِ سماجی بہبود میں افغان عورتیں بھرپور انداز میں کام کررہی تھیں۔

تہذیب اور آرٹ کے دشمن: طالبان حکومت کو ہر تہذیب، آرٹ اور ثقافت کا دشمن کہا جاتا ہے مگر یہ

حقیقت خود الزام تراشی کرنے والا مغربی طبقۂ فکر بھی جانتا ہے کہ طالبان پرائی تہذیب کے مخالف تھے نہ کہ اس تہذیب وثقافت کے جو افغان مسلمانوں کی اصل متاع تھی۔ ہر ملک اپنے رسم ورواج، تہذیب تمدن اور ثقافت کی حفاظت کرنا چاہتا ہے اور اس پر بجٹ کا اچھا خاصا حصہ صرف کرتا ہے۔ کیونکہ وطن اور مملکت کی وحدت اور شکل وصورت اسی سے پہچانی جاتی ہے۔ طالبان اپنے وطن کو دنیا بھر میں ممتاز کرنے کے لیے اس کی صدیوں پرانی اسلام سے ہم آہنگ ثقافت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ ان کا ڈاڑھی، پگڑی اور برقعے وغیرہ کو رواج دینا اور اسلامی شعائر کو عام کرنا اس مصلحت کے تحت تھا۔ اگر سکھ اپنی ڈاڑھی اور پگڑی پر اصرار کرسکتے ہیں، انگریز کوٹ پینٹ کی جکڑ بندیوں کے عاشق ہیں تو افغانستان کا حکمران اپنے عوام کی اسلامی وضع قطع کو برقرار رکھنے کی اجازت کیوں نہیں پاسکتا؟

بامیان کے بتوں کی تباہی: طالبان کی ''تہذیب وثقافت دشمنی'' میں بامیان کے بتوں کی تباہی کو سب سے بڑے الزام کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ دنیا کو یہ الزام دھرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جب طالبان کو دنیا کی حکومتوں نے تسلیم ہی نہیں کیا تو پھر ان سے یہ توقع کیوں رکھی گئی کہ وہ دنیا والوں کی رسموں اور قیود کا احترام کریں گے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ عالمی برادری اور اقوام متحدہ بامیان کے بتوں کو بچانے کے لیے تو واویلا کرتی رہی، مگر کشمیر، چیچنیا اور فلسطین میں نہتے مسلمانوں کے قتلِ عام پر وہ حرکت میں کیوں نہیں آئی۔ کیا پتھر کے بتوں کی حیثیت زندہ انسانوں سے زیادہ ہے؟

اسلامی ملکوں اور مسلمانوں کو تو خیر ویسے ہی اس بت شکنی پر ناک بھوں چڑھانا زیب نہیں دیتا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضور نبی اکرم ﷺ تک اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے لے کر محمود غزنوی تک بت شکنی کی سنت اس طرح زندہ وتابندہ ہے کہ ہر مسلمان کو اس عمل کے دہرانے کا شائق ہونا چاہیے مگر بنظرِ انصاف دیکھا جائے تو بت پرست قوموں کے پاس بھی طالبان پر طعنہ زنی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ بت گوتم بدھ کے تھے جس نے خود کبھی اپنے بت بنوانا پسند نہیں کیے۔ اگر گوتم بدھ زندہ ہوتا تو وہ بھی طالبان کی پیٹھ ٹھونکتا نہ کہ انہیں برا بھلا کہتا۔

پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ یہ بت دو ہزار سال پہلے افغانوں ہی نے تراشے تھے، اب خود انہوں نے ہی توڑ دیے۔ اگر یہ بت جاپانیوں، امریکیوں اور جرمنوں نے بنائے ہوتے تو خیر سوچا جاسکتا تھا کہ دوسروں کی چیز توڑی جارہی ہے۔ یہ تو اپنی چیز کو خود توڑ ڈالا گیا ہے...... لہٰذا کسی کو اعتراض کا کیا حق ہے۔

یہاں یہ غلط فہمی دور کرلینی چاہیے کہ طالبان وہ پہلا گروہ ہیں جنہوں نے بامیان کے بتوں کو توڑنے کی کوشش کی۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان سے قبل کئی مسلم حکمران بت شکنی کی یہ سعادت حاصل

کرنے کی کوشش کر چکے تھے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اگر سلطان محمود غزنوی، سلطان غوری یا کئی دیگر سلاطین نے بامیان کے بتوں کو توڑنے کی کوشش نہیں کی تو وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بتوں کا احترام کرتے تھے۔ سبب یہ تھا کہ وہ یعقوب بن لیث صفاری اور دوسرے مہم آزماؤں کو اس کوشش میں ناکام دیکھ چکنے کے بعد یہ سمجھ چکے تھے کہ مروّجہ اوزاروں اور ہتھیاروں (تلوار، کلہاڑی، کدال) وغیرہ سے ان کو توڑنا ممکن نہیں۔ اس لیے چوتھی صدی ہجری سے گیارہویں صدی ہجری تک یہ سلسلہ رکا رہا۔

پھر جب گولہ بارود کا زمانہ آیا تو عالمگیر اور امیر عبدالرحمن جیسے مسلم حکمرانوں نے ایک بار پھر ایسی کوششیں شروع کیں جن کی تکمیل طالبان نے کر دی۔

11 ستمبر اور اسامہ بن لادن کی حفاظت: عام طور پر یہ کہا اور سمجھا جاتا ہے کہ اگر طالبان اسامہ کو تحفظ نہ دیتے اور 11 ستمبر کا واقعہ پیش نہ آتا تو طالبان حکومت برقرار رہتی اور امریکا کو افغانستان پر چڑھائی کا موقع نہ ملتا۔ مگر غور کیا جائے تو یہ خیال سطحی نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ امریکا اس سے قبل اگست 1998ء میں بھی افغانستان پر حملہ کر چکا تھا اور اس کے بعد بھی زیادہ بڑے اور موثر حملے کی تیاری کر رہا تھا۔

اس سلسلے میں امریکی جوائنٹ آف چیف اسٹاف جنرل ہنری شیلٹن کا وہ انٹرویو قابل ذکر ہے جو دسمبر 2000ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس میں جنرل موصوف نے انکشاف کیا تھا کہ امریکا بہت جلد افغانستان پر جوابی حملہ کر سکتا ہے۔ اس سے قبل فروری 2000ء میں امریکا کی جانب سے طالبان کو وارننگ دے دی گئی تھی کہ وہ اسامہ کو اس کے حوالے کر دیں ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ان سب سے بڑھ کر سابق پاکستانی سیکرٹری خارجہ نیاز اے نائیک کا بیان ہمیں اصل حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔

نیاز اے نائیک کا کہنا ہے کہ جولائی 2001ء کے وسط میں امریکی حکام نے انہیں آگاہ کر دیا تھا کہ بش انتظامیہ طالبان حکومت کے خلاف کارروائی کی تیاری کر رہی ہے۔ نیاز اے نائیک جرمنی کے دارالحکومت برلن میں افغانستان کے حوالے سے منعقد ہونے والے انٹرنیشنل کنٹیکیٹ گروپ کے اجلاس میں شریک تھے۔ اس موقع پر امریکی نمایندوں نے انہیں خبردار کیا کہ اگر طالبان اسامہ بن لادن کو ان کے حوالے نہیں کرتے تو امریکا افغانستان کے خلاف فوجی کارروائی کرے گا اور اسامہ بن لادن اور ملا محمد عمر کو قتل یا گرفتار کرنے کے بعد ظاہر شاہ کی نگرانی میں عبوری حکومت قائم کرے گا۔ (نائیک صاحب اگست 2009ء میں پراسرار طور پر قتل کر دیے گئے۔)

ان دنوں برطانوی اور فرانسیسی ذرائع ابلاغ میں ایسی خفیہ رپورٹیں بھی شائع ہوئی تھیں جن میں پیش گوئی کی گئی تھی کہ امریکا ایسی کارروائی اکتوبر کے وسط میں کرے گا اور برف باری کے موسم سے قبل اپنی

مہم مکمل کرلے گا۔ یہ انکشافات اس لیے کیے گئے تھے کہ اتحادی ممالک اس مہم سے قبل اپنے اقتصادی وسیاسی اہداف طے کرلیں اور بعد میں امریکا سے مزاحم نہ ہوں۔ ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ امریکا بہرحال افغانستان پر حملے کے لیے تیار تھا۔ 11 ستمبر کا حادثہ پیش نہ آتا تب بھی وہ حملہ ضرور کرتا۔ یہ تو ممکن تھا کہ یہ حملہ ذرا دیر سے اور زیادہ بھرپور تیاریوں کے ساتھ ہوتا مگر یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ امریکا طالبان کو پھلتا پھولتا دیکھ کر خاموش بیٹھا رہتا۔ اسلام کی عظمتِ رفتہ کو زندہ کرنے والے یہ مجاہد جو کہ تیل کے راستوں پر بھی قابض تھے، امریکا کو بھلا کہاں برداشت ہوسکتے تھے۔

احکام کی ایک جھلک: آخر میں ہم طالبان امارتِ اسلامی کے چند اہم اعلانات پر ایک نظر ڈالتے ہیں جن سے یہ اندازہ لگانے میں آسانی ہوگی کہ آیا وہ کون سے احکام تھے جن کو مغرب وحشیانہ قرار دے رہا تھا۔ یاد رہے کہ یہ احکام مذہبی پولیس (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) کی طرف سے جاری کیے گئے تھے۔

عورتوں سے متعلق:

- خواتین کے لیے اونچی ایڑی کے جوتے یا چلنے میں آواز پیدا کرنے والے جوتے پہننا ممنوع ہے۔
- عورتیں اپنے گھروں سے نہ نکلیں۔ اگر نکلنا پڑے تو فیشن ایبل لباس، سرخی پاؤڈر اور بے حجابی سے بچیں۔ سرتاپاؤں مکمل برقعے میں ملبوس رہیں۔

ہسپتالوں سے متعلق:

- عورتیں ہمیشہ لیڈی ڈاکٹر سے رجوع کریں۔ اگر مرد ڈاکٹر کے پاس جانا ضروری ہو تو کسی قریبی رشتہ دار مرد کے ساتھ جائیں۔
- مریضہ کے طبی معاینے کے دوران مریضہ اور معالج دونوں شرعی حجاب پہنے ہوں۔
- مرد معالج مریضہ کے متاثرہ حصے کے سوا کسی دوسرے حصے کو نہ دیکھے نہ چھوئے۔
- ہسپتالوں میں بیمار خواتین کی انتظار گاہیں مردوں سے الگ اور باپردہ ہوں۔
- رات کو ہسپتال کے جن کمروں میں مریض عورتیں ہوں وہاں کوئی مرد ڈاکٹر بغیر طلب کیے داخل نہ ہو۔
- خاتون ڈاکٹر سادہ لباس پہنیں۔ فیشنی لباس پہننے، سرخی پوڈر لگانے اور زیب وزینت کی اجازت نہیں۔
- میڈیکل شعبے کی عورتیں ڈرائیور کے ساتھ نشست پر نہ بیٹھیں۔
- لیڈی ڈاکٹر اور نرسیں بیمار مردوں کے کمروں میں داخل نہ ہوں۔
- ہسپتال کا عملہ وقت مقررہ پر مساجد میں نماز ادا کرے گا۔

ڈرائیوروں سے متعلق: کوئی ڈرائیور فیشنی برقعے میں ملبوس کسی عورت کو کار میں نہیں بٹھائے گا۔ ایسی عورتیں کہیں نظر آئیں تو ان کے گھر تلاش کر کے ان کے خاوندوں کو سزا دی جائے گی۔ اگر عورتیں فیشنی لباس پہنے ہوں اور ان کے مرد رشتہ دار ساتھ نہ ہوں تو بھی ڈرائیور انہیں گاڑی میں نہیں بٹھائے گا۔

موسیقی سے متعلق:

- دکانوں، ہوٹلوں، بڑی گاڑیوں، رکشوں میں کیسٹ اور موسیقی منع ہے۔

داڑھی سے متعلق: اگر کسی نے داڑھی مونڈی یا (ایک مشت سے کم) تراشی تو جب تک داڑھی بڑی نہیں ہو جاتی اسے قید رکھا جائے گا۔

دیگر پابندیاں:

- طالبان نے اسلامی شریعت کے مطابق درج ذیل پابندیاں بھی لگائیں۔
- کبوتر بازی اور تاش کھیلنا ممنوع قرار دیا۔ پتنگ بازی کی ممانعت اور پتنگوں کی دکانیں ختم کرنے کے احکام جاری کیے۔ گاڑیوں، دکانوں، ہوٹلوں اور تمام جگہوں سے تصویروں، مجسموں اور پورٹریٹ ختم کرنے کا حکم دیا۔
- جوئے خانے ممنوع قرار دیے گئے۔ جواریوں کے لیے ایک ماہ قید کی سزا مقرر ہوئی۔
- نشہ بازوں اور منشیات فروشوں کو قید کرنے اور سزا دینے اور منشیات فروشوں کی دکانیں بند کرانے کا حکم جاری کیا گیا۔
- فیشنی بال رکھنا ممنوع قرار دیا گیا۔ مذہبی پولیس نے اعلان کیا کہ ایسے لوگوں کو گرفتار کر کے ان کے بال کاٹ دیے جائیں گے اور انہی سے بال کاٹنے کی اجرت لے کر حجام کو دی جائے گی۔
- آبادی کے قریب بہتی ندیوں کے کنارے نوجوان لڑکیوں کو کپڑے دھونے سے منع کر دیا گیا۔ خلاف ورزی کرنے والیوں کو گھر بھیج کر ان کے شوہر (یا سرپرستوں) کو سزا دیے جانے کا اعلان کیا گیا۔
- شادی بیاہ پر ناچ گانے پر پابندی لگا دی گئی۔ خلاف ورزی پر خاندان کے سربراہ کو گرفتار کرنے کا حکم ہوا۔
- درزیوں کے لیے عورتوں کا لباس سینے، ان کا ناپ لینے اور دکانوں میں فیشن کے میگزین رکھنا جرم قرار دے دیا گیا۔
- جادوگروں کو گرفتار کرنے، توبہ نہ کرنے تک قید میں رکھنے اور جادو کی کتب جلا ڈالنے کا حکم جاری ہوا۔

نماز کی پابندی: اعلان کیا گیا کہ نماز کے وقت گاڑیوں کی آمد و رفت بند ہو جائے گی۔ تمام لوگوں کے لیے مساجد میں جانا لازمی ہوگا۔ نوجوانوں کو نمازوں کے وقت دکانوں میں دیکھا گیا تو قید کر دیا جائے گا۔ کھیل کے

دورانِ نماز کا وقت ہو جائے تو کھیل روک دیا جائے گا۔تماشائی تالیوں کی جگہ اللہ اکبر کا نعرہ بلند کریں گے۔

آخری بات: یہ درست ہے کہ یہ احکام دورِ جدید کی مادر پدر آزاد تہذیب سے ہٹ کر ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام پابندیاں قرآن وحدیث سے ماخوذ اور چودہ سو سال قبل کے مدنی معاشرے سے ہم آہنگ ہیں۔ایک اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے اس قسم کی پابندیاں لگانا حکومتِ وقت کی ذمہ داری بنتی ہے۔ان میں سے زیادہ تر پابندیاں اس لیے لگائی جارہی تھیں کہ ان کی خلاف ورزی سے بہت سے فتنے نمودار ہورہے ہیں۔موسیقی سے دل میں جو طربیہ یا حزنیہ جذبات ابھرتے ہیں وہ انسان کو کسی اونچے مقصد کا نہیں رہنے دیتے، وہ یا مست عاشق بننے لگتا ہے یا دل پھینک اور مایوس مجنوں۔وہ ایمانی جذبات جو تلاوت اور ذکر اللہ سے ابھرتے ہیں، موسیقی کے اثر سے کمزور ہو جاتے ہیں اور دل میں کفر ونفاق غیر محسوس طور پر پنپنے لگتا ہے، اسی لیے حدیث میں آتا ہے: گانا بجانا دل میں نفاق کو یوں اگاتا ہے جیسے پانی کھیتی کو (مشکوٰۃ) پس اگر قوم کی ذہنی صلاحیتوں کو زنگ آلودہ ہونے سے بچانے کے لیے موسیقی پر پابندی لگائی جاتی ہے تو اس سے کونسا حق سلب ہوتا ہے، اور اسے وحشیانہ قانون کس معنیٰ میں کہا جارہا ہے؟

یہ بات بھی سب جانتے ہیں کہ عورتوں کا بے پردہ پھرنا، اونچی ایڑی کی جوتی پہننا، فیشنی لباس کا مظاہرہ کرنا اور غیر محرم ڈرائیور کے ساتھ سیٹ پر بیٹھنا مردوں کو تعلقات پر برانگیختہ کرنے کا باعث بنتا ہے۔یہی تعلقات بڑھ کر طرح طرح کے فتنوں کو جنم دیتے ہیں جس سے گھر اور خاندان تباہ ہوتے ہیں۔جوان لڑکیوں کا ندی کے کنارے کپڑے دھونا اکثر اوباش لوگوں کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔عصمت دری کے ان گنت واقعات ایسے ہی مقامات پر پیش آچکے ہیں۔پس ہر وہ حکمران جو قوم کی بیٹیوں کی عفت وعصمت کو اپنی بیٹی کی عزت کی طرح مانتا ہو، وہ ایسی پابندیاں ضرور لگائے گا جو ان کے جوہرِ عصمت کی حفاظت میں معاون ہوں۔

یہ درست ہے کہ عوام مذکورہ شرعی احکام میں سے بہت سی چیزوں کے عادی نہیں تھے اس لیے انہیں طالبان کی حکومت میں کسی قدر دشواری محسوس ہوتی تھی اور شرعی پابندیوں کی اہمیت نہ سمجھنے والے بہت سے لوگ طالبان سے نالاں بھی تھے مگر اس کے باوجود دیکھا جائے تو ان پابندیوں سے کسی کا کوئی ایسا حق سلب نہیں ہوتا تھا جو اللہ کی شریعت نے اسے انسان ہونے کی حیثیت سے عطا کر رکھا ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ آج کل مسلم دنیا میں بھی کسی بھی حکومت یا ادارے کی کارکردگی کو جانچنے کے لیے اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کو معیار بنا لیا گیا ہے حالاں کہ یہ چارٹر بذاتِ خود بوجوہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک سازش ہے۔اگر کوئی اس چارٹر کو معیار مان کر دنیا کی حکومتوں کو جانچے

تو یقیناً اسے کئی جگہ طالبان پر بلکہ دورِ خلافت راشدہ اور دورِ نبوت کے نظام حکومت پر بھی انگلی اٹھانے کے مواقع مل جائیں گے مگر طالبان کے ہاں معیار اقوام متحدہ کا چارٹر نہیں، نہیں، شریعت اسلامیہ تھی۔ طالبان حکومت کا مقصد لوگوں کو وہ ''بنیادی حقوق'' دینا نہیں تھا جو یہودیوں کے ہاتھوں میں کھیلنے والے اس ادارے نے متعارف کرا کے مسلم ممالک میں غیر مسلم اقلیتوں کو آزاد، آزاد خیال مسلمانوں کو بے دین اور اسلام پسند عناصر کو پابند بنانے کی راہیں ہموار کی ہیں۔ بلکہ طالبان حکومت کا منشور خالق کے قانون کے مطابق بندوں کو ایسی راہ پر چلانا تھا جس سے وہ دنیا و عقبیٰ میں فلاح پائیں۔ انہیں خالق کی طرف سے دیے گئے تمام حقوق بھی ملیں اور اس کی رضا مندی بھی۔ دنیا میں بھی وہ اس کی حلال نعمتوں سے متمتع ہوں اور آخرت میں بھی راحت پائیں۔

مآخذ و مراجع

- ...... طالبان جند اللہ۔ فہمی ہویدی
- ...... ہفت روزہ ضرب مؤمن، جلد 4، 5
- ...... ہفت روزہ تکبیر: جلد 2001ء
- ...... ماہنامہ امارت اسلامی افغانستان جلد 1422ء
- ...... قومی اخبارات۔ امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور ہفت روزہ جرائد۔ 2001ء
- ...... روزنامہ اسلام کراچی 2001ء
- ...... طالبان بائیوگرافی۔ باربرا ایلس

چھتیسواں باب

افغانستان، امریکی استعمار کے شکنجے میں

طالبان کے منظر عام سے ہٹتے ہی سابق نام نہاد صدر برہان الدین ربانی نے ایک بار پھر اپنی صدارت کی بحالی کا اعلان کر دیا تھا مگر ان کا یہ دعویٰ نا قابلِ سماعت تھا۔ امریکا افغانستان میں اپنی مرضی کی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا جبکہ افغانستان ایک بار پھر مختلف گروپوں اور گروہوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ مزار شریف دوستم کے پاس تھا۔ پنج شیر سے کابل تک حزبِ وحدت اور شمالی اتحاد کے کمانڈروں کی اجارہ داری تھی جبکہ پختون کمانڈر جوان کا اقتدار قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، مشرقی صوبوں میں غالب تھے۔ یہ سب لڑنے مرنے پر تلے تھے مگر امریکا کا خوف بھی ان پر طاری تھا کیونکہ امریکی افواج بدستور افغانستان میں موجود تھیں اور فی الحال ان کا واپس جانے کا کوئی پروگرام نظر نہیں آرہا تھا گویا اب اصل حکمران امریکا ہی تھا۔ لہٰذا یہ سب کے سب مستقبل کے سیاسی سیٹ اَپ میں زیادہ سے زیادہ حصہ پانے کے لیے وائٹ ہاؤس کی طرف دیکھنے پر مجبور تھے۔ امریکا یہ چاہتا تھا کہ یہاں جلد از جلد اپنی کٹھ پتلی حکومت تشکیل دے جو اس کے مفادات کی تکمیل کے لیے باندی کی طرح کام کرے۔

بون کانفرنس: جس دن قلعہ جنگی کے تہ خانے سے طالبان اور عرب مجاہدین کے باقی ماندہ افراد کو گرفتار کیا گیا تھا اسی دن امریکا افغانستان سے ہزاروں میل دور جرمنی کے شہر بون میں افغان لیڈروں کو ملک کے نئے سیاسی سیٹ اَپ کا فیصلہ سنانے کے لیے جمع کر چکا تھا۔ ان لیڈروں کو امریکا نے بڑی سوچ بچار کے بعد منتخب کیا تھا۔ ان میں سے کچھ کی ضرورت اس لیے تھی کہ وہ جنگجو سردار تھے اور طالبان کے سخت ترین مخالف ہونے کی وجہ سے امریکا کے بہترین مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ کچھ لیڈر ایسے تھے جن کا اثر ورسوخ اب بھی موجود تھا اور ان کے ذریعے لوگوں کی حمایت حاصل کرنا ممکن تھا۔ کچھ سیاست دان امریکا کے پسندیدہ افغان لیڈروں کے حامی ہونے کی وجہ سے بلا لیے گئے تھے۔ مثلاً پروفیسر صبغت اللہ مجددی اور پیر احمد گیلانی کو اس وجہ سے بلوایا گیا تھا کہ وہ ظاہر شاہ کی حمایت کرتے تھے۔

ان کے برعکس جو لیڈر امریکا کے معتوب تھے انہیں افغان سیاست میں اہم کردار رکھنے کے باوجود بون کانفرنس سے دور رکھا گیا۔ مثال کے طور پر مولوی محمد نبی محمدی نہایت عالی قدر سیاست دان اور مجاہد تھے مگر چونکہ وہ امریکا مخالف اور طالبان کے حامی تھے، اس لیے انہیں اس کانفرنس میں نمائندگی نہیں دی گئی۔ اس طرح مولانا محمد یونس خالص اور گلبدین حکمت یار کو بھی امریکا مخالف ذہن رکھنے کی وجہ سے مندوبین کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔

27 نومبر 2001ء کو شروع ہونے والا یہ اجتماع چھ روز تک جاری رہا۔ کانفرنس کے مندوبین میں شامل افغان لیڈروں کے کئی گروپ تھے۔ ان گروپوں میں شمالی اتحاد کا گروپ اور جلاوطن افغان بادشاہ ظاہر شاہ کا گروپ...... جو امریکا کو زیادہ پسند تھا...... سب سے آگے تھا۔

ظاہر شاہ کے گروپ کے تمام افراد تارکِ وطن یا جلاوطن پشتون تھے جو ایک طویل مدت سے ملک سے باہر تھے اور مختلف ممالک میں فارغ البالی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان میں حامد کرزئی کی شخصیت سب سے نمایاں تھی جسے امریکا کی پوری آشیرباد حاصل تھی۔ کانفرنس میں شریک افغان لیڈروں، کمانڈروں اور ان کے نمائندوں کو پہلے ہی اجتماعی یا انفرادی ملاقاتوں اور رابطوں کے ذریعے اس نتیجے کو قبول کرنے پر آمادہ کر لیا گیا تھا۔ چوں ظاہر شاہ گروپ کے لوگوں کا کئی برس سے افغانستان میں کوئی کردار نہیں تھا اس لیے مذاکرات پر شمالی اتحاد چھایا رہا۔ اس کے نمائندوں یونس قانونی اور ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ نے اپنے تناسب سے کہیں بڑھ کر نائب وزیر اعظم کی نشست سمیت 29 میں سے 14 وزارتیں اپنے لیے منظور کروالیں۔ اس سودے بازی کے بدلے انہوں نے حامد کرزئی کو عبوری حکومت کے وزیر اعظم کے طور پر قبول کرنے کی ہامی بھر لی۔

سابق صدر برہان الدین ربانی نے حلف برداری کی تقریب پر نہایت خاموشی سے ملک کا اقتدار نئی حکومت کے حوالے کرنے کی رسم انجام دی۔ حامد کرزئی حلف برداری کے بعد برہان الدین ربانی کے بغل گیر ہوئے۔ مرحوم تمنا رشید دوستم بھی تقریب میں کٹھ پتلی کی طرح موجود تھا جسے امریکا کے تیار کردہ اس نئے سیٹ اپ میں تقریباً معطل رکھا گیا تھا کیونکہ اس کی روس نوازی امریکا کے لیے شک وشبے کا باعث تھی۔ حامد کرزئی کو عبوری حکومت کا وزیر اعظم منتخب کرنے کے ساتھ ہی یہ بھی طے کر لیا گیا کہ جلد از جلد لویہ جرگہ طلب کر کے وسیع البنیاد حکومت قائم کی جائے گی۔ پختون لیڈروں کو عبوری حکومت میں برائے نام نمائندگی ملی تھی تاہم انہوں نے اتفاق کر لیا تھا۔

نئی عبوری حکومت: بون کانفرنس میں طے شدہ فیصلوں کے مطابق 22 دسمبر 2001ء کو حامد کرزئی کی

قیادت میں 30 رکنی افغان عبوری حکومت نے حلف اُٹھا کر چھ ماہ کے لیے ملک کا نظم ونسق سنبھال لیا۔ وزیر داخلہ یونس قانونی اور وزیر خارجہ عبداللہ عبداللہ سمیت گیارہ وزراء تاجک تھے۔ مصطفیٰ کاظمی، سیما ثمر، حاجی محقق اور سلطان حمید نامی 4 وزراء ہزارہ جات سے تھے۔ صرف 5 وزراء پشتون اور تین ازبک تھے۔

حامد کرزئی کون؟ حامد کرزئی قندھار اور اس کے گردونواح میں آباد پختون قبیلے پوپلزئی سے تعلق رکھتے ہیں۔ پوپلزئی ایک بڑا قبیلہ ہے جس میں ساڑھے 5 پانچ لاکھ سے زائد افراد شامل ہیں۔ اس قبیلے کو ماضی میں افغانستان پر حکمرانی کا موقع ملتا رہا تھا۔ حامد کرزئی کی ولادت 24 دسمبر 1957ء کو قندھار کے نواحی گاؤں ''کرز'' میں عبدالاحد کرزئی کے ہاں ہوئی جو ظاہر شاہ کی حکومت میں پارلیمنٹ کے رکن تھے۔ حامد نے قندھار اور کابل کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ 1976ء میں میٹرک کیا۔ کمیونسٹوں کے اقتدار کے بعد جب ظاہر شاہ اور داؤد خان کا قبیلہ عتاب کی زد میں آیا تو حامد کرزئی بھارت چلے گئے۔ وہاں 1979ء سے 1983ء تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ان کا پسندیدہ موضوع ''بین الاقوامی تعلقات'' تھا۔ شملہ یونیورسٹی سے انہوں نے پولیٹیکل سائنس میں پوسٹ گریجویٹ کورس کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے روس سے برسرپیکار پروفیسر صبغت اللہ مجددی کی تنظیم میں محکمہ اطلاعات کے ڈائریکٹر کے طور پر کام کر کے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ تنظیم کے لیے فنڈز بھی اکٹھے کیا کرتے تھے۔ غالباً اسی دور میں ان کے روابط امریکا سے ہوئے۔ 1992ء میں کابل میں مجاہدین کی عبوری حکومت قائم ہوئی تو کرزئی نائب وزیر خارجہ کے منصب پر فائز ہوئے مگر پھر مجاہدین کی خانہ جنگی سے تنگ آ کر 1994ء میں مستعفی ہو گئے۔

1995ء میں طالبان جنوبی افغانستان پر قابض ہوئے تو حامد کرزئی نے شروع میں ان کی حمایت کی مگر وہ طالبان کے پاکستان سے تعلقات اور افغانستان میں غیر ملکی مجاہدین کی موجودگی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ 1996ء میں کابل پر طالبان کے قبضے کے بعد حامد کرزئی اقوام متحدہ سے وابستہ ہو گئے۔ 1999ء میں ان کے والد عبدالاحد کرزئی پاکستان میں قتل کر دیے گئے۔ کرزئی نے اس کا مجرم آئی ایس آئی اور طالبان کو ٹھہرایا۔ تب سے وہ پاکستان اور طالبان کے سخت مخالف بن گئے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ انسان ہیں۔ چھ زبانوں؛ پشتو، فارسی، اُردو، ہندی، انگلش اور فرانسیسی پر عبور رکھتے ہیں۔

نئے حکمران حامد کرزئی کا خطاب: افغان قوم کے نام اپنے پہلے خطاب میں حامد کرزئی نے اعلان کیا کہ ہم ملک کی تعمیر وترقی کے لیے مل جل کر کام کریں گے۔ طالبان اور دہشت گردوں کو جلد ملک سے نکال دیا جائے گا۔ مختلف گروپوں کی حد بندیاں ختم کر کے قومی فوج قائم کی جائے گی اور امن وامان کو

یقینی بنایا جائے گا۔ انہوں نے ساڑھے تین ماہ قبل قتل کیے جانے والے تاجک لیڈر احمد شاہ مسعود کو اپنا بھائی قرار دے کر خراجِ عقیدت پیش کیا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ ملک میں تعلیمی انقلاب لایا جائے گا اور لویہ جرگے میں نیا آئین متعارف کرایا جائے گا۔

تقریب سے ایرانی وزیر خارجہ کمال الدین خرازی نے بھی خطاب کیا اور اس دن کو تمام اسلامی دنیا کے لیے نہایت اہم قرار دیا۔ پاکستانی وزیر خارجہ عبدالستار خاموش تماشائی کی طرح چپ چاپ اس تقریب میں شریک رہے۔ یہ بات ظاہر تھی کہ یہ نیا حکومتی سیٹ اپ کسی طرح بھی پاکستان کے حق میں نہیں تھا۔ پاکستان دوست طالبان کی جگہ اب پاکستان دشمن اور بھارت نواز شمالی اتحاد افغانستان پر مسلط ہو گیا تھا۔ اس کے وزراء خصوصاً وزیر خارجہ عبداللہ عبداللہ جی بھر کے پاکستان کے خلاف زہر اگل رہے تھے۔

پاکستان پر بھارت نواز افغان حکومت کے اثرات: افغانستان میں نئی حکومت کے قیام کا تلخ ذائقہ سب سے پہلے پاکستان ہی کو چکھنا پڑا۔ طالبان نے بھارت کو افغانستان میں سفارت خانے نہیں کھولنے دیے تھے۔ آخری وقت میں بھارت نے طالبان کو اس پیغام کے ساتھ بھرپور عسکری امداد کی پیش کش کی تھی کہ ہم دونوں مل کر اپنے مشترکہ دشمن پاکستان سے لڑیں گے، مگر طالبان نے پاکستان سے زخم کھانے کے باوجود اسلامی اخوت کا پاس کیا تھا۔ ملا محمد عمر نے بھارت کا پیغامِ دوستی ٹھکرا دیا تھا اور امداد کی پیش کش اس کے منہ پر دے ماری تھی۔

مگر اب بھارت کی دلی مرادیں بر آئی تھیں۔ اس کا سفارت خانہ کابل میں کیا کھلا افغانستان میں جگہ جگہ پاکستان کے خلاف دہشت گردی کے تربیتی مراکز قائم ہو گئے۔ پاکستان کی مغربی سرحدیں سات برس بعد پہلی بار بالکل غیر محفوظ ہو گئیں اور افواج پاکستان کی توجہ اور طاقت تقسیم ہو کر مشرقی اور مغربی سرحدوں پر لگ گئی۔ بھارت کے لیے پاکستان کی مشرقی سرحدوں کو روندنے کا یہ بہترین موقع تھا چنانچہ دسمبر 2001ء کے وسط میں...... یعنی طالبان حکومت کے سقوط کے اگلے ہی ہفتے...... مشرقی سرحدوں پر بھارتی افواج کی زبردست نقل و حرکت نے پاکستان میں شدید بے چینی پھیلا دی۔ جنوری 2002ء میں بھارت پوری طرح حملے کے لیے تیار تھا اور پاکستان کی بقا اور سلامتی سخت خطرے میں تھی۔ ایسے میں پاکستان نے افواج مغربی سرحدوں سے ہٹا کر مشرقی سرحدوں پر جمع کرنا شروع کر دیں۔

خاد نئے نام سے فعال: حامد کرزئی کے برسر اقتدار آنے کے بعد آنے والی تبدیلیوں میں سے ایک اہم تبدیلی یہ تھی کہ افغان خفیہ ایجنسی ''خاد'' کو ''ملی امنیتِ دولتی'' کا نام دے کر بحال کر دیا گیا۔ اس طرح طالبان کی حمایت اور امریکا کی مخالفت کے الزام میں شہریوں کی پکڑ دھکڑ اور بے قصور لوگوں پر

مظالم کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دوسری تبدیلی یہ تھی کہ افیون کی کاشت پھر شروع ہو گئی۔ سینکڑوں مربع میل کے علاقوں پر پوست کے کھیت لہلہانے لگے۔ منشیات کے اسمگلروں کی عید ہو گئی۔

سابقہ قومی پرچم بحال: طالبان نے اپنے دور میں افغانستان کا قومی پرچم تبدیل کر کے سفید رنگ کا جھنڈا جس پر کلمہ طیبہ درج تھا، متعارف کرایا تھا۔ حامد کرزئی نے حکومت سنبھالتے ہی طالبان دور کی ایسی تمام یادگاروں کو تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ تین رنگوں والا سابقہ قومی پرچم جو طالبان سے قبل رائج تھا، دوبارہ بحال کر دیا گیا۔ نئی افغان حکومت کے قیام کے ساتھ ہی افغان کرنسی کی قیمت راتوں رات کئی گنا بڑھ گئی کیوں کہ امریکی کی مالی امداد مل جانے سے افغانستان میں زرِ مبادلہ کے نئے ذخائر جمع ہو گئے تھے۔ کرنسی کا لین دین کرنے والے تاجر مالا مال ہو گئے۔

طالبان کے بعد: امریکا افغانستان پر عملاً قبضہ کر چکا تھا اور صدر بش کی عالمگیر جنگ کا ایک بہت بڑا مرحلہ مکمل ہو گیا تھا۔ آگے چلنے سے پہلے ہم اس حقیقت کو ذہن میں تازہ کرتے چلیں کہ امریکا کی اس مہم جوئی کے بنیادی مقاصد چار تھے:

① مستقبل قریب میں مسلم دنیا کو عسکری، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی طور پر اُبھرنے سے روکنا۔ کیونکہ اسلامی نشاۃ ثانیہ کے آثار دن بدن واضح ہوتے جا رہے تھے۔ امریکا اس خطرے کی روک تھام کرنا چاہتا تھا۔

② اسلامی دنیا کے قدرتی وسائل اور معدنی دولت پر قبضہ جمانا۔ کیونکہ اگر مسلم ممالک بیدار ہو کر از خود ان وسائل سے استفادے کی صلاحیت حاصل کر لیتے تو امریکا اور مغربی ممالک منہ دیکھتے رہ جاتے۔

③ القاعدہ اور طالبان سمیت اپنی عالمگیریت کے راستے میں مزاحم ہر عسکری طاقت کو نیست و نابود کرنا۔

④ وسطِ ایشیا سے تیل اور گیس کے ذخائر اپنے ہاں منتقل کرنے کے لیے پائپ لائن منصوبوں کو جلد از جلد شروع کرنا۔

طالبان کے سقوط اور عبوری حکومت کے قیام کے بعد چند دن امریکا اور اس کے اتحادیوں کے لیے بڑے آرام اور اطمینان کے تھے۔ وہ خوابوں کی دنیا میں اگلی منازل کے ستاروں پر کمندیں ڈال رہے تھے تاہم ابھی کچھ خدشات باقی تھے۔ سب سے بڑا خدشہ طالبان اور القاعدہ قیادت سے تھا جن کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ امریکا سب سے پہلے اس طرف سے اطمینان چاہتا تھا۔

طالبان قیادت کی تلاش میں آپریشن: چنانچہ سب سے پہلے ہلمند کے پہاڑوں میں طالبان سربراہ

ملا محمد عمر کی تلاش شروع ہوگئی۔ منگل یکم جنوری 2002ء کو قندھار کے نئے گورنر گل آغا کی قیادت میں آپریشن کا آغاز ہوا۔ امریکی فوج بھی 50 ٹینکوں اور درجنوں طیاروں کے ساتھ اس مہم میں شریک تھی۔ جاسوسوں کی اطلاعات یہ تھیں کہ اسامہ بن لادن اور ملا محمد عمر ''بغران'' کے علاقے میں روپوش ہیں۔ چنانچہ کئی دنوں تک علاقے کا محاصرہ کر کے گھر گھر تلاشی لی گئی۔ مگر ملا محمد عمر عین وقت پر ایک ساتھی کے ہمراہ موٹر سائیکل پر سوار ہو کر دشمنوں کے نرغے سے دور نکل گئے تھے۔ اسامہ بن لادن کا کچھ پتا نہ چلا۔

دینی مدارس کی بندش: کرزئی اور امریکا جانتے تھے کہ طالبان کو دینی مدارس نے جنم دیا تھا اور ان کے مراکز ہوتے ہوئے طالبان کو ختم کرنا ناممکن ہے۔ چنانچہ طالبان کے خلاف آپریشن کا دائرہ کار بڑھانے سے قبل نئی افغان حکومت نے ملک بھر میں ایک ہزار دینی مدارس کو بند کر دیا۔ کچھ اس قسم کی پیش رفت حکومت پاکستان بھی کرنے پر تلی تھی کیونکہ امریکا پاکستان پر مدارس کا کردار محدود کرنے کے لیے مسلسل دباؤ ڈال رہا تھا۔ تاہم پاکستان میں دینی مدارس کے متحدہ پلیٹ فارم سے حکومتی دباؤ کا نہایت پامردی اور حکمت عملی سے مقابلہ کیا گیا اور مدارس کا کردار حسبِ سابق بحال رہا۔

گوانتانا موبے کا عقوبت خانہ: ان دنوں افغانستان سے بہت دور کیوبا کے الگ تھلگ اور ویران جزیرے گوانتانا موبے میں ایک ہیبت ناک عقوبت خانہ تیار کیا جا رہا تھا۔ 45 مربع میل کے اس جزیرے سے کسی قیدی کا فرار ہونا ناممکن تھا۔ یہاں کنکریٹ کے فرش اور آہنی سلاخوں والے سینکڑوں پنجرے بنا لیے گئے تھے جن میں طالبان اور القاعدہ کے خصوصی قیدیوں کو لانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ قید خانے کا احاطہ 4 میل سے زیادہ وسیع تھا۔ اس کے چاروں طرف کانٹے دار تاروں کی دیوار تھی۔ امریکا سے اس جگہ کا فاصلہ 80 میل کے لگ بھگ ہے۔

کیوبا 19 ویں صدی عیسوی سے امریکا کے زیر تسلط ہے۔ کیوبا کے باشندوں کی تحریک آزادی کے نتیجے میں 1901ء میں امریکی فوج کیوبا سے نکل تو گئی تھی مگر معاہدے کے مطابق یہاں بحری اڈہ بنا لیا تھا اور اب 2002ء میں یہاں ایکسرے کیمپ بھی بنا لیا گیا۔ اس کیمپ کے قیدیوں کے بارے میں کوئی عدالتی ٹریبونل سماعت نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ امریکا میں رائج شہری حقوق کا یہاں اطلاق نہیں ہوتا تھا۔

جنوری 2002ء کے اواخر میں القاعدہ اور طالبان کے 353 افراد کو یہاں منتقل کر دیا گیا۔ سخت ترین سردی اور بادو باراں کے دوران وہ پنجروں میں کپکپا رہے تھے۔ ان قیدیوں پر تشدد کے وہ طریقے آزمائے جا رہے تھے جن سے دنیا اب تک ناآشنا تھی۔ قیدیوں کے پانچوں حواس معطل کرنے کے لیے باقاعدہ ایک منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ ان کے ہاتھ پیر باندھ دیے گئے تھے۔ منہ پر ٹیپ لگا دی گئی تھی۔

ناک پر ماسک چڑھادیا گیا تھا۔ آنکھیں اندھے سیاہ شیشوں سے ڈھانپ دی گئی تھیں۔ کانوں پر ساؤنڈ پروف کن ٹوپ چڑھادیے گئے تھے۔ اب وہ چل سکتے تھے نہ بول سکتے تھے، نہ دیکھ سکتے تھے نہ سن سکتے تھے اور نہ ہی کچھ سونگھ سکتے تھے۔ انہیں دو دو گز کے چھوٹے چھوٹے پنجروں میں اکڑوں بٹھادیا جاتا تھا۔ وہ کئی کئی دن تک اسی ہیئت میں پڑے رہتے تھے۔ یہاں انسانیت کی وہ تذلیل ہورہی تھی جس پر ہر انسان سسک کر رہ جاتا تھا۔ ''جنیوا کنونشن'' کے مطابق قیدیوں کو جو مراعات حاصل تھیں، گوانتاناموبے میں ان کو سراسر نظرانداز کردیا گیا تھا۔

القاعدہ اور طالبان کی تنظیم نو: افغانستان کے حالات پر نگاہیں جمائے ہوئے مبصرین جانتے تھے کہ القاعدہ اور طالبان یہاں اب بھی موجود ہیں اور خود کو منظم کر رہے ہیں تاہم اندازہ یہ تھا کہ انہیں منظم ہوکر دفاعی اور مزاحمتی کارروائیاں شروع کرنے میں دو تین سال لگ جائیں گے۔ دراصل مغربی مبصرین یہ گمان کرتے تھے کہ عوام میں طالبان کی جڑیں کمزور ہیں اور وہ گزشتہ سات سال تک زبردستی لوگوں پر مسلط رہے تھے۔ القاعدہ کے بارے میں ان کی رائے اس سے زیادہ بری تھی۔ مگر یہ تمام اندازے اور قیاسات جنوری 2002ء کے شروع ہی میں چکناچور ہوگئے۔

القاعدہ نے تورا بوڑا سے نکلنے کے ایک ماہ کے اندر اندر اپنی کارروائیوں کا ازسرنو آغاز کرکے دنیا کو حیرت زدہ کردیا اور مغربی مبصرین گنگ ہوگئے۔ سب سے پہلے قندھار ایرپورٹ پر ایک عرب مجاہد نے اچانک خودکش حملہ کرکے کئی امریکیوں کو ہلاک کردیا۔ یہ کارروائی جنوری 2002ء کے پہلے ہفتے میں ہوئی تھی۔ اگلے ہفتے القاعدہ کے اہم راہنما ایمن الظواہری کا میڈیا پر تہلکہ خیز انٹرویو نشر ہوا۔ ایمن الظواہری نے اعلان کیا کہ طالبان اور القاعدہ کے تمام اہم راہنما محفوظ اور خیریت سے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اصل جنگ تو اب شروع ہوئی ہے۔

جنوری 2002ء کے آخری ہفتے میں خوست میں ایک امریکی ہیلی کاپٹر مار گرایا گیا۔ اس میں سوار 25 کمانڈوز ہلاک ہوگئے۔ یہ کارروائیاں اس بات کا ثبوت تھیں کہ امریکی قبضے کے خلاف تحریک مزاحمت کی چنگاریاں سلگ رہی ہیں۔

کرزئی کا دورۂ پاکستان: امریکا کو شک تھا کہ حکومتِ پاکستان کرزئی حکومت سے مطمئن نہ ہونے کے باعث طالبان یا القاعدہ کو منظم ہونے میں خفیہ طور پر مدد دے سکتی ہے تاکہ افغانستان میں ایک بھارت نواز حکومت مستحکم نہ ہوسکے۔ امریکا کے نزدیک اس کا حل یہی تھا کہ کرزئی حکومت اور پاکستان میں اعتماد کا رشتہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ فروری 2002ء کے وسط میں افغان حکمران حامد کرزئی اور وزیر خارجہ عبداللہ

عبداللہ پاکستان کا دورہ کرتے نظر آئے۔ انہوں نے صدر پرویز مشرف سے ملاقات کی اور نئے رشتوں کی بنیاد ڈالنے پر اتفاق کیا۔ عبداللہ عبداللہ نے پاکستان کے خلاف بیان بازی پر ندامت ظاہر کی۔

حکمت یار کی حکمت عملی: روس کے خلاف جہادِ افغانستان کے ایک اہم کردار گلبدین حکمت یار طالبان کے دورِ حکومت میں ایران منتقل ہو گئے تھے اور اب بھی وہیں پناہ گزین تھے۔ حامد کرزئی نے پاکستان سے رشتے استوار کرنے کے ساتھ ساتھ گلبدین حکمت یار کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش بھی کی۔ گلبدین حکمت یار نے کرزئی سے تعاون کی گفت وشنید کے لیے حزب اسلامی کے ترجمان قطب الدین ہلال اور کمانڈر خالد فاروقی کو اپنا نمایندہ بنا کر کابل بھیجا۔ یہ فروری 2002ء کے آخری عشرے کی بات ہے۔ حکمت یار نے تعاون کے لیے دو بنیادی شرائط پیش کی تھیں: (1) غیر ملکی افواج کے انخلاء کی حکمت عملی طے کی جائے۔ (2) ملک میں اسلامی نظام نافذ کیا جائے۔ کرزئی نے ان دونوں شرائط پر عملدرآمد کو ناممکن بتایا، نتیجہ یہ نکلا کہ یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔

گل آغا کو ملا عمر کی دھمکی: قندھار میں ان دنوں مجاہدین اور طالبان کی بڑی تعداد قید تھی جن پر بے پناہ مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔ انہیں امریکا کے حوالے کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ قندھار کا نیا گورنر گل آغا مقامی لوگوں کو طالبان کی حمایت کے شبہے میں طرح طرح کی اذیتیں دے رہا تھا۔ مارچ کے پہلے عشرے میں طالبان سربراہ ملا محمد عمر نے اپنی روپوشی کے بعد پہلا بیان دیا اور وائرلیس پر گل آغا کو مخاطب کر کے کہا: ''مجاہدین کو امریکا کے حوالے کرنے کے نتائج خطرناک ہوں گے۔ مجاہدین پر اتنا ظلم کرو جتنا آنے والے وقت میں خود برداشت کر سکو۔'' گل آغا پر اس دھمکی سے ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ سرحد عبور کر کے کوئٹہ اور پھر وہاں سے کسی نامعلوم مقام کی طرف فرار ہو گیا۔ ملا محمد عمر کے اس پیغام سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ طالبان اور ان کی قیادت محفوظ ہے اور جوابی کارروائیوں کی قوت رکھتی ہے۔

شاہی کوٹ کا معرکہ: طالبان نے موسم بہار تک خود کو ایک بھرپور مزاحمتی قوت میں تبدیل کر لیا۔ ان کی جنگی حکمت عملی یہ تھی کہ محاذ جنگ کو جنوبی افغانستان سے لے کر مشرقی صوبوں تک پھیلا دیا جائے، دشمن کی خوراک و رسد کے راستے اور سپلائی لائن منقطع کر دی جائے اور شاہراہوں پر قبضہ کر کے اتحادیوں کی نقل وحرکت کو محدود کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہزاروں طالبان ارکن عام شہریوں کے بھیس میں افغان فوج میں شامل ہو رہے تھے۔ ان کے مخبر اور جاسوس بھی ہر طبقۂ زندگی خصوصاً سرکاری اداروں میں گھل مل گئے تھے۔ یہ ان کے لیے ذرا بھی مشکل ثابت نہیں ہوا کیونکہ آخر وہ اسی ملک کے باشندے تھے۔ ان تیاریوں کے نتیجے میں مارچ 2002ء کے آغاز میں طالبان نے قندھار میں 500 ٹن اسلحے

اور گولہ بارود کا عظیم ذخیرہ تباہ کر دیا۔ اس کے فوراً بعد مشرقی افغانستان کا صوبہ گردیز میدانِ جنگ بن گیا۔ جہاں طالبان کے تازہ دم دستوں نے امریکی اور اتحادی افواج سے ایک یادگار ٹکر لی۔

طالبان کی قیادت نامور جہادی لیڈر مولانا نصر اللہ منصور کے جواں سال صاحبزادے کمانڈر سیف اللہ منصور کر رہے تھے۔ طالبان کے علاوہ 120 عرب اور 200 چیچن مجاہدین ان کے ساتھ تھے۔ اس جنگ کا دائرہ شاہی کوٹ، زرمت اور کنڈاؤ کے پہاڑوں تک پھیل گیا۔ ابتدا میں امریکا نے افغان سرکاری سپاہیوں اور اپنی بری فضائی افواج کے ساتھ یہاں طالبان کے خلاف ایک بڑا آپریشن شروع کیا جس میں پورا ایک بریگیڈ حصہ لے رہا تھا۔ اسے ''آپریشن اناکونڈا'' کا نام دیا گیا۔ امریکی بی باون طیاروں نے طالبان کے ٹھکانوں پر تھرموبیر کی بم پھینکے جو فضا سے آکسیجن جذب کر کے تمام جانداروں کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ تاہم طالبان کی بڑی تعداد اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد کے طفیل محفوظ رہی۔

اس کے بعد جب امریکی فوجوں نے زمینی کارروائی شروع کی تو گھات میں چھپے طالبان نے ان پر حملہ کر دیا۔ امریکیوں کی درجنوں لاشیں گریں اور وہ جان بچا کر بھاگنے لگے۔ جلد ہی انہوں نے پہلے سے زیادہ تیاری کے ساتھ دوسرا حملہ کیا۔ اس بار امریکی افواج کے ساتھ آسٹریلیا، کینیڈا، جرمنی، فرانس اور ناروے کی فوجیں بھی شامل تھیں جن کی مجموعی تعداد 6 ہزار سے زائد تھی۔ مجاہدین نے اب بھی ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا۔ وہ دشمن کی سپلائی کاٹنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ امریکی فضائیہ کے مقابلے میں مجاہدین نے پہلی بار میزائل بھی استعمال کیے جن سے وہ ایک بی باون طیارہ، ایک سی 130 طیارہ، ایک مگ طیارہ اور 12 ہیلی کاپٹر گرانے میں کامیاب رہے۔ آخر کار امریکیوں اور اتحادیوں کو اس علاقے سے نکلنے کے لیے مزید ہیلی کاپٹر منگوانا پڑے۔ مجاہدین نے امریکی فوج کے 18 افراد قیدی بھی بنا لیے۔ دس دن کی خونریز جنگ کے بعد اتحادی نہایت افراتفری کے عالم میں کم از کم 89 لاشیں چھوڑ کر فرار ہوئے۔ (بعض ذرائع 200 لاشیں بتاتے ہیں) ان کے زخمیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ خوست کا ہسپتال زخمیوں سے بھر گیا۔

امریکی فوج اس کے بعد مشرقی اور جنوبی افغانستان میں بالکل نہ ٹک سکی۔ تمام امریکی فوری طور پر قندھار اور خوست اور گردیز سے بگرام کی طرف کوچ کر گئے۔ آپریشن اناکونڈا کے کمانڈر میجر جنرل فرینک ہیگن نے مہم کی ناکامی کی وجوہ بتاتے ہوئے کہا کہ ہم طالبان کی تعداد، قوت اور اسلحے کے بارے میں صحیح معلومات حاصل نہ کر سکنے کے باعث اپنے اہداف حاصل نہ کر سکے۔ امریکا کے لیے شاہی کوٹ کے معرکے میں گرفتار ہونے والے 18 امریکی فوجیوں کی بازیابی بہت اہم تھی۔ اس نے طالبان سے

اس بارے میں مذاکرات شروع کر دیے۔ طالبان نے بدلے میں کیوبا میں قید 352 القاعدہ اور طالبان ارکان کی رہائی اور آپریشن اناکونڈا میں شہید ہونے والے مجاہدین اور شہریوں کا خون بہا ادا کرنے کا مطالبہ پیش کیا۔ امریکا خون بہا ادا کرنے پر تیار ہو گیا جو 5 ملین ڈالر بنتا تھا۔ تاہم کیوبا سے 352 قیدیوں کی بجائے اس نے 18 امریکیوں کے بدلے 18 قیدیوں کو رہا کرنے پر آمادگی ظاہر کی جسے طالبان نے مسترد کر دیا۔

شاہی کوٹ کے اس تاریخی معرکے کے اثرات دوررس ثابت ہوئے۔ دنیا پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ طالبان ایک زندہ حقیقت ہیں جو نہ صرف اپنے دفاع پر قدرت رکھتے ہیں بلکہ زمینی جنگ میں امریکا اور اس کے اتحادیوں پر بھاری پڑ سکتے ہیں۔ لوگوں کی طالبان سے وابستہ شکستہ اُمیدیں پھر سے جوان ہونے لگیں۔ افغان عوام کو یہ احساس ہونے لگا کہ امریکی ناقابلِ شکست نہیں اور ان کے وطن کی حفاظت کرنے والے ابھی زندہ ہیں۔

اپریل کے آخری ہفتے میں ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا۔ قندھار سے 25 کلومیٹر دور ایک گاؤں میں طالبان سربراہ ملا محمد عمر مجاہد اچانک نمودار ہوئے۔ لوگوں نے انہیں پہچان لیا اور ان کے گرد جمع ہو گئے۔ کچھ لوگ والہانہ عقیدت کے ساتھ ان کے ہاتھ چومنے لگے۔ ملا عمر نے گاؤں کے قبرستان میں حال ہی میں شہید ہونے والے ایک مجاہد ملا نیک محمد کی قبر پر دُعا کی اور پھر جس طرح آئے تھے اسی طرح کہساروں کی آغوش میں غائب ہو گئے۔

کابل کی صورتِ حال: کہساروں اور وادیوں میں طالبان کی نئی صف بندی کے ان دنوں میں کابل، جلال آباد اور قندھار میں خاموشی کا راج تھا۔ یہاں امریکی اور اتحادی فوجوں کا راج چلتا تھا۔ ان کی مرضی کے بغیر عبوری حکومت کا کوئی پرزہ نہیں ہل سکتا تھا۔ کابل میں رات 10 بجے سے صبح 6 بجے تک کرفیو لگا رہتا تھا۔ امریکی فوج نے شمالی اتحاد اور کابل پولیس کو پابند کر رکھا تھا کہ ان کے کارکن شہر میں مسلح ہو کر گشت نہیں کر سکتے۔ کرزئی کا قندھاری گروپ بھی بے دست و پا نظر آتا تھا۔ کابل میں 40 ملکوں کے سفارت خانے کھل گئے۔ یہ اتحادیوں کے لیے اوپن سٹی تھا۔ ڈالر عملی طور پر افغانستان کا سکہ بن چکا تھا۔ شہر میں سہولیات کا عالم یہ تھا کہ اپریل 2002ء میں پورے کابل میں صرف ایک پبلک کال آفس نظر آتا تھا۔ اپریل میں امریکا نے ایک بار پھر مشرقی افغانستان میں فوج بھیجی۔ 1800 سپاہی خوست پہنچ گئے مگر وہ اپنی حفاظت کے لیے زیادہ فکر مند تھے۔ 15/ اپریل کو امریکی فوج کے دستے پر ریموٹ بم حملہ ہوا جس میں دس فوجی مارے گئے۔

پاکستان کے مسائل: کابل میں بھارت کا اثر ورسوخ بھی بڑھتا چلا جارہا تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' نے افغانستان میں کئی تربیتی مراکز قائم کر لیے تھے جہاں دہشت گردوں کو تربیت دے کر پاکستان بھیجا جانے لگا تھا۔ طالبان کے دور میں بھارت افغانستان میں ایسی مراعات پانے کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ اس موسم گرما تک بھارتی افواج پاکستان کی مشرقی سرحدوں پر جمع رہیں اور پاکستان مغربی سرحدوں سے افواج کم کر کے مشرقی سرحدوں پر لاتا رہا۔ یہ صورتِ حال امریکا کے لیے ناخوشگوار تھی کیونکہ وہ پاکستانی افواج کو طالبان اور القاعدہ ارکان کی روک تھام کے لیے افغان سرحدوں پر رکھنا چاہتا تھا، چنانچہ صدر بش نے دباؤ ڈال کر بھارت کو حملے سے باز رکھا اور دونوں ملکوں کی فوجیں سرحدوں سے پیچھے ہٹ گئیں۔

جنگ کا خطرہ تو ٹل گیا مگر پاکستان میں ان بھارتی تخریب کاروں کا دائرہ کار بڑھتا چلا گیا جو افغانستان سے تربیت لے کر پاکستان میں بم دھماکے کر رہے تھے اور علیحدگی پسند تحریکوں کو ہوا دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ بڑی تعداد میں شمالی اتحاد اور دیگر گروہوں کے جنگجو پاکستان میں گھس کر لوٹ مار، اغوا برائے تاوان، ٹارگٹ کلنگ، رہزنی اور ڈکیتی جیسے جرائم کر کے ملک کے امن وامان کو تہ وبالا کر رہے تھے۔

''لویہ جرگہ'' کی تاریخ: بون کانفرنس کے فیصلے کے تحت عبوری حکومت کو چھ ماہ کے لیے اختیارات دیے گئے تھے۔ طے یہ ہوا تھا کہ چھ ماہ بعد ''لویہ جرگہ'' کا انعقاد ہوگا جس میں ایک وسیع البنیاد حکومت تشکیل دی جائے گی جو ملک میں جمہوریت کی راہ ہموار کرے گی۔ چنانچہ مئی 2002ء میں لویہ جرگہ کی تیاریاں زور وشور سے شروع کر دی گئیں۔

یاد رہے کہ لویہ جرگہ صدیوں سے افغانستان کی سیاسی روایات کا ایک اہم حصہ رہا ہے جس میں قبائلی سردار جمع ہو کر ملک وقوم کے بڑے بڑے مسائل کے فیصلے اتفاق رائے سے کیا کرتے ہیں۔ سب سے پہلے 1211ء میں یوسف زئی پشتونوں نے پشاور سے قندھار ہجرت کرنے کا فیصلہ کرنے کے لیے ''لویہ جرگہ'' بلایا تھا۔ اس کے بعد سے یہ سلسلہ جاری چلا آرہا ہے۔ دوسرا لویہ جرگہ 1413ء میں منعقد ہوا۔ تیسرا 1570ء میں مغلوں کے خلاف پشتونوں کو متحد کرنے کے لیے ہوا۔ چوتھا 1707ء میں میرویس نے ایران کے خلاف مزاحمت کے لیے بلوایا۔ پانچواں لویہ جرگہ اس لحاظ سے بے حد اہم تھا کہ اس میں احمد شاہ ابدالی نے افغانستان کو باقاعدہ ایک مملکت کی شکل دی تھی۔ چھٹا لویہ جرگہ ابدالی کے وارث تیمور شاہ نے 1792ء میں طلب کیا اور پایۂ تخت کابل سے قندھار منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ساتواں لویہ جرگہ 1841ء میں برطانیہ سے جہاد پر اتفاقِ رائے کے لیے منعقد ہوا۔ آٹھواں لویہ جرگہ 1916ء میں حاکم افغانستان امیر حبیب اللہ خان نے پہلی جنگ عظیم میں افغانستان کی خارجہ پالیسی

طے کرنے کے لیے بلوایا۔ نویں، دسویں اور گیارھویں لویہ جرگے کا انعقاد امیر امان اللہ نے 1922ء، 1924ء اور 1928ء میں کروایا۔ ان میں سے پہلے میں نئے آئین کی منظوری دی گئی۔ دوسرے میں سابقہ افغان پالیسیوں کا جائزہ لیا گیا اور تیسرے میں اپنی حکومت کی چار سالہ کارکردگی پر غور کیا گیا۔ بارھواں لویہ جرگہ نئے حکمران نادر شاہ کی بادشاہت کی توثیق کے لیے تھا۔ تیرھویں، چودھویں، پندرھویں اور سولھویں لویہ جرگے کا انعقاد ظاہر شاہ نے کیا تھا۔ ان میں سے پہلا 1941ء میں جرمن شہریوں کے بارے میں فیصلے کے لیے تھا۔ دوسرا 1952ء اور تیسرا 1955ء میں منعقد ہوا جن میں پاکستان سے متصل قبائلی علاقہ جات کے بارے میں بحث کی گئی۔ چوتھا 1964ء میں بلوا کر ظاہر شاہ نے اپنی بادشاہت کی توثیق کی۔ سترھواں لویہ جرگہ 1977ء میں داؤد خان نے بادشاہت کے خاتمے کے بعد جمہوری ریاست کے قیام کے لیے بلوایا تھا۔

2002ء کا لویہ جرگہ: اب 2002ء میں اٹھارھواں لویہ جرگہ امریکا کی سرپرستی میں افغانستان میں عالمی طاقتوں کی من پسند حکومت کے قیام کے لیے منعقد کیا جا رہا تھا۔ جوں جوں جرگے کے دن قریب آ رہے تھے ملک میں سیاسی جوڑ توڑ تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ احمد شاہ مسعود کی وارث سیاسی پارٹی جو ''شورائی نظار'' کے نام سے کام کر رہی تھی توڑ پھوڑ کا شکار ہو چکی تھی۔ جنرل قاسم فہیم، ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ اور یونس قانونی نے جو اس کے اہم ترین رکن تھے، پروفیسر برہان الدین ربانی سے الگ ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ برہان الدین ربانی اب بھی صدارت کے اُمیدوار تھے مگر ان کی دال گلتی نظر نہیں آتی تھی۔

ظاہر شاہ کی واپسی: حکمرانی کے اہم اُمیدوار سابق بادشاہ ظاہر شاہ گزشتہ 29 برس سے روم میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ حامد کرزئی خود انہیں لینے اٹلی گئے۔ 17 اپریل 2002ء کو ظاہر شاہ نے ایک بار پھر افغانستان میں قدم رکھا، مگر یہاں ان کے لیے نفرت کی فضا تھی۔ شمالی اتحاد ظاہر شاہ کو ایک پل کے لیے برداشت کرنے کا روادار نہیں تھا۔ اس کشیدگی کے پیش نظر ظاہر شاہ کی جان کی حفاظت کے لیے سخت ترین سیکیورٹی کا انتظام کیا گیا اور ان کی تمام ملاقاتیں منسوخ کر دی گئیں۔ اس ناسازگار ماحول کے باوجود ظاہر شاہ کو اُمید تھی کہ لویہ جرگہ کے ذریعے وہ اقتدار کا پنچھی قابو کر لیں گے، کیونکہ مجددی اور گیلانی کے علاوہ ان دنوں حزبِ اسلامی بھی ان کی حمایت پر آمادہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے بعد اگر امریکا کی نظرِ کرم ہو جاتی تو دوبارہ حکمران بننا کوئی مشکل نہ تھا۔

جرگہ میں تاخیر کی وجوہ: لویہ جرگہ کے انعقاد میں دیر ہوتی چلی گئی۔ وجہ یہ تھی موسمِ گرما شروع ہوتے ہی ملک میں جگہ جگہ مقامی کمانڈروں نے ایک دوسرے کے خلاف مورچے بنا لیے تھے اور مسلح جھڑپیں

شروع ہو گئی تھیں۔ مئی 2002ء کے پہلے عشرے میں شمالی افغانستان میدانِ جنگ بن گیا۔ رشید دوستم اور کمانڈر عطا کی فوجیں باہم ٹکرانے لگیں۔ اگر اقوام متحدہ وقت کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے بلا تاخیر بیچ میں کود کر تصفیہ نہ کراتی تو جنگ بہت طول پکڑ سکتی تھی۔ ادھر مشرقی افغانستان میں حامد کرزئی کی طرف سے خوست اور گردیز کا مقرر کردہ سابق گورنر باچا خان ان مقامی کمانڈروں سے برسرپیکار تھا جنھوں نے اسے گورنر ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ باچا خان ایک ظالم وجابر انسان ہے۔ اس لڑائی میں بے دریغ راکٹ فائر کیے گئے جس سے ایک سو کے قریب بے گناہ شہری جاں بحق ہو گئے۔ یاد رہے کہ باچا خان کو بون کانفرنس میں تشکیل دی گئی حکومت میں خوست کا گورنر مقرر کیا گیا تھا مگر دو ماہ بعد (فروری 2002ء کے اواخر میں) حامد کرزئی نے اسے آئی ایس آئی سے روابط کے الزام میں عہدے سے برطرف کر دیا تھا۔ باچا خان نے برطرفی کے احکام مسترد کر دیے اور علاقے پر حکومت کا دعوے دار رہا جس کے بعد مقامی کمانڈروں سے اس کی جھڑپیں شروع ہو گئیں۔

<u>اٹھارہویں لویہ جرگے کی روداد:</u> آخر کار جون 2002ء کے پہلے عشرے میں افغانستان کا اٹھارہواں لویہ جرگہ منعقد ہوا۔ اس جرگے میں 1575 نمایندوں نے شرکت کی۔ یہ جرگہ دو لحاظ سے منفرد تھا:

① اس کا انعقاد ایک غیر ملکی طاقت کے اشارے پر ہو رہا تھا۔

② پہلی بار خواتین بھی جرگے میں حصہ لے رہی تھیں جن کی تعداد 200 تھی۔

بون کانفرنس کی طرح جرگے کے تمام مندوبین بھی امریکی منصوبہ بندی کے تحت مدعو کیے گئے تھے جن سے توقع تھی کہ وہ امریکا کی من پسند حکومت تشکیل دینے میں پورا تعاون کریں گے۔ اس کے باوجود جرگہ ابتدا ہی میں اس وقت اختلافات کا شکار ہو گیا جب ظاہر شاہ نے حامد کرزئی کے مقابلے میں دست بردار ہونے سے انکار کر دیا۔ ادھر برہان الدین ربانی بھی دامن میں بہت سی اُمیدیں لیے کھڑے تھے۔ شمالی اتحاد ظاہر شاہ کو قبول کرنے کے لیے قطعاً تیار نہ تھا، جبکہ ربانی کو کسی کی بھی حمایت حاصل نہیں تھی۔ جرگے کی ایک نشست میں ایک خاتون رکن ''تاجور کاکڑ'' نے برہان الدین ربانی پر کھلم کھلا الزام عائد کرتے ہوئے کہا کہ وہ کابل چھوڑتے وقت محل کی تمام قیمتی چیزیں، ہیرے جواہرات، قدیم نوادرات حتیٰ کہ صدارتی کرسی تک چرا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ربانی نے ان الزامات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جرگے کے دوران شمالی اتحاد کی غنڈہ گردی کے کئی مناظر دیکھنے میں آئے۔ شمالی اتحاد کے جنگجو اپنے مخالفین کے گھروں پر بے دریغ حملے کرتے اور ان کے اہل خانہ کو اذیتیں پہنچاتے رہے۔

امریکا ہر صورت میں اپنے منظور نظر حامد کرزئی کو حکمران دیکھنا چاہتا تھا اس لیے امریکی نمایندے زلمے

خلیل زاد کو بیچ میں آنا پڑا۔ اس نے ظاہر شاہ اور برہان الدین ربانی کو ہٹ دھرمی کے خطرناک عواقب سے آگاہ کیا۔ اس دباؤ کے نتیجے میں دونوں اُمیدوار چپ چاپ دست بردار ہو گئے۔ جرگے کے ارکان نے حامد کرزئی کو اتفاق رائے سے 2004ء کے جمہوری انتخابات تک قوم کا نمائندہ حکمران چن لیا۔ میڈیا رپورٹوں کے مطابق اس اتفاق رائے کے لیے جرگے کے ہر رکن کو 20،20 ہزار امریکی ڈالر دیے گئے تھے۔ عین اس وقت جبکہ حامد کرزئی نئی سج دھج سے تختِ کابل کے حکمران کے طور پر منتخب ہو رہے تھے۔ القاعدہ کے جانبازوں نے اسٹینگر میزائل سے امریکا کا ایک جنگی طیارہ (جس کی قیمت 45 ملین ڈالر تھی) مار گرایا۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ اصل معرکہ جس قوت کے ساتھ برپا ہے اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔

لویہ جرگے سے طالبان کے خدشات: طالبان کو ''لویہ جرگہ'' سے کئی خدشات لاحق تھے۔ اس جرگے کا تاریخی پس منظر اور افغانوں میں اس کی حیثیت کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا تھا کہ اس میں کیا گیا فیصلہ پوری قوم کا فیصلہ شمار ہوگا جس سے سرتابی کرنے والا قومی دھارے سے کٹ جائے گا۔ اگر امریکی پالیسی سازوں میں حقائق کو سمجھنے اور ان کا سامنا کرنے کی اہلیت ہوتی یا وہ افغانستان کے ذرا بھی ہمدرد ہوتے تو لویہ جرگہ کے ذریعے طالبان کی اُبھرتی ہوئی مزاحمتی تحریک کو کمزور کیا جا سکتا تھا مگر یہ اس صورت میں ہو سکتا تھا جب لویہ جرگہ میں تمام قوموں، گروہوں اور طبقات کو مناسب نمایندگی دی جاتی۔ خصوصاً پشتونوں کو ان کی مردم شماری کے مطابق حکومت سازی میں شامل کیا جاتا۔ مجاہدین اور علمائے دین کو بھی حصہ دیا جاتا۔ مگر امریکا نے جرگے میں صرف اپنے من پسند افراد کو شامل کیا۔ مناسب نمایندگی کا ذرا برابر خیال نہیں رکھا۔ پشتونوں کو نظر انداز کر کے شمالی اتحاد کو حکومت میں غالب حصہ دے دیا۔ ان وجوہ کی بنا پر لویہ جرگہ کے فیصلوں کو افغان قوم میں وہ حیثیت حاصل نہ ہو سکی جو ماضی کے جرگوں کی تھی۔ رائے عامہ نے اسے امریکی جرگہ اور امریکی فارمولا قرار دیا۔ یوں طالبان کو لاحق وہ شدید خطرہ ٹل گیا جو ان کی تحریک کو سبوتاژ کر سکتا تھا۔

حامد کرزئی کی شخصیت: طالبان کے لیے دوسرا بڑا خطرہ خود حامد کرزئی کی شخصیت تھی۔ اس میں شک نہیں کہ امریکا کا انتخاب لاجواب تھا۔ حامد کرزئی میں جو خصوصیات تھیں، ان کا نعم البدل تلاش کرنا بہت مشکل تھا۔ کرزئی پوپلزئی قبیلے کے فرزند ہیں جو طالبان کے مرکز قندھار اور جنوبی افغانستان میں بھرپور اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ وہ ماضی میں جہادی گروپوں سے بھی وابستہ رہے۔ انہیں نجیب یا کارمل سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی کیونکہ وہ ملحد یا بدعقیدہ نہیں بلکہ عام افغانوں کی طرح بڑی حد تک روایتی اسلامی ذہن رکھتے ہیں۔ ان کے چہرے پر خشخشی ڈاڑھی بھی ہے جو کسی نہ کسی درجے میں ان کے روایت پسند ہونے

کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ وہ پشتو، دری اور انگریزی کے علاوہ اُردو، ہندی اور فرنچ زبانوں کے بھی ماہر ہیں۔ انہیں بین الاقوامی تعلقات بنانے کا فن خوب آتا ہے۔ پختون ہونے کی حیثیت سے وہ جنوب اور مشرقی صوبوں کے لیے قابل قبول ہو سکتے ہیں۔ یہ وہ خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے کرزئی عوامی مقبولیت حاصل کر کے طالبان کے لیے خطرہ پیدا کر سکتے تھے۔ اس لیے طالبان نے شروع ہی میں کرزئی کو راستے سے ہٹا دینے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ ان کی جانب سے کرزئی کو قتل کرنے کے لیے وقفے وقفے سے خطرناک کارروائیاں ہوتی رہیں۔

طالبان کے علاوہ خود حکومت میں شامل شمالی اتحاد بھی کرزئی کی جان کا دشمن تھا اور وہ بھی کرزئی کو مارنے کے لیے سازشیں تیار کرتا رہتا تھا۔ ہم حامد کرزئی کو دنیا کے ان حکمرانوں میں شمار کر سکتے ہیں جن کے لیے سیکیورٹی خطرات سب سے زیادہ تھے۔ تاہم کرزئی کے حفاظتی انتظامات بھی دنیا بھر میں اعلیٰ ترین تھے کیونکہ یہ ذمہ داری خود امریکا کی تھی۔ امریکی ایجنسیاں اور اہلکار کرزئی کے خلاف ہونے والی کارروائیوں کے منصوبوں کا اکثر بروقت پتا لگا کر ان کی جان بچا لیتے تھے...... مگر یہی امریکا کی نوازشات کرزئی کی سب سے بڑی خامی شمار ہوتی تھیں۔ اس بنا پر وہ عوام میں امریکا نواز شمار ہوتے رہے اور انہیں طالبان جیسا خراج تحسین کبھی نہ مل سکا۔

مآخذ و مراجع

- ......ہفت روزہ ضرب مؤمن، جلد 5، 6، 7
- ......ہفت روزہ تکبیر، فرائڈے اسپیشل، غازی: جلد 2002ء، 2003ء
- ......قومی اخبارات ۔ امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور ہفت روزہ جرائد۔ 2002ء، 2003ء
- ......روزنامہ اسلام کراچی 2002ء، 2003ء

سینتیسواں باب

طالبان امریکا سے نبرد آزما

افغانستان میں تین سال کے لیے سیاسی سیٹ اپ بنا کر امریکا خاصا مطمئن ہو گیا تھا کہ وہ افغان عوام اور دنیائے اسلام کی نظروں میں دھول جھونکنے میں کامیاب رہا ہے تاہم اسامہ بن لادن اور ملا محمد عمر کو گرفتار کرنے میں ناکامی امریکیوں کو چین نہیں لینے دیتی تھی۔ امریکی افواج نے اس خفت سے جھنجھلا کر بے قصور افغان عوام کو ہوائی حملوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔

جولائی 2002ء کے آغاز میں امریکی بی باون طیاروں نے ارزگان میں شادی کی ایک تقریب پر اندھا دھند بمباری کی جس سے دولہا اور دلہن سمیت 400 افراد شہید ہو گئے۔ اس سنگدلی پر افغان عوام چیخ اُٹھے۔ دنیا بھر کے میڈیا پر نشر ہونے والی اس خبر سے امریکا کا اصل بھیانک چہرہ سامنے آ گیا۔ ملا محمد عمر نے اس واقعے کے بعد اپنے بیان میں امریکا کو خبردار کرتے ہوئے کہا:

''جنگ کی آگ وائٹ ہاؤس تک ضرور پہنچے گی۔''

انہوں نے اسامہ بن لادن کی تلاش میں امریکا کی ناکامی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

''اسامہ بن لادن خیریت سے ہیں اور ان کی خیریت کا کانٹا بن کر بش کے دل میں چبھتی رہے گی۔''

جنگجو سرداروں کی حکومت مخالف کارروائیاں: جلد ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ حامد کرزئی لویہ جرگہ کے ذریعے تختِ کابل کا حق حاصل کرنے کے باوجود جنگجو کمانڈروں کی حمایت پانے سے محروم ہیں۔ خوست کا گورنر بادشاہ خان کھل کر کہہ رہا تھا کہ لویہ جرگہ کے ذریعے اقلیت کو 90 فیصد افغانوں پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ اس نے میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے کہا: ''حامد کرزئی امریکی ایجنٹ ہے جسے ہٹانا ضروری ہے۔'' جنگجو سرداروں کی باہمی ناچاقیاں ٹارگٹ کلنگ کے روپ میں ظاہر ہو رہی تھیں۔ جولائی کے وسط میں ننگرہار کے گورنر حاجی عبدالقدیر خان کو سرکاری دفتر سے رہائش گاہ جاتے ہوئے دن دیہاڑے قتل کر دیا گیا۔ اس حملے کا الزام وزیر دفاع جنرل فہیم قاسم پر لگایا جا رہا تھا۔ خود حامد کرزئی کے قتل کے کئی

منصوبے طشت از بام ہو چکے تھے۔

ملک میں امن وامان بدستور ناپید تھا۔ اگست کے آخری ہفتے میں باچا خان نے 6 ہزار جنگجوؤں کے ساتھ جنوبی افغانستان میں بڑے پیمانے پر لوٹ مار شروع کردی اور کئی شاہراہوں کو بند کردیا۔ کرزئی نے اسے باغی قرار دیتے ہوئے الٹی میٹم دیا کہ وہ دو ہفتے کے اندر خود کو حکومت کے حوالے کردے، مگر باچا خان نے کوئی پروانہ کی۔ وجہ یہ تھی کہ جنوبی اور مشرقی افغانستان میں کرزئی کا اثر ورسوخ نہیں تھا۔

ایک سال میں امن وامان کی صورتِ حال: 22 دسمبر 2002ء کو حامد کرزئی کی تخت نشینی کا ایک برس مکمل ہوا۔ اس ایک سال میں ملک بھر میں امن وامان اور بنیادی سہولتوں کی فراہمی کی صورتِ حال ناگفتہ بہ رہی۔ ایک سال کے دوران کابل قندھار شاہراہ پر بدامنی کے سینکڑوں واقعات پیش آئے۔ صرف اکتوبر اور نومبر میں یہاں قتل کے 55 اور اغوا کے 250 واقعات رونما ہوئے۔ اس سال بدخشاں میں قحط کی وجہ سے 6 ہزار افراد جاں بحق ہوئے۔ امریکی امداد کے ذخائر سے انہیں کچھ میسر نہ آسکا۔ پورے بدخشاں میں طبی سہولیات ناپید رہیں۔ مقامی ذرائع کے مطابق صوبے بھر میں ایک کلینک بھی نہیں۔

منشیات کی افزائش: اس سال افغانستان نے اگر کسی میدان میں ترقی کی تو وہ منشیات کی کاشت تھی۔ ملک بھر میں 400 ٹن افیون پیدا ہوئی اور افغانستان اس حوالے سے پہلے نمبر پر آگیا۔ کرزئی حکومت نے دورانِ سال افیون کی کاشت پر قابو پانے کے لیے کچھ برائے نام کوششیں کی تھیں، مگر ان کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا تھا۔ اس بارے میں کرزئی حکومت کی کارکردگی کا اندازہ سال کے آخری ہفتے میں واقع ہونے والے اس تصادم سے لگایا جاسکتا ہے جو کرزئی حکومت کے اہلکاروں اور کسانوں میں ہوا۔ سرکاری اہلکار ننگر ہار اور ہلمند میں پوست کی فصل تلف کرنے آئے تو کسانوں نے مناسب معاوضے کا مطالبہ کیا جس پر سرکاری فوج نے کسانوں پر حملہ کردیا۔ تصادم میں 2 کاشت کار جاں بحق اور 8 شدید زخمی ہوگئے۔

ایران کی نئی پالیسی: اس سال ایک اہم تبدیلی افغانستان کے پڑوسی ملک ایران کے رویے میں آئی۔ ایران نے طالبان حکومت کے خاتمے کے لیے امریکی حملے کی بھرپور حمایت کی تھی، مگر امریکا کا تسلط مکمل ہونے کے بعد ایران کو اپنے پڑوس میں امریکی اڈوں کی موجودگی سے اپنی بقا کے بارے میں تحفظات لاحق ہونے لگے۔ ایران کے خدشات اس وقت بڑھ گئے جب 2002ء کے موسمِ خزاں میں امریکا نے ایران کو کمزور کرنے یا اس پر دباؤ بڑھانے کے لیے افغانستان میں ایران مخالف گروپوں کے لیے تربیتی کیمپ بنانا شروع کیے۔

دراصل امریکا اس خطے میں کئی بڑی تبدیلیوں کا خواہاں تھا۔ وہ شمالی افغانستان کو الگ کرنا چاہتا تھا۔

پاکستان کے صوبہ سرحد کو جدا کر کے افغانستان کے پختون صوبوں میں ملانا چاہتا تھا۔ چین کے صوبے سنکیانگ کی علیحدگی بھی امریکی منصوبے میں شامل تھی اور خود ایران کے صوبہ بلوچستان کو الگ کر کے پاکستان کے بلوچستان کے ساتھ ملانا اور ''گریٹ بلوچستان'' وجود میں لانا بھی امریکی کھیل کا حصہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایران نے امریکی تسلط کے عواقب کو سمجھنا شروع کر دیا۔ ایک سال کے اندر اندر اس نے اپنی پالیسی میں خفیہ طور پر تبدیلی کر کے امریکا مخالف قوتوں کے ساتھ بھرپور تعاون کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہی وجہ تھی کہ ایران نے نہ صرف گلبدین حکمت یار بلکہ اسامہ بن لادن کے بیٹے سعد بن لادن کو بھی پناہ فراہم کی، جبکہ یہ دونوں امریکا کے مطلوب افراد کی فہرست میں شامل تھے۔ اگلے قدم کے طور پر ایران نے دسمبر 2002ء میں اپنی سرحدوں پر تربیتی کیمپ قائم کر لیے تاکہ افغانستان میں اثر و رسوخ رکھنے والے گروپوں کو عسکری تربیت فراہم کرے۔ حزبِ وحدت کے علاوہ برہان الدین ربانی اور اسماعیل خان تورون کے افراد یہاں تربیت حاصل کرنے لگے۔ امریکا کے خلاف مزاحمت میں شرکت کرنے والوں کو بھی یہاں عسکری تربیت دی جا رہی تھی۔

حکمت یار...... آمادۂ پیکار: 2002ء کے موسم گرما کے دوران ایک اور بڑی تبدیلی بھی رونما ہو چکی تھی۔ ایران میں پناہ گزین افغان راہنما گلبدین حکمت یار نے حالات کے کئی اُتار چڑھاؤ دیکھنے کے بعد بالآخر امریکا کے خلاف مزاحمت میں بھرپور کردار ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ حکمت یار لویہ جرگہ سے قبل ظاہر شاہ کی حمایت کی طرف مائل تھے، مگر جرگے کے فیصلے سے یہ حقیقت طشت ازبام ہو گئی کہ نئی حکومت خالص امریکا نواز ہے جس میں شمالی اتحاد کے تاجک اور ہزارہ غالب ہیں۔ حامد کرزئی کو صرف شوپیس کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے اور پختونوں کو مکمل طور پر نظر انداز کیا گیا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں حکمت یار نے جولائی 2002ء میں تحریک مزاحمت کا حصہ بننے کا فیصلہ کیا۔ جولائی کے آخری عشرے میں حکمت یار کے نمایندوں نے باجوڑ میں طالبان کے کچھ راہنماؤں سے ملاقات کر کے آیندہ کی حکمت عملی طے کی۔ اس ملاقات کی اطلاع حکومت پاکستان کو امریکا کی خفیہ ایجنسی نے دی جبکہ حکومت پاکستان ایسی کسی ملاقات سے لاعلمی ظاہر کر رہی تھی۔

افغان عوام ہتھیار اُٹھالیں: ستمبر 2002ء کے آغاز میں جبکہ دنیا میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی اور بش کے اعلانِ صلیبی جنگ کو ایک برس مکمل ہونے والا تھا، حکمت یار نے امریکا کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا۔ حزبِ اسلامی کے سربراہ نے اپنے بیان میں کہا:

''افغان عوام ہتھیار اُٹھالیں۔ ہم امریکی افواج پر بھرپور حملے کریں گے۔''

انہوں نے حامد کرزئی سے مصالحت کے امکانات کو مسترد کرتے ہوئے کہا:

''حامد کرزئی کی غلام حکومت کی غلامی سے موت بہتر ہے۔''

جلد ہی امریکا سے جہاد کے بارے میں حکمت یار کا آڈیو پیغام اور تحریری فتویٰ بھی نشر ہو گیا۔ اس کے چند دنوں بعد طالبان سربراہ ملا محمد عمر کا الجزیرہ ٹی وی سے ایک اہم پیغام نشر ہوا جس میں انہوں نے کہا:

''دنیا میں جہاں بھی دہشت گردی ہو رہی ہے اس کا ذمہ دار امریکا ہے۔ افغانستان کی آزادی تک جہاد جاری رہے گا۔''

طالبان اور القاعدہ کی نئی حکمت عملی: استعمار کے خلاف افغانوں کی یہ جدوجہد سوویت یونین کے خلاف جہاد سے خاصی مختلف تھی، کیونکہ اُس دور میں امریکا اور روس آمنے سامنے تھے۔ افغانستان کے میدان میں اشتراکیت اور اسلام کے درمیان تصادم کا جو نظارہ دکھائی دے رہا تھا، اس میں سرمایہ دارانہ نظام کا پیشرو اپنے تمام حلیفوں کے ساتھ، اسلام پسندوں کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ مجاہدین کے لیے پاکستان کے دروازے اور عرب ممالک کے خزانے کھلے تھے مگر طالبان کو ایک بالکل مختلف صورتِ حال میں جنگ لڑنا پڑ رہی تھی۔ دنیا کا کوئی ملک علانیہ طور پر ان کی حمایت کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ خود پاکستان جہاں طالبان کے حامی سب سے زیادہ تھے، ان کے خلاف فرنٹ لائن اتحادی کا کردار ادا کر رہا تھا۔

طالبان یہ جنگ چاروں طرف سے محصور ہو کر لڑ رہے تھے۔ ان کا اصل سرمایہ ان کا یقین تھا۔ ان کی حقیقی طاقت ان کا ایمان تھا۔ ظاہری اسباب میں ان کا انحصار اسلحے کے ان ذخائر پر تھا جو انہوں نے جنگ سے قبل غاروں میں محفوظ کر لیے تھے۔ دشمن کی فضائیہ اب بھی ان کے بس سے باہر تھی۔ تاہم طالبان اور القاعدہ اس کوشش میں تھے کہ اسلحے کے عالمی بیوپاریوں یا امریکا سے خطرات محسوس کرنے والے ہمسایہ ملکوں سے خفیہ طور پر میزائل حاصل کر لیں۔

افغان وزارتِ دفاع کے ملٹری انٹیلی جنس رحمت اللہ روند نے نائن الیون کی برسی پر خبردار کیا تھا کہ اسامہ بن لادن چین سے زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائل خریدنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ خبر درست تھی یا نہیں۔ مگر یہ بات بہرحال طے تھی کہ القاعدہ اور طالبان روز بروز خود کو زیادہ منظم کرتے جا رہے تھے۔ القاعدہ نے اپنا نیٹ ورک اب افغانستان سے باہر پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنے سیاسی اور عسکری شعبوں کو پہلی بار الگ الگ ونگز میں تقسیم کر دیا تھا۔ طالبان نے اپنے قابلِ اعتماد افراد کو نئی حکومت میں اہم عہدوں پر لا کر تحریکِ مزاحمت کو تحفظ دینے کی حکمت عملی اختیار کر لی تھی۔ بظاہر یہ افراد طالبان تحریک سے منحرف شمار ہوتے تھے، مگر حقیقت میں ان کے معاون تھے۔ اس حکمت عملی کے نتیجے میں طالبان حامی

کمانڈر محمد علی نذر پکتیا کا گورنر بننے میں کامیاب ہو گیا۔ طالبان کے سرپرست مولانا جلال الدین حقانی کے دست راست کمانڈر ابراہیم حقانی اپنی طویل روپوشی ختم کر کے منظر عام پر آ گئے اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ اس دوران امریکی اور اتحادی فوجوں نے کمانڈر سیف الرحمن منصور کی تلاش کے نام پر مشرقی افغانستان میں ایک بار پھر سرچ آپریشن شروع کر دیا، مگر یہ مہم بھی ناکام ثابت ہوئی۔

حامد کرزئی پر قاتلانہ حملہ: طالبان نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ حامد کرزئی کو کسی صورت میں چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ ستمبر 2002ء کے وسط میں حامد کرزئی اپنے بھائی احمد ولی کی شادی میں شرکت کے لیے قندھار آئے۔ وہ قندھار کے گورنر گل آغا کے ہمراہ گورنر ہاؤس جانے والی شاہراہ سے گزر رہے تھے کہ ان پر نامعلوم افراد نے اندھا دھند فائرنگ کر دی۔ گل آغا شدید زخمی ہو گیا۔ کئی گولیاں اس کے بازو اور گردن میں پیوست ہو گئیں۔ جبکہ کرزئی کو حیرت انگیز طور پر کوئی گزند نہ پہنچی۔ کہا جاتا ہے کہ حملہ طالبان نے کیا تھا۔

چہار طرفہ جنگ: افغانستان میں جاری یہ جنگ چہار طرفہ تھی۔

① طالبان امریکا، اتحادی افواج اور حامد کرزئی کی کٹھ پتلی حکومت کے خلاف پرچم جہاد بلند کیے ہوئے تھے۔

② اتحادی ممالک افغانستان میں اپنے لیے زیادہ سے زیادہ مفادات سمیٹنے اور کم سے کم نقصان برداشت کرنے کی کشمکش میں مبتلا تھے۔

③ کرزئی حکومت میں شامل مختلف سیاسی طبقات اور گروہ اپنے اپنے حلقے کے غلبے کے لیے دست بہ گریباں تھے۔

④ مختلف علاقوں اور قبائل کے فوجی کمانڈر اپنے اپنے علاقے کے علاوہ آس پاس کے علاقوں پر بھی قبضے کی تگ و دو میں مصروف تھے۔ ہر کمانڈر چاہتا تھا کہ نہ صرف وہ اردگرد کے سرداروں پر غالب رہے، بلکہ اس کی طاقت کا حامد کرزئی کو بھی احترام کرنا پڑے۔ کوئی جنگجو سردار خود کو حامد کرزئی سے نچلا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ غرض یہ حالات کچھ ایسے تھے کہ کرزئی کا اپنے لوگوں میں اعتماد ختم ہونے لگا تھا۔ جس کے نتیجے میں نومبر کے آغاز میں کرزئی نے چھ صوبوں کی انتظامی مشینری برطرف کر دی۔

بش کی فرعونی سوچ: 20 ستمبر 2002ء کو صدر بش نے قومی سلامتی کے حوالے سے ایک پالیسی بیان دیا جس میں کہا گیا کہ امریکا سرد جنگ کے دور کے برعکس اب کسی ملک کو اپنے اوپر عسکری فوقیت حاصل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا، بلکہ امریکا کو لاحق کسی امکانی خطرے سے بھی پوری قوت سے نمٹا جائے گا۔ امریکی صدر کا یہ پالیسی بیان واضح کر رہا تھا کہ امریکا اب افغانستان کے علاوہ دیگر خوددار اور نہ

جھکنے والے ممالک پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس دوران طالبان کے گوریلا حملے جاری تھے۔ اکتوبر کے آخری عشرے میں انہوں نے مختلف کارروائیوں میں 42/اتحادی فوجی مار ڈالے تھے۔

شمالی اتحاد کے خلاف احتجاج: ادھر شمالی اتحاد کی سخت گیری نے کابل کے شہریوں کا جینا دوبھر کر رکھا تھا۔ نومبر کے دوسرے ہفتے میں کابل یونیورسٹی کے ہزاروں طلبہ نے شمالی اتحاد کی غنڈہ گردی کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا۔ اس موقع پر پولیس کی اندھا دھند فائرنگ سے 7 طلبہ جاں بحق اور 70 زخمی ہو گئے۔ شاید جبر و جور کی حکومت انصاف مانگنے والے عوام کو یہی کچھ دے سکتی تھی۔

پاکستان کی سیاست میں تبدیلی: اکتوبر 2002ء میں پاکستان کے فوجی صدر جنرل پرویز مشرف نے عام انتخابات کا دیرینہ وعدہ پورا کیا جس میں ان کی منظورِ نظر جماعت قائد مسلم لیگ نے، سادہ اکثریت سے کامیاب ہو کر حکومت بنالی۔ ان انتخابات میں اسلام پسند جماعتوں کے اتحاد متحدہ مجلسِ عمل نے سرحد اور بلوچستان میں شاندار کامیابی حاصل کر کے نہ صرف دونوں صوبوں میں حکومتیں تشکیل دیں بلکہ قومی اسمبلی میں 60 سے زائد نشستیں حاصل کر کے ایک مضبوط اپوزیشن بھی بنالی۔ اس میں شک نہیں کہ متحدہ مجلس عمل نے پاکستانی عوام کے امریکا مخالف جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکی تسلط کے خاتمے کا نعرہ لگا کر اور اپنے انتخابی نشان کتاب کو "الکتاب" قرار دے کر میدان مار لیا تھا۔ اسی لیے مبصرین متحدہ مجلس عمل کی کامیابیوں کو طالبان کی کامیابیوں سے جوڑ رہے تھے۔

سردیوں میں گرم محاذ: دسمبر کے سرد ترین مہینے میں امریکی واتحادی افواج کے خلاف گرما گرم کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ آغازِ ماہ میں خوست ایئرپورٹ پر ایک مجاہد نے فدائی حملہ کر کے درجنوں امریکیوں کو مار ڈالا۔ دوسرے عشرے میں ننگرہار کے دیہاتیوں نے امریکی فوج کے ایک دستے پر ہلا بول دیا۔ 3 امریکی ہلاک اور 5 زخمی ہوئے۔ دیہاتی 107 امریکیوں کو درختوں سے باندھ کر بھاگ گئے۔ یہ عوام کی طرف سے امریکی سورماؤں کا روایتی استقبال تھا۔

تیسرے عشرے میں ہلمند، لوگر، پکتیا، جلال آباد اور قندھار میں ہونے والی مختلف کارروائیوں میں 91/امریکی اور اتحادی فوجی ہلاک ہوئے۔ ایک ہیلی کاپٹر بھی تباہ ہوا جس میں 30 امریکی فوجی سوار تھے۔ انہی دنوں کابل کے علاقے پل چرخی میں ایک جرمن ہیلی کاپٹر کو نشانہ بنایا گیا جس میں سوار 15 جرمن فوجی اور افسران ہلاک ہو گئے۔

دورانِ سال امریکی ایجنڈے کے تحت افغان حکومت کی طرف سے عوام کو مغربی سانچے میں ڈھالنے کے اقدامات جاری رہے۔ اس سلسلے کا اہم فیصلہ دسمبر کے اواخر میں وزیر داخلہ تاج محمد وردک

نے کیا جس میں سرکاری دفاتر میں حجاب پر پابندی عائد کردی گئی اور حکم جاری ہوا کہ آئندہ سے ملازم خواتین بے پردہ رہیں گی۔ کابل کی خواتین نے اس فیصلے کے خلاف شدید احتجاج کیا مگر بے سود۔

سن 2003ء کے اہم واقعات

ڈیڑھ سال میں 12 سو امریکی ہلاک: نئے سال کے آغاز میں برف باری کے دوران غیر ملکی افواج کی نقل وحرکت بہت محدود ہوگئی تھی۔ تاہم طالبان اس وقت زیادہ متحرک دکھائی دے رہے تھے۔ 20 جنوری 2003ء کو مزار شریف میں نامعلوم افراد کی کارروائی میں 2 امریکی قتل اور 3 شدید زخمی ہوگئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شمالی افغانستان میں بھی امریکا مخالف عناصر کی موجودگی ثابت ہوئی تھی۔ مجموعی طور پر جنوری 2003ء کے دوسرے عشرے میں ملک بھر میں امریکی فوج پر 22 حملے ہوئے جس میں 11 امریکی ہلاک اور 29 زخمی ہوئے۔

25 جنوری کو 400 افراد پر مشتمل امریکی کمانڈوز دستہ طالبان کے خلاف کارروائی کے لیے اسپین بولدک پہنچا۔ اس کے ساتھ بی باون، ایف سولہ اور سی 130 طیارے بھی تھے۔ طالبان نے اس دستے کو پہاڑوں میں گھیرلیا۔ یہاں ایک ہولناک معرکہ ہوا جس میں دست بدست لڑائی ہوئی۔ انجام کار امریکی 32 لاشیں چھوڑ کر فرار ہوگئے۔

2 فروری کو نیمروز ایرپورٹ پر القاعدہ کے ایک عرب مجاہد نے فدائی حملہ کر کے 10 امریکی ہلاک کردیے۔ امریکیوں کی جوابی کارروائی میں 5 مجاہد شہید ہوگئے۔ مارچ 2003ء میں منظر عام پر آنے والی ایک میڈیا رپورٹ میں بتایا گیا کہ اکتوبر 2001ء سے اب تک ڈیڑھ سال میں 1200 امریکیوں کی لاشیں خلیجی ممالک منتقل کی جاچکی ہیں۔ اس کے علاوہ سینکڑوں امریکی فوجی اپاہج ہوچکے ہیں۔ ان کے مقابلے میں گوریلا جنگ شروع کرنے کے بعد طالبان اور مجاہدین کا جانی نقصان بہت کم ہورہا تھا۔ شہداء کی لاشیں ان کا حوصلہ مزید بلند کردیتی تھیں جبکہ دشمن پر انہیں دیکھ کر ہیبت طاری ہوجاتی تھی۔

فروری 2003ء کے پہلے عشرے میں امریکی فوج کے افسران اور طبی ماہرین تورابوڑا کے پہاڑوں میں القاعدہ کی باقیات کی تحقیق کرنے گئے اور وہاں مدفون عرب شہداء کی لاشیں تلاش کرتے رہے۔ انہوں نے دیکھا کہ ڈیڑھ سال بعد بھی لاشوں سے تازہ خون ٹپک رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر امریکی سورماؤں پر ناقابلِ بیان دہشت طاری ہوگئی۔

عراق پر امریکی یلغار: 2002ء کے دوران امریکا کو افغانستان کی مہم جوئی سے مطلوبہ نتائج کا حصول

بعید نظر آنے لگا تھا اس لیے صدر بش نے پہلے سے طے شدہ عراق پر قبضہ کرنے کے منصوبے کی جلد تکمیل کا فیصلہ کرلیا۔ اب عراق کو زیادہ شد و مد سے دہشت گرد ملک مشہور کیا جانے لگا۔ صدام حسین پر ممنوع کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری کے الزامات عائد کیے گئے۔ اگرچہ اقوام متحدہ کی ٹیم نے معاینے کے بعد ان الزامات کی تردید کردی تھی مگر صدر بش نے تیل کے ذخائر غصب کرنے کے لیے شروع کیے گئے محاذ کو وادی فرات تک پھیلانے کا تہیہ کرلیا تھا۔ امریکی منصوبہ سازوں کو اُمید تھی کہ افغانستان کی بہ نسبت عراق پر قبضہ آسان ہوگا اور وہاں سے فوری طور پر وافر مقدار میں تیل ہتھیایا جاسکے گا۔

چنانچہ 18/ مارچ 2003ء کو امریکا نے اپنے اتحادیوں کے ساتھ عراق پر حملہ کردیا اور کارپٹ بمباری کے ذریعے بغداد اور دوسرے شہروں کو تباہ و برباد کرنے کے بعد آخر کار یہاں قبضہ کرنے میں بھی کامیاب ہوگیا، اس طرح صدر صدام حسین کی حکومت ختم ہوگئی۔ افغانستان پر عراق کی جنگ کے گہرے اثرات پڑے۔ یہاں کے عوام کے لیے یہ سمجھنا آسان ہوگیا کہ امریکا کی جنگ کسی ایک ملک کے خلاف نہیں بلکہ وہ پورے عالمِ اسلام کو یرغمال بنانے کے جنون میں مبتلا ہے۔ اس سوچ کے نتیجے میں فطری طور پر طالبان کی حمایت اور امریکا کی کٹھ پتلی کرزئی حکومت کی مخالفت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس جنگ سے القاعدہ کو بھی اپنا نیٹ ورک عرب ممالک میں پھیلانے کا زبردست موقع ملا۔ القاعدہ کے سینکڑوں تربیت یافتہ جوان افغانستان سے نکل کر ایران کے راستے عراق پہنچ گئے۔ ایران میں عرب قبائل کی آبادیاں ایک پٹی کی شکل میں عراق تک چلی گئی ہیں۔ القاعدہ کے مجاہد انہی بستیوں سے گزرتے ہوئے عراق پہنچ جاتے تھے۔ شیخ اسامہ کے معتمد رفقاء جن میں الزرقاوی کا نام سب سے مشہور ہے، عراق میں مقامی نوجوانوں کو تربیت دے کر بہت جلد یہاں امریکیوں کے خلاف بھرپور جہاد کا آغاز کرنے میں کامیاب ہوگئے اور یوں امریکا افغانستان کے ساتھ ساتھ عراق میں بھی سخت ترین مزاحمت کا سامنا کرنے لگا۔

کرزئی کے عہدے داروں کا طالبان سے رابطہ: 2003ء کے موسم بہار کے آغاز میں کرزئی حکومت کے لیے طالبان کے حملوں کا خطرہ بڑھ گیا۔ چند ہفتوں پہلے پختون قبائل نے بھی کرزئی کے خلاف اعلانِ بغاوت کرتے ہوئے پکتیا اور خوست کی شاہراہیں مسدود کر کے حکومت کے لیے سخت مشکلات پیدا کردی تھیں۔ ایسے میں انتظامیہ کے ہر افسر کو اپنی جان کا خوف لاحق ہوگیا تھا۔ اپریل 2003ء کے دوران نوبت یہاں تک آپہنچی کہ طالبان کو اعلیٰ حکومتی افسران کی طرف سے باقاعدہ خفیہ پیغامات ملنے لگے کہ وہ جان کی امان کے بدلے ان کا ہر مطالبہ ماننے کے لیے تیار ہیں۔ اس طرح کئی صوبوں میں طالبان کو امریکی اور اتحادی افواج سے لڑنے کے لیے یکسوئی نصیب ہوگئی۔

افغانستان میں انسانی حقوق کی پامالی: سال کے دوران افغانستان میں امریکا کی جانب سے انسانی حقوق کی پامالی کی خبریں میڈیا پر آتی رہیں۔ مئی کے آغاز میں یہ رپورٹ سامنے آئی کہ امریکا پوست کی فصل تلف کرنے کی آڑ میں طیاروں کے ذریعے زہریلے کیمیائی مواد کی بارش کر کے افغانوں کی نسل کشی کر رہا ہے۔ اس عمل کے نتیجے میں چند دنوں کے اندر 33 بچے، 11 خواتین اور 3 کسان جاں بحق ہو گئے تھے۔ جون میں افغانستان میں سرگرم 80 رفاہی اداروں نے اقوام متحدہ کو ایک کھلے خط میں ملک کی ناقابلِ بیان صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ بدامنی کے باعث لوگ طالبان کے دور کو یاد کر رہے ہیں۔ یہ خود دشمن کے گھر سے اہلِ حق کی سچائی اور اخلاقی برتری کی گواہی تھی۔

افغانستان میں بھارت کا اثر ورسوخ: افغانستان اس وقت جن قوتوں کی ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بن چکا تھا، ان میں بھارت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بھارت کے شمالی اتحاد سے گہرے روابط تھے اور طالبان سے نفرت اور پاکستان دشمنی دونوں کا مشترکہ منشور تھی۔ اس تعلق اور اعتماد کے نتیجے میں مئی کے دوسرے ہفتے میں شمالی اتحاد نے 89 اضلاع میں پائی جانے والی 24 اقسام کی معدنیات کے بے بہا ذخائر بھارتی ماہرین کے لیے چوپٹ کھول دیے۔ ماہرین کے مطابق قحط زدہ افغانستان میں 84 ملین ٹن کوئلہ، 120 ارب مکعب میٹر گیس، 108 ارب ٹن لوہا اور 4 ملین ٹن جست موجود ہے۔ اس کے علاوہ بدخشاں اور پنج شیر میں یاقوت، زمرد اور لاجورد کی بڑی بڑی کانیں ہیں۔ شمالی اتحاد کی نظر کرم سے بھارت کو افغانوں کی اس قومی دولت پر تسلط حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔

شمالی اتحاد کو بدلے میں بھارت سے جو مراعات درکار تھیں، بھارت نے ان کی قسط بھی جاری کر دی اور جون 2003ء کے آغاز میں 94 ملین ڈالر کی امداد افغان حکومت کو دے دی۔

ملک کا نیا آئین: امریکا کے اشارے پر کرزئی حکومت گزشتہ ایک سال سے نیا آئین تیار کرنے میں مصروف تھی۔ آخر کار جون 2003ء کے دوسرے ہفتے کے دوران ملک کے نئے آئین کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ آئین 22 صفحات، 9 ابواب اور 110 شقوں پر مشتمل تھا۔ سابقہ آئین کی اسلامی شقیں حذف کر دی گئی تھیں۔ فقہ حنفی کو خارج کر دیا گیا تھا۔ فارسی کو قومی زبان قرار دے دیا گیا تھا۔ مقننہ کمیٹی کے تقریباً تمام افراد یورپ اور امریکا کی شہریت رکھنے والے افغان تھے، ان میں تین خواتین بھی شامل تھیں۔

دہشت گردوں سے مذاکرات؟ جس وقت یہ آئین منظور کیا جا رہا تھا، گردیز کے علاقے شاہی کوٹ میں امریکی اور اتحادی افواج 50 ہیلی کاپٹروں اور درجنوں بکتر بند گاڑیوں کے ساتھ طالبان کے خلاف ایک بڑے آپریشن میں مصروف تھیں۔ تاہم انہیں مکمل ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس معرکے میں 56

صلیبی ہلاک ہوئے۔ اس معرکے میں ناکامی کے بعد امریکا نے طالبان کو تقسیم کرنے کی سازشیں تیز کردیں۔ جون کے آخری عشرے میں طالبان کے سرپرست اور مشرقی صوبوں کے مجاہد کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی کو امریکا کی طرف سے مذاکرات اور صلح جوئی کی پیش کش کی گئی مگر عظیم مجاہد راہنما نے یہ پیش کش ٹھکرادی اور جواب دیا: ''دہشت گردوں سے مذاکرات کا کیا مطلب۔''

جنرل ڈیوس کا اعتراف: جولائی کے آخری عشرے میں طالبان سربراہ ملا محمد عمر نے حامد کرزئی کو ایک تحریری پیغام میں دھمکی دی کہ طالبان اپنی کارروائیاں مزید تیز کریں گے۔ اس پیغام کے فوراً بعد ملک کے مختلف حصوں میں کئی کارروائیوں میں 67 / امریکی اور اتحادی سپاہی ہلاک کردیے گئے۔ کارروائیوں کا زیادہ زور جنوبی افغانستان میں تھا۔ امریکی کرنل جنرل ڈیوس نے انہی دنوں میڈیا کو بیان دیتے ہوئے یہ اعتراف کیا کہ طالبان جنوبی افغانستان سے کسی کو گزرنے نہیں دیتے۔

افغان حکومت کی پاکستانی قبائل کے لیے مراعات: حامد کرزئی پاکستانی مخالف ذہن رکھنے کی وجہ سے یہ سمجھتے تھے کہ افغانستان میں طالبان کی کامیاب کارروائیوں کے پیچھے آئی ایس آئی کا ہاتھ ہے۔ چنانچہ بھارت کے مشورے پر کرزئی نے پاکستان کے سرحدی قبائل کو اپنے ساتھ ملانے کی کوششوں کا تدریجاً آغاز کردیا۔ یہ گویا آئی ایس آئی کی کارروائیوں کا انتقام تھا۔ حامد کرزئی نے پاک افغان سرحدوں پر آباد قبائل کو ایک قرار دیا اور ڈیورنڈ لائن کے خاتمے کے مسئلے کو ازسرنو اُٹھایا۔ جولائی 2003ء کے اواخر میں افغان حکومت نے ڈیورنڈ لائن کے دونوں طرف آباد قبائل کے لیے افغان شناختی کارڈ کے اجرا، تعلیمی سہولیات اور راشن کی فراہمی سمیت کئی پُرکشش مراعات کا اعلان کردیا۔

نیٹو افغانستان میں: امریکا افغانستان کی مہم میں پیش آنے والی دشواریوں سے اُکتاتا جارہا تھا۔ اس نے نئی حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے ''نیٹو'' کی افواج کو آگے لانے کا فیصلہ کرلیا۔ ''نیٹو'' یا نارتھ اٹلانٹک ٹریٹی آرگنائزیشن، امریکا، کینیڈا اور کئی یورپی ممالک کا عسکری اتحاد ہے جو 1949ء میں وجود میں آیا۔ ابتدائً اس میں 12 / ممالک شامل تھے، تدریجاً ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس وقت نیٹو کے ممبر ممالک کی تعداد 26 ہے۔ اس میں شامل اہم یورپی ممالک فرانس، بلجیم، ڈنمارک، جرمنی، ہنگری، بلغاریہ، برطانیہ، اٹلی، آئس لینڈ، لکسمبرگ، نیوی لینڈ، ناروے، پرتگال، اسپین، یونان، پولینڈ اور ترکی ہیں۔ ان کے علاوہ اسٹونیا، چیک ری پبلک، لیتھونیا، رومانیا، سلواکیا، سلووینیا اور لیوینیا بھی اس کے رکن ہیں۔ امریکا اور کینیڈا کو ملا کر یہ تعداد 26 ہوجاتی ہے۔ طے ہوا کہ نیٹو ممالک کے فوجی دستے اگست 2003ء میں کابل آکر بین الاقوامی سیکیورٹی فورسز کی کمان سنبھال لیں گے۔ طالبان نے بھی نیٹو کا

استقبال کرنے کی تیاریاں کرلی تھیں۔ نیٹو افواج کی افغانستان میں تعیناتی کے تین مقاصد بتائے جارہے تھے:

① حامد کرزئی کی حکومت کو تحفظ دینا۔

② کرزئی حکومت کے مخالفین یعنی طالبان کا خاتمہ کرنا۔

③ افغانستان کی تعمیر نو کا فریضہ انجام دینا۔

اگست سے لے کر نومبر تک طالبان کی کارروائیوں میں غیر معمولی شدت رہی کیونکہ اگست کے دوسرے عشرے میں نیٹو کے دستے افغانستان وارد ہوئے تھے مگر تعیناتی کے پہلے ہی ہفتے میں ان کے 208 فوجی مختلف کارروائیوں میں مارے گئے۔ یہ کارروائیاں ارزگان، ہلمند، پکتیا، پکتیکا، گردیز، جلال آباد، ارگون اور غزنی میں ہوئی تھیں۔ اگست کے آخری عشرے میں 11 امریکی اور 79 اتحادی سپاہی ہلاک ہوئے جس کے بعد نیٹو کی ہائی کمان نے اعتراف کیا کہ طالبان کا مقابلہ آسان نہیں۔

<u>طالبان کی کامیابیاں:</u> ستمبر 2003ء تک امریکی فوج پر دباؤ اتنا بڑھ گیا کہ 11 ہزار امریکی سپاہیوں نے وطن واپسی کا مطالبہ کردیا۔ مسلسل معرکوں اور جانی نقصان سے ان کے اعصاب شل ہوگئے تھے۔ میڈیا رپورٹوں کے مطابق 45 امریکی فوجی خودکشی کرچکے تھے جبکہ 350 نفسیاتی مریض بن کر زیر علاج تھے۔

برف باری تک طالبان نے اپنی کارروائیوں کی رفتار برقرار رکھی۔ اکتوبر کے پہلے عشرے میں مختلف کارروائیوں میں 123 اتحادی ہلاک ہوئے۔ طالبان کو ایک کامیابی یہ حاصل ہوئی کہ ان کے 41 قیدی سرنگ بنا کر قندھار جیل سے فرار ہوگئے۔ نومبر کے پہلے عشرے میں 103 اتحادی ہلاک ہوئے۔ یہ کارروائیاں کابل، پکتیا، ننگرہار اور کنڑ میں ہوئی تھیں۔ ان علاقوں میں حزب اسلامی بھی کارروائیوں میں بھرپور حصہ لے رہی تھی۔

<u>کرزئی حکومت کی بے بسی:</u> موسم سرما شروع ہونے تک طالبان نے جنوبی افغانستان کو بقیہ ملک سے کاٹ دیا تھا۔ یہاں اکثر صوبوں اور اضلاع میں ان کا حکم چلنے لگا تھا۔ طالبان سربراہ نے شرعی قوانین نافذ کردیے تھے۔ کرزئی انتظامیہ کے افسران یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے مگر ان کا طالبان پر بس نہیں چلتا تھا۔ اس لیے وہ چپ چاپ تھے۔ خود کابل میں کرزئی کے اختیارات کم سے کم ہوتے چلے جارہے تھے۔ شمالی اتحاد نے اپنے حکمران کو نہ صرف ٹی وی پروگراموں بلکہ سرکاری تقاریب تک میں شرکت سے روک دیا تھا۔ جنرل فہیم، برہان الدین ربانی، پروفیسر سیاف اور اسماعیل توروں کرزئی کے خلاف متحد ہوگئے تھے۔

<u>کابل میں امریکن یونیورسٹی:</u> افغانستان میں دوررس تبدیلیاں لانے کے لیے امریکا نے دسمبر

2003ء میں ''امریکن یونیورسٹی'' کے قیام کے منصوبے پر عملدرآمد شروع کردیا۔ 35/ایکڑ رقبے پر محیط یونیورسٹی میں داخلہ فیس 5 ہزار ڈالر مقرر ہوئی۔ طے ہوا کہ تمام اساتذہ غیر ملکی ہوں گے اور غیر پشتون طلبہ کو داخلے میں زیادہ کوٹہ دیا جائے گا۔ درحقیقت یہ یونیورسٹی افغانوں کی نسلِ نو میں امریکا کے تازہ دم نظریاتی وفادار پیدا کرنے کے لیے بنائی جارہی تھی۔

2004ء کے معرکے

ماڈرن دینی مدارس: کابل میں امریکن یونیورسٹی کے منصوبے کے آغاز کے ساتھ ساتھ امریکا نے جنوری 2004ء میں افغانستان میں 200 نئے دینی مدارس کھولنے کا فیصلہ بنالیا۔ طے کیا گیا کہ غیر ملکی اداروں سے سند لینے والے لبرل اساتذہ اور مستشرقین کے ذریعے افغان طلبہ کو قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ اسلام، تفسیر، عربی لغت، عربی ادب، انشاء اور تقابلِ ادیان کی تعلیم دی جائے گی۔ طلبہ کو وہ تمام سہولیات مفت فراہم کی جائیں گی جو پاک وہند اور افغانستان کے روایتی دینی مدارس میں مفت ملتی ہیں۔ یعنی کھانا، رہائش، تعلیم اور علاج معالجہ۔

اس منصوبے کو کامیاب کرنے کے لیے امریکا نے اسی ماہ افغانستان کے تمام دینی مدارس اور یتیم خانے بند کرانے کا حکم جاری کرکے اس پر جبراً عمل کرانا شروع کردیا۔ کنڑ کے جامعہ دارالندوہ اور جامعہ امام بخاری کو امریکی فوج نے خود جاکر بند کروایا اور 950 طلبہ کو بے دخل کردیا۔

امریکا کا ایک اور منصوبہ افغانستان میں قومی فوج کا قیام تھا تاکہ لڑائیوں میں زیادہ سے زیادہ جانی نقصان افغانوں ہی کا ہو۔ امریکا 9 ہزار مقامی افراد کو 50 ڈالر ماہانہ تنخواہ کا لالچ دے کر فوجی تربیت دے رہا تھا۔ تربیت کے بعد فوجی خدمات شروع کرنے کے بعد 70 ڈالر تنخواہ طے تھی۔ تاہم جنوری 2004ء میں تربیت حاصل کرنے والوں میں سے 3 ہزار افراد فرار ہوگئے جس سے اس منصوبے کی مکمل کامیابی کے امکانات مخدوش ہوگئے۔ اسی طرح دینی مدارس کا منصوبہ بھی ناکامی سے دوچار ہوا۔ اسی قسم کا ایک منصوبہ امریکا کی خوشنودی کے لیے پرویز مشرف حکومت نے پاکستان میں متعارف کرایا جسے ''ماڈل دینی مدارس'' کا نام دیا گیا۔ مگر پاکستان میں بھی امریکا کی یہ سازش مکمل طور پر ناکامی سے دوچار ہوئی۔

حکمت یار کا بیان: فروری 2004ء میں طالبان اور حزب اسلامی کے تعلقات میں مزید پختگی محسوس کی گئی۔ گلبدین حکمت یار نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ وہ ملا محمد عمر کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ انہوں نے کہا:

''ہمیں ماضی کے تلخ تجربات سے سبق سیکھنا ہوگا۔ اگر ہم نے اتحاد نہ کیا تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔''

اس بیان کے بعد طالبان اور حزب اسلامی کے حملوں میں مزید شدت دکھائی دینے لگی۔ فروری کے اواخر میں کنڑ میں 15 امریکی اور 80 اتحادی فوجی ہلاک ہوئے۔ موسم بہار شروع ہوتے ہی امریکا نے 6/ ہزار مزید فوجی افغانستان بھیج دیے جنھوں نے اسامہ بن لادن کی تلاش میں نیا آپریشن شروع کر دیا۔ ادھر ملا محمد عمر نے جنوبی صوبوں میں نامور طالبان کمانڈر ملا داد اللہ کو امریکی و اتحادی افواج پر طوفانی حملوں کا ہدف دے دیا۔ ملا داد اللہ نے مارچ کے دوسرے عشرے کے دوران قندھار کے نواحی علاقے ''میوند'' میں ایک خونریز جنگ لڑ کر 15/ اتحادیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اس ہفتے مجموعی طور پر 61/ امریکی اور اتحادی ہلاک اور 151 زخمی ہوئے۔ امریکیوں پر اتنا خوف سوار ہوا کہ ان کے ایک ہزار فوجی خوست چھاؤنی سے بھاگ کر کابل چلے گئے۔ طالبان کی دہشت کے علاوہ وہ ہیضے کے وبائی مرض کا شکار بھی ہو چکے تھے۔

<u>وانا آپریشن اور کمانڈر نیک محمد</u>: اس خطے میں امریکی منصوبوں کا ایک حصہ پاکستان کو تقسیم کرنا بھی تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پاکستانی فوج اور عوام کو لڑایا جائے۔ دینی مدارس کے طلبہ اور اسلام پسندوں کو فوج کے ہاتھوں مروایا جائے اور سرحدی قبائل کو بغاوت پر آمادہ کر کے ملک کو خانہ جنگی میں جلا کر دیا جائے۔ اس منصوبے پر عمل کا آغاز 2004ء کے آغاز کے ساتھ ہی ہو چکا تھا۔ ان دنوں پاکستان کے شمال مغربی سرحدی علاقوں خصوصاً جنوبی وزیرستان میں امن وامان کی صورتِ حال مخدوش ہوتی جا رہی تھی۔ پاکستانی فوج امریکا کے دباؤ پر بعض سرداروں کی عسکری طاقت کچلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ امریکا کا کہنا تھا کہ ان جنگجو سرداروں نے طالبان کو پناہ دینے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے جس سے امریکی فوج کو سخت تشویش لاحق ہے۔

امریکا نے وانا کے علاقے کو ان سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا تھا اور نیک محمد نامی ایک مقامی کمانڈر کو گرفتار کرنے پر زور دیا تھا۔ نیک محمد کی اس علاقے میں خاصی اہمیت تھی۔ اسے گرفتار کرنا آسان نہیں تھا۔ مقامی آبادی کے بے پناہ جانی ومالی نقصانات اور سینکڑوں فوجیوں کے کام آجانے کے بعد آخر کار موسمِ بہار میں حکومت پاکستان اور قبائلی کمانڈروں میں صلح نامہ ہو گیا کیونکہ حکومت پاکستان نے ان عواقب کو محسوس کر لیا تھا جو مزید خونریزی سے پیدا ہو سکتے تھے۔

مگر موسم گرما میں 23 جون 2004ء کو کمانڈر نیک محمد کو گائیڈڈ میزائل کا نشانہ بنا کر راستے سے ہٹا دیا

گیا۔اس کے بعد جنوبی وزیرستان میں ایک بار پھر حالات بگڑ گئے۔وقفے وقفے سے وہاں فوج کا آپریشن جاری رہا۔

افغان فوج کو خنزیر کا گوشت: افغانستان میں امریکی فوج کی زیادتیاں جاری تھیں۔میڈیا پر خبریں آرہی تھیں کہ امریکا افغان فوج کو خنزیر کا گوشت کھانے پر مجبور کر رہا ہے۔امریکی اعلیٰ افسران کا کہنا تھا کہ جو افغان سپاہی اتنا پکا مسلمان ہو کہ شراب، زنا اور دوسرے حرام کاموں سے دور بھاگتا ہو، وہ فوج کی ملازمت کے قابل نہیں ہوسکتا۔امریکی افغان عوام کو مخرب اخلاق لٹریچر، عریاں تصاویر اور فحش مواد کی سی ڈیز بھی مفت دے رہے تھے تاکہ یہ لوگ اپنے دین وایمان اور اسلامی تشخص سے محروم ہو جائیں۔

جون 2004ء کے اواخر میں ایک دن امریکی فوجی تلاشی کے بہانے بوٹوں سمیت کابل کی مسجد وزیر اکبر خان میں گھس گئے۔اس سے قبل وہ وزارتِ داخلہ اور صدارتی محل کے احاطوں میں تعمیر شدہ مساجد کی بھی اسی انداز میں بے حرمتی کر چکے تھے۔اس قسم کے واقعات سے امریکا مسلمانون کو دہشت زدہ مایوس اور ماؤف العقل بنا دینا چاہتا تھا، مگر افغان عوام ردِعمل کے طور پر امریکا کی مخالفت میں اور جری ہوتے گئے۔تحریک طالبان کو نئے رضا کار ملتے گئے۔

اگست کے آغاز میں طالبان نے ایک کارروائی میں امریکی چنیوک ہیلی کاپٹر مار گرایا۔17ر امریکیوں سمیت 46 فوجی ہلاک ہوگئے۔واقعے کے بعد طالبان ترجمان ملا عبداللطیف حکیمی نے ویب سائٹ پر پیغام نشر کیا کہ ”تباہی امریکا کا مقدر ہے۔“

یہ بات یقینی تھی کہ طالبان میزائل ٹیکنالوجی حاصل کر چکے تھے جس کی مدد سے وہ امریکی ہیلی کاپٹروں کو کامیاب سے گرا رہے تھے اور کبھی کبھار کوئی طیارہ بھی ان کی زد میں آجاتا تھا۔اگست کے دوسرے ہفتے میں خوست، غزنی اور زابل میں طالبان کے حملوں میں 113ر اتحادی مارے گئے۔سنگئی میں طالبان نے میزائل فائر کر کے ایک ہیلی کاپٹر تباہ کر دیا، اس کے علاوہ مختلف علاقوں میں کئی کارروائیوں میں 56ر امریکی ہلاک کر دیے گئے۔

طالبان کی شرعی عدالتیں: 2004ء کے موسم گرما کے دوران طالبان اتنی قوت حاصل کر چکے تھے کہ 8 صوبوں زابل، ہلمند، ارزگان، پکتیکا، پکتیا، خوست اور کنڑ میں ان کی شرعی عدالتوں نے کام شروع کر دیا تھا۔عوام کو مقامی کمانڈروں اور کرزئی حکومتوں کے اہلکاروں سے انصاف نہیں ملتا تھا اس لیے وہ طالبان کی شرعی عدالتوں کی طرف جوق در جوق رجوع کر رہے تھے۔موسم سرما میں طالبان کی ہیبت کابل کے گردونواح تک پھیل چکی تھی۔چنانچہ نومبر 2004ء شروع ہوتے ہی 300 امریکی فوجی لغمان

کو غیر محفوظ تصور کرتے ہوئے قندھار منتقل ہو گئے۔ طالبان کو شمالی اتحاد نے بھی اب بادل نخواستہ ایک موثر قوت کے طور پر مان لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نومبر کے دوسرے عشرے میں افغان وزیر دفاع جنرل فہیم نے طالبان کے ساتھ اتحاد بنا کر اپنے مخالفین کو بگرام اور سلانگ سرنگ سے ہٹانے کا منصوبہ بنایا مگر طالبان نے جنرل فہیم کی دعوت صلح کو ٹھکرا دیا اور جواباً کہا کہ ہم غدار ملت سے اتحاد نہیں کر سکتے۔

صدارتی الیکشن: 2004ء کا ایک اہم قضیہ اکتوبر میں ہونے والے افغانستان کے صدارتی انتخابات تھے۔ ملک کی تاریخ میں پہلی بار صدر کے عہدے کے لیے الیکشن لڑا جا رہا تھا۔ حامد کرزئی کو تا حال امریکا کی پوری سرپرستی حاصل تھی اس لیے مخالف دھڑوں کے افراد آسانی سے خریدے گئے تھے۔ الیکشن کے دوران طالبان نے اپنی کارروائیاں زیادہ تیز کر دی تھیں اس لیے پولنگ اسٹیشنوں پر گہما گہمی کم رہی تھی۔ ویسے بھی افغان عوام جانتے تھے کہ ان انتخابات کی حیثیت ایک ڈرامے سے زیادہ نہیں جس کا ہدایت کار امریکا ہے۔ میڈیا رپورٹوں کے مطابق الیکشن کے آخری ہفتے میں طالبان نے مختلف کارروائیوں میں 108 امریکی واتحادی سپاہی موت کے گھاٹ اُتارے تھے۔ اکتوبر میں ہونے والی سب سے بڑی کارروائی کابل میں کی گئی۔ 23/ اکتوبر 2004ء کو کابل میں ایک خودکش بمبار نے حملہ کر کے نیٹو افواج کے کمانڈر کو ہلاک کر دیا۔ دھماکے کی زد میں آکر مزید 9 غیر ملکی اور افغان فوجی بھی مارے گئے۔

11 ستمبر کے حملے کا اعتراف: اس دوران امریکا میں بھی صدارتی انتخابات کا دنگل پورے زور و شور سے برپا رہا۔ جارج واکر بش کا مقابلہ سخت جان حریف جان کیری سے تھا۔ انتخابات کی تاریخ 2 نومبر مقرر تھی۔ پولنگ سے چار دن قبل 29/ اکتوبر 2004ء کو الجزیرہ نے القاعدہ کے سربراہ اسامہ بن لادن کی نئی ویڈیو ٹیپ جاری کی جس میں شیخ اسامہ نے امریکی عوام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"2001ء سے آج تک امریکی صدر نے امریکیوں کو گمراہ کیا ہے۔"

القاعدہ سربراہ نے اس ویڈیو ٹیپ میں یہ اعلان کر کے دنیا کو حیران کر دیا کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ القاعدہ ہی نے کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اگر امریکا دنیا میں ظلم وستم ڈھانے سے باز نہ آیا تو ہم گیارہ ستمبر 2001ء کی یاد دوبارہ تازہ کر سکتے ہیں۔ 2 نومبر کے انتخابات کے نتائج میں صدر بش کو جان کیری پر برتری حاصل رہی اور بش نے مزید 4 سال کے لیے صدارتی کرسی سنبھال لی۔ اگلے دن 3 نومبر 2004ء کو افغانستان کے صدارتی انتخابات کے نتائج کا اعلان بھی ہو گیا جس کے مطابق حامد کرزئی نے 55 فیصد سے زائد ووٹ حاصل کر کے معرکہ جیت لیا تھا۔ غیر ملکی مبصرین نے الیکشن کو صاف وشفاف اور نتائج کو غیر جانبدارانہ قرار دیا تاہم جو حقیقت تھی وہ سبھی کو معلوم تھی۔

حامد کرزئی، افغان صدر: 7 دسمبر 2004ء کو حامد کرزئی نے پانچ سال کی مدت کے لیے افغانستان کے صدر کی حیثیت سے اقتدار سنبھال لیا۔ حکومت کی جانب سے عوام کو یہ ڈرامہ چپ چاپ دیکھنے کا پابند کیا گیا تھا۔ ملکی میڈیا مکمل طور پر پابندِ سلاسل تھا۔ ایک افغان شاعر غلام رسول خوش بخت نے صدارتی الیکشن کی ''شفافیت'' پر ایک طنزیہ نظم لکھ دی تھی جس پر اس کا چین و آرام دوبھر کر دیا گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ 20 فروری 2005ء کو اسے القاعدہ کا وفادار قرار دے کر گرفتار کر لیا گیا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے افغانستان میں امریکا کے زیرِ سایہ جمہوریت کس حد تک عوامی اُمنگوں کی ترجمان اور ان کے حقوق کی پاسدار تھی؟

حقیقت یہ تھی کہ امریکی حکام افغانستان میں کسی کو بھی القاعدہ سے تعلق کے شبہے میں گرفتار کر لیے تھے۔ 13 اگست کو قندھار کی ایک مسجد سے 27 رکنی تبلیغی جماعت کو بھی اس الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ ملا عبدالسلام ضعیف نے اپنی داستانِ اسارت میں لکھا ہے کہ گوانتانامو بے کے افغان قیدیوں میں موچی، لوہار، چرواہے، صحافی، صراف، دکان دار، ائمہ مساجد حتیٰ کہ امریکا کے اپنے ترجمان تک شامل ہیں۔

امریکیوں کا قبرستان: دوبارہ منتخب ہونے والے امریکی صدر بش کو الیکشن میں کامیابی کے بعد 2004ء خوشگوار سال محسوس ہو رہا تھا مگر اس میں شک نہیں کہ امریکا کے لیے یہ سال بہت برا ثابت ہوا۔ وہ افغانستان اور عراق دونوں جگہ پٹ رہا تھا۔ مغربی صحافیوں نے انکشاف کیا تھا کہ جرمنی کے جنوب مغرب میں قائم امریکی فوجی ہسپتال کے ریکارڈ کے مطابق وہاں افغانستان اور عراق سے 18 ہزار زخمی امریکیوں کو لایا جا چکا ہے۔ ان میں سے ساڑھے 5 ہزار ذہنی مریض، 800 بالکل پاگل، 200 اندھے اور 120 لنگڑے لولے ہیں۔ صحافیوں کو یہ معلومات جون 2004ء میں خود لینڈ تھل میڈیکل سینٹر کے سربراہ لیفٹیننٹ کرنل رونلڈ پیلس نے مہیا کی تھیں۔

دسمبر میں امریکی فوجی اخبار Star and Stripes نے انکشاف کیا کہ جرمنی کے ہسپتال میں عراق اور افغانستان سے لائے جانے والے زخمیوں کی تعداد 24 ہزار تک پہنچ چکی ہے گویا صرف 6 ماہ میں 6 ہزار امریکی مزید زخمی ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امریکا اور اتحادیوں کے نقصانات کس حد کو چھو رہے تھے اور مغربی حکومتیں کس طرح غلط اعداد و شمار کے ذریعے اپنی عسکری تباہی کو چھپا رہی تھیں۔

صدر بش کی دوبارہ کامیابی کے بعد یہ امکانات مزید پختہ ہو گئے تھے کہ تیل کے عالمی بیوپاریوں کا ٹولہ عراق اور افغانستان کی جنگ میں مزید ایندھن جھونکنے پر تلا رہے گا اور ہزاروں لاکھوں انسان اس آگ میں جھلستے رہیں گے؟ یہ انہی پالیسیوں کا تسلسل تھا کہ صدارتی انتخابات میں بش کی کامیابی کے فوراً

بعد امریکی حکام نے ہرات کے مضافات میں 700 ایکڑ پر مشتمل وسط ایشیا کے سب سے بڑی عسکری اڈے کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ یہ اڈہ ایرانی سرحد سے صرف 45 کلومیٹر دور تھا جبکہ وسط ایشیا کی سرحدیں بھی نزدیک تھیں۔ مبصرین کا کہنا تھا کہ امریکا اس اڈے سے بیک وقت وسط ایشیا، افغانستان اور ایران کو کنٹرول کرنا چاہتا ہے۔

امریکی طیاروں کا شکار: صدر بش کی نئی امنگوں اور امریکا کی ان نت نئی منصوبہ بندیوں اور سازشوں کے باوجود طالبان کے حملے کم ہونے میں نہ آئے۔ دسمبر کی کڑکتی سردی میں وہ کابل کے اردگرد متحرک رہے۔ کابل کے قریب پرواز کرتا ایک امریکی جاسوسی طیارہ دسمبر کے پہلے ہفتے میں ان کا نشانہ بن گیا۔ اس کے فوراً بعد کوہِ ہندوکش پر محوِ پرواز ایک امریکی فوجی طیارہ ان کا شکار بنا جس میں سوار 27 مغربی ہلاک ہو گئے۔

ماخذ و مراجع

- ...... ہفت روزہ ضرب مؤمن، جلد 7، 8
- ...... ہفت روزہ تکبیر، فرائڈے اسپیشل، غازی: جلد 2003ء، 2004ء
- ...... قومی اخبارات۔ امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور ہفت روزہ جرائد 2003ء، 2004ء
- ...... روزنامہ اسلام کراچی 2003ء، 2004ء

اڑتیسواں باب

معرکۂ فنا و بقا

2005ء

تحریکِ مزاحمت میں پھوٹ ڈالنے کی کوششیں: 2005ء کے آغاز میں کرزئی حکومت، تحریکِ مزاحمت کے مختلف گروپوں کو امتیازی برتاؤ کے ذریعے الگ الگ کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آئی۔ حامد کرزئی نے 100 انتہائی مطلوب افراد کی فہرست سے گلبدین حکمت یار کا نام نکلوا کر حزب اسلامی کے لیے نرم گوشہ رکھنے کا اشارہ دیا۔ انہی دنوں افغان وزیر داخلہ احمد جلالی نے اعلان کیا کہ عرب مجاہدین گرفتاری دے دیں، ان پر افغان قوانین کے تحت مقدمات چلائے جائیں گے، انہیں امریکا کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کی کہ یہ رعایت اسامہ اور ان کے قریبی ساتھیوں کے لیے نہیں ہوگی۔ جنوری کے اواخر میں کرزئی نے جنرل قاسم فہیم سے سرکاری مراعات واپس لے لیں جن میں سرکاری رہائش اور 92 جریب زمین شامل تھی۔ جنرل فہیم کے حامد کرزئی سے اختلافات بہت بڑھ گئے تھے جس کی وجہ سے افغان صدر نے یہ تادیبی کارروائی کی۔

افغان طیارے کی تباہی: جمعرات 3 فروری 2005ء کو افغان ایرلائن کا ایک مسافر طیارہ ہرات سے کابل جاتے ہوئے خراب موسم کی وجہ سے ایرپورٹ پر نہ اُتر سکا اور سہ پہر کے وقت لاپتا ہو گیا۔ اگلے دن طیارے کی تباہی کی خبر ملی۔ اس میں سوار 104 افراد ہلاک ہو چکے تھے جن میں 4 امریکی شہری، 6 روسی، نیٹو کے 4 اعلیٰ عہدے دار، 6 ترک انجینئر اور ایک اطالوی باشندہ بھی شامل تھے۔ اتحادی افواج کے لیے یہ ایک بڑا دھچکا تھا۔ اسی ہفتے 5 ہزار افغان فوجی 20 ہفتے کی تربیت مکمل کر کے فرار ہو گئے۔ کرزئی حکومت نے 2007ء تک 45 ہزار فوجی تیار کرنے کا ہدف طے کیا تھا مگر اس قسم کے واقعات کی وجہ سے یہ ہدف پورا ہونا مشکل نظر آ رہا تھا۔ 12 فروری 2005ء کو ترکی نے افغانستان میں نیٹو فورسز کی کمان سنبھال لی۔ جنرل ایتھم اردواغی کو نیا انچارج مقرر کیا گیا۔

افغانستان کی پہلی خاتون گورنر: 14 فروری 2005ء کو افغانستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک خاتون کو گورنر کا عہدہ دیا گیا۔ صدر حامد کرزئی نے نجیب اللہ کی حکومت میں شامل ایک وزیر کی بیوی حبیبہ سرابی کو بامیان کا گورنر مقرر کر کے ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈال دی۔ شمالی افغانستان کے سفاک قاتل رشید دوستم کو اب تک نئی حکومت اور انتظامیہ میں کوئی حصہ نہیں دیا گیا تھا۔ تاہم یکم مارچ 2005ء کو حامد کرزئی نے اسے نیا چیف آف آرمی اسٹاف مقرر کر کے ازبکوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پوست کی کاشت میں اس سال مزید اضافہ ہوا۔ حکومت میں شامل شمالی اتحاد کے کمانڈر خود اپنے علاقوں میں پوست کی کاشت کروا رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اقوام متحدہ نے کسانوں اور زمین داروں کو متبادل ملازمتیں دینے کا وعدہ پورا نہیں کیا اس لیے لوگ پوست کی کاشت پر مجبور ہیں۔

موسم بہار میں افغانستان کے مشرقی اور وسطی علاقوں میں تیز بارشیں ہوئیں۔ 5 مارچ کو غزنی میں بند ٹوٹنے سے سیلاب آ گیا۔ سینکڑوں مکانات تباہ ہو گئے۔ اس حادثے میں 13 افراد جاں بحق اور 2 سو لاپتا ہو گئے۔

31 جولائی 2005ء کو سعودی عرب کے حکمران شاہ فہد بن عبدالعزیز کا انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر 82 سال تھی۔ شاہ فہد روس افغان جنگ میں مجاہدین کی بھرپور مالی مدد کرتے رہے تھے اور بعد میں خانہ جنگی کے دور میں بھی انہوں نے یہاں قیام امن کی متواتر کوششیں کی تھیں۔ ان کے بعد شاہ عبداللہ نے سعودی عرب کے نئے حکمران کے طور پر اقتدار سنبھال لیا۔

روس سے تاوان جنگ کا مطالبہ: اگست میں افغان حکومت نے ایک عجیب تنازع کھڑا کر دیا۔ اس نے روس سے 10 ارب ڈالر جنگی ہرجانہ طلب کر لیا۔ سرخ افواج کے انخلا اور سوویت یونین کی شکست وریخت کے چودہ سال بعد افغان حکومت کو اچانک یہ خیال کیسے آ گیا کہ وہ روس کی مسلط کردہ جنگ کا ہرجانہ طلب کرے؟۔ مبصرین کے مطابق افغان حکومت یہ مطالبہ امریکا کے ایماء پر کر رہی تھی تاکہ روس کو دباؤ میں رکھا جائے۔ کیونکہ روس افغانستان میں امریکا کے من پسند گروپوں کے مقابلے میں کمیونسٹ کمانڈروں اور ازبکوں ...... رشید دوستم، کمانڈر عطا وغیرہ ...... کی سرپرستی کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ امریکا کو شک تھا کہ روس طالبان کو بھی کرزئی حکومت کے خلاف کارروائیوں کے لیے اسلحہ فراہم کر رہا ہے۔

بھارتی وزیراعظم افغانستان میں: انہی دنوں بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ نے افغانستان کا دورہ کیا اور 28 اگست کو حامد کرزئی کے ساتھ دہشت گردی کے خلاف بھارت افغانستان مشترکہ تعاون کے معاہدے پر دستخط کیے۔ من موہن سنگھ جلال آباد جا کر قبائلی سرداروں سے ملاقات اور ننگرہار یونیورسٹی کے طلبہ سے خطاب کے خواہش مند تھے مگر سیکیورٹی خطرات کے سبب یہ طے شدہ پروگرام عین وقت پر منسوخ کر دیے گئے۔

من موہن سنگھ نے دورۂ افغانستان میں صدر حامد کرزئی کو بھارتی فوج افغانستان میں تعینات کرنے کی تجویز پیش کی۔ حامد کرزئی نے اس پر غور کرنے کی مہلت طلب کرلی۔ من موہن سنگھ کی واپسی کے بعد حامد کرزئی نے 6 ستمبر کو اپنی کابینہ کا اجلاس بلاکر اس مسئلے پر رائے طلب کی۔ اکثر ارکان نے اس کی شدید مخالفت کی۔ سابق مجاہد لیڈروں نے بھی اسے مسترد کردیا۔ اس طرح بھارتی لابی کی ایک خطرناک سازش کی راہ مسدود ہوگئی۔ تاہم بھارت نے دوسرے دل لبھانے والے طریقوں سے افغانستان میں اثر ورسوخ بڑھانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ دسمبر کے مہینے میں بھارت کا افغان تاجروں کے لیے ایک تربیتی مرکز کھولنا اس سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

18 ستمبر کو افغانستان میں پارلیمانی الیکشن ہوئے۔ اس دوران پولنگ اسٹیشن پر طالبان کے کئی حملے ہوئے جن میں کئی افراد مارے گئے۔ 9 پولنگ اسٹیشن نذرِ آتش کردیے گئے۔ یہ کارروائیاں اس حال میں کی گئی تھیں کہ 40 ہزار افغان سیکیورٹی اہلکار اور 30 ہزار اتحادی فوجی پولنگ اسٹیشنوں پر تعینات تھے۔ ملک بھر سے انتخابات کے نتائج سامنے آنے کا عمل 7 راکتوبر کو مکمل ہوا۔ یہ نتائج حامد کرزئی کے لیے قطعاً ناموافق تھے۔ شمالی صوبوں کے علاوہ دارالحکومت کابل میں بھی شمالی اتحاد کے نامزد اُمیدوار جیت گئے تھے۔ سابق مجاہد لیڈروں نے بھی نمایاں کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ صوبائی اسمبلیوں میں سابق جہادیوں کو برتری حاصل ہوگئی تھی۔

صدر حامد کرزئی کو پولنگ کے اگلے دن ہی نتائج کا اندازہ ہوگیا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنی پالیسی میں کچھ تبدیلی لاتے ہوئے عوامی مطالبات اور اُمنگوں کی ترجمانی پر مشتمل بیانات کے ذریعے اپنی ساکھ کو سہارا دینے کی کوشش شروع کردی۔ اس سلسلے کا اہم ترین بیان 20 ستمبر کو دیا گیا جس میں حامد کرزئی نے افغانستان میں پارلیمانی انتخابات کے بعد امریکی آپریشن کی مخالفت کردی۔ انہوں نے کہا کہ اب حالات کی نوعیت تبدیل ہوگئی ہے اس لیے افغانستان میں غیر ملکی افواج کو کسی بڑے آپریشن کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی۔

جنگی جرائم کی کمیٹی کا قیام: نئی پارلیمانی حکومت کو اقتدار منتقل ہوجانے سے صدر حامد کرزئی کے اختیارات میں مزید کمی آگئی تھی۔ تاہم مجموعی طور پر اب سیٹ اَپ پہلے کی بہ نسبت متوازن تھا۔ حکومت عوام کا دل جیتنے کے لیے کچھ نئے کام کرنا چاہتی تھی۔ 14 دسمبر 2005ء کو افغان کابینہ نے جنگی جرائم میں ملوث افراد کے خلاف کارروائی کی منظوری دیتے ہوئے اعلان کیا کہ 1978ء کے کمیونسٹ انقلاب سے 2001ء میں طالبان حکومت کے خاتمے تک کیے جانے والے جنگی جرائم کے مرتکب افراد کی نشان

دہی کی جائے گی اور ان کے خلاف شواہد جمع کرنے کے لیے ایک پانچ رکنی کمیٹی کام کرے گی۔ اس فیصلے کے بعد کمیٹی نے کام شروع کیا اور جنگی جرائم کے مرتکب کئی افراد کی نشان دہی کر کے انہیں شواہد سمیت عدالت میں پیش کیا۔ اس سلسلے کا پہلا اہم مقدمہ ''خاد'' کے سابق سربراہ اسداللہ سروری سے متعلق تھا جسے 26 دسمبر 2005ء کو عدالت میں پیش کر کے اس کے خلاف مقدمے کا آغاز کیا گیا۔

طالبان کی کارروائیوں پر ایک نظر: طالبان کی کارروائیاں اس سال شروع سے آخر تک وقفوں وقفوں سے جاری رہیں۔ حملوں کا زور موسمِ سرما میں زیادہ ہوا اور خودکش حملوں کو باقاعدہ ایک مہم کے طور پر شروع کر دیا گیا۔ ان کارروائیوں کی ایک جھلک دکھائی جا رہی ہے:

12 جنوری...... مشرقی افغانستان کے صوبہ پکتیکا کے صدر مقام ''شرنہ'' کے ایئر پورٹ پر دو امریکی طیارے اُترے، امریکی اہلکار اپنے استقبال کے لیے آنے والے افراد کے ساتھ گاڑیوں میں سوار ہو کر ایئر پورٹ سے روانہ ہوئے ہی تھے کہ طالبان نے ان کی ایک گاڑی کو بارودی سرنگ کے دھماکے سے تباہ کر دیا۔ 10/امریکی اور متعدد سرکاری اہلکار مارے گئے۔

25 فروری...... ہلمند میں افغان فوج کے قافلے پر طالبان کے حملے میں 2 کرنلوں سمیت 9 اہلکار مارے گئے۔

26 جولائی...... طالبان نے ارزگان میں امریکی افغان فوج کے مشترکہ آپریشن میں 50 طالبان کے مارے جانے کے دعوے کو مسترد کرتے ہوئے صرف اپنے 8 افراد کی شہادت کی تصدیق کی۔ طالبان نے دعویٰ کیا کہ حملہ آوروں میں سے 28 افغان فوجی قتل کر دیے گئے۔

29 جولائی...... بگرام میں طالبان نے امریکی ہیلی کاپٹر مار گرایا۔

22 اگست...... زابل میں بم دھماکے سے 5 امریکی ہلاک ہو گئے۔

18 ستمبر...... عین پولنگ کے دن خوست میں 6 امریکی قتل کر دیے گئے۔

25 ستمبر...... زابل میں امریکی ہیلی کاپٹر مار گرایا گیا، 30 افراد مارے گئے۔

28 ستمبر...... کابل میں فوجی کیمپ پر خودکش حملہ ہوا جس میں 15 /افغان فوجی اور افسران ہلاک ہو گئے۔

اکتوبر...... میں طالبان کے ترجمان ملا عبداللطیف حکیمی کوئٹہ کے نواح سے گرفتار ہو گئے۔

15/نومبر...... کابل میں 2 خودکش حملے ہوئے جن میں 3 جرمن فوجیوں سمیت 5 افراد مارے گئے۔

16 نومبر...... قندھار میں امریکی فوجی قافلے پر خودکش حملہ ہوا جس میں 4 فوجی مارے گئے۔

18 نومبر...... قندھار میں 8 افغان فوجی قتل کر دیے گئے۔

20 نومبر...... طالبان نے نیمروز سے ایک بھارتی انجینئر کو اس کے دو افغان ساتھیوں سمیت اغوا کر لیا اور بھارتی تعمیراتی کمپنی کو 48 گھنٹے کے اندر کام بند کر کے افغانستان چھوڑنے کا الٹی میٹم دے دیا۔

یکم دسمبر...... طالبان نے بادغیس ایر پورٹ پر حملہ کر کے عمارت اور رن وے کو زبردست نقصان پہنچایا۔

3 دسمبر...... قندھار کے ضلع شاہ ولی کوٹ میں سرکاری گاڑی بم سے اُڑا دی گئی جس سے ضلعی انتظامیہ کا سربراہ 4 افراد سمیت لقمۂ اجل بن گیا۔

4 دسمبر...... کابل میں طالبان نے امریکی ہیلی کاپٹر تباہ کر دیا۔ اس میں سوار تمام افراد مارے گئے۔

6 دسمبر...... ارزگان میں امریکی فوج نے آپریشن کر کے 22 طالبان کو مارنے کا دعویٰ کیا۔ طالبان نے بتایا کہ صرف ایک طالب شہید ہوا ہے جبکہ 3 امریکی مارے گئے ہیں۔

15 دسمبر...... کابل میں افغان پارلیمنٹ کے باہر خود کش کار بم دھماکے سے 2 افراد ہلاک اور 6 زخمی ہو گئے۔

28 دسمبر...... بغلان میں نیٹو کی گاڑی تباہ کر دی گئی۔ 6 اہلکار ہلاک ہو گئے۔ اس دن پکتیکا میں طالبان نے ایک خونریز لڑائی کے بعد 50 امریکی موت کے گھاٹ اُتار دیے۔

القاعدہ کے حملے: افغانستان میں ان کارروائیوں کے دوران القاعدہ باہر بھی سرگرم تھی۔ 7 جولائی 2005ء کو لندن میں 7 جگہوں پر ہولناک دھماکے ہوئے جن میں 50/افراد ہلاک اور 700 زخمی ہوئے۔ القاعدہ نے ذمہ داری قبول کرتے ہوئے لندن پر مزید حملوں کی دھمکی بھی دی۔ القاعدہ کے ترجمان نے کہا: ''اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جنگ میں شریک دیگر ملکوں پر بھی حملے کیے جائیں گے۔ ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک عراق، افغانستان اور فلسطین کے مسلمانوں کی سلامتی یقینی بنائی جائے گی۔''

اس کارروائی کے دو ہفتے بعد 25 جولائی 2005ء کو مصر کے شہر ''شرم الشیخ'' میں ملک کے قومی دن کے موقع پر 3 خود کش دھماکے ہوئے جن میں 90 افراد ہلاک اور 20 زخمی ہوئے۔ القاعدہ نے اس حملے کی ذمہ داری بھی قبول کر لی۔ 2005ء کی ایک اہم خبر یہ تھی کہ سابق افغان سفیر ملا عبدالسلام ضعیف گوانتانامو بے سے رہا ہو کر نومبر کے دوسرے عشرے میں کابل پہنچ گئے۔

طالبان کے لیے اس سال کا سب سے صدمہ انگیز واقعہ کمانڈر ملا اختر عثمانی کی شہادت تھا جو جاسوسوں کی سازش کا شکار ہو کر شہید ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ امریکا طالبان میں اپنے مخبر شامل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

طریقہ کار یہ تھا کہ جاسوس عین اس جگہ کی نشان دہی کرتا تھا جہاں مطلوبہ لیڈر موجود ہوتا تھا جس کے فوراً بعد دشمن کے طیارے آکر اس پورے علاقے کو کارپٹ بمباری کا نشانہ بنا دیتے تھے۔ ملا اختر عثمانی کی جاسوسی کرنے والا قندھار کا کوئی شخص تھا۔ طالبان نے جلد ہی اسے پہچان لیا۔ وہ قندھار سے غزنی بھاگا مگر ملا اختر عثمانی کے بیٹے نے غزنی تک اس کا پیچھا کیا اور اس کے گھر میں گھس کر اسے مار ڈالا۔ ملا اختر عثمانی کی شہادت کے بعد ملا داداللہ کو جنوبی افغانستان کے عمومی کمانڈر بنایا گیا اور ان کی کارروائیوں نے دشمن کے اوسان خطا کر دیے۔

امریکا اس سال افغانستان میں اپنی افواج کم کرنے اور افغان فوجیوں کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا رہا۔ اس کے باوجود امریکی فوجی نشانہ بنتے ہی رہے۔ سال کے آخر میں امریکا نے 3 ہزار سپاہی مزید واپس بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ 20 دسمبر کو امریکی وزیر دفاع رمز فیلڈ نے اپنے بیان میں کہا کہ امریکا اب افغانستان میں صرف 16 ہزار سپاہی رکھے گا۔ مجموعی طور پر 2005ء میں افغانستان کے حالات تقریباً جوں کے توں رہے۔ صرف پارلیمانی حکومت قائم ہونے سے کچھ چہرے تبدیل ہو گئے۔ جبکہ جنگلوں، پہاڑوں اور وادیوں میں طالبان امریکا اور اس کے اتحادیوں سے بدستور نبرد آزما تھے۔

2006ء کے حالات

2006ء میں امریکا پاکستان کے سرحدی قبائل کا سروے اس نقطۂ نظر سے کرتا رہا کہ کس طرح جنگ کی آگ یہاں تک پھیلائی جائے۔ موسم سرما کے آخری ایام میں سرحد پر امریکی طیارے گلوبل ہاک کی پروازیں دیکھی گئیں۔ یہ طیارہ 65 ہزار فٹ بلندی سے 100 میل تک کے علاقے کا سروے کر سکتا ہے۔

اس سال طالبان کی کارروائیاں تیز ہوتی گئیں اور امریکا کو اپنی شکست سامنے نظر آنے لگی۔ 8 مارچ 2006ء کو امریکی خفیہ ادارے کے سربراہ مائیکل مولن نے بگرام میں امریکی فوجیوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ طالبان کے حملوں میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ ائمہ مساجد کھلم کھلا لوگوں کو درسِ جہاد دے رہے ہیں اس لیے یہ سال بے حد خطرناک ثابت ہوگا۔ امریکی فوجیوں کو چاہیے کہ وہ اپنی چھاؤنیوں اور بیرکوں تک محدود رہیں۔

ادھر افغان صدر حامد کرزئی نے سال کے شروع ہی سے پاکستان مخالف بیانات دے کر دوطرفہ تعلقات میں کشیدگی پیدا کر دی تھی۔ 14 مارچ کو انہوں نے حزب وحدت کے سابق سربراہ عبدالعلی مزاری کی برسی پر ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان کو نفاق ڈالنے والا دشمن قرار دے دیا۔

<u>مشنریوں کی یلغار:</u> امریکا افغانستان میں امدادی اور رفاہی کاموں کی آڑ میں عیسائیت کی بھرپور تبلیغ

کر رہا تھا اور ہزاروں مشنری اس مہم میں مصروف تھے۔ ان کے پرکشش جال میں آکر اب تک 90 ہزار افغان باشندے مرتد ہو چکے تھے۔ طالبان کے دور میں مشنری سرگرمیوں پر پابندی عائد تھی اور مرتد کی شرعی سزا قتل کو قانونی طور پر اپنایا گیا تھا مگر امریکا نے افغانستان کے نئے آئین میں اقوام متحدہ کے چارٹر پر عملدرآمد کو لازمی قرار دلوایا تھا جس کی دفعہ 18 کے تحت کسی شخص کو عقیدے کی بنا پر سزا نہیں دی جاسکتی۔ یہی وجہ تھی کہ بدقسمت لوگ سزا کے خوف کے بغیر مشنریوں کے ہتھے چڑھ جاتے تھے۔ امریکا کی کوشش اب یہ تھی کہ ان نئے عیسائیوں کو افغانستان میں باقاعدہ اقلیتی حقوق دیے جائیں۔ مارچ 2006ء میں کرزئی حکومت کو اس کے لیے آمادہ کرلیا گیا۔

طالبان کی جانب سے خودکش حملوں کا جو سلسلہ 2005ء میں شروع ہوا تھا، وہ 2006ء میں مزید بڑھ گیا۔ افغان ارکان اسمبلی ان حملوں سے اتنے خوف زدہ تھے کہ انہوں نے مارچ کے اواخر میں سیکیورٹی انتظامات بڑھانے اور اس کے لیے ہر رکن کے حفاظتی اخراجات میں 10 ہزار ڈالر کے اضافے کا مطالبہ کردیا۔

موسمِ بہار کی آمد طالبان کی جانب سے بڑے حملوں کے آغاز کا نقارہ پیٹ رہی تھی۔ اس موقع پر 4 اپریل کو برطانوی وزیر دفاع جان ریڈ نے علی الاعلان کہا کہ افغانستان پر طالبان کے دوبارہ قبضے کا خطرہ پیدا ہو چکا ہے۔

طالبان کی فتوحات کا خطرہ تو اپنی جگہ حقیقت تھا مگر امریکا اس خطرے کو ایک اور مفاد کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ وہ افغانستان میں مستقل قیام کرکے چین پر نگاہ رکھنے کی تگ ودو میں تھا۔ افغانستان میں مستقل اڈے بنانے کی منظوری کے لیے امریکی وزیر دفاع رمزفیلڈ نے اپریل 2006ء کے دوسرے ہفتے میں کابل کا دورہ کیا اور حامد کرزئی سے اس معاملے پر مذاکرات کیے۔ حامد کرزئی ذاتی طور پر امریکی افواج کے مستقل قیام کے مخالف تھے اس لیے انہوں نے خود کوئی واضح جواب دینے کے بجائے کہا کہ اس معاملے کا فیصلہ پارلیمنٹ کرے گی۔ ظاہر ہے امریکا کا اپنی کٹھ پتلی حکومت سے یہ منظوری حاصل کرنا محض رسمی تھا اس لیے افغان پارلیمنٹ میں اس پر بحث اور فیصلے کا انتظار کیے بغیر اسی ماہ چین کے قریب افغان علاقے میں ایک بڑے اڈے کے لیے سروے کا کام شروع کرادیا گیا جس کے لیے 123 ماہرین افغانستان بلالیے گئے۔

گیس پائپ لائن کا ٹھیکہ: اس کے ساتھ ہی امریکا نے وسط ایشیا کی معدنی دولت کی طرف پہلا قدم بڑھادیا اور راتوں رات اپنی کمپنی "یونوکال" کو ترکمانستان افغانستان گیس پائپ لائن کا ٹھیکا دلادیا۔

اگرچہ حالات ایسے نظر نہیں آتے تھے کہ منصوبے پر کام شروع کیا جاسکے مگر افغان وزارتِ اقتصادیات نے 24/اپریل کو اعلان کر دیا کہ منصوبہ اس سال شروع ہو جائے گا۔ جون کے آغاز میں اس منصوبے میں بھارت کی شمولیت کی درخواست بھی منظور کر لی گئی، مگر طالبان کی شدید کارروائیوں کے سبب موسمِ گرما میں تمام حکومتی سرگرمیاں معطل ہو کر رہ گئیں۔ افسران اور حکام گھروں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ منصوبے پر عملدرآمد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

افغان عوام پر مظالم کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ یکم اپریل 2006ء کو شمالی اتحاد نے بگرام میں لوگوں کی 250 ایکڑ زمین پر قبضہ کر کے 350 خاندانوں کو بے گھر کر دیا اور وہاں اپنے حامی افراد کو لا بسایا۔ بے گھر افراد کا حرماں نصیب قافلہ ہجرت کر کے پاکستانی علاقے کوہاٹ آ کر پناہ گزین ہوا۔ 19/اپریل کو خوست میں 5 افغان شہری امریکی بمباری کا نشانہ بن کر شہید ہو گئے۔ 11 مئی کو ملک کے ممتاز عالم دین حبیب اللہ شریعتی کو اس الزام میں گرفتار کر لیا گیا کہ انہوں نے لویہ جرگہ میں امریکی اڈوں کی مخالفت کی تھی اور ان کی تقریر کے بعد 600 ارکان امریکی اڈوں کے مخالف ہو گئے تھے۔

<u>طالبان کے طوفانی حملے</u>: اس دوران طالبان کی کارروائیاں شروع ہو چکی تھیں۔ 15/اپریل کو انہوں نے امریکی فوجی قافلے پر حملہ کر کے 6 آئل ٹینکر تباہ کر دیے۔ اسی دن قندھار ایرپورٹ پر بموں سے حملہ کر کے عمارت کو شدید نقصان پہنچایا۔ زابل میں بارودی سرنگ حملہ ہوا جس سے تباہ ہونے والی گاڑی میں 9/افغان فوجی ہلاک ہو گئے۔ 16/اپریل کو زابل میں ایک امریکی ہیلی کاپٹر مار گرایا گیا جس میں سوار 12 فوجی مارے گئے۔ 21/اپریل کو زابل کے ضلع ارغنداب میں ایک جھڑپ کے دوران پولیس کمشنر سمیت 11 حکومتی اہلکار ہلاک ہو گئے۔ طالبان نے حریف کے اسلحے اور 5 گاڑیوں پر قبضہ کر لیا۔ 10 مئی کو کنڑ میں چنیوک امریکی ہیلی کاپٹر مار گرایا جس میں 10/امریکی اہلکار مارے گئے۔

<u>حامد کرزئی، تعاون کے طلب گار</u>: حامد کرزئی کو گزشتہ 4 سال کے تجربات نے بہت کچھ سکھایا تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ اپنے محدود اختیارات کے باوجود کسی نہ کسی طرح عوامی نفرت کو کم کریں اور طالبان سے صلح وصفائی کا راستہ نکالیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے امریکی فوج کو درخواست بھیج کر 30/اپریل کو بگرام جیل سے 86 اور قندھار جیل سے 16/افغان قیدی رہا کروا دیے۔ انہوں نے صدر بش کو بھی درخواست بھیجی کہ گوانتانا موبے میں قید افغان قیدیوں کو رہا کر دیا جائے مگر مئی کے آخری عشرے میں [illegible] نے یہ درخواست مسترد کر دی۔

[illegible] کے آغاز میں حامد کرزئی نے طالبان اور حزبِ اسلامی کو مفاہمت کی پیش کش بھی کی تھی جسے

طالبان نے سختی سے مسترد کر دیا۔ حزب اسلامی نے بھی حوصلہ افزا جواب نہ دیا۔ مہینے کے آخری عشرے میں یہی پیش کش مولانا جلال الدین حقانی کو کی گئی اور ساتھ میں انہیں 2 صوبوں کی گورنری کا لالچ بھی دیا گیا۔ مولانا جلال الدین حقانی نے اس پیش کش کو رد کرتے ہوئے جواب دیا: ''حامد کرزئی امریکی فوج کو نکل جانے کے لیے کہیں تو میں ایک لاکھ طالبان کے ساتھ ان کی مدد کے لیے تیار ہوں۔'' اس کے فوراً بعد طالبان سربراہ ملا محمد عمر کا یہ بیان سامنے آیا: ''افغان حکمران نے اپنا ملک امریکا کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ افغان عوام ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں۔'' صاف معلوم ہوتا تھا کہ طالبان امریکا کے زیر سایہ افغان حکومت کو کسی قسم کے مذاکرات اور مفاہمت کے قابل نہیں سمجھتے۔

قرآن مجید کی بے حرمتی پر اشتعال: مئی کے مہینے میں ایک اور زلزلہ خیز واقعہ رونما ہوا۔ امریکی فوج گوانتاناموبے کے عقوبت خانے میں کئی بار قرآن مجید کی بے حرمتی کر چکی تھی۔ افغانستان اور عراق میں بھی وہ یہ ظلم ڈھا چکی تھی۔ 8 مئی کو ایسا ہی ایک تازہ واقعہ پیش آیا جس سے اسلامی دنیا خصوصاً افغانستان میں ہل چل مچ گئی۔ 13 مئی کو افغان چیف جسٹس فضل ہادی شنواری نے مطالبہ کر دیا کہ امریکا اس گستاخی پر معافی مانگے۔ افغانستان میں پانچ دن تک احتجاجی مظاہرے ہوتے رہے۔ جنہیں روکنے کے لیے سرکاری اہلکاروں کے تشدد اور فائرنگ سے متعدد مظاہرین زخمی ہو گئے۔ 15 مئی کو بدخشاں کے مرکز فیض آباد میں 300 علماء نے ایک کانفرنس میں اعلان کیا کہ امریکا 3 دن کے اندر اندر توہین قرآن مجید کے مرتکبین کو ہمارے حوالے کرے ورنہ جہاد کا اعلان کر دیا جائے گا۔ بلخ میں بھی مظاہرے ہوئے۔ کابل میں نامعلوم افراد نے بھارتی سفارت خانے پر راکٹ داغ دیے۔ یہ رویہ بتا رہا تھا کہ افغان عوام اسلام دشمن طاقتوں کے یکجان ہونے کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں اور اب ان کے مقابلے میں خود بھی متحد ہو رہے ہیں۔

افغان فوج میں بھرتیوں کی مہم: امریکا کے مظالم اور گستاخیوں کے ردِ عمل میں تحریک جہاد کو تازہ خون میسر آ رہا تھا۔ دوسری طرف امریکا اور اس کے اتحادیوں میں اپنی مزید افواج کو جنگ کی بھٹی میں جھونکنے کی ہمت نہیں تھی اس لیے انہوں نے بڑے پیمانے پر افغان باشندوں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کے مطابق 15 مئی 2006ء کو کرزئی حکومت نے طالبان کے دفاع سے لیے ایک لاکھ 20 ہزار افغانوں پر مشتمل ملیشیا فورس تیار کرنے کا اعلان کر دیا۔ اعلامیے میں بتایا گیا کہ ہر صوبے سے کم از کم 2 ہزار اور زیادہ سے زیادہ 10 ہزار افراد لیے جائیں گے۔ ہر سپاہی کو ساڑھے چار ہزار روپے تنخواہ اور دیگر مراعات دی جائیں گی۔

کرزئی حکومت یہ اعلان ایسے وقت میں کر رہی تھی کہ میڈیا پر کابل کی پس ماندگی اور افغان شہریوں کی

کسمپرسی پر مشتمل ایک چشم کشا سروے رپورٹ کا چرچا تھا جس کے مطابق کابل میں گزشتہ چار سال کے دوران بھکاریوں کی تعداد 5 ہزار سے بڑھ کر 37 ہزار تک پہنچ گئی تھی اور خطرہ تھا کہ یہ تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کر جائے گی۔ دوسری طرف توہینِ قرآن کے واقعے کے سبب عوام میں امریکا سے نفرت کے جذبات انتہا کو پہنچے ہوئے تھے اس لیے کسی کو توقع نہیں تھی کہ فورس کی تشکیل کا یہ منصوبہ کامیاب ہوگا۔ کرزئی حکومت کی جانب سے ملیشیا فورس کے قیام کے اعلان کے جواب میں 22 مئی کو طالبان کمانڈر ملا داد اللہ نے بیان دیا: ''ہمارے فدائی حملہ آوروں کی تعداد 1200 سے زائد ہے جو ایک اشارے پر جاں نثار کرنے کے لیے تیار ہیں۔'' انہوں نے کہا: ''ملا محمد عمر آج بھی طالبان کی قیادت کر رہے ہیں۔''

اتنی بڑی تعداد میں فدائی حملہ آوروں کے تیار ہونے کی خبر نے طالبان مخالف حلقے کے بہت سے لوگوں کے قدم بھرتی کے مراکز میں جانے سے روک دیے۔

کابل میں کرفیو: ادھر 30 مئی کو کابل میں ایک امریکی ڈرائیور نے نشے کی حالت میں 2 راہگیروں کو کچل دیا جس پر افغان عوام نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ یہ دیکھ کر امریکی فوجی آگئے اور احتجاج کے لیے جمع ہونے والے لوگوں پر فائر کھول دیا جس سے 50 افراد جاں بحق اور 140 زخمی ہو گئے۔ اس سانحے سے دارالحکومت میں حالات بے حد کشیدہ ہو گئے اور غیر معینہ مدت کے لیے کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ اس قسم کے حالات عوام کو امریکا سے مزید متنفر اور کرزئی حکومت سے مایوس کرنے کا باعث بن رہے تھے۔

ملا داد اللہ کے حملے اور دھمکی: طالبان نے اس موسمِ گرما میں ملا داد اللہ کی قیادت میں امریکی، اتحادی اور افغان فوجوں پر تابڑ توڑ حملے کرنے کی تیاری مکمل کر لی تھی۔ جون کے آغاز میں طالبان نے افغان سرکاری افواج کو دھمکی دیتے ہوئے اعلان کیا کہ افغان فوجی ایک ہفتے میں ہتھیار ڈال دیں یا ملازمت چھوڑ کر فرار ہو جائیں۔ بصورت دیگر ان کا انجام بہت برا ہوگا۔ طالبان کی اس دھمکی سے دہشت زدہ ہو کر چند دنوں کے اندر اندر 15 ہزار افغان فوجی نوکری چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس طرح یہ اُمید خاک میں مل گئی کہ کرزئی حکومت کبھی ایک لاکھ 20 ہزار افراد کی فوج تیار کر پائے گی۔

امریکی سفارت خانے کی رپورٹ: 12 جون 2006ء کو کابل کے امریکی سفارت خانے نے واشنگٹن کو ایک رپورٹ ارسال کی جس میں بتایا گیا کہ امریکا کے خلاف افغان عوام کی زبردست نفرت ایک اسلامی انقلاب کی طرف بڑھ رہی ہے۔ عوام آج بھی طالبان سے محبت کرتے ہیں۔ وہ عرب مجاہدین کو حضور ﷺ کی اولاد سمجھ کر تحفظ دیتے ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ جنوبی اور مشرقی افغانستان میں طالبان کی بیشتر صوبوں پر حکمرانی ہے جو ہمارے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔

انہی دنوں امریکا کو عراق کی جنگ میں ایک نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ وہاں کے عظیم مجاہد کمانڈر الزرقاوی شہید کردیے گئے۔ عراقی مجاہدین نے ابوحمزہ کو الزرقاوی کا جانشین مقرر کردیا۔ اس واقعے کے ردِعمل میں 13 جون کو طالبان نے بھی اعلان کیا کہ الزرقاوی کا بدلہ لینے کے لیے ہم 150 فدائی بمبار عراق بھیجیں گے۔ طالبان کے اس ردِعمل سے پتا چل رہا تھا کہ عراق اور افغانستان میں لڑنے والوں کے درمیان زبردست تعلق اور گہرا رشتہ موجود ہے۔ الزرقاوی کی شہادت کے بعد طالبان نے افغانستان میں بھی اپنی کارروائیاں تیز کردیں۔ ملا محمد عمر نے کمانڈر ملا داداللہ کو امریکیوں کے خلاف جہاد کی کمان سونپ دی تھی۔ ملا داداللہ طوفانی کارروائیوں سے امریکا اور افغان فوجی دونوں ہی خوفزدہ تھے۔

جولائی میں شائع ہونے والے امریکی میگزین ''نیوز ویک'' نے اپنی اشاعت میں ملا داداللہ کی کارروائیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

''ملا داداللہ افغانستان کے الزرقاوی بن گئے ہیں۔ وہ تیز دھار برچھے کی صورت میں میدانِ کارزار میں اپنے گوریلوں کے سرخیل ثابت ہورہے ہیں۔ ملا عمر کی طرف سے ملا داداللہ کو حملوں کے لیے خودمختاری حاصل ہے۔ نوجوان ان کے شانہ بشانہ کارروائیوں میں حصہ لیتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔''

تبصرہ نگار نے اعتراف کیا کہ سقوطِ کابل کے بعد طالبان کی کارروائیوں کی حالیہ لہر شدید تر ہے۔

طالبان کی کارروائیوں کی تیز ترین لہر: آیئے! اب ذرا طالبان کی کارروائیوں کی اس تیز ترین لہر پر ایک نظر ڈالتے ہیں جو مئی 2006ء کے اواخر میں شروع ہو کر موسمِ گرما کے اختتام تک جاری رہی۔

21 مئی کو جنوبی افغانستان میں طالبان اور اتحادیوں کے درمیان کئی دن تک خونریز جنگ ہوئی۔ 224 اتحادی ہلاک اور 89 طالبان شہید ہوئے۔

3 جون کو امریکی ایف 16 طیارہ خوست میں القاعدہ کا نشانہ بن کر تباہ ہوگیا۔

12 جون کو طالبان نے قندھار پولیس کے سربراہ سمیت 13 اہلکار یرغمال بنالیے۔ دو دن بعد سربراہ سمیت 8 یرغمالی ہلاک کردیے۔

جون کے وسط میں نیٹو افواج طالبان کے خلاف آپریشن کے لیے ہلمند پہنچ گئیں۔ 21 جون کو طالبان کی تلاش میں ناکامی پر امریکی فوج نے قندھار کے ضلع میانشین میں اندھا دھند بمباری کرکے 60 شہریوں کو شہید کردیا۔

29 جون کو کنڑ میں طالبان اور امریکی فوج کے درمیان خونریز جنگ جاری تھی۔ معرکے میں 28

امریکی ہلاک ہوئے جبکہ 10 شہریوں اور 10 مجاہدین نے شہادت پائی۔

9 جولائی کو بگرام ایربیس کی امریکی جیل سے القاعدہ کے چار اہم راہنما فرار ہو گئے۔ ان میں سے ایک دوبارہ پکڑا گیا جبکہ باقی ہاتھ نہ آسکے۔

ترجمانوں کا قحط پڑ گیا: انہی دنوں حامد کرزئی نے طالبان کو نرمانے کے لیے بگرام جیل سے 76 طالبان قیدی رہا کروادیے مگر طالبان رکنے میں نہ آئے۔ 5 جولائی کو انہوں نے ہلمند میں 7 افغان پولیس اہلکار مارڈالے۔ اس کے ساتھ ساتھ طالبان نے ایک نئی حکمت عملی اپناتے ہوئے امریکی ترجمانوں کو بھی نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ 11 رجولائی کو قندھار ایرپورٹ کے قریب کار بم دھماکے میں 17 ترجمان بیک وقت مارے گئے۔ اسی ہفتے دیگر صوبوں میں 9 ترجمانوں کو تاک تاک کر نشانہ بنایا گیا۔ امریکی فوج کو پہلے مقامی لوگوں سے گفتگو کے لیے ترجمان بہت مشکل سے ملتے تھے، کیونکہ لوگ جانتے تھے کہ امریکی افسران عموماً اپنے ترجمانوں سے بدفعلی بھی کرتے ہیں۔ اس وقت جنسی تشدد سے بے حال ہونے والے 6 ترجمان ہسپتالوں میں زیر علاج تھے۔ اب طالبان کے ترجمانوں پر حملوں کے باعث لوگ اس ملازمت سے مزید گریز کرنے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ امریکی حکام اور افسران کو ترجمان ملنا مشکل ہو گئے۔

نیٹو افواج کی جنوبی افغانستان سے پسپائی: نیٹو افواج نے دو ماہ کی مسلسل ناکام کوششوں کے بعد اگست کے وسط میں ہلمند سے واپسی اختیار کرلی۔ نیٹو افواج کے کمانڈر "جنرل ڈیوڈ رچرڈ" نے اعتراف کیا کہ جنوبی افغانستان میں مزید قیام ممکن نہیں ہے۔ جنرل ڈیوڈ نے صرف جنوبی صوبوں کو کنٹرول کرنے کے لیے 85 ہزار فوجیوں کی تعیناتی کی درخواست دی تھی۔ مبصرین کے مطابق یہ اعتراف اور درخواست نیٹو کی کھلی شکست کی دلیل تھی۔ نیٹو افواج کی ہلمند سے پسپائی پر ملا داداللہ نے اعلان کیا: "ہم افغانستان کی سرزمین نیٹو پر تنگ کر دیں گے۔"

حقیقت یہ تھی کہ نیٹو افواج امریکا کا آخری سہارا اور آخری اُمید تھی۔ ان کی پسپائی امریکا کی یقینی شکست کی علامت تھی۔ طالبان کی تحریکِ جہاد فتح مبین کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اگست کے اواخر میں سامنے آنے والی ایک رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ صرف چھ ماہ میں کابل میں 30 فدائی حملے ہوئے ہیں جن میں 150 اتحادی مارے گئے ہیں۔ روایتی قسم کے 750 حملے ہوئے جس میں 1220 رافغان فوجی ہلاک ہوئے۔ امریکا کے 6 ہیلی کاپٹر، ایک مسافر طیارہ، 15 فوجی گاڑیاں اور 25 آئل ٹینکر تباہ ہوئے۔ 92 مجاہد شہید ہوئے۔ یہ اعداد و شمار صرف کابل اور گرد و نواح کی کارروائیوں کے ہیں۔ اس

سے ملک بھر کی کارروائیوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

طالبان کمانڈر ملا عبدالرحیم نے اکتوبر 2006ء میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا: ”نیٹو افواج طالبان کی موجودگی کی خبر سن کر ہی بھاگ جاتی ہیں۔“

انہوں نے کہا کہ طالبان اب تک اپنے سقوط کے وقت ساتھ لیا گیا اسلحہ اور گاڑیاں استعمال کر رہے ہیں۔

طالبان کی فتوحات: ان کارروائیوں کے نتیجے میں موسم گرما کے اختتام سے پہلے پہلے طالبان نے چند شہری آبادیوں کو چھوڑ کر جنوبی افغانستان کا بقیہ علاقہ تقریباً مکمل طور پر آزاد کرالیا۔ یہاں قندھار، ہلمند، فراہ، نیمروز، زابل اور ارزگان میں باقاعدہ طالبان کے گورنر اور کمشنر کام کرنے لگے۔ شرعی عدالتیں سرگرم ہوگئیں۔ پولیس اور انٹیلی جنس کا نظام متحرک ہوگیا۔ کرزئی انتظامیہ کے اہلکار اب بھی یہاں موجود تھے، مگر ان کی حیثیت محض تماشائی کی سی تھی۔ ان کی موجودگی کا فائدہ یہ تھا کہ امریکی طیارے کھلم کھلا شہری آبادیوں اور بستیوں کو نشانہ نہیں بنا سکتے تھے۔

5 ستمبر کو طالبان نے قندھار کے ضلع پنجوائی میں اسٹینگر میزائل فائر کر کے نیٹو کا طیارہ ”نمروڈ“ مار گرایا جس میں 65 اتحادی ہلاک ہوگئے۔ اسی دن ایک معرکے میں اتحادیوں کی 5 گاڑیاں اور 7 ٹینک تباہ ہوئے۔ اتحادیوں کے طیاروں نے انتقامی طور پر اندھا دھند بمباری کی جس سے 195 شہری شہید ہوگئے۔ ایک اور معرکے میں طالبان نے اتحادیوں کو گھیر لیا۔ انہوں نے فضائی مدد طلب کی تو کمک آنے والے ہیلی کاپٹروں نے اپنی ہی فوج کو نشانہ بنادیا جس سے 5 اتحادی اور 5 افغان فوجی ہلاک ہوگئے۔

امریکی وزیر خارجہ کنڈولیزا رائس نے 12 ستمبر 2006ء کو اپنی پانچ سالہ جنگ اور افغانستان کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ”حیرت ہے پانچ برس بعد بھی طالبان کی قوت میں اضافہ ہو رہا ہے۔“

صلح وصفائی پر غور وخوض: سال 2006ء کے اواخر میں یہ واضح نظر آنے لگا کہ طالبان کے مخالفین شکستگی کے احساس سے بوجھل ہو کر بڑی سنجیدگی سے مذاکرات کی راہ کا سرپیر ڈھونڈ رہے تھے۔ انہوں نے کچھ دنوں پہلے وزیر داخلہ ضرار احمد مقبل کی سرکردگی میں ایک جائزہ کمیشن مقرر کیا تھا تاکہ وہ طالبان کی کامیابیوں اور عوام کی ان سے ہمدردی کی وجوہ معلوم کرے۔ کمیشن نے طالبان کے حامی علاقوں کا جائزہ لینے کے بعد ستمبر 2006ء کے آغاز میں یہ رپورٹ دی کہ غیر ملکی افواج کی بلا جواز کارروائیاں افغان عوام کو مشتعل کر رہی ہیں۔ رپورٹ سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ لوگ غیر ملکی افواج کے مظالم کے ردعمل میں طالبان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اس رپورٹ کے ذریعے حامد کرزئی امریکی حکام پر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اب افغانستان میں آپریشن بند کر کے طالبان سے مذاکرات کرنا ناگزیر ہے۔

ادھر برطانیہ اور کینیڈا کے فوجی حکام بھی امریکا پر زور دے رہے تھے کہ طالبان سے کوئی باعزت امن معاہدہ کر کے یہ جھگڑا ختم کیا جائے۔ آخر کار ستمبر 2006ء کے وسط میں امریکا نے کرزئی حکومت کو ہم زبان بناتے ہوئے طالبان کو مذاکرات کی پیش کش کر دی۔ طالبان نے اس بار بھی غیر ملکی افواج کی واپسی کے بغیر مذاکرات کے امکان کو مسترد کر دیا۔ طالبان کی جانب سے ملا داداللہ نے جواب دیتے ہوئے کہا: ''غیر ملکی افواج کو نکالنے کے لیے آخری فرد تک لڑیں گے۔''

طالبان کے اس دوٹوک جواب کے باوجود امریکا مذاکرات کا کوئی راستہ ڈھونڈتا رہا۔ پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف کا مشورہ بھی اب یہی تھا کہ باعزت صلح کر لی جائے۔ جنرل پرویز مشرف نے 20 ستمبر کو اپنے بیان میں کہا: ''طاقت ہر مسئلے کا حل نہیں ہے۔ افغان حکومت بھی 'شمالی وزیرستان معاہدے' کے ہمارے تجربے سے فائدہ اُٹھائے۔''

نیٹو کی تین شرائط: ستمبر کے اواخر میں نیٹو افواج نے طالبان سے سے رابطہ کیا اور انخلاء پر مشروط رضامندی ظاہر کی۔ نیٹو ہائی کمان کی پیش کش اہم شرائط یہ تھیں:

- ...... طالبان القاعدہ سے مکمل لاتعلقی اختیار کریں۔
- ...... آیندہ القاعدہ کو پناہ نہ دینے کا وعدہ کریں۔
- ...... اتحادی افواج کو افغانستان کی تعمیر نو کے لیے یہاں قیام کی اجازت دیں۔

طالبان کے لیے یہ تینوں شرائط ناقابل قبول بلکہ ناقابل سماعت تھیں، اس لیے مذاکرات کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکا اور اس کے اتحادیوں کا طالبان سے مذاکرات کا ڈول ڈالنے کا مقصد صرف جنگ بندی یا مزید تیاری کی مہلت حاصل کرنا تھا۔ وہ افغانستان کو آزاد چھوڑ دینے اور یہاں کا مستقبل مقامی لوگوں کے سپرد کرنے کے لیے مخلص نہیں تھے یہی وجہ تھی طالبان بھی ان سے مذاکرات کے لیے سنجیدہ نہ ہوئے۔

اس جنگ نے ملک کو کیا دیا؟ افغانستان پر غیر ملکی افواج کے اس اجتماع نے ملک کو کیا دیا تھا۔ اقوام متحدہ کا ادارہ انسدادِ منشیات 2006 کے ماہ ستمبر میں اعلان کرتا ہے: ''اس سال افغانستان میں 59 فی صد سے زائد پوست کاشت کی گئی جس سے افیون کی پیداوار 6100 ٹن تک پہنچ گئی۔''

برطانوی اخبار انڈی پینڈنٹ لکھتا ہے:

''دہشت گردی کی عالمی جنگ میں اب تک ایک لاکھ 80 ہزار افراد ہلاک اور 45 لاکھ افراد بے گھر ہو چکے ہیں۔''

اخبار ٹیلی گراف 8 اکتوبر کی اشاعت میں بتاتا ہے:

''عراق اور افغان جنگ کے زخمی فوجیوں نے اسکاٹ لینڈ اور عراق کے ہسپتالوں کو بھر دیا ہے۔''

13 نومبر کو میڈیا پر آنے والے ایک سروے میں اتحادی ممالک کے عوام نے رائے دی کہ بش نے دنیا کو خطرے میں جھونک دیا ہے۔

کرزئی کی مشکلات: حامد کرزئی کی مشکلات روز افزوں تھیں۔ اگست میں رشید دوستم اور جنرل عبدالمالک کی بڑھتی ہوئی طاقت نے انہیں پریشان کر دیا کیونکہ روس نے اپنے ان دونوں مہروں سے تعلقات بحال کر لیے تھے اور انہیں بھرپور عسکری و مالی امداد دینے لگا تھا۔ ان کی پارٹیاں خود مختار بنتی جا رہی تھیں۔ تنگ آ کر حامد کرزئی نے 21 اگست کو وارننگ دی کہ دوستم کی ''جنبش ملی'' اور عبدالمالک کی ''آزاد وطن'' پارٹیاں دو ماہ کے اندر اندر غیر مسلح ہو جائیں ورنہ ان پر پابندیاں عائد کر دوں گا مگر ان سرپھروں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ حامد کرزئی نے مجبور ہو کر ستمبر 2006ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اجلاس کے موقع پر صدر بش سے درخواست کی کہ افغانستان اور پاکستان کے اشتراک سے ایک بڑا جرگہ منعقد کر کے طالبان سے مذاکرات کا کوئی راستہ تلاش کیا جائے۔ ستمبر کے آخری عشرے میں حامد کرزئی کو اس وقت مزید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جب انہوں نے امریکا کو افغان فوج کے لیے طیارے، ٹینکوں، ہیلی کاپٹر اور دیگر بھاری ہتھیار فراہم کرنے کی تحریری درخواست دی مگر صدر بش نے یہ درخواست سختی سے مسترد کر دی۔

مجددی کی دھمکی: اکتوبر کو صبغت اللہ مجددی نے جو کرزئی کے اہم اتحادی اور سینیٹ کے چیئرمین تھے کرزئی کو حکومت سے علیحدگی کی دھمکی دے دی۔ پروفیسر مجددی نے کابل میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب میں کہا: ''حکومت کرپشن میں انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ افغان قوم کے ساتھ بدترین خیانت کی جا رہی ہے۔ غیر ملکی مداخلت اور بدامنی نے عوام کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ میں اس قومی جرم میں مزید شامل نہیں رہنا چاہتا۔ اگر دو ماہ کے اندر نااہل افراد کی برطرفی اور بدعنوان اداروں کی اصلاح نہ کی گئی تو میں حکومت سے تعاون ختم کر دوں گا۔'' مجددی کی یہ دھمکی کرزئی کے لیے غیر معمولی طور پر اہم تھی کیونکہ حامد کرزئی روس سے جہاد کے دور میں مجددی کی تنظیم کے ایک رکن تھے۔

2006ء میں کرزئی طالبان کے حملوں میں بال بال بچتے رہے۔ سال کے اوائل میں وہ قندھار میں قبائلی کے جرگے سے خطاب کرتے ہوئے طالبان کے خودکش حملے میں بال بال بچے تھے۔ سال کے دوران ایک موقعے پر طالبان نے گردیز میں ایک امریکی ہیلی کاپٹر کو نشانہ بنایا۔ ان کو معلوم نہیں تھا کہ اس میں حامد کرزئی بھی سوار ہیں۔ اس حملے میں بھی کرزئی محفوظ رہے۔

صدام حسین کو پھانسی: 2006ء کا اختتام امریکا کی عالم اسلام پر مسلط کردہ جنگ کے ایک تہلکہ خیز واقعے پر ہوا۔ 30 دسمبر 2006ء کو عراق کے دارالحکومت بغداد میں سابق عراقی صدر صدام حسین کو پھانسی دے دی گئی جس سے پورے عالم اسلام میں غم وغصے کی لہر دوڑ گئی۔

صدام حسین 28 اپریل 1937ء کو عراق کے شہر تکریت میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام عبدالمجید تھا۔ دورانِ تعلیم وہ بعث پارٹی کے سرگرم لیڈر بن گئے۔ 1979ء میں انہوں نے بغاوت کر کے عراق کی حکومت سنبھالی۔ اسی سال ایران میں آیت اللہ خمینی کے زیر قیادت برپا ہونے والے شیعہ انقلاب اور افغانستان پر سوویت یونین کی یلغار نے پورے خطے کا منظر نامہ تبدیل کر دیا۔ عالمی طاقتوں کی بھڑکائی ہوئی آگ میں ایران اور عراق بھی کود گئے اور دونوں ملکوں میں دس سال تک خونریز جنگ جاری رہی۔ روس ایران کا اور امریکا عراق کا پشت پناہ تھا۔ افغانستان سے روسی افواج کی واپسی کے ساتھ ہی عالمی طاقتوں نے ایران عراق جنگ میں ایندھن ڈالنے کا سلسلہ بند کر دیا اور یہ 8 سالہ جنگ اختتام پذیر ہوگئی۔ سوویت یونین کی شکست وریخت کے آثار نمایاں ہوتے ہی امریکا نے پوری دنیا کا واحد حکمران بننے کی پالیسی پر عمل شروع کر دیا تھا۔ اس کے لیے وہ خلیجی ممالک، ایران اور مشرق وسطیٰ میں قدم جمانا چاہتا تھا۔ چنانچہ صدام حسین کو اگست 1990ء میں کویت پر قبضہ کرنے کا راستہ دکھایا گیا۔ اس کے بعد امریکا عرب دنیا کو صدام سے بچانے کا فریب دے کر اپنے اتحادیوں سمیت خلیج میں آدھمکا۔ یہ جنگ فروری 1991ء میں عراق کی شکست پر ختم ہوئی تاہم صدام کی حکومت ختم نہ کی جاسکی۔ امریکا کا اصل چہرہ دیکھنے کے بعد صدام حسین نے بڑی طاقتوں کے خلاف جارحانہ رویہ اختیار کر لیا جس کی وجہ سے عراق پر اقتصادی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ اکتوبر 2001ء میں افغانستان پر حملہ کرنے کے ساتھ ہی امریکا نے عراق کو بھی اپنی مہم کا اہم ہدف قرار دے دیا تھا۔ چنانچہ مارچ 2003ء میں امریکا اور اس کے اتحادیوں نے عراق پر یلغار کر کے صدام کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ صدام حسین 13 دسمبر 2003ء کو ایک خفیہ تہہ خانے سے گرفتار کر لیے گئے۔ ان پر 140 سے زائد افراد کو 1982ء میں ماورائے عدالت قتل کرنے کا مقدمہ چلتا رہا جس کے نتیجے میں انہیں سزائے موت سنادی گئی۔

سزا کے لیے عین عیدالاضحیٰ کا دن مقرر کر کے امریکا نے مسلمانوں کی بے بسی کا بھرپور مذاق اُڑایا۔ درحقیقت یہ واقعہ ان بے حمیت مسلم حکمرانوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی تھا جو امریکا کے مفادات کے محافظ بن کر اپنے مسلمان بھائیوں سے نبرد آزما تھے۔ ان کا انجام صدام حسین سے مختلف نہیں ہوسکتا تھا۔

مآخذ و مراجع

⚜ ...... ہفت روزہ ضرب مؤمن، جلد 8، 9، 10

⚜ ...... ہفت روزہ تکبیر، فرائیڈے اسپیشل، غازی: جلد 2005ء، 2006ء

⚜ ...... قومی اخبارات۔ امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور ہفت روزہ جرائد 2005ء، 2006ء

⚜ ...... روزنامہ اسلام کراچی 2005ء، 2006ء

انتالیسواں باب

بش کا آخری راؤنڈ

2007ء کے حالات

افغان مہاجرین کی واپسی کا مسئلہ: افغانستان کے حالات سے پاکستان براہِ راست متاثر ہو رہا تھا۔ جنرل پرویز مشرف کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ آخر پاکستان کب تک لاکھوں افغان مہاجرین کا بوجھ برداشت کرے گا جو اپنے ملک کے حالات ناسازگار ہونے کی وجہ سے پاکستان میں رہائش پذیر ہیں۔ مئی 2006ء کے آغاز میں جنرل پرویز نے اقوامِ متحدہ سے باقاعدہ یہ مطالبہ شروع کر دیا تھا کہ وہ اپنی نگرانی میں پاکستان میں قائم افغان مہاجر کیمپ افغانستان میں منتقل کر دے۔ جنوری 2007ء کے وسط میں جنرل پرویز نے حکومت پاکستان کے افسران کا اعلیٰ سطحی اجلاس بلا کر یہ فیصلہ کرڈالا کہ افغان مہاجرین کو اقوامِ متحدہ کے ذریعے جلد واپس روانہ کر دیا جائے گا، مگر اقوامِ متحدہ اس میں قرار واقعی دلچسپی لیتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

اغوا کے واقعات: 2007ء میں طالبان نے خودکش حملوں کے علاوہ اپنے مطالبات کے لیے اہم افراد کو اغواء کرنے کی حکمت عملی بھی اپنائی اور اس میں خاصے کامیاب رہے۔ جنوری 2007ء میں انہوں نے ہلمند میں 52 سالہ اطالوی صحافی ڈینئل ماستروگان کو ایک افغان صحافی اجمل نقش بندی اور ڈرائیور سید آغا سمیت اغوا کیا۔ کارروائی ملا داداللہ کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ طالبان نے اطالوی صحافی کے بدلے پانچ اہم افراد رہا کروائے جن میں سابق طالبان ترجمان عبداللطیف حکیمی، ملا داداللہ کے بھائی ملا عبدالغفور اور کمانڈر راستادیاسر شامل تھے۔ اطالوی صحافی کو حسبِ وعدہ رہا کرنے کے بعد ملا داداللہ کے حکم پر ڈرائیور سید آغا اور اجمل نقشبندی کو قتل کر دیا گیا۔

قلعہ موسیٰ کا قضیہ: 2007ء کے آغاز میں ہلمند کے علاقے موسیٰ قلعہ نے میڈیا پر بڑی اہمیت اختیار کر لی۔ موسیٰ قلعہ کو ہلمند کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں فراہ اور قندھار کی سڑکوں کے سنگم پر ایک

قدیم قلعہ تھا جسے 220ء میں کوشانی حکمرانوں نے تعمیر کیا تھا۔ یہاں تھیں۔ اصل میں قلعے کا نام کچھ اور تھا مگر اسلامی دور میں یہ موسیٰ قلعہ کہلانے لگا۔ اس علاقے کو منشیات کے گڑھ کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل تھی۔ گزشتہ سال یہاں طالبان اور نیٹو فورسز میں کئی جھڑپوں کے بعد آخرکار مقامی سطح پر جنگ بندی کا ایک معاہدہ ہوا۔ 17/اکتوبر 2006ء کو کیے گئے طالبان اور نیٹو فوج کے باہمی معاہدے میں طے کیا گیا تھا:

① نیٹو فورسز موسیٰ قلعہ سے نکل جائیں گی۔
② طالبان یہاں حملہ نہیں کریں گے۔
③ برطانوی فوج، جس کے پاس اس سال نیٹو فورسز کی کمان تھی، اس علاقے میں صرف افیون کو تلف کرنے کے لیے داخل ہو سکے گی۔
④ وہ عوام کو ایذا نہیں دے گی۔
⑤ فریقین کے انخلاء کے بعد علاقے کا انتظام مقامی عمائد کریں گے۔

معاہدے کے بعد طالبان نے علاقہ خالی کر دیا اور نیٹو افواج بھی وہاں سے چلی گئیں، مگر 2007ء کے آغاز میں 26 جنوری کو نیٹو فورسز نے طیاروں سے بمباری کر کے موسیٰ قلعہ کی آبادی کو شدید نقصان پہنچایا۔ گاؤں کی مسجد بھی شہید ہو گئی۔ اس طرح معاہدہ ٹوٹ گیا اور طالبان نے پیش قدمی کر کے موسیٰ قلعہ کا کنٹرول سنبھال لیا۔ ادھر نیٹو فورسز کی کمان برطانیہ سے امریکی افواج کی طرف منتقل ہو گئی۔ امریکی افسران نے کمان سنبھالتے ہی پورے افغانستان میں طالبان کے خلاف کارروائیاں تیز کر کے اپنی دھاک بٹھانے کی کوشش کی۔ موسیٰ قلعہ میں بھی تجدیدِ معاہدہ کی بجائے آپریشن کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ طالبان نے ردِ عمل کے طور پر مزید پیش قدمی کی اور نیٹو کے منہ پر خاک ڈالتے ہوئے 25 فروری کو "بگواہ" پر بھی قبضہ کر لیا۔

شمالی اتحاد کا کرزئی کے خلاف جلوس: اُدھر کابل میں شمالی اتحاد نے حامد کرزئی کے خلاف محاذ کھول لیا تھا۔ 23 فروری کو دارالحکومت میں شمالی اتحاد کے حامی عوام نے سڑکوں پر کرزئی کے خلاف کھلا مظاہرہ کیا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ مظاہرے کی قیادت کرزئی حکومت کے نائب صدر کریم خلیلی، وزیر دفاع جنرل فہیم اور چیف آف آرمی اسٹاف رشید دوستم کر رہے تھے۔ عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے یہ لوگ کرزئی کے دیگر اقدامات کو نظر انداز کر کے صرف یہ الزام اُٹھا رہے تھے کہ کرزئی سابق مجاہدین کو حکومت سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔

نیٹو کی کچھ کامیابیاں: سال کے آغاز میں نیٹو کو کچھ کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں۔ جنوری کے پہلے ہفتے میں نیٹو افواج نے جنوبی افغانستان کے علاقے ''گرم لیہ'' میں طالبان کے خلاف ایک اور بڑا آپریشن شروع کیا جس میں 13 طالبان شہید ہو گئے اور طالبان کے ترجمان ڈاکٹر حنیف کو گرفتار کرلیا گیا، مگر اتحادی افواج کی ان چھوٹی موٹی کامیابیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میڈیا پر مغربی ممالک کے بڑے بڑے دانشور اور چوٹی کے مبصرین اعتراف کر رہے تھے کہ امریکا عن قریب یہ جنگ ہارنے والا ہے۔

قندھار، کنڑ، لغمان، ہلمند، خوست، پکتیکا، پکتیا، لوگر، زابل، ارزگان اور غزنی میں طالبان نے مضبوط نیٹ ورک قائم کر رکھا تھا۔ سابق مجاہد، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ اور اساتذہ طالبان سے ملتے جا رہے ہیں۔ طالبان کا دوبارہ غلبہ سب کو کھلی آنکھوں سے نظر آ رہا تھا۔ بس امریکا اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے انہیں تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

طالبان سے مذاکرات کے لیے جرگہ بلانے کی تجویز: 5 فروری 2007ء کو سابق افغان سفیر ملا عبدالسلام ضعیف نے اپنے ایک بیان میں مطالبہ کیا کہ عالمی برادری طالبان کو اپنے موقف کی وضاحت کا موقع دے۔ اس سے قبل حامد کرزئی ستمبر 2006ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اجلاس کے موقع پر اس بارے میں صدر بش کو اہم مشورہ دے چکے تھے کہ طالبان سے مفاہمت کے لیے زمین ہموار کرنے کی خاطر افغانستان اور پاکستان کے راہنماؤں پر مشتمل ایک بڑا جرگہ منعقد کیا جائے، بش نے فوری طور پر یہ تجویز جنرل پرویز مشرف کے سامنے رکھی تھی۔ اس کے بعد سے اس بارے میں بات آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔

پاک افغان جرگے کا پہلا دور: مارچ 2007ء کے وسط میں حامد کرزئی کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا آغاز ہو گیا۔ اسلام آباد میں پاک افغان جرگہ کمیشن کا پہلا اجلاس ہوا جس میں دونوں ملکوں کے سربراہوں اور سیاسی راہنماؤں نے اپنے مسائل مل جل کر حل کرنے پر اتفاق کیا۔ حامد کرزئی نے اعلان کیا کہ طالبان کو اقتدار میں شریک کرنے پر غور کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا ہم ملا عمر کے ساتھ مذاکرات کے لیے تیار ہیں۔ یہ پاک افغان جرگے کا پہلا دور تھا۔

سیاف کے ذریعے طالبان کے خلاف محاذ: موسم سرما میں امریکا نے حامد کرزئی کی وساطت سے سابق افغان جہادی لیڈر پروفیسر سیاف کو طالبان کے خلاف کام کرنے کے لیے بھاری مقدار میں اسلحہ اور رقم فراہم کی تھی اور ہدف دیا تھا کہ وہ طالبان کے خلاف بھرپور انداز میں محاذ کھول دیں، مگر تین ماہ گزرنے کے باوجود پروفیسر سیاف اس ہدف میں کوئی ابتدائی کامیابی بھی حاصل نہیں کر سکے تھے جس

سے امریکیوں کو سخت ناراضی ہوئی۔

25 مارچ 2007ء کو امریکی فوج نے یکدم پروفیسر سیاف کے گھر چھاپہ مارا۔ ان پر شک ظاہر کیا گیا کہ وہ امریکا کے مخالف ممالک سے امداد وصول کررہے ہیں۔ تلاشی کے دوران گھر سے 12 کروڑ روپے اور اسلحے کے ذخائر برآمد ہوئے جسے امریکا نے دوسرے ملکوں کی امداد سے تعبیر کیا۔ سیاف نے اس لاقانونیت پر احتجاج کرنا چاہا تو امریکی افسران نے انہیں یہ کہہ کر چپ کرادیا کہ ہم افغان حکومت کے پابند نہیں ہیں اور اپنی مرضی سے ہر کارروائی کر سکتے ہیں۔

<u>حزب اسلامی سے کشیدگی ختم کرنے کی کوشش:</u> حامد کرزئی موسم گرما میں پاک افغان جرگہ منعقد ہونے سے قبل ایک بار پھر حزبِ اسلامی سے روابط بڑھانا چاہتے تھے تاکہ جرگہ نتیجہ خیز بن سکے۔ اٹارنی جنرل عبدالجبار کرزئی اور حزب اسلامی کے درمیان مذاکرات کے لیے سرگرم ہوگیا مگر اس دوران وہ قوتیں حرکت میں آگئیں جو کرزئی اور حزب اسلامی کے قرب سے خطرہ محسوس کرتی تھیں۔ چنانچہ مئی میں جوزجان کے گورنر جمعہ خان ہمدرد کے خلاف مظاہرے شروع ہوگئے۔ ادھر بغلان میں سابق گورنر بشیر بغلانی پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ ان دونوں کا تعلق حزب اسلامی سے رہا تھا۔ سب سے بڑا واقعہ یہ رونما ہوا کہ مئی کے دوران حزب اسلامی کے سینئر راہنما اور وزیر اعظم استاد عبدالصبور فرید کو پراسرار انداز میں قتل کردیا گیا۔ جون کے مہینے میں شمالی اتحاد نے 59 چھوٹی چھوٹی تنظیموں کا ایک نیا اتحاد قائم کرلیا۔ مبصرین کے مطابق اس کا مقصد کرزئی اور حزب اسلامی کے مابین ممکنہ اتحاد کے خطرات کی روک تھام کرنا تھا۔

<u>ملا داداللہ کی شہادت:</u> 13 مئی 2007ء کو ملا داداللہ جاسوسوں کی سازش کا نشانہ بن کر ہوکر شہید ہوگئے۔ طالبان کیلئے یہ واقعہ نہایت افسوس ناک تھا۔ ملا داداللہ امریکیوں کے اعصاب پر سوار ہو چکے تھے اور ان کی پے درپے کارروائیوں نے دشمنوں کو بدحواس کردیا تھا اس لیے وہ امریکا اور اتحادیوں کی ہٹ لسٹ پر تھے۔ ان کے شبے میں درجنوں افراد گرفتار کیے جاچکے تھے۔ جون 2006ء میں ملا داداللہ کی گرفتاری کی خبر نے میڈیا میں تہلکہ مچادیا تھا مگر گرفتار کیا گیا شخص جو ایک پاؤں سے معذور تھا، کوئی اور تھا۔ ملا داداللہ نے جلد ہی میڈیا پر آکر اس خبر کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ دسمبر 2006ء میں ملا داداللہ امریکیوں کی زد میں آئے، مگر بال بال بچ گئے۔ تاہم 13 مئی 2007ء کو وہ نیٹو اور افغان فورسز سے ایک خونریز جنگ کے دوران کسی جاسوس کی نشان دہی پر کی جانے والی بمباری کا شکار ہوکر شہادت کی منزل مراد پاگئے۔

ملا داداللہ کی عمر 39 سال تھی۔ وہ 1969ء میں جنوبی افغانستان کے علاقے ''پنجوائی'' میں پیدا ہوئے تھے۔ ملا محمد عمر کے ساتھ تعلیم حاصل کی تھی۔ جہاد روس میں بھی ان کے ساتھ رہے اور تحریک طالبان میں

بھی شروع سے شریک تھے۔ 1995ء میں بارودی سرنگ کے ایک دھماکے میں ان کی بائیں ٹانگ کام آگئی تھی، تاہم یہ معذوری ان کی سرگرمیوں میں رکاوٹ نہ بن سکی۔ ملا داد اللہ کی شہادت کے بعد اتحادی افواج نے ان کی لاش اپنے قبضے میں لے کر نامعلوم مقام پر دفنا دی تھی۔ طالبان نے ان کی لاش ورثاء کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔ افغان پارلیمنٹ کے کئی ارکان نے جن میں پروفیسر مجددی بھی شامل تھے، اس مطالبے کی حمایت کی مگر بے سود۔ تب طالبان نے افغان ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کو قندھار سے اغواء کر لیا اور اپنے مطالبے کو پورا کرنے کے لیے دباؤ ڈالا۔ آخر کار ملا داد اللہ کی لاش ورثا کے حوالے کر دی گئی۔ طالبان نے افغان ڈاکٹروں کی ٹیم کو رہا کر دیا۔ اس کے علاوہ دو فرانسیسی اغوا شدگان کو بھی رہا کر دیا گیا۔

ملا داد اللہ کی شہادت طالبان کے لیے ایسا ہی سانحہ تھی جیسا کہ ملا بور جان کی شہادت یا ملا محمد ربانی کی وفات۔ طالبان سربراہ ملا محمد عمر نے اس سانحے پر بذاتِ خود شہید کے ورثاء سے تعزیت کی اور ملا داد اللہ کے بھائی ملا عبدالغفور کو ان کا نائب مقرر کر دیا۔ ہزاروں نوجوانوں نے ان کے بیٹے ملا منصور داد اللہ سے خودکش حملوں کے لیے رابطہ کر لیا۔

<u>انتقامی کارروائیاں</u>: اس واقعے کے کچھ دنوں بعد پشاور کے ایک ہوٹل میں خودکش حملے میں چند افراد مارے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ملا داد اللہ کی جاسوسی کرنے والا مخبر یا اس کے قریبی ساتھی اس ہوٹل میں تھے جو دھماکے میں مارے گئے۔ ملا داد اللہ کا انتقام لینے کے لیے طالبان کی کارروائیاں تیز تر ہو گئیں۔ 23 مئی کو پاک افغان سرحد پر اتحادی افواج کے 10 آئل ٹینکرز تباہ کر دیے گئے۔ جون کے ابتدائی دو ہفتوں میں 24 ریموٹ کنٹرول دھماکے کیے گئے۔ طالبان کے خوف سے قندھار میں سرکاری دفاتر سنسان ہو گئے۔ ان حالات میں اٹلی، فرانس اور جرمنی نے نیٹو سے علیحدگی کی دھمکی دے دی۔ جون کے وسط میں ان ممالک نے کہا ہم امریکا اور برطانیہ کے لیے اپنے فوجی نہیں مروا سکتے۔ ہم جانتے ہیں امریکا ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر وسط ایشیا کے تیل اور گیس پر قبضے کے خواب دیکھ رہا ہے۔

<u>کرزئی پر راکٹوں کی بارش</u>: اتوار 17 جون کو صدر حامد کرزئی غزنی کی ایک سرکاری عمارت میں کسی اجلاس سے خطاب کر رہے تھے کہ اچانک طالبان نے عمارت پر راکٹ برسا دیے۔ حامد کرزئی کو دنیا کی گراں ترین سیکیورٹی کمپنی کی خدمات حاصل ہیں جس کی جدید ترین ٹیکنالوجی راکٹ یا میزائل کا رُخ موڑ دیتی ہے۔ چنانچہ راکٹ اپنے ہدف سے ہٹ کر دور جا گرے۔ اس طرح کرزئی ایک بار پھر بچ گئے۔ بعض مبصرین کا کہنا ہے طالبان کرزئی کو قتل کرنا نہیں چاہتے، صرف دباؤ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کے کرزئی پر حملے اکثر ناکام ہوتے نظر آتے ہیں۔

افغان عوام کا قتل عام: طالبان کے مسلسل حملوں کی روک تھام میں ناکام ہو کر جون کے اواخر میں اتحادیوں نے ایک بار پھر افغان عوام کے قتل عام کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جون 2007ء کے آخری ہفتے میں ارزگان، زابل، ہلمند، قندھار، پکتیا، وردگ اور غزنی کے شہریوں پر اندھا دھند بمباری کی گئی جس سے خواتین اور بچوں سمیت 213 افراد شہید ہو گئے۔ ارزگان کے مرکز ترین کوٹ سے 24 کلومیٹر دور ضلع چودہ کی آبادی کو مکمل طور پر فنا کر دیا گیا۔

اس ظلم پر حامد کرزئی بھی خاموش نہ رہ سکے۔ ہفتہ 23 جون کو انہوں نے صدارتی محل میں صحافیوں کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''ہمارے لیے بے گناہ افغانوں کی مزید ہلاکتیں ناقابل برداشت ہیں۔ اگر اتحادی افواج کو یہی کچھ کرنا ہے تو ہمیں ان کی ضرورت نہیں، کیونکہ ان کے رہنے کا مقصد عوام کا تحفظ ہے نہ کہ ان کی ہلاکت۔''

پاک افغان تعلقات میں بہتری: اسلام آباد میں پاک افغان سربراہوں کی ملاقات کے بعد دوطرفہ تعلقات میں خاصی بہتری نظر آ رہی تھی۔ پاکستان افغانستان سے تعاون میں پیش رفت کر رہا تھا۔ اپریل 2007ء میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان نے افغانستان کو 100 بسیں اور ٹی وی ٹرانسمیٹر تحفے میں دیے تھے۔ پاکستانی حکام نے کچھ عرصے قبل طورخم سے جلال آباد تک 75 کلومیٹر طویل شاہراہ اور جلال آباد شہر کی اندرونی پونے چار کلومیٹر کی سڑکیں تعمیر کروائی تھیں۔ ان کے علاوہ کئی منصوبوں پر کام اور بعض کا سروے جاری تھا۔

حامد کرزئی پاکستان سے مل کر ایک اور اہم کام کروانا چاہتے تھے اور وہ تھا ڈیورنڈ لائن کا خاتمہ۔ وہ ظاہر شاہ کی طرح اس موقف پر اٹل تھے کہ ڈیورنڈ لائن کے پار اٹک تک کا علاقہ افغانستان کا ہے جو 1897ء کے معاہدے کے مطابق دوبارہ افغانستان کو مل جانا چاہیے۔ 12 اپریل کو انہوں نے جلال آباد یونیورسٹی میں پختون کانگریسی راہنما ''خان عبدالغفار خان'' کی یاد میں ''باچا خان کمپلیکس'' کی تعمیر نو کا اعلان کیا۔ خان عبدالغفار خان بھی ڈیورنڈ لائن کے تصور کو مسترد کرتے تھے۔ حامد کرزئی نے بھی اس موقع پر اپنے خطاب میں ڈیورنڈ لائن کے خاتمے پر اصرار کیا۔

امن جرگے کے لیے پاک افغان مذاکرات: اس دوران پاک افغان جرگے کے لیے کوششیں جاری تھیں۔ اس کے انعقاد سے قبل افغان حکومت اور امریکا نے طالبان کو تقسیم کرنے کی کوششیں بھی کیں۔ میڈیا پر بعض طالبان لیڈروں کو معتدل اور دوسروں کو سخت گیر موقف کا حامی قرار دینے لگا۔ اس پر ملا عبدالسلام ضعیف نے 12 اپریل کو اپنے بیان میں کہا: ''طالبان کے درمیان روشن خیال اور سخت گیر کی

تفریق غلط ہے۔ ان کی جنگ غیر ملکی افواج کے خلاف ہے اور وہ سب متحد ہیں۔ ان کی تقسیم کا خیال وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ یہ ایک سازش ہے جو ناکام رہے گی۔"

3 مئی 2007ء کو کابل میں پاک افغان جرگے کے لیے مذاکرات کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس اجلاس میں طے ہوا کہ جرگے میں 800 افراد کو مدعو کیا جائے گا جن میں سے نصف پاکستان کے اور نصف افغانستان کے ہوں گے۔ آخر کار 9راگست 2007ء کو کابل میں پاک افغان امن جرگے کا انعقاد بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ دونوں ملکوں سے 700 کے لگ بھگ ارکان اس میں شرکت کر رہے تھے۔ پاکستانی وفد کی قیادت وفاقی وزیر داخلہ آفتاب شیر پاؤ کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ مولانا محمد خان شیرانی، محمود خان اچکزئی اور اسفند یار ولی بھی شامل تھے۔ افغانستان کی طرف سے صدر حامد کرزئی کی سرکردگی میں پارلیمنٹ کے اسپیکر یونس قانونی کے علاوہ پروفیسر صبغت اللہ مجددی، برہان الدین ربانی اور عبدالرب رسول سیاف شریک تھے۔

اس چار روزہ اجلاس میں افغانستان سے امریکی فوج کے انخلاء، طالبان اور حزب اسلامی سے مذاکرات اور قیام امن تک مسلم ملکوں کی متبادل افواج کی افغانستان میں تعیناتی پر بحث ہوئی۔ آخر میں طالبان اور حزب اسلامی سے مذاکرات کے لیے 50 رکنی کمیٹی کا انتخاب کیا گیا۔ یاد رہے پاکستان کی جانب سے جنرل پرویز مشرف کا اس جرگے میں شرکت کرنا طے تھا مگر جرگے سے قبل افغان صدر کی جانب سے پاکستان کے خلاف کچھ نازیبا گفتگو اور الزام تراشی کے ردعمل میں جنرل پرویز نے عین وقت پر کابل روانگی کا فیصلہ منسوخ کر دیا تھا۔ چونکہ یہ جرگہ درحقیقت میں امریکا کے ایما پر منعقد ہوا تھا اس لیے اس میں امریکی مفادات کا تحفظ اہم ہدف تھا۔ امریکا کی کوشش یہ تھی کہ جرگے میں طالبان اور حزب اسلامی سے معاملات طے کرنے اور مذاکرات شروع کرنے پر اتفاق ہو جائے مگر القاعدہ کے معاملات کو الگ رکھا جائے۔ چنانچہ یہی ہوا اور مذاکرات کی گفتگو میں القاعدہ اور غیر ملکی مجاہدین کے مسئلے کو نظر انداز کر دیا گیا۔

جرگے میں پاک افغان تعلقات کے بارے میں کئی اہم امور پر اتفاق ہوا جو درج ذیل ہیں:

① پاکستان اور افغانستان باہمی معاملات مل جل کر مذاکرات کے ذریعے حل کریں گے۔

② سرحدوں سے دراندازی اور مداخلت کا خاتمہ کیا جائے گا۔

③ دوطرفہ تعلقات میں بہتری لائی جائے گی۔

④ مطلوبہ معلومات کا باہم تبادلہ کیا جائے گا۔

⑤ افغان مہاجرین کی باعزت واپسی جلد ممکن بنائی جائے گی۔ ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی

بند کی جائے گی۔

(۶) دونوں ملک اپنی سرزمین ایک دوسرے کے خلاف استعمال نہیں ہونے دیں گے۔

جرگے کے نتائج: مبصرین کے مطابق چونکہ جرگے میں شروع سے طالبان کے نمایندوں کو شامل نہیں کیا گیا تھا اس لیے اس سے مطلوبہ نتائج کا حصول بعید نظر آرہا تھا۔ جرگے کے اختتام سے ایک گھنٹہ قبل طالبان نے ننگرہار میں ایک امریکی گاڑی تباہ کر کے چار فوجیوں کو ہلاک کر دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ میدان میں اب بھی وہی غالب ہیں۔ اس کے علاوہ طالبان نے کوریا کی ایک مشنری ٹیم کو اغوا کر کے بھی شروع سے میڈیا کی توجہ اپنی طرف مبذول رکھی تھی۔ جرگے کا اہم ترین مقصد طالبان سے مذاکرات کی راہ نکالنا تھا، مگر اس کے لیے جو طریقہ کار اپنایا گیا، وہ بے حد اُلجھاؤ والا تھا۔ 50 رکنی کمیٹی جس کو طالبان سے بات چیت کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، اپنا کام شروع نہ کر سکی کیونکہ شمالی اتحاد کو اس کے ارکان کے انتخاب پر اعتراض تھا۔

کرزئی کا طالبان سے مذاکرات کے لیے رابطہ: اس کے باوجود حامد کرزئی نے ستمبر میں اپنے طور پر مذاکرات کی تیاری کر لی، امریکا نے خفیہ طور پر انہیں خبردار کر دیا تھا کہ مذاکرات کی وجہ سے 11 ستمبر کے بعد ہونے والی سیاسی واقتصادی تبدیلیاں متاثر نہ ہونے پائیں۔ کرزئی کے طالبان سے مذاکرات کی خبر سے شمالی اتحاد میں کھلبلی مچ گئی مگر کرزئی نے پروا نہ کی۔

4 اکتوبر کو حامد کرزئی نے اپنے بیان میں کہا: ''اگر مجھے مذاکرات کے لیے ملا عمر یا حکمت یار کے پاس جانا پڑا تو میں جاؤں گا۔'' اس کے بعد کرزئی کی طالبان سے بالواسطہ گفت وشنید شروع ہوگئی۔ طالبان نے ایک بار پھر مذاکرات کو 50 ہزار غیر ملکی فوجیوں کے انخلاء سے مشروط کیا۔ کرزئی نے کہا: ''ایسا ہوا تو ملک پھر 1990ء کی دہائی جیسے حالات کا شکار ہو جائے گا۔'' طالبان نے جواب دیا: ''غیر ملکی افواج کی موجودگی میں مذاکرات بے معنی ہوں گے۔'' غیر ملکی مجاہدین کا مسئلہ بھی اس گفت وشنید کی ناکامی کا سبب بنا اور رابطے منقطع ہو گئے۔

تاہم پاک افغان جرگے میں طے کردہ مذاکراتی کمیٹی کے ذریعے طالبان سے گفتگو کا امکان پھر بھی باقی تھا۔ چونکہ 50 ارکان پر مشتمل اس کمیٹی پر شمالی اتحاد معترض تھا اس لیے دسمبر کے آغاز میں حامد کرزئی نے شمالی اتحاد کے لیڈر ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ کی قیادت میں 25 رکنی نیا امن جرگہ تشکیل دیا جو شمالی اتحاد کے عناصر کے غلبے کی وجہ سے بالکل ناموزوں ثابت ہوا، کیونکہ طالبان پختون لیڈروں سے شاید بات کر لیتے مگر شمالی اتحاد کے لیڈر کی سربراہی میں کسی امن کمیٹی سے مذاکرات ان کے نزدیک وقت کے ضیاع کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ تھا ذکر پاک افغان جرگے اور طالبان سے مذاکرات کی ناکام کوششوں کا۔

طالبان کی کارروائیاں: اس کے علاوہ 2007ء میں اور بہت سے اہم واقعات پیش آئے۔ میدانِ جنگ میں حسب سابق طالبان چھائے رہے۔ سب سے دھما کا خیز کارروائی اس وقت ہوئی جب مارچ کے آغاز میں نائب امریکی صدر ڈک چینی نے اپنی افواج کو حوصلہ دینے کے لیے افغانستان کا دورہ کیا۔ منگل 6 مارچ کو وہ بگرام ایربیس کے امریکی فوجی اڈے سے حامد کرزئی کے صدارتی محل جانے کے لیے نکل رہے تھے۔ عین اسی وقت ایک فدائی حملہ آور ان گنت رکاوٹیں عبور کرتا ہوا، اڈے کے مرکزی گیٹ تک پہنچ گیا اور سیکیورٹی اہلکاروں کے روکنے پر اس نے خود کو دھماکے سے اُڑا دیا جس سے 15 / افراد ہلاک اور 27 زخمی ہو گئے۔ ڈک چینی چند لمحوں اور تھوڑے سے فاصلے کے فرق سے بچ گئے۔ اس حملے سے امریکی حکام لرز کر رہ گئے۔ 18 / اپریل کو طالبان نے غزنی میں نیٹو کا ہیلی کاپٹر مار گرایا۔

طالبان نے اس سال ایک اور ہدف کی طرف توجہ دی۔ یعنی وہ اتحادی افواج کو تیل سپلائی کرنے والے قافلوں کو ایک تسلسل سے نشانہ بنانے لگے۔ 23 مئی کو پاک افغان سرحد پر اتحادی افواج کے 10 / آئل ٹینکرز تباہ کر دیے گئے۔ اس کے بعد ایسی کارروائیاں لگا تار ہونے لگیں۔ 18 جون کو کابل میں افغان پولیس کی وین پر خودکش حملہ ہوا جس میں 22 پولیس انسٹرکٹر سمیت 39 افراد مارے گئے جبکہ 52 افراد زخمی ہوئے۔ ذرائع کے مطابق 2001ء سے لے کر اب تک یہ سب سے بڑا دھما کا تھا۔ جو کابل شہر کے عین وسط میں ہوا جس سے دور دور تک کی عمارتیں لرز گئیں۔ طالبان نے ایک بڑی جست یہ لگائی کہ پہلی بار مضبوط بنیادوں پر شمال اور مغربی افغانستان کے امریکا مخالف جہادی کمانڈروں سے رابطے قائم کیے۔ جون کے وسط میں طالبان اور سابق جہادی تنظیموں کے ہزاروں مسلح مجاہدین افغانستان کے شمال اور جنوب مغرب میں امریکا اور اتحادی افواج کے خلاف ''ٹائیگر آپریشن'' کے نام سے ایک مشترکہ مہم کا آغاز کرنے پر متفق ہو گئے۔ آپریشن کی کارروائیوں کے لیے طالبان اور سابق جہادی کمانڈروں نے مشترکہ طور پر ایک جہادی کونسل بھی قائم کر دی جس میں بدخشاں، تخار، قندوز، مزار شریف، بغلان، سمنگان، جوزجان، سرپل، ہرات، بادغیس اور کاپیسا کے کمانڈر شامل تھے۔ اس آپریشن کے تحت کی گئی کارروائیوں میں صرف ماہ جون میں 16 / اتحادی اور 50 افغان حکومت کے سپاہی کیفر کردار تک پہنچائے گئے۔

ملک کی حالت زار: اس دوران افغانستان کی حالت کیا تھی؟ ایک سروے کے مطابق ملک بھر میں صرف 6 فیصد شہریوں کو بجلی کی سہولت میسر تھی۔ صرف 13 فیصد عوام کو پینے کا صاف پانی مہیا تھا۔ 30 فیصد بچے 5 سال کی عمر تک پہنچنے سے قبل مر رہے تھے۔ 42 فیصد خواتین زچگی کے دوران فوت ہو رہی

تھیں۔ بیماریوں میں خطرناک حد تک اضافے اور طبی سہولیات کی نایابی نے 60 لاکھ افغانوں کو زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ بے روزگاری کی شرح 75 فیصد سے زائد ہو چکی تھی۔ 6 سال میں ہزاروں افراد کو القاعدہ اور طالبان سے تعلق کے شبے میں ٹارچر کیا گیا تھا۔ ملکی تعمیر و ترقی کی رفتار نہ ہونے کے برابر تھی۔ پارلیمنٹ کے ارکان شرمندگی کی وجہ سے اپنے اپنے حلقہ انتخاب میں جانے سے کتراتے تھے۔ امریکی و اتحادی افواج ہر قانون سے بالاتر تھیں اور وہ بے گناہ شہریوں پر اندھا دھند بمباری کرتے اپنی ہوسِ فتح یابی کو تسکین دیتی رہتی تھیں۔

عیسائی مشنریوں کا اغوا: 19 جولائی کو طالبان نے کابل قندھار شاہراہ سے کوریا کے 23 عیسائی مشنریوں کو اغوا کر لیا جس سے دنیا بھر میں کھلبلی مچ گئی۔ طالبان نے ان کے بدلے اپنے 8 گرفتار شدگان کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ جن کے نام یہ ہیں: ڈاکٹر عبدالواسع، مولوی عثمان، ضیا احمد، مجیب الرحمن، سلمان، محمود حسین، بلادر خان، انوار اللہ۔

ان میں سے پانچ پل چرخی اور تین بگرام ایئر بیس کی امریکی جیل میں تھے۔ طالبان کے اس مطالبے کے جواب میں صدر بش نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا۔ حامد کرزئی بھی یہ دیکھ کر خاموش رہے۔ آخر ڈیڈ لائن ختم ہونے پر طالبان نے دو اغوا شدگان کو قتل کر دیا۔ یہ معاملہ اگست میں پاک افغان جرگے کے دوران میڈیا پر سرفہرست رہا تھا اور طالبان کی قوت کا نشان بن گیا تھا۔ جرگے کے بعد طالبان نے بقیہ اغوا شدگان کو خیر سگالی کے تحت رہا کر دیا۔

اتحادیوں کا گرتا ہوا مورال: آغاز اگست میں اتحادی افواج کے کمانڈر رچرڈ ڈیوڈ نے اعتراف کیا کہ ہم افغانستان میں شکست سے دوچار ہیں۔ اواخرِ نومبر میں برطانوی اخبارات نے انکشاف کیا کہ گزشتہ 6 ماہ کے دوران 1344 برطانوی افسران فوج سے مستعفی ہو چکے ہیں۔ مبصرین اسے عراق و افغانستان میں مسلسل شکستوں سے عارضی نفسیاتی تھکن کا نتیجہ بتلاتے تھے۔ مارچ 2007ء میں افغان وزارت دفاع کے ایک اہم عہدے دار کی مرتب کردہ رپورٹ کے مطابق 6 سالہ جنگ میں 2 ہزار امریکی فوجی ہلاک اور 4 ہزار زخمی ہو چکے تھے۔ اکثر زخمی عمر بھر کے لیے اپاج ہو گئے تھے۔ 17 سو فوجی پاگل ہو چکے تھے۔

امریکا کا پاکستان پر شک: 14 اگست 2007ء کو امریکی حکومت نے پاکستانی حکام پر لرزہ طاری کر دیا۔ امریکا نے طالبان اور پاکستان کے تعلقات کے دستاویزی ثبوت فراہم کیے اور دعویٰ کیا کہ اکثر طالبان لیڈر پاکستان میں پناہ گزین ہیں جنہیں پاکستان نقد رقم اور اسلحہ دے رہا ہے۔ امریکی ماہرین کا

کہنا تھا کہ پاکستان اپنے دفاع کے لیے زمینی وسعت حاصل کرنے کی خاطر طالبان کی فتح کو ضروری سمجھتا ہے اس لیے ان سے خفیہ تعاون کر رہا ہے۔ تاہم پاکستان نے ان الزامات کی پرزور تردید کی۔

طالبان کے لیے ایرانی اسلحہ: ستمبر میں الجزیرہ ٹی وی نے ایک عجیب خبر دی جس میں کہا گیا تھا: ''6 ستمبر کو فراہ میں طالبان کے لیے جانے والے ایرانی اسلحے کی بہت بڑی کھیپ پکڑی گئی۔ اپریل میں پکڑی جانے والی کھیپ کے بعد ایرانی اسلحے کا یہ سب سے بڑا ذخیرہ ہے جو اتحادی افواج کے ہاتھ آیا ہے۔ اس میں ایرانی، روسی اور چینی ساختہ اینٹی کرافٹ میزائل بھی شامل ہیں۔'' برطانوی حکام بھی یہ کہہ چکے تھے کہ طالبان نے ان کے کئی طیاروں اور ہیلی کاپٹروں کو چینی ساختہ H.N-5 میزائل سے نشانہ بنایا ہے۔

تیز تر ہوتی جنگ: 7 اکتوبر کو امریکی حملے کے چھ سال مکمل ہونے کے موقع پر کابل میں فوجی وردی میں ملبوس ایک فدائی نے افغان فوج کی بس میں گھس کر دھماکا کر دیا جس سے 30 فوجی مارے گئے۔ انہی دنوں این جی او سیفٹی آفس نے ایسی کارروائیوں کے تناظر میں رپورٹ دی کہ طالبان کابل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ طالبان کے حملوں میں اس سال 90 فیصد اضافہ ہوا ہے اور اب ہر ماہ 25 فیصد اضافہ ریکارڈ کیا جا رہا ہے۔ جنوری 2007ء میں ماہانہ حملے 139 تھے جو جولائی 2003ء میں ماہانہ 405 ریکارڈ کیے گئے۔

برطانوی وزیر اعظم گورڈن براؤن نے 10 اکتوبر کو امریکا کے لیے اپنے پیغام میں کہا: ''افغانستان میں ہم جھڑپیں جیت رہے ہیں مگر جنگ ہار رہے ہیں۔''

نومبر میں صورتِ حال یہ تھی کہ فراہ کے ضلع بکواہ پر طالبان کے قبضے کو خود کرزئی حکومت نے خفیہ طور پر تسلیم کرتے ہوئے طالبان کے ضلعی کمشنر مولوی عبدالرحمن کو فنڈز جاری کر دیے تھے۔ جنوبی افغانستان میں طالبان کی متوازی شریعت کورٹوں میں عوام کا تانتا بندھا ہوا تھا جو حکومتی اداروں کی رشوت ستانی سے عاجز آئے ہوئے تھے۔ کئی اضلاع میں طالبان اور کرزئی حکومت میں معاہدہ ہو گیا تھا کہ یہاں غیر ملکی افواج نہیں آئیں گی۔

اس سال طالبان کی ایک اہم کارروائی نومبر کے آغاز میں بغلان کے علاقے شہر کہنہ میں ہوئی۔ جس میں افغان حکومت کے چھ اراکین اسمبلی ایک ساتھ لقمۂ اجل بن گئے۔ ہلاک شدگان میں شمالی اتحاد کے سیاسی مشیر و ہزارہ لیڈر مصطفیٰ کاظمی کے علاوہ نازک میر، سرفراز، حاجی ظریف، انجینئر متین اور سیف الرحمن شامل تھے۔

نومبر کے آخری ہفتے میں طالبان کے تین اہم کمانڈر جنہیں 20،20 سال قید کی سزا سنائی گئی تھی، پل

چرخی جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں طالبان شوریٰ کے رکن ملانقیب کے علاوہ ملا ترابی اور ملا عبدالہادی شامل تھے۔ 12 دسمبر 2007ء کو طالبان نے وردگ میں ایک ہیلی کاپٹر مار گرایا جس میں 30 اتحادی ہلاک ہو گئے۔ اسی مہینے امریکا کے فرنٹ لائن اتحادی جنرل پرویز مشرف نے پاکستانی عوام کے بے پناہ دباؤ پر فوجی وردی اُتار دی۔

<u>تحریفِ قرآن کا مجرم گرفتار</u>: اس سال کی ایک اہم خبر 13 دسمبر کو طورخم بارڈر پر تحریف قرآن مجید کے مجرم ''بختیار'' کی گرفتاری تھی۔ اس امریکی نژاد افغان مصنف نے قرآن مجید کا عربی عبارت کے بغیر فارسی ترجمہ لکھا تھا جس میں بے پناہ تحریف کی گئی تھی مثلاً شفاعت کا انکار کیا تھا، یہودیت اور عیسائیت کو برحق مانا گیا تھا۔ ترجمے کا ناشر ''غوث زلمانی'' تھا جو اٹارنی جنرل کا ترجمان تھا۔ نومبر کے مہینے میں افغان یونیورسٹی کے طلبہ اور عوام نے اس پر زبردست احتجاج کیا تھا اور کابل جلال آباد شاہراہ بند کر دی تھی۔ مظاہرین نے مصنف اور ناشر کو پھانسی دینے کا مطالبہ کیا تھا۔ آخر کار عوامی دباؤ پر افغان حکومت نے مصنف کو طورخم بارڈر عبور کرتے ہوئے گرفتار کر لیا۔ اس قسم کی خبروں سے افغان عوام کی دینی غیرت زندہ ہونے کا واضح ثبوت مل رہا تھا۔

<u>امریکا کو کرزئی کے متبادل کی تلاش</u>: سال کے آخری ایام میں امریکا اور اس کے اتحادی حامد کرزئی کو ہٹانے پر غور کرنے لگے تھے۔ متبادل کے طور پر سابق وزیر داخلہ علی احمد جلالی اور زلمے خلیل زاد کے نام زیر غور تھے، مگر خاندانی پس منظر کے باعث سابق بادشاہ ظاہر شاہ کے پوتے مصطفیٰ ظاہر کو زیادہ موزوں تصور کیا جا رہا تھا۔ امریکا اور اتحادی ممالک کا کہنا تھا حامد کرزئی طالبان کو شکست دینے اور ملک پر اپنا کنٹرول قائم کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ کرزئی کے بھائی احمد ولی کرزئی پر منشیات کے عالمی اسمگلروں کے ساتھ کام کرنے کا الزام بھی بدنامی کا باعث تھا۔

<u>کرزئی کا طالبان کے لیے پیغام</u>: کرزئی کو بھی ان ارادوں کی بھنک پڑ چکی تھی، اس لیے دسمبر میں انہوں نے خفیہ طور پر ایک بار پھر طالبان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی طرف سے اپنے بھائی احمد ولی کرزئی کو مذاکرات کے لیے نامزد کرتے ہوئے طالبان کو اپنے خفیہ پیغام میں کہا: ''ملک کو اندرونی و بیرونی طور پر شدید خطرات لاحق ہیں۔ شمالی اتحاد اور جنگجو سرداروں سے نجات کے لیے آپ کا تعاون نہایت ضروری ہے۔ امریکی و اتحادی افواج کی مداخلت نے عوام میں شدید نفرت پیدا کر دی ہے۔ ہم ملا محمد عمر مجاہد سے اس معاملے میں فوری طور پر مذاکرات کرنا چاہتے ہیں۔ اس ابتدائی مرحلے میں شمالی اتحاد اور امریکا کو بات چیت سے ہرگز آگاہ نہ کیا جائے۔''

تاہم طالبان نے اس بار بھی غیر ملکی افواج کے غیر مشروط انخلاء کے بغیر مذاکرات کو لا حاصل قرار دے کر مذاکرات پر آمادگی سے انکار کر دیا۔

اقوام متحدہ کی سالانہ رپورٹ برائے افغانستان: اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق 2007ء کے دوران طالبان کی مزاحمت میں حد سے زیادہ اضافہ ہوا تھا۔ اس سال مسلح جھڑپوں میں 850 افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے جس میں 500 عام شہری تھے۔ اس سال خودکش حملوں کا تناسب بھی بڑھ گیا۔ 2006ء میں 123 خودکش حملے ہوئے تھے جبکہ 2007ء میں ان کی تعداد 160 تک پہنچ گئی۔ امریکا اور اس کے اتحادیوں کو اس سال صرف ایک کامیابی حاصل ہوگئی تھی جب دسمبر میں نیٹو افواج نے ایک بڑا آپریشن کر کے موسیٰ قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس طرح نیٹو کی کمان یہ کہنے کے قابل ہوئی کہ وہ بھی کچھ کر کے دکھا سکتی ہے۔

ظاہر شاہ کی وفات: اس سال افغانستان کے سابق بادشاہ ظاہر شاہ 93 سال کی عمر میں فوت ہو گئے۔ وہ 15 / اکتوبر 1914ء کو کابل میں بارک زئی شاہی خاندان کے ایک اہم رکن نادر خان کے ہاں پیدا ہوئے تھے۔ نادر شاہ بعد میں افغانستان سپہ سالار اور پھر بادشاہ بنے۔ جب انہیں قتل کر دیا گیا تو 8 نومبر 1933ء کو ظاہر شاہ نے تاج و تخت سنبھالا۔ 1973ء میں داؤد خان کی بغاوت کے باعث وہ اقتدار سے محروم ہو کر جلاوطن ہو گئے۔ 2002ء میں وہ لویہ جرگہ کے موقع پر اپنے وطن واپس آ گئے۔ اس موقع پر انہیں ''فادر آف نیشن'' کا خطاب دیا گیا۔ 2004ء میں وہ شدید علیل ہو گئے۔ دہلی میں ان کا علاج ہوا۔ عرب امارات کے ہسپتال میں بھی داخل رہے۔ کچھ افاقہ ہونے پر وطن واپس آ گئے۔ 23 جولائی 2007ء کو کابل کے صدارتی محل میں انہوں نے دنیائے فانی کو الوداع کہا اور کابل میں دفن ہوئے۔

اگرچہ ظاہر شاہ کے دور میں کمیونسٹوں نے عروج پایا اور افغانستان میں جدت پسندی کو فروغ ملا مگر ظاہر شاہ ذاتی طور پر کمیونسٹوں کے مخالف تھے۔ وہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان اور نماز روزے کے پابند تھے۔ اپنے والد کی طرح انہیں بھی اکابرِ دیوبند سے عقیدت تھی اور دار العلوم دیوبند سے ان کا نیازمندانہ تعلق ایک عرصے تک برقرار رہا۔ دار العلوم کا ایک دروازہ ''باب الظاہر'' انہی کے نام پر تعمیر کیا گیا ہے۔

2008ء میں طالبان کی کامیابیاں

موسیٰ قلعہ میں مُلا عبد السلام کی تعیناتی: سال 2008ء کا آغاز موسیٰ قلعہ کے قضیے سے ہوا۔ ہر چند کہ نیٹو نے یہاں قبضہ کر لیا تھا مگر اسے برقرار رکھنا اس کے لیے بے حد مشکل تھا۔ طالبان کے زبردست جوابی حملوں کا خوف ہر آن موجود تھا۔ چنانچہ 4 جنوری 2008ء کو برطانوی اور افغان فوج نے مقامی

عمائد سے مذاکرات کر کے یہاں کا انتظام طالبان کے ایک حامی کمشنر ملا عبدالسلام کے سپرد کر دیا۔ ملا عبدالسلام ہلمند ضلع ''کجکی'' کے گاؤں ''شاویز'' میں ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی تعیناتی کے بعد قلعہ موسیٰ میں امن وامان قائم ہو گیا۔

برف باری کے موسم میں طالبان کی کارروائیاں تقریباً تھمی رہیں۔ فروری کے وسط میں قندھار میں کتوں کی لڑائی دیکھنے والے مجمع کے درمیان ایک نہایت ہولناک بم دھماکا ہوا۔ موقع پر موجود 150ر افراد میں سے 80 وہیں موت کے گھاٹ اُتر گئے جبکہ سو کے لگ بھگ زخمی ہو گئے۔ اس لرزہ خیز واردات کی ذمہ داری کسی نے قبول نہ کی۔

برطانوی شہزادے ''ہیری'' کی آمد و رفت: برطانوی شہزادے چارلس کے فرزند شہزادہ ہیری ان دنوں اپنی افواج کا حوصلہ بڑھانے کے لیے افغانستان آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنا وقت انتہائی سخت سیکیورٹی میں چھاؤنی کے اندر گزارا۔ مارچ کے آغاز میں جبکہ افغانستان میں محاذ گرم ہونے کے دن آرہے تھے، شہزادے نے برطانیہ کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ وطن پہنچ کر شہزادے نے اقرار کیا کہ محاذ سے جلد واپسی ان کے لیے باعثِ شرمندگی ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ وہ واپس آکر برطانیہ میں دہشت گردوں کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ شہزادے کا یہ بیان اس خوف و دہشت کی صحیح عکاسی کرتا ہے جو امریکی اتحاد میں شامل ہر سپاہی افغانستان سے ساتھ لے کر واپس آتا ہے۔

موسمِ بہار اور کابل میں ہلچل: موسمِ بہار شروع ہوتے ہی طالبان کے زوردار حملوں نے ملک بھر میں خوف کی ایک لہر دوڑا دی۔ 9ر ہزار طالبان کابل کے اردگرد موجود تھے جن میں ایک ہزار خودکش حملہ آور صرف ایک اشارے کے منتظر تھے۔ کابل میں دفاعی تیاریوں کے لیے ہلچل مچ گئی۔ فورسز کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا۔ اس سال افغان فوج کی تعداد کا ہدف 70 ہزار مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے بغیر کابل اور دوسرے بڑے شہروں کی حفاظت ممکن نہیں تھی۔ طالبان نے اب ذرا مختلف قسم کی کارروائیاں بھی شروع کر رکھی تھیں۔ وہ بعض علاقوں میں موبائل فون کمپنیوں کے ٹاوروں کو بھی اُڑا رہے تھے۔

ڈنمارک کی فوج پر حملہ: اس سال کے آغاز میں یورپی میڈیا نے توہینِ رسالت پر مبنی خاکے شائع کر کے دنیا بھر کے مسلمانوں کو شدید ذہنی صدمہ پہنچایا تھا۔ ڈنمارک اور جرمنی ان گستاخانہ حرکات میں پیش پیش تھے۔ طالبان ان سے انتقام لینے کے لیے بے چین تھے۔ مارچ کے وسط میں انہوں نے ڈنمارک کے فوجی قافلے پر حملے کا موقع ڈھونڈ نکالا۔ یہ قافلہ ہلمند کے ضلع گریشک میں گشت کے دوران ایک بازار سے گزر رہا تھا کہ طالبان نے خودکش حملہ کر دیا۔ ڈنمارک کے چار فوجی مارے گئے جبکہ متعدد زخمی ہوئے۔

حاجی عبدالکبیر کا قتل: اگلے ہفتے طالبان نے سروبی میں اتحادیوں کا جاسوس طیارہ مار گرایا۔ مقامی مخالفین کو بھی نشانہ بنایا جارہا تھا۔ سابق جہادی لیڈر اور موجودہ حکومت نواز کمانڈر حاجی عبدالکبیر کو انہی دنوں گولیوں سے اُڑا دیا گیا۔

اسی ہفتے طالبان کے خلاف ایک بڑا آپریشن ہوا۔ افغان وزارتِ دفاع کے مطابق اس کارروائی میں طالبان کمانڈر ملا ہاشم سمیت 45 طالبان قتل کر دیے گئے۔

بھارتی انجینئر نشانہ بن گئے: اپریل کے دوسرے ہفتے میں طالبان نے مختلف کارروائیوں میں 6 امریکی اور 13 نیٹو کے فوجی ہلاک کر دیے۔ اسی ہفتے انہوں نے نیمروز میں بھارتی انجینئروں کے ایک قافلے پر حملہ کر کے دو انجینئروں کو مار ڈالا۔ پاک افغان سرحد پر تعینات افغان سیکیورٹی فورسز پر بھی حملہ ہوا جس میں 15 سپاہی ہلاک اور 24 زخمی ہوئے۔

حامد کرزئی پر قاتلانہ حملہ: 26 اپریل کو کابل میں کمیونسٹوں کے خلاف فتح کی 16 ویں سالگرہ منائی جارہی تھی۔ نیشنل اسٹیڈیم کو تقریب کے لیے خصوصی طور پر سجایا گیا تھا۔ طالبان کے ممکنہ حملے کے خطرے کے پیشِ نظر سخت ترین حفاظتی انتظامات کر لیے گئے تھے۔ تقریب طے شدہ پروگرام کے مطابق جاری تھی۔ حامد کرزئی فوجی پریڈ کے معائنے کے بعد اسٹیج پر امریکی سفیر کے ساتھ براجمان تھے۔ افغانستان کا قومی ترانہ لگایا جارہا تھا کہ اچانک فائرنگ اور دھماکوں سے ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ حملہ طالبان نے کیا تھا۔ حامد کرزئی اور امریکی سفیر جو گولیوں کا اصل ہدف تھے، بال بال بچ گئے، جبکہ اسٹیج پر موجود ایک رکن قومی اسمبلی مارا گیا۔ 11 افراد شدید زخمی ہوئے۔ اس کارروائی سے کرزئی انتظامیہ پر طالبان کا دباؤ کئی گنا بڑھ گیا۔

ارگون میں نیٹو کا کرنل ہلاک: مئی کے دوسرے ہفتے میں پکتیکا کے علاقے ارگون میں طالبان اور نیٹو افواج کے مابین ایک خونریز معرکہ ہوا۔ طالبان نے ایک بہت بڑی کامیابی حاصل کی۔ نیٹو کا علاقائی انچارج کرنل مائنگ ان کے حملے میں ہلاک ہوگیا۔ 7 مزید اتحادی بھی مارے گئے۔ مغربی ذرائع ابلاغ کے مطابق 13 طالبان بھی اس لڑائی میں کام آگئے۔ مئی کے اختتام پر طالبان نے موسیٰ قلعہ پر حملے شروع کر دیے۔ 500 طالبان نے ایک بڑی کارروائی میں اتحادیوں کی آٹھ چیک پوسٹیں تباہ کر دیں۔ جون کے دوسرے ہفتے میں طالبان نے ہلمند میں ایک خودکش حملہ کر کے 3 برطانوی فوجی مار ڈالے۔ قندھار میں امریکی ہیلی کاپٹر کو نشانہ بنا کر تباہ کر دیا گیا۔ اس میں سوار دو امریکی فوجیوں کی ہلاکت کی تصدیق ہوگئی۔

قندھار جیل سے سینکڑوں قیدی آزاد کرا لیے: حامد کرزئی پر حملے کے بعد اس سال طالبان کی سب سے بڑی کارروائی 20 جون کو ہوئی جس میں انہوں نے قندھار جیل کو توڑ کر اپنے سینکڑوں ساتھیوں کو آزاد

کرالیا۔ یہ ایک حیرت انگیز کارروائی تھی، کیونکہ قندھار میں امریکی اور نیٹو افواج کی بہت بڑی تعداد تعینات تھی۔جیل پر سخت ترین پہرہ تھا کہ قریب ہی اتحادی فوجیوں کا اڈہ تھا۔دشمنوں کے اتنے سخت انتظامات کے درمیان راستہ بنانے کے لیے ان کی توجہ منتشر کرنا ضروری تھی چنانچہ طالبان نے حملے سے پہلے جاسوسوں کے ذریعے قندھار کے گورنر کو یہ خبر پہنچادی کہ طالبان آج گورنر ہاؤس پر حملہ کرنے والے ہیں۔اس اطلاع سے حفاظتی انتظامات کا رخ گورنر ہاؤس کی طرف ہو گیا اور طالبان کے لیے کام آسان ہو گیا۔

منصوبے کے مطابق طالبان کے ایک گروپ نے قندھار شہر سے جیل کی طرف آنے والے راستے پر تعینات فوجیوں پر حملہ کیا تا کہ یہاں قبضہ کر کے جیل کے پہرے داروں کو کمک ملنے کے امکانات کم کیے جاسکیں۔طالبان کے دوسرے گروپ نے جیل کے صدر دروازے کی طرف فائرنگ شروع کی جس سے جیل کے پہرے دار ادھر جمع ہونے لگے اور ان کی توجہ بٹ گئی۔اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر طالبان نے بارود سے لدا ہوا ٹرک صدر دروازے کی طرف روانہ کر دیا۔منصوبہ یہ تھا کہ خودکش حملہ آور ٹرک کو پھاٹک کے ساتھ کھڑا کر کے بارود سے اُڑا دے گا جس سے پھاٹک تباہ ہو جائے گا اور طالبان کا دوسرا گروپ فائرنگ کرتا ہوا اندر چلا جائے گا، مگر جب خودکش حملہ آور نے پھاٹک کے سامنے پہنچ کر کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے کنٹرول بٹن دبا دیا تو دھما کا نہ ہوا۔کئی بار کی کوشش کے باوجود جب بارود نہ پھٹا تو وہ ٹرک سے نیچے اُتر گیا اور تیزی سے پیچھے آکر طالبان کو اطلاع دی۔سب نے فوری طور پر ٹرک کو نشانہ بنا کر اندھا دھند فائرنگ کی۔پھر ایک راکٹ داغا گیا جس سے بارود کا ذخیرہ ایک ہولناک دھما کے ساتھ پھٹ گیا اور ایک فلک بوس شعلے نے پوری جیل کو روشنی کا لباس پہنا دیا۔دھما کا اتنا شدید تھا کہ اندر موجود تمام پہرے دار جو فائرنگ کا جواب دینے کے لیے یہاں جمع ہو گئے تھے، ہلاک ہو گئے۔

طالبان نے اسی دن علی الصبح جاسوسوں کے ذریعے قیدیوں کو ایک پستول پہنچا کر منصوبے سے آگاہ کر دیا تھا اس لیے فائرنگ کی آوازیں سنتے ہی چند قیدیوں نے پستول سے بیرک کا تالا توڑ دیا تھا اور پہرے داروں کی افراتفری سے فائدہ اُٹھا کر چند منٹ میں تمام قیدیوں کو بیرکوں سے باہر نکال لیا تھا۔ حملہ آور طالبان نے اس دوران میزائل مار کر جیل کی دیواریں بھی توڑ ڈالی تھیں۔اس لیے تمام قیدی آسانی سے باہر نکل آئے۔ان میں سے چار سو طالبان اور 750 عام شہری تھے۔اتحادی افواج کے پہنچنے سے پہلے تمام قیدی حملہ آوروں کے ساتھ محفوظ پناہ گاہوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔جلد ہی ان آزاد طالبان نے ارغنداب اور ضلع مالہ پر قبضہ کر لیا۔انہیں پکڑنے کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔ان کارروائیوں میں 17 امریکی مارے گئے۔اس صورتِ حال سے کرزئی حکومت کی بے بسی اور اتحادیوں

کی ناکامی کھل کر سامنے آ گئی۔ یاد رہے قندھار جیل پر یہ حملہ عین اس وقت ہوا تھا جب پیرس میں دنیا بھر سے سینکڑوں مندوبین جمع ہو کر افغان مسئلہ حل کرنے پر بحث کر رہے تھے اور حامد کرزئی عالمی برادری کی طرف سے افغانستان کے لیے 120 ارب ڈالر کا امدادی پیکیج منظور ہو جانے پر مسرور ہو رہے تھے۔

کابل میں بھارتی سفارت خانے پر حملہ: جولائی کے دوسرے ہفتے میں طالبان نے ایک بار پھر دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ انہوں نے کابل میں بھارتی سفارت خانے کے دروازے پر بارود سے لدی کار ٹکراتے ہوئے خودکش حملہ کیا جس میں بھارت کے دفاعی اتاشی اور سینئر سفارت کار سمیت چار افسران اور دیگر 37 افراد مارے گئے۔

13 ر جولائی کو طالبان نے کنڑ میں صبح ساڑھے چار بجے امریکی فوجی اڈے پر ''آر پی'' گنوں سے حملہ کیا۔ دن بھر لڑائی جاری رہی جس میں 20 امریکی ہلاک ہوئے۔ امریکیوں کی ہلاکت کی یہ سب سے بڑی کارروائی تھی۔ اس سے قبل 2005ء میں امریکی ہیلی کاپٹر پر کیے گئے حملے میں 16 ر امریکی ہلاک ہوئے تھے۔

اسی ہفتے گریشک میں طالبان نے 20 افغان فوجی بھی مار دیے جبکہ اتحادی فورسز نے 9 افغان فوجیوں کو شک کی بنیاد پر بمباری کر کے مار ڈالا۔

فرانسیسیوں کی شامت: اگست کے پہلے ہفتے میں طالبان نے پاک افغان سرحد کے قریب مشرقی افغانستان میں 5 نیٹو اہلکار قتل کر دیے اور پندرہ دن قبل اغوا کیے گئے فرانسیسی امدادی کارکن کو رہا کر دیا۔ 20 ر اگست کو قندھار میں سڑک کنارے بم پھٹنے سے 3 کینیڈین فوجی ہلاک ہو گئے۔

اگست کا سب سے بڑا واقعہ طالبان کے فرانسیسی فوج سے جھڑپ تھی۔ یہ واقعہ مہینے کے تیسرے ہفتے کے دوران پیش آیا جس میں فرانس کے 10 فوجی مارے گئے۔ فرانس میں اس خبر سے صف ماتم بچھ گئی اور قومی سطح پر اس کا سوگ منایا گیا۔ فرانسیسی صدر سرکوزی کو اپنی تمام مصروفیات ترک کر کے اپنے سپاہیوں کی تعزیت اور حوصلہ افزائی کے لیے افغانستان کا ہنگامی دورہ کرنا پڑا۔

ٹارگٹ کلنگ اور اغوا کی کارروائیاں: 11 ر نومبر بروز منگل کو طالبان نے قندھار میں صوبائی انٹیلی جنس کے سربراہ حبیب اللہ غزنوی کو گولیوں کا نشانہ بنا ڈالا۔ حملہ آور موٹر سائیکلوں پر سوار تھے۔ قندھار اور گرد و نواح میں ٹارگٹ کلنگ کے لیے طالبان نے عموماً موٹر سائیکل سوار نشانہ بازوں کے ساتھ حملے کرنے کا طریقہ اپنا لیا تھا۔

نومبر کے دوسرے ہفتے میں طالبان نے ہلمند اور قندھار میں مختلف جھڑپوں میں 18 ر اتحادی و افغان

فوجی ہلاک اور 4 ٹینک تباہ کردیے۔ کابل کے گردونواح میں 63 اتحادی مارے گئے جبکہ 9 ٹینک تباہ ہوئے۔ اسی ماہ کابل میں 13 غیر ملکی مندوب اور ڈی ایچ ایل کمپنی کے تین کارکن قتل کر دیے گئے جبکہ ایک فرانسیسی اور ایک کینیڈین صحافی کو اغوا کے بعد تاوان کے بدلے رہا کر دیا گیا۔ 16 نومبر کو طالبان نے غزنی کے کمشنر عبدالرحیم دیش والا کو قتل کر ڈالا۔

نیٹو کی رسد پر حوصلہ شکن حملہ: 2008ء میں طالبان کی طوفانی کارروائیوں نے ایک اور نیا منظر دکھایا۔ وہ پاکستانی سرحدوں پر نیٹو اور امریکی افواج کی رسد کے قافلوں کو تباہ کرنے لگے۔ 2007ء میں ایسے حملے صرف افغانستان کی حدود میں ہوتے رہے تھے، مگر 2008ء میں پشاور، خیبر ایجنسی اور کوئٹہ چمن شاہراہ پر کھل کر ایسی کارروائیاں ہوتی رہیں، حملہ آور قافلوں کو شدید نقصان پہنچانے کے بعد ہر بار صاف بچ نکلنے میں کامیاب رہے۔ ایسی پہلی بڑی کارروائی مارچ کے آخری ہفتے میں ہوئی جب طورخم بارڈر پر اتحادیوں کے 60 آئل ٹینکر جلادیے گئے۔ دسمبر کے آغاز میں پشاور میں 22 کنٹینر سوخت کردیے گئے۔ سال کی آخری اور سب سے تہلکہ خیز کارروائی دسمبر کے دوسرے ہفتے میں ہوئی جب پشاور میں تین سو نامعلوم افراد نے حملہ کر کے نیٹو کے 200 کنٹینرز تباہ کر ڈالے۔

نیٹو نے اس قسم کی کارروائیوں سے گھبرا کر روس سے راہداری پانے کی منصوبہ بندی شروع کردی۔ روس نے آمادگی بھی ظاہر کردی، مگر اس کی عملی شکل نہ بن سکی۔ ایسی کارروائیوں کو روکنے کے لیے پاکستان، افغانستان اور امریکا نے باہمی مشاورت سے اپریل کے آغاز میں پاک افغان سرحد پر نگرانی وجاسوسی کے مشترکہ مراکز کے قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس ضمن میں مارچ کے اواخر میں سی آئی اے کے ڈائریکٹر مائیکل ہیڈن کا یہ بیان منظر عام پر آیا کہ 18 ماہ سے شدت پسندوں نے پاک افغان سرحد پر محفوظ پناہ گاہیں بنالی ہیں۔ ان کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ القاعدہ اب مغربی وضع قطع رکھنے والے افراد کو تربیت دے کر اپنے اہداف کے لیے تیار کر رہی ہے جن کو شناخت کرنا بے حد مشکل ہے۔

رسد کے نئے راستے کی تلاش: ان حالات کے پیش نظر نیٹو نے افغانستان کے لیے وسط ایشیا سے رسد کا نیا راستہ کھلوانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ روس کی آمادگی کے بعد قازقستان اور ازبکستان کو بھی منالیا گیا۔ دسمبر میں نئے راستے کی تیاری کے لیے ناگزیر تعمیراتی کام تیزی سے شروع کر دیا گیا۔ یہ بے حد ضروری تھا کیونکہ پاکستانی حکام نے کنٹینروں پر پے در پے حملوں کو روکنے میں ناکامی کا سامنا کرنے کے بعد سال کے اواخر میں طورخم بارڈر بند کردیا تھا اور وہاں سرحد پر نیٹو اور امریکی افواج کی رسد کے ایک ہزار کنٹینروں کی قطار کھڑی تھی۔ پاکستان سے رسد کے اخراجات اور کرایوں میں اب 90 فیصد اضافہ ہو گیا

تھا کیونکہ کوئی ٹرانسپورٹر یا ڈرائیور مشکل ہی سے ادھر کا رُخ کرنے پر آمادہ ہوتا تھا۔

خیبر ٹرانسپورٹ ایسوسی ایشن کے صدر نے اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

''نیٹو افواج افغانستان میں سیکیورٹی صورتِ حال کو کنٹرول نہیں کر سکتی تو بھلا ہمیں ایف سی اور پاکستانی اہلکار کیسے تحفظ دے سکتے ہیں، اس لیے ہم اس معاملے میں بے بس ہیں۔''

رسد کو محفوظ بنانے کا معاملہ اس قدر اہمیت اختیار کر گیا تھا کہ انہی دنوں امریکا کی جوائنٹ آف اسٹاف کمیٹی کے چیئرمین ایڈمرل مولن نے اعلان کیا امریکا مزید 30 ہزار فوجی افغانستان بھیج کر انہیں پاک افغان سرحد پر تعینات کرے گا۔ طالبان کی فتوحات کا اعتراف سال کے آخر میں سامنے آنے والی عالمی تھنک ٹینک کی ایک رپورٹ سے ہوتا ہے جس میں واضح کیا گیا ہے کہ گزشتہ سال طالبان افغانستان کے 54 فیصد اور اب 72 فیصد رقبے پر قابض ہیں۔

<u>بے گناہ شہریوں پر اندھا دھند بمباری:</u> طالبان کی کارروائیوں سے برافروختہ ہو کر امریکی اور اتحادی افواج نے موسم گرما میں ایک بار پھر عام افغان شہریوں کے قتل عام پر کمر باندھ لی تھی۔ یہ سلسلہ سال کے اختتام تک جاری رہا۔ جولائی کے آخری ہفتے میں امریکی طیاروں نے ہرات کے علاقے شین ڈنڈ کی شہری آبادی پر اندھا دھند بمباری کی جس سے 50 بچوں اور 19 عورتوں سمیت 108 افراد شہید ہو گئے۔ امریکی یلغار کے بعد مغربی افغانستان میں شہری آبادی کے قتل عام کا یہ سب سے بڑا واقعہ تھا۔

اگست کے دوسرے ہفتے میں اتحادیوں کی بمباری سے 53 خواتین، بچے اور مرد جاں بحق ہوئے۔ نومبر کے دوسرے ہفتے میں قندھار میں شادی کی ایک تقریب پر امریکی طیاروں نے بم برسائے جس سے بچوں اور عورتوں سمیت 40/افراد شہید ہو گئے۔ دسمبر کے وسط میں امریکی طیاروں نے کابل کے نواح میں ایک گاؤں پر بمباری کر کے چرواہوں کے آٹھ گھر تباہ کر دیے۔ اس حملے میں 7 بچوں سمیت 25/افراد شہید ہو گئے۔

<u>قیدیوں پر کتے چھوڑ دیے:</u> امریکا اور اتحادیوں کے مظالم صرف بمباری تک محدود نہیں تھے بلکہ جیلوں میں قیدیوں پر انسانیت سوز مظالم کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اگست کے دوسرے ہفتے میں پکتیکا سے طالبان کی مدد کے شبہے پر حراست میں لیے گئے افراد پر امریکی اہلکاروں نے کتے چھوڑ دیے، جس سے دو قیدی شدید زخمی ہو گئے۔ اتحادی افواج کے ترجمان لیفٹیننٹ ناتھن پیری نے اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ کہا: ''ہمیں جہاں بھی ضرورت ہوگی، ہم کتے استعمال کریں گے۔''

<u>صحافی جاوید احمد پر مظالم:</u> اکتوبر کے اواخر میں بگرام جیل سے ایک قیدی جاوید احمد کو رہا کیا گیا۔ یہ بے

باک صحافی قندھار کا رہنے والا تھا۔ اسے ملکی حالات پر بے لاگ تبصروں کے جرم میں قید کر کے بدترین ذہنی ونفسیاتی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ جاوید احمد کو سگریٹ کے دھوئیں سے الرجی تھی۔ جب امریکیوں کو یہ معلوم ہوا تو اسے سزا دینے کا نیا طریقہ اختیار کیا۔ ایک ساتھ کئی کئی سپاہی اس کے گرد بیٹھ کر سگریٹ نوشی کرتے اور اس پر دھوئیں کے مرغولے چھوڑتے۔ رہائی کے بعد جاوید احمد نے بگرام جیل میں امریکیوں کے سفاکانہ طرزِ عمل کا کچا چٹھا کھولا۔ اس نے بتایا کہ جیل میں 700 سے زائد افراد نہایت اذیت ناک زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں جن میں افغانستان کے علاوہ عراق، ازبکستان، جنوبی افریقہ اور دیگر ممالک کے افراد بھی ہیں۔ اس نے انکشاف کیا کہ 25 سے زائد قیدی پاکستانی ہیں جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔

ڈاکٹر عافیہ صدیقی جیل میں: جاوید احمد کی رہائی سے قبل پاکستانی شہری ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی بگرام جیل میں موجودگی کا راز طشت از بام ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو پانچ سال قبل (2003ء میں) کراچی سے ان کے دو بچوں سمیت اغوا کیا گیا تھا۔ اب تک وہ لاپتا تھیں۔ اس سال بگرام جیل سے رہا ہونے والے بعض قیدیوں نے بتایا کہ وہ جیل میں ایک خاتون قیدی کی لرزہ خیز چیخیں سنتے رہے ہیں، جو غالباً پاکستانی ہیں اور بگرام جیل میں قید واحد عورت ہے۔ اس انکشاف پر میڈیا کے باہمت لوگ حرکت میں آگئے۔ برطانوی صحافی مریم ریڈلی اور پاکستانی صحافی اشتیاق بیگ ایک مہم کے طور پر اس خاتون کی رہائی کے لیے سرگرم عمل ہوئے۔ جلد ہی تصدیق ہوگئی کہ وہ خاتون واقعی ڈاکٹر عافیہ صدیقی ہیں۔ امریکی حکام نے حقائق پر پردہ ڈالنے کے لیے اسی ماہ ڈاکٹر عافیہ کو امریکا منتقل کر دیا جہاں ان پر القاعدہ سے تعلقات اور امریکی فوجیوں پر حملے جھوٹے کے الزام میں مقدمہ چلا کر 86 برس کی قید سنادی گئی۔ پاکستانی عوام کے احتجاج، اپیلوں اور شدید دباؤ کے باوجود پاکستانی حکام نے اپنی قابلِ فخر شہری کو آزاد کرانے میں کوئی دل چسپی نہیں لی۔

افغانستان کے خزانوں پر ڈاکہ زنی: امریکیوں اور اتحادیوں کے افغانوں پر ظلم وتشدد کے ساتھ ساتھ وسیع پیمانے پر اس سرزمین کی دولت لوٹنے کا کھیل بھی شروع کر رکھا تھا۔ وہ ملکی نوادرات، قیمتی پتھر اور معدنیات اپنے ہاں منتقل کر رہے تھے۔ ماہ جون میں ناروے واپس جانے والے ایک سپاہی سے سینکڑوں قیمتی اشرفیاں، نایاب پتھر اور قدیم برتن برآمد ہوئے جس سے میڈیا کو اس لوٹ مار کا کچھ علم ہوا۔ انہی دنوں بامیان کے باشندوں نے انکشاف کیا ان کے ہاں جاپانیوں کی آمد بکثرت ہو رہی ہے جو فراہمی آب کے منصوبے پیش کرتے ہیں۔ یہ لوگ جب کوئی کنواں کھودنا شروع کرتے ہیں تو ایک خاص گہرائی تک کھدائی کے بعد علاقے کے لوگوں کا قریب پھٹکنا ممنوع قرار دیتے ہیں۔ مقامی لوگوں نے بتایا کہ انہوں

نے ایک بار چھپ چھپا کر دیکھا تو جاپانی ٹیم کنویں کی تہہ سے اشرفیاں، قیمتی جواہر اور نایاب چیزیں نکال رہی تھی۔ یہ ہیں اتحادیوں کے کارنامے جو افغانستان کی تعمیرِ نو اور عوامی فلاح و بہبود کی آڑ میں دونوں ہاتھوں سے ملکی دولت اور صدیوں کی امانتیں لوٹ کر لے جا رہے ہیں۔ میڈیا رپورٹوں کے مطابق لوگر میں کرومائٹ کی 20 بڑی کانوں سے بڑی مقدار میں پتھر باہر منتقل کیا جا رہا ہے۔ مغربی دنیا نے ہلمند میں یورینیم کے وسیع ذخائر کا کھوج بھی لگا لیا ہے۔ ان ذخائر کو بگرام ایر بیس کے ذریعے باہر پہنچایا جا رہا ہے۔ یہ حقیقت اس وقت منکشف ہوئی جب اس یورینیم کی شراکت داری میں امریکا اور برطانیہ میں تنازع ہو گیا اور کابل کے دو جریدوں ''پیام مجاہد'' اور ''شبکہ اطلاع رسانی'' نے عوام کو اس سے باخبر کیا۔

بش اور پرویز مشرف کوچۂ اقتدار سے باہر: 2008ء اس لحاظ سے بھی اہم تھا کہ صلیبی جنگ کا آغاز کرنے والے صدر جارج واکر بش اور اس کے فرنٹ لائن اتحادی صدر پرویز مشرف دونوں کو اپنے عوام کی شدید نفرت کا سامنا کرنے کے بعد اقتدار سے باہر ہونا پڑا۔ پرویز مشرف، وردی پہلے ہی اُتار چکے تھے۔ 18 فروری 2008ء کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی جیت گئی تھی اور یوسف رضا گیلانی وزیر اعظم بن گئے تھے۔ زبردست عوامی دباؤ کے علاوہ فوجی قیادت کی وارننگ پر آخر کار 18 ر اگست کو پرویز مشرف صدارت سے مستعفی ہو گئے۔ ان کی جگہ صدارتی انتخابات کے بعد آنجہانی بے نظیر بھٹو کے شوہر آصف زرداری نے 10 ستمبر 2008ء کو صدر کا منصب سنبھال لیا۔

صدر جارج بش نے دسمبر میں ہونے والے عام انتخابات میں سیاہ فام حریف بارک اوباما سے شکست کھائی اور 8 سال بعد ایوانِ اقتدار سے باہر ہو گئے۔ بارک اوباما امریکا کے پہلے صدر ہیں جن کا نسلی تعلق ایک سیاہ فام مسلم خاندان سے ہے اس لیے توقع کی جا رہی تھی کہ وہ بش کی پالیسیوں میں بڑی تبدیلی لائیں گے مگر یہ توقعات پوری نہ ہو سکیں۔ اوباما نے فتح کے بعد اپنی کابینہ کا اعلان کیا تو رابرٹ گیٹس کو وزیر دفاع اور ہیلری کلنٹن کو وزیر خارجہ مقرر کیا جن کا تعصب اور اسلام دشمنی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

عراقی صحافی نے بش کو جوتوں کا تحفہ دیا: وائٹ ہاؤس چھوڑنے سے پہلے صدر بش نے عراق اور افغانستان سے اپنی عسکری مہمات کا خراج تحسین حاصل کرنا ضروری سمجھا اور دسمبر 2008ء کے وسط میں اچانک بغداد پہنچ گئے۔ 14 ر دسمبر کو یہاں وہ ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے کہ ایک صحافی منتظر الزیدی نے یکے بعد دیگرے ان پر اپنے دونوں جوتے پھینک کر پوری قوم کی طرف سے ان کی پالیسیوں کے خلاف شدید نفرت کا اظہار کیا۔ اس تذلیل کے بعد صدر بش کابل پہنچ گئے اور کابل میں حامد کرزئی سے مل کر پریس کانفرنس کی۔ صدر بش نے کہا کہ قیامِ امن کے لیے ہمیں طویل جدوجہد کرنا

ہوگی۔ اگر پاکستان سے لوگ آ کر حملے کرتے رہیں گے تو افغانستان میں کامیابی مشکل ہو جائے گی۔ وطن واپس پہنچ کر صدر بش نے ایک بیان میں اپنے 8 سالہ دور اقتدار پر تبصرہ کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ ان کی پالیسیوں نے امریکا کو دہشت گردوں سے محفوظ بنا دیا ہے۔ انہوں نے فخریہ انداز میں کہا کہ وہ دہشت گردوں کے خلاف پاکستان اور سعودی عرب سمیت 90 ملکوں کا عظیم اتحاد چھوڑے جا رہے ہیں۔

افغانستان میں بڑے فوجی اڈوں کی تعمیر کا منصوبہ: صدر بش کا لہجہ بتا رہا تھا کہ انہوں نے عراق اور افغانستان جاری جنگ سے پیدا شدہ ملکی و بین الاقوامی مسائل اور عالمی بحران سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ چند دنوں بعد آنے والی امریکی جوائنٹ فورسز کمانڈ کی ایک رپورٹ نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ امریکا اپنی غلطیوں کو دہرانے پر مصر ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ امریکا اسلامی دنیا سے عسکریت پسندی ختم کرنے کے لیے 25 سال تک جنگ جاری رکھنے کی طویل منصوبہ بندی کر چکا ہے۔ اس مقصد کے لیے افغانستان میں مستقل فوجی ڈھانچہ بنایا جا رہا ہے جس کے تحت تین بڑے فوجی اڈے تعمیر کیے جائیں گے۔ ایک اڈہ قندھار میں ہوگا جس پر 500 ملین ڈالر لاگت آئے گی۔ ان تین اڈوں کے علاوہ تین علاقوں میں فوجی بستیاں آباد کی جائیں گی جن میں سے ہر بستی پر 300 ملین ڈالر صَرف ہوں گے۔

ملا محمد عمر نے مذاکرات کا امکان مسترد کر دیا: امریکا کی یہ تیاریاں چیخ چیخ کر بتا رہی تھیں کہ حامد کرزئی اور سعودی و پاکستانی شخصیات کے ذریعے گاہے گاہے طالبان سے مذاکرات کا ڈول ڈالنا ایک مکروفریب کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے 28 دسمبر کو طالبان سربراہ ملا محمد عمر مجاہد نے ایک طویل عرصے کی خاموشی کے بعد بانگ دہل اعلان کیا:

''افغان حکومت اور سعودی عرب سے طالبان کے مذاکرات کی باتیں بے بنیاد ہیں۔ ہم نے سعودی عرب اور ایران سمیت کسی بھی جگہ کرزئی حکومت سے کسی نوعیت کی کوئی گفت وشنید نہیں کی۔''

ملا محمد عمر کا یہ بیان اس تناظر میں بھی تھا کہ بعض عناصر یہ پرچار کر رہے تھے طالبان بھی مذاکرات پر آمادہ ہیں اور سعودی عرب یا ایران میں ان کے نمائندوں نے صلح کی ابتدائی گفتگو شروع کر دی ہے۔ ظاہر ہے ایسی افواہوں کا مقصد طالبان کے درمیان پھوٹ ڈالنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

انتخابات میں شرکت کے لیے حکمت یار کی شرائط: افغان صدر حامد کرزئی کی پوزیشن حسب سابق کمزور رہی۔ وہ عام انتخابات کے لیے جس عوامی حمایت کے خواہاں تھے وہ انہیں حاصل نہ ہو سکی۔ حکمت یار نے فروری کے وسط میں انتخابات میں شرکت کے لیے آمادگی ظاہر کر دی تھی مگر ان کی دو شرائط تھیں:

① غیر ملکی افواج واپس چلی جائیں۔

④ کرزئی استعفیٰ دے دیں۔

ظاہر ہے کرزئی استعفیٰ دینے کا تصور نہیں کر سکتے تھے اور غیر ملکی افواج کو واپس کرنا ان کے بس سے باہر تھا، پھر بھی کرزئی کی کوشش یہ تھی وہ طالبان اور حکمت یار کو منالیں۔ کرزئی حکومت کے رکنِ ایوانِ بالا مولانا ارسلان خان رحمانی جو افغان جہاد کے نامور لیڈر اور مجاہدین کے وزیر اوقاف بھی رہے، سال بھر اس سلسلے میں پیش رفت لیے اسلام آباد اور کابل کے درمیان متحرک رہے۔ اگست کے آغاز میں انہوں نے ایک صحافی کو بتایا کہ اقوام متحدہ کے نمایندے نے بھی انہیں کرزئی اور طالبان کے درمیان پُل کا کردار ادا کرنے کی ترغیب دی ہے۔

جون کے وسط میں امریکی سفیر ولیم وڈ نے بھی افغان حکومت کی طالبان سے مذاکرات کی کوششوں کی حمایت کرتے ہوئے کہا یہ افغانستان کا داخلی معاملہ ہے۔ تاہم طالبان قیادت صلح کی کوششوں کے پس پردہ پُرفریب ہتھکنڈوں سے محتاط تھی، اس لیے اس نے مذاکرات کی پیش کش کا کوئی مثبت جواب نہ دیا اور ایسی کوششوں کا کوئی نتیجہ سامنے نہ آیا۔ طالبان کی کارروائیاں کرزئی حکومت کے لیے مسلسل مشکلات بڑھاتی رہیں۔ افغان فورسز نہ صرف بے بس تھیں بلکہ بکثرت سپاہی طالبان سے ملتے جا رہے تھے۔ نومبر میں بیک وقت 11 سو فوجی منحرف ہو کر طالبان میں شامل ہو گئے جس سے افغان فوج پر بڑا منفی اثر پڑا۔

مآخذ و مراجع

- ...... ہفت روزہ ضرب مؤمن، جلد 10، 11، 12
- ...... ہفت روزہ تکبیر، فرائڈے اسپیشل، غازی: جلد 2007ء، 2008ء
- ...... قومی اخبارات۔ امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور ہفت روزہ جرائد 2007ء، 2008ء
- ...... روزنامہ اسلام کراچی 2007ء، 2008ء
- ...... ذاتی یادداشتیں
- ...... زبانی روایات

چالیسواں باب

اوباما اور افغانستان

2009ء کے حالات

اوباما کی صدارت: سال 2009ء امریکا میں نئے صدر اوباما کے اقتدار کا سورج طلوع ہوتے دیکھ رہا تھا۔ 20 جنوری کو وائٹ ہاؤس میں اوباما کی تقریب حلف برداری کا انعقاد ہوا جبکہ دنیا میں بدامنی، قتل وغارت اور ہولناک جنگوں کا افسوس ناک سلسلہ شروع کرنے والا بے رحم انسان جارج واکر بش پوری دنیا بلکہ اپنے ہم وطنوں کی بھی لعنت ملامت کا پشتارہ لادے وائٹ ہاؤس سے رخصت ہوگیا۔ اوباما نے اقتدار سنبھالنے کے بعد بنیادی طور پر صدر بش کی جارحانہ اور استعماری سوچ پر مبنی پالیسیوں کو جاری رکھا البتہ طریقہ کار میں کچھ ترمیم کردی۔ القاعدہ کے سینئر راہنما ایمن الظواہری نے اپریل 2009ء کے وسط میں جاری ہونے والی ویڈیو ٹیپ میں اوباما کی پالیسیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

> ''اوباما انتظامیہ بش کی پالیسیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔ وہ امریکا کے تشخص میں کوئی تبدیلی نہیں لایا۔ امریکا بدستور افغانستان، عراق اور فلسطین میں مسلمانوں کا قتل عام کررہا ہے۔''

اوباما کی حکمت عملی: اوباما نے اقتدار سنبھالتے ہی پہلا بڑا فیصلہ یہ کیا کہ عراق میں جنگ ختم کر کے افواج کو چھاؤنیوں میں محدود کردیا جائے اور ملک کا کنٹرول مقامی فورسز کو سونپ دیا جائے۔ اس تجویز پر صدر بش کے دور میں تقریباً اتفاق ہوگیا تھا۔ اوباما نے اسے عملی شکل دے دی اور سال 2009ء کے دوران عراق میں امریکی افواج کا کردار تقریباً ختم ہوگیا۔

اوباما کی اس پالیسی کا دوسرا رخ یہ تھا کہ عراق سے جان چھڑا کر پوری توجہ افغان محاذ پر دی جائے اور وہاں افواج کی تعداد بڑھادی جائے۔ چنانچہ اس سال افغانستان میں امریکی واتحادی افواج کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ جنوری میں اقتدار سنبھالتے ہی اوباما نے 17 ہزار مزید فوجی افغانستان روانہ کرنے کا اعلان کیا اور مارچ کے پہلے عشرے میں اس سے متعلقہ بل پر دستخط کردیے۔ افواج کا نظم ونسق

بہتر بنانے کیلئے مئی میں امریکی وزارتِ دفاع نے جنرل میک کرنین کو ہٹا کر جنرل میک کرسٹل کو افغانستان میں نیٹو فورسز اور امریکی افواج کا کمانڈر بنا دیا۔ اس دوران 17 ہزار میں سے 12 ہزار امریکی سپاہی افغانستان پہنچ گئے مگر جون میں آپریشن خنجر کی ناکامی نے اس تعداد کو بھی ناکافی ثابت کر دکھایا۔

جنرل میک کرسٹل کا اصرار: اگست میں جنرل میک کرسٹل نے بلجیم میں ہونے والے امریکا کے اعلیٰ فوجی حکام کے غیر رسمی اجلاس کے دوران آگاہ کیا کہ امریکا کو 2010ء تک مزید 27 ہزار سپاہی افغانستان میں تعینات کرنا ہوں گے۔ اکتوبر تک یہ ضرورت مزید بڑھ گئی اور جنرل میک کرسٹل نے مطالبہ کیا کہ افغانستان میں فوجی حکمت عملی یکسر بدلنا ہوگی۔ میک نے درخواست کی کہ نیٹو افواج میں مزید 40 ہزار افراد کا اضافہ ناگزیر ہے۔ جبکہ زمینی حقائق کے لحاظ سے نیٹو کا افغانستان میں مزید افراد فراہم کرنا آسان نہیں تھا۔ نیٹو کا اہم رکن اٹلی اپنی افواج افغانستان سے نکالنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ برطانیہ پہلے ہی مایوسی کا شکار تھا۔ ستمبر کے اواخر میں ایک برطانوی اخبار نے افغان جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"اعصاب شکن افغان جنگ فنڈز کی کمی اور ہلاکتوں میں اضافے کے باعث تباہ کن اور ناکام ثابت ہوگی اور مرنے والے فوجیوں کی قربانیاں رائیگاں جائیں گی۔"

حقیقت یہ تھی کہ امریکا کا معاشی تباہی کے باوجود جنگ پر اصرار دیکھ کر بڑے بڑے دانشوروں کو امریکا کی شکست و ریخت سامنے نظر آ رہی تھی۔

اوباما کو نوبل پرائز: اس سال صدر اوباما کے لیے اگر کوئی خوشی کا موقع تھا تو وہ صرف یہ کہ انہیں اکتوبر میں امن کے حوالے سے "نوبل پرائز" سے نوازا گیا جس پر دنیا بھر کے سربراہوں نے انہیں مبارک باد دی جبکہ میڈیا پر نامور صحافیوں اور دانشوروں نے اسے حیرت انگیز قرار دیا کیونکہ اوباما کے آنے کے بعد دنیا کو امن کی کوئی کرن دکھائی نہیں دے رہی تھی، ان سے وابستہ تمام توقعات سراب ثابت ہوئی تھیں۔ طالبان ترجمان نے اوباما کو نوبل پرائز ملنے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: "یہ انتہائی غیر معقول فیصلہ ہے۔ اوباما کو امن کا نہیں، تشدد کا نوبل پرائز دیا گیا ہے۔"

سچ تو یہ ہے کہ یہ جھوٹا اعزاز افغان جنگ میں شکست کے اس ناسور کو مندمل نہیں کر سکتا تھا جو امریکی قیادت کو تڑپائے دے رہا تھا۔ امریکی صدر اوباما نے 14 ستمبر کو ٹی وی چینل سی این بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے اس بارے میں اپنی پریشانی کا اعتراف کیا اور کہا: "میں ہر وقت افغان جنگ میں درپیش مشکلات کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔"

ساتھ ہی انہوں نے یہ کہا کہ اگر ڈرون حملے کامیاب رہے تو افغانستان سے فوج واپس نہ بلانے کی

کوئی وجہ نہیں ہوگی۔

امریکی قیادت مخمصے کا شکار: ستمبر سے نومبر کے اواخر تک صدر اوباما، امریکی افواج کے سینئر افسران اور نیٹو کے اعلیٰ عہدیداروں کے بیانات سے صاف پتا چلتا تھا کہ امریکی قیادت افغان مسئلے پر کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی۔ جون سے نومبر کے اختتام تک مختلف مواقع پر صدر اوباما اپنے مشیروں اور فوجی قیادت کے ساتھ طویل مشاورتوں میں مصروف رہے۔ اس دوران بار بار ان کا عندیہ تبدیل ہوتا نظر آتا رہا۔ امریکی فوجی ہائی کمان کا موقف بھی کسی ایک رخ پر نہیں تھا۔ درحقیقت اوباما انتظامیہ 8 سال سے جاری افغان جنگ کی نئی حکمت عملی طے کرنے میں شدید اختلافات کا شکار تھی۔

جنرل میک کرسٹل اور صدر اوباما کی مایوسی: جنرل میک کرسٹل جلد از جلد مزید 40 ہزار سپاہیوں کا انتظام کرانے پر مصر تھے، مگر 13 اکتوبر کو کوپن ہیگن میں صدر اوباما سے 25 منٹ طویل ملاقات کے بعد انہیں اندازہ ہوا کہ صدر کی قوت فیصلہ جواب دے چکی ہے۔ اس کے بعد کرسٹل اور اوباما کے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور کرسٹل کا جوش بھی مایوسی میں بدلنے لگا۔ صرف پانچ دن بعد وہ واشنگٹن میں ایک انٹرویو کے دوران یہ کہتے نظر آئے کہ طالبان سے بات چیت کا عمل جاری رہنا چاہیے۔ امریکی فوج کو ایک بیل سے مشابہ قرار دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مزاحمت کاروں کا ہر زخم اس بیل کو کمزور کر رہا ہے۔ میک نے دعویٰ کیا کہ اگر ہم طالبا زگار فراہم کر دیں تو 60 فیصد مسائل ویسے ہی حل ہو جائیں گے۔

میک کرسٹل کے اس بیان کے اگلے روز 9 اکتوبر کو صدر اوباما نے وائٹ ہاؤس میں ایک اجلاس کی صدارت کی جس میں طالبان سے مذاکرات کی منظوری کا عندیہ ظاہر کیا گیا۔ اجلاس کے بعد امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے کہا کہ امریکا طالبان کا سیاسی کردار قبول کرنے پر آمادہ ہے کیونکہ مسئلے کا فوجی حل ممکن نہیں رہا۔

نئی پالیسی مگر؟ صدر اوباما نے افغان پالیسی کے بارے میں مشاورت جاری رکھی۔ اس سلسلے کی چوتھی میٹنگ میں گرما گرم بحث کے بعد طالبان کے خاتمے کا ہدف ترک کرنے، پاکستان میں ڈرون حملوں کو وسعت دینے اور القاعدہ کو شکست دینے پر اتفاق کیا گیا۔ ادھر امریکا کے بعض اتحادی جنگ کو محدود کرنے یا پسپائی کی مخالفت کر رہے تھے۔ برطانوی چیف آف جنرل اسٹاف ڈیوڈ رچرڈ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ افغانستان سے انخلاء کی صورت میں برطانیہ کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ ڈیوڈ رچرڈ اُمید ظاہر کر رہے تھے کہ جنگ اب بھی جیتی جا سکتی ہے۔ البتہ فتح میں کچھ سال مزید لگ سکتے ہیں۔ 127 اکتوبر کو صدر اوباما نے ایک بار پھر متذبذب انداز اختیار کرتے ہوئے کہا کہ افغانستان میں مزید فوج بھیجنے میں جلدی نہیں کریں گے، مگر اس بیان کے بعد صدر اوباما کی پالیسی کا رُخ بدلتا نظر آنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا

جیسے وہ جنگ جاری رکھنے پر اصرار کرنے والے مشیروں کی رائے کو ترجیح دے رہے ہیں۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اکتوبر کے آخری ایام میں امریکا نے سی آئی اے کی وساطت سے طالبان کے ساتھ خفیہ مذاکرات کی بھی کوشش کی اور امریکی نمایندے جنوبی افغانستان میں طالبان کے نمایندے ملا برادر سے ملے۔امریکا یہ ضمانت حاصل کرنا چاہتا تھا کہ القاعدہ امریکا کی واپسی کے بعد مغربی ممالک یا امریکا میں کوئی انتقامی کارروائی نہ کرے، مگر ان مذاکرات کا کوئی نتیجہ سامنے نہ آیا۔جس کے بعد اوباما نے مزید فوج افغانستان بھیجنے پر غور شروع کر دیا۔نومبر کے آخری عشرے میں امریکی حکام اگلے سال افغانستان میں مزید فوج تعینات کرنے پر متفق نظر آنے لگے لیکن خود فوج کا مطالبہ تھا کہ ہمیں واپسی کا ٹائم فریم پہلے دیا جائے۔

آخر کار 2 دسمبر کو بوقت نصف شب امریکی صدر نے نئی افغان پالیسی کا اعلان کر دیا جس کے مطابق مزید 30 ہزار فوجی افغانستان بھیجنے اور 18 ماہ بعد 2011ء میں انخلا شروع کرنے کا مژدہ سنایا گیا۔ اوباما نے یہ بھی کہا کہ وہ مسلم دنیا سے محاذ آرائی ختم کرنا چاہتے ہیں۔

19 / دسمبر کو امریکی نجی ٹی وی چینل ”اے بی سی“ کو انٹرویو دیتے ہوئے صدر اوباما نے کہا: ”افغانستان میں مزید فوج بھیجنے کا فیصلہ آسان نہیں تھا۔اپنے بہادر فوجیوں اور ان کے اہل خانہ کے بارے میں سوچ کر رات کی نیند اُڑ جاتی ہے۔“ امریکی صدر کا مزید فوج بھیجنے کے ساتھ ساتھ واپسی کا ٹائم فریم دینا اور افغان مسئلے سے راتوں کی نیند حرام ہونے کا اعتراف کرنا اس بات کا واضح اعلان تھا کہ سپر پاور امریکا مسلمانوں کی قوت ایمانی کے سامنے صفر پاور بن چکا ہے۔

کھسیانی بلی کھمبا نوچے: امریکی اور اتحادی سورما اپنی شکست کی اصل وجوہ چھپانے اور شرمندگی سے بچنے کے لیے جس قسم کے جھوٹ گھڑ رہے تھے ان کا اندازہ امریکی فوج کے سربراہ جنرل میک کرسٹل کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے جس میں انہوں نے کہا طالبان کا ساتھ دینے والے بہت سے نوجوان معاشی مجبوری کی خاطر لڑتے ہیں اور طالبان جنگجو امریکی فوجیوں سے زیادہ تنخواہ پاتے ہیں۔یاد رہے کہ موصوف نے کچھ ہی مدت پہلے ارشاد فرمایا تھا: ”طالبان کو ہم روزگار فراہم کر دیں تو 60 فیصد مسائل حل ہو جائیں گے۔“ سوال یہ ہے کہ اگر طالبان کی تنخواہیں امریکی فوجیوں سے زائد ہیں تو وہ روزگار کے لیے بھلا امریکا کے محتاج کیوں ہوں گے؟

امریکا کے لیے ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ عراق سے افغانستان تک پھیلی ہوئی اس کی فوج کے لیے معالجین کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی، ڈاکٹروں کی ہزاروں اسامیاں خالی پڑی تھیں۔امریکی جرائد کی رپورٹوں کے مطابق ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر حد سے زیادہ کام کی وجہ سے خود ذہنی مریض بنتے جا رہے تھے۔

امریکی فوجیوں کی خودکشیوں کا ریکارڈ: 2009ء کے اختتام پر میڈیا پر آنے والی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ اس سال امریکی فوج میں خودکشیوں کی شرح گزشتہ تمام سالوں سے زیادہ رہی۔ 160 حاضر سروس سپاہیوں نے خودکشی کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا۔ اس سے قبل 2008ء میں 140 فوجیوں نے خودکشی کی تھی جبکہ 2007ء میں یہ تعداد 115 تھی۔ خودکشی کرنے والوں میں سے ایک تہائی ناتجربہ کار فوجی ایسے تھے جو اس سے قبل کسی محاذ پر تعینات نہیں کیے گئے تھے۔

2009ء، افغانستان میں امریکی مظالم: امریکا اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی، بین الاقوامی قوانین کی پامالی اور افغان شہریوں پر مظالم کا سلسلہ اس سال بھی جاری رکھا۔ جنوری کے آخری عشرے میں کابل کے نواحی ضلع لغمان میں اتحادی طیاروں کی بمباری سے 15 افراد جاں بحق ہو گئے۔ لغمان کی صوبائی کونسل نے تصدیق کی کہ مرنے والے عام شہری تھے۔ جولائی کے تیسرے ہفتے میں پکتیکا کے ضلع کڑواز کے بارڈر سے ایک امریکی فوجی کو اغوا کر لیا گیا جس کے بعد امریکی فوج نے آ کر علاقے میں گولی چلا دی جس سے 10 سے زائد بچے اور عورتیں شہید ہو گئیں۔

جراثیمی اور ممنوعہ کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال: اکتوبر کے آغاز میں سامنے آنے والا ایک میڈیا رپورٹ میں انکشاف کیا گیا کہ امریکی فوج نے طالبان کے خلاف جراثیمی ہتھیار استعمال کیے ہیں۔ فوج، زابل، ارزگان، ہلمند اور قندھار میں ان بین الاقوامی طور پر ممنوع ہتھیاروں کے تجربات کرتی رہی ہے اور جب یہ بات مشہور ہوئی تو اسے چند فوجیوں کی ذاتی حرکت قرار دے دیا گیا اور ان فوجیوں پر بھی مقدمہ چلانے کے بجائے انہیں چپکے سے وطن واپس بھیج دیا گیا۔ یاد رہے اس سے قبل مئی میں نیٹو کمانڈر ''ڈیوڈ میکرنین'' کے ترجمان جنرل گرگیری جولین نے بھی اعتراف کیا تھا کہ امریکی افواج افغانستان میں سفید فاسفورس بم استعمال کر رہی ہیں جو بین الاقوامی طور پر ممنوع ہیں۔

گوانتانامو بے میں مشق ستم جاری رہی: گوانتانامو بے کی طرح اس سال بگرام جیل کے قیدیوں پر بھی امریکی فوج کے لرزہ خیز تشدد کی رپورٹیں میڈیا پر آئیں جن سے امریکا کی اصل تہذیب کا نہایت مکروہ چہرہ سامنے آتا ہے۔ رپورٹوں میں بتایا گیا کہ قیدیوں پر کتے چھوڑ کر انہیں بدترین طریقے سے زخمی کیا جاتا ہے۔ ناقابل برداشت مار پیٹ اور غلیظ گالیوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ یخ بستہ پانی میں ڈبویا جاتا ہے۔ تپتے موسم گرما میں ان پر کھولتا ہوا پانی انڈیلا جاتا ہے۔ انہیں کئی کئی دن سونے نہیں دیا جاتا۔ بعض اوقات انہیں مادر زاد برہنہ کر کے آبرو باختہ مغربی عورتوں کے سامنے کھڑا ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ایسی ایک رپورٹ جون میں بی بی سی پر بھی نشر ہوئی۔

امریکی صدر اوباما نے انتہائی سنگ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی فوج کے ان سنگین جرائم کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ حالانکہ توقع کی جارہی تھی کہ اوباما انتظامیہ کم از کم عقوبت خانوں اور زندانوں میں مسلمانوں پر ہونے والے اس بدترین ظلم وتشدد میں کچھ نہ کچھ کمی ضرور کردے گی جس سے دنیا بھر میں امریکا کی رسوائی ہوئی ہے۔

طالبان کا قتل عام، دوستم اور سی آئی اے: وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ امریکی افواج، افسران اور انتظامیہ کے جنگی جرائم کی مزید تفصیلات سامنے آتی جارہی تھیں۔ جولائی کے وسط میں نیویارک ٹائمز نے کئی بار اُٹھائے جانے والے اس سوال کا جواب تلاش کیا کہ دسمبر 2001ء میں دوستم کے ہاتھوں ہزاروں طالبان کے قتل کی تحقیقات کیوں نہیں کی گئیں؟ اخبار نے انکشاف کیا کہ دوستم کے ان ناقابل معافی جنگی جرائم کی تحقیقات خود امریکا نے رکوائی تھیں کیونکہ دوستم سی آئی اے کا وظیفہ خوار ملازم رہا ہے۔

نیٹو کی حالتِ زار، نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں: امریکا کی دست راست نیٹو کے تمام حربے بھی ناکامی سے دوچار ہورہے تھے۔ 2009ء میں نیٹو نے طالبان کے روپ میں جنگجو میدان میں اُتارنے کا تجربہ بھی کیا مگر اس سے کوئی خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے۔ سال کے آخری مہینوں میں نیٹو کی اعلیٰ کمان اور ماتحت افواج کے کمانڈروں میں کشاکشی بھی بڑھ گئی۔ کمانڈر مزید تازہ دم فوجیوں کا مطالبہ کررہے تھے جبکہ اعلیٰ کمان اس کی متحمل نہیں تھی۔ 16 / اکتوبر کو ایساف کمانڈر میجر جنرل مارٹ دی کرولک کا یہ مطالبہ میڈیا پر سامنے آیا جس میں کہا گیا تھا کہ جنوبی افغانستان اور ہلمند کو دہشت گردوں سے پاک کرنے کے لیے کم از کم دو بریگیڈ مزید فوج یعنی 10 سے 15 ہزار سپاہیوں کی فوری ضرورت ہے۔ اس مطالبے کے جواب میں فرانس کے صدر سرکوزی نے فرانسیسی جریدے ''لی فگارو'' کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ہم اس جنگ زدہ ملک میں مزید ایک فوجی بھی نہیں بھیجیں گے۔

نیٹو کی ساکھ ختم: انہی دنوں کینیڈا کے ایک سابق فوجی جنرل رک بلیئر نے اپنی کتاب ''اے سولجر فسٹ بلٹس بیوروکریٹس اینڈ دی پولیٹکس آف وار'' میں پیش گوئی کہ نیٹو کو ایک بڑا دھچکا لگنے والا ہے۔ اگر نیٹو افغانستان میں کامیاب نہ ہوئی تو اس کے وجود کو خطرہ لاحق ہوجائے گا۔ جنرل رک بلیئر جس نے افغان جنگ کے ابتدائی سالوں میں ایساف افواج کی کمان بھی کی تھی، دعویٰ کیا کہ نیٹو اپنی ساکھ کھوچکی ہے۔ اکتوبر میں نیٹو کے سیکرٹری جنرل اینڈرسن فوگ راسموسن نے افغان جنگ میں درپیش مشکلات کا ذکر

کرتے ہوئے کہا: ''امریکا کے اتحادی اس جنگ میں شرکت کی بڑی بھاری قیمت چکا رہے ہیں۔ اگر ہم جنگ ہار رہے تو یہ ملک دوبارہ دہشت گردوں کا مسکن بن جائے گا۔''

افغان مسئلے کے بارے میں نیٹو کی ہائی کمان کی بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ اکتوبر کے آغاز میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے اجلاس میں نیٹو افواج کو افغانستان میں مزید ایک سال کے لیے سرگرم رکھنے کی قرارداد منظور کی گئی۔ اس کے صرف ایک ماہ بعد نیٹو کے سربراہ اینڈرسن فوگ نے برطانوی وزیراعظم گورڈن براؤن سے مشورے کے بعد اعلان کر دیا کہ آیندہ سال ہم اختیارات افغان فورسز کو سونپ دیں گے۔ کیونکہ اس ملک سے نکل جانا ہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔ یہ اعلان 14 نومبر کے قومی اخبارات میں شامل ہوا تھا۔

موصوف نے ایک جرمن ہفت روزے کو انٹرویو دیتے ہوئے اعتراف کیا کہ افغانستان کے حالات اور چیلنجز کے بارے میں ان کا اندازہ غلط تھا۔ انہوں نے ساتھ ہی اُمید ظاہر کی کہ اگر نیٹو ممالک مزید فوج بھیجنے پر آمادہ ہوں تو کامیابی مل سکتی ہے۔ ظاہر ہے اس قسم کے ملے جلے بیانات وہ اپنی خفت مٹانے کے لیے ہی دے رہے تھے۔

نیٹو سربراہ دسمبر کے آخری ہفتے افغانستان کے دورے پر بھی گئے، یہاں انہوں نے ایک بار پھر قلابازی کھائی اور 23 دسمبر کو کابل میں صدر حامد کرزئی کے ساتھ پریس کانفرنس میں کہا کہ ہم انخلا کی ڈیڈ لائن نہیں دے سکتے اور جب تک افغان فورسز ملکی دفاع کے قابل نہ ہوں، ہم افغانستان میں رہیں گے۔ ان بیانات اور اعلانات کے تضاد سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ نیٹو سربراہ کی قوت فیصلہ سلب ہو چکی تھی۔

<u>34 میں سے 33 صوبے طالبان کے پاس:</u> افغانستان میں نیٹو افواج کی ناکامی کا اندازہ خود نیٹو کے ایساف کمانڈر کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو دسمبر 2009ء کے اواخر میں عالمی میڈیا پر نشر ہوا جس میں دہائی دی گئی تھی کہ طالبان نے افغانستان کے 34 صوبوں میں سے 33 صوبوں میں متوازی حکومتیں قائم کر لی ہیں۔ وہ ہر روز طاقتور اور ہم کمزور تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سے قبل 20 اکتوبر کو پاکستان کے سابق حکمران پرویز مشرف نے نیویارک سے یہ بیان دیا کہ طالبان افغانستان کے 90 فیصد علاقے پر قابض ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ طالبان کو تسلیم نہ کرنا امریکا کی غلطی تھی۔

<u>رسد پر حملے جاری رہے:</u> 2009ء میں بھی امریکا اور نیٹو کے لیے پاکستان سے رسد کا راستہ محفوظ نہ بنایا جا سکا۔ یہاں قافلوں پر مسلسل حملے ہوتے رہے۔ فروری میں لنڈی کوتل میں نیٹو کے درجنوں کنٹینر اور آئل ٹینکرز جلا دیے گئے۔ مارچ کے وسط میں پشاور میں نیٹو کے قافلے پر ایک بار پھر بڑا حملہ ہوا۔

پاک افغان اڈے پر کھڑے 34 ٹرکوں کو نامعلوم حملہ آوروں نے رات کی تاریکی میں راکٹوں کا نشانہ بنا ڈالا۔ 34 ٹرکوں کے ساتھ ساتھ 20 بکتر بند گاڑیاں بھی جو حفاظت کے لیے ساتھ تھیں، تباہ ہو گئیں۔

نوبت یہاں تک پہنچی کہ مارچ کے اواخر میں نیٹو کے لیے سپلائی مکمل طور پر بند ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ کیونکہ تین ماہ سے پاکستان والا روٹ حملوں کی زد میں تھا۔ اوپر سے کرغیزستان نے بھی اپنی سرزمین پر امریکی اڈہ بند کر دیا تھا۔ اپریل میں تاجکستان نیٹو کو رسد کے لیے راہداری مہیا کرنے پر آمادہ ہو گیا جس کے بعد امریکا نے جون میں روس سے کیے گئے معاہدے کے تحت وسط ایشیا سے سپلائی لائن کھولنے کی تیاری مکمل کر لی مگر شمالی افغانستان میں رسد کے قافلوں پر طالبان کے حملوں کی منصوبہ بندی نے زمینی روٹ سے اس کوشش کو بھی خطرناک بنا دیا۔

اوباما روس سے مدد لینے پر مجبور: امریکی صدر اوباما نے اس صورتِ حال میں انتہائی مجبوری کا قدم اُٹھاتے ہوئے روس کے صدر کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور دونوں حکمرانوں نے جوہری اسلحے کی تخفیف کے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ ساتھ ہی روسی صدر نے امریکی واتحادی افواج کی رسد کے لیے روس سے روزانہ 12 پروازوں کو افغانستان جانے کی منظوری دے دی۔ اس طرح ایک حد تک سامانِ رسد جانے کی گنجائش نکل آئی، مگر امریکی واتحادی افواج کی ضروریات اتنی زیادہ تھیں کہ زمینی راستہ استعمال کیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ خصوصاً اس لیے کہ افواج کی تعداد میں اس سال مسلسل اضافہ کیا جا رہا تھا۔ سپاہیوں کی ہلاکت، رسد میں کمی اور وسائل کی کم یابی کی وجہ سے اگست کے آخری عشرے میں نیٹو کمانڈروں نے مشترکہ طور پر مطالبہ کیا کہ مزید وسائل اور مزید سپاہی فراہم کیے جائیں ورنہ افغانستان میں کامیابی مشکل ہے۔

کنٹینرز تباہ ہوتے رہے: ستمبر کے آغاز میں ایسے قافلوں پر پھر ایک بڑا حملہ ہوا جس میں نیٹو کے 25 آئل ٹینکرز اور کنٹینرز تباہ ہو گئے۔ یہ حملہ چمن بارڈر پر ہوا تھا۔ بم ایک آئل ٹینکر میں نصب کیا گیا تھا۔ دھماکے کے بعد شعلوں نے پورے قافلے کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اکتوبر کے دوسرے عشرے میں پشاور میں نیٹو کے ٹرمینل پر چند نامعلوم افراد نے حملہ کیا۔ وہ سیکیورٹی گارڈز سے اسلحہ چھین کر اندر داخل ہوئے اور کنٹینروں کو آگ لگا دی جس سے 10 گاڑیاں تباہ ہو گئیں۔ 8 نومبر کو جنوبی افغانستان میں نیٹو فورسز کی رسد کے قافلے پر حملہ کر کے 2 آئل ٹینکرز تباہ کر دیے گئے۔

امریکا کی ڈوبتی معیشت 2009ء میں: امریکا کے معاشی مسائل اس سال بھی روز افزوں رہے۔ نومبر سے دسمبر کے وسط تک صرف ڈیڑھ ماہ میں اس کے 11 بینک دیوالیہ ہو چکے تھے۔ اوسطاً ہر ماہ 11 بینک دیوالیہ ہوتے رہے جن کی مجموعی تعداد سال کے آخر تک 130 سے زائد ہو چکی تھی۔ امریکا میں بے

روزگاری کی شرح بھی ناقابل یقین حدوں کو چھو رہی تھی۔ 2 کروڑ 60 لاکھ افراد بے روزگار ہو کر مارے مارے پھر رہے تھے۔ صرف اکتوبر 2009ء میں 2 لاکھ افراد کو ملازمتوں سے جواب دیا گیا۔ امریکا کی معاشی تباہی کے اسباب میں اس کی عالمگیر جنگ سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ ایک رپورٹ کے مطابق 2001ء سے 2009ء کے اختتام تک امریکا افغانستان اور عراق کے محاذوں پر دس کھرب یعنی ایک ٹریلین ڈالر جھونک چکا تھا، مگر وہ نتائج سے اب بھی کوسوں دور کھڑا تھا۔

کرزئی حکومت کے مسائل

2008ء کے اواخر میں حامد کرزئی اور امریکی حکام کے درمیان فاصلے بڑھ گئے تھے اور صاف محسوس ہوتا تھا کہ امریکا اب ان کی جگہ کسی اور شخص کو استعمال کرنے والا ہے۔ یہ اشارے واضح تھے کہ امریکا کے نزدیک افغان جنگ میں کرزئی کی حکومت کی اہمیت کم ہوگئی ہے۔ 2009ء کے شروع ہی میں حامد کرزئی کو بڑا جھٹکا اس وقت لگا جب 20 جنوری کو وائٹ ہاؤس میں ہونے والی صدر اوباما کی تقریب حلف برداری میں انہیں مدعو نہ کیا گیا۔ افغان صدر نے اس کے ردِعمل میں اپنی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا امریکی حملوں میں افغان شہریوں کی ہلاکت ناقابل برداشت ہے۔

کرزئی، روس اور بھارت سے دوستی، میڈیا کا طنز: حامد کرزئی کے لب و لہجے سے پتا چلتا تھا کہ وہ امریکا سے بالکل مایوس ہو چکے ہیں۔ ماہ فروری میں ان کے بیانات اور اقدامات سے یہ واضح ہوگیا کہ وہ روس سے دوستی بڑھا کر امریکا کو بے اعتنائی کا رویہ تبدیل کرنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں۔ حامد کرزئی کے اس بدلتے ہوئے رجحان پر افغان میڈیا نے زبردست طنز کیا۔ روزنامہ ''ہشت صبح'' نے اپنے اداریے میں لکھا کہ حامد کرزئی امریکی سگار کو روسی ماچس سے جلانا چاہتے ہیں۔ روزنامہ ''پیمان'' نے لکھا حامد کرزئی نے چند ماہ سے مغربی دوستوں سے مایوس ہو کر روس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا ہے جس سے ان کی سیاسی ناپختگی ظاہر ہوتی ہے۔

حامد کرزئی جنوری کے دوسرے ہفتے میں بھارت یاترا بھی کر آئے تھے۔ حالانکہ اس سفر میں کوئی نئی بات نہیں ہوئی تھی۔ دہلی میں صدر بھارت اور وزیر خارجہ سے ملاقات میں حسب معمول دہشت گردی کے خاتمے کے لیے اتحاد و اتفاق کے عہد و پیمان کی تجدید کی گئی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کرزئی اپنے کیریئر کو بچانے کے لیے خطے میں نئے دوستوں کی تلاش اور پرانے دوستوں سے تعلقات میں مزید پختگی کے لیے نہایت شد و مد سے کوشش کر رہے ہیں۔

کرپٹ افغان حکومت: انہی دنوں نیٹو کے سیکرٹری جنرل جاپ ڈی ہوپ شیفر نے امریکی اخبار میں شائع کردہ اپنے آرٹیکل میں کہا کہ افغان حکومت نا اہل ہے۔ ملک کی تباہی کی وہ بھی اتنی ہی ذمہ دار ہے جتنا کہ طالبان۔ بنیادی مسئلہ طالبان نہیں حکومتی بدانتظامی ہے۔ افغان حکومت طالبان پر الزام لگاتی ہے، مگر وہ خود کرپشن کے طاعون کا شکار ہے۔

اس قسم کے تبصروں کے جواب میں حامد کرزئی نے بھی نیٹو کو آڑے ہاتھوں لیا اور کہا کہ نیٹو کے خودسرانہ اور غیر ضروری آپریشنوں کی وجہ سے طالبان کی حمایت اور ان کی متشددانہ سرگرمیوں میں اضافہ ہوا ہے۔ حامد کرزئی نے امریکی صدر اوباما کی جانب سے افغانستان میں مزید افواج کی تعیناتی کی بھی مخالفت شروع کر دی۔

انتخابات کی تاریخ: فروری 2009ء کے اواخر میں افغان پارلیمنٹ میں مزید امریکی فوج کی تعیناتی کا مسئلہ زیر بحث آیا، اکثریت نے ملک میں مزید 30 ہزار امریکی فوجیوں کی تعیناتی کو نا قابل قبول قرار دیا۔ افغان صدر اور پارلیمنٹ کے لیے یہ اظہارِ جرأت اس لیے ضروری تھا کہ اب قوم کو اعتماد میں لینے کا وقت آچکا تھا۔ مارچ میں الیکشن سر پر تھے اور کرزئی حکومت کو جیسے تیسے عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنا تھیں۔ تاہم انہی دنوں طالبان کی کارروائیوں کا ایک طوفان آگیا اور الیکشن کروانا ممکن نہ رہا۔ اس کے باوجود امریکا کا اصرار تھا کہ الیکشن چاہے نمائشی ہی سہی، ضرور کروائے جائیں۔ چنانچہ امریکی دباؤ پر اگست 2009ء میں انتخابات کا انعقاد طے کر لیا گیا۔

20/اگست 2009ء کے عام انتخابات: آخر کار 20/اگست کو امریکی اور اتحادی افواج کے سخت حفاظتی نرغے میں افغانستان کے عام انتخابات ہوئے۔ اس بار طالبان نے انتخابی عمل کو سبوتاژ کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ اس سے قبل افغان حکومت کی جانب سے انتخابات کے دوران عارضی جنگ بندی کی پیش کش کا انہوں نے مثبت جواب دیا۔ شاید طالبان نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ انتخابی عمل کو روکنے سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا۔ نتائج تو بالادست استعماری طاقت کے پروگرام کے مطابق ہی سامنے آتے ہیں، البتہ پولنگ روکنے کے لیے کیے گئے حملوں سے اُلٹا خود حملہ آوروں کی ساکھ متاثر ہوتی ہے۔

کرزئی نے دنگل جیت لیا: انتخابات میں حامد کرزئی کا اصل مقابلہ سابق وزیر خارجہ عبداللہ عبداللہ اور سابق وزیر خزانہ اشرف غنی سے تھا۔ ان کے علاوہ 30 دیگر امیدوار بھی تھے۔ حیرت انگیز طور پر حامد کرزئی نے اس بار بھی دنگل جیت لیا، جبکہ چند ماہ سے امریکا سے ان کے تعلقات کا روکھا پن سب کو یقین دلا رہا تھا کہ اس بار وہ چاروں شانے چت گریں گے۔ اس طرح 2009ء افغان صدر حامد کرزئی کے

لیے خوش قسمتی کا سال ثابت ہوا کیونکہ سال بھر انتخابات میں شکست کا خوف محسوس کرنے کے باوجود وہ بالآخر انتخابات جیت کر دوبارہ صدر بن گئے حالانکہ ان کی کامیابی کے امکانات بظاہر معدوم تھے۔ مبصرین کے مطابق آخری وقت میں امریکی انتظامیہ اور صدر کرزئی کے درمیان کچھ ایسے معاملات طے پاگئے تھے جن پر امریکا کو شدید اصرار اور کرزئی کو مسلسل انکار تھا جن میں سرفہرست ملک میں امریکی اڈوں کا قیام تھا۔ کرزئی نے جب یہ دیکھ لیا کہ امریکا کی ضد کے آگے انکار کا نتیجہ اقتدار سے محرومی کی شکل میں ملے گا تو وہ نرم پڑ گئے تاہم یہ طے کرلیا گیا کہ ان معاملات کو اس طرح تدریجاً آگے بڑھایا جائے گا کہ عوام اپنی حکومت سے بداعتماد نہ ہونے پائیں۔ ان نازک معاملات کے طے پا جانے کے بعد امریکا سمجھ گیا کہ اب کرزئی کی جگہ کسی نئی قیادت کو سامنے لانا سودمند نہیں ہوگا کیونکہ کرزئی طالبان سے بات چیت آگے بڑھانے میں بھی معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔ ہر چند کہ امریکا نے انخلاء کا حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا مگر آیندہ ایک دو سالوں میں وہ ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور ہوسکتا تھا۔ ان پہلوؤں کے پیش نظر رکھتے ہوئے کرزئی کو باقی رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

دھاندلی کا اعتراف: گزشتہ انتخابات کی طرح اس بار بھی پولنگ کے عمل میں زبردست دھاندلی دیکھنے میں آئی تھی۔ عبداللہ عبداللہ تو یہ رونا رو ہی رہے تھے، خود حامد کرزئی کو اعتراف کرنا پڑا کہ صدارتی الیکشن میں فراڈ ہوا ہے۔ 26/اکتوبر کو انہوں نے امریکی ٹی وی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ میں تسلیم کرتا ہوں الیکشن کے پہلے راؤنڈ میں فراڈ ہوا ہے تاہم یہ الیکشن اتنا برا بھی نہیں تھا جتنے ان کے مخالفین دعوے کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ صدارتی الیکشن کا دوسرا راؤنڈ ضرور ہوگا۔ ان کے اور عبداللہ عبداللہ کے درمیان دوبارہ صدارتی الیکشن ضرور ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو یہ جمہوریت کی بے عزتی ہوگی۔

توہین قرآن پاک، کرزئی کے خلاف نعرے: 19/اکتوبر کو صوبہ جلال آباد کے علاقے خواجگان میں امریکی فوجیوں کے ہاتھوں قرآن مجید کے نذرِ آتش کیے جانے کا افسوس ناک سانحہ پیش آیا۔ جس پر اگلے روز جلال آباد میں ہزاروں لوگوں نے احتجاجی مظاہرہ کیا اور کابل جلال آباد شاہراہ بند کردی۔ مظاہرین امریکی جھنڈے کو آگ لگا کر قرآن پاک کے دشمنوں سے اپنی نفرت کا اظہار کر رہے تھے۔ انہوں نے اوباما اور کرزئی کے خلاف زبردست نعرے بازی کی۔

امریکا نواز کابینہ کی تشکیل: 19/دسمبر کو حامد کرزئی نے افغان پارلیمان کی 25 رکنی نئی کابینہ کا اعلان کیا جس میں امریکا نواز افراد کو اہم وزارتیں دی گئیں۔ حنیف اتمار کو وزارتِ داخلہ اور عبدالرحیم وردگ کو وزارتِ دفاع کا قلمدان سپرد کردیا گیا۔ معدنی وسائل کی وزارت ابراہیم عادل کو دی گئی جن پر 20 ملین

ڈالر کی بدعنوانی کا الزام عائد تھا۔ کابینہ کے اعلان کے ردِ عمل میں جنوبی اور مشرقی افغانستان میں قبائلی عمائد کے جرگے منعقد ہوئے جن میں کابینہ کو مسترد کرتے ہوئے صدر حامد کرزئی کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

طالبان کی کارروائیاں: اب ذکر ہو جائے 2009ء میں طالبان کی کارروائیوں کا۔ یہ سال شروع ہوا تو طالبان کی کارروائیاں موسمِ سرما کی انتہائی شدت میں بھی جاری تھیں۔ برف باری کے دوران بھی ان میں کمی نہ آئی۔ 10 جنوری کو خوست میں ایک جھڑپ کے دوران 12/اتحادی فوجی ہلاک اور ایک ٹینک تباہ ہوا۔ کاپیسا میں طالبان کے حملے میں 4 فرانسیسی سپاہی مارے گئے۔ 17 جنوری کو کابل کے قریب امریکی بلیک ہاک ہیلی کاپٹر طالبان کے میزائل کا نشانہ بن گیا۔ کنڑ میں راکٹ سے چنیوک امریکی ہیلی کاپٹر مار گرایا گیا۔ ہرات میں بھی ایک ہیلی کاپٹر تباہ کیا گیا جس میں سوار بارہ افغان فوجی ہلاک ہو گئے۔ فروری کے پہلے عشرے میں طالبان نے جلال آباد کے امریکی بیس کیمپ پر ایک بڑا حملہ کیا جس میں 11/امریکی ہلاک اور تین گاڑیاں تباہ ہو گئیں۔ فروری کے اختتام پر شائع ہونے والے ایک تجزیے میں کہا گیا کہ طالبان کے حملے سال گزشتہ کی بہ نسبت تین گنا تیز نظر آرہے ہیں، کیونکہ 2008ء کے ابتدائی دو مہینوں میں 9/امریکی ہلاک ہوئے تھے، جبکہ اس سال اتنے وقت میں 28/امریکی مارے جا چکے ہیں۔

مارچ کے آغاز میں ہلمند میں طالبان نے خودکش حملہ کر کے 17/برطانوی فوجیوں کو بھی ہلاک کر دیا۔

موسمِ بہار کے معرکے: مارچ میں افغانستان میں عام انتخابات طے تھے۔ طالبان قیادت نے ایک طرف امریکی انتظامیہ کی تبدیلی اور دوسری طرف ملک میں انتخابات سے آنے والی تبدیلیوں کے پیشِ نظر افغانستان پر کنٹرول کی نئی حکمتِ عملی ترتیب دی جس کے مطابق 14 صوبوں میں طالبان کے تمام متوازی گورنر اور کمشنر تبدیل کر دیے گئے۔ مارچ کے آخری عشرے میں طالبان کی کارروائیاں تیز تر ہو گئیں۔ کنڑ میں ایک خون ریز جھڑپ کے دوران 31/امریکی ہلاک ہو گئے۔ ہلمند کے علاقے گریشک میں 22/اتحادی مارے گئے۔

آمدِ بہار کے تہوار جشنِ نوروز کے دن افغانستان کے مختلف علاقوں میں امریکی، اتحادی اور کٹھ پتلی افغان حکومت کے اہم اہداف پر بم دھماکے اور خودکش حملے ہوئے جن میں نیٹو کے 5 فوجیوں سمیت 30/افراد مارے گئے۔ شاہ ولی کوٹ میں سڑک کے کنارے نصب بم پھٹنے سے 4 کینیڈین سپاہی ہلاک ہو گئے۔ نیٹو کمانڈر میک کینن نے طالبان کی ان کارروائیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ طالبان حقیقی قوت رکھتے ہیں۔

انہی دنوں جلال آباد میں پولیس چیک پوسٹ پر حملہ ہوا جس میں خودکش حملہ آور نے دھماکا خیز مواد

سے لدی ہوئی کار چیک پوسٹ سے ٹکرادی، اس کارروائی میں 6/ اہلکار مارے گئے۔ مجموعی طور پر مارچ کے آخری عشرے کی کارروائیوں میں امریکا اس کے اتحادیوں اور افغان حکومت کے 81/ اہلکار لقمہ اجل بنے۔ موسمِ بہار میں طالبان کے تابڑ توڑ حملوں کی وجہ سے ملک میں عام انتخابات نہ ہوسکے اور ان کا وقت موسمِ گرما تک مؤخر کردیا گیا۔

طالبان اور امریکی اسلحہ: طالبان ان کارروائیوں میں اب امریکی اسلحہ بھی استعمال کررہے تھے جس کا انکشاف مئی کے آخری عشرے میں نیویارک ٹائمز نے کیا۔ جریدے نے دعویٰ کیا کہ طالبان امریکا کا اسلحہ امریکا ہی کے خلاف استعمال کررہے ہیں۔ اس ماہ پاکستانی ہفت روزہ تکبیر نے ایک رپورٹ میں انکشاف کیا ارزگان (ہلمند) میں کچھ طالبان کو گرفتار کیا گیا ہے جن سے امریکی اسلحہ برآمد ہوا ہے۔ تفتیش سے پتا چلا ہے کہ افغان فوج کے اہلکار اپنا امریکی ساختہ اسلحہ طالبان کو فروخت کردیتے ہیں۔ تاہم افغان حکومت نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے: "یہ وہ اسلحہ ہے جو 2008ء میں 40 کنٹینروں میں اسپین بولدک سے براستہ قندھار، کابل جارہا تھا۔ طالبان نے اسپین بولدک میں اس قافلے پر حملہ کرکے 40 کنٹینروں پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس اسلحے میں M-16 سے لیزر گنیں تک شامل تھیں۔ جو اسلحہ یا آلات زیادہ پیچیدہ تھے اور طالبان ان کا استعمال نہ سمجھ سکے، وہ انہوں نے ایک خلیجی ریاست کو فروخت کردیے۔"

طالبان نیٹ ورک وسیع: اس موسمِ گرما میں طالبان سربراہ ملا محمد عمر نے عظیم کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی کے بیٹے سراج الدین حقانی کو حزبِ اسلامی سے اشتراکِ عمل کا ہدف سونپ دیا۔ سراج الدین حقانی اور حزبِ اسلامی کے کمانڈروں میں اس بابت ملاقاتیں ہوئیں جس کے بعد طالبان اور حزبِ اسلامی میں امریکا اور اتحادیوں کے خلاف مشترکہ حملوں کی ترتیب طے پاگئی۔ 20 مئی کو طالبان نے ایک فوجی ہیلی کاپٹر مار گرایا جس میں سوار 15 / فوجی ہلاک ہوگئے۔ یکم جون کو وردک میں ریموٹ کنٹرول بم دھماکے سے اتحادیوں کا ٹینک تباہ ہوگیا۔ 14 / اتحادی سپاہی بھی اس حملے میں مارے گئے۔ اسی ہفتے 8 جرمن فوجیوں سمیت 32 / امریکی واتحادی سپاہی موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ اگلے ہفتے خوست میں 12 / خودکش حملے ہوئے جن میں درجنوں اتحادی فوجی مارے گئے۔

جون کے آخری عشرے میں امریکی جریدے "وال اسٹریٹ جرنل" نے انکشاف کیا کہ طالبان سربراہ ملا محمد عمر نے اپنے جنگجوؤں کا کنٹرول براہِ راست خود سنبھال لیا ہے جبکہ اس سے پہلے مقامی کارروائیوں کا اختیار مقامی کمانڈروں کے پاس تھا۔ جریدے نے دعویٰ کیا کہ ملا محمد عمر نے براہِ راست کنٹرول سنبھالنے کے بعد امریکی واتحادی افواج پر حملے تیز کرنے کا حکم دے دیا ہے اور خوست میں اس ماہ 12 / خودکش حملے انہی کے حکم

پر ہوئے ہیں۔ان دنوں امریکا نے روس سے معاہدے کے بعد وسطِ ایشیا کے راستے افواج کو رسد کی فراہمی کی تیاری مکمل کرلی تھی۔طالبان نے جواب میں شمالی افغانستان میں بھی حملوں کی پیش بندی کرلی۔

میک کرسٹل کی کمان میں خنجر آپریشن: اس دوران امریکی صدر اوباما کے دستخط کردہ بل کے مطابق 17 ہزار میں سے دو ہزار تازہ دم امریکی فوجی افغانستان پہنچ چکے تھے۔اوباما نے انتہائی تجربہ کار، ماہر اور عیار اعلیٰ فوجی آفیسر میک کرسٹل کو افغانستان میں اپنی افواج کی کمان سونپ دی تھی۔میک کرسٹل کو خصوصی کارروائیوں (اسپیشل آپریشن) کا جادوگر اور قومی ہیرو سمجھا جاتا ہے۔عراق میں نامور مجاہد کمانڈر ابو مصعب الزرقاوی کو شہید کرنے اور صدر صدام حسین کو گرفتار کرنے والے گروپ کا انچارج یہی شخص تھا۔

میک کرسٹل نے افغانستان آتے ہی افواج کو از سرِ نو مرتب کیا اور پہلی بار ایک نئے انداز سے طالبان کے خلاف ایک بہت بڑا آپریشن شروع کیا جسے ''خنجر آپریشن'' کا نام دیا گیا۔اس آپریشن کے لیے نیٹو کے 10 ہزار سپاہی چنے گئے تھے۔پہلے مرحلے میں 4 ہزار امریکی میرینز، دو ہزار افغان فوجی اور برطانوی رائل فورسز (شاہی فوج) کے 600 منتخب سپاہی حصہ لے رہے تھے۔ادھر طالبان نے حملہ آوروں کو بھرپور جواب دینے کی تیاری کرلی تھی۔

جون میں شروع ہونے والا یہ آپریشن جولائی کے آغاز تک جاری رہا۔امریکی واتحادی افواج مشرقی وجنوبی افغانستان میں طالبان کو تلاش کرتی رہیں۔مبصرین کے مطابق ویتنام جنگ کے بعد امریکا کا کسی جگہ یہ سب سے بڑا آپریشن تھا۔اس آپریشن میں ہلمند، زابل اور پکتیکا میدانِ کارزار بنے رہے۔ طالبان نے روایتی حوصلہ مندی اور جنگی مہارت کے ساتھ امریکی فوج کا سامنا کیا اور اسے ناکوں چنے چبوادیے۔دو ہفتوں کی خوں ریز جھڑپوں میں 115 / امریکی واتحادی سپاہی مارے گئے۔طالبان نے کانوائے پر حملہ کرکے متعدد گاڑیاں تباہ کردیں۔زابل میں ہیلی کاپٹر مار گرایا۔پکتیکا میں طالبان نے خود پیش قدمی کرکے امریکی اڈے پر بڑا حملہ کیا جس میں 89 / امریکی واتحادی ہلاک ہوگئے۔برطانوی شاہی افواج کا طالبان نے شاہانہ انداز میں خاطر خواہ استقبال کیا۔ہلمند میں 12 برطانوی فوجی ان کا نشانہ بن گئے۔برطانوی فوج کا لیفٹیننٹ کرنل بھی مارا گیا۔عالمی میڈیا کا کہنا تھا کہ 2001ء سے اب تک 184 برطانوی فوجی افغانستان میں ہلاک ہوچکے ہیں۔(صحیح اعداد وشمار اس سے کہیں زیادہ ہیں)

انہی دنوں امریکی فوجیوں میں سوائن فلو کی بیماری پھیل گئی اور ایک ہفتے میں 14 سپاہی شدید بیمار ہوگئے۔

فضائیہ بھی طالبان کی زد میں: 18 جولائی کو طالبان نے ایک عجیب کارنامہ انجام دیا۔وہ زیادہ تر ہیلی کاپٹروں کو نشانہ بناتے تھے، جبکہ جیٹ طیارے اپنی بلند پروازی کے سبب ان کی دسترس سے باہر تھے،

مگر اس دن قندھار کے فوجی اڈے سے برطانیہ کا ایک جیٹ طیارہ معمول کے گشت کے لیے اُڑنے لگا تو طالبان اس کی تاک میں تھے۔ اس سے پہلے کہ طیارہ زیادہ بلندی پر جاتا، طالبان نے اسے طیارہ شکن گولے سے مار گرایا۔ اسی ہفتے مختلف مقامات سے مزید دو ہیلی کاپٹروں کے تباہ ہونے کی خبر بھی ملی۔

آپریشن خنجر کی ناکامی: طالبان کے ان خوفناک حملوں کے بعد امریکا اور برطانیہ کو آپریشن خنجر بند کرنا پڑا۔ امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس نے تھکے ہارے لہجے میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ امریکی فوج اور امریکی عوام افغان جنگ سے تھک چکے ہیں۔ برطانوی فوج کی ہائی کمان نے ہلمند میں مار کھانے والی افواج کو چھاؤنیوں میں واپس بلا کر یہ مضحکہ خیز بیان جاری کیا کہ آپریشن مکمل ہوگیا ہے، اب ہم تعمیر نو پر توجہ دیں گے۔ برطانوی نمایندے نے کہا: ’’ہلمند میں مزید کارروائی اتنی اہم نہیں رہی بلکہ یہاں سے زیادہ خطرہ پاکستان میں ہے۔‘‘

اس بیان کے پیچھے یہ اشارہ مضمر تھا کہ طالبان قیادت پاکستان میں پناہ گزین ہے لہٰذا وہاں حملے کرنا زیادہ اہم ہے۔ اس کے جواب میں طالبان کمانڈر ملا عبدالغنی برادر کا بیان میڈیا پر آیا جس میں کہا گیا ہے کہ ملا محمد عمر سمیت تمام طالبان قیادت افغانستان میں ہے اور ہماری کارروائیاں اپنے ملک تک ہی محدود ہیں۔ ملا عبدالغنی اس تاثر کی تردید کرنا چاہتے تھے کہ افغانستان کے طالبان پاکستان میں بم دھماکوں اور خودکش حملوں میں ملوث یا معاون ہیں۔

ستمبر کے پہلے ہفتے میں طالبان نے مختلف کارروائیوں میں 38 اتحادی فوجیوں کو ہلاک کر دیا۔ ننگرہار میں دو اور کاپیسا میں تین ٹینک بھی تباہ کر دیے۔ کنڑ میں ایک ہیلی کاپٹر مار گرایا۔ قندھار میں بارودی سرنگ کے دھماکے سے 6 کینیڈین فوجی ہلاک ہوگئے۔

قندوز میں 98 شہری شہید: اس ہفتے طالبان کو ایک نقصان بھی برداشت کرنا پڑا۔ قندوز میں چند طالبان نے اتحادیوں کے ایک آئل ٹینکر کو اغوا کر لیا۔ وہ اسے قندوز کی بستی علی آباد لے آئے اور اس سے تیل نکالنے لگے۔ علاقے کے لوگ بھی یہ تماشا دیکھنے جمع ہوگئے۔ اچانک فضا میں امریکی طیارے نمودار ہوئے جو جدید آلات کی مدد سے آئل ٹینکر کا کھوج لگا چکے تھے۔ ان طیاروں نے آتے ہی اندھا دھند بمباری کی جس سے موقع پر جمع ہونے والے 98 عام شہری اور کئی طالبان شہید ہوگئے۔

ملا محمد عمر کا اہم بیان: 20 ستمبر کو طالبان سربراہ ملا محمد عمر نے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی کے بعد امریکا کی طرف سے صلیبی جنگ کے اعلان کے 8 سال مکمل ہونے پر ایک اہم بیان جاری کیا جس میں انہوں نے اعلان کیا: ’’غیر ملکی افواج کے انخلا تک جنگ جاری رہے گی۔‘‘ انہوں نے کہا: ’’ہم نے برطانوی

راج کے خلاف 80 سال جنگ لڑ کر فتح حاصل کی تھی۔"

نورستان میں اتحادیوں کی بدترین پسپائی: اکتوبر کے آغاز میں اتحادی افواج اور افغان فوج نے ہلمند اور نورستان میں طالبان کے خلاف ایک اور بڑا آپریشن شروع کیا۔ 7/ اکتوبر کے قومی اخبارات کی سرخیوں کے مطابق اس آپریشن میں اتحادیوں کی جانب سے بڑے پیمانے پر طالبان کی ہلاکتوں کا دعویٰ کیا جا رہا تھا، جبکہ افغان وزارتِ دفاع نے 10/ افغان فوجیوں کی ہلاکت کی تصدیق کی تھی۔ طالبان نے اس آپریشن کا جواب نورستان میں دیا اور وہاں قائم کی گئی امریکی افواج کی 8 چیک پوسٹوں پر یک بارگی طوفانی حملہ کیا۔ اس کارروائی میں 300 سے زائد طالبان حصہ لے رہے تھے۔ دن کے وقت شروع ہونے والی یہ لڑائی رات 11 بجے تک جاری رہی۔ جس میں 40 امریکی اور 35 افغان فوجی مارے گئے۔ 90/ افغان فوجی حملے کے بعد لاپتا ہو گئے جبکہ امریکی فوج علاقے سے فرار ہو گئی۔ طالبان نے ان کی ایک گاڑی اور اسلحے کے بڑے ذخیرے پر قبضہ کر لیا۔ مبصرین اسے طالبان کی اس سال کی سب سے بڑی کارروائی قرار دے رہے ہیں۔

بھارتی سفارت خانے پر حملہ: 8/ اکتوبر کو طالبان نے کابل میں بھارتی سفارت خانے کے قریب خودکش حملہ کر کے امریکا کے اتحادیوں کو ایک اور اعصاب شکن پیغام دیا۔ حملہ آور کار میں سوار تھا۔ اس نے صبح 8 بج کر 40 منٹ پر بھارتی سفارت خانے کے احاطے میں کار پارک کی اور دھماکا کر دیا جس سے تین بھارتی اہلکاروں سمیت 80/ افراد زخمی اور 17/ ہلاک ہو گئے۔ اقوام متحدہ سمیت کئی اداروں کی گاڑیاں اور قرب وجوار کی عمارتیں تباہ ہو گئیں۔

طالبان اور القاعدہ کی تکنیک: 11/ اکتوبر کو طالبان نے قندوز میں نیٹو کے بغیر پائلٹ جاسوسی طیارے کو کامیابی سے نشانہ بنایا۔ اس قسم کی کارروائیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کچھ دنوں بعد پینٹا گون نے اعتراف کیا کہ افغانستان میں مزاحمت کار ڈرون طیاروں کی لائیو ویڈیو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ انہوں نے ویڈیو فوٹیج حاصل کرنے کے لیے انٹرنیٹ سے ویڈیو اسکائی گریبر جیسا کمپیوٹر پروگرام خرید لیا ہے۔ پینٹا گون کے مطابق یہ ہیکنگ اس لیے ممکن ہوئی ہے کہ ڈرون طیاروں کا مواصلاتی لنک غیر محفوظ تھا جسے اَپ گریڈ کر کے اب محفوظ بنایا جا رہا ہے۔

یاد رہے مذکورہ سوفٹ ویئر انٹرنیٹ سے فقط 25 ڈالر کے عوض خریدا جا سکتا ہے۔ طالبان اور القاعدہ کے ارکان بڑی بڑی مہمات کو اس طرح نہایت ارزاں ٹیکنالوجی کے ذریعے سر کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ امریکا کے خلاف کارروائیوں کے ابتدائی سالوں میں ساٹھ ستر روپے کے خرچ سے سادہ

ریموٹ کنٹرول سسٹم بنایا جاتا تھا، جس میں چھ سات سو روپے کا بارود لگا کر ایک بارودی سرنگ تیار کر لی جاتی تھی۔ چند سو روپے کی ایسی بارودی سرنگوں کے ذریعے طالبان امریکی واتحادی افواج کی ان جدید ترین گاڑیوں کو تباہ کرتے رہے جن میں سے ہر گاڑی اپنے ساز وسامان اور اسلحہ وآلات سمیت تین کروڑ روپے کی لاگت تک پہنچ جاتی تھی جبکہ جانی نقصان اس کے علاوہ تھا۔

2005ء میں امریکا نے طالبان کے اس سادہ ریموٹ کا توڑ تیار کر لیا۔ امریکی واتحادی افواج کے گزرنے سے قبل تیز الیکٹرونک لہریں چھوڑی جاتیں جو راستے میں نصب بارودی سرنگ کو قبل از وقت پھاڑ کر قافلے کو محفوظ کر دیتیں۔ طالبان کے انجینئروں نے دن رات کی دماغ سوزی اور تجربات کے بعد اس کا حل بھی نکال لیا اور سادہ ریموٹ کو جدت دے کر اسے الیکٹرونک لہروں سے محفوظ بنا دیا۔ اس طرح اتحادیوں کی گاڑیاں ایک بار پھر ریموٹ کے ذریعے تباہ کی جانے لگیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس جدید تکنیک میں ریموٹ پر صرف پندرہ بیس روپے کا مزید خرچ آیا تھا۔

2008ء میں امریکا نے نئے آلات کے ذریعے طالبان کے اس نئے ریموٹ سسٹم کو ناکارہ بنانے میں کامیابی حاصل کر لی جس کے بعد طالبان ریموٹ بم حملوں کو چھوڑ کر اپنے جانی نقصان میں اضافے کا خطرہ برداشت کرتے ہوئے براہِ راست حملے کر کے قافلوں کو تباہ کرنے لگے۔

ایک سال بعد 2009ء میں طالبان کے انجینئروں نے نئے ریموٹ سسٹم تیار کر لیے جو دوبارہ ریموٹ حملوں میں کامیابی سے استعمال ہونے لگے۔ 2009ء کے اواخر میں مغربی میڈیا کی ایک رپورٹ میں انکشاف کیا گیا کہ طالبان اب سڑک کے کنارے بم حملوں کے لیے ایسے بم استعمال کر سکتے ہیں جنھیں لکڑی کے بنڈوں میں نصب کیا گیا ہوتا ہے اس لیے انہیں جدید ترین لہروں کے لیے ذریعے جام کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ بم اور ریموٹ سسٹم کو تلاش کرنے والے جدید ترین امریکی آلات ان کا سراغ نہیں لگا پاتے۔

مزید کارروائیاں: 16 اور 17 اکتوبر کو فراہ اور دیگر صوبوں میں 4 امریکیوں سمیت 6 اتحادی فوجی ہلاک ہوئے۔ 18 اکتوبر کو قندھار میں ایک ہیلی کاپٹر تباہ کیا گیا۔ اس روز کابل، قندھار شاہراہ پر غزنی کے قریب ایک بڑے حملے میں 15 امریکی ہلاک ہوئے جبکہ 20 گاڑیاں اور ٹینک تباہ کیے گئے۔ 26 اکتوبر کو طالبان نے بادغیس میں ایک امریکی ہیلی کاپٹر مار گرایا جس میں سوار 25 امریکی مارے گئے۔ اسی دن جنوبی افغانستان میں مزید دو ہیلی کاپٹر تباہ ہوئے جسے طالبان نے اپنی کارروائی قرار دیا جبکہ امریکی واتحادی حکام کے مطابق یہ دو ہیلی کاپٹر آپس میں ٹکرا کر تباہ ہوئے تھے۔ 28 اکتوبر کو تین طالبان جانبازوں نے کابل میں ایک گیسٹ ہاؤس کو دو گھنٹے تک اپنے قبضے میں لیے رکھا اور اس دوران

6 غیر ملکی عہدے داروں کو قتل کر دیا۔ جوابی حملے میں تینوں طالبان بھی نشانہ بن گئے۔

19 نومبر کو افغانستان کے مختلف علاقوں میں جھڑپوں اور بم دھماکوں میں 4 غیر ملکی فوجی ہلاک ہوئے جن کا تعلق برطانیہ، ڈنمارک اور امریکا سے تھا۔ اگلے ہفتے جنوبی افغانستان میں مختلف واقعات میں 5 امریکی فوجی مارے گئے۔ ان میں سے تین فوجی ایک بم دھماکے میں اور دو طالبان کی فائرنگ کا نشانہ بن کر ہلاک ہوئے۔ 2 دسمبر کو طالبان ترجمان نے امریکی صدر کی جانب سے مزید 30 ہزار فوجیوں کی تعیناتی پر ردِعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا:

''اس سے طالبان کا عزم مزید پختہ ہوگا اور مجاہدین کی تعداد میں بھی اور اضافہ ہوگا۔''

ترجمان نے کہا: ''اوباما امریکی فوجیوں کی لاشیں اُٹھانے کے لیے تیار رہیں۔''

دسمبر کے وسط میں طالبان نے ایک گرفتار امریکی فوجی کے بدلے اپنے 10 کمانڈر رہا کرا لیے۔ اس امریکی فوجی کو 5 ماہ قبل طالبان نے اس وقت اغوا کیا تھا جب وہ نشے میں دھت حالت میں اپنے کیمپ سے باہر نکل رہا تھا۔

23 دسمبر کو حزبِ اسلامی نے کاپیسا میں 5 اور طالبان نے وردگ میں 18/اتحادی فوجیوں کی ہلاکت کا دعویٰ کیا۔ 28 دسمبر کو طالبان کی مختلف کارروائیوں میں 12/اتحادی اور 18 طالبان مارے گئے۔

نیٹو کے ایک اعلیٰ انٹیلی جنس آفیسر نے اپنا نام خفیہ رکھتے ہوئے صحافیوں کو بتایا کہ افغانستان کے 34 میں سے 33 صوبوں پر طالبان کا کنٹرول ہے اور انہوں نے متوازی حکومت قائم کر کے باقاعدہ گورنر بھی مقرر کیے ہوئے ہیں۔ آفیسر کے مطابق ملا محمد عمر نے افغان حکومت کے سقوط کے امکان کے پیش نظر کابینہ بھی تشکیل دے دی ہے۔ آفیسر نے مزید کہا کہ طالبان کو اپنے اخراجات کے لیے سالانہ 10 سے 20 کروڑ ڈالر کی ضرورت ہوتی ہے جو منشیات، ٹیکس اور دیگر ذرائع سے پوری کی جاتی ہے۔ 20 دسمبر کو طالبان نے مختلف جھڑپوں میں 7/اتحادی فوجیوں کو ہلاک کیا۔ ننگرہار میں اتحادیوں کا ایک ٹینک تباہ ہوا جبکہ حزب اسلامی سے جھڑپ میں 4/اتحادی فوجیوں کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی۔

سی آئی اے کے افسران کا شکار: 2009ء کا اختتام امریکی استعمار کے چہرے پر ایک زناٹے دار طمانچہ رسید کر گیا۔ امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے کے افسران ان دنوں اس خوش فہمی میں مبتلا تھے وہ ایک تاریخی کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔ ان کا ایک ایجنٹ افغانستان میں روپوش القاعدہ کی قیادت کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ یہ ایجنٹ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر اور اُردن کا شہری تھا۔ اس کا نسلی تعلق فلسطین سے تھا۔ خلیل البلادی نامی اس ایجنٹ کو ایک سال قبل اُردن کی خفیہ سروس نے القاعدہ سے

ہمدردی کے شبہے میں گرفتار کیا تھا۔ دورانِ حراست اُردن کی خفیہ پولیس نے اسے اپنا ایجنٹ بنالیا تھا اور مکمل اعتماد کرنے کے بعد اسے سی آئی اے کی جانب سے افغانستان بھیج دیا گیا تھا۔

خلیل البلادی کا مشن القاعدہ کے نائب سربراہ اور شیخ اسامہ کے دست راست ڈاکٹر ایمن الظواہری کا کھوج لگانا تھا۔ خلیل البلادی سال بھر کی محنت شاقہ کے بعد اپنے ہدف کو پانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے دسمبر کے آخری ہفتے کے دوران اپنے رابطہ کاروں کو اطلاع دی کہ اس نے اپنا مشن مکمل کرلیا ہے۔ چنانچہ اسے خوست میں واقع سی آئی اے کے اڈے میں طلب کرلیا گیا۔ یہ اڈہ اس لحاظ سے بے حد اہم تھا کہ یہاں سے سرحد پار ڈرون حملوں کی نگرانی کی جاتی تھی۔ اسے سی آئی اے کے آپریٹو اسٹیشن کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ بدھ 30 دسمبر کی شام کو خلیل البلادی خوست پہنچ گیا۔ سی آئی اے کے افسران القاعدہ کی روپوش قیادت خصوصاً ایمن الظواہری کے بارے میں مصدقہ اطلاعات حاصل کرنے کے لیے بے چینی سے اس کا انتظار کررہے تھے، مگر خلیل البلادی انہیں معلومات فراہم کرنے نہیں، موت کا جام پلانے جارہا تھا۔ وہ خودکش حملے کی تیاری کرکے آیا تھا اور بارود بھری جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔

سی آئی اے سینٹر میں اس کے داخل ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد ایک ہولناک دھماکا ہوا اور پورا علاقہ لرز گیا۔ سی آئی اے سینٹر سے اُٹھنے والے شعلے دور دور تک دکھائی دیے۔ اس خودکش حملے میں افغانستان میں سرگرم سی آئی اے کی ٹیم کی سربراہ اپنے 7 افسران اور ایجنٹوں سمیت ماری گئی جبکہ 4 کینیڈین فوجی بھی ہلاک ہوگئے۔ اس واقعے سے امریکی ایوانوں میں ماتم برپا ہوگیا۔ میڈیا کے مطابق گزشتہ 27 برسوں میں یہ امریکی خفیہ ایجنٹوں پر ہونے والا سب سے بڑا حملہ تھا۔ واشنگٹن پوسٹ نے اس کارروائی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ حملہ آور ڈبل ایجنٹ تھا۔

چند دنوں بعد خلیل البلادی کی حملے سے قبل ریکارڈ کرائی گئی ویڈیو منظر عام پر آگئی جس میں اس نے کہا: ''میرا خودکش حملہ مسلمانوں کے دشمنوں امریکی سی آئی اے اور اُردنی انٹیلی جنس کے لیے پیغام ہے کہ کسی مجاہد کو خریدا نہیں جاسکتا۔ اردن اور امریکا کے خفیہ اداروں نے مجاہدین کی جاسوسی کے لیے مجھے کئی ملین ڈالر پیش کیے مگر میں نے مجاہدین کو سب کچھ بتادیا ہے۔ میرا حملہ امریکی ڈرون ٹیم سے بدلہ لینے کی کارروائیوں کی کڑی کا پہلا حصہ ہے اور یہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی پر مظالم کا بھی بدلہ ہے۔''

پنٹاگون کی رپورٹ کے مطابق مجموعی طور پر اس سال طالبان نے امریکی فوج پر 10200 حملے کیے۔

مذاکرات کی بانسری: ایک طرف امریکا جنگ میں پوری قوت جھونکتا چلا جارہا تھا اور بے قصور انسانوں پر زہرہ گداز مظالم ڈھا رہا تھا تو دوسری طرف مذاکرات کی بانسری بھی بجا رہا تھا۔ مارچ کے پہلے عشرے

میں امریکی صدر اوباما نے نیویارک ٹائمز کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ معتدل طالبان سے مذاکرات کا امکان موجود ہے۔ 30 ہزار مزید افواج کی تعیناتی کی حتمی منظوری دینے کے بعد 22 مارچ کو صدر اوباما نے ایک بیان میں کہا کہ افغانستان کے مسئلے کا حل صرف فوجی کارروائی سے ممکن نہیں۔ ''معتدل طالبان'' پر مذاکرات کا جال ڈالنے کے لیے امریکا سعودی عرب اور پاکستان سے کام لینا چاہتا تھا۔ اس سلسلے کی پہلی کوشش جنوری 2009ء کے وسط میں ہوئی جب سعودی انٹیلی جنس چیف شہزادہ مقرن کابل پہنچے اور صدارتی محل میں افغان صدر سابق مجاہد لیڈروں اور وزراء سے ملاقات کی جس میں طالبان اور حزب اسلامی سے مذاکرات کے امکانات اور طریقہ کار پر بحث کی گئی۔

مئی میں امریکا نے یہی مہم زیادہ پرکاری کے ساتھ شروع کی۔ اس بار سعودی عرب کو ہدف دیا گیا کہ وہ طالبان کو مذاکرات پر آمادہ کرے، جبکہ افغان صدر حامد کرزئی کے علاوہ ترکی اور ایران کو حزبِ اسلامی، پروفیسر سیاف اور دیگر سابق جہادیوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنے کا کام سونپا گیا۔ اس طرح اگر طالبان آمادۂ مذاکرات نہ ہوتے تب بھی امکان تھا کہ حزبِ اسلامی کو ان سے الگ کرنے میں کامیابی ہو جائے گی۔

طالبان جھانسے میں نہ آئے: تاہم یہ خواب بھی شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔ طالبان نے مذاکرات میں دلچسپی لی نہ حزب اسلامی اس جھانسے میں آئی۔ ملا عبدالسلام ضعیف نے پریس کو بتایا کہ ملا محمد عمر سے صلح کے بارے میں براہِ راست ایسے کوئی مذاکرات نہیں ہو سکے۔ اس سے قبل اپریل میں سابق طالبان راہنما مولوی وکیل احمد متوکل نے اپنے بیان میں امکان ظاہر کیا تھا کہ اگر غیر ملکی طاقتیں افغانستان چھوڑ دیں تو طالبان مذاکرات کے لیے تیار ہوں گے۔

اگست کے آغاز میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے نمائندہ برائے افغانستان کائی ریڈر نے اپنے بیان میں امریکی حکومت کو متوجہ کرتے ہوئے کہا:

> ''افغانستان میں قیام امن کے لیے طالبان قیادت سے مذاکرات کرنا ہوں گے۔ یہ مذاکرات چھوٹے مرتبے کے طالبان سے نہیں، بلکہ اعلیٰ قیادت سے کیے جائیں۔ اس کے بغیر مذاکرات بے نتیجہ ہوں گے۔ مذاکرات اگر جزوی طور پر کیے گئے تو نتائج بھی جزوی نکلیں گے۔''

طالبان سربراہ ملا محمد عمر کسی بھی موقع پر مذاکرات کے حق میں لچک اختیار کرتے نظر نہ آئے۔ ستمبر کے واخر میں امریکا کی صلیبی جنگ کے اعلان کو آٹھ سال پورے ہونے پر انہوں نے مذاکرات کے امکانات کو ایک بار پھر مسترد کرتے ہوئے اس عزم کا اظہار کیا کہ غیر ملکی افواج کے انخلا تک جنگ جاری رہے گی۔

نومبر میں امریکا نے سی آئی اے کے توسط سے طالبان کے نمائندے ملا برادر سے ملاقات کی اور

مذاکرات کاڈول ڈالا، مگر یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ ملا محمد عمر نے مذاکرات کو ایک بہانہ قرار دے کر ٹھکرا دیا۔

30 اکتوبر، وائٹ ہاؤس میں اہم اجلاس: معروف امریکن صحافی باب وڈورڈ (BOBWOOD WARD) اپنی تازہ تصنیف "Obama,s wars" میں ایک دلچسپ مجلس مشاورت کا ذکر کرتا ہے، ملاحظہ ہو:

"30 اکتوبر کو اوباما نے وائٹ ہاؤس میں تمام چیف اسٹاف کو طلب کیا، افغانستان میں موجود جنرل پیٹریاس، جنرل مائک مولن اور جنرل میک کرسٹل کو جان بوجھ کر اس اجلاس میں شریک نہ کیا گیا۔ اوباما نے کہا: افغانستان کی جنگ پورے امریکا کی جنگ ہے، مجھے اس کے حل کا ایک ہی طریقہ گھما پھرا کر تین طرح پیش کیا جارہا ہے، میں چاہتا ہوں کہ مجھے الگ الگ تین حل بتائے جائیں جن میں سے میں ایک کو چن سکوں۔

میرین کمانڈر جیمز کنوائے نے کہا: میرین فلاحی کارکن نہیں ہوتے کہ آپ ان سے تعمیرِ نو کا کام لیں، ان کا کام قتل کرنا ہے۔ ان کو اسی کی تربیت دی جاتی ہے۔ خدا دشمن کی مدد کر رہا ہے۔ ہم عمر بھر بھی افغانستان میں لڑتے رہیں تو کچھ نتیجہ نہیں نکلے گا۔ واحد راستہ یہ ہے کہ افغان فوج کی تربیت کر کے ملک ان کے حوالے کریں اور عراق کی طرح یہاں سے بھی واپسی کا فیصلہ کریں۔

عراق کے جنگ کے آزمودہ کار جنرل کیسی نے کہا: طالبان کو شکست دینا طویل وقت چاہتا ہے مگر ان کو منتشر کرنے میں کم وقت لگے گا۔

سب نے خوش ہو کر کہا: ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ طالبان اتنے منتشر ہو جائیں کہ دوبارہ حکومت نہ بنا سکیں۔

کیسی نے کہا: میک کرسٹل طالبان کو شکست دینے کی بات کرتے ہیں جو ناممکن ہے۔ ایسا ہوتا تو اسرائیل غزہ میں حماس کو شکست دے چکا ہوتا۔ مگر حماس کی طرح طالبان کو بھی عوامی مقبولیت حاصل ہے۔ اس لیے طالبان کو کمزور کرنے کے ساتھ منتشر کیا جائے اور پھر معاملات افغان فورسز کے سپرد کر دیے جائیں۔

اس تجویز سے سب نے اتفاق کیا اور اجلاس برخاست ہو گیا۔"

2009: پاکستان کے لیے خطرات: اوباما کی پالیسی کا ایک بڑا ہدف یہ تھا کہ پاکستان کے خلاف جاری خفیہ جنگ کا دائرہ وسیع کر دیا جائے، افغان جنگ کو تدریجاً پاکستان کی طرف منتقل کر دیا جائے، قبائل اور پاکستانی افواج کو باہم لڑا دیا جائے اور پاکستان کو جنگ زدہ خطہ ثابت کر کے اس کے ایٹمی

ہتھیاروں کو اپنی نگرانی میں لینے کا دیرینہ منصوبہ جلد از جلد مکمل کر لیا جائے۔ اس ہدف کے تحت فروری کے اواخر میں اوباما نے پاکستان کے قبائلی علاقوں پر ڈرون حملے بڑھانے کا حکم دے دیا۔ ادھر سی آئی اے، را اور کئی ممالک کی خفیہ ایجنسیاں پاک افغان سرحدی علاقوں میں پوری طرح متحرک ہو گئیں۔ یہ انکشاف فروری کے آخری عشرے میں پاکستانی فوج کے ایک ذمہ دار افسر نے کیا۔

سرحداتِ پاکستان پر ڈرون حملوں میں اضافہ: ڈرون حملوں کے بڑھ جانے سے جنوبی وزیرستان سے کرم ایجنسی اور باجوڑ تک تمام سرحدی علاقہ امریکی حملوں کی آماجگاہ بن گیا۔ مارچ کے آغاز میں جنوبی وزیرستان میں ڈرون حملے سے 12 افراد شہید ہو گئے۔ ساتھ ہی امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس نے بیان دیا کہ قبائلی علاقے امریکا سمیت پاکستان کے لیے خطرہ بن چکے ہیں، یہاں القاعدہ، طالبان، جلال الدین حقانی اور حکمت یار نے ٹھکانے بنائے ہوئے ہیں اور یہ مل کر یہاں سے مشترکہ کارروائیاں کر رہے ہیں۔ امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے نے بھی اعلان کیا کہ القاعدہ کے خلاف پاکستان کی حدود میں حملے جاری رہیں گے۔ مارچ کے پہلے عشرے میں امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے بھی دعویٰ کیا کہ افغانستان میں بیرونی خطرات کا منبع پاکستان میں ہے۔ مارچ کے آخری عشرے میں امریکی سفیر برائے پاکستان و افغانستان رچرڈ ہالبروک نے اپنے بیان میں کوئٹہ کو طالبان قیادت کا ہیڈ کوارٹر قرار دے دیا۔ مارچ کے اواخر میں شمالی و جنوبی وزیرستان پر مزید ڈرون حملے ہوئے، 24 گھنٹوں میں دوبار میزائل بھی پھینکے گئے جن سے 12 افراد شہید ہو گئے۔ اپریل کے پہلے عشرے میں شمالی وزیرستان کے علاقے اور کرّم ایجنسی میں شادی کی تقریب پر ڈرون حملہ ہوا جس سے بچوں اور عورتوں سمیت 25 افراد جاں بحق ہو گئے ہیں۔ ڈرون حملوں کے ساتھ اس قسم کے بیانات پر جمعیت علمائے اسلام پاکستان کے سربراہ مولانا فضل الرحمن نے اپریل کے آغاز میں نہایت برمحل تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ امریکا پاکستان میں داخل ہونے کے لیے مختلف حیلے بہانے تلاش کر رہا ہے۔

نظام عدل ریگولیشن: اپریل میں حکومت پاکستان نے سوات میں حالات کو سنبھالنے کے لیے بظاہر ایک اہم پیش رفت کی اور مولانا صوفی محمد کو ثالث بنا کر نظامِ عدل ریگولیشن کی منظوری دے دی۔ صدر آصف زرداری نے معاہدے پر دستخط بھی کر دیے۔ پورے ملک میں اس معاہدے پر خوشیاں منائی گئیں۔ پاکستانی طالبان کے سربراہ مولانا فضل اللہ اور ان کے نائب حاجی مسلم خان نے حکومت کو یقین دلایا کہ اب طالبان ہتھیار رکھ دیں گے مگر معاہدے پر اس انداز میں عمل نہ ہو سکا اور چند دنوں بعد فوج اور پاکستانی طالبان میں جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ حکومتِ پاکستان کا کہنا تھا کہ طالبان غیر مسلح نہیں ہوئے

تھے بلکہ ان کے بعض گروپوں نے بونیر پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کے ساتھ ہی مارگلہ عبور کر کے اسلام آباد تک ان کی رسائی کا خدشہ تھا۔

بہر کیف پاکستانی افواج نے مئی کے آغاز میں سوات کو خالی کرا کے وہاں بہت بڑا آپریشن شروع کر دیا۔ اس سانحے کے نتیجے میں سینکڑوں افراد جاں بحق، ہزاروں زخمی اور 35 لاکھ بے گھر ہو گئے اور پاکستان ایک زبردست بحران کے دور میں داخل ہو گیا۔ فوج اور قبائلی جنگجو سخت ترین حریف بن کر آمنے سامنے آ گئے اور پورے ملک میں بم دھماکوں اور خودکش حملوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

امریکی اتحادی بننے کا انعام!: امریکی محکمہ خارجہ نے انہی دنوں اپنی ایک رپورٹ میں بتایا کہ 2007ء اور 2008ء میں پوری دنیا میں دہشت گردی کے واقعات میں 18 فیصد کمی ہوئی جبکہ پاکستان میں دہشت گردی 200 فیصد تک بڑھ گئی ہے۔ یہ پاکستان کو افغانستان کی جنگ میں امریکا کا اتحادی بننے کا انعام مل رہا تھا۔ اس کے باوجود اوباما کا پاکستان میں جنگ کے شعلوں کو ہوا دینے کا جنون بڑھتا جا رہا تھا۔ مغربی میڈیا کی ایک رپورٹ میں کہا گیا کہ صدر اوباما پاکستان میں حملوں کے لیے اپنی افواج کو ویسے ہی وسیع اختیارات دینا چاہتے ہیں، جیسا کہ افغانستان میں برسرپیکار امریکی فوجوں کو حاصل ہیں۔ جون کے آخر میں جنوبی وزیرستان پر ایک اور بڑا ڈرون حملہ ہوا جس میں 100 / افراد شہید ہو گئے۔ ہنگو میں مدرسے پر ڈرون حملہ ہوا جس میں نامور عالم دین اور محدثِ زمان حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید ہو گئے اور نادر و نایاب کتب پر مشتمل ان کی انمول لائبریری بھی تودہ خاک بن گئی۔

جلال آباد کا ڈرون ائیر بیس: اگست کے وسط میں سی آئی اے نے پاک افغان سرحد پر القاعدہ کے مبینہ ٹھکانوں کو نشانہ بنانے کے لیے جلال آباد میں نیا ڈرون ایر بیس تیار کر لیا۔ اس سے پہلے بلوچستان کے شمسی ایر بیس کو استعمال کر کے وزیرستان پر ڈرون حملے کیے جا رہے تھے۔ اب جلال آباد کے اس نئے ڈرون ایر بیس سے خوست، پکتیا اور پکتیکا میں القاعدہ، طالبان اور مولانا جلال الدین حقانی کے مجاہدین کے ٹھکانوں پر بھی ڈرون حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔

بلیک واٹر کی پاکستان آمد: ادھر پاکستان کو پوری طرح اپنے شکنجے میں لینے کے لیے امریکی غنڈوں کی بدنام زمانہ فورس ''بلیک واٹر'' پاکستان پہنچ چکی تھی۔ اگست میں میڈیا پر چرچا ہوا کہ بلیک واٹر کے ارکان اسلام آباد میں 200 مکانات کرائے پر لے کر رہائش پذیر ہیں جس سے پورے ملک میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکا نے اسلام آباد میں 56 / ایکڑ پر اپنے سفارت خانے کی نئی قلعہ نما عمارت تعمیر کرنا شروع کر دی۔

جنوبی وزیرستان آپریشن: پاکستانی افواج نے جولائی میں سوات آپریشن مکمل کرلیا تھا جس کے بعد امریکی دباؤ پر اگست میں جنوبی وزیرستان میں بیت اللہ محسود کے خلاف بڑی کارروائی کی تیاری شروع کردی گئی۔ اگست کے اواخر میں بیت اللہ محسود کے ڈرون حملوں کا نشانہ بننے کی افواہ پھیلی جو بعد میں سچ ثابت ہوئی۔ حکومت پاکستان نے اسے دہشت گردی کے خلاف اپنی بڑی کامیابی قرار دیا۔ تاہم امریکا کے مطالبات اس سے کہیں آگے کے تھے۔

کوئٹہ پر امریکا کی نظر: ستمبر کے اواخر میں امریکا نے کھل کر یہ کہہ دیا کہ طالبان قیادت کوئٹہ میں موجود ہے اس لیے وہ کسی بھی وقت اپنے کمانڈوز کے ذریعے کوئٹہ پر حملہ کرسکتا ہے۔ برطانوی جریدے ''سنڈے ٹائمز'' نے امریکی حکام کے حوالے سے ایک انٹیلی جنس رپورٹ میں الزام عائد کیا کہ آئی ایس آئی ملا محمد عمر اور طالبان قیادت کو محفوظ ٹھکانہ فراہم کیے ہوئے ہے۔ یکم اکتوبر کو پاکستان میں امریکا کے ڈپٹی چیف آف مشن ''جیرالڈ فیئراسٹین'' نے دعویٰ کیا کہ ملا محمد عمر کوئٹہ سے طالبان کی قیادت کررہے ہیں۔

کیری لوگر بل: اکتوبر کے آغاز میں پاکستان کو مستقل طور پر امریکی شکنجے میں لینے کے لیے ''کیری لوگر بل'' سامنے آیا جسے پاکستانی عوام نے بیک آواز مسترد کردیا۔ پارلیمنٹ میں بحث کے دوران بھی اسے ملکی خودمختاری کا سودا کہہ کر شدید ترین تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ تاہم حکمران پارٹی کے لیے بل کی شرائط کے بدلے سالانہ 1.5 رارب ڈالر کی امداد بڑی پُرکشش تھی چنانچہ عوام اور عوامی نمایندوں سے بالا بالا بل میں پیش کردہ شرائط کے مطابق معاہدہ کرلینے کا فیصلہ ہوگیا۔ یہ بل دراصل پاکستان کو بغیر لڑے پوری طرح فتح کرنے کا معاہدہ تھا۔ امریکا کی توجہ اب اس بات پر مرکوز تھی کہ افغانستان سے پہلے پاکستان کو پوری طرح قابو میں کیا جائے، یہاں کے ایٹمی ہتھیاروں کو بے ضرر بنایا جائے، یہاں کے دینی مراکز کو حریتِ فکر سے عاری کیا جائے اور قبائل کے آزاد منش مسلمانوں کو مکمل طور پر غلامی کی زنجیروں میں جکڑا جائے۔ اس کے بعد ہی افغانستان یا کوئی اور ملک قابو میں آسکتا ہے۔ ''سب سے پہلے پاکستان'' کی اس نئی پالیسی کو نائب امریکی صدر جو بائیڈن نے اختراع کیا تھا۔ واشنگٹن پوسٹ کے مطابق اس نئی پالیسی کے آجانے کے بعد پاکستان براہِ راست امریکا کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے اور افغانستان کا مسئلہ پس منظر میں چلا گیا ہے۔ 16 دسمبر کو امریکی نائب صدر جو بائیڈن نے طالبان کے خلاف پاکستان کی کارروائیوں کی تعریف کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ پاکستان ابھی بہت کچھ نہیں کررہا۔ پاکستان کے مغربی علاقوں میں موجود دہشت گرد امریکا کے لیے خطرہ ہیں۔

ملا طور جان کا بیان: 8 نومبر کو افغان کمانڈر عبدالمنان عرف ملا طور جان نے ایک نجی ٹی وی چینل کو

انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہم امریکا سے اس لیے لڑ رہے ہیں کہ اس نے ہمارے ملک پر یلغار کی ہے۔ ہم انہیں بھگا کر دم لیں گے۔ ملا طور جان نے کہا ہمارا پاکستانی طالبان سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم صرف امریکا اور غیر ملکیوں سے لڑ رہے ہیں۔

بھارت کے مورچے افغانستان میں: ادھر پاکستان قبائلی علاقے کی جنگ میں اُلجھا ہوا تھا اور ادھر بھارت افغانستان میں قدم جماتا چلا جا رہا تھا۔ مئی کے وسط میں بھارت نے افغانستان کے خفیہ اداروں کو تربیت فراہم کرنے سے متعلق چار معاہدوں پر دستخط کر دیے۔ یہ مذاکرات دہلی میں ہوئے تھے جن میں امریکی اور برطانوی سفیروں کے علاوہ موساد کا نمایندہ بھی شامل تھا۔ پاکستان نے بھی افغانستان میں بھارت کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو کم کرنے کی کوشش شروع کر دی، انہی دنوں اسلام آباد میں شہری علاقائی اقتصادی تعاون کانفرنس (ایکا) کا انعقاد ہوا جس کے اختتام پر جاری کیے گئے اعلامیے میں پاکستان نے افغانستان میں تجارت، توانائی، مواصلات میں سرمایہ کاری کرنے، چمن تا قندھار ریلوے لائن بچھانے اور ایک ہزار افغان طلبہ کو اسکالرشپ پیش کرنے کا اعلان کیا۔

پاکستان کی جانب سے اس قسم کے اقدامات کے باوجود افغانستان میں بھارتی اثر و رسوخ کا توڑ نہ کیا جا سکا۔ اکتوبر کے آغاز میں اتحادی افواج کے ایک سابق کمانڈر ''ملٹ برڈن'' نے اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا افغانستان میں بھارتی اثر و رسوخ میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور یہ ملک بھارتی چھاؤنی کا روپ دھارتا جا رہا ہے۔

ملٹ برڈن کا یہ تاثر چند دنوں بعد بالکل درست ثابت ہوا۔ بھارتی وزیر اعظم من موہن سنگھ کی زیر صدارت قومی سلامتی و دفاعی کمیٹی کے مشترکہ اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ چند ماہ بعد 2010ء میں بھارتی فوج افغانستان میں اپنی سرگرمیاں شروع کر دے گی۔ انہی دنوں جنوبی وزیرستان کے ایک قبائلی راہنما نے سرحد پار پاکستان کے خلاف سرگرمیوں پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ افغانستان میں پاکستان کی سلامتی کے خلاف غیر ملکی ایجنسیوں کے 17 مراکز کام کر رہے ہیں۔

نئی امریکی پالیسی سے پاکستان متاثر: نومبر میں جبکہ امریکی قیادت افغان مسئلے پر اپنی نئی پالیسی مرتب کرنے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھی تھی، پاکستانی حکام کو شدید تشویش لاحق ہوگئی کہ کہیں نئی امریکی پالیسی میں پاکستان کے مفادات کو نظر انداز نہ کر دیا جائے، چنانچہ 23 نومبر کو پاکستان کے آرمی چیف اشفاق پرویز کیانی نے مطالبہ کیا کہ امریکا نئی افغان پالیسی پر پاکستان کو اعتماد میں لے، مگر ہوا وہی جس کا خدشہ تھا۔ 2 دسمبر کو صدر اوباما کی طرف سے امریکا کی نئی افغان پالیسی کا اعلان ہوا جس میں نہ صرف پاکستان

کے مفادات کو نظر انداز کیا گیا بلکہ بار بار پاکستان کو دہشت گردی کا مرکز قرار دیا گیا اور اپنی ناکامی کا ملبہ پاکستان پر ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے ردِعمل میں 3 دسمبر کو پاکستانی وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے امریکی الزامات اور اسامہ بن لادن کی پاکستان موجودگی کی تردید کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ امریکا افغان پالیسی کی وضاحت کرے۔ تاہم امریکا نے کسی سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا، بلکہ 8 دسمبر کو امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس نے نہایت سخت لہجے میں مطالبہ کیا کہ پاکستان طالبان کے خلاف کارروائی تیز کرے ورنہ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔

2009ء میں پاکستان کے نقصانات: مجموعی طور پر 2009ء میں پاکستان میں 44 ڈرون حملے ہوئے جن میں 700 افراد جاں بحق ہو گئے۔ ایک تجزیے کے مطابق ان میں سے 90 فیصد عام شہری تھے۔ اوسطاً 800 شہری شہید ہوئے۔ یعنی ایک ایک القاعدہ یا طالبان لیڈر کے ساتھ 140 عام شہری بھی نشانہ بنتے چلے گئے۔ ڈرون حملوں کے علاوہ ملک میں سال میں 91 دھماکے ہوئے جن میں 1482 افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

بدنام زمانہ نجی امریکی دہشت گرد تنظیم "بلیک واٹر" پاکستان میں گھس چکی تھی اور دہشت گردی کو ہوا دے رہی تھی۔ امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس نے خود جنوری 2010ء میں پاکستان کے دورے کے موقع پر اعتراف کیا کہ بلیک واٹر نجی حیثیت میں پاکستان میں کام کر رہی ہے۔

پاکستان کا دوٹوک جواب: دسمبر 2009ء کے وسط میں پاکستانی فوج کے سربراہ جنرل اشفاق کیانی اور امریکی نمائندے جنرل پیٹریاس کے درمیان ایک اہم ملاقات ہوئی۔ امریکا دباؤ ڈال رہا تھا کہ پاکستان جنوبی وزیرستان کی طرح شمالی وزیرستان میں بھی آپریشن کرے اور حقانی گروپ کے خلاف کارروائیاں کرے جو افغانستان میں طالبان کے شانہ بشانہ امریکی واتحادی افواج کا ناطقہ بند کیے ہوئے ہے۔ اس ملاقات میں امریکا نے واضح الفاظ میں دھمکی بھی دی اگر پاکستان نے امریکا کے حسب منشا موثر کارروائیاں نہ کیں تو کوئٹہ شہر پر ڈرون حملے شروع کر دیے جائیں گے۔ تاہم پاکستانی سپہ سالارِ اعلیٰ نے مزید امریکی دباؤ قبول کرنے اور کارروائیوں کا دائرہ کار بڑھانے سے انکار کر دیا۔ پاکستان کی جانب سے پہلی بار ایک جرأت مندانہ موقف نے امریکا کی مایوسی میں اضافہ کر دیا۔

مآخذ و مراجع

- ...... ہفت روزہ ضرب مؤمن، جلد 12، 13
- ...... ہفت روزہ تکبیر، فرائڈے اسپیشل، غازی: جلد 2009ء
- ...... قومی اخبارات۔ امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور رہفت روزہ جرائد 2009ء
- ...... طالبان کی ویب سائٹ (http://shahamat.info)
- ...... روزنامہ اسلام کراچی 2009ء
- ...... ذاتی یادداشتیں
- ...... زبانی روایات

اکتالیسواں باب

امن مذاکرات اور شدید معرکے

18 جنوری، کابل کا معرکہ: طالبان کے بھرپور حملوں کا سلسلہ 2010ء میں بھی جاری رہا۔ 18 جنوری 2010ء کی صبح سوا دس بجے کابل میں صدر حامد کرزئی کی کابینہ کی تقریب حلف برداری جاری تھی کہ 20 طالبان نے شہر میں داخل ہو کر اپنی قوت کی دھاک جمادی۔ انہوں نے ایوانِ صدر کی انتظامی عمارت، وزارتِ دفاع، وزارتِ انصاف، وزارتِ کان کنی، مرکزی بینک اور سیرینا ہوٹل سمیت 20 عمارتوں کو نشانہ بنایا۔ حلف برداری کی تقریب درہم برہم اور 8 عمارتیں نذرِ آتش ہوگئیں۔ چار گھنٹے تک شہر میدان جنگ بنا رہا۔ اس جھڑپ میں سیکیورٹی فورسز کے 14 افراد قتل اور 71 زخمی ہوئے۔ جوابی کارروائی میں 9 طالبان شہید ہوگئے۔

کابل دھماکا، را کے افسران ہلاک: 26 فروری بروزِ جمعہ کی صبح ساڑھے چھ بجے طالبان نے کابل میں کار بم دھماکہ کر کے ایک ہولناک کارروائی شروع کی۔ انہوں نے ایک ہوٹل اور تین گیسٹ ہاؤسز کو نشانہ بنایا، فائرنگ کے ساتھ پانچ خودکش بمباروں نے اپنے ہدف پر حملے کیے جس سے سترہ افراد ہلاک ہوگئے جن میں بھارتی خفیہ ایجنسی را کے چار اعلیٰ افسران، دو بھارتی میجر، اطالوی وزیر اعظم کا ایک مشیر اور ایک فرانسیسی شہری بھی تھے۔ پانچ مہینوں کے اندر کابل میں طالبان کا یہ پانچواں بڑا حملہ تھا۔ اس واقعے سے عالمی سطح پر خوف وہراس پھیل گیا۔

امریکا اور اتحادی فورسز کے متفرق نقصانات: 9 مارچ کو خوست کے ضلع علی شیر میں اتحادیوں کے فوجی اڈے پر خودکش حملہ ہوا جس میں دو افراد ہلاک ہوگئے۔

- 13 مارچ کو قندھار میں حامد کرزئی کے سوتیلے بھائی ولی کرزئی کے گھر اور پولیس ہیڈ کوارٹر سمیت متعدد مقامات پر خودکش دھماکے ہوئے جن میں 35 افراد ہلاک ہوگئے۔
- 2 اپریل کو قندوز میں جرمنی کے فوجی قافلے پر طالبان نے حملہ کر کے دو ٹینک تباہ اور 28 فوجیوں کو ہلاک کر دیا۔

- 19 اپریل کو طالبان نے زابل میں جدید ترین امریکی طیارہ سی وی 22 مار گرایا جس میں سوار چار اہلکار ہلاک ہو گئے۔
- 5 مئی کو طالبان نے پانچ خودکش بمباروں کے ساتھ نیمروز میں ایک بڑا حملہ کیا۔ طالبان اور مقامی فورسز میں زبردست جھڑپ ہوئی جس کے بعد طالبان نے کئی سرکاری عمارتوں پر قبضہ کر لیا۔
- 7 جون کو قندھار میں پولیس مراکز پر دو خودکش حملوں میں نیٹو کے دس فوجیوں سمیت 12 افراد ہلاک ہو گئے۔ غزنی میں کانوائے پر حملے میں پانچ افغان اہلکار مارے گئے۔
- 9 جون کو طالبان نے ہلمند میں نیٹو کا چنیوک ہیلی کاپٹر مار گرایا جس میں سوار چار افراد ہلاک ہو گئے۔
- 22 جون کو ارزگان میں نیٹو ہیلی کاپٹر تباہ ہوا جس میں آسٹریلیا کے کمانڈوز سمیت 14 فوجی مارے گئے۔ یہ ہیلی کاپٹر مجوزہ آپریشن قندھار کے لیے کمک لے کر جا رہا تھا۔ آسٹریلیا اور برطانیہ کے وزرائے اعظم نے اعتراف کیا کہ وہ اس جنگ میں شرکت کی بھاری قیمت چکا رہے ہیں۔
- 30 جون کو صبح آٹھ بجے طالبان فدائیوں نے جلال آباد ایئر پورٹ پر حملہ کر کے 15 امریکیوں کو مار ڈالا۔ مجموعی طور پر جون کے مہینے میں 115 امریکی اور نیٹو فوجی مارے گئے۔
- 22 جولائی کو اڑ ندک (ہلمند) میں طالبان نے چنیوک ہیلی کاپٹر مار گرایا، 6 امریکی ہلاک ہو گئے۔
- برطانوی اخبار دی گارڈین کے مطابق جولائی کے مہینے میں مجموعی طور پر ملک بھر میں 100 امریکی مارے گئے۔
- 26 اگست کو قندوز میں طالبان کے حملے میں 8 سیکورٹی اہل کار ہلاک ہو گئے۔
- 30 اگست کو لندن کے اخبار ٹیلی گراف نے خبر دی کہ افغانستان میں تین دنوں میں 27 امریکی مارے گئے۔ اگست خونی مہینہ ثابت ہوا۔
- 21 ستمبر کو طالبان نے زابل کے ضلع دیچوپان میں امریکی ہیلی کاپٹر مار گرایا، 9 فوجی ہلاک ہو گئے۔
- 5 اکتوبر کو قندھار میں دھماکے ہوئے، 4 نیٹو فوجیوں سمیت 8 افراد ہلاک ہو گئے۔
- 12 اکتوبر کو کنڑ میں چنیوک ہیلی کاپٹر مار گرایا، 26 نیٹو فوجی ہلاک ہو گئے، اسی روز کابل میں ایک کارگو طیارہ حادثاتی طور پر تباہ ہوا۔
- 12 اکتوبر کو ننگرہار سروبی چیک پوسٹ پر طالبان کے حملے میں 15 افغان فوجی ہلاک ہو گئے۔
- انہی دنوں غیر ملکی تنظیموں کو مشورے دینے والی تنظیم این جی او سیفٹی آفس نے امدادی کارکنوں کو طالبان کے زیر کنٹرول علاقوں میں ان سے اجازت لے کر جانے کا مشورہ دے دیا۔

✤ 2 نومبر کو کنڑ اور قندھار میں 7 امریکی مردار ہوئے، جاسوس طیارہ تباہ ہوا، نیٹو نے 22 طالبان کی ہلاکت کا دعویٰ کیا۔

✤ 12 دسمبر کو قندھار میں فوجی اڈے پر خودکش حملے میں 6 امریکی ہلاک ہو گئے۔

✤ 19 دسمبر کو کابل، جلال آباد اور قندوز میں طالبان کے حملوں میں 17 اتحادی ہلاک ہو گئے۔

مذکورہ سطور میں کارروائیوں کی صرف ایک جھلک دکھائی گئی ہے۔ عالمی ذرائع ابلاغ کے مطابق 2010ء میں 700 سے زائد اتحادی ہلاک ہوئے مگر دوسری طرف خود پینٹاگون کی رپورٹ کے مطابق اس سال مجموعی طور پر طالبان کے اٹھارہ ہزار حملے ہوئے جبکہ گزشتہ سال یہ تعداد دس ہزار دوسو تھی۔ اس رپورٹ میں ہلاک شدگان کی تعداد ظاہر نہیں کی گئی مگر اٹھارہ ہزار کی تعداد کو دیکھتے ہوئے ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ اتحادیوں کے جانی نقصانات اس سے کئی گنا زیادہ ہیں جو عالمی ذرائع ابلاغ پر نشر ہوتے ہیں۔

<u>امریکا، اتحادیوں اور افغان فورسز کے مظالم اور نقصانات:</u> 30 جنوری کو وردک کے ضلع سید آباد میں ایک افغان نژاد امریکی مترجم نے فائرنگ کر کے تین امریکی سپاہیوں کو ہلاک کر دیا اور جوابی فائرنگ میں خود بھی قتل ہو گیا۔

✤ 26 اگست کو قندھار میں ایک ڈرون گر کر تباہ ہو گیا۔

✤ 13 جولائی کو ہلمند کے مرکز لشکرگاہ میں برطانوی فورسز گھر گھر کی تلاشی لے رہی تھیں، اس دوران افغان فورسز کے ایک اہل کار نے انہیں متنبہ کیا کہ وہ تلاشی میں چادر اور چاردیواری کے تقدس کا لحاظ رکھیں، برطانوی فوجیوں نے جب اس کی کوئی پروانہ کی تو اس نے فائرنگ کر کے تین انگریز فوجیوں کو ہلاک اور چھ کو زخمی کر دیا اور خود فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

✤ 23 نومبر کو وردک میں ایک امریکی ہیلی کاپٹر تباہ ہو گیا۔

✤ 29 نومبر کو ایک افغان پولیس آفیسر نے فائرنگ کر کے 6 امریکی مار دیے، جوابی فائرنگ میں خود شہید ہو گیا۔

<u>نیٹو کے مظالم:</u> 6 اپریل کو نیٹو نے ہلمند میں بمباری سے دو خواتین سمیت آٹھ افراد کو شہید کر ڈالا۔

✤ 24 جولائی کو ہلمند کے گاؤں ریگی میں امریکی بمباری سے عورتوں اور بچوں سمیت 60 شہری شہید ہو گئے جو طالبان اور اتحادیوں کی لڑائی میں شدت آنے کی وجہ سے نقل مکانی کر رہے تھے، انہیں سفید پرچم دکھانے کے باوجود نشانہ بنایا گیا۔

✤ 2 ستمبر، تخار میں نیٹو نے انتخابی ریلی پر بمباری کر کے 12 افراد کو شہید کر دیا۔ انتخابی امیدوار

عبدالوحید خراسانی بھی زخمی ہو گئے۔

- 25 اکتوبر ہلمند بغران مسجد پر نیٹو کی بمباری کی گئی۔ کئی مکانات بھی تباہ ہوئے اور بچوں اور خواتین سمیت 50 افراد نے جام شہادت نوش کیا۔

افغان عوام کے مظاہرے: 10 جولائی کو کابل میں اتحادی افواج کے ہاتھوں مقامی افراد کی ہلاکتوں پر ہزاروں افراد نے احتجاج کیا۔ بلخ میں مقامی شہریوں نے امریکیوں کے انخلاء اور اسلامی حکومت کے قیام کے لیے مظاہرہ کیا۔

- امریکی ملعون پادری ٹیری جونز نے اا ستمبر کو قرآن پاک کے 200 نسخے جلانے کا اعلان کیا تھا، اس کے خلاف دنیا بھر میں مسلمانوں نے احتجاج کیا مگر سب سے شدید احتجاج افغان مسلمانوں نے کیا۔
- 7 ستمبر کو افغانستان میں قرآن کو جلانے کے امریکی پادری کے منصوبے کے خلاف احتجاج میں ارکان پارلیمنٹ سمیت سینکڑوں افراد نے دھرنا دیا اور امریکی قافلے پر پتھراؤ کیا۔
- 9 ستمبر کو اوباما نے ملعون پادری سے منصوبہ ترک کرنے کی درخواست کردی اور وجہ یہ بتائی کہ ایسی حرکات سے القاعدہ میں بھرتیاں تیز ہو جائیں گی۔
- 10 ستمبر کو پورے افغانستان میں توہین قران پر احتجاج ہوا۔ کرزئی نے پادری کے اعلان کو اسلام کی توہین قرار دیا۔ بدخشان کے صدر مقام فیض آباد میں نماز عیدالفطر کے بعد قرآن مجید کی توہین پر احتجاج کے لیے ہزاروں مظاہرین جمع ہوئے، تب ان پر نیٹو چھاؤنی کے جرمن فوجیوں نے فائر کھول دیا جس سے ایک شخص شہید اور چار زخمی ہو گئے۔

امریکا کی کارروائیاں، سازشیں اور ناکامیاں

آپریشن مشترک: فروری میں امریکی فوج نے نیٹو کے ساتھ ہلمند میں آپریشن مشترک شروع کیا مگر ناکام ہو کر پسپا ہو گئی جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

فروری 2010ء کا دوسرا عشرہ شروع ہوتے ہی جنوبی افغانستان کے صوبے ہلمند میں طالبان اور اتحادی افواج کے درمیان ایک سخت ترین معرکہ لڑا گیا۔ مفاہمت کی باتیں کرتے کرتے امریکا نے اچانک اپنے چیلے چانٹوں کی تمام تر ممکنہ قوت کو ایک نقطے پر جمع کر کے ہلمند کے ایک ضلع نادعلی کے ایک چھوٹے سے قصبے "مرجہ" کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ افغانستان میں نادعلی جیسے 365 اضلاع اور مرجہ جیسی ہزاروں بستیاں ہیں۔ امریکا اور اس کے اتحادی اس چھوٹے سے ہدف کو سر کرنے کے لیے شیفٹن اور ابراہام جیسے

65 ٹن وزنی ٹینک، ڈرون طیارے، 60 ہیلی کاپٹر اور پندرہ ہزار سپاہی میدان میں لے آئے۔ اسے ویت نام کی جنگ کے بعد کسی بھی ملک کے خلاف کی جانے والی امریکا کی سب سے بڑی کارروائی شمار کیا جا رہا تھا۔ اس آپریشن کے پیچھے یہ ذہن کارفرما تھا کہ کسی طرح کم از کم کسی ایک علاقے کو طالبان کے قبضے سے نکال کر دکھایا جائے اور یوں امریکی قوم کی خاک آلود ناک اونچی کرنے کوشش کی جائے۔

اس آپریشن کی وجہ سے علاقے سے کم از کم تیس ہزار افراد نقل مکانی پر مجبور ہو گئے تاہم طالبان اپنے روایتی ایمانی جذبے اور مومنانہ شجاعت کے ساتھ اس بار بھی مقابلے میں ڈٹے رہے۔ انہوں نے اپنے مرکز ''مرجہ'' سے، جو اتحادیوں کا اصل ہدف تھا، آگے بڑھ کر دشمن کی پیش قدمی روک لی۔ گھمسان کی لڑائی میں اتحادیوں کا جو نقصان ہوا اسے صحیح طرح میڈیا پر نشر نہیں کیا گیا تاہم خصوصی ذرائع کے مطابق ابتدائی جھڑپوں ہی میں امریکا اور اتحادیوں کے 100 سے زائد سپاہی مارے گئے۔ پچاس سے زائد ٹینک، کئی ہیلی کاپٹر اور ڈرون طیارے تباہ ہو گئے۔ طالبان نے بارودی سرنگوں اور دیسی بموں سے دشمن کی پیش قدمی کا راستہ مسدود کر دیا۔ ان کی جرأت کا یہ عالم تھا کہ عورتوں نے بھی ہتھیار اُٹھا لیے تھے۔ ایک غیور افغان خاتون نے مرجہ کے بازار میں اتحادی سپاہیوں پر فائر کھول کر 14 / افراد کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور جوابی فائرنگ میں خود بھی شہید ہو گئی۔

اتحادیوں نے تنگ آکر معصوم شہریوں پر غصہ اتارنا شروع کر دیا اور مرجہ کی آبادی پر اندھادھند راکٹ باری کر کے ایک ہی خاندان کے نو افراد سمیت بارہ افراد کو شہید کر دیا۔ بہرکیف ہلمند پر ان کی یلغار جسے ''آپریشن مشترک'' کا نام دے کر اس سے بڑی اُمیدیں وابستہ کر لی گئی تھیں، سو فی صد ناکام رہی۔

آپریشن میں مسلسل ناکامی کے بعد 22 فروری کو امریکی فضائیہ نے ارزگان میں شہریوں کی مسافر گاڑیوں پر بمباری کر کے تیس افراد کو شہید کر دیا جس سے پورے افغانستان میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی، حامد کرزئی نے احتجاج کیا جس پر نیٹو اور امریکی افواج کے کمانڈر جنرل میک کرسٹل نے زبانی معذرت کو کافی سمجھا۔

آپریشن قندھار: آپریشن مشترک کی شرمناک ناکامی کی خفت مٹانے کے لیے طے کیا گیا کہ کسی طرح افغانستان کے ایک شہر قندھار پر قابو پا کر خود کو فاتح ثابت کیا جائے، چنانچہ مارچ میں بڑے زور و شور سے 23 ہزار سپاہیوں کے ساتھ قندھار اور اس کے مضافات کو طالبان سے پاک کرنے کی مہم کا اعلان کیا گیا مگر طالبان کی جوابی کارروائیوں کے خوف سے یہ مہم ملتوی ہوتی چلی گئی۔ امریکی فوج کے مرکزی کمانڈر جنرل ڈیوڈ پیٹریاس کا کہنا تھا کہ اس آپریشن میں سخت مزاحمت کا سامنا ہوگا۔ آپریشن کی تیاریوں میں نو مہینے گزر گئے۔ پہلے، لوگوں کو طالبان کے خلاف ابھارنے کی ناکام کوششوں میں کئی ماہ ضائع کیے

گئے، پھر قندہار کے گردونواح میں ہزاروں ایکڑ زرعی زمینوں کو بمباری کر کے اور بلڈوزر چلا کر ہموار کیا گیا تا کہ طالبان یہاں مورچے نہ بنا سکیں۔ اس طرح ہزاروں گھرانوں کو نقل مکانی پر مجبور کیا گیا۔

اس کے باوجود امریکا باقاعدہ آپریشن شروع نہیں کر سکا جب کہ طالبان نہ صرف قندھار کے گردونواح بلکہ بیچ شہر میں امریکی کمانڈوز، اسپیشل فورسز اور حکومتی اداروں پر مسلسل حملے کر کے اپنی دھاک بٹھاتے رہے۔

امریکا کا دیوالیہ: اس سال بھی امریکا میں کساد بازاری کے اثرات نظر آتے رہے، صرف سال کے ابتدائی چار مہینوں میں پچاس امریکی بینک بند ہوئے۔ اس سال افغانستان میں امریکا کے جنگی اخراجات بڑھتے چلے گئے، عراق جنگ کے مصارف 64 ارب ڈالر تک تھے مگر افغان جنگ کے اخراجات 72 ارب ڈالر سے بھی بڑھ گئے۔ امریکی ذرائع ابلاغ نے اعتراف کیا کہ گیارہ ستمبر 2001ء کے بعد پینٹاگون کا بجٹ دوگنا ہو گیا ہے۔

عراق جنگ ختم: امریکا نے اس سال اگست کے اواخر میں عراق کی جنگ ختم کر دی تا کہ اپنی ساری طاقت افغانستان میں جھونکی جا سکے۔ اس سے قبل اپریل کے آغاز میں عراق سے 41 ہزار گاڑیاں، 30 لاکھ جنگی ساز و سامان اور تیس ہزار سپاہی افغانستان پہنچا دیے گئے تھے۔ ستمبر کے آغاز میں اوباما نے عراق جنگ کے خاتمے کا باضابطہ اعلان کرتے ہوئے کہا کہ اب ہماری تمام توجہ افغانستان پر ہو گی۔ عراق کی جنگ میں چار ہزار چار سو سپاہی ہلاک اور 34 سو زخمی ہوئے۔ اربوں ڈالر خرچ ہو گئے، اب ملکی معیشت کو مضبوط کیا جائے گا۔ امریکی محکمہ خارجہ کے ترجمان فلپ کراؤل نے اعتراف کیا کہ عراق جنگ میں جو سات سال پانچ ماہ پر محیط تھی، ایک کھرب ڈالر ضائع ہوئے ہیں۔

میک کرسٹل کا استعفیٰ: سال کے دوران امریکا کے لیے اس وقت سخت پریشان کن صورتحال پیدا ہو گئی جب افغانستان کے امریکی سپریم کمانڈر میک کرسٹل نے کھلم کھلا اوباما انتظامیہ کی پالیسیوں سے اختلاف کرنا شروع کر دیا۔ 22 جون کو اس نے اوباما انتظامیہ پر افغان جنگ میں ناقص حکمت عملی اختیار کرنے کا الزام لگایا۔ میک کرسٹل کے خیالات کو ایک صحافی مائیکل ہیسٹنگ اس کی اجازت سے قلم بند کر کے منظر عام پر لایا، اس رپورٹ کے اہم مندرجات یہ تھے:

- امریکی نائب صدر جوزف بائیڈن کی افغان پالیسی سے افغانستان انتشار کا شکار ہو جائے گا۔
- افغان جنگ کی موجودہ پالیسی محض وقت اور معیشت کا ضیاع ہے۔
- سینیٹر جان کیری اور جان میک مین کا حامد کرزئی سے رویہ غیر مناسب ہے۔

❁ افغانستان میں ایک بے گناہ شخص کا قتل دس مزید مجاہد پیدا کر دیتا ہے اس لیے یہاں عراق والی پالیسی نہیں چلے گی۔

واضح رہے کہ میک کرسٹل خود عراق میں ایک خوں خوار جنرل کے طور پر مشہور تھا، اس نے وہاں جنرل پیٹریاس کی ماتحتی میں جوائنٹ اسپیشل فورسز کمانڈر کی حیثیت سے معصوم شہریوں کا قتل عام کیا تھا۔ عراق میں شیعہ سنی فسادات برپا کرانے اور کرائے کی مقامی فوج متعین کرنے کے بعد امریکا کو خوش فہمی ہو گئی کہ افغانستان میں بھی یہی نسخہ کامیاب ثابت ہوگا، چنانچہ یہی عمل دہرانے کے لیے میک کرسٹل کو افغانستان میں متعین کر دیا گیا مگر یہاں طالبان کی مزاحمت کا مزہ چکھنے اور کئی ناگوار تجربات سے گزرنے کے بعد اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔

آپریشن مشترک میں ناکامی سے میک کرسٹل کا رعب داب ختم ہو گیا تھا اور آپریشن قندھار کے مسلسل التواء نے اس کی ساکھ بالکل ہی گرا دی تھی۔ اپنی ناکامیوں کے جواز میں میک کرسٹل نے برملا یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہاں عراق جیسی فریب کاری نہیں چل سکتی، یا تو مزید دو تین گنا فوج تعینات کی جائے اور ہر دس افغانوں پر ایک فوجی مقرر کیا جائے ورنہ جنگ ختم کر کے واپسی کا راستہ ناپنا ہی بہتر ہے۔
مذکورہ رپورٹ میں میک کرسٹل کے خیالات خلاصہ یہ تھا کہ افغان جنگ مکمل طور پر ناکام جنگ ہے۔ اس نے امریکن انتظامیہ پر فرداً فرداً طنز کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ افغان امریکی سفیر رچرڈ ہالبروک ایک درندہ ہے، میں جس کی ای میل کھولنا نہیں چاہتا، مشیر سلامتی جیمز جونز مسخرہ ہے، جو ابھی تک 1985ء کی سرد جنگ کے دور میں جی رہا ہے۔ نائب صدر جوزف بائڈن کون ہے میں نہیں جانتا؟

میک کرسٹل کے اس بیان پر امریکی صدر اوباما نے سخت ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے اسے واشنگٹن طلب کر لیا اور اس سے استعفیٰ لے کر اس کی جگہ جنرل ڈیوڈ پیٹریاس کو افغان جنگ کا مرکزی کمانڈر مقرر کر دیا۔

6 جولائی کو امریکی ہوم لینڈ ڈیپارٹمنٹ کے ایک افسر نے دعویٰ کیا کہ ملا عمر کو 27 جون کو کراچی سے گرفتار کیا جا چکا ہے تاہم طالبان نے اس کی پرزور تردید کرتے ہوئے اسے امریکا کی اپنی ناکامیوں کو چھپانے کا ایک شوشہ قرار دیا۔

جولائی کے اوائل میں امریکی فوج کے سربراہ ایڈمرل مائک مولن نے سیکورٹی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ آپریشن قندھار ناکامی کے خوف سے موخر کیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ افغان مسئلے کا سیاسی حل ہی ممکن ہے۔

30 اگست کو امریکی اور نیٹو افواج کے سربراہ جنرل ڈیوڈ پیٹریاس نے کہا کہ طالبان کے حملوں کی

تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ نیٹو کو شدید مزاحمت کا سامنا ہے۔

اتحادیوں کی پسپائی: اگست کے آغاز میں ہالینڈ نے اپنی فوج کو جو چار سال سے افغانستان میں تھی واپس بلالیا، اس مدت میں ہالینڈ کے 24 فوجی ہلاک اور 140 زخمی ہوئے تھے۔

اکتوبر کے اواخر میں جرمنی نے اعلان کیا کہ وہ مئی میں اپنی فوج واپس لے جائے گا۔ کنیڈا اور اٹلی نے بھی 2011ء کے موسم گرما میں انخلاء کا فیصلہ سنا دیا۔

نومبر کے آغاز میں فرانس نے بھی واضح کردیا کہ وہ اپنی فوج 2011ء میں واپس بلالے گا۔

مڈٹرم الیکشن میں اوباما کی پارٹی کو شکست: 3 نومبر کو امریکی مڈٹرم الیکشن میں افغانستان سے انخلاء کی حامی اوباما کی جماعت ڈیموکریٹس ہار گئی۔ بش کی پالیسوں کے مطابق افغان جنگ جاری رکھنے کی حامی ری پبلکن پارٹی نے 230 نشستیں لے کر ایوانِ زیریں (ایوانِ نمائندگان) سے ڈیموکریٹس کی اکثریت ختم کردی جو صرف 178 نشستیں جیت سکی۔ 37 ریاستوں میں سے 24 میں گورنر کے عہدے پر بھی اپوزیشن کامیاب رہی۔

نیٹو کا اہم اجلاس: 19 نومبر پرتگال کے دارالحکومت لزبن میں نیٹو کا دوروزہ اہم اجلاس ہوا جس میں 28 رکن ممالک کے صدور اور وزرائے اعظم کے علاوہ افغانستان اور روس کے نمائندے بھی شامل تھے۔ اس میں افغانستان کے مستقبل کا لائحہ عمل طے کیا گیا اور نیٹو کو سپلائی کے متبادل راستوں پر غور کیا گیا۔

20 نومبر کو اجلاس کے اختتام پر نیٹو اور افغان صدر نے اس معاہدے پر دستخط کیے کہ نیٹو افواج 2014ء تک افغانستان کے تمام علاقوں کا اختیار افغان فورسز کو سونپ دیں گی، البتہ وہ افغان فورسز کی تربیت کرتی رہیں گی۔ یہ اعلان بھی ہوا کہ روس نیٹو افواج کی سپلائی کے لیے خصوصی رعایتیں دے گا۔ آخر میں نیٹو سربراہ راسموسن فوگ نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جب تک حالات ٹھیک نہیں ہوجاتے، ہم افغانستان میں رہیں گے۔ یہ سمجھنا دشمن کی بھول ہوگی کہ ہم فرار ہورہے ہیں، انخلاء کے بعد بھی افغانستان کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔

ایک دکاندار امریکی جنرلوں کو بے وقوف بنا گیا: 23 نومبر کو شایع ہونے والی خبروں کے مطابق ایک نامعلوم شخص ملا منصور بن کر امریکی حکام کو مدت تک بے وقوف بناتا رہا۔ میک کرسٹل نے اس کی وساطت سے بات چیت کی منظوری دی تھی۔ وہ تین ملاقاتوں میں امدادی کاموں کے نام پر امریکیوں سے خطیر رقم بٹور کرلے گیا۔ ایک بار اسے افغان صدر سے ملانے کے لیے خصوصی طیارے میں کابل بھی لایا گیا۔ تفتیش سے معلوم ہوا کہ وہ کوئی کوئٹہ کا دکاندار تھا جواب روپوش ہے۔

ملا ریڈیو: نومبر میں افغانستان میں طالبان کے خلاف پروپگنڈے کے لیے امریکا نے مفت ریڈیو سیٹ بانٹنا شروع کر دیے۔ ابتدائی دنوں میں 15 ہزار ریڈیو تقسیم کیے گئے۔ اس ریڈیو کو ''ملا ریڈیو'' کا نام دیا گیا تاکہ مذہب پسند عوام بھی اسے پسند کریں، اس میں خبروں تبصروں اور موسیقی کے ذریعے انتہا پسندی کے خاتمے اور روشن خیالی کی ترغیب دی جارہی تھی۔

افغانستان کی تقسیم پر غور: نومبر میں امریکا اس منصوبے پر بھی غور کرنے لگا کہ طالبان سے مذاکرات کامیاب نہ ہونے پر کیا کیا جائے گا۔ چونکہ امریکی صدر اوباما نے 2009ء کے اواخر میں افغان پالیسی سے متعلقہ اعلامیے میں جولائی 2011ء میں افغانستان سے انخلاء شروع کرنے کا اعلان کیا تھا جس کا وقت قریب آچکا تھا اور امریکا کے روز افزوں عسکری و معاشی نقصانات بھی اسے زیادہ رکنے کے قابل نہیں چھوڑ رہے تھے، اس لیے امریکا اس پر غور کرنے لگا کہ 2011ء میں شمالی افغانستان کے تین صوبے ازبک و تاجک ملیشیا کے حوالے کر کے انہیں شمالی افغانستان کے نام سے الگ ملک قرار دے دیا جائے تاکہ اس کے جانے کے بعد بھی یہاں کوئی مستحکم امریکہ مخالف حکومت قائم نہ ہو سکے۔

رچرڈ ہالبروک، افغانستان نے دل توڑ دیا: امریکیوں کے لیے سال کی ایک بہت بری خبر، پاکستان وافغان مسائل کے لیے خصوصی سفیر رچرڈ ہالبروک کی موت تھی جو 10 دسمبر کو دل کے دورے کی وجہ سے اپنے دفتر میں چکرا کر گر پڑے اور پھر حالت نازک ہونے پر ہسپتال میں داخل کر دیے گئے جہاں ان کے دل کے دو آپریشن ہوئے۔ پیر 13 دسمبر کو ہالبروک کا انتقال ہو گیا۔ مرنے سے پہلے واشنگٹن میں اپنے پاکستانی سرجن سے آخری خواہش بیان کرتے ہوئے کہا: ''افغان جنگ روکنا ہوگی۔''

مسئلہ افغانستان پر استنبول کانفرنس: اس سال افغانستان کے ہمسایہ ممالک بھی افغان مسئلے کو بات چیت کے ذریعے حل کرانے کے لیے سرگرم دکھائی دیے۔ استنبول میں افغانستان، پاکستان اور ترکی کا سہ فریقی اجلاس ہوا جس میں ترکی کے صدر عبداللہ گل، صدرِ پاکستان آصف زرداری اور افغان صدر حامد کرزئی نے شرکت کی۔ 26 جنوری کو اجلاس کے اختتامی اعلامیے میں اعتدال پسند طالبان مفاہمتی عمل شروع کرنے پر زور دیا گیا۔ چین سمیت دیگر ہمسایہ ممالک نے بھی افغان حکومت کے طالبان سے مفاہمت کے اعلان کی حمایت کی اور طالبان سے اپیل کی کہ وہ ہتھیار پھینک کر قومی سیاست میں کردار ادا کریں۔

ادھر افغانستان میں نیٹو اور امریکی افواج کے اعلیٰ کمانڈر میک کرسٹل نے برطانوی اخبار ''فنانشل ٹائمز'' کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا: ''لڑائی بہت ہو چکی اب سیاسی عمل کی ضرورت ہے۔''

انہوں نے اُمید ظاہر کی کہ افغانستان میں 30 ہزار مزید امریکی فوج کے آنے سے طالبان اتنے

کمزور ہو جائیں گے کہ انہیں مذاکرات پر مجبور کیا جا سکے گا۔ انہوں نے یہ توقع بھی ظاہر کی کہ طالبان ملک کو چلانے میں مدد کر سکتے ہیں۔

لندن کانفرنس: 28 جنوری 2010ء کو طالبان سے مصالحت کے لیے لندن میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں 70 ممالک کے نمایندوں نے شرکت کی اور طے کیا گیا کہ طالبان سے مفاہمت کے لیے جرگہ بلایا جائے گا۔ کانفرنس میں افغانستان کی امداد میں پچاس فیصد اضافے اور طالبان کو صدر حامد کرزئی کی حمایت پر آمادہ کرنے کے لیے 500 ملین ڈالر کے فنڈ کے قیام کا اعلان بھی کیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ ملک کا کنٹرول نیٹو کی جگہ جلد از جلد افغان فورسز کو دے دیا جائے گا۔ طالبان کے بعض راہنماؤں کے نام اقوام متحدہ کی مرتب کردہ دہشت گردوں کی فہرست سے خارج کرنے اور ان پر عائد پابندیاں ہٹانے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ ان طالبان راہنماؤں میں طالبان کے سابق وزیر خارجہ ملا وکیل احمد متوکل کے علاوہ عبدالحکیم منیب، شمس الضحیٰ امین زئی، محمد موسیٰ ہوتک اور فضل محمد فیضان کے نام شمار کیے گئے۔ افغان صدر نے سابقہ امدادی رقموں کے بارے میں اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ انہیں کچھ علم نہیں کہ اب تک افغانستان میں 24 ارب ڈالر کی امداد دینے کا اعلان کرنے والے ممالک نے یہ رقم کہاں خرچ کی ہے۔ لندن کانفرنس کے فوراً بعد 2 فروری کو افغان صدر سعودی عرب جا پہنچے، کہا جاتا ہے کہ وہ طالبان کو مذاکرات کے لیے آمادہ کرنے میں شاہ عبداللہ سے مدد لینا چاہتے تھے۔

کرزئی کے حزب اسلامی سے مذاکرات: ادھر 21 فروری کو کرزئی حکومت نے نورستان کا ایک اور صوبہ بغلان حزب اسلامی کے حوالے کر دیا تا کہ انیسویں لویہ جرگہ میں اس کی شرکت کو یقینی بنایا جا سکے۔

حامد کرزئی ایک عرصے حزب اسلامی کی حمایت حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے تا کہ اس طرح طالبان پر مذاکرات کے لیے دباؤ ڈالا جا سکے۔ 21 مارچ کو حزب اسلامی کے اعلیٰ اختیاراتی وفد نے انجینئر قطب کی سربراہی میں کابل میں سرکاری حکام اور سابق جہادیوں سے مذاکرات شروع کر دیے اور پندرہ نکاتی فارمولا پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس کے مطابق امریکا سمیت کسی سے بھی بات ہو سکتی ہے۔ اس فارمولے کا بنیادی مقصد غیر ملکی افواج کا انخلاء اور ایک وسیع البنیاد حکومت کا قیام تھا۔ حزب کے نمائندوں نے 1996ء کے انخلاء کے بعد پہلی بار شمالی اتحاد کے رہنماؤں سے بھی امن مذاکرات شروع کر دیے تاہم شمالی اتحاد کے رہنما حکمت یار کے فارمولے سے کلی طور پر متفق نہ ہوئے۔ 23 مارچ کو سلامتی کونسل نے بھی ان امن مذاکرات کی حمایت کا اعلان کر دیا۔

امریکا کو طالبان کے بغیر ہونے والے ان مذاکرات سے اتنی دلچسپی تھی کہ 28 مارچ کو امریکی صدر اوباما

رات کی تاریکی میں اچانک ہی بگرام ایربیس پہنچ گئے، انہوں نے صدر حامد کرزئی اور امریکی فوجی افسران سے ملاقاتیں کیں اور افغان مسئلے کو امریکی سلامتی کے لیے اہم قرار دیا۔ کرزئی کا مطالبہ تھا کہ حکمت یار کا نام امریکا کو مطلوب افراد کی فہرست سے نکالا جائے تاکہ امن مذاکرات آگے بڑھائے جا سکیں۔ اس ملاقات کے فوراً بعد امریکی حکام نے حکمت یار کا نام مطلوب افراد کی فہرست سے نکالنے پر آمادگی ظاہر کردی۔

یکم اپریل کو کابل کے فرانسیسی سفارت خانے میں حزب اسلامی، کرزئی حکومت اور امریکی نمائندوں میں مذاکرات ہوئے جس میں کرزئی حکومت نے امریکا کو حکمت یار کے بیشتر مطالبات منظور کرنے پر آمادہ کرلیا۔ حزب اسلامی کا کہنا تھا کہ اس کے جنگجوؤں کو افغان فوج یا پولیس میں شامل کرلیا جائے، اس طرح طالبان کے ساتھ مذاکرات ناکام ہونے کی صورت میں ان کو کمزور کیا جا سکتا ہے۔ ان مذاکرات میں فرانسیسی سفیر نے اہم کردار ادا کیا۔ مگر بعد میں بعض وجوہ سے حزب اسلامی کے ساتھ مذاکرات کی یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور آنے والے دنوں میں حزب اور کرزئی حکومت کے سابقہ فاصلے برقرار نظر آئے۔

لویہ جرگہ: 2 جون 2010ء کو کابل میں انیسویں لویہ جرگے کا انعقاد ہوا۔ جرگے کے شرکاء نے مطالبہ کیا کہ طالبان قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے جس پر کرزئی نے آمادگی ظاہر کردی۔ کرزئی نے جرگے کے اختتام پر طالبان قیدیوں کی رہائی کا فیصلہ سناتے ہوئے پیش کش کی کہ طالبان اور حزب اسلامی صلح پر رضامند ہوں تو ان کی شرائط پر بھی بات چیت کی جا سکتی ہے۔ ایسا موقع تاریخ میں بار بار نہیں ملتا۔ انہوں نے دعوت دی کہ سابق جہادی ملک کو آباد کرنے کیلئے متحد ہوجائیں۔ اس لویہ جرگے کا طالبان کے ساتھ حزب نے بھی مکمل بائیکاٹ کیا اور اسے عبث قرار دیا۔ طالبان کے ترجمان کے مطابق جرگے کے شرکاء کی فہرست امریکا نے تیار کی تھی۔

بعض ذرائع ابلاغ کے مطابق صدر کرزئی نے عظیم گوریلا کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی کے بیٹے سراج الدین حقانی سے بھی رابطے کیے تاکہ ان کو مصالحت پر آمادہ کرکے طالبان سے مذاکرات کی راہ ہموار کی جا سکے۔ جون کے اواخر میں امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ نے رپورٹ شائع کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ طالبان اور امریکا میں مفاہمت کے لیے پاکستان خفیہ طور پر سرگرم ہو چکا ہے اور آرمی چیف اشفاق کیانی کے علاوہ آئی ایس آئی کے سربراہ احمد شجاع پاشا بھی اس مقصد کے لیے افغانستان کا دورہ کرچکے ہیں۔ امریکا دباؤ ڈال رہا ہے کہ مذاکرات میں حقانی گروپ کو شامل نہ کیا جائے کیونکہ اس کے مبینہ طور پر القاعدہ سے مستحکم تعلقات ہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ حامد کرزئی نے مولانا جلال الدین حقانی کے صاحبزادے مولانا سراج حقانی سے، جن کے ماتحت تمام عرب اور غیرملکی مجاہدین امریکا سے نبرد آزما ہیں، موسم گرما میں ملاقات کی اور انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ طالبان کو القاعدہ سے الگ کرکے غیرملکی

مجاہدین کو اپنے اپنے وطن واپس جانے پر آمادہ کیا جائے تا کہ اتحادی افواج کے واپس جانے اور وسیع البنیاد حکومت کے قیام کی راہ ہموار ہو سکے۔ طالبان کے ترجمان ذبیح اللہ مجاہد نے کرزئی اور سراج الدین حقانی کی ملاقات کو سراسر جھوٹ قرار دیتے ہوئے مجاہدین کے اتحاد میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش قرار دیا۔

عالمی ڈونرز کانفرنس کابل: 20 جولائی کو کابل میں عالمی ڈونرز کانفرنس منعقد ہوئی جس میں چالیس ملکوں کے وزرائے خارجہ اور مندوبین نے شرکت کی۔ افغان صدر نے ملک میں عدم استحکام اور بدعنوانی کا ذمہ دار غیر ملکی سکیورٹی کمپنیوں کو قرار دیا۔ شرکاء نے طالبان سے مفاہمت کی حمایت کا اعلان کیا۔ کہا گیا کہ 2014ء تک ملک کی سیکورٹی افغان فورسز کے حوالے کر دی جائے گی۔

مصالحتی کونسل: 6 اپریل کو پارلیمنٹ کے ارکان کے ساتھ بند کمرے کے ایک اجلاس میں افغان صدر حامد کرزئی نے نہایت سخت لہجہ اپناتے ہوئے کہا کہ اگر امریکا اور مغربی دنیا نے افغانستان میں ناروا مداخلت ختم نہ کی تو وہ بھی سیاست چھوڑ کر طالبان کی صفوں میں شامل ہو جائیں گے۔ انہوں نے برطانیہ اور دوسرے ملکوں پر افغانستان کے صدارتی انتخابات میں گڑبڑ کرانے کے الزامات بھی عائد کیے۔ اس قسم کے بیانات پر مغربی دنیا اور امریکا میں شدید تشویش پھیل گئی۔ وائٹ ہاؤس نے انہیں متنبہ کیا کہ اگر انہوں نے یہ بیان بازی بند نہ کی تو ان کا 12 مئی کا مجوزہ دورہ امریکا منسوخ کر دیا جائے گا۔ نیویارک ٹائمز نے 8 جون کی اشاعت میں کہا کہ کرزئی امریکا سے دور اور طالبان سے قریب ہوتے جا رہے ہیں اور ایران سے بھی روابط بڑھا رہے ہیں۔

12 جولائی کو صدر کرزئی نے مطالبہ کیا کہ طالبان سے فیصلہ کن مذاکرات سے قبل دس بڑے طالبان رہنماؤں کے نام فوری طور پر اقوام متحدہ کی دہشت گردوں کی فہرست سے خارج کیے جائیں۔

مغربی میڈیا ایسی خبروں کو پورے زور وشور سے نشر کر رہا تھا، مقصد یہ تھا کہ افغانستان میں کرزئی کو مذہبی طبقے اور طالبان حامی افراد میں ایک غیور لیڈر کا مقام دلوا دیا جائے اور کرزئی حکومت کی طرف سے مذاکرات کا شوشہ چھوڑ کر طالبان میں پھوٹ ڈالنے کی کوششوں کو کامیاب کیا جائے۔ آپ 2009ء کے حالات میں پڑھ چکے ہیں کہ 30 اکتوبر کو اوباما کی خصوصی مشاورت میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ طالبان کو ختم کرنا ممکن نہیں لہٰذا ان کو منتشر کر کے کمزور کیا جائے۔ جنوری 2010ء کی لندن کانفرنس میں اسی منصوبے کو 70 ممالک سے قبولیت کی سند دلوائی گئی تھی، اس کے بعد 2010ء کے آخر تک اسی پلان پر عمل ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ خصوصاً آخری چھ مہینوں میں مذاکرات کے ڈھونگ کے ذریعے یہ کوششیں انتہا پر نظر آتی ہیں۔ آیئے ان کوششوں کا مزید مطالعہ کریں۔

اکتوبر کے مہینے میں حامد کرزئی نے مقامی سرداروں اور سابق جہادیوں کی ایک مصالحتی کونسل تشکیل دے دی جس کا سربراہ سابق صدر برہان الدین ربانی کو مقرر کیا گیا۔ خبریں پھیل گئیں کہ طالبان اور کرزئی کے درمیان مقامی سرداروں کے توسط سے اور براہ راست بھی روابط میں تیزی آ گئی ہے، کئی گرفتار طالبان اور جہادی رہنماؤں کو آزاد کر دیا گیا، جن میں بگرام جیل میں قید بعض اہم افراد بھی شامل تھے۔ یہ خبریں بھی نشر ہوئیں کہ امریکی حکام نے افغان حکومت سے ایسے تمام طالبان رہنماؤں کی فہرست مانگی جن کے القاعدہ سے تعلقات نہیں ہیں تاکہ انہیں اقوام متحدہ کی بلیک لسٹ سے نکالا جا سکے۔ بعض طالبان کو پاسپورٹ بھی جاری کر دیے گئے اور یہ طے کیا گیا کہ اگر طالبان رضامند ہو گئے تو حج کے موقع پر سعودی عرب میں شاہ عبداللہ کو ثالث بنا کر مفاہمتی عمل کا باقاعدہ آغاز کیا جائے گا مگر طالبان کی جانب سے نومبر تک محتاط رویہ اختیار برقرار رکھا گیا۔

ذرائع ابلاغ پر نشر ہونے والی 14 اکتوبر کی خبروں کے مطابق طالبان رہنماؤں کو مذاکرات کے لیے کابل تک نقل و حرکت کی اجازت بھی دے دی گئی اور نیٹو نے بعض رہنماؤں کو طیارے سے کابل پہنچایا۔

نومبر کے پہلے عشرے میں کابل میں باچا خان کی یاد میں دو روزہ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کرزئی نے کہا کہ افغانستان میں امن عمل میں پیش رفت ہو رہی ہے۔

ان خبروں میں اگر کچھ صداقت تھی تو اس حد تک کہ بعض سابق طالبان جو اس وقت ملا محمد عمر کے ماتحت نہیں ہیں، بلکہ آزادنہ حیثیت سے کام کر رہے ہیں، کرزئی انتظامیہ سے مل کر مصالحتی عمل کو آگے بڑھانا چاہ رہے تھے۔ ان میں ملا عبدالسلام ضعیف، عبدالحکیم مجاہد، وکیل احمد متوکل اور مولانا ارسلان خان رحمانی جو افغان سینٹ کے رکن بھی ہیں، کے نام نمایاں تھے۔ مگر یہ سابق طالبان رہنما ملا محمد عمر کی کمان میں مسلح جہاد کرنے والے طالبان میں اب ایسا اثر و رسوخ نہیں رکھتے کہ انہیں کسی معاہدے پر آمادہ کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ طالبان ملا محمد عمر ہی کے کہنے پر صلح کا سوچ سکتے تھے۔

طالبان کی ویب سائٹ (http://shahamat.info) پر ملا محمد عمر کی جانب سے اس دوران عید الفطر کے موقع پر ایک اعلان شائع ہوا جس میں طالبان کی کرزئی حکومت یا امریکا سے مذاکرات کی تمام خبروں کو مجاہدین میں انتشار پیدا کرنے کی سازش قرار دیا گیا۔ اس پیغام میں طالبان کی آئندہ حکومت کا منشور بھی پیش کیا گیا۔

چونکہ ممکنہ امریکی انخلاء کے بعد طالبان کے کسی بھی انداز میں حکومت میں شریک ہونے سے شمالی اتحاد کو سخت تشویش تھی اس لیے اکتوبر کے وسط میں شمالی اتحاد طالبان کے مقابلے میں منظم ہونے لگا۔ شمالی

لیڈروں نے کرزئی کی جانب سے بعض طالبان سے مذاکرات کو خطرناک گردانا اور ایسی کوششوں کو پشتون تعصب پسندی پر مبنی قرار دیا۔

کرزئی خاندان، سرمایہ بیرون ملک منتقل: نومبر کے وسط میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ امریکا کے ممکنہ انخلاء اور طالبان کے برسراقتدار آنے کے خطرات کے پیشِ نظر کرزئی خاندان نے اپنا سرمایہ بڑے پیمانے پر بیرون ملک منتقل کرنا شروع کر دیا ہے، بینک آف کابل کے صدر محمود کرزئی (برادر حامد کرزئی) نے بینک آف کابل سے تین سوملین ڈالر نکال کر دبئی میں دو محل خرید لیے ہیں جس کی وجہ سے بینک کا دیوالیہ نکلنے کو ہے۔ اسی طرح خاندان کے دیگر افراد بھی سرمایہ خلیجی ملکوں میں منتقل کر رہے ہیں۔

عام انتخابات: افغانستان میں 22 مئی 2010ء کو پارلیمانی انتخابات کا انعقاد ہونا تھا مگر بدامنی کی وجہ سے جنوری ہی میں اعلان کر دیا گیا کہ انتخابات 18 ستمبر کو ہوں گے۔ 18 ستمبر کو اعلان کے مطابق پارلیمانی انتخابات تو ہوئے مگر اس میں دھاندلی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے گئے۔ طالبان نے اس بار الیکشن میں رکاوٹ ڈالنے کی معمولی کوشش بھی نہ کی۔ پھر بھی عوام کی بہت کم تعداد نے انتخابات میں حصہ لیا، خصوصاً پشتون علاقوں میں ٹرن آؤٹ بہت کم رہا۔ غیر معمولی دھاندلی اور پشتونوں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے ازبک، تاجک اور ہزارہ الیکشن میں چھائے رہے۔ بعد میں بہت سے حکومتی ارکان، سرکاری افسران اور غیر ملکی مبصرین نے دھاندلی کا اعتراف بھی کیا اور دھاندلی کے خلاف کابل میں مظاہرہ بھی ہوا مگر جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔

23 نومبر پارلیمانی انتخابات کے نتائج جاری ہو گئے جن کے مطابق افغانستان کی تاریخ میں پہلی بار پختونوں کو 249 میں سے صرف 100 نشستیں مل سکیں، ازبک، تاجک اور ہزارہ اقلیتیں جیت گئیں۔

پاکستان اور بھارت کی افغانستان میں کش مکش: پاکستان اور بھارت میں افغانستان کے حوالے سے کشاکشی جاری رہی، 3 مارچ کو بھارتی حکومت نے افغانستان میں مزید فوج تعینات کرنے کا اعلان کر دیا جس کی افغان صدر سے منظوری بھی لے لی گئی۔ اس کے تیسرے دن 6 مارچ کو پاکستانی آرمی چیف اشفاق کیانی ہنگامی دورے پر کابل گئے اور صدر حامد کرزئی سے ملے اور اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔

10 مارچ کو افغان صدر کرزئی پاکستان کے دورے پر آئے اور صدر زرداری، وزیر اعظم گیلانی اور چیف آف آرمی اسٹاف جنرل اشفاق کیانی سے ملے۔ ملاقات میں پاک افغان جرگے کی تجویز سے اتفاق کیا گیا۔ حامد کرزئی نے یقین دلایا کہ پاکستان کے خلاف اپنی زمین استعمال نہیں ہونے دیں گے۔ افغان صدر نے ملا برادر کی حوالگی کا مطالبہ بھی کیا جسے پاکستانی حکومت نے مسترد کر دیا۔

26 اپریل کو صدر کرزئی نے بھارت کا دورہ کیا اور بھارتی وزیر اعظم من موہن سنگھ کو افغانستان میں

بھارتیوں کے تحفظ کی یقین دہانی کرائی۔ بھارتی وزیر اعظم نے کہا کہ کابل دھماکوں کے بعد میں بھارتیوں کی سیکورٹی کے حوالے سے تشویش تھی مگر کرزئی کی یقین دہانی کے بعد ہم اپنے منصوبے مکمل کریں گے اور افغانستان کی تعمیر و ترقی کے لیے کرزئی حکومت سے تعاون جاری رہے گا۔ بھارت کی کوشش تھی کہ افغان فورسز کو بھارت میں تربیت دلانے کا معاہدہ بھی کرلے مگر اس معاملے میں پاکستان آگے نکل گیا اور جنرل اشفاق کیانی نے جولائی میں کرزئی سے افغان افسران کی پاکستان میں تربیت کی منظوری لے لی۔

18 جولائی کو پاکستان نے افغانستان کو بھارت تک تجارتی راہداری کی منظوری دے دی۔ پاک افغان وزرائے تجارت امین فہیم اور انوار الحق نے امریکی وزیر خارجہ ہیری کلنٹن کی موجودگی میں اس معاہدے پر دستخط کیے کہ افغانستان کو سمندر تک راستہ دیا جائے گا اور وہ واہگہ بارڈر کے ذریعے بھارت تک سامان لے جاسکے گا، بھارت کو افغانستان ایکسپورٹ کی اجازت نہیں ہوگی، بدلے میں پاکستان کو وسط ایشیا تک رسائی ملے گی۔ مبصرین کے مطابق یہ معاہدہ امریکا کے دباؤ پر ہوا جس کے لیے ہیری کلنٹن نے بذات خود مداخلت کی تھی، تاہم پاکستانی ٹرانسپورٹرز نے افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کے معاہدے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ اس کی آڑ میں بھارتی تاجر ملک پر چھا جائیں گے۔

26 اگست کو حامد کرزئی نے یکدم موڈ بدل کر یہ بیان داغا کہ امریکا پاکستان میں طالبان کے ٹھکانوں کو نشانہ بنائے، سرحد پار پناہ گاہیں ختم کیے بغیر کامیابی نہیں ملے گی۔

28 اگست کو ذرائع ابلاغ پر خبر آئی کہ افغانستان سے 100 پاکستانی قیدی بھارتی جیلوں میں منتقل کردیے گئے ہیں، جب کہ پہلے ہی 1300 قیدی منتقل کیے جاچکے ہیں۔ انہیں برین واشنگ کے بعد استعمال کرنے کا منصوبہ طے ہے۔

5 ستمبر کو صدر کرزئی پاکستان آئے اور صدر زرداری سے مل کر پاکستان میں طالبان کے ٹھکانوں کے خلاف مشترکہ کارروائی کا مطالبہ کیا۔ تاہم فوجی قیادت نے کرزئی کے الزامات مسترد کردیے اور کہا کہ عسکریت پسندوں کے ٹھکانے افغانستان میں ہیں۔

4 دسمبر کو پاکستانی وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کابل کے دورے پر گئے اور اگلے دن کرزئی سے ملاقات کی جس کے بعد ایک مشترکہ اعلامیے میں کہا گیا کہ پاکستان افغان حکومت اور عسکریت پسندوں کے مابین مفاہمت کی حمایت کرتا ہے، اس عمل کا آغاز افغان حکومت کی طرف سے ہوگا اور یہ افغانوں کی اپنی کوشش ہوگی۔

11 دسمبر کو پاکستان، افغانستان اور ترکمانستان کے صدور اور بھارتی وزیر پٹرولیم نے اشک آباد میں

ساڑھے سات ارب ڈالر کے چار ملکی گیس لائن منصوبے پر دستخط کر دیے۔

پاکستان اور امریکا: اس سال پاکستان اور امریکا کے درمیان بھی دہشت گردی، افغانستان اور طالبان کے حوالے سے کش مکش جاری رہی۔ امریکا ''ڈومور'' کی صدائیں لگاتا رہا۔

op7 جنوری 2010ء کو پاکستانی صدر آصف علی زرداری نے مطالبہ کیا کہ امریکا اپنی کارروائیاں افغانستان تک محدود رکھے اور ڈرون ٹیکنالوجی ہمیں دے۔ 21 جنوری 2010ء کو پاک فوج کے ترجمان میجر اطہر عباس نے پاک فوج کی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ایک سال تک مزید کوئی نیا محاذ نہیں کھولا جائے گا، جن علاقوں کا کنٹرول حاصل کرلیا ہے وہاں قبضہ مستحکم بنایا جائے گا۔ انہوں نے یہ بیان ایسے وقت جاری کیا جبکہ امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس پاکستان کو طالبان کے خلاف کارروائیاں بڑھانے پر آمادہ کرنے کے لیے اسلام آباد آئے ہوئے تھے۔

مارچ کے آغاز میں امریکی فوج نے پہلی بار پاکستان سے متصل افغان سرحد کا کنٹرول سنبھال لیا اور پاک سرحد سے پانچ کلومیٹر دور تین نئے بیس کیمپ قائم کر لیے۔

8 جون کو اسلام آباد کے قریب ترنول کے مقام پر نیٹو رسد کے ٹرمینل پر حملہ ہوا جس میں چالیس کنٹینر جل گئے اور 7 افراد مارے گئے۔

13 جون کو پاک فوج کے ترجمان میجر اطہر عباس نے مغربی میڈیا پر آنے والی لندن اسکول آف اکنامکس کی اس رپورٹ کی تردید کی جس میں پاک فوج اور آئی ایس آئی پر طالبان کی پشت پناہی جاری رکھنے کا الزام لگایا گیا ہے۔ افغان طالبان نے بھی لندن اسکول آف اکنامکس کی رپورٹ کو مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہماری تحریک افغانستان سے ابھری ہے، ہمیں بیرونی مدد درکار نہیں۔

جولائی کے اواخر میں امریکی وزیر خارجہ ہیری کلنٹن نے ایک بار پھر اس الزام کا اعادہ کیا کہ اسامہ بن لادن اور ملا عمر پاکستان میں ہیں، وزیر اعظم پاکستان نے جواباً ثبوت کا مطالبہ کر دیا۔ یکم ستمبر امریکی حکومت نے تحریک طالبان پاکستان کو دہشت گرد تنظیم قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ گزشتہ سال دسمبر میں خوست کے سی آئی اے اڈے پر خودکش حملے کے ذریعے سات افسران کی ہلاکت کا منصوبہ حکیم اللہ محسود نے مرتب کیا تھا۔

نیٹو کی رسد بند: 30 ستمبر کو نیٹو کے ایک حملے میں پاکستان کے تین ایف سی اہلکار نشانہ بن گئے جس پر پاکستان نے رسد روک کر فضائیہ کو الرٹ کر دیا۔

یکم اکتوبر کو پاکستان نے نیٹو سے معافی کا مطالبہ کر دیا۔ طورخم سرحد پر کنٹینروں کی لائن لگ گئی۔ پاک افغان مسائل کے امریکی سفیر رچرڈ ہالبروک نے نیٹو کی رسد بند کرنے پر سنگین نتائج کی دھمکی دے دی۔

13 اکتوبر کو اسلام آباد میں بارہ افراد نے نیٹو ٹینکروں پر حملہ کر کے 28 کو تباہ کر دیا، 6 افراد ہلاک ہو گئے۔ نیٹو حکام شروع میں کہہ رہے تھے کہ پاکستان کے رسد بند کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، ہمارے پاس متبادل راستے ہیں مگر جلد ہی انہیں دن میں تارے دکھائی دے گئے اور آخر کار نیٹو سربراہ جنرل راس موسن نے خود پاکستان سے معافی مانگی، تاہم طورخم بارڈر سے رسد بدستور بند رہی بلکہ 5 اکتوبر کو چمن سرحد بھی بند کر دی گئی۔ تب امریکی سفیر نے بھی معذرت چاہی۔ 6 اکتوبر کو نیٹو رسد پر دو بڑے حملے ہوئے، ایک نوشہرہ میں جی ٹی روڈ پر ہوا جس میں 45 کنٹینر تباہ ہو گئے، دوسرا کوئٹہ میں ہوا جس میں 40 کنٹینر ضائع ہوئے۔ ادھر جنرل پیٹریاس نے بھی معافی مانگ کر رسد کھولنے کی درخواست کی۔ پھر 7 اکتوبر کو امریکی مسلح افواج کے سربراہ مائیک مولن نے کیانی سے خط میں اظہارِ افسوس کیا۔ رسد پھر بھی بدستور بند رہی اور طورخم کے راستے ساڑھے چھ ہزار کنٹینر راستہ کھلنے کے منتظر رہے۔

واضح رہے کہ صرف یکم جنوری 2008ء سے 30 جون 2010ء تک اڑھائی سال میں پاکستان کے راستے نیٹو کے 24 ہزار 215 کنٹینر افغانستان جا چکے ہیں۔

9 اکتوبر کو حکومت پاکستان نے معافی قبول کر کے رسد بحال کی۔ رسد بند ہونے کے دنوں میں 150 ٹینکر جلے اور درجنوں لوٹے گئے۔ نیٹو کے جاسوسی کے آلات، جدید ترین وائرلیس سسٹم، تاریکی کے چشمے، خطرناک گولہ بارود اور ہتھیار ملک بھر کی باڑہ مارکیٹوں میں فراہم ہونے لگے جس پر پاکستانی حکام کو کریک ڈاؤن کی مہم شروع کرنا پڑی۔

10 اکتوبر کو نیٹو نے پاک سرحد پر فوج بڑھا دی۔ خوست، پکتیا، اسپین بولدک میں اضافی دستے لگا دیے۔ اس کے ساتھ امریکا نے ایک بار پھر شمالی وزیرستان میں آپریشن کا مطالبہ بڑھا دیا۔ 13 اکتوبر کو امریکی فوجی سربراہ مایک مولن نے اعلان کیا کہ شمالی وزیرستان دہشت گردی کا مرکز ہے۔ اسامہ اور القاعدہ کا مرکز یہیں ہے۔ شمالی وزیرستان میں پورے سال ڈرون حملے جاری رہے اور سینکڑوں افراد نشانہ بن کر شہید ہوئے۔

15 دسمبر کو امریکا کی سولہ انٹیلی جنس کمیٹیوں نے ایک مشترکہ رپورٹ میں افغان جنگ کی ناکامی کی ذمہ داری پاکستان پر عائد کرتے ہوئے کہا کہ اسلام آباد طالبان کی حمایت ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہے، اور پاکستان کے بغیر افغان جنگ نہیں جیت جا سکتی۔

پاکستان سے طالبان لیڈروں کی گرفتاریاں: 2010ء میں طالبان کو کئی بڑے رہنماؤں کی گرفتاریوں کے صدمے برداشت کرنا پڑے۔ فروری کے اوائل ہی میں طالبان سربراہ ملا محمد عمر کے نائب

اوردستِ راست ملاعبدالغنی برادرکوسی آئی اے نے پاکستانی ایجنسیوں کے ساتھ مشترکہ آپریشن میں کراچی سے گرفتار کرلیا،جس کے بعدانہیں نامعلوم مقام پر منتقل کردیا گیا۔بعض مبصرین کا کہنا ہے کہ ملابرادرطالبان اورامریکا کے درمیان ممکنہ مذاکرات میں کوئی خاص کردارادا کرنے جارہے تھے مگران کی گرفتاری سے یہ امکان ختم ہوگیا۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ پاکستان کومذاکراتی عمل میں شریک کرنے کے حوالے سے ملامحمد عمر سے الگ رائے رکھتے تھےاور براہ راست امریکی حکام سے مذاکرات کرنا چاہتے تھے۔پاکستانی میڈیا پران کی گرفتاری کی خبر 16 فروری کونشرہوئی۔امریکی ترجمان نے اسے افغان جنگ کی سب سے بڑی کامیابی قراردیا۔

سی آئی اے ملابرادرکوتفتیش کے لیے بگرام ایربیس لے جانا چاہتی تھی مگر پاکستانی ایجنسیوں نے انہیں اپنی تحویل میں رکھا۔حکومتِ پاکستان کوانہیں امریکا کے حوالے کرنے کے بارے میں تحفظات لاحق تھے۔پاکستان کے وزیرداخلہ عبدالرحمن ملک نے پہلے بیان دیا کہ ملابرادرسمیت کوئی بھی جنگجوامریکا کے حوالے نہیں کریں گے،ان پر مقدمہ پاکستانی عدالت میں چلے گا۔مگر بعد میں کہا کہ اگر امریکا نے ملا برادرکوحوالے کرنے کی درخواست کی تو ہم غورکریں گے۔ 26 فروری کولاہور ہائی کورٹ نے ملابرادر سمیت پانچ گرفتارطالبان رہنماؤں کی بیرون ملک حوالگی پر پابندی عائد کردی۔ 16 مارچ کو پاکستانی وزیرِدفاع احمد مختار نے اعلان کیا کہ ملابرادر پر پاکستان میں بغیر پاسپورٹ داخلے کا مقدمہ چلایا جائیگا۔

4 مارچ کوطالبان کے ایک اوراہم ترین کمانڈر محتشم آغا کوکراچی کے علاقے احسن آباد سے گرفتار کیا گیا۔کہا جاتا ہے کہ وہ ملامحمد عمر کے داماد ہیں اور طالبان دور میں وزیرِ خزانہ اور شوریٰ کے رئیس بھی رہے تھے۔اس دوران افغانستان میں ملابرادر کی جگہ پہلے ملاعبدالقیوم کو طالبان سربراہ کا نائب مقرر کیا گیا۔ مگر دوہفتوں بعداعلان کیا گیا کہ عبدالرزاق خادم اورملااختر منصورنائب ہوں گے۔

7 مارچ کوالقاعدہ کے ایک اہم امریکی نژادکمانڈرآدم غدان کوکراچی ہی میں سپرہائی وے کے قریب ایک عمارت سے گرفتار کیا گیا۔

24 مارچ کوکراچی کے علاقے نوری آباد سے ملامحمد عمر کے ایک اورقریبی ساتھی عبدالحئی مالک اور القاعدہ کے ایک رہنماذکی عزت کوگرفتارکرلیا گیا۔ان کامیابیوں کو بڑھاچڑھا کر پیش کر کے امریکی قیادت نے اپنی افواج کے گرتے ہوئے حوصلے بلند کرنے کی پوری کوشش کی۔

روس اورامریکا کے تعلقات: 7 اپریل کوکرغیزستان میں خونریز انقلاب آگیا،دارالحکومت میں جھڑپوں سے چارسوافرادزخمی ہوئے۔صدر مملکت قربان بیگ کوفرار ہونا پڑااوروہاں امریکا کی حمایت یافتہ حکومت کی جگہ روس نواز انقلابیوں نے اقتدارسنبھال لیا۔اس انقلاب سے کرغیزستان کے راستے

افغانستان کو امریکی رسد کی سپلائی بھی خطرے میں پڑ گئی۔ بعد میں امریکا نے اس خطرے کے تدارک کے لیے روس سے قریبی تعلقات قائم کرنے کی کوشش شروع کردی۔ ان تعلقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ افغانستان میں بھی دونوں ممالک نے منشیات کے خلاف مشترکہ آپریشن پر اتفاق کرلیا جس کے بعد اکتوبر کے اواخر میں ننگرہار میں دونوں ملکوں کے ستر افراد پر مشتمل ٹیم نے ہیلی کاپٹروں کی مدد سے منشیات کے اسمگلروں کے خلاف کارروائیاں کیں۔ روس و امریکا کے اس مشترکہ آپریشن کے فیصلے پر کرزئی نے احتجاج کرتے ہوئے اسے خودمختاری کے خلاف قرار دیا۔

جب نومبر میں نیٹو کا اجلاس ہوا تو روس کو نیٹو کا ممبر نہ ہونے کے باوجود اس میں شریک کیا گیا۔

2010ء کی متفرق خبریں: اس سال پاکستان میں یکم جنوری کو لکی مروت میں بہت بڑا خودکش دھماکہ ہوا جس کے بعد خودکش دھماکے مسلسل جاری ہے۔ سال بھر میں مجموعی طور پر 33 خودکش حملے ہوئے جن میں 738 افراد لقمہ اجل بنے۔

مارچ کے اوائل میں دوستم کی نجی جیل اور کابل کی سرکاری جیل میں طبی سہولیات نہ ملنے کی وجہ سے 22 پاکستانیوں کی ہلاکت کی خبر آئی۔ یہ پاکستانی مولانا صوفی محمد کے ہمراہ اکتوبر 2001ء میں افغانستان گئے تھے۔

31 مارچ کو پاکستان میں ایک آئینی مسودے پر دستخط کردیے گئے جس کے تحت صوبہ سرحد کا نیا نام ''خیبر پختون خواہ'' رکھ دیا گیا۔

30 اپریل کو آئی ایس آئی کے سابق افسر خالد خواجہ کو شمالی افغانستان میں قتل کردیا گیا۔ وہ امن پروگرام کے لیے وہاں گئے تھے اور کئی روز قبل اغوا کرلیے تھے۔ پاکستانی طالبان کی تنظیم ایشین ٹائیگر نے انہیں امریکا کے لیے جاسوسی اور لال مسجد آپریشن میں مدد کے الزام قتل کرنے کی ذمہ داری قبول کرلی۔

14، 15 جون کو عالمی ذرائع ابلاغ پر نشر ہونے والی خبروں میں بتایا گیا کہ افغانستان میں 9 کھرب ڈالر کی معدنیات کے ذخائر دریافت کرلیے گئے ہیں، امریکا نے سوویت یونین کے تیار کردہ نقشوں کی مدد سے وہاں سونے، چاندی اور تانبے کے علاوہ لیتھینیم جیسی نایاب دھات کا سراغ لگالیا ہے۔ اس مہم میں پینٹاگون، امریکی جیالوجیکل سروے اور یو اس ایڈ کے اہلکاروں پر مشتمل ٹیم نے کام کیا ہے۔

10 جولائی کو پکتیا میں پاکستانی بس پر نامعلوم افراد نے فائرنگ کی جس سے 13 مسافر جاں بحق ہوگئے۔ مسافروں کا تعلق کرم ایجنسی سے تھا جو پارہ چنار، گردیز اور جلال آباد کے راستے پشاور جارہے تھے۔

23 ستمبر امریکی عدالت نے انصاف کا خون کرتے ہوئے ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو 86 برس قید کی سزا

سزادی۔ ڈاکٹر عافیہ 1972ء میں پیدا ہوئیں، 1990ء میں سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا گئیں، میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی سے تعلیم حاصل کی، 1995ء میں ان کی شادی امجد خان سے ہوگئی، جس سے تین بچے مریم، احمد اور سلمان ہوئے۔ 21 اکتوبر 2002ء کو طلاق ہوگئی جس کے بعد وہ کراچی آگئیں۔ 25 مارچ 2003ء کو انہیں کراچی ایئرپورٹ جاتے ہوئے گرفتار کر کے غائب کر دیا گیا۔ 2008ء میں بگرام ایئربیس کے امریکی عقوبت خانے میں ان کے قید ہونے کا انکشاف ہوا جس پر پاکستانی صحافیوں اور عوام نے احتجاج شروع کیا تو انہیں امریکا پہنچا دیا گیا، ان پر امریکی اہلکاروں پر فائرنگ کے سلسلے میں سات سراسر جھوٹے الزامات عائد کیے گئے، جن کی بنیاد پر عدالت نے کوئی ثبوت دیکھے بغیر انہیں ایسی بے رحمانہ سزا سنائی جس سے ہر پاکستانی کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ حکومتِ پاکستان نے عوامی دباؤ کے جواب میں طفل تسلیاں تو دیں مگر عملی طور پر ڈاکٹر عافیہ کی رہائی کے لیے کچھ نہ کیا۔

8 اکتوبر کو تخار کی ایک مسجد میں بم دھماکے سے گورنر قندوز سمیت 20 افراد جاں بحق ہو گئے۔

27 اکتوبر کو روس کے سابق صدر میخائل گورباچوف نے کہا کہ افغانستان میں جنگ جیتنا ناممکن ہے۔ امریکا کے لیے وہاں سے فوج واپس بلانے کے سوا کوئی راستہ نہیں، اوباما کا انخلاء کا فیصلہ درست ہے، اگر فوج واپس نہ بلائی گئی تو افغانستان دوسرا ویت نام ثابت ہوگا۔

پاکستانی ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر ثمر مبارک، کے مطابق شمالی وزیرستان میں جہاں امریکا پاکستانی فورسز کے ساتھ مل کر طالبان کے مبینہ ٹھکانوں کے خلاف آپریشن کے لیے فوج متعین کر چکا ہے، 273 ارب ڈالر کے سونے اور تانبے کے ذخائر موجود ہیں۔ (ڈان 4 دسمبر 2010ء)

<u>وکی لیکس کے انکشافات:</u> اکتوبر کے مہینے میں مشہور ویب سائٹ وکی لیکس سے ڈھائی لاکھ خفیہ صفحات کے انکشافات شروع کر دیے گئے۔ افغانستان کے خطے سے متعلق چند انکشافات یہ ہیں:

گوانتاناموبے کے قیدیوں کے معاملے میں کویتی وزیر داخلہ نے امریکی سفیر کو مشورہ دیا کہ قیدیوں کو افغانستان لا کر میدان جنگ میں ہلاک کر دیا جائے۔ یمنی صدر نے یہ بھی پوچھا کہ قیدیوں کے بدلے میں ہمیں کتنے ڈالر ملیں گے۔

- ...... امریکا نے افغانستان میں برطانوی فوج کو ناکارہ قرار دیا۔ افغان صدر کا بھی یہی موقف ہے۔
- ...... کرزئی نے اعتراف کیا کہ آئی ایس آئی طالبان کی مدد نہیں کر رہی۔
- ...... رچرڈ ہالبروک کے خیال میں پاکستانی عوام طالبان سے زیادہ کرپٹ رہنماؤں سے تنگ ہیں۔
- ...... آسٹریلیا کے سابق وزیر اعظم کیون رڈ افغان جنگ سے بہت خوفزدہ اور نتائج سے مایوس تھے۔

- ...... بھارت نے امریکا پر واضح کر دیا ہے کہ اس کے افغانستان میں اسٹریجک مفادات ہیں اس لیے وہ اس ملک سے نہیں نکلے گا۔
- ...... حامد کرزئی نے کہا کہ پاکستان کو بار بار یہ ذہن نشین کرانے کی ضرورت ہے کہ وہ عظیم اسلامی امارت بننے کا خواب دیکھنا چھوڑ دے۔
- ...... افغان صدر کے حکم پر اتحادی فورسز کے گرفتار کردہ کئی خطرناک مجرم اور منشیات کے اسمگلر رہا کر دیے گئے جس پر امریکی حکام نے کرزئی کو سرزنش کی۔

وکی لیکس کے انکشافات سے کئی ممالک کے باہمی تعلقات خطرے میں پڑ گئے، خصوصاً امریکا کا اصل چہرہ بالکل بے نقاب ہو گیا۔ تاہم رچرڈ ہالبروک نے کہا کہ وکی لیکس پاک امریکا تعلقات کے درمیان ایک حادثہ ہے، ہم جلد اس کے اثرات سے نکل جائیں گے۔

<u>ملا محمد عمر کا پیغام:</u> دسمبر 2010ء کے وسط میں طالبان سربراہ ملا محمد عمر کا مقامی اخبار کے نام ایک خط آیا جس کے مندرجات کا خلاصہ یہ ہے:

"امریکا افغانستان میں آئے روز جانی نقصانات اٹھا رہا ہے، وہ ہر جگہ محاصرے اور پسپائی کی حالت میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آئے روز مذاکرات اور امن کی باتیں کر رہا ہے۔ کرزئی حکومت کی موجودگی میں عوام کی حالت خراب تر ہوتی جا رہی ہے اور ان کی مشکلات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بھوک، فقر و فاقہ اور گھر بار کا نہ ہونا عام ہے۔ مختلف قسم کے امراض پھیل رہے ہیں اور عوام کی ہلاکتیں ہو رہی ہیں۔ جمہوریت کے نام پر اجتماعی ثقافتی انحراف آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ ملک میں اوپن مارکیٹ نظام کے تحت اشیائے خورد و نوش سمیت تمام اجناس اعلیٰ حکومتی عہدے داروں کے ہاتھ لگ چکی ہیں جو ان کی من مانی قیمت مقرر کرتے ہیں۔ افغانستان کے لاچار خاندان بھیک مانگنے اور گداگری پر مجبور ہیں۔ کرپشن اپنی آخری حدود کو چھو رہی ہے جس کا اعتراف خود کرزئی کے آقا کر رہے ہیں اور وہ یہ مانتے ہیں کہ کرزئی حکومت کرپشن اور بدعنوانی میں دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔ افغان حکمران عوام کو لوٹنے اور اپنی جیبوں کو بھرنے کے سوا کوئی کام نہیں کر رہے۔ حکمرانوں کے پاس مغربی ممالک کی شہریت ہے اس لیے انہیں مقامی لوگوں سے کوئی ہمدردی نہیں۔ وہ افغانستان کو اپنا ملک نہیں سمجھتے۔ امریکی چاہتے ہیں کہ افغانوں کو استعمال کر کے چند زر خرید ایجنٹوں کو برقرار رکھا جائے۔ کرزئی حکومت آخری حد تک کٹھ پتلی، بے اختیار اور امریکا کے تعاون سے برقرار ہے، امریکا اس حکومت کے ذریعے

خطے میں اپنے قیام کی راہ ہموار کرنا اور اپنے قبضے کو مزید طول دینا چاہتا ہے۔ ایسی فاسد اور جفا کار کٹھ پتلی حکومت کے ساتھ کام کرنے کا کوئی اخلاقی اور دینی جواز نہیں۔ امریکا ایک طرف تو اپنی فوجی کارروائیوں کو وسعت دے رہا ہے اور دوسری طرف مذاکرات کے بے بنیاد اور کھوکھلے نعروں کے ذریعے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ افغان عوام اور عالمی برادری کو امارتِ اسلامیہ کی قیادت کے متعینہ ترجمانوں کے سوا کسی قسم کی خبروں، دعووں اور نعروں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ خادمِ اسلام، امیر المؤمنین، ملا محمد عمر مجاہد"

دسمبر کے اواخر میں طالبان سربراہ کا ایک اور پیغام منظرِ عام پر آیا جس کا خلاصہ یہ ہے:

"امریکا اور اتحادیوں کو افغانستان میں شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ رچرڈ ہالبروک کی موت اور میک کرسٹل سمیت اہم امریکی زعماء کے استعفے اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ موسم گرما میں ہم افغانستان کو نیٹو کے لیے گرما دیں گے اور دنیا نیٹو کی بدترین شکست کے حوالے سے خبریں سنے گی۔ امریکا مختلف حیلے بہانے اختیار کر کے افغانستان سے انخلاء کے لیے پر تول رہا ہے مگر وہ جاتے جاتے بھی اپنے مفادات کے لیے افغانستان کے زخمی عوام کو مزید زخم لگانا چاہتا ہے۔ افغانستان کی جان چھوڑ دے اور جلد از جلد نکل جائے۔ اگر اس نے اپنی پالیسیاں تبدیل نہ کیں تو افغانستان روس کی طرح ایک بار پھر امریکا کا بھی قبرستان ثابت ہوگی"۔

مآخذ و مراجع

- ...... ہفت روزہ ضرب مؤمن، جلد 14
- ...... ہفت روزہ تکبیر، فرائڈے اسپیشل، غازی: جلد 2010ء
- ...... قومی اخبارات۔ امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور ہفت روزہ جرائد 2010ء
- ...... طالبان کی ویب سائٹ (http://shahamat.info)
- ...... روزنامہ اسلام کراچی 2010ء
- ...... ذاتی یادداشتیں
- ...... زبانی روایات

بیالیسواں باب

2011ء میں

طالبان کی کارروائیاں: 2011ء میں طالبان کی کارروائیاں عروج پر رہیں۔ جنرل پیٹریاس نے اعتراف کیا کہ طالبان کے حملے 75 فیصد بڑھ گئے ہیں۔ امریکی حکام نے افغانستان کے 80 فی صدر قبے پر طالبان کے کنٹرول کا اقرار بھی کیا۔ طالبان کی کارروائیوں اور امریکا کی پسپائیوں کی ایک جھلک یہ ہے:

- 7 مارچ کو امریکا نے کنڑ میں نو برس سے قائم اپنا اڈا خالی کر دیا۔ امریکی کمان نے اس موقع پر مشرقی افغانستان میں اپنی ناکامی کا اقرار کیا۔
- 25 اپریل کو طالبان نے سرنگ کے ذریعے قندھار جیل سے 375 قیدی آزاد کرا لیے جن میں چار صوبائی سطح کے رہنما اور درجنوں کمانڈر شامل تھے۔ طالبان نے پانچ ماہ میں 320 میٹر طویل سرنگ کھودی تھی، بیرکوں کی چابیاں بھی بنالی گئی تھیں۔ اس کارروائی سے کرزئی حکومت اور امریکا ششدر رہ گئے۔ سرنگ کے ذریعے قید سے کامیاب فرار کا یہ ایک انوکھا اور تاریخی واقعہ تھا۔
- 30 اپریل...... موسم بہار شروع ہوتے ہی طالبان نے آپریشن البدر کا اعلان کر دیا۔ عوام کو سرکاری اداروں، فوجی قافلوں اور فوجی اڈوں سے دور رہنے کی ہدایت کی گئی۔
- 19 مئی...... پکتیکا میں تعمیراتی کمپنی پر طالبان کے حملے میں 36 افراد ہلاک ہو گئے۔
- 26 مئی...... پکتیکا میں فرانسیسی ہیلی کاپٹر تباہ ہو گیا۔
- 28 مئی...... طالقان کے گورنر ہاؤس میں نیٹو کے جرمن کمانڈر جنرل مارکس نائپ کی میٹنگ میں ایک حملہ آور گھس گیا، اس نے اندھادھند فائرنگ کے بعد فدائی حملہ کر دیا۔ تین جرمن فوجی اور مقامی پولیس چیف جنرل داؤد داؤدی ہلاک ہو گئے جبکہ جرمن کمانڈر زخمی ہو گیا۔
- 30 مئی...... ہرات میں طالبان نے اٹلی کے فوجی اڈے پر بارود سے بھری گاڑی سے حملہ کیا۔ 5 اطالوی فوجی ہلاک اور 30 زخمی ہو گئے۔

- 13 جون...... وردک میں طالبان نے 38 نیٹو ٹینکر نذرِ آتش کرڈالے۔
- 28 جون...... کابل میں انٹر کانٹی نینٹل فائیو اسٹار ہوٹل پر چھ بمبار طالبان نے فدائی حملہ کیا، اس وقت وہاں صوبائی گورنروں کا اجلاس جاری تھا۔ حملے میں 11، افراد مارے گئے۔
- 13 جولائی...... کاپیسا میں فرانسیسی قافلے پر حملے میں 5 فرنچ سپاہی ہلاک ہوگئے۔
- 7، اگست...... وردک میں امریکی چینوک ہیلی کاپٹر مار گرایا جس میں سوار 38 امریکی سپاہی موت کے گھاٹ اتر گئے، ان میں ایبٹ آباد آپریشن میں حصہ لینے والے ''سیل ٹیم 6'' کے 25 ارکان بھی شامل تھے۔
- 8، اگست...... زرمت (پکتیا) میں ایک امریکن ہیلی کاپٹر تباہ۔ 33 امریکی ہلاک۔
- 11 ستمبر...... نائن الیون کے دس سال مکمل ہونے پر وردک میں طالبان کا ٹرک فدائی حملہ ہوا، جس میں دس امریکیوں سمیت 167 افراد مارے گئے۔
- 7، اکتوبر۔ افغان جنگ کے دس سال پورے ہونے پر طالبان نے چار امریکی اڈوں پر دھاوا بول دیا۔ متعدد ہلاک وزخمی۔
- 29 اکتوبر...... طالبان نے کابل کے انتہائی محفوظ گوشے دارالامان میں گھس کر پانچ امریکی فوجیوں اور پندرہ سی آئی اے اہلکاروں کو اس وقت ہلاک کردیا جب وہ فوجی بس سے اڈے کی طرف منتقل ہورہے تھے۔
- 21 دسمبر...... غزنی میں نیٹو کے گشتی دستے پر حملہ۔ 5 پولش فوجی ہلاک۔ پولینڈ کا یہ افغانستان میں سب سے بڑا نقصان تھا۔
- اس سال طالبان نے کابل کے اندر گھس کر خصوصی اہداف کو نشانہ بنا کے اپنی دھاک قائم کردی۔ ستمبر کے اوائل میں چھ فدائی طالبان نے جو ہلکی مشین گنوں، راکٹ لانچروں، دستی بموں اور خودکش جیکٹوں سے مسلح تھے، کابل کے برطانوی سفارت خانے میں گھس کر افغان محافظوں کو بے بس کردیا، اور سفارت خانے پر قابض ہوگئے، اتحادی فوج نے جن میں نیوزی لینڈ کے سپاہی بھی شامل ہوگئے تھے، ان پر جوابی حملہ کیا۔ اس دوران فدائیوں ایک اونچی عمارت پر قابض ہوکر سامنے دکھائی دینے والی امریکی سفارت خانے کی عمارت کو بے دریغ راکٹوں کا نشانہ بنایا اور سات گھنٹے تک مزاحمت کرتے ہوئے متعدد اتحادیوں کو مار گرایا۔ گولہ بارود کی اس بارش میں سفارت خانہ مکمل طور پر تباہ ہوگیا۔ فدائی حملہ آور شہید ہوگئے جبکہ دیگر 21 افراد ہلاک اور 19 سے زائد زخمی ہوئے۔

❖ اس سال طالبان نے امریکی ایجنٹوں اور حامد کرزئی کے ساتھیوں کو خصوصی طور پر نشانہ بنایا۔ طالبان کے خلاف آپریشن میں برطانوی فوج کا ساتھ دینے کے مرتکب، ہلمند کے سابق گورنر جان محمد کو، جولائی کی ایک شام گھر میں مہمانوں کے ساتھ کھانے کے دستر خوان پر قتل کر دیا گیا۔ ساتھ ہی پارلیمنٹ کا رکن، ہاشم پال بھی مارا گیا۔ قندہار کے میئر ایک فدائی حملے میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور قندھار کے ڈائریکٹر حج و اوقاف کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا۔

اسامہ بن لادن کی شہادت: 2011ء کی سب سے بڑی خبر اور سب سے المناک واقعہ شیخ اسامہ بن لادن کی شہادت تھا۔ یہ ایسی خبر تھی جسے پوری دنیا میں مسلمانوں نے نہایت رنج اور افسوس کے ساتھ سنا۔

اسامہ کے خلاف کس طرح کارروائی عمل میں لائی گئی، یہ ایک طویل داستان ہے۔ 2010ء اور 2011ء کے اوائل میں ایسا لگتا تھا کہ اسامہ کا مسئلہ امریکا کے لیے اہم نہیں رہا ہے مگر درحقیقت امریکی سی آئی اے اور اس کے ایجنٹ افغانستان اور پاکستان میں اس مقصد کے لیے پوری طرح فعال تھے اور شکاری کتوں کی طرح اپنے ہدف کی بو سونگھ رہے تھے۔ سی آئی اے پوری دنیا میں اپنا سب سے بڑا نیٹ ورک پاکستان میں قائم کر چکی تھی اور پاکستان میں سی آئی اے کا چیف ریمنڈ ڈیوس جس کا اصل نام مائیکل جارج فرنانڈس تھا انتہائی مشکوک سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ اس کے جنوبی وزیرستان میں بکثرت رابطے تھے۔ وہ متعدد دینی مدارس کا دورہ کر چکا تھا۔ کئی بار اسے ممنوعہ فوجی علاقوں کے آس پاس دیکھا گیا تھا۔ پاکستانی انٹیلی جنس اس پر نظر رکھے ہوئے تھیں مگر اس پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں تھا۔

ادھر سی آئی اے کو کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جو اسامہ بن لادن سے رابطے میں ہوتا کہ اس کے ذریعے اپنے ہدف تک پہنچا جا سکے۔ ایسا شخص انہیں ابواحمد الکویتی کی شکل میں مل گیا تھا جو اسامہ بن لادن کا معتمد ساتھی تھا، یہ اصل میں ایک پاکستانی نوجوان تھا۔ اس کا اصل نام ارشد خان تھا۔ سی آئی اے کے ایجنٹ غیر محسوس انداز میں اس کے پیچھے لگے رہے۔ کڑیوں سے کڑیاں ملانے کے بعد آخر کار انہیں پختہ شک ہو گیا کہ اسامہ بن لادن یا القاعدہ کی کوئی اور اہم شخصیت ایبٹ آباد کے علاقے بلال ٹاؤن کی ایک غیر معمولی طور پر مستحکم عمارت میں رہائش پذیر ہے۔ یہ عمارت ارشد خان ہی کی ملکیت تھی۔ کاکول ملٹری اکیڈمی سے صرف نصف کلومیٹر دور واقع اس عمارت کے گرد اٹھارہ فٹ بلند چہار دیواری اور اس کے حفاظتی انتظامات کسی بھی آدمی کو شک میں ڈال سکتے تھے...... مگر عمارت کے مالکان نے مشہور کر رکھا تھا کہ ان کی کچھ لوگوں سے دشمنیاں ہیں جن سے حفاظت کے لیے عمارت اتنی مضبوط بنوائی گئی ہے۔

سی آئی اے نے اس موقعے پر اپنے پاکستانی ایجنٹ ڈاکٹر شکیل سے کام لیا جو محکمہ صحت کا ملازم تھا۔

اس نے علاقے بھر میں دوبار پولیو کے قطرے پلانے کی جعلی مہم چلائی اور اس طرح لیڈی ہیلتھ ورکرز کے ذریعے اس پراسرار گھر کے مکینوں کے خون کے نمونے حاصل کر لیے جن کے ڈی این اے ٹیسٹ کے بعد سی آئی اے کا شک یقین میں بدل گیا کہ یہاں بن لادن فیملی موجود ہے۔

یہی وہ دن تھے جب ریمنڈ ڈیوس لاہور میں گرفتار ہو گیا۔ اسے دو نوجوانوں فہیم اور فیضان پر شک ہوا تھا کہ وہ اس کی نگرانی کر رہے ہیں اور شاید اس کے بارے میں بہت کچھ جان چکے ہیں۔ ریمنڈ نے بلا تامل فائرنگ کر کے انہیں ختم کر دیا، یہ 27 جنوری کا واقعہ ہے۔ مگر اس کارروائی کے بعد ریمنڈ موقع پر ہی گرفتار کر لیا گیا۔ امریکا نے اپنے خاص ایجنٹ کی رہائی کے لیے پاکستان پر زبردست دباؤ ڈالا۔ امریکی صدر اوباما نے کہا کہ ریمنڈ ہمارا سفیر تھا جسے سفارتی استثناء کے تحت رہا کر دیا جائے مگر امریکی حکام اس کی سفارتی حیثیت کا ثبوت پیش نہ کر سکے۔ جلد ہی پاکستانی تحقیقاتی اداروں نے یہ بات اگلوالی کہ ریمنڈ سی آئی اے کا چیف ہے۔ ریمنڈ 48 دن حراست میں رہا، اس دوران پاکستانی سرحدوں پر کئی ماہ سے جاری ڈرون حملے، حیرت انگیز طور پر تقریباً رک گئے تھے۔ آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل (ر) حمید گل نے انہی دنوں اپنے ایک انٹرویو میں انکشاف کیا کہ پاکستان میں ریمنڈ جیسے ایک ہزار سے زائد امریکی جاسوس موجود ہیں۔

امریکی جاسوس کے بہیمانہ اقدام کے خلاف پورے ملک میں احتجاج ہوتا رہا اور اسے سزائے موت دینے کے مطالبے سے ملک کی فضا گونجتی رہی مگر پاکستان امریکی دباؤ زیادہ دیر برداشت نہ کر سکا اور آخر کار 15 مارچ کی شب ریمنڈ کو رہا کر دیا گیا...... اگلے دن کے اخبارات میں یہ خبر اہل پاکستان کا منہ چڑا رہی تھی کہ فہیم اور فیضان کے ورثاء کو دیت کی بھاری رقم دے کر ریمنڈ کو چھڑا لیا گیا ہے۔ ریمنڈ آزاد ہوتے ہی افغانستان میں رہتے ہوئے ایک بار پھر اپنی مہم جوئی میں مصروف ہو گیا۔

ڈیڑھ ماہ تک سی آئی اے خاموشی سے آپریشن کی تیاری کرتی رہی اور آخر کار یکم اور 2 مئی کی درمیانی شب دو امریکی ہیلی کاپٹر چالیس فوجیوں کو لے کر اس مکان پر منڈلانے لگے...... رات کی تاریکی میں فائرنگ کی آوازوں نے علاقے میں سنسنی پھیلا دی...... مکان کے اندر سے ایک راکٹ فائر ہوا اور ایک امریکی ہیلی کاپٹر شعلوں کا کفن پہنے زمین پر آ گرا...... کچھ دیر تک مزاحمت ہوتی رہی...... آخر کار امریکی فوجی اندر داخل ہو گئے...... انہوں نے بڑی تیزی سے اپنی کارروائی مکمل کی...... چالیس منٹ کے اندر اندر وہ کچھ لاشیں لے کر واپس جا رہے تھے...... اس جگہ سے شیخ کی تین بیگمات اور بچے بھی گرفتار بھی کیے گئے جنہیں پاکستانی حکام نے اپنی تحویل میں لے لیا۔

اس کے ساتھ امریکا نے اعلان کر دیا کہ وہ اپنے سب سے زیادہ مطلوب فرد "شیخ اسامہ بن لادن" کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے...... اور لاش کو بحیرہ عرب میں پھینک دیا گیا ہے۔

صبح تک امریکی حکام کی طرف سے شیخ کی نعش کی تصویر بھی جاری کی گئی جس کا جعلی ہونا اگلے ہی دن ثابت ہو گیا اور خود امریکی حکام نے جعلی تصویر جاری کرنے کا اعتراف بھی کیا۔

ایبٹ آباد آپریشن اور شیخ کے شہید کیے جانے کے امریکی دعوے نے کئی سوالیہ نشان ابھار دیے جن کے تسلی بخش جوابات آج تک نہیں دے جا سکے۔ مثلاً اگر امریکا کو اسامہ بن لادن کا پتا مل گیا تھا تو وہ انہیں زندہ گرفتار کیوں نہ کر سکا؟ جب کہ صدر بش نے نائن الیون کو دعویٰ کیا تھا کہ ہم اپنے دشمنوں کو انصاف کے کٹہرے میں لائیں گے؟ شیخ کی نعش کی تصویر یا فوٹیج کیوں جاری نہیں کی گئی جب کہ اس سے قبل امریکا ہر مطلوب فرد کی فوٹیج جاری کرتا آیا ہے۔ نعش کو آزاد میڈیا اور صحافیوں کے سامنے کیوں نہ پیش کیا گیا تا کہ دنیا کو امریکا کی سچائی کا یقین ہوتا۔

بعض ذرائع سے پتا چلتا ہے کہ شیخ وہیں موجود تھے مگر انہوں نے گرفتاری پر شہادت کو ترجیح دیتے ہوئے فدائی حملہ کر دیا تھا، جس کی وجہ سے خود ان کی لاش قابلِ شناخت نہ رہی تھی۔ ایسے مجاہد کے شایان شان موت یہی ہو سکتی ہے...... اور اسے لاش نہ دکھانے کی یہ ایک معقول وجہ کہا جا سکتا ہے۔

ایک دوسرا تجزیہ جو قرین قیاس ہے یہ ہے کہ شیخ اس سے پہلے کسی اور مقام پر وفات یا شہادت پا چکے تھے جس کی تصدیق امریکا کو انہی دنوں ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی سی آئی اے کو یہ معلوم ہو گیا کہ ایبٹ آباد میں شیخ کی ازواج اور بچے موجود ہیں۔ چنانچہ یہ ڈرامہ سیٹ کر دیا گیا تا کہ دنیا پر یہ دھاک جمائی جا سکے کہ اسامہ کو امریکا بہادر نے ختم کر کے افغان مہم کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا ہے اور اب افغانستان سے باعزت واپسی کا وقت آ گیا ہے۔

بہر حال یہ بات اپنی جگہ طے تھی کہ 2 مئی کے بعد شیخ اسامہ اس دنیا میں نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے متعلقین، حراست میں لی گئی ان کی بیگمات، قریبی رشتہ داروں اور خود القاعدہ نے ان کی شہادت کی تصدیق کر دی۔

<u>برہان الدین ربانی کا قتل:</u> 20 ستمبر کو سابق افغان صدر اور طالبان سے مصالحتی وفد "افغان امن کونسل" کے سربراہ پروفیسر برہان الدین ربانی کو کابل میں امریکن سفارت خانے کے قریب واقع ان کی رہائش گاہ میں قتل کر دیا گیا۔ ان کی عمر 71 سال تھی۔ 23 ستمبر کو ان کی آخری رسومات ادا کی گئیں اور وزیر اکبر خان کے علاقے میں ان کی آخری آرامگاہ بنی۔ پاکستانی وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی بھی تعزیت

اور آخری رسومات میں شرکت کے لیے کابل پہنچ گئے تھے۔ ربانی کے قتل کا الزام طالبان پر لگایا گیا جبکہ یہ بالکل غلط تھا۔ انہیں شمالی اتحاد نے قتل کرایا جس کے پس پردہ امریکی ایماء موجود تھا۔ دراصل ربانی، ان آخری سالوں میں امریکی تسلط سے سخت نالاں تھے۔ وہ افغانستان میں امریکا کو اڈے دینے کو زہرِ قاتل سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ آئندہ حکومت میں طالبان کے کلیدی کردار کو تسلیم کرنے پر راضی تھے اور برملا کہتے تھے کہ انہیں طالبان کے ماتحت رہنا قبول ہے۔ وہ طالبان سے مذاکرت کے بہت بڑے داعی تھے اور اس میں پاکستان کا کردار بھی ضروری سمجھتے تھے۔ ادھر افغان حکومت کا طاقتور عنصر شمالی اتحاد طالبان سے مذکرات کا قائل تھا نہ پاکستان سے کسی تعلق کا، اس کے ساتھ ساتھ امریکا کو بھی افغانستان کی سیاست میں وہی لوگ چاہیے تھے جو امریکن اڈوں کی تجویز قبول کریں۔ چنانچہ ربانی کو بڑی صفائی سے راستے سے ہٹادیا گیا اور الزام طالبان کے سر منڈھ دیا گیا جس کی طالبان نے شدت سے تردید کی۔

ربانی کی تجہیز و تکفین کے فوراً بعد شمالی اتحاد طالبان سے مصالحتی کوشش رکوانے کے لیے سرگرم ہوگیا، اس نے مطالبہ کیا کہ طالبان کا بزورِ قوت خاتمہ کیا جائے۔

احمد ولی کرزئی کا قتل: 12 جولائی کو افغان صدر حامد کرزئی کے بھائی، قندہار صوبائی اسمبلی کے سربراہ، احمد ولی کرزئی کو قندہار میں رہائش گاہ پر قتل کردیا گیا۔ انہیں ان کے پروٹوکول افسر سردار محمد نے اس وقت گولیوں کا نشانہ بنادیا جب وہ واش روم سے نکل رہے تھے۔ احمد ولی کرزئی نے مارچ کے وسط میں افغانستان میں مستقل امریکی اڈوں کو قیام امن کے لیے اشد ضروری قرار دیا تھا۔

امن مذاکرات، دورے، عالمی کانفرنسیں: دورانِ سال مختلف کانفرنسیں، سربراہان مملکت کی ملاقاتیں اور امن مذاکرات کی کوششیں جاری رہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے:

- 23 جنوری...... کرزئی نے ماسکو کا دورہ کیا اور روس سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کی۔
- 8 اپریل...... ترکی نے طالبان کو سیاسی دفتر بنا کردینے کی پیش کش کردی۔
- 16 اپریل...... کابل میں پاکستانی حکام کے افغان صدر کرزئی سے نہایت اہم مذاکرات ہوئے۔ پاکستان کی جانب سے وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کے علاوہ عبدالرحمن ملک، جنرل اشفاق کیانی اور آئی ایس آئی چیف احمد شجاع پاشا بھی شریک تھے۔
- 2 مئی ...... پاکستان کا اثر توڑنے کے لیے بھارتی صدر من موہن سنگھ جھٹ پٹ کابل پہنچ گئے ...... کرزئی سے افغانستان کے لیے 50 کروڑ ڈالر امداد کا وعدہ کیا...... طالبان سے مذاکراتی عمل کی حمایت کی، بشرطیکہ پاکستان کو معاملات سے باہر رکھا جائے۔

- یکم جون ...... امریکا ملا محمد عمر سے براہِ راست مذاکرات کے لیے سرگرم ہوگیا۔ ان تک رسائی رکھنے والے افراد کو سرگرمی سے تلاش کیا جانے لگا۔ مولوی طیب آغا سے رابطہ کرلیا گیا جو ملا محمد عمر کے متعمدِ خاص ہیں۔ انہیں قطر میں طالبان دفتر قائم کرنے کی اجازت دے گئی۔
- حامد کرزئی 10 جون کو دو روزہ دورے پر پاکستان پہنچ گئے۔ وزیر اعظم پاکستان یوسف رضا گیلانی سے ملاقات میں پن بجلی، مواصلات، بینکاری، صحت، تعلیم اور سرحدوں کی مشترکہ نگرانی سے متعلقہ امور طے پائے اور 23 نکاتی اعلامیہ جاری کیا گیا۔ کرزئی پاکستانی سیاست دانوں سے بھی ملاقاتوں کے خواہش مند تھے مگر کوشش کے باوجود نواز شریف اور مولانا فضل الرحمن سے ان کی ملاقات نہ ہوسکی۔
- 23 جون ...... اوباما نے افغانستان سے ڈیڑھ سال میں 33 ہزار فوج نکالنے کا اعلان کردیا۔ ساتھ ہی مذاکرات میں پاکستان کے کردار کی ضرورت تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔
- 29 جون ...... کابل میں پاک افغان مصالحتی کمیشن کا پہلا اجلاس ہوا جس میں طالبان سے مفاہمتی عمل کی حمایت کی گئی۔
- جولائی میں امریکا نے طالبان سے مذاکرات کا ڈول ڈالنے کے لیے 14 طالبان رہنماؤں کے نام بلیک لسٹ سے خارج کردیے جبکہ 123 نام باقی رکھے گئے۔ خارج کیے جانے والوں میں طالبان کے وزیر مولانا ارسلان خان رحمانی، طالبان کے سعودی عرب کے لیے سفیر حبیب اللہ غازی، فقیر محمد خان، اور سید رحمان حقانی شامل تھے۔
- امریکا یہ ضمانت چاہتا تھا کہ انخلاء کے دوران طالبان امریکی افواج اور واپس جانے والی رسد پر حملے نہ کریں۔ دوسری طرف طالبان نے انخلاء کے دوران امریکی فوج اور رسد پر حملے نہ کرنے کی ضمانت کو اس امر سے مشروط کردیا کہ انخلاء فوری طور پر مکمل ہو، اور پیچھے امریکی اڈے برقرار نہ رکھے جائیں۔ امریکا طالبان کی اس شرط کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ چنانچہ اس نے ایک دوسرے رخ پر کام شروع کیا۔ طالبان مزاحمت کاروں میں حقانی گروپ نہایت مؤثر رہا ہے، امریکا نے اسے توڑنے کی کوشش شروع کردی اور طالبان کو مذاکرات سے نکال کر حقانی گروپ سے بات چیت شروع کرنا چاہی۔ مگر مولانا جلال الدین حقانی کے تربیت یافتہ مجاہدین اس جھانسے میں نہ آئے۔ حقانی گروپ کے رہنما مولانا سراج الدین حقانی نے 17 ستمبر کو واضح طور پر اعلان کیا کہ طالبان کے بغیر مذاکرات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔
- حقانی گروپ کے اس صاف جواب کے بعد امریکا نے میران شاہ سے خوست تک پھیلے ہوئے حقانی

مجاہدین کو اپنا خاص ہدف بنالیا۔ مغربی میڈیا "حقانی گروپ" کی بھیانک تصویر کشی کرنے لگا۔ ساتھ ہی امریکا نے پاکستان پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ براہِ راست حقانی گروپ کے خلاف آپریشن کرے۔

پاکستان یہ مطالبہ قبول نہیں کرسکتا تھا، کیونکہ حقانی گروپ افغانستان میں طالبان کا بہترین معاون تھا، اس سے لڑنے کا مطلب افغان طالبان سے براہِ راست ٹکر لینا تھا، امریکا یہ چاہتا تھا کہ افغانستان سے اپنے پاؤں سمیٹتے ہوئے، پاکستان اور طالبان کو لڑتا ہوا چھوڑ جائے۔ پاکستانی حکام اس خطرے کو بھانپ چکے تھے اور امریکا کے بعد تن تنہا افغان طالبان سے دشمنی مول لینا نہیں چاہتے تھے، چنانچہ حقانی گروپ کے خلاف کارروائی کا مطالبہ مسترد کردیا گیا۔ 23 ستمبر کو امریکی فوجی سربراہ جنرل مائیک مولن نے پاکستانی چیف جنرل اشفاق کیانی سے ملاقات کی، دونوں میں شدید تناؤ کی کیفیت میں بات چیت ہوئی۔ مائیک مولن کا مطالبہ تھا کہ پاکستان حقانی گروپ سے تعلقات ختم کردے۔ جنرل کیانی نے ان الزامات کی تردید کی اور واضح کیا کہ ان کا حقانی گروپ سے کوئی تعلق نہیں۔

- 4 اکتوبر...... حامد کرزئی نے دہلی میں بھارتی سربراہ من موہن سنگھ کے ساتھ اسٹریجک پارٹنرشپ کے معاہدے پر دستخط کیے، طے ہوا کہ افغان فورسز کو بھارتی افسران تربیت دیں گے اور بھارت افغانستان سے معدنی وسائل برآمد کرنے کی ذمہ داری لے گا۔ اس معاہدے کے تین دن بعد سات اکتوبر کو کرزئی نے پاکستان مخالف بیان دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی مدد کے بغیر طالبان انگلی بھی نہیں ہلا سکتے۔ چین کے لیے افغانستان میں بھارتی تسلط ناقابل قبول ہے، اس لیے چین نے اپنی سفارت کاری بروئے کار لاتے ہوئے، 19، اکتوبر کو افغانستان میں طورخم سے مزار شریف تک ریلوے لائن بچھانے کے منصوبے پر آمادگی ظاہر کردی۔
- تقریباً تین ہفتوں تک امریکا پاکستان پر حقانی گروپ کے حوالے سے دباؤ ڈالتا رہا مگر آئی ایس آئی کے سربراہ احمد شجاع پاشا کے کھرے کھرے اور مدلل جوابات سننے کے بعد امریکی حکام کو چپ لگ گئی۔ احمد شجاع پاشا نے جب امریکی حکام کے حقانی گروپ سے رابطوں کے تصویری ثبوت پیش کیے تو وہ مدافعانہ انداز اپناتے ہوئے نظر آئے۔ اکتوبر کے اواخر میں امریکی وزیر خارجہ ہیری کلنٹن نے پاکستان کا دورہ کیا اور حقانی گروپ سے مذاکرات کے لیے آئی ایس آئی کی مدد طلب کی۔
- ترکی، افغانستان میں امن کے عمل کو آگے بڑھانے خصوصاً بھارت کی جگہ پاکستان کو وہاں اہم کردار دینے کے لیے سنجیدہ تھا۔ ترکی نے یکم اور دو نومبر کو استنبول میں سہ فریقی مذاکرات کی میزبانی کی۔ ترکی کے صدر عبداللہ گل، پاکستان کے صدر آصف زرداری اور افغان صدر حامد کرزئی نے

مذاکرات کے اختتام پر 23 نکاتی اعلامیہ جاری کیا جس میں ایک دوسرے کے معاملات میں عدم مداخلت، برہان الدین ربانی کے قتل کے بارے میں مشترکہ تحقیقات اور افغان فورسز کے پاکستانی افسران سے تربیت لینے کے نکات بھی شامل تھے۔ ترکی نے اس موقع پر افغانستان اور پاکستان میں غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔

نومبر کے وسط میں سارک سربراہی کانفرنس میں کرزئی اور گیلانی ایک بار پھر ملے اور ایک گھنٹے ملاقات کی۔ خطے میں امن واستحکام کے لیے پاک افغان تعاون پر اتفاق کیا گیا۔

بیسواں لویہ جرگہ۔ امریکی اڈوں کی منظوری: امریکا افغانستان میں بہرحال اپنے اڈے برقرار رکھنے اور اس کے لیے افغان سیاسی نمائندوں کی ظاہری حمایت حاصل کرنے کا تہیہ کر چکا تھا، اس لیے اس نے 19 نومبر 2011ء کو افغانستان کے بیسویں لویہ جرگے کا انعقاد کرایا جس میں شریک افغان عمائدنے بھاری اکثریت سے امریکا سے دس سالہ اسٹریجک معاہدے کی توثیق کردی جو پارلیمنٹ سے منظوری سے مشروط ہوگی۔ امریکا نے فیصلہ اپنے حق میں لینے کے لیے افغان نمائندوں کو فی کس ایک ایک کروڑ ڈالر کی رشوت دی تھی۔ اتنی بھاری قیمت پر افغان عمائد نے قومی حمیت کا سودا کرلیا۔ پورے اجلاس میں صرف ایک خاتون رکن نے اس معاہدے کی مخالفت کی جسے شرکاء نے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔

پاک امریکا تعلقات میں کشیدگی: پاکستان کی آزادانہ خارجہ پالیسی کی طرف پیش رفت سے امریکا کو تشویش لاحق ہو چلی تھی، چنانچہ پاکستان کو متنبہ کرنے کے لیے 26 نومبر کو مہمند ایجنسی کے علاقے سلالہ چیک پوسٹ پر امریکی طیاروں نے اندھا دھند بمباری کر کے 28 پاکستانی فوجیوں کو شہید کردیا جن میں ایک میجر اور ایک کیپٹن بھی شامل تھے۔ پاکستان نے نہ صرف اس حملے پر شدید احتجاج کیا بلکہ پہلی بار عملی اقدام اٹھاتے ہوئے نیٹو کی رسد مسدود کردی۔ جنرل کیانی نے حکم جاری کیا کہ آئندہ جارحیت پر فوری جوابی کارروائی کی جائے۔ ساتھ ہی حکومتِ پاکستان نے امریکن افواج کے زیر استعمال اپنا شمسی ایربیس خالی کرانے کا مطالبہ کردیا چنانچہ 10 دسمبر کو امریکا شمسی ایربیس سے بے دخل ہوگیا۔ امریکا نے شروع میں ڈھٹائی سے کام لیتے ہوئے سلالہ چیک پوسٹ کے سانحے پر معذرت سے بھی انکار کردیا۔ امریکی حکام نے ظاہر کیا کہ پاکستان کے عدم تعاون کے باوجود نیٹو رسد پر کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا اور متبادل راستے اختیار کرلیے جائیں گے۔

پاکستان سے کشیدگی ہی کے باعث 5 دسمبر کو اقوام متحدہ کے زیر اہتمام، افغان مسئلے پر جرمنی کے شہر بون میں ہونے والی کانفرنس سے پاکستان کو بالکل باہر رکھا گیا۔ کانفرنس میں 86 ممالک اور 16 عالمی

اداروں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ افغانستان کے مستقبل، طالبان سے مفاہمت اور فوجی اڈوں کے برقرار رہنے پر گفت وشنید ہوئی جو بالکل بے نتیجہ رہی۔ خود جرمن حکام نے اعتراف کیا کہ پاکستان کے بغیر افغان مسئلے پر بحث لاحاصل ہے۔ اس کانفرنس سے ایک دن قبل بون میں ہزاروں افراد نے مارچ کیا جو افغان جنگ بند کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

بہرکیف نیٹو کے ہزاروں کنٹینر کراچی میں رکنے کی وجہ سے امریکی فوج کو رسد میں مشکلات کا سامنا ہوا تو اس نے پاکستان کو منانے کی کوششیں شروع کر دیں اور بالآخر کامیاب ہو گیا۔ نیٹو رسد بحال کر دی گئی۔

قطر میں طالبان کا سیاسی دفتر: 27 دسمبر کو قطر میں طالبان کے سیاسی دفتر کا باقاعدہ افتتاح کر دیا گیا۔ ساتھ ہی ایف بی آئی نے ملا محمد عمر کا نام اپنے انتہائی مطلوب افراد کی فہرست سے خارج کرنے کا اعلان کیا۔

امن مذاکرات اور نئی حکومت کی تشکیل کے حوالے سے طالبان سربراہ ملا محمد عمر کا وہ پیغام انتہائی اہمیت کا حامل ہے جو عید الفطر کے موقعے پر جاری کیا گیا، اس میں کہا گیا تھا:

"آئندہ حکومت میں تمام قومیں حصہ دار ہوں گی۔ افغانستان کی آزادی اور اسلامی نظام کے لیے ہر جائز طریقے پر غور ہو سکتا ہے۔ ہمارا موقف ہے کہ مستقبل کے افغانستان میں ایک ایسا حقیقی اسلامی نظام ہو جو ملک کے تمام رہنے والوں کے لیے قابلِ اعتماد ہو۔ عالمی اور علاقائی ممالک کے ساتھ دوطرفہ تعلقات باہمی احترام، اسلامی اور قومی مفادات کی بنیاد پر استوار ہوں گے۔ ملک سے غربت، بے روزگاری، ناخواندگی اور دیگر اجتماعی اور اقتصادی مسائل کے حل پر خاص توجہ دی جائے گی۔ تمام افغان عوام کو بلا امتیازِ رنگ ونسل ومذہب ملک کی خدمت کے لیے استعمال کیا جائے گا۔"

طالبان سربراہ نے تاکید کرتے ہوئے کہا:

"اغواء برائے تاوان کو سختی سے روکا جائے۔ مجاہدین علمی مطالعے، دینی دعوت، وظائف اور عوام کی خدمت کو اپنا شعار بنائیں۔"

افغان عوام: ✤ یکم اپریل۔ قرآن مجید کی بے حرمتی کرنے والے ملعون پادری ٹیری جونز کے خلاف افغان عوام نے شدید غم وغصے کا اظہار کرتے ہوئے ملک بھر میں مظاہرے کیے۔ مزارشریف میں مظاہرین اقوام متحدہ کے دفتر کے سامنے پہنچے تو محافظ اہلکاروں نے فائر کھول دیا۔ اس پر مظاہرین نے مشتعل ہو کر اہلکاروں سے ہتھیار چھین کر انہی کو بھون ڈالا۔ 20 اہلکار مارے گئے۔ دو غیر ملکیوں کو ذبح کر دیا گیا۔

✤ 2 اپریل۔ قندھار میں اسی قسم کے احتجاجی مظاہرے پر امریکیوں نے فائرنگ کر دی۔ 10 شہری

شہید اور 85 زخمی ہو گئے۔ ملک بھر میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔

- 19 اپریل۔ کابل میں مشتعل افراد نے پیپر مل پر حملہ کر کے اسے جزوی طور پر نقصان پہنچایا۔ مل مالکان قرآن مجید کے شہید اوراق کوری سائکل کر کے ان سے ٹشو پیپر بنایا کرتے تھے۔ عوامی احتجاج پر کمپنی کے چیف ایگزیکٹو سمیت تین افسران کو گرفتار کر لیا گیا۔
- 18 مئی۔ نیٹو حملے میں چار شہریوں کی شہادت کے خلاف تخار میں شہریوں نے نیٹو کے اڈے کی طرف احتجاجی مارچ کیا، اس موقع پر نیٹو اہلکاروں کی فائرنگ سے مزید 13 آدمی شہید اور 50 زخمی ہو گئے۔
- 25 مئی۔ نورستان میں نیٹو کی بمباری سے 18، افغان شہری شہید ہو گئے۔
- 29 مئی۔ ہلمند کے ضلع ''نوزادو'' میں نیٹو کی بمباری سے 20 پولیس اہلکار اور 32 شہری جاں بحق ہو گئے جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ مقتولین کے ورثاء نے گورنر ہاؤس کے سامنے لاشیں رکھ کر احتجاج کیا اور لشکر گاہ کی مرکزی شاہراہ بند رکھی۔ صدر حامد کرزئی نے اس سانحے پر افسوس ظاہر کرنے کے ساتھ امریکا کو متنبہ کیا کہ آئندہ ایسے واقعے کا اعادہ ہوا تو امریکا سے تمام معاہدے منسوخ کیے جاسکتے ہیں۔ تاہم کرزئی نے امریکی سفیروں سے کوئی باز پرس نہیں کی گویا تنبیہی بیان صرف عوام کو دکھانے کے لیے تھا۔
- 24 اکتوبر۔ ہزاروں شہریوں نے کابل کی سڑکوں پر مظاہرہ کرتے ہوئے امریکا کے کرزئی حکومت سے اسٹریجک معاہدے کی مخالفت کی اور نعرہ بازی کی کہ ہمیں امریکی اڈے قبول نہیں۔ ملک بھر میں اس فیصلے پر شدید احتجاج کیا گیا۔

امریکی اڈے: اوباما نے امریکا سے انخلاء کا فیصلہ اس طور پر ہرگز نہیں کیا تھا کہ وہ اس ملک سے لاتعلق ہو جائے۔ انخلاء کا فیصلہ صرف امریکا پر بڑھنے والے مالی بوجھ کو کم کرنے کے لیے ہے۔ امریکا کو ہر سال ایک فوجی پر دس لاکھ ڈالر خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ صرف جنوری سے جون 2011ء تک افغانستان میں امریکا کے جنگی اخراجات 113، ارب ڈالر سے متجاوز ہو چکے تھے جبکہ فوج کو مزید 107، ارب ڈالر درکار تھے۔ عراق افغان جنگ کی وجہ سے امریکا شدید معاشی بحران کا شکار تھا، قرضے 143، کھرب ڈالر سے تجاوز کر گئے تھے۔ اس قدر بھاری اور مستقل اخراجات سے نجات کی صورت یہی تھی کہ علاقوں کا کنٹرول مقامی فورسز کو دے دیا جائے، چنانچہ چھ سات سال کے اندر امریکا افغان فورسز کی تشکیل پر 28 ارب ڈالر خرچ کر چکا ہے، یہ خرچہ اس کی اپنی ایک سال کی مہمات کے اخراجات سے بہت کم ہے۔ جولائی 2011ء کے دوران نیٹو نے چھ شہروں، پنج شیر، مزار شریف، ہرات، بامیان، لشکر گاہ (ہلمند) اور

مہترلام (لغمان) کا کنٹرول افغان فورسز کے حوالے کر کے اپنا کچھ بوجھ ہلکا کر لیا ہے۔

دوسرا خرچہ اس نے یہاں اپنے مستقل اڈوں کی تعمیر پر کیا ہے جو حیرت انگیز حد تک وسیع، مستحکم اور مضبوط ہیں۔ یہ اڈے قندھار، بگرام (کابل)، شین ڈنڈ (ہرات)، خوست اور جلال آباد (ننگرہار) میں ہیں۔ ان کی تعمیر اگرچہ اربوں ڈالروں میں ہوئی ہے مگر فوج کو مسلسل جنگی مہمات میں جھونکنے سے یہ سودا سستا ہے۔

تیسرا خرچہ امریکا نے افغان رہنماؤں کو خرید کر اس بات پر آمادہ کرنے کے لیے کیا کہ وہ ملک میں دس برس کے لیے امریکی اڈوں کی منظوری دے دیں۔ نومبر میں ہونے والے لویہ جرگے سے قبل اس مقصد کے لیے فی کس ایک ایک کروڑ ڈالر دیے گئے، اور مخالفت کرنے والوں کو برہان الدین ربانی کی طرح انجام تک پہنچا دیا گیا۔

جنوری 2011ء کے اوائل میں وکی لیکس کی طرف سے کیا گیا یہ انکشاف بہت جلد حقیقت بنتا نظر آگیا کہ ''افغانستان سے امریکی انخلاء کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔'' اس امر کو پاکستان میں تعینات امریکی سفیر کیمرون منٹر نے بھی تسلیم کیا۔ اپریل کے وسط میں ان کا یہ بیان سامنے آیا کہ امریکا 2014ء کے بعد بھی افغانستان میں رہے گا۔

دراصل امریکا روس کی غلطی نہیں دھرانا چاہتا جو افغانستان کو افراتفری میں خالی کر گیا اور پیچھے چند سال کی کشت و خون کے بعد طالبان جیسے اسلام پسندوں کا غلبہ ہو گیا۔ امریکا کی خواہش ہے کہ اس ملک کی آئندہ حکومتیں آزاد ہونے کے باوجود امریکا کی بالادستی کو کبھی چیلنج نہ کر سکیں۔ اس کے لیے امریکا کا دوررس منصوبہ یہ ہے کہ افغانستان میں تعینات افواج میں سے ایک تہائی کو 2012ء کے اواخر تک اور ایک تہائی کو 2014ء کے اختتام تک واپس بلا لے۔ جبکہ پچیس تیس ہزار فوج مستقل طور پر افغانستان میں زیرِ تعمیر پانچ امریکی اڈوں میں قیام پذیر رہے۔

16 نومبر سے 19 نومبر تک کابل میں جاری رہنے والا ''لویہ جرگہ'' اس لحاظ سے انتہائی اہمیت کا حامل تھا کہ اس میں شریک ارکان کی اکثریت نے امریکی ڈالروں کے عوض اپنی حمیت کو فروخت کرتے ہوئے امریکا سے اس اسٹریٹجک معاہدے کی توثیق کر دی جس کے تحت امریکا اپنے اڈوں میں 2012ء کے بعد مزید دس سال تک افواج ٹھہرا سکے گا۔ امریکا شرکاء کو یقین دلانے میں کامیاب رہا کہ امریکی فوج کا اڈوں میں موجود رہنا ملک میں امن کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ امریکی حکام نے افغان عمائد اور سابقہ جہادیوں کو اس خدشے میں مبتلا کر دیا کہ اگر امریکا نے مکمل انخلاء کیا تو اس کے جاتے ہی طالبان انہیں زیروزبر کر ڈالیں گے، پس ایک وسیع البنیاد حکومت قائم کی تشکیل و بقا اور طالبان پر دباؤ

برقرار رکھنا تب ہی ممکن ہوگا جب امریکی فوج زیادہ دور نہ بیٹھی ہو اور اس کے طیارے ضرورت پڑتے ہی سرکشوں کی گوشمالی کرنے کے لیے تیار ہوں۔

افغانستان کے مستقبل کے ضمن میں پاکستان کے سابق چیف آف آرمی اسٹاف جنرل اسلم بیگ کا یہ انکشاف بھی قابل ذکر ہے جو انہوں نے جون کے اواخر میں کیا۔ انہوں نے کہا کہ امریکا افغانستان کو تین حصوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ اس کا منصوبہ ہے کہ ہلمند سے جنوبی افغانستان کا پورا علاقہ طالبان کو دے دیا جائے۔ شمالی علاقے شمالی اتحاد کے حوالے کر دیے جائیں، جبکہ جلال آباد، کابل، ہرات اور قندھار کو اپنی تحویل میں رکھا جائے۔ ان شہروں کے پاس اس کے تین اہم ترین اڈے (قندھار، بگرام اور شین ڈنڈ) موجود ہیں۔

<u>افغان بچوں کی حالتِ زار:</u> اس وقت افغانستان میں چھ لاکھ سے زائد بچے بھوک، افلاس اور امراض کے شکنجے میں ہیں۔ ان کو خوراک، لباس، علاج اور تعلیم کی بنیادی سہولتیں تک میسر نہیں ہیں۔ غیر ملکی امدادی تنظیموں کو افغان بچوں کے حوالے سے جو فنڈ ملے ہیں وہ 35 ارب ڈالر سے متجاوز ہیں مگر ان میں سے افغان بچوں کو سوائے چند نمائشی چیزوں کے کچھ نہیں ملا۔ 60 ہزار سے زائد بچے صرف کابل میں جبری مشقت تلے دبے ہوئے ہیں، یہ وہ بچے ہیں جو دوسرے جنگ زدہ علاقوں سے جان بچا کر یہاں آئے ہیں۔

امریکی حکومت کے ایک نگران ادارے کی رپورٹ کے مطابق امریکی حکومت نے 2001ء سے اب تک افغانستان کی تعمیرِ نو کے لیے 55 بلین ڈالر کی رقم دی ہے جس کا کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں گئی اور کن کن مصارف میں خرچ ہوئی، امریکی ایجنسیوں سے رقم کس نے وصول کی۔ کابل میں بی بی سی کے نامہ نگار کا کہنا ہے کہ اس رقم کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ جنگ زدہ افغانستان میں تین عشروں سے تباہ کاری کا دور دورہ ہے مگر اس کے باوجود آبادی کے بڑھنے کی رفتار برقرار ہے۔ اگرچہ 1979ء سے اب تک بیس لاکھ سے زائد افراد جنگوں کی نذر ہو چکے ہیں جبکہ پچاس لاکھ سے زیادہ نفوس دوسرے ملکوں میں بسے ہوئے ہیں، اس کے باجود افغانستان کی آبادی تیس سال پہلے کی بہ نسبت دوگنا ہو چکی ہے جن میں زیادہ تعداد بچوں اور نوجوانوں کی ہے۔ مگر یہ نسل نو زندگی کی بنیادی سہولتوں سے قطعی محروم ہے جس کی تمام ذمہ داری ان طاقتوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے افغانستان کو اپنے مفادات کی خاطر جنگ کے الاؤ میں جھونک رکھا ہے۔

مآخذ و مراجع

- ...... ہفت روزہ ضربِ مؤمن، جلد 15
- ...... ہفت روزہ تکبیر، فرائڈے اسپیشل، غازی: جلد 2011ء
- ...... قومی اخبارات۔ امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور ہفت روزہ جرائد 2011ء
- ...... طالبان کی ویب سائٹ (http://shahamat.info)
- ...... روزنامہ اسلام کراچی 2011ء
- ...... ذاتی یادداشتیں
- ...... زبانی روایات

تینتالیسواں باب

افغانستان کا حال و مستقبل

مسلمان عالمی طاقتوں کے مقابلے میں افغانستان کو اپنی آخری اُمید یقین کر کے اس ملک سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ خصوصاً پاکستان اور افغانستان کے مابین اسلامی اخوت و مروت کا جو رشتہ قائم ہے، اسے منقطع کرنا ناممکن ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے حکومتوں کی پالیسیاں بدل جائیں اور حکمران اپنے ذاتی مفادات کے لیے اسلامی تعلیمات کو نظر انداز کر کے بھائی چارے کی جگہ عداوت کی چنگاریوں کو ہوا دینے لگیں مگر دونوں ملکوں کے عوام اسلام سے والہانہ تعلق اور استعمار سے شدید نفرت کی جو مشترک اقدار رکھتے ہیں، ان کے ہوتے ہوئے ان کے مابین بیگانگی کی دیواریں حائل نہیں کی جا سکتیں۔

گزشتہ ایک عشرے سے افغانستان کے چپے چپے پر عزم و ہمت اور ایثار و قربانی کی حیرت انگیز مثالیں جنم لے رہی ہیں جن سے حملہ آور اقوام کے حوصلے پست ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت امریکا طالبان کو جنگ کے ذریعے شکست دینے سے مایوس ہو چکا ہے اور کسی بھی طرح مذاکرات کر کے واپسی کا راستہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اقوام متحدہ سے لے کر حکومت پاکستان اور سعودی عرب تک ہر وہ ملک، ادارہ یا فرد جو طالبان سے مذاکرات میں تعاون کر سکتا، اس وقت امریکا کی مجبوری بن چکا ہے۔

امریکا کی انخلاء سے قبل کی منصوبہ بندیاں: سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مذاکرات کا ڈول ڈالا جا رہا ہے تو طالبان امریکا سے مذاکرات ہونے کا انکار کیوں کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے طالبان کے امریکا سے براہ راست مذاکرات ہرگز نہیں ہو رہے بلکہ کرزئی سرکار اس کا راگ الاپ رہی ہے اور بعض سابق طالبان کرزئی کے توسط سے کچھ بات چیت کر رہے ہیں۔ مگر ان خبروں کو طالبان کی اصل قیادت کی مذاکرات میں دلچسپی کے نام سے مشہور کیا جا رہا ہے تا کہ طالبان کے حامی ہزاروں نوجوان مذاکرات کا حتمی رخ سامنے آنے تک جنگ سے احتراز کرنے لگیں اور یوں امریکا کو میدان جنگ میں سانس لینے کا موقع مل جائے اور اس کے اکھڑتے ہوئے قدم جم جائیں۔

طالبان سے موجودہ صورتحال میں امریکا کی بات چیت بہت ہی مشکل ہے۔اس میں سب سے دشوار مرحلہ غیر ملکی مجاہدین خصوصاً عرب اور القاعدہ کے ارکان کے مستقبل کا ہے جنہیں امریکا ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کا مجرم قرار دیتا ہے۔امریکا انہی کو پناہ دینے کا الزام لگا کر افغانستان پر حملہ آور ہوا تھا اور طالبان نے اپنی روایتی مہمان نوازی اور اسلامی اصولوں کی خاطر انہیں امریکا کے حوالے کرنے سے انکار کیا تھا۔ اب بھی طالبان امریکا کو ایسی کوئی یقین دہانی کرانے کے لیے تیار نہیں کہ غیر ملکی افواج کے انخلاء کے بعد القاعدہ اور دوسرے غیر ملکی مجاہدین کو افغانستان میں پناہ گاہیں فراہم نہیں کی جائیں گی جب کہ امریکا ہر قیمت پر یہ یقین دہانی ضرور چاہتا ہے۔اس یقین دہانی کے بغیر اس کی واپسی کھلی شکست کے مترادف ہوگی اور سپر پاور کا صفر پاور ہونا سب عیاں ہو جائے گا۔امریکا کی آخری کوشش یہی ہے کہ کسی طرح خود کو اس کھلی شکست کے تاثر سے بچالے۔

امریکا جس انخلاء کا اعلان کر رہا ہے اس سے اس کی یہ مراد ہرگز نہیں کہ وہ آنا فانا اپنی افواج کو بالکل نکال لے جائے گا اور افغانستان کے معاملات سے یکسر لاتعلق ہو جائے گا۔ایسا نہیں ہے بلکہ امریکا عراق کی طرز پر افغانستان کا کنٹرول علاقائی نمائندوں کی ایک وسیع البنیاد حکومت کو جس میں کچھ سابق طالبان بھی شامل ہوں، دے کر اپنی افواج کو چند بڑی چھاؤنیوں میں محصور کرلے گا جن میں سے ہر چھاؤنی میں کم از کم دس پندرہ ہزار فوج کے طویل عرصے تک قیام کے مکمل اور محفوظ ترین انتظامات ہوں گے، حتیٰ کہ طیاروں کے لیے زیرِ زمین رن وے بھی بنالیے گئے ہیں۔یہ فوج کسی شہر میں تعینات نہیں ہوگی، ملکی انتظام مکمل طور پر مقامی فورسز اور پولیس کے پاس ہوگا مگر ان اڈوں کی موجودگی سے امریکا افغانستان، پاکستان، ایران، روس اور چین پر اپنا رعب طاری رکھے گا۔یہ تو امریکا کے منصوبے ہیں، باقی ہوگا وہی جو اللہ کو منظور ہوا۔اس کی جس نصرت نے امریکا کے سابقہ منصوبوں پر پانی پھیرا ہے، وہ اب بھی اہلِ حق کے ساتھ ہے۔

مذاکرات اور پاکستان کا کردار: امریکا کی مسلسل ناکامی اور طالبان کی میدان جنگ میں بالادستی خوش آیند ہے اور اس سے ہم اُمید کر سکتے ہیں کہ مستقبل قریب میں افغانستان استعماری طاقتوں کی گرفت سے آزاد ہو کر امن وامان اور ترقی وخوشحالی کی راہ پر چل نکلے گا، مگر تاریخ کے ہر موڑ کی طرح یہ موڑ بھی اس دور کے اربابِ حل وعقد سے نہایت حزم واحتیاط اور دوراندیشی کا مطالبہ کرتا ہے۔اس وقت صورتِ حال کچھ ایسی ہے کہ افغانستان کے مسئلے میں دخیل تمام فیصلہ کن عناصر جن میں طالبان اور پاکستان سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، ایک تنے ہوئے رسے پر چل رہے ہیں، جسے عبور کرنے میں چند قدم کا فاصلہ رہ گیا ہے۔اگر ان چند قدموں کو احتیاط سے طے کرلیا گیا تو اب تک کی تمام کاوشوں اور

قربانیوں کا حاصل منزلِ مراد کی شکل میں مل جائے گا، لیکن خدانخواستہ اگر یہ آخری چند قدم پوری ہوش مندی سے طے نہ کیے گئے تو خطرہ ہے کشتی ساحل پر ڈوبنے کا المناک منظر نہ دیکھنا پڑ جائے۔

الحمد للہ! ہمیں میدانِ جنگ میں غیور طالبان کی مکمل فتح اور استعماری طاقتوں کی اس ملک سے جلد واپسی کا اتنا ہی یقین ہے جتنا کل کا سورج طلوع ہونے کا، مگر افغانستان کی تاریخ خصوصاً گزشتہ 20 سال کے واقعات کے پیشِ نظر ہمیں کسی خوش فہمی میں بھی مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ افغانستان کے حالات سے دلچسپی رکھنے والے اکثر دوست یہ تصور رکھتے ہیں کہ امریکا کی واپسی کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے طالبان کا وہ سنہرا دور اس آن بان کے ساتھ واپس آجائے گا جو 1996ء میں فتح کابل سے لے کر امارتِ اسلامیہ کے سقوط تک ان گنت نگاہوں کو تسکین اور قلوب کو روشنی دیتا رہا۔

میں اس سے تو اتفاق کرتا ہوں کہ ان شاء اللہ افغانستان میں ایک آزاد اور آئیڈیل اسلامی حکومت ضرور قائم ہوگی مگر یہ توقع عجلت پسندانہ ہے کہ یہ منزل آناً فاناً حاصل ہو جائے گی۔ حقائق اشارہ کناں ہیں کہ طالبان اور افغانستان میں سرگرم تمام استعمار مخالف اور اسلام پسند عناصر کو اس کے لیے ایک بار پھر سفر کرنا ہوگا۔ اگر حکمتِ عملی درست، منصوبہ بندی برمحل اور باہمی تنظیم پائیدار رہی تو کوئی بعید نہیں کہ یہ سفر مختصر ثابت ہو، لیکن اگر خدانخواستہ کسی بھی موقع پر عاقبت نااندیشی کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا گیا اور باہمی اعتماد کی گرہیں کھل گئیں تو شدید خدشہ ہے کہ افغانستان 1992ء جیسے حالات کا شکار نہ ہو جائے۔

امریکا بھی اس بات کو سمجھتا ہے اس لیے اس کی پوری کوشش ہے کہ جاتے جاتے افغان مزاحمت کاروں میں پھوٹ ڈال دے۔ اس کے علاوہ تقسیم افغانستان کی کوششیں بھی جاری ہیں، جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اگر طالبان کے ساتھ امریکا کے مذاکرات کی کوئی صورت نہ نکلی تو امریکا انخلاء سے قبل شمالی افغانستان کو ایک الگ مملکت بنانے کی پوری کوشش کرے گا جسے ہنگامی بنیاد پر اقوام متحدہ سے منظور دلوادی جائے گی۔ اس سلسلے میں شمالی اتحاد کے کئی رہنما امریکا سے متفق ہیں۔ ظاہر ہے کہ شمالی افغانستان کی یہ الگ مملکت مشرقی افغانستان میں سرگرم طالبان کے لیے ایک مستقل دردِ سر بنی رہے گی۔ خطرہ ہے کہ ایسے واقعات آخری بازی میں طالبان کی کامیابی کا وزن کم نہ کر دیں۔ تادمِ تحریر طالبان کے امریکا سے براہِ راست مذاکرات شروع نہیں ہوئے البتہ امریکا نے اس بارے میں پہلی بار پاکستان کا کردار تسلیم کر لیا ہے جس کی وجہ سے پاکستان نے ملا برادر سمیت متعدد گرفتار طالبان رہنماؤں کو بڑی خاموشی سے رہا کر دیا ہے۔ حکومتِ پاکستان کا کہنا ہے کہ اسے نظر انداز کر کے افغانستان میں قیامِ امن کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ ایک ملک کا نہیں، پورے خطے کا مسئلہ ہے۔ امریکا نے پاکستان کے

اس موقف کو مان لیا ہے اور اسی بنیاد پر پاکستان، افغانستان میں ایک ذمہ دارانہ کردار ادا کرنے کا موقع ملنے کی یقین دہانی کے ساتھ ساتھ کشمیر کے حوالے سے بھی امریکا سے منصفانہ کردار ادا کرنے کی توقع رکھتا ہے، تاہم امریکا افغانستان اور کشمیر دونوں مسئلوں میں بھارت کی خواہشات اور توقعات کو بھی مدِنظر رکھے ہوئے ہے اس لیے پاکستان کو کوئی پختہ یقین دہانی نہیں کرائی جارہی۔ یہ ایک تاریخی اور زمینی حقیقت ہے کہ بڑی سے بڑی جنگ کا اختتام بھی مذاکرات پر ہوتا ہے۔ طالبان بھی اس حقیقت کو بخوبی سمجھتے ہیں اسی لیے وہ مذاکرات کو کلی طور پر مسترد نہیں کرتے، مگران کا مطالبہ یہ ہے کہ پہلے امریکا اپنے اتحادیوں کے ساتھ غیر مشروط طور پر انخلاء کے لیے تیار ہوجائے۔ طالبان کا کہنا ہے کہ وہ صلح پر تب ہی غور کریں گے جب غیر ملکی افواج انخلاء شروع کردیں گی۔ طالبان کا یہ مطالبہ درست ہے اور آج نہیں تو کل امریکا اور اس کے اتحادیوں کو مذاکرات کی میز پر آنا پڑے گا مگر اس سے قبل امریکا کی پوری کوشش ہے کہ طالبان کے موقف کو اتنا نرم کردے کہ امریکا کی واپسی، شکستِ فاش محسوس نہ ہو۔

یہاں صورتِ حال کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ افغانستان میں برسرِ پیکار بعض گروپ مذاکرات کے اس عمل سے پاکستان کو دور رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے پاکستان مذاکرات کے عمل کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرے گا اور یوں افغانستان کے مفادات محدود ہوسکتے ہیں مگر افغانستان کی گزشتہ 30 برس کی تاریخ بتاتی ہے کہ افغانستان اور پاکستان ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ ان کے مفادات بھی ایک ہیں اور نقصان بھی۔

اگر حکمران اور حکومتیں دونوں ملکوں کے مفادات کو الگ الگ بھی کرلیں تب بھی زمینی حقائق وہی رہیں گے اور ایسی ہر پالیسی جس کی بنیاد ان دونوں ملکوں کی یگانگت، اتحاد اور اتفاق کے خلاف ہو، درحقیقت اپنے پاؤں پر کلہاڑا مارنے کے مترادف ہوگی۔ ایسی پالیسی اگر کل پاکستان کے ایک فوجی آمر نے ملک پر مسلط کی تھی تو بھی غلط تھی جس کے نقصانات سب پر عیاں ہیں اور اگر ایسی کوئی پالیسی افغانستان کی کوئی آیندہ حکومت تشکیل دیتی ہے تب بھی وہ خودکشی کے مترادف ہوگی۔ دونوں ملکوں کے اربابِ حل وعقد، سیاست دانوں اور عسکری قائدین کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ عالم اسلام میں کم ازکم ان دونوں ملکوں کی موت وحیات اور فنا وبقا مشترک ہے۔ ان میں سے کسی ایک کی تباہی دونوں کی تباہی ہے۔ کسی ایک کی شکست دونوں کی شکست ہے۔

پاکستان کی شرقاً غرباً جغرافیائی تنگی اس کی سب سے بڑی عسکری کمزوری ہے جسے دور کرنے کے لیے اسے پشت پر افغانستان کا وسیع میدان درکار ہے۔ ہمارا وطن دنیا کے ان ممالک میں سے ایک ہے جن کا

کوئی صوبہ وسط میں واقع نہیں۔ تمام صوبے کسی نہ کسی سرحد پر واقع ہیں۔ پاکستان کی سرحدوں پر واقع ملکوں میں افغانستان ہی ہے جس پر زیادہ بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کو بھارتی عفریت سے حفاظت کے لیے ہمہ وقت مشرقی سرحدوں پر توجہ مرکوز رکھنا پڑتی ہے جس کے لیے مغربی سرحدوں پر ایک دوست ملک کا سایہ ہونا ضروری ہے۔

پاکستان کے دو صوبے سرحد اور بلوچستان اور ان کے ساتھ ملحقہ قبائلی علاقے، افغانستان کے ساتھ گہرا نسلی تعلق رکھتے ہیں۔ کسی سرحد کے ذریعے ان کے رشتے ناتے منقطع کرنا محال ہے۔ اس سے بڑھ کر دونوں ملکوں کے کروڑوں عوام کے مابین اسلام کا اٹوٹ رشتہ ہے۔ دونوں ملکوں کے عوام کی اکثریت حنفی اہل سنت ہے۔ ان کے دینی مدارس کے لاکھوں فضلا باہمی استادی شاگردی کا مقدس تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں ملکوں کی تجارت ایک دوسرے پر منحصر ہے۔ پاکستان کے لیے وسط ایشیا کے تمام راستے افغانستان سے گزر کر جاتے ہیں اور افغانستان کو بین الاقوامی تجارت کے لیے پاکستان کی بندرگاہیں استعمال کیے بغیر چارہ کار نہیں۔ یہ ہیں وہ حقائق جنہیں پاکستان نے 1980ء کے عشرے میں مدنظر رکھا اور افغانستان کے ساتھ روسی استعمار کے خلاف جنگ میں بھرپور کردار ادا کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں ملک کمیونزم کی غلامی سے بچ گئے اور دنیا کی ایک سپر پاور کا جنازہ نکل گیا۔

افغانستان کے مسلمان اس تاریخ کو کبھی نہیں بھلا سکتے۔ اگرچہ پاکستان کے گزشتہ فوجی آمر نے ان قربانیوں پر پانی پھیرنے کی پوری کوشش کی، مگر حقائق کو بدلا نہیں جا سکتا۔ افغانوں اور افغانستان کے لیے آج بھی پاکستان اتنا ہی اہم ہے جتنا کل تھا۔

امریکا چلا گیا تب بھی افغانستان کے چاروں طرف دشمنوں کا گھیراؤ رہے گا۔ حنفی افغان، ایران پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ تاجکستان اور ازبکستان کی اشتراکیت پسند حکومتیں روس کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے ان کے لیے خطرہ بن سکتی ہیں۔ چین بھی ایک غیر مسلم عالمی طاقت ہے جو وسط ایشیا میں کسی بھی اسلامی طاقت کا اُبھرنا خطرناک سمجھتا ہے اور ماضی قریب میں افغانستان کے اسلام پسندوں کے خلاف شنگھائی 5 کی شکل میں متحرک رہا ہے۔ ایسے میں افغان کے مستقبل کی کسی بھی حکومت کو پاکستان کے بغیر چارہ کار نہیں۔ اگر وہ پاکستان کو دوست کے طور پر قبول نہیں کرتی تو اسے لامحالہ بھارت سے دوستی گانٹھنا پڑے گی جس کی فطرت ''بغل میں چھری منہ میں رام رام'' ہے۔

<u>مستقبل کے خطرات، گریٹ گیم:</u> 2000ء میں امریکا کا گریٹ گیم وسط ایشیا کے معدنی وسائل پر قبضے، طالبان حکومت کے خاتمے اور چین، پاکستان اور روس کو دباؤ میں رکھنے سے متعلق تھا۔ 2011ء

میں گریٹ گیم کے مہرے کچھ آگے پیچھے ہو گئے مگر اہداف وہی ہیں۔

اب گریٹ گیم کی بساط کچھ اس طرح بچھی نظر آتی ہے کہ

- امریکا خطے میں اپنی افواج اور عسکری مہمات میں کمی کے باوجود اپنے اڈے یہاں باقی رکھے گا۔
- اس سلسلے میں بھارت اس کا سب سے بڑا معاون ہوگا۔
- امریکا بھارت کو پاکستان اور چین کے مقابلے میں مضبوط کرے گا۔ افغانستان میں بھی بھارت اور امریکا ایک دوسرے کے مددگار رہوں گے۔
- امریکا افغانستان میں بھارت کے اثر و رسوخ میں اضافے کی حمایت کرے گا اور پاکستان کو یہاں کی سیاست میں بے اثر کر دے گا۔
- چونکہ امریکا کو چین کے سپر پاور بننے اور روس کے دوبارہ طاقت پکڑنے اور اس خطے میں بالادستی حاصل کرنے کا خطرہ ہے اس لیے وہ افغان اڈوں کے ذریعے اس دونوں کو بھی لگام دینے کی کوشش کرے گا۔
- روس اور چین بہرحال بڑے ممالک ہیں اس لیے وہ اپنے مفادات کو آسانی سے ضایع نہیں ہونے دیں گے، ان کی طرف سے اپنے مفادات کے دفاع کی کوششوں سے اس خطے میں ایک نئی اکھاڑ پچھاڑ شروع ہو جائے گی۔
- ایران خاموش تماشائی نہیں بنا رہے گا...... بلکہ اپنی تاریخ اور ماضی کی روایات کے عین مطابق وہ غالب آنے والے فریق کا ساتھی بن کر افغانستان کی سیاست میں دخیل رہے گا۔ اس بات کا قوی امکان ہے وہ ایک بار پھر امریکا کا اتحادی بن جائے...... علانیہ طور پر نہ سہی، خفیہ طور پر ہی۔
- گریٹ گیم کا سب سے بڑا نقصان پاکستان کو ہوگا...... افغانستان سے متعلقہ اس کے مفادات شدید خطرے میں پڑ جائیں گے...... وہاں بھارت کا اثر و رسوخ پاکستان کو دوطرفہ خطرات میں دھکیل دے گا...... اور پاکستان خطے میں بے یار و مددگار رہ جائے گا۔
- جہاں تک افغانستان کا تعلق ہے، خطرہ ہے کہ یہاں بدامنی کا ایک نیا دور شروع ہوگا جو شاید روس کی واپسی کے بعد والے سالوں سے مختلف نہ ہو۔
- یہ تمام خدشات غلط ثابت ہو سکتے ہیں...... بشرطیکہ افغان طالبان کی جدوجہد جاری رہے اور وہ جارح افواج کو ملک سے مکمل طور پر بے دخل کرنے اور اپنی آزاد و خودمختار اسلامی حکومت بنانے میں کامیاب ہو جائیں، پاکستان اور افغانستان میں ازسرِنو برادرانہ تعلقات کا آغاز ہو...... اور

بھارتی عزائم کے سامنے یہ دونوں ملک مشترکہ پالیسی اپنائیں۔ خدا کرے کہ وہ دن جلد آئے اور افغان عوام ایک بار پھر اپنے شاندار ماضی کی تصویر ایک حقیقت کی شکل میں اپنے سامنے دیکھیں۔

ان کلمات کا خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ کے اس انتہائی نازک موڑ پر افغانستان کی فیصلہ کن قوتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ پاکستان کو ساتھ لے کر چلیں۔ اسی طرح پاکستان کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسئلہ افغانستان میں امریکا کے مفادات کی بجائے علاقائی تحفظات کا خیال رکھے۔

مذاکرات کا وہ وقت عن قریب شروع ہونے کو ہے جس میں نہ صرف افغانستان بلکہ اس خطے کے مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔ ایسے میں پاکستان جیسے پڑوسی اسلامی ملک کی حمایت طالبان کے لیے مفید ہوگی نہ کہ مضر۔ مگر یہ بھی شرط ہے کہ حکومتِ پاکستان اس سلسلے میں مخلصانہ کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہو۔ اگر پاکستان ہی نے مخلصانہ کردار ادا کرنے کی بجائے، ایجنٹ کا رول ادا کیا تو اس خطے کے مسلمانوں کو تباہی سے کوئی طاقت نہیں بچا سکے گی۔

اہلِ پاکستان کو یاد رکھنا چاہیے کہ انہیں خود افغانستان کی ضرورت ہے۔ پاکستان کی کسی بھی حکومت کے لیے (چاہے وہ اسلام پسند ہو یا لبرل) افغانستان میں کسی کمزور حکومت کا بننا، نقصان دہ ہوگا۔ تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ افغانستان میں شمالی اتحاد اور کمیونسٹوں سمیت کوئی بھی گروہ حکومت بنائے گا تو وہ پاکستان مخالف بھی ہوگی اور کمزور بھی۔ دوست اور مضبوط حکومت صرف انہی لوگوں کی ہوسکتی ہے جو اسلام پسند افغان عوام کی امیدوں کے مطابق وہاں شرعی نظام کے قیام کا بیڑا اٹھائیں جیسا کہ اس وقت طالبان کا منشور یہی ہے۔ ہمیں اُمید ہے حکومتِ پاکستان اپنی افغان پالیسی میں ان پہلوؤں کو مدنظر رکھے گی۔ ہم یہ توقع بھی کرتے ہیں کہ طالبان پاکستان دوستی کے تاثر کو قائم رکھیں گے اور ایک سابق آمر کی حماقتوں کی وجہ پاکستان اور اپنے وطن کے مفادات کو نظرانداز نہیں کریں گے۔ اگر دونوں ملکوں میں اعتماد، اتحاد اور اشتراک کا سلسلہ پروان چڑھتا رہا تو اس خطے کے مستقبل کے بارے میں باطل قوتوں کی سازشیں ہمیشہ کے لیے ناکام ہوجائیں گی۔ (ان شاء اللہ)

چوالیسواں باب

کیا افغان بنی اسرائیل ہیں؟......

افغانوں کے نسب کے بارے میں اٹھنے والے سوالات کو آج کل بڑی اہمیت دی جارہی ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں افغانستان پر برطانوی استعمار کی طرف سے مسلط کی جانے والی جنگوں کے دوران بھی اس سوال کو اچھالا گیا اور یورپین محققین نے اس پر بزعمِ خود بڑی نایاب تحقیقات بھی فرمائی ہیں جن کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ افغان بنی اسرائیل کی نسل سے ہیں۔ اس وقت یہودی لابی بھرپور کوشش کررہی ہے کہ نہ صرف افغانوں کو ان کے یہودی النسل ہونے کا یقین دلا دیا جائے بلکہ انہیں یہودی مذہب بھی قبول کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ اس کی تفصیل آگے چل کر عرض کی جائے گی۔ پہلے ہم مغربی دانشوروں اور یہودی لابی کے ان دلائل کا جائزہ لیتے ہیں جن کے بل بوتے پر افغانوں کو بنی اسرائیل ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس اس دعوے کی کوئی مضبوط دلیل نہیں۔

<u>یہ روایت کب اور کیسے مشہور ہوئی:</u> میرے علم کے مطابق گیارہویں صدی ہجری، سترہویں صدی عیسوی میں سب سے پہلے آخوند رویزہ نامی ایک شخص نے ''تذکرۃ الابرار والاشرار'' نامی اپنی کتاب میں افغانوں کا نسب بیان کرتے ہوئے یہ ''انکشاف'' کیا تھا کہ افغان حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں کیوں کہ بنی اسرائیل کا ایک بڑا جدامجد طالوت تھا جس کے ایک بیٹے کا نام ''افغان'' تھا۔ افغان اس کی اولاد ہیں۔

اس اجمال کے بعد افغانوں کے نسب کے بارے میں ایک اور بے سند مگر مفصل روایت مشہور ہوگئی، جس کا لب لباب درج ذیل ہے:

''بنی اسرائیل کے بادشاہ طالوت کے ایک بیٹے کا نام ''افغنہ'' تھا جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں حکومت کے نظم ونسق کا ذمہ دار تھا۔ افغنہ کی اولاد شام میں سکونت پذیر ہوکر خوب پھلی پھولی۔ جب بخت نصر نے بیت المقدس پر قبضہ کیا تو افغنہ کی اولاد کو غور، کابل، فیروز کوہ اور قندھار

کے آس پاس دھکیل دیا۔ جب حضرت خالد بن ولید q نے اسلام قبول کیا تو ان لوگوں کو مکتوب بھیج کر اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ افغنہ کی اولاد میں سے سب سے بڑا سردار قیس تھا۔ جس کا سلسلہ نسب طالوت سے ہو کر ابراہیم علیہ السلام تک پہنچتا تھا۔ وہ قبیلے کے چند سرکردہ افراد کو لے کر حضور } کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضور } نے نام پوچھا۔ بنی افغان کے راہنما نے بتایا کہ اس کا نام قیس ہے۔ حضور } نے جواب دیا: ''قیس عبرانی نام ہے چونکہ ہم عرب ہیں، اس لیے آج کے بعد آپ کا عربی نام عبدالرشید ہوگا۔'' عبدالرشید کئی جنگوں میں حضرت خالد بن ولید q کے ہمراہ بہادری سے لڑا اور جب خالد q نے حضور } کو ان کی بہادری کے بارے میں بتایا تو حضور } نے عبدالرشید کو ''بتان'' کا لقب دیا، یہی لفظ بعد میں ''پٹھان'' بن گیا۔ بتان کشتی کے اس شہتیر کو کہتے ہیں جس پر کشتی کا انحصار ہوتا ہے۔ حضور } نے عبدالرشید کو بعد میں اپنے ہاں بلایا۔ اس کے حق میں دُعا مانگی اور ایک صحابی اور کئی انصار کے ساتھ دوبارہ غور روانہ کیا تاکہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں۔''

یہ دوسری روایت ہمیں سب سے پہلے نعمت اللہ ہروی کی ''تاریخ خان جہانی'' میں ملتی ہے جو کہ 1022ھ (1613ء) میں لکھی گئی ہے۔ مؤلف اس حدیث سے استدلال کر کے بتاتا ہے کہ تمام افغان قبائل بنی اسرائیل کی نسل سے ہونے کا اعزاز رکھتے ہیں، اور ان میں سے کچھ قبیلوں کو (جو قیس اور اس کے ہم وفد لوگوں کی اولاد ہیں) صحابہ رضی اللہ عنہم کی اولاد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ غرض تمام علمی ذخائر میں اگر افغانوں کے بنی اسرائیلی ہونے کے بارے میں کچھ ملتا ہے تو وہ یہی روایت ہے۔ ہروی کے بعد بعض دیگر فارسی و پختون و ہندوستانی مؤرخین (جیسے حافظ رحمت خان روہیلہ اور قاضی عطاء اللہ خان) بھی اسے نقل کرتے چلے گئے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس میں ایک فی صد شک بھی نہیں رہتا کہ یہ روایت سراسر من گھڑت ہے۔ ظہورِ اسلام کے بعد ایک ہزار سال تک یہ روایت کہیں پڑھنے یا سننے میں نہیں آئی۔ حدیث کی کسی کتاب میں اس طویل روایت کا کوئی جزو تک نہیں ملتا۔ یہ طے ہے کہ احادیث کے متون کی تدوین کا کام تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں تکمیل کو پہنچ گیا تھا لہٰذا اس کے بعد کوئی ایسی حدیث قبول نہیں کی جاسکتی جو متونِ حدیث میں موجود نہ ہو۔ خاص طور پر ایسی حالت میں کہ راوی سند بھی بیان نہ کر رہا ہو۔ نعمت اللہ ہروی اور ان جیسے دوسرے مؤرخین نے یہ حدیث نقل کرتے ہوئے سلسلہ اسناد بیان کیا ہے نہ کسی حدیث کی کتاب کا حوالہ دیا ہے اور میں عرض کر چکا ہوں کہ اس روایت کا کوئی جزو ذخیرہ حدیث میں موجود نہیں حتیٰ کہ ضعیف اور موضوع احادیث کے ذخائر بھی اس سے خالی ہیں۔ اس کا صاف

مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث ایک ہزار سال بعد بعض مخصوص مقاصد کے تحت گھڑی گئی ہے۔لہٰذا اسے کسی درجے میں بھی قبول کرنا ممکن نہیں۔

ممکن ہے بعض قارئین خیال کریں کہ کسی چیز کو تاریخ کی حد تک ثابت کرنے کے لیے اس کا حدیث کے معیار پر پورا اُترنا ضروری نہیں اس لیے اس روایت کو حدیث نہ سہی، صرف تاریخ سمجھ کر مان لیا جائے تو کیا حرج ہے۔مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مؤرخین کے ہاں بھی کسی روایت کو تاریخی اعتبار سے قبول کرنے کے لیے اس کا کسی نہ کسی درجے میں ثبوت درکار ہوتا ہے۔کسی حدیث کو تاریخی مواد کے لیے استعمال کرنے کے لیے یہ تو ضروری نہیں کہ وہ صحیح یا حسن کے درجے کی ہو، کیوں کہ تاریخ میں کوئی شرعی حکم ثابت نہیں کیا جاتا بلکہ صرف واقعہ نقل کرنا مقصد ہوتا ہے۔مگر واقعہ کے ثبوت کے لیے بھی حدیث کسی درجے میں تو ثابت ہونی چاہیے چاہے ضعیف ہو۔اگر کوئی حدیث ثابت ہی نہ ہو بلکہ موضوع (من گھڑت) ہو تو اصولِ تاریخ کے مطابق اسے تاریخ میں بھی قبول نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ مؤرخ کا کام حتی الامکان سچے واقعات کو مرتب کرنا ہے نہ کہ جھوٹ کے پلندے تیار کرنا۔دیانت دار مؤرخ ہمیشہ سچائی کو تلاش کر کے نقل کرنے اور بے سند و غیر معتبر چیزوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس کا پیش کردہ مواد مستند اور معتبر رہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ نہ صرف محدثین و اصحابِ سیر بلکہ گیارہویں صدی ہجری سے قبل کے کسی مؤرخ نے بھی اس روایت کو ذکر نہیں کیا۔ہم جانتے ہیں کہ دورِ نبوت، دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور ماقبل از اسلام کے ادوار کا جو بھی تاریخی ریکارڈ تھا (چاہے وہ ثبوت کے لحاظ سے پختہ تھا یا کمزور) وہ ہجرت کے تین چار سو سال بعد تک جمع اور مرتب ہو چکا تھا اور آٹھویں صدی ہجری تک محقق مؤرخین اس میں سے کھرے اور کھوٹے کو الگ الگ بھی کر چکے تھے۔اس تمام اسلامی تاریخی ریکارڈ میں مذکورہ روایت یا اس روایت کے کسی جزو کا سرے سے کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔اس میں ذکر کردہ نام عبدالرشید، قیس (قیس)، بتان وغیرہ رجال، انساب، تاریخ اور طبقات کی کسی کتاب میں مذکور نہیں۔یہی نہیں آپ شعر و ادب او[ر] غرناموں تک کو چھان ماریں، دنیائے اسلام کا ہزار سالہ کتب خانہ آپ کو اس روایت سے بالکل خالی ملے گا جو نعمت اللہ ہروی صاحب اور ان کے معاصر مؤرخین نقل کر گئے ہیں۔

رہی یہ بات کہ پھر مؤرخ ہروی اور ان کے بعد کچھ حضرات نے اس روایت کو کیوں نقل کیا۔اس بارے میں ہم وسعت ظرفی سے کام لیں تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ شاید ابتداء میں نعمت اللہ ہروی جیسے ایک دو مؤرخین سے تسامح ہو گیا اور وہ اس روایت کو حسنِ ظن کی بناء پر نقل کر گئے۔پھر بعد میں آنے والے بعض افغان علماء اور دانشور انہی حضرات پر اعتماد کر کے اسے قبول کرتے گئے۔

اس روایت کی قبولیت میں نفسِ انسانی کی کچھ کمزوریوں کا دخل بھی ہو سکتا ہے۔ دراصل یہ بات کسی بھی افغان بلکہ ہر مسلمان کے لیے پرکشش ہے کہ اس کا یا اس کی قوم کے بعض قبیلوں کا سلسلہ نسب کسی صحابی سے ثابت ہو جائے۔ غالباً اسی لیے بعض افغان مؤرخین روایت کی سند اور اس کے مندرجات کی ناپختگی کو نظر انداز کر گئے۔

حق بہرحال حق ہوتا ہے جسے قبول کرنا چاہیے۔ اگر واقعی کسی پختہ روایت سے افغانوں کا بنی اسرائیل اور اولادِ صحابہ رضی اللہ عنہم ہونا ثابت ہو جائے تو اسے ایک تاریخی سچائی ماننے میں کوئی حرج نہیں، مگر حقیقت یہ ہے جس طرح یہ روایت حدیث کے معیار کے لحاظ سے کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اسی طرح تاریخی لحاظ سے بھی اسے کوئی مؤرخ قبول نہیں کر سکتا۔

یہاں تک تو بات ثبوت اور سند کی تھی جس سے اس روایت کا بالکل بے اصل ہونا واضح ہو چکا ہے۔ اس سے ہٹ کر اب اس روایت کو درایت (عقل وفہم) کی روشنی میں دیکھیں تو آپ کو کسی تردّد کے بغیر اس کا خود ساختہ ہونا معلوم ہو جائے گا۔ روایت میں کئی چیزیں خود اس کا خانہ ساز ہونا واضح کر رہی ہیں۔ ذرا نمبر وار غور فرمائیے۔

1. یہ روایت بتاتی ہے کہ بخت نصر نے افغنہ کی اولاد کو غور، کابل اور قندھار (یعنی موجودہ افغانستان) کی طرف دھکیل دیا تھا۔

یہ بات تمام تواریخ کے خلاف ہے کیونکہ بنی اسرائیل کی تاریخ سے متعلقہ روایات اس بارے میں واضح ہیں کہ بخت نصر کے ظلم کا شکار ہونے والے دو ہی قسم کے لوگ تھے۔ بہت سے قتل کر دیے گئے اور باقی ماندہ افراد جن کی مقدار اکثر تواریخ میں 70 ہزار بیان کی گئی ہے، بابل لے جائے گئے تھے۔ وہاں وہ ایک مدت تک جلاوطنی کی زندگی گزارتے رہے اور آخر کار جب فارس کا بادشاہ بابل پر غالب آیا تو انہیں نجات نصیب ہوئی۔

اس موضوع سے متعلق تمام ذخیرۂ روایات میں کہیں یہ ذکر نہیں کہ بخت نصر کے مظالم کا شکار ہونے والے کچھ اسرائیلی غور یا دیگر افغان علاقوں کی طرف دھکیلے گئے ہوں۔

یہ بات عقلاً بھی بعید ہے کہ بخت نصر کی قید سے نجات پانے کے بعد وہ اپنے آبائی علاقے فلسطین کے بجائے غور، کابل اور قندھار کی طرف چلے گئے ہوں کیونکہ اپنے آبائی علاقے میں واپس جانے کا موقع ملنے کے بعد ان کے لیے خراسان میں کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ فلسطین بابل سے نسبتاً قریب بھی تھا اور سرسبز وشاداب ومتمدن بھی۔ سب سے بڑھ کر ان کا وطنِ مالوف تھا۔ اس کے برعکس خراسان کی

مسافت ہی تھکا دینے والی اور بعید تھی۔ وہاں ویسا تمدن بھی ہرگز نہ تھا جس کے یہودی عادی تھے۔ پھر ایک اجنبی قوم اور اجنبی ملک کو وہ اپنے وطن پر کیسے ترجیح دے سکتے تھے؟

(۲) اس روایت میں دعویٰ کیا گیا ہے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کرنے کے بعد ان لوگوں کو مکتوب بھیج کر اسلام لانے کی دعوت دی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ افغنہ کی اولاد کے ساتھ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پہلے سے گہرے دوستانہ تعلقات تھے تبھی انہوں نے سارے عرب قبائل کو چھوڑ کر ہزاروں میل کے فاصلے پر آباد ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور پھر ان کا خط اولادِ افغنہ کے ہاں اتنا قابلِ تعظیم اور مؤثر ثابت ہوا کہ وہ لوگ فوراً اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے اور ان کا ایک وفد مدینہ حاضر ہو گیا۔

مگر سیرتِ نبویہ، سیر صحابہ رضی اللہ عنہم اور تاریخ کی کسی کتاب سے اشارہ تک نہیں ملتا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ یا قریش کے رؤساء کا اُس دور میں خراسان (افغانستان) کے لوگوں سے ایسا کوئی دوستانہ تعلق ہو۔ اہلِ عرب کے تجارتی تعلقات بھی زیادہ سے زیادہ عراق عجم، فارس یا جنوبی ہند کے ساحل تک محدود تھے۔ ایسے میں ایک اکیلے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے تعلقات ہزاروں میل دور آباد ایک گمنام قوم سے کیسے استوار ہو گئے؟

(۳) یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے راجح قول کے مطابق صفر سن 8 ہجری میں اسلام قبول کیا تھا۔ (دیکھیے البدایۃ والنہایۃ جلد 6، ص 404، مطبوعہ دار ھجر) اگر انہوں نے اسلام لاتے ہی خط لکھ دیا ہو تب بھی اس دور میں مدینہ سے غور، کابل یا قندھار بھیجے جانے والے کسی خط کے جواب میں چلنے والا قافلہ ایک ڈیڑھ سال سے پہلے نہیں آسکتا تھا۔ کیونکہ وہ اونٹ، گھوڑے اور خچروں کا دور تھا پس حضرت خالد کا خط پڑھ کر کوئی خراسانی وفد فوراً ہی عرب کی طرف روانہ ہو جاتا تب بھی وہ 9 ہجری سے پہلے نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب اسلام قبول کرنے کے لیے وفود کی آمد ہونے لگی تھی، اس سال کو عام الوفود کا نام دیا گیا تھا، ادھر دربارِ رسالت میں پل پل کے حالات کو یاد کرنے والے صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت موجود تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک بات محفوظ کی جا رہی تھی۔ خاص طور پر اسلام قبول کرنے کے لیے آنے والے وفود کے حالات کو تو بڑے اہتمام کے ساتھ ذخیرۂ حدیث وسیرت کا حصہ بنایا گیا ہے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ اتنا اہم وفد اتنے زیادہ فاصلے سے حاضر ہوتا اور دو چار صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اس کا ذکر نہ کرتے۔ لیکن آپ کتبِ سیرت میں سن 9 ھ اور 10 ھ کے تمام حالات اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی مہمات کی تفاصیل بھی کھنگال ڈالیے۔ آپ کو کہیں اولادِ افغنہ یا قیس کا ذکر نہیں ملے گا۔

(۴) روایت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ قول منسوب کرنا کہ "قیس عبرانی نام ہے" اور اس

وجہ سے نام تبدیل کر کے ''عبدالرشید'' رکھ دینا انتہائی غیر معقول ہے۔

آپ لغات میں دیکھ کر معلوم کر سکتے ہیں ''قیس'' عبرانی نہیں، عربی لفظ ہے۔ اس کا معنیٰ ''دانت کا جڑ سے گرنا'' ہے۔ عرب میں قدیم زمانے سے یہ نام رکھا جا رہا تھا۔ جمہرۃ انساب العرب ج 1، ص: 21 میں عدی بن کعب کی والدہ حبیبہ کا نسب یوں بیان کیا گیا ہے: ''بنت بجالۃ بن سعد بن قیس''۔ اسے عبرانی کہنا روایت گھڑنے والے کی جہالت کا ثبوت ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ ''قیس'' کو اس کے معنیٰ کی وجہ سے تبدیل کر دیا جاتا مگر عربی نام کو عبرانی سمجھ کر تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بعض مصادر میں افغانوں کے جدامجد کا نام ''قیس'' آیا ہے۔ اس کا عبرانی نہ ہونا اور بھی واضح ہے، عربوں میں قیس عام نام تھا، اس لیے اسے عبرانی کہہ کر عبدالرشید سے تبدیل کرنے کی کہانی کا من گھڑت ہونا اور بھی زیادہ واضح ہے۔

پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں قیس اور قیس نامی حضرات موجود تھے۔ قیس بن عاصم رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے جن سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت موجود ہے کہ جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بیری کے پتوں سے ملے پانی سے غسل کا حکم دیا۔ (المعرفۃ والتاریخ، ص: 421، جلد 1) اسی طرح قیس بن سعد، قیس بن عاصم، قیس بن مخرمہ اور قیس بن نعمان رضی اللہ عنہم بھی مشہور صحابہ ہیں۔ (تقریب التہذیب ج 2، ص 24) اگر یہ نام غلط یا نامناسب ہوتے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں تبدیل کر دیتے۔ علاوہ ازیں ''عبدالرشید'' نام دورِ نبوت سے موجودہ دور تک عربوں میں کبھی مروج نہیں رہا۔ اگرچہ یہ عربی ضرور ہے، مگر عرب شخصیات میں آپ کو ''عبدالرشید'' نام کا کوئی آدمی مشکل سے ملے گا۔

⑨ روایت میں ذکر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرشید کو اس کی بہادری کی وجہ سے ''بتان'' کا لقب دیا۔ حالانکہ احادیث وسیرت کے پورے ذخیرے میں کہیں بھی یہ لفظ مذکور نہیں۔

اسی روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ ''بتان کشتی کے اس شہتیر کو کہتے ہیں جس پر کشتی کا انحصار ہوتا ہے یہی 'بتان' آگے چل کر پٹھان بنا۔''

اس لغوی تحقیق کا حال جاننے کے لیے پہلے آپ عربی کی تمام لغات اُٹھا کر ''بتان'' کا لفظ تلاش کریں (کیونکہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو کوئی لقب دیا ہوگا تو عربی زبان ہی میں دیا ہوگا۔ ہروی صاحب کے نزدیک بھی ''بتان'' عربی لفظ ہے، جو بگڑ کر ''پٹھان'' بن گیا)

جب آپ لفظ ''بتان'' کا کھوج لگائیں تو آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ لفظ عربی لغت میں سرے سے موجود ہی نہیں (جیسا کہ سیرت، حدیث اور عربی ادب کا پورا ریکارڈ بھی اس لفظ سے خالی ہے)۔

معلوم ہوا کہ یہ کہنا ''بتان کشتی کے اس شہتیر کو کہتے ہیں جس پر کشتی کا انحصار ہوتا ہے'' سراسر گپ بازی ہے۔ جو لفظ ہی بے اصل ہے اس کے معانی بیان کرنا کیا حیثیت رکھتا ہے؟

قارئین! یہ بات ملحوظ رکھیں کہ ہم اس سے انکار نہیں کر رہے کہ پختونوں کا جدِ امجد قیس، قیس یا عبدالرشید نامی کوئی شخص ہوگا۔ اس کے علاوہ نعمت اللہ ہروی اور دیگر پختون تاریخ نگاروں نے اپنی قوم کا جو شجرہ نسب بیان کیا ہے جو غور غشت وغیرہ سے ہو کر قیس (عبدالرشید) تک جا پہنچتا ہے، ہم اس سے بھی انکار نہیں کر رہے۔ نہ اس پر تنقید کی کوئی معقول وجہ ہمارے سامنے ہے۔ ہم تو اس جعلی روایت کی تردید کر رہے ہیں جو نہ معلوم کس نے، کیوں اور کب گھڑی ہے اور جس میں بنی اسرائیل کے کچھ گروہوں کے افغانستان میں آباد ہونے اور ان کے ایک فرد ''قیس'' کے صحابی بن کر ''بتان'' کا لقب پانے کا ذکر ہے۔ یہ روایت اور اس سے ثابت کی گئی ہر بات سراسر من گھڑت ہے جس کے شواہد تفصیلاً آپ کے سامنے آچکے ہیں۔

<u>یہ روایت کب اور کیسے مشہور ہوئی:</u> اب اصل بات سمجھنے کی یہ ہے کہ یہ جعلی روایت افغانوں میں کب اور کیسے مشہور ہوئی اور اس کی تشہیر کے اسباب کیا تھے؟ جہاں تک راقم کی تلاش و جستجو ساتھ دیتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت اگر نعمت اللہ ہروی نے خود اختراع نہیں کی تو ممکن ہے کسی معاصر داستان گو سے سنی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ افغانوں کو بنی اسرائیل قرار دینے والی روایت کے گھڑے جانے کا زمانہ نعمت اللہ ہروی کے دور سے کچھ پہلے کا ہو۔

بہرکیف! روایت جس نے اور جب بھی گھڑی ہو، اس کا فرضی ہونا یقینی ہے اور یہ بھی طے ہے کہ اس روایت اور اس سے ثابت کیے گئے دعووں کی شہرت کا زمانہ زیادہ سے زیادہ دو تین سو سال پرانا ہے۔ اس تشہیر میں سب سے بڑا حصہ ان مستشرقین کا ہے جو مغربی استعمار کے لیے اسلامی ممالک میں اقتدار کی راہیں ہموار کر رہے تھے اور اسی خاطر علمی سرگرمیوں (علمی سازشوں) میں منہمک تھے۔ اس سلسلے میں کچھ روایات تو خود گھڑی گئیں اور کچھ روایات جو نعمت اللہ ہروی کی تاریخ خان جہانی جیسی سابقہ کمزور تاریخی و ادبی کتابوں میں مل گئیں انہیں خوب شہرت دی گئی۔ ایسے غیر مستند دلائل، کمزور ترین قیاسات اور ناقابلِ التفات قرائن کو جوڑ جاڑ کر مستشرقین اور ان کے لیے کام کرنے والے مسلمان دانشوروں نے باقاعدہ ایک مہم چلا کر افغان قوم کو بنی اسرائیل مشہور کر دیا۔

شاید عام حالات میں افغان خود کو کبھی بنی اسرائیل کہلوانا پسند نہ کرتے، مگر ''بتان والی روایت'' انہیں بنی اسرائیلی ہونے کے ساتھ ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم کی اولاد بھی ثابت کر رہی تھی اس لیے بعض افغان مورخین اور فضلاء نے اس روایت کو دلچسپ اور مفیدِ مطلب سمجھ کر آگے نقل کرنا شروع کر دیا، دوسرے لفظوں میں

ایسی روایات ان کے ہاں قبول ہو گئیں اور گزشتہ ڈیڑھ صدی کے دوران افغانوں کے پڑھے لکھے طبقے کی اچھی خاصی تعداد خود کو بنی اسرائیل گمان کرنے لگی جبکہ اس بات کا حقیقت سے دور کا تعلق بھی نہیں۔

دانشورانِ فرنگ اور ان کی لگام تھامنے والے مستشرقین کس طرح افغانوں کو یہودی النسل ثابت کرنے کی کوشش کرر ہے تھے، اس کا اندازہ لگانے کے لیے چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

سر ولیم جونز نے جو کہ بنگال میں برطانیہ کی شاہی ایشین سوسائٹی کا چیئرمین تھا اپنے ایک تبصرے میں لکھا: ''اسرائیل کے دس قبیلے سرگردانی کے عالم میں ایک وطن 'ارسریت' میں چلے گئے تھے۔ فارسی زبان کی سب معتبر تاریخیں بتاتی ہیں کہ پشتون یہودی النسل ہیں اور خود افغان بھی یہی کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ کہا جاتا ہے افغانوں کے قبائل (آج بھی) یہودی ہیں۔ اگرچہ افغانوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی اصلیت اور نسب چھپانے کی بہت کوشش کی ہے۔''

سر ولیم جونز کا یہ پورا تبصرہ جو کہ ''ایشیائی تحقیقات ج: 2، ص: 67'' پر موجود ہے، جھوٹی علمیت بگھارنے کی ایک مضحکہ خیز کوشش اور افغانوں پر باطناً یہودی ہونے کی تہمت لگانے کے سوا کچھ نہیں۔ بیشتر قدیم معتبر کتبِ تاریخ افغانوں کو بنی اسرائیل قرار دینے کے ذکر سے خالی ہیں۔ ہاں تذکرۃ الابرار اور تاریخ خان جہانی (نعمت اللہ ہروی) اور اسی پائے کی چند کتب نے اس بے سند روایت کو نقل کیا ہے۔

اسی دور میں تاریخ ہند و خراسان پر ایک مستند کتاب ''آئینِ اکبری'' تحریر کی گئی جو ابوالفضل کی تصنیف ہے اور ہر دور میں ایک اہم ماخذ کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس میں افغانوں کے نسب کے بارے میں صرف یہ تحریر ہے:

> ''پشتونوں کا خیال ہے ان کا مجد امجد ''افغان'' تھا جس کے تین بیٹے سڑبن، غور غشت اور اوبتن تھے۔'' پھر ابوالفضل مشہور پختون قبائل کا ذکر کر کے لکھتا ہے کہ ان سب کا نسب انہی تین افراد سے جا ملتا ہے۔ (ص: 406، 407)

اگر پختونوں یا افغانوں کے بنی اسرائیل ہونے کی کوئی معتبر روایت ہوتی تو ابوالفضل ضرور اسے نقل کرتا۔

سر ولیم جونز کا یہ دعویٰ بھی نری گپ ہے کہ افغان خود اپنے آپ کو یہودی النسل کہتے ہیں کیونکہ سترہویں صدی عیسوی سے قبل کسی افغان مورخ، عالم یا قائد کا کوئی ایسا بیان نہیں ملتا جس میں افغانوں کی نسبت یہود کی طرف کی گئی ہو اور اس تحقیق کے تو کیا کہنے کہ اسلام لانے کے بعد افغان اپنی اصلیت اور نسب چھپانے کی کوشش کرتے رہے۔ اگر وہ واقعی یہودی النسل ہوتے تو انہیں نسب چھپانے کی کیا ضرورت تھی! یہودی کی نسل سے ہونا کوئی گناہ تو نہیں کہ اسے چھپایا جاتا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین سے

دورِ حاضر تک کتنے ہی مشاہیرِ اسلام ایسے ہیں جو یہودیت سے اسلام کی طرف آئے۔ کسی نے نسب چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اسلام میں ویسے بھی نسب تبدیل کرنا اور اپنی نسبت کسی اور قبیلے کی طرف کرنا حرام ہے، پھر افغان بھلا ایسا کیوں کرتے؟ اگر وہ بنی اسرائیلی ہوتے تو ہمیشہ اپنا نسب نمایاں رکھتے، مگر اصل بات یہ ہے کہ ان کا یہودی النسل ہونا محض ایک پروپگینڈا ہے جسے مستشرقین ہوا دیتے آئے ہیں اور ان کی نام نہاد تحقیقات کو عقیدت کی نگاہ سے پڑھ کر سینکڑوں جدید تعلیم یافتہ افغان خود کو بنی اسرائیل تصور کر بیٹھے اور اس غلط نظریے کو آگے پھیلاتے چلے گئے۔

<u>الیگزنڈر برنز کی تحقیقات</u>: ولیم جونز کی طرح ایک اور انگریز آفیسر الیگزنڈر برنس نے بھی افغانوں کو یہودی النسل قرار دینے کے لیے زبردست کام کیا۔ یہ شخص افغانستان پر برطانیہ کا تسلط قائم کرنے کے لیے سرگرم تھا۔ اس نے امیر دوست محمد خان کے عہدِ حکومت میں 1832ء کے دوران افغانستان میں برطانیہ کی سفارتی مہم میں حصہ لیا اور واپسی پر اپنی کتاب ''The Travel to Bukhara'' (سفر بخارا) میں لکھا:

''افغانوں کے چہرے یہودیوں جیسے ہیں۔ وہ خود بھی یہ مانتے ہیں وہ یہودی النسل ہیں۔''

(جلد:1، صفحہ:162)

برنس نے اپنی دوسری تصنیف ''کابل'' میں افغانوں کے بنی اسرائیل ہونے کی دلیل یہ پیش کی کہ امیر دوست محمد خان نے پٹھانوں اور یہودیوں میں مماثلت کو تسلیم کیا اور کہا کہ ہم بھی یہودیوں کی طرح بیٹی کو میراث میں حصہ نہیں دیتے لہٰذا ہم کیوں یہودی نہ ہوں گے۔ (صفحہ:109)

برنس کی یہ دونوں دلیلیں انتہائی کمزور ہیں۔ افغانوں کے چہروں کا یہودیوں جیسا ہونا کسی بھی طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ دونوں کی آنکھوں کی رنگت اور ناک نقشے میں واضح فرق ہے۔ ہاں! گوری رنگت اور ڈاڑھی مونچھوں میں مماثلت مانی جاسکتی ہے کہ انیسویں صدی تک یہودی عموماً ڈاڑھی رکھا کرتے تھے، مگر اب یہ مماثلت کوئی حیثیت نہیں رکھتی کیوں کہ اب اکثر یہودی کلین شیو ہوتے ہیں۔ صرف ان کے کٹر مذہبی لوگ ڈاڑھی رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہود خود کئی نسلوں کا آمیزہ ہیں۔ ان میں گورے، کالے، سانولے، سرخ نیز ایشین، یورپین اور افریقن ہر قسم اور نسل کے لوگ نظر آتے ہیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر صرف ظاہری شباہت سے قوموں کے نسب کا فیصلہ کر دیا جائے تو انساب گورکھ دھندا بن جائیں گے کیوں کہ دنیا کی ہر قوم میں دوسری اقوام کی کچھ مشابہت مل جائے گی۔ آج ترکی میں بھی اکثر لوگ وضع قطع کے لحاظ سے یورپی معلوم ہوتے ہیں تو کیا انہیں فرنچ، برٹش اور

جرمنوں کی اولاد قرار دے دیا جائے گا۔ عربوں کے چہرے پٹھانوں سے بہت ملتے جلتے ہیں تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ عرب پٹھانوں کی اولاد ہیں۔

جہاں تک امیر دوست محمد خان کے خود کو یہودی ماننے کا تعلق ہے تو یہ برنس کی ذاتی روایت ہے جس پر کس طرح اعتبار نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ برنس مسلمانوں خاص کر افغانوں کا سخت دشمن تھا اور ان کو گمراہ کرنے کے لیے بڑے سے بڑا جھوٹ بول سکتا تھا۔ یاد رہے کہ یہ وہی برنس (برنز) ہے جو شاہ شجاع کو کٹھ پتلی حاکم کے طور پر دوست محمد خان کی جگہ تختِ کابل پر بٹھانے میں پیش پیش رہا اور انجام کار اپنی سازشوں کے بدلے میں مجاہد افغانوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔

کہتے ہیں کہ ''جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔'' یہ بات برنس کی تحقیقات پر بالکل صادق آتی ہے۔ اس نے پیچھے ایک مثال دی تھی کہ افغان خود کو یہودی النسل مانتے ہیں مگر ''The Travel to Bukhara'' میں ایک مقام پر وہ خود اپنی تردید کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''افغان یہودیوں کے ساتھ شدید تعصب رکھتے ہیں اور کسی واضح دلیل کے بغیر خود کو بنی اسرائیل ماننے پر تیار نہیں ہوتے۔'' (جلد:1، صفحہ:164)

ذرا آگے چل کر ''مدعی سست گواہ چست'' کا مصداق بنتے ہوئے لکھتا ہے:

''چونکہ بنی اسرائیل کے بعض قبائل مشرق کی طرف آئے تھے اس لیے ہم کیوں تسلیم نہ کریں کہ افغان انہی کی اولاد ہیں مگر اسلام لے آئے ہیں۔'' (صفحہ:164)

مطلب یہ کہ افغان خود تو اپنے آپ کو یہودی النسل نہیں مانتے مگر ہم ان کا نسب بنی اسرائیل سے جوڑ کر رہیں گے۔ تحقیق کی دنیا میں ایسے بے بنیاد قیاسات اور متضاد بیانات کی جو حیثیت ہو سکتی ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔

<u>والٹر بیلو کی فریب کاری:</u> ایک اور انگریز مؤرخ ''ہنری والٹر بیلو'' نے افغانوں کو بنی اسرائیل ثابت کرنے کے لیے عجیب دلیل دی ہے، اس نے فارسی کی مشہور تاریخی کتاب طبقاتِ ناصری کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ قدیم زمانے میں غور میں بنی اسرائیل نامی قوم آباد تھی جس کے ہمسایہ ملکوں سے تجارتی تعلقات تھے۔

ہنری والٹر بیلو کا یہ حوالہ سراسر کذب بیانی ہے۔ طبقات ناصری میں صرف اتنا لکھا ہے کہ غور میں ایک یہودی تھا جس نے ہارون الرشید سے غور میں کچھ یہودیوں کو آباد کرنے کی اجازت حاصل کی تھی۔

(دیکھیے طبقات ناصری: 313/1)

اس میں کہیں بھی غور میں بنی اسرائیل کے آباد ہونے کا ذکر نہیں۔ ہنری والٹر ہی بتا سکتے تھے کہ طبقات ناصری کی عبارت سے قدیم زمانے میں غور میں قوم بنی اسرائیل کا آباد ہونا اور پوری افغان قوم کا

اس کی اولاد ہونا کسی طرح ثابت ہو سکتا ہے۔

جارج روز کا نظریہ: ایک مغربی محقق جارج روز نے افغانوں کو بنی اسرائیل ثابت کرنے کے لیے کئی کتابیں لکھی ہیں اور اس سلسلے میں عجیب وغریب دلائل دیے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتا ہے کہ اگر پٹھان یہودی النسل نہ ہوتے تو خود کو کبھی بنی اسرائیل نہ کہتے، اس لیے کہ افغان دوسرے مسلمانوں کی طرح یہودیوں سے بہت نفرت کرتے ہیں۔ (رہی قبائل اور مشرقی سلاطین: 31)

جارج روز کی یہ دلیل اس مسئلے پر بحث کرنے والے دوسرے مغربی محققین کے خلاف ہے جو کہتے ہیں کہ افغان اپنا یہودی ہونا چھپاتے ہیں۔ اب سوچئے کہ ان میں کون سچا ہے اور کون جھوٹا!!!

جارج روز نے لکھا ہے کہ:

''بنی اسرائیل کے دس قبائل لاپتا ہو کر اپنے وطن سے دور چلے گئے تھے۔ یہ دس قبائل افغانستان پہنچ گئے تھے اور پٹھان انہی کی اولاد ہیں۔''

اپنے اس دعوے کی دلیل کے طور پر جارج روز نے مستشرقین کی عادت کے مطابق ہر طرح کی رطب ویابس روایات اور خرافات کو جمع کر دیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی کوئی دلیل مفیدِ مطلب نہیں ثابت ہوئی۔

اصل یہودی روایت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے نکلے تو ان کے ساتھ اولادِ یعقوب کے بارہ قبائل تھے جن کے نام بنیامین، روبین، یہودا، لاوی، جاد، اشیر، زبولون، ساعر، یوسف، نفتالی، دان اور شمعون تھے۔ ان میں سے بنیامین اور یہوذا فلسطین کے جنوبی علاقوں میں آباد ہو گئے اور وہی اب تک باقی ہیں۔ دیگر دس قبائل جو شمالی فلسطین میں سکونت پذیر تھے ادھر اُدھر بکھر گئے اور دوسرے ملکوں میں جا کر لاپتا ہو گئے۔ انہیں ''دس لاپتا قبائل'' کہا جاتا ہے۔ مستشرقین کی کوشش ہے کہ افغانوں کا نسب انہی لاپتا قبائل سے جوڑ دیا جائے۔

مذکورہ مستشرقین کے علاوہ درجنوں مغربی دانشوروں نے اس مسئلے پر تحقیقات کا ایک انبار لگایا ہے جن میں ولیم مور کرافٹ، چارلس میسن اور ہنری راورٹی قابلِ ذکر ہیں۔ ولیم مور نے بھی پٹھانوں کی ظاہری شباہت کو ان کے یہودی النسل ہونے کی علامت قرار دیا اور چارلس میسن نے ''درۂ خیبر'' کو مدینہ منورہ میں یہودیوں کی بستی ''خیبر'' سے جوڑ کر اپنا دعویٰ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ دنیا میں درجنوں شہر، دیہات اور مقامات ایسے ہیں جن کے ناموں کا تلفظ یکساں ہے، مگر دونوں الگ الگ زبانوں کے الفاظ اور الگ الگ معنوں میں ہیں۔

ایک اور دلیل: یہودیوں کے انسائیکلوپیڈیا ''دائرۃ المعارف الیہودیۃ'' میں کہا گیا ہے کہ یہودیوں کی

عبادت گاہوں کے کھنڈرات کابل میں موجود ہیں جو بخت نصر کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

(صفحہ:224)

اس بارے میں اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ یہود اپنی تہذیب کو قدیم ترین تہذیب ثابت کرنے کے لیے اپنے اثرات و باقیات کو دنیا کے کونے کونے میں ثابت کرنے پر تُلے رہتے ہیں۔ اس طرح وہ زیادہ سے زیادہ علاقوں کو اپنی تہذیب کا مرکز اور اپنا وطن قرار دے کر وہاں تسلط حاصل کرنے یا کم از کم وہاں تہذیبی و ثقافتی سرگرمیاں شروع کرنے کا بہانہ تلاش کر لیتے ہیں۔ چونکہ آثارِ قدیمہ اور تاریخ سمیت علوم وفنون کے اکثر شعبوں میں یہودی سب سے آگے ہیں، اس لیے ان کی تحقیقات کو کوئی مسترد بھی نہیں کر پاتا۔ تاہم ان کی سازش فطرت کے پیشِ نظر کسی کو آنکھیں بند کر کے ان کے انکشافات پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری: دلچسپ بات یہ ہے خود یورپیوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو افغانوں کے یہودی ہونے کی تحقیقات کو کھلی جعل سازی قرار دیتے ہیں۔ مثلاً اسٹیورٹ الفنسٹن نے اپنی تصنیف Kingdom Of Kalavl میں صفحہ 156 سے 160 تک ان تمام روایات کی مدلل تردید کی ہے جن سے پشتونوں کو بنی اسرائیل ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

> ”افغانوں اور یہودیوں کے درمیان بہت سی مشابہتیں پیش کی جاتی ہیں مگر ایسی مشابہتیں مختلف اقوام کی معاشرت میں عام مل جاتی ہیں۔ اگر یہ بات قوموں کے ایک ہونے کی دلیل ہو تو تاتاری، عرب، جرمن اور روسیوں کو بھی ایک مانا جائے۔“

اس طرح ایک اور نامور مستشرق برنارڈ ڈرون نے اپنی کتاب ”History of Afghans“ میں لکھا ہے کہ افغانوں کا یہودیوں کے ہم شکل ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ یہودی النسل ہوں ورنہ کشمیریوں کا بھی یہودی ہونا لازم آئے گا کیونکہ ان کی شکلیں بھی ایسی ہی ہیں۔

ڈرون نے اس نظریے کی بھی تردید کی ہے کہ پٹھان فلسطین سے آئے ہیں اور اس پر زور دیا ہے کہ یہ قوم شروع سے یہاں آباد چلی آئی ہے، کسی دوسرے ملک سے یہاں منتقل نہیں ہوئی۔

(صفحہ:65تا80)

افغان اور بنو اسحٰق: افغانوں کو بنی اسرائیل قرار دینے والے بعض حضرات نے علاماتِ قیامت سے متعلق ان احادیث سے بھی استدلال کرنے کی کوشش کی ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک بنو اسحٰق کے ستر ہزار افراد جہاد کے لیے قسطنطنیہ پر یلغار نہ کر دیں۔

(مسلم حدیث نمبر 2920، مستدرک حاکم حدیث نمبر 8606)

استدلال کے تحت کہا جاتا ہے کہ دیگر روایات کے مطابق قربِ قیامت کے مجاہدین میں اہلِ خراسان یعنی افغانوں کی شرکت یقینی ہے، قسطنطنیہ کے یہ مجاہدین بھی جنہیں بنو اسحٰق کہا گیا ہے، قرین قیاس ہے کہ افغان ہوں گے، انہیں بنو اسحٰق اسی لیے کہا گیا کہ افغان بنو اسرائیل ہیں۔

مگر غور کیا جائے تو یہ استدلال امکان در امکان پر مبنی ہے سو نہایت کمزور ہے۔ یہ محض ایک امکان ہے کہ قسطنطنیہ کے جہاد میں افغان شریک ہوں گے۔ احادیث میں اس کی کوئی دلیل موجود نہیں۔ یہ بھی محض ایک امکان ہے کہ اس جہاد میں شریک بنو اسحٰق، اسرائیلی نسل کے ہوں۔ وہ کسی اور نسل کے بھی ہو سکتے ہیں۔

اگر امکان کے طور پر مان لیا جائے کہ افغان قسطنطنیہ کے جہاد میں شریک ہوں گے، تب بھی یہ امکان ختم نہیں ہو جاتا کہ اس جہاد میں دوسری قومیں بھی شریک ہوں اور بنو اسحٰق سے وہ دوسرے لوگ مراد ہوں۔ یہ محض ایک امکان ہی ہے کہ جن بنو اسحٰق کی بات کی جا رہی ہے، وہ افغان ہوں گے۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ قربِ قیامت کی احادیث میں جہاں بنو اسحٰق کا ذکر آیا ہے وہاں اس بارے میں محدثین کے مختلف اقوال ہیں کہ یہ بنو اسحٰق کون ہوں گے؟ محدثین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہاں بنو اسحٰق سے مراد بنو اسماعیل یعنی اہلِ عرب مراد ہیں۔ (...ج، شرح مسلم)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بنو اسحٰق سے یورپی اقوام مراد لی ہیں۔ وہ اس بارے میں فرماتے ہیں:

''اس (بنو اسحٰق کے جہادِ قسطنطنیہ میں شریک ہونے والی) حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ روم (اہلِ یورپ) آخری زمانے میں اسلام لے آئیں گے، اور غالباً قسطنطنیہ کی فتح انہی میں سے ایک جماعت کے ہاتھوں ہوگی جیسا کہ حدیث ''انہ یغزوہا سبعون الفاً من بنی اسحٰق'' بتا رہی ہے۔ رومی (یورپی) عیص بن اسحٰق بن ابراہیم کی اولاد ہیں، اس طرح وہ بنی اسرائیل کے چچا زاد ہیں جو یعقوب بن اسحٰق کی اولاد ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ آخری زمانے میں رومی (یورپی) بنی اسرائیل سے بہتر ثابت ہوں گے'' (النہایۃ فی الفتن والملاحم، ج:1 ص:30)

علمائے انساب میں سے علامہ نویری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بنو اسحٰق یا اسحاقیون جعفر بن طیار رضی اللہ عنہ کی اولاد کو کہا جاتا ہے۔ (نہایۃ الارب، ج:2، ص:360)

ایک قول یہ ہے کہ بنو اسحٰق سے مراد بنو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جن کی آبادی مصر میں صعید کے علاقے اشمونین میں ہے۔ (نہایۃ الارب، ج:1، ص:14)

تاریخ و تمدن اور لغت کے ماہر علامہ مقریزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بنو اسحٰق وہ عرب قبیلہ ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے طلحہ بن عبداللہ کی اولاد سے ہے۔ طلحہ بن عبداللہ سے تین قبیلے چلے ہیں،

بنو اسحٰق، بنو قصہ اور بنو محمد (البیان والاعراب بارض مصر من الاعراب، ج:1، ص:9)

علمائے لغت میں سے علامہ زبیدی نے لکھا ہے کہ بنو اسحٰق سے ''علوی'' مراد ہوتے ہیں۔

(تاج العروس، ج:6، ص:378)

پانچویں صدی ہجری کے ایک ممتاز مؤرخ ابونعیم الاصفہانی لکھتے ہیں کہ اہل فارس (ایرانی) اولادِ اسحٰق سے ہیں۔ (تاریخ اصفہان، ج:1، ص:9)

قارئین! اتنے اقوال، امکانات اور احتمالات کے ہوتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہے کہ محض قیاس کی بناء پر افغانوں کو بنو اسحٰق اور بنو اسحٰق کو بنی اسرائیل قرار دے دیا جائے۔

خلاصۂ بحث: اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ افغانوں کے اسرائیلی ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ آخر ان کا نسب کہاں جا کر ملتا ہے تو اتنا جان لینا کافی ہے کہ وہ بھی باقی سب کی طرح آدم و نوح علیہما السلام کی اولاد ہیں، بعض قبائل میں ہزار ڈیڑھ ہزار سال کے انساب ضرور محفوظ ہو سکتے ہیں مگر اس سے آگے حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس سلسلے میں پیش کی جانے والی تمام تحقیقات قیاس آرائیوں پر مشتمل ہیں۔ اس میں افغانوں کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا کی اکثر اقوام ہزار دو ہزار سال پہلے کی تاریخ میں اپنے حسب و نسب اور آباؤ اجداد کی تلاش میں یقینی طور پر کچھ نہیں بتا سکتیں۔ محققین کو ٹامک ٹوئیوں کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ قدیم ادوار میں وہ ذرائعِ علم مفقود تھے جن کے ذریعے ایسی معلومات کو محفوظ کیا جا سکتا۔ قوموں کی تاریخ لکھنے کا کوئی مستقل رواج نہ تھا۔ حسب نسب عموماً زبانی یاد رکھے جاتے تھے مگر اس کا رواج بھی تمام قوموں میں نہیں تھا۔ ہاں عرب اس ذوق میں ممتاز تھے اور اپنے شجر ہائے انساب زبانی یاد رکھا کرتے تھے۔ اس لیے عربوں کے انساب اسلام سے کئی صدیوں قبل تک محفوظ مانے جاتے ہیں، مگر ایک حد تک جانے کے بعد خود عربوں کا نسب بھی ترتیب وار محفوظ نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ محققین کے نزدیک صحیح احادیث کی بنا پر عربوں کے سب سے معزز قبیلے قریش کا نسب بھی عدنان سے اوپر محفوظ نہیں ہے۔ تو کسی اور قوم کے بارے میں کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ اس کے تین چار ہزار سال قبل تک کے آباؤ اجداد کا ریکارڈ محفوظ ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ افغانوں کے حسب و نسب کی تلاش اور ان کے قدیم آباؤ اجداد کی کھوج درحقیقت کوئی ایسا مقصد نہیں تھا جس کو اتنی اہمیت دی جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ گزشتہ دس بارہ صدیوں تک افغانوں کے انساب محفوظ ہیں اور تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ افغانوں کے بیشتر قبائل پچیس تیس پشتوں تک اپنے آباؤ اجداد کے نامور بزرگوں سے واقف ہیں۔ نسب کی درستی، پہچان اور شرافت

کے لیے اتنا بہت کافی ہے۔ پھر یہ شرف کیا کم ہے کہ انہی افغانوں میں شہاب الدین غوری، احمد شاہ ابدالی، محمود غزنوی جیسے نامور فاتحین اور ابراہیم بن ادہم، شقیق بلخی، امام ابوداؤد سجستانی اور امام بیہقی رحمہم اللہ جیسے بزرگوں نے جنم لیا حتیٰ کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے آباؤ اجداد بھی اسی سرزمین سے اُٹھ کر عراق گئے تھے۔ ان شرافتوں کے ہوتے ہوئے افغانوں کو ہرگز ضرورت نہیں رہتی کہ وہ ماقبل از اسلام کے دور میں اپنے آباؤ اجداد کی جستجو میں سر کھپائیں۔ ظاہر ہے کوئی مسلمان خاندان جاہلیت کے دور میں اپنے کسی جدِ امجد کو دریافت کر بھی لے تو اسے کوئی مطلب حاصل نہیں ہوتا، کیونکہ کوئی مسلمان اپنے جاہل اور بے دین آباؤ اجداد پر فخر نہیں کر سکتا۔ اسلام نے جھوٹے تفاخر کے یہ تمام بت توڑ دیے ہیں اور اسلام کو گلے لگانے والے افغان اسلام کی اس تعلیم سے خوب واقف ہیں۔

یہ پروپیگنڈا کیوں کیا گیا؟ اتنی بحث کے باوجود یہ بات اب تک واضح نہیں ہوسکی کہ آخر افغانوں کو بنی اسرائیل قرار دینے میں دانشورانِ فرنگ کو کیا مفاد نظر آیا اور اس لایعنی بحث پر اتنا زور کیوں دیا جاتا رہا۔ اس سلسلے میں کوئی یقینی بات پختہ ثبوتوں کے ساتھ ہی کہی جاسکتی ہے جو دستیاب نہیں ہیں۔ تاہم قرائن اور اشارات سے ایسا محسوس ہوتا رہا کہ شاید یہ خود یہودیوں کی ایک سازش ہو جس کے لیے مستشرقین سے کام لیا گیا ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط تک مستشرقین، احادیث کا اکثر ذخیرہ کھنگال چکے تھے اور یہ بات یقینی سے کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے وہ احادیث پڑھ لی تھیں جن میں خراسان سے مہدی کے امدادی لشکر کے چلنے اور اس کی معاونت سے دجّال کی فوج کی شکست کا ذکر ہے۔ استعمار کے ہرکاروں اور یہودی مستشرقین کو ان احادیث کی بنا پر یہ خطرہ لاحق ہوگیا ہوگا کہ مستقبل میں خراسان (افغانستان) کے جری مسلمان ان کے سب سے بڑے حریف بن کر سامنے آسکتے ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ انہوں نے پیش بندی کے طور پر پہلے سے یہ تیاری شروع کردی کہ افغانوں کے دلوں میں یہود کے لیے نرم گوشہ پیدا کردیا جائے۔ اس کا ایک ممکنہ طریقہ یہ ہوسکتا تھا کہ افغانوں کو جو کہ اپنے نسب کے بارے میں بے حد حساس ہوتے ہیں یہ یقین دلا دیا جائے کہ نسلاً وہ خود بنی اسرائیلی ہیں۔

اس ہدف کو سامنے رکھ کر مستشرقین نے اپنے طریقہ واردات کے مطابق وہ رطب ویابس مواد تلاش کرنا شروع کیا جس سے ان کے مذکورہ موقف کی تائید ہوتی ہو اور نعمت اللہ ہروی جیسے مؤرخین کی عبارتیں ان کے کام آگئی ہوں۔

بظاہر ان مستشرقین کی اکثریت یورپ کے عیسائیوں پر مشتمل ہے مگر عین ممکن ہے کہ ان کی خاصی تعداد باطناً یہودی ہو یا ان میں سے بہت سوں کو یہودی لابی نے دولت کے ذریعے اپنے مقاصد کے لیے

استعمال کیا ہو۔ دورِ حاضر میں یہودی جس طرح افغانوں کو یہودی النسل ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس سے اس تاثر کو مزید تقویت ملتی ہے کہ ماضی میں بھی یہ واقعتاً یہودیوں کی ایک سوچی سمجھی سازش تھی۔

القدس العربی کا انکشاف: اب قارئین اس بات کا ثبوت ملاحظہ فرمائیں کہ واقعی افغانوں کے نسب کو امریکی یہودی سازش کے تحت تبدیل کیا جا رہا ہے، یہ محض ہمارا دعویٰ نہیں حقیقت ہے۔

عربی جریدہ القدس العربی اپنی 11 جنوری 2010ء کی اشاعت میں انکشاف کرتا ہے:

''اسرائیل افغانستان کے پشتون قبائل میں بڑے پیمانے پر اس خیال کو تقویت دے رہا ہے کہ وہ یہود کی اولاد ہیں، اس طرح افغانوں کو یہودیت قبول کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ اس دعوت کے پیچھے مادّی فوائد، پرکشش مراعات اور بیرونی دنیا میں رہائش اور معاش کی ترغیب بھی شامل ہے۔ اس کوشش کے نتیجے میں اب تک بہت سے افغان یہودی بن چکے ہیں اور ان میں سے کئی اسرائیل نقل مکانی کر چکے ہیں۔''

مضمون نگار خطرہ ظاہر کرتا ہے کہ آگے چل کر یہ یہودی افغان دوسرے افغانوں کو یہودیت کی طرف مائل کریں گے اور لکھتا ہے:

''افغانوں کو یہودیت کی دعوت دینے کے لیے ایک طرف تو اسرائیلی خفیہ تنظیموں کے کارکن پرانے محققین کی عبارتوں سے تاریخی دلائل پیش کر رہے ہیں، اس کے علاوہ ان افغان زعماء کے اعترافات کو بھی مشہور کیا جا رہا ہے جو خود کو یہودی النسل مان چکے ہیں۔ ان میں امیر دوست محمد خان کے علاوہ ظاہر شاہ کی مثال بھی دی جا رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ظاہر شاہ نے اپنا نسب یہودی قبیلے بن یامین سے جوڑا تھا۔ نیز پشتو زبان میں یہودیت کی دعوت پر مشتمل لٹریچر بھاری پیمانے پر جنوبی اور مشرقی افغانستان میں پھیلا جا رہا ہے۔''

قارئین! کیا یہ انکشاف دل دہلا دینے والا نہیں کہ افغان یہودیت قبول کر رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ یہودی لابی اور مستشرقین کی دوصد سالہ کاوشیں رنگ لانے لگی ہیں۔ حالات کا یہ پہلو بھی بے حد عجیب ہے کہ یہودی اپنی ہزار ہا سالہ تاریخ میں پہلی بار کسی قوم کو اپنے مذہب کی دعوت دے رہے ہیں، ورنہ دنیا جانتی ہے کہ یہودی کبھی اپنے مذہب کی تبلیغ نہیں کرتے بلکہ اپنے مذہب اور عقائد کو سات پردوں میں چھپائے رکھتے ہیں۔ اگر کوئی اپنی خوشی سے ان کا مذہب قبول کرنا چاہے تب بھی وہ اسے آسانی سے اپنے مذہب میں قبول نہیں کرتے۔ سو بار ٹالتے ہیں، آزماتے ہیں، پھر کہیں جا کر موقع دیتے ہیں۔ تو افغانوں کو وہ خود یہودیت کی طرف کیوں مائل کر رہے ہیں۔ کیا وہ یقین کر چکے ہیں کہ اگر افغان یہودی نہ

بنے تو جلد ہی وہ مہدی کے لشکر کا حصہ بن کر اسرائیل کو فتح کرنے پہنچ جائیں گے۔

آخری بات یہ ہے اگر بالفرض کسی طرح افغانوں کو بنی اسرائیلی ہونے کا یقین دِلا بھی دیا جائے تب بھی ان شاء اللہ ان کی اکثریت کے ایمانی اور اسلامی تعصب میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ یہود کی چالیں انہی پر الٹ جائیں گی۔ ایمان ایسی چیز ہے جو دل میں بیٹھ جائے تو پھر اللہ اور رسول کی محبت کی خاطر سگے رشتوں کو قربان کر دینا بھی آسان ہوتا ہے۔ الحمد للہ! افغان مسلمان اس دولت سے پوری طرح مالا مال ہیں۔ اسی سرمایے کے بل بوتے پر انہوں نے دنیا کی تین سپر پاورز برطانیہ، روس اور امریکا کا غرور خاک میں ملایا ہے۔ اور اسی ایمانی قوت سے وہ مستقبل میں یہود کی عالمگیریت کا خواب چکنا چور کریں گے۔ انہی سطور پر "تاریخ افغانستان" کا سلسلہ ختم کرتا ہوں۔ پانچ سال سے زائد مدت گزری جب یہ سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اب اس کا اختتام ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی تاریخ سے سبق حاصل کرنے اور اسے آیندہ کے لیے مشعل راہ بنانے ہمت وتوفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

گزشتہ اور موجودہ صدی کے افغان حکمران ایک نظر میں

گزشتہ اور موجودہ صدی کے افغان حکمران ایک نظر میں

1. امیر عبدالرحمن خان، اکتوبر 1881ء تا اکتوبر 1901ء
2. امیر حبیب اللہ خان، یکم اکتوبر 1901ء تا 20 فروری 1919ء
3. امیر نصر اللہ خان، 20 فروری 1919ء تا 25 فروری 1919ء
4. شاہ امان اللہ خان، 25 فروری 1919ء تا، 14 جنوری 1929ء
5. شاہ عنایت اللہ خان، 14 جنوری 1929ء تا 17 جنوری 1929ء
6. غازی حبیب اللہ (بچہ سقہ)، 17 جنوری 1929ء تا 10 اکتوبر 1929ء
7. محمد نادر شاہ، 16 اکتوبر 1929ء تا 8 نومبر 1933ء
8. محمد ظاہر شاہ (آخری بادشاہ)، 8 نومبر 1933ء تا 17 جولائی 1973ء
9. سردار محمد داؤد خان، 17 جولائی 1973ء تا 27 اپریل 1978ء
10. نور محمد ترہ کئی، 27 اپریل 1978ء تا 16 ستمبر 1979ء
11. حفیظ اللہ امین، 16 ستمبر 1979ء تا 27 دسمبر 1979ء
12. ببرک کارمل، 27 دسمبر 1979ء تا 20 مئی 1986ء
13. نجیب اللہ، 20 مئی 1986ء تا 16 اپریل 1992ء
14. صبغت اللہ مجددی، 28 اپریل 1992ء تا 28 جون 1992ء
15. برہان الدین ربانی (صدر)، 28 جون 1992ء تا 27 ستمبر 1996ء
16. گلبدین حکمت یار (وزیر اعظم)، 7 مارچ 1993ء تا جنوری 1994ء
17. ملا محمد عمر (امیر المؤمنین)، 27 ستمبر 1996ء تا نومبر 2001ء
18. حامد کرزئی، 22 دسمبر 2001ء تا حال

طالبان سے دوبدو جنگ کے دوران امریکی فوجیوں کی بوکھلاہٹ۔
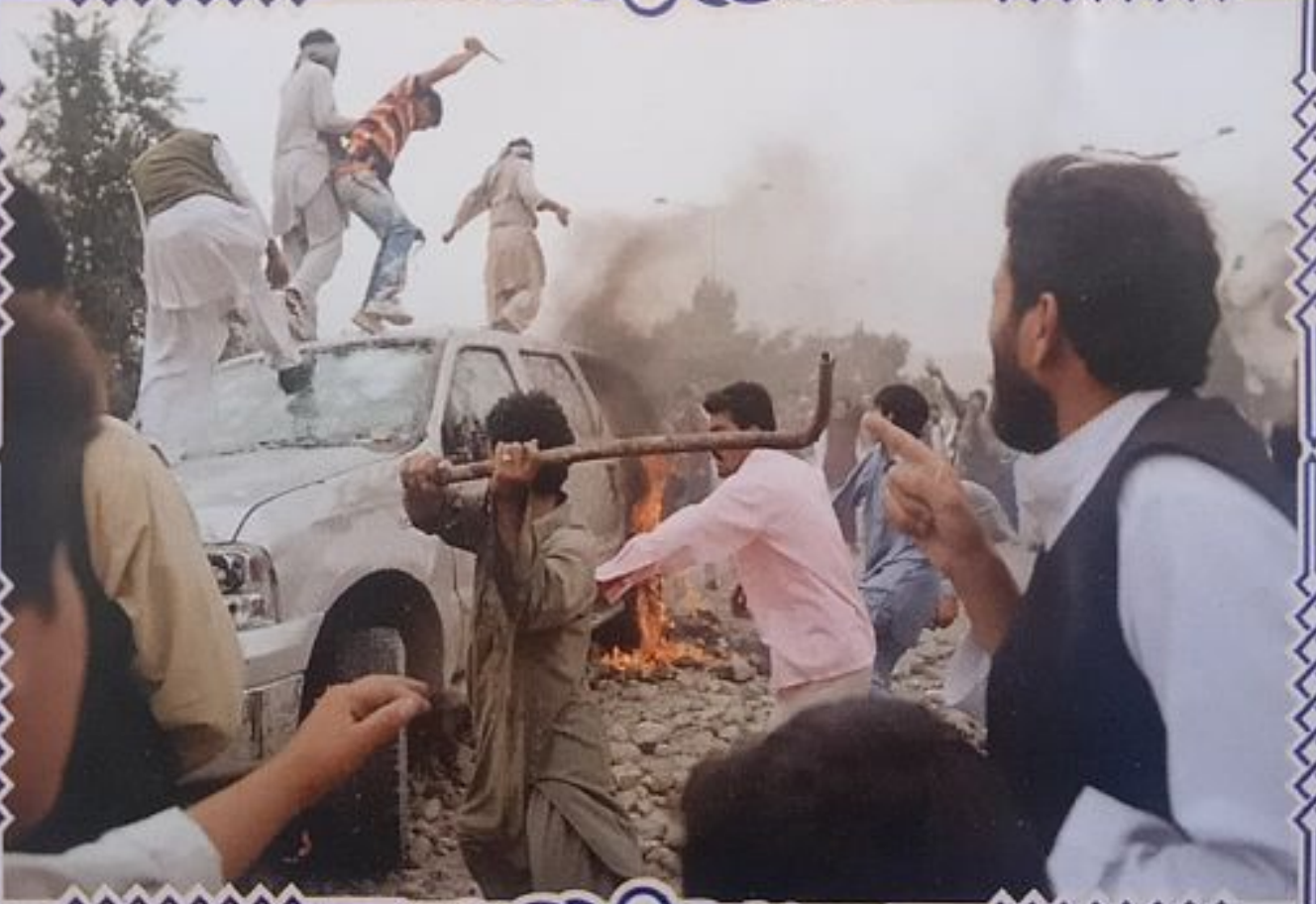
افغان شہری ایک احتجاجی مظاہرے کے دوران کابل میں امریکی سفارت خانے کے سامنے کھڑی گاڑیوں کو توڑ پھوڑ رہے ہیں۔
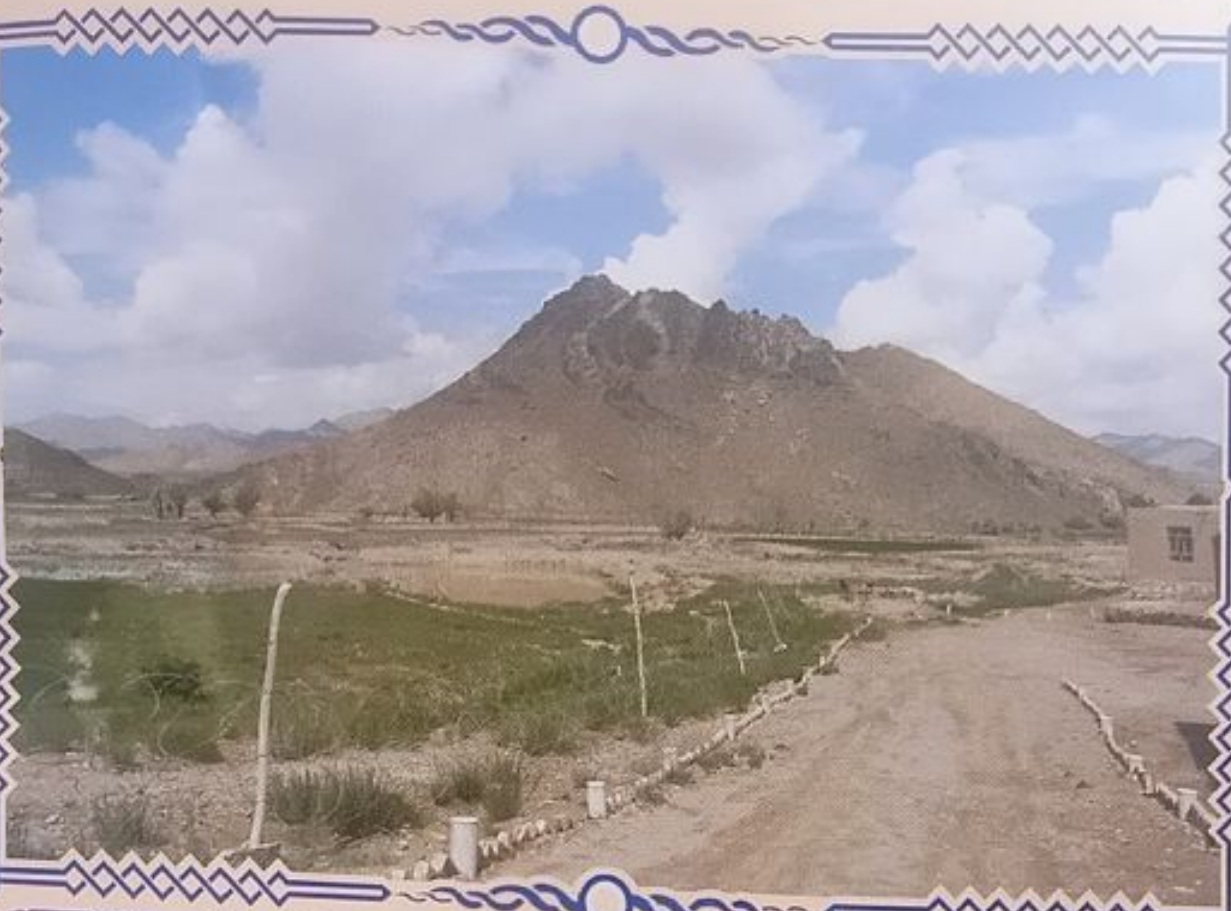
جبل السراج جہاں طالبان اور احمد شاہ مسعود کے درمیان معرکے برپا ہے۔

سالانگ شاہراہ کی سرنگ جو مشرقی اور وسطی افغانستان کو شمالی صوبوں سے ملانے کا واحد راستہ ہے۔

سمرقند میں الغ بیگ کی تعمیر کردہ رصدگاہ

مزار شریف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب مقبرہ

امریکی فوج طالبان کے ٹھکانوں کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے۔ چنیوک ہیلی کاپٹر فضا سے حملہ آور ہے۔

امریکی فوجی گاڑی برف میں دھنسی ہوئی ہے۔ امریکا کو یہاں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہے۔
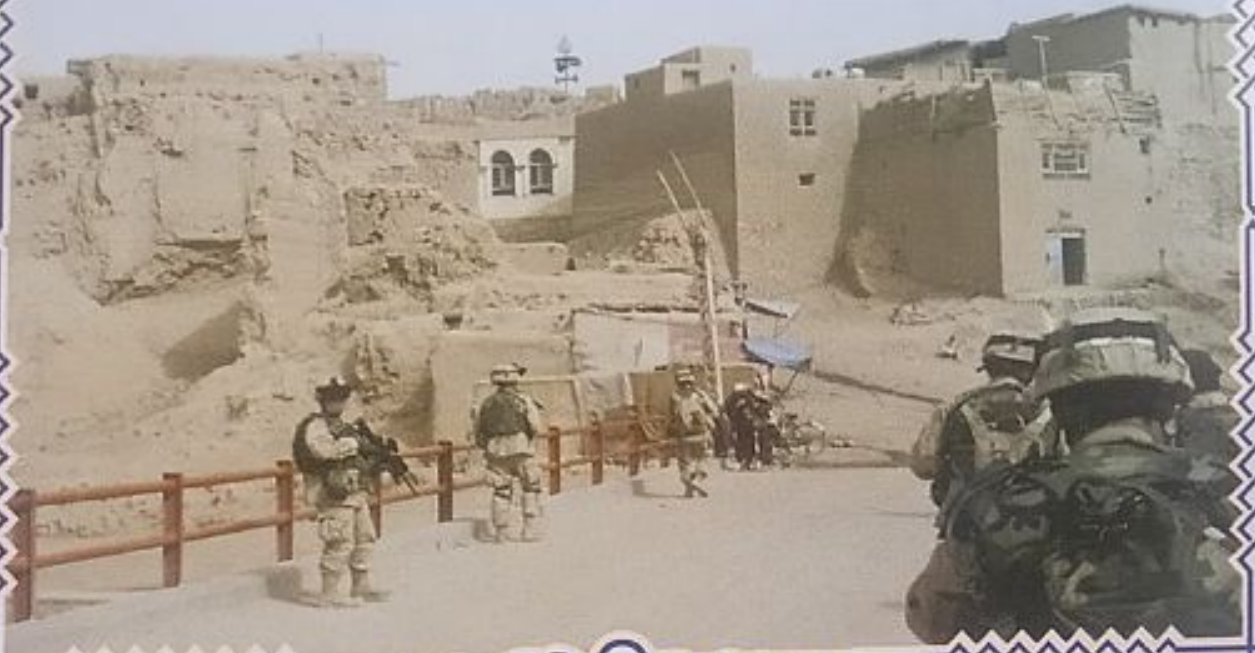
امریکی فوج، سلطان محمود غزنوی کے شہر غزنی میں۔

کابل میں امریکن یونی ورسٹی......امریکا تعلیم کے بہانے یہاں اپنی تہذیب وثقافت کی کاشت کر رہا ہے۔

کابل کا شمال مشرقی صوبہ پروان، جہاں سلطان جلال الدین نے چنگیزی لشکر کو عبرت ناک شکست دی تھی۔
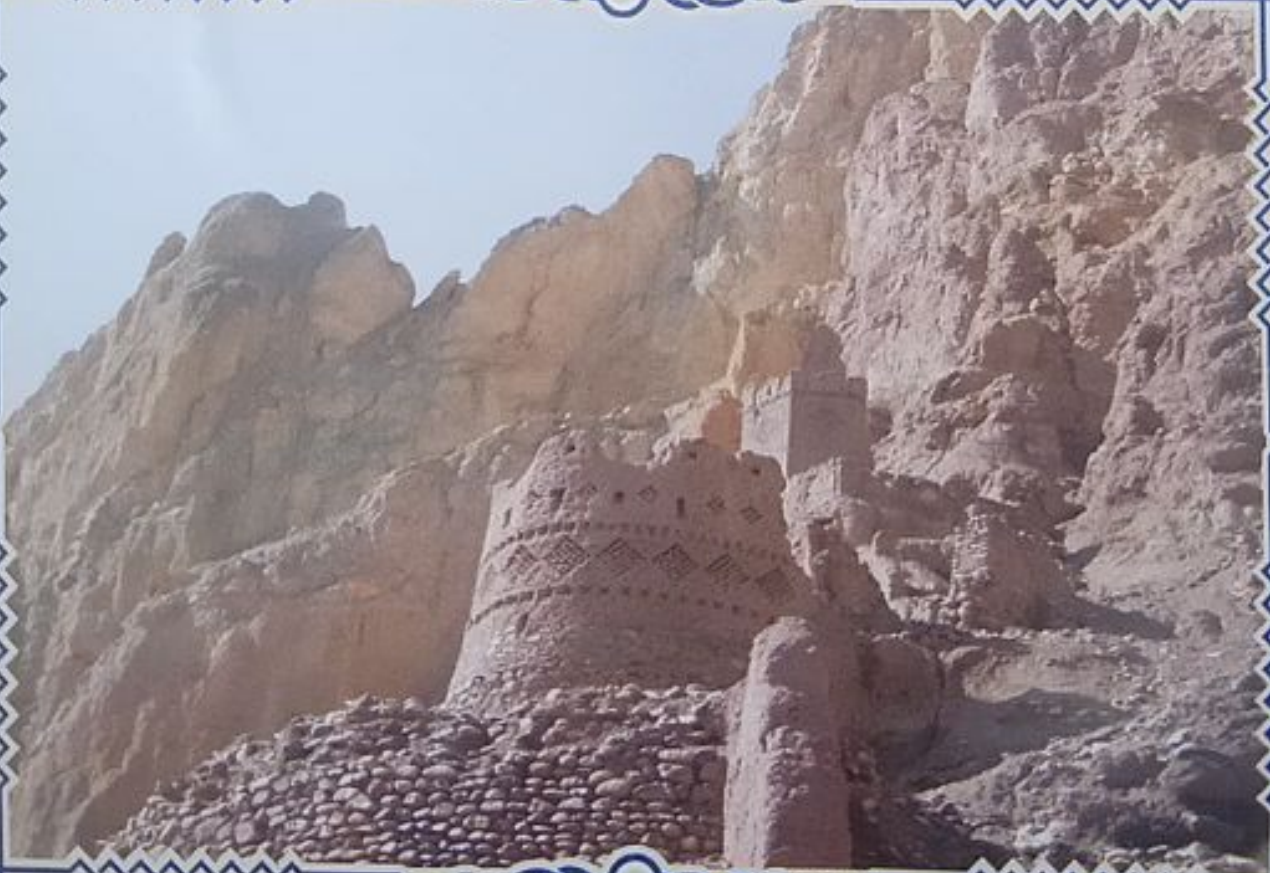
بامیان کا قدیم شہر اور قلعہ جسے چنگیز خان نے نیست و نابود کر دیا۔

بامیان میں بدھا کا مجسمہ...... طالبان سے پہلے۔
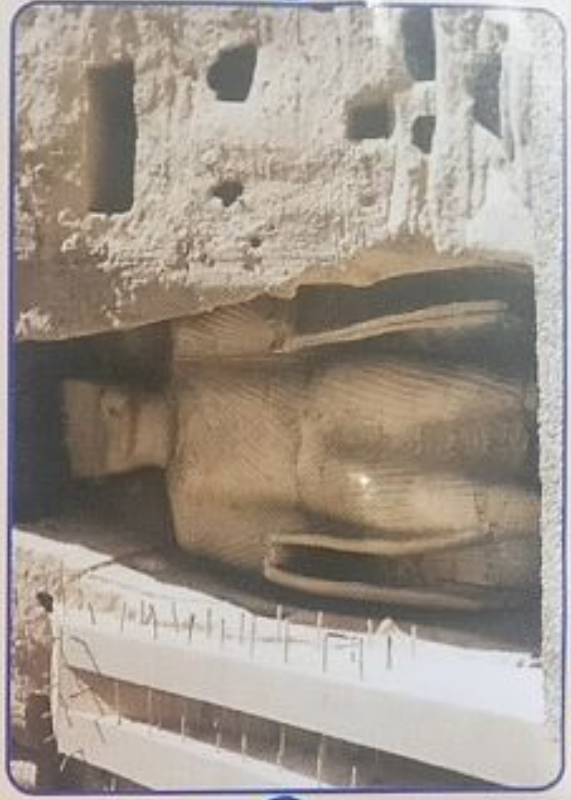
سروبی کی خطرناک گھاٹی۔ طالبان اسے عبور کر کے آناً فاناً کابل میں داخل ہو گئے۔

گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء...... ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے دونوں ٹاوروں پر طیاروں کا حملہ
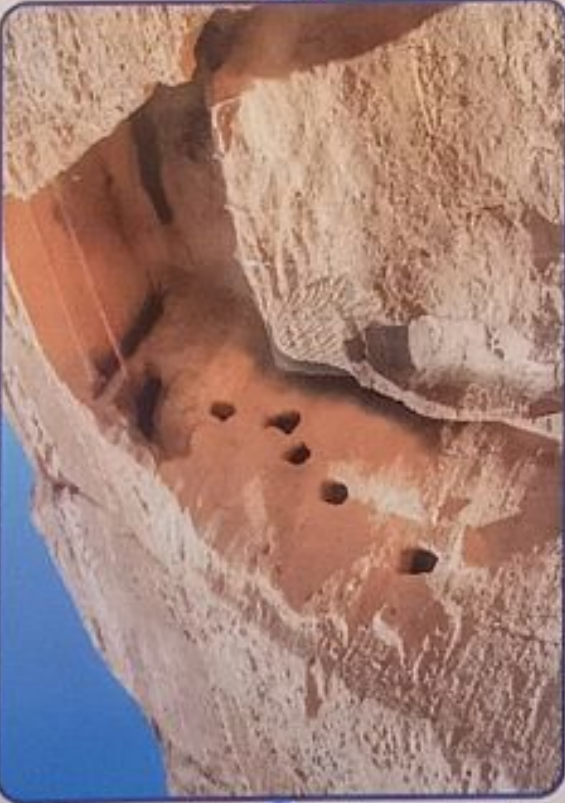
طالبان کے ہاتھوں تباہ ہونے کے بعد صرف یہ نشانات رہ گئے۔

۱۸ جنوری ۲۰۱۰ء کو کابل میں طالبان کے خودکش حملے کے بعد دھواں اٹھ رہا ہے، افغان فورس کے اہلکار تماشا دیکھ رہے ہیں۔

کابل میں طالبان کے حملے کے بعد شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ افغان بادشاہوں کا شکستہ حال شاہی محل "دارالامان" نمایاں دکھائی دے رہا ہے۔

کچھ اس کتاب کے بارے میں

تاریخ کی کتب قوم کی امانت ہوتی ہیں اور انہی پر قوموں کے تشخص کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ دورِ حاضر میں مستشرقین کی ایک پوری کھیپ ہماری تاریخ مسخ کرنے میں مصروف ہے۔ اس بات کا خطرہ ہے کہ اگر ہم نے اپنے ماضی بعید کے ساتھ ساتھ قریبی ادوار کی تاریخ کو پوری احتیاط، دیانت داری اور صداقت کے ساتھ محفوظ نہ کیا تو اگلی نسلوں کے ہاتھوں میں تاریخ کے نام پر صرف وہی زہر آلود مواد ہوگا جو مستشرقین پیش کر رہے ہیں۔ افغانستان کی تاریخ خصوصاً ایسے فکری حملوں کا ہدف ہے۔ اہلِ مغرب آج میڈیا کے ذریعے وہاں کے غیور مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں، کل کو اسی مواد سے وہ افغانستان کی ایسی تاریخ مرتب کریں گے جس میں ہمارے لیے جا بجا گمراہ پھندے بچھے ہوں گے۔

ان خطرات کے دفاع کے لیے ساڑھے پانچ سال قبل ہفت روزہ ضربِ مومن میں ''تاریخ افغانستان'' پر مضامین کا آغاز کیا گیا۔ ابتدا میں میرا ہدف صرف قریبی دو عشروں کی تاریخ مرتب کرنا تھا۔ اس میں بھی سوویت یونین کے خلاف جہاد اور طالبان کے اسلامی دور کو خصوصی اہمیت دینا میرا محور تھا۔ مگر جب کام شروع کیا تو معلوم ہوا کہ افغانستان کا ہر دور اپنے سابقہ دور سے اس طرح بندھا ہوا ہے کہ اس سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔ ویسے تو ہر قوم اپنے ماضی کی اسیر ہوتی ہے مگر اپنی اسلامی تاریخ اور روایات سے جس قدر مضبوط رشتہ افغانوں میں دیکھا جاتا ہے، دنیا کی کوئی اور قوم اسکی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ اس لیے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیوں نہ افغانستان کے پورے اسلامی عہد کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے اور قارئین کو اس سیر میں اپنا ہم سفر بنا لیا جائے۔

بایں ہمہ جب یہ سلسلہ شروع ہوا تھا تو یہ توقع نہ تھی کہ اسے عوام و خواص میں اس قدر مقبولیت حاصل ہوگی۔ راقم کو قارئین کی جانب سے ملنے والے بکثرت خطوط سے یہ اندازہ ہوا کہ الحمدللہ ہماری قوم خاص کر نوجوان طبقے میں اپنی تاریخ جاننے اور اس سے سبق حاصل کرنے کا زبردست ولولہ موجود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک بات اکثر خطوط اور پیغامات میں مشترک ہوتی تھی اور وہ یہ کہ اس سلسلے کو کتابی شکل میں ضرور لایا جائے۔ قارئین کی دلچسپی کے پیشِ نظر اب اسے کتابی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بلاک A-1، گلستانِ جوہر، یونیورسٹی روڈ، کراچی
0321-3135009 | 0321-2000870
almanhalpublisher@gmail.com
almanhalpublisher@hotmail.com
www.almanhalpublisher.com